

گنگا سے گومتی تک

..... ”مجھ کو فی کھانوں کی دھوشتا انکی شہلی
 ہے . معمولی پڑھا لکھا آدمی انہیں بھا نسی کی
 کے سمجھ سکتا ہے . سرلما نے ساتھ بھاشا میں دینک
 اندولی اس طرح ہے جس طرح اونچے پائے کے
 جوں میں ملتی ہے .

ن کہانہوں میں ہلستے ہیں، کرنا ہی ہے۔ کس نے
 لے ہلستے ہمت میں ہل پڑینگے، تو کہیں پوچھتے
 آپ دیکھ سے اسیلے ہمت رہ جائینگے۔ محبوب کی
 اس ہماری کوسل بہاؤ نہوں جگانی میں، ہمیں اچھا
 یہ ہدائی ہوں۔“

— ذائقہ و ام بلاس عرما

... ” وہ (جھپ) سارگ صاف کرنا چاہتے ہیں،
 کو سنبھالنا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ کلا کو کام کاجی
 لے رہے ہیں۔ اور ایسی نوڈلنی کہ دھار دیتی چلی جائے
 ، کپانہاں جگہ، جگہ ہمارا دیمان - حاج سہن ہونے والے
 وں اور آٹھ چاروں کی طرف کھینچتی ہیں... سنگڑ
 لہانوں میں ایک سیدھی آدھی تڑپنا ہے، جو اچھی
 ہے۔“

— چیلداد کمار

لگ بھگ ملحقہ کے سدھی ہوئے لکھنویوں نے "لکنا سے
و" کو سراہا ہے۔

”گنگا سے گومتی تک“ میں 180 صفحے ہیں، نرنگا
”کبر“ پوربھا جلد، دام کھول دو روپے۔ جلدی آرڈر
میں۔

مجلس شورای ملی

— 22 —

المجلد 'لها عدد' 145. مقول كسبي العاديات.

ہندوستانی کلچر سوسائٹی

ہندوستانی کلچر سوسائٹی

مقصد

مقصد

(1) ایک ایسی ہندوستانی کلچر کا بڑھانا، फैلانا اور پرچار کرنا جس میں سب ہندوستانی شامل ہوں۔

(1) ایک ایسی ہندوستانی کلچر کا بڑھانا، फैلانا اور پرچار کرنا جس میں سب ہندوستانی شامل ہوں۔

(2) ایکٹا پہلانے کے لئے کتابوں، اخباروں، رسالوں وغیرہ کا چھاپنا۔

(2) ایکٹا پہلانے کے لئے کتابوں، اخباروں، رسالوں وغیرہ کا چھاپنا۔

(3) پڑائی، غزلیں، کتابیں، سہاؤں، کانفرنسیں، لکچر، سبھیوں، جانوں، بیگاریوں اور فیکٹوں میں آپس کا میل بڑھانا۔

(3) پڑائی، غزلیں، کتابیں، سہاؤں، کانفرنسیں، لکچر، سبھیوں، جانوں، بیگاریوں اور فیکٹوں میں آپس کا میل بڑھانا۔

سوسائٹی کے پریسیڈنٹ می:۔ عبداللہ مہدی راجا؛
وائس پریسیڈنٹ—ڈاکٹر بھگوان داس اور ڈاکٹر عبدالحق۔
گورننگ باڈی کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر بھگوان داس؛
سکرٹری—یوسف سلطانی۔

سوسائٹی کے پریسیڈنٹ—مسٹر عبداللہ مہدی راجا؛
وائس پریسیڈنٹ—ڈاکٹر بھگوان داس اور ڈاکٹر عبدالحق۔
گورننگ باڈی کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر بھگوان داس؛
سکرٹری—یوسف سلطانی۔

گورننگ باڈی کے آفیسر—

گورننگ باڈی کے آفیسر—

ڈاکٹر سید محمد، ڈاکٹر نازا چاند، مولوی سید
لہمان ندوی، می:۔ منظر علی، شی:۔ جی
کھن، یوسف سلطانی، مہتمم بھگوان داس، سہتی پونم
چند رائے، قاضی محمد عبدالغفار اور شری اور پرکاش
پالہوال۔

ڈاکٹر سید محمد، ڈاکٹر نازا چاند، مولوی سید
لہمان ندوی، می:۔ منظر علی، شی:۔ جی
کھن، یوسف سلطانی، مہتمم بھگوان داس، سہتی پونم
چند رائے، قاضی محمد عبدالغفار اور شری اور پرکاش
پالہوال۔

ممبروں کے قاعدوں کے لئے لکھتے۔

ممبروں کے قاعدوں کے لئے لکھتے۔

سلطان

سلطان

سوسائٹی، ہندوستانی کلچر سوسائٹی

سوسائٹی، ہندوستانی کلچر سوسائٹی

145، سڈی گنج، دہلی

145، سڈی گنج، دہلی

نوٹ—سوسائٹی کے نئے قاعدوں کے انوسار ممبروں کی
فیس صرف ایک روپیہ کرنسی کی ہے۔ "نیا ہند" کے
جو گاہک ممبر بننا چاہیں ان کو صرف چھ روپیہ جلدہ
دہلے پر ہی ممبر بنا لیا جائے گا۔ الگ سے ممبروں کی
فیس دہلے والے سوسائٹی کی نکلی ہوئی کوئی کتاب جو
ایک روپیہ دام کی ہوگی مفت لے سکیں گے یا زیادہ دام
کی کتابیں لہے پر ایک بار ایک روپیہ کم کیا سکیں گے۔

نوٹ—سوسائٹی کے نئے قاعدوں کے انوسار ممبروں کی
فیس صرف ایک روپیہ کرنسی کی ہے۔ "نیا ہند" کے
جو گاہک ممبر بننا چاہیں ان کو صرف چھ روپیہ جلدہ
دہلے پر ہی ممبر بنا لیا جائے گا۔ الگ سے ممبروں کی
فیس دہلے والے سوسائٹی کی نکلی ہوئی کوئی کتاب جو
ایک روپیہ دام کی ہوگی مفت لے سکیں گے یا زیادہ دام
کی کتابیں لہے پر ایک بار ایک روپیہ کم کیا سکیں گے۔

हमारे यहाँ मिलने वाली कुछ और किताबें

नोट:—यह किताबें सिर्फ हिन्दी में हैं			नोट:—ये किताबें सिर्फ हिन्दी में हैं		
नाम किताब	लेखक	राम	लेखक	नाम किताब	राम
1. शेर और शायरी	श्री अयोध्या प्रसाद गोयली	8 0 0	श्री अयोध्या प्रसाद गोयली	1. शेर और शायरी	8 0 0
2. शेर और सुजन	"	8 0 0	"	2. शेर और सुजन	8 0 0
3. गहरे पानी पैठ	"	2 8 0	"	3. गहरे पानी पैठ	2 8 0
4. हमारे आराध्य	श्री बनारसीदास चतुर्वेदी	3 0 0	श्री बनारसीदास चतुर्वेदी	4. हमारे आराध्य	3 0 0
5. संस्मरण	"	3 0 0	"	5. संस्मरण	3 0 0
6. दो हजार वर्ष पुरानी कहानियाँ	श्री जगदीशचन्द्र जैन	3 0 0	श्री जगदीशचन्द्र जैन	6. दो हजार वर्ष पुरानी कहानियाँ	3 0 0
7. ज्ञान गंगा	श्री नारायण साद जैन	6 0 0	श्री नारायण साद जैन	7. ज्ञान गंगा	6 0 0
8. पद्म चिन्ह	श्री शान्ति प्रिय द्विवेदी	2 0 0	श्री शान्ति प्रिय द्विवेदी	8. पद्म चिन्ह	2 0 0
9. पंच प्रदीप	शान्ति एस. ए.	2 0 0	शान्ति एस. ए.	9. पंच प्रदीप	2 0 0
10. आकाश के तारे धरती के फूल	श्री कन्हैयालाल मिश्र प्रसाद	2 0 0	श्री कन्हैयालाल मिश्र प्रसाद	10. आकाश के तारे धरती के फूल	2 0 0
11. मुक्ति दूत	श्री बीरेन्द्र कुमार जैन एस. ए.	5 0 0	श्री बीरेन्द्र कुमार जैन एस. ए.	11. मुक्ति दूत	5 0 0
12. मिलन यामिनी	श्री बच्चन	4 0 0	श्री बच्चन	12. मिलन यामिनी	4 0 0
13. रजत रश्मि	डाक्टर रामकुमार वर्मा	2 8 0	डाक्टर रामकुमार वर्मा	13. रजत रश्मि	2 8 0
14. मेरे बापू	श्री तन्मय ब्रुखारिया	2 8 0	श्री तन्मय ब्रुखारिया	14. मेरे बापू	2 8 0
15. विश्व संघ की ओर	पंडित सुन्दरलाल भगवानदास केला	3 0 0	पंडित सुन्दरलाल भगवानदास केला	15. विश्व संघ की ओर	3 0 0
16. भारतीय अर्थशास्त्र	श्री भगवानदास केला	5 0 0	श्री भगवानदास केला	16. भारतीय अर्थशास्त्र	5 0 0
17. भारतीय शासन	"	3 0 0	"	17. भारतीय शासन	3 0 0
18. नागरिक शास्त्र	"	2 4 0	"	18. नागरिक शास्त्र	2 4 0
19. साम्राज्य और उनका पतन	"	2 8 0	"	19. साम्राज्य और उनका पतन	2 8 0
20. भारतीय स्वाधीनता आन्दोलन	"	1 4 0	"	20. भारतीय स्वाधीनता आन्दोलन	1 4 0
21. सदीय अर्थ व्यवस्था	"	1 8 0	"	21. सदीय अर्थ व्यवस्था	1 8 0
22. हमारी आदिम जातियाँ	श्री भगवानदास केला और श्री अखिल विनय	3 8 0	श्री भगवानदास केला और श्री अखिल विनय	22. हमारी आदिम जातियाँ	3 8 0
23. अर्थशास्त्र शब्दावली	श्री दया शंकर दुबे, एस. ए. एल. एल. बी. गजाधर प्रसाद, अम्बिष्ट, भगवानदास केला	2 0 0	श्री दया शंकर दुबे, एस. ए. एल. एल. बी. गजाधर प्रसाद, अम्बिष्ट, भगवानदास केला	23. अर्थशास्त्र शब्दावली	2 0 0
24. नागरिक शिक्षा	भगवानदास केला श्री दयाशंकर दुबे	1 8 0	भगवानदास केला श्री दयाशंकर दुबे	24. नागरिक शिक्षा	1 8 0
25. राष्ट्र मंडल शासन	श्री दयाशंकर दुबे	1 8 0	श्री दयाशंकर दुबे	25. राष्ट्र मंडल शासन	1 8 0
26. जवानो	महात्मा भगवानदीन	3 0 0	महात्मा भगवानदीन	26. जवानो	3 0 0
27. मारने की हिम्मत !	"	1 0 0	"	27. मारने की हिम्मत !	1 0 0
28. सखीना सच	"	0 8 0	"	28. सखीना सच	0 8 0
29. मेरे साथी	"	1 0 0	"	29. मेरे साथी	1 0 0

मिलने का पता—

मैनेजर 'बचा हिन्द'
145, इन्दिरा, बंगलापुर-2.

मैनेजर 'बचा हिन्द'
145, इन्दिरा, बंगलापुर-2.

मैनेजर 'बचा हिन्द'

گیاتا اور کوران

لےکچر—پंडित सुन्दरलाल

اس کتاب میں ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے مہل کی باتوں میں۔ گھٹا کا بڑا، گھٹا کے ایک ایک ادعا کا نہجور، قرآن کا بڑا، لگ بھگ 15 خاص خاص مضمونوں پر قرآن کی قریب 500 آیتوں کا لفظی ترجمہ وغیرہ دیا گیا ہے۔

جو لوگ سب دھرموں کی بلحاظی لیکچر کو جاننا اور سمجھنا چاہیں ان کے لئے یہ کتاب اصول ہے۔

پولہ تین سو صفحے کی سندر جلد بلدی کتاب کی قیمت صرف ڈھائی روپہ، ڈاک خرچ الگ۔

ہندو مسلم عکاتا

اس کتاب میں وہ چار لیکچر جمع کئے گئے ہیں جو پلڈت جی نے نلسنہتری بورڈ کوالیار کی دعوت پر گوالیار میں دیے تھے۔

سوی سرف کی کتاب، قیمت صرف بارہ آلے۔

مہاتما گاندھی کے بلیدان سے سبک

سامبرداکیتا یعنی فرقہ پرستی کی بیماری پر راجکاجی، مچھربی اور دتھاسی پھل سے وچار اور کسکا ایلان۔ اسی نے آخر میں دیکھ پتا مہاتما گاندھی تک کو ہمارے بچ میں نہ دھلے دیا۔

قیمت بارہ آلے۔

پنجاہ ہمیں کیا سکھاتا ہے

اکتوبر سن 1947 میں پچھمی اور پوربی پنجاہ کے ہمارے کے بعد وہاں کی بھنگر برہانی اور اہسی مار کٹ کے کارن لوگوں پر جو جو مصیبتیں آئیں ان کا ہرناک انکھوں دیکھا ورنہ۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آجکل کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لئے کچھ سچاوی ہی پھی کئے گئے ہیں۔ قیمت چار آلے۔

بنگال اور اس سے سبق

اس چھوٹی سی کتاب میں 1949-50 میں پوربی اور پچھمی بنگال کے فرقہ وارانہ جھگڑوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے جھگڑوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی ترکیب بھی سچائی گئی ہے۔ قیمت صرف دو آلے۔

گیاتا اور قرآن

لیکچر—پندت سندر لال

اس کتاب میں ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے مہل کی باتوں میں۔ گھٹا کا بڑا، گھٹا کے ایک ایک ادعا کا نہجور، قرآن کا بڑا، لگ بھگ 15 خاص خاص مضمونوں پر قرآن کی قریب 500 آیتوں کا لفظی ترجمہ وغیرہ دیا گیا ہے۔

جو لوگ سب دھرموں کی بلحاظی لیکچر کو جاننا اور سمجھنا چاہیں ان کے لئے یہ کتاب اصول ہے۔

پولہ تین سو صفحے کی سندر جلد بلدی کتاب کی قیمت صرف ڈھائی روپہ، ڈاک خرچ الگ۔

ہندو مسلم ایکتا

اس کتاب میں وہ چار لیکچر جمع کئے گئے ہیں جو پلڈت جی نے نلسنہتری بورڈ کوالیار کی دعوت پر گوالیار میں دیے تھے۔

سو صفحے کی کتاب، قیمت صرف بارہ آلے۔

مہاتما گاندھی کے بلیدان سے سبق

سامبرداکیتا یعنی فرقہ پرستی کی بیماری پر راجکاجی، مچھربی اور دتھاسی پھل سے وچار اور کسکا ایلان۔ اسی نے آخر میں دیکھ پتا مہاتما گاندھی تک کو ہمارے بچ میں نہ دھلے دیا۔

قیمت بارہ آلے۔

پنجاہ ہمیں کیا سکھاتا ہے

اکتوبر سن 1947 میں پچھمی اور پوربی پنجاہ کے ہمارے کے بعد وہاں کی بھنگر برہانی اور اہسی مار کٹ کے کارن لوگوں پر جو جو مصیبتیں آئیں ان کا ہرناک انکھوں دیکھا ورنہ۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آجکل کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لئے کچھ سچاوی ہی پھی کئے گئے ہیں۔ قیمت چار آلے۔

بنگال اور اس سے سبق

اس چھوٹی سی کتاب میں 1949-50 میں پوربی اور پچھمی بنگال کے فرقہ وارانہ جھگڑوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے جھگڑوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی ترکیب بھی سچائی گئی ہے۔ قیمت صرف دو آلے۔

ملک کا پتہ--

میلنگر 'نیا ہلد' 145 ملکی فلیج، ایلہ آباد

میلنگر کا پتہ--

میلنگر، 'نیا ہلد' 145، ملکی فلیج، ایلہ آباد۔

ہندوستانی کلچر سوسائٹی کی کتابیں

پچاس روپے سے زیادہ دام کی کتابیں خریدنے والوں کو اور بکسٹروں کو خاص رعایت دی جائے گی۔ پوری جانکاری کے لیے لکھیے۔

ڈاک یا ریل رچ ہر حالت میں گاہک کے قبضے ہوگا۔

ہندوستانی کلچر سوسائٹی کی کتابیں

پچاس روپے سے زیادہ دام کی کتابیں خریدنے والوں کو اور بکسٹروں کو خاص رعایت دی جائے گی۔ پوری جانکاری کے لیے لکھیے۔

ڈاک یا ریل رچ ہر حالت میں گاہک کے قبضے ہوگا۔

بھارت کا ویڈیو

پورا ہندی انٹرواد

جو 26 جنوری سن 1950 سے سارے بھارت میں لاگو ہوا۔ 'بھارت میں انگریزی راج' کے لکھک پندت سندرلال دھارا مूल انگریزی سے انٹروادیت۔

ہر بھارتی کا فرض ہے کہ جس دھان کے اطمینان سے بھارت کا شاسن اس زمانے میں چل رہا ہے اسے جتنی بھی سمجھے۔ بھارت کے ہر حصے میں اس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے۔

آسان بامصاوری بھاشا۔ ریل آٹھ پہلی ہوا سائز۔ لکھک چار سو پندرہ کی سندر جلد۔ قیمت کےवल ساڈے سات روپے۔

بھارت کا ویڈیو

پورا ہندی انٹرواد

جو 26 جنوری سن 1950 سے سارے بھارت میں لاگو ہوا۔ 'بھارت میں انگریزی راج' کے لکھک پندت سندرلال دھارا مूल انگریزی سے انٹروادیت۔

ہر بھارتی کا فرض ہے کہ جس دھان کے اطمینان سے بھارت کا شاسن اس زمانے میں چل رہا ہے اسے جتنی بھی سمجھے۔ بھارت کے ہر حصے میں اس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے۔

آسان بامصاوری بھاشا۔ ریل آٹھ پہلی ہوا سائز۔ لکھک چار سو پندرہ کی سندر جلد۔ قیمت کےवल ساڈے سات روپے۔

فیرکاوندی پر باپو

سندپادک—آئی آئی کورن داس

اس کتاب میں سن 1921 سے سن 1948 تک گاندھی جی نے سامبرداہیتا کے سوال پر جو کچھ کہا یا لکھا وہ سب آپکو ایک جگہ ملے گا۔

بھارت کے آزاد ہونے پر یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ہر بھارتی اس سامبرداہیتا کے نقصان کو سمجھے اور اس زہر کو اپنے اندر سے صاف کرے۔

سندر جلد۔ اچھا کاغذ۔ دو سو صفحے۔ قیمت دو روپے۔

فرقہ بندی پر باپو

سندپادک—شری شریکرشن داس

اس کتاب میں سن 1921 سے سن 1948 تک گاندھی جی نے سامبرداہیتا کے سوال پر جو کچھ کہا یا لکھا وہ سب آپکو ایک جگہ ملے گا۔

بھارت کے آزاد ہونے پر یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ہر بھارتی اس سامبرداہیتا کے نقصان کو سمجھے اور اس زہر کو اپنے اندر سے صاف کرے۔

سندر جلد۔ اچھا کاغذ۔ دو سو صفحے۔ قیمت دو روپے۔

وینوبا کا سندھش

لکھک—سورس رامسائی

ایک شبد—مہاتما بھگواندین

وینوبا جی کے بھودان یکم سے آج سارا دیش واقف ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آپکو ملے گا کہ یہ بھودان یکم کب اور کسے شروع ہوا اور اس کا مقصد کیا ہے۔

پہلا ایکشن ہاتھ نکل گیا۔ یہ دوسرا ایکشن ہے۔ صفحے 25، دام کےवल دو آنے۔

میلنگ کا پتا—

مینیجر، 'نیا دین' 145، سڈیگن، دھاکھاپور۔

وینوبا کا سندھش

لکھک—سورس رامسائی

ایک شبد—مہاتما بھگواندین

وینوبا جی کے بھودان یکم سے آج سارا دیش واقف ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آپکو ملے گا کہ یہ بھودان یکم کب اور کسے شروع ہوا اور اس کا مقصد کیا ہے۔

پہلا ایکشن ہاتھ نکل گیا۔ یہ دوسرا ایکشن ہے۔ صفحے 25، دام کےवल دو آنے۔

میلنگ کا پتا—

مینیجر، 'نیا دین' 145، سڈیگن، دھاکھاپور۔

हैं जिसकी एक राजधानी नागपुर हो और दूसरी बम्बई। हमारा तो ख्याल था कि सर्वोच्च समाज जब हिन्दुस्तान में क़ायम होगा तो न बम्बई रहेगा न नागपुर, न नई दिल्ली, न लखनऊ, न कलकत्ता, न मद्रास, बड़े बड़े और गांव बृहत् शहर खत्म हो जायेंगे। हमारा यह ख्याल अब भी है, लेकिन श्री शंकर राय जी को अपनी राय देने का पूरा हक़ है और इस राय में दूसरों को भी शरीक करने का पूरा हक़ है। इस तरह बरार का अलग सूबा बने और बम्बई का असल, इनके लिये श्री ज़िज साल जी भाई और श्री एस. के. पाटिल साहब को भी कोशिश करने का पूरा हक़ है। हमारी गुफ़ारिश है कि इस भाषा के सवाल पर ठंडे दिख से खूब गौर किया जाना चाहिये और जितने विचार या ख्याल इस मसले पर आयें उनका मंथन होना चाहिये, ध्यान रहे कि हम मंथन चाहते हैं रगड़ नहीं। मंथन से मक्खन पैदा होता है और रगड़ से आग। लेकिन हम यह भी चाहते हैं कि हिन्दुस्तान के नये नक्सरे के बारे में जो भी फैसले हों वह कसरत राय या मेजार्टी वोट से न हो कर सबकी मुश्तक़ यानी एक राय से हों।

एक अर्ज और है. आखिर यह सुबों के बनने का तमाशा क्या है, इसके लिये इतनी बदगुमानियां फैलाना या वापैला मचाना हमारी समझ में नहीं आता. क्या हम एक ही हिन्दुस्तान की मिट्टी की पैदावार नहीं हैं ? अगर हमारा हिन्दुस्तान जीता है तो हममें से कौन मरता है और अगर हिन्दुस्तान खत्म होता है तो हम में से कौन जीता है ? इसलिये धुनियादी मसला यह है कि हिन्दुस्तान क्रायम रहे और यहां पर कोई भी नंगा भुका न रहे. खरूरत इस बात की है कि हमारे गरीब भाई अपनी गरीबी छोड़ दें, अमीर भाई अपनी अमीरी छोड़ दें, बाबू लोग अपनी बाबूगरी छोड़ दें, हम अपनी अपनी हस्ती मिटा दें और सब मिल कर ऐसा समरस या एक रस भ्रमात्र बनायें जिसका चर्रा चर्रा हमारा आरना हो.

ہوں جسکی ایک دلچسپ ناکھور ہو اور دوسری
بہمیگی۔ ہمارا تو خیال تھا کہ سرور دے سچ
جب ہندستان میں قائم ہوگا تو نہ بہمیگی دھوکا
نہ ناکھور، نہ نئی دلی، نہ لکھنؤ، نہ کلکتہ، نہ
مدرس، بڑے بڑے اور گاؤں چوسک شر ختم ہو جائیں گے۔
ہمارا یہ خیال اب بھی ہے۔ لیکن شری شکر راؤ جی کو
اپنی رائے تسلیم کا پورا حق ہے اور اس رائے میں دوسروں
کو بھی شریک کرنے کا پورا حق ہے۔ اس طرح ہرگز کا الگ
صوبہ بنے اور بہمیگی کا الگ، ان کے لئے شری برج لال
جی بھائی اور شری ایس۔ نے۔ پاتل صاحب کو بھی
فرمانے کرنے کا پورا حق ہے۔ ہماری گزارش ہے کہ اس بھائی
کے سوال پر تھلنے دل سے خوب غور کیا جانا چاہئے
اور جتنے چار یا خیال اس مسئلے پر آئیں ان کا متفق
ہونا چاہئے۔ دیکھنا رہے کہ ہم متفق چاہتے ہیں، رکو
نہیں۔ متفق سے ممکن پیدا ہوتا ہے اور رکو سے آگ۔
لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہندستان کے نئے نقشہ
کے بارے میں جو بھی فیصلے ہوں وہ کسرت رائے یا
مہاراجی ورنگ سے نہ ہو کر سب کی مشترکہ یعنی ایک
رائے سے ہوں۔

ایک مرض اور ہے۔ آخر یہ صوبوں کے ہلنے پلانے کا
تعارف کیا ہے، اس کے لئے انٹی بدگمانیاں پھیلانا یا واپس
مچھلتا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ہم ایک
ہی هندستان کی متقی کی پھداوار نہیں ہیں؟ اگر
ہمارا هندستان جھٹکا ہے تو ہم میں سے کون مرنا ہے اور
اگر هندستان ختم ہوتا ہے تو ہم میں سے کون جھٹکا ہے؟
اس لئے بلھادی مسئلہ یہ ہے کہ هندستان قائم رہے
یہاں پر کوئی بھی نہکا بھوکا نہ رہے۔ ضرورت اس بات
کی ہے کہ ہمارے شریب بھائی اپنی شریبی چھوڑیں،
امہر بھائی اپنی امہری چھوڑیں، بابو لوگ اپنی بابو گوری
چھوڑیں، ہم اپنی اپنی ہستی متھادیں اور سب ملکر ایسا
سموس یا ایک دس سماج بنائیں جس کا ذرہ ذرہ ہمارا
آگہلہ ہو۔

کی یہ بھی یو. پی. کے کچھ مینیسٹروں اور خاص کر
بیک مینیسٹر صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو پسند
نہیں آیا اور ان کی ناراضگی کے قریب
ہے کچھ لوگوں نے اوپر والے ممبرانہ سے اپنے دستخط
والیں بھی لے لیں۔ ہم یہ عرض کر دیں کہ ہمیں نہیں
معلوم کہ اس کے پیچھے سچائی کون ہے یا کیا راز ہے؟
لیکن جب ہم نے پلٹتے ہوئے بلوچ پلٹ کی ایک اسٹیج
کی رپورٹ سنی تو حیرت ہوئی کہ ان کے جیسا اونچا
تجربہ کار اور دانشمند سیاست دان کس طرح ایسی باتوں
کو کہتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ پلٹ جی نے فرمایا کہ
اگر پر دیکھیں رام اور کرشن کا، لٹکا و جمنا کا پر دیکھیں ہے اور
کسی صورت سے بھی اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔
پلٹ پلٹ کو لکھی اور حکامی طور پر اپنی رائے دینے کا
پورا حق ہے۔ لیکن ان کے ان لفظوں میں ایک کرسی، ایک
ہوکھلا اور ایک قانت ایسی نظر آتی ہے جو ان
کے جیسے مری اور اصلی ہستی کو شوہا نہیں دیتی۔
ہم اس وقت ہندوستان کے نئے نقشہ کے پلٹ پر اپنی
گوئی رائے نہیں دے رہے ہیں اور نہ اپنے بزرگ چیف
مستتر کی بات کا ہی جواب دینا چاہتے ہیں۔ لیکن
کہا پچھلے سو برس کا انہیں یہ نہیں بتانا کہ یوپی کا
ہوئی پلا—رام اور کرشن، لٹکا اور جمنا، ہمدی اور اردو،
ہندو اور مسلمان، علمگدہ اور ہمارس، ہمدی اور تہلخ،
لہگ اور مہامہا، الہ آباد اور لکھنؤ، وغیرہ وغیرہ زندگی
کے مانو ہر محکمہ میں دو بھائی زادہ ہے۔ ہندوستان
کی سیاست کو بگاڑنے کا اور اس ملک کے دل کے دو ٹکڑے
کر دینے کا—یہ یو پی کوئی قدرتی اکائی بھی نہیں ہے
بلکہ ایک بدلتی گول گھاٹا ہے جسے انگریزوں نے اپنی مرضی
اور قابلیت کے مطابق یہ آج کے جیسے بدنام اور فہل پاؤں
کی سی شکل دے ڈالی۔ اس صوبہ کے جغرافیہ کو دیکھ
کر کوئی بھی اس کے پلانے والوں کو داغ نہیں دے سکتا۔
لیکن اگر پلٹ پلٹ کو یہ چھو پسند آتی ہے تو وہ
انہیں مہارک، ہزار بار، مہارک۔ مگر اس کے یہ معنی تو
نہیں ہوتے کہ ان کے آگے کسی کی نہ چلے اور ان کی بات
پتھر کی لکھ مانی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ پلٹ جی
جیسے قماربازی یا لوگ شاعی کے پجاری کو خود یہ
بات مناسب نہیں محسوس ہوگی اور وہ ہر خیال کی
قدر کوہنکر اور اس خیال کے باہر نکلنے کا ہر ممکن
موقع ہر کسی کو اپنی ذاتی اور حکمی، دونوں طرفوں
سے دیں گے۔

ایک طرف جہاں پلٹ پلٹ یو پی کو یو پی ہی رہا
دھار پر اصرار کرتے ہیں، دوسری طرف کانگریس اور
میرورہے سانچے کے سابق سیکرٹری، سری شکر راؤ جی دیو،
مراٹھی بھاشا بھاشی لوگوں کا ایک ہوا اور شاندار صوبہ چاہتے

ایک طرف جہاں پلٹ پلٹ یو پی کو یو پی ہی رہنے
دینے پر اصرار کرتے ہیں، دوسری طرف کانگریس اور
میرورہے سانچے کے سابق سیکرٹری، سری شکر راؤ جی دیو،
مراٹھی بھاشا بھاشی لوگوں کا ایک ہوا اور شاندار صوبہ چاہتے

سنتوہا ہو، اُپمہ کی ہینڈستان کے نکرہ کا مہااپن کامپس نے شکر سے ہی مہسوس کر لیا یا۔ یہی وجہ ہے کہ 1920 کے کرریب جب کامپس کا سنگٹن ملک کے کوئے کوئے میں بھلا تو کامپسی سبوں اور سرکاری سبوں میں کافی فرق ہو گیا۔ کامپس کا ہزاراں کی سبب آشا یا بولی کی بنا پر کرایم کیا جاتے اور ملک کی بھلائی و حفاظت کے ساتھ ساتھ اس صوبے کے رہنے والوں کی خواہشوں کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

اُپمہ کی راہ کی ویدائی کے باء آشاوار سبوں کی ماگ کدورتی طور پر زور پکڑنے لگی۔ لیکن بھارت کا جو نہا ودهان ہذا اس میں قریب قریب وہی صوبے (خاص کر Part A والے) رکھے گئے جو اُپمہ کوڑ گئے یے۔ لیہا جلتا میں اسلئے وہاں اور بھلا کے سوال کو لیکر جبکہ جبکہ شور فل مچایا جائے گا۔ زیادہ بلند آواز دہوں سے اور خاص طور پر آندہ سے اتوں۔ آندہ کے لوگ جان تک قربان کرنے کو تیار ہوئے اور ایک پاک ہستی کی شہادت کے بعد آخر آندہ کا نہا صوبہ مدراس نے پرانے صوبہ میں سے کٹر بھا دیا تھا۔ آندہ کا بھلا تھا کہ دوسرے بھلا والے بھی آئے سے باہر ہوئے لکے۔ نئی دلی کی حکومت پریشان ہوئی کہونکہ خود اس حکومت کی پارٹی والے یعنی کانگریس کے لوگ بھی اس کھالم میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ معاملہ کو زیادہ بگڑنا دیکھ کر حکومت نے بھاشانی کمیشن نام سے تین آدمیوں کا ایک بورڈ قائم کر دیا اور اس کے سہرہ یہ نام کیا کہ ملک بھر کا دورہ کرے، مختلف جماعتوں اور لوگوں سے ملکر انکی رائے اس سوال پر لے اور پھر ہر پھلو سے اس پر شور کرنے کے بعد ہندستان کے نئے نقشہ کے متعلق اپنی سفارہی سرکار کو پیش کرے۔

اس کمیشن کو پہلے قریب تین ماہ ہوچکے ہیں اور آجکل یہ ملک کا دورہ کر رہا ہے۔ جبکہ جبکہ یہ لوگوں سے ملتا ہے اور لوگ بھی اپنے سچے ہاؤ مہمورلڈم کی شکل میں اس آگے دے رہے ہیں۔ خاموشی اور احتیاط کے ساتھ یہ کمیشن کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں اُپمہ آئریڈیش کے پچھمی ضلعوں کے کچھ ائردار لوگوں نے بھی اپنا ایک مہمورلڈم اس نے آگے پیش کیا جس میں شاید یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ پچھمی آئریڈیش کو دوہولکھلڈ یا مہرٹھ اور اگڑا کمیشنوں کو دہلی و پنجاب کے کچھ مشرقی ضلعوں کو ملا کر ایک نہا صوبہ کھوا کیا جائے۔ اس میں یہ بھی اصدہلی کے بھی بہت سے ممبران کے دستخط تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آندہ ہی آندہ کیا واقعہ ہوئے مگر اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چھ

اُپمہ کی راہ کی ویدائی کے باء آشاوار سبوں کی ماگ کدورتی طور پر زور پکڑنے لگی۔ لیکن بھارت کا جو نہا ودهان ہذا اس میں قریب قریب وہی صوبے (خاص کر Part A والے) رکھے گئے جو اُپمہ کوڑ گئے یے۔ لیہا جلتا میں اسلئے وہاں اور بھلا کے سوال کو لیکر جبکہ جبکہ شور فل مچایا جائے گا۔ زیادہ بلند آواز دہوں سے اور خاص طور پر آندہ سے اتوں۔ آندہ کے لوگ جان تک قربان کرنے کو تیار ہوئے اور ایک پاک ہستی کی شہادت کے بعد آخر آندہ کا نہا صوبہ مدراس نے پرانے صوبہ میں سے کٹر بھا دیا تھا۔ آندہ کا بھلا تھا کہ دوسرے بھلا والے بھی آئے سے باہر ہوئے لکے۔ نئی دلی کی حکومت پریشان ہوئی کہونکہ خود اس حکومت کی پارٹی والے یعنی کانگریس کے لوگ بھی اس کھالم میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ معاملہ کو زیادہ بگڑنا دیکھ کر حکومت نے بھاشانی کمیشن نام سے تین آدمیوں کا ایک بورڈ قائم کر دیا اور اس کے سہرہ یہ نام کیا کہ ملک بھر کا دورہ کرے، مختلف جماعتوں اور لوگوں سے ملکر انکی رائے اس سوال پر لے اور پھر ہر پھلو سے اس پر شور کرنے کے بعد ہندستان کے نئے نقشہ کے متعلق اپنی سفارہی سرکار کو پیش کرے۔

اس کمیشن کو پہلے قریب تین ماہ ہوچکے ہیں اور آجکل یہ ملک کا دورہ کر رہا ہے۔ جبکہ جبکہ یہ لوگوں سے ملتا ہے اور لوگ بھی اپنے سچے ہاؤ مہمورلڈم کی شکل میں اس آگے دے رہے ہیں۔ خاموشی اور احتیاط کے ساتھ یہ کمیشن کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں اُپمہ آئریڈیش کے پچھمی ضلعوں کے کچھ ائردار لوگوں نے بھی اپنا ایک مہمورلڈم اس نے آگے پیش کیا جس میں شاید یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ پچھمی آئریڈیش کو دوہولکھلڈ یا مہرٹھ اور اگڑا کمیشنوں کو دہلی و پنجاب کے کچھ مشرقی ضلعوں کو ملا کر ایک نہا صوبہ کھوا کیا جائے۔ اس میں یہ بھی اصدہلی کے بھی بہت سے ممبران کے دستخط تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آندہ ہی آندہ کیا واقعہ ہوئے مگر اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چھ

اس کمیشن کو پہلے قریب تین ماہ ہوچکے ہیں اور آجکل یہ ملک کا دورہ کر رہا ہے۔ جبکہ جبکہ یہ لوگوں سے ملتا ہے اور لوگ بھی اپنے سچے ہاؤ مہمورلڈم کی شکل میں اس آگے دے رہے ہیں۔ خاموشی اور احتیاط کے ساتھ یہ کمیشن کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں اُپمہ آئریڈیش کے پچھمی ضلعوں کے کچھ ائردار لوگوں نے بھی اپنا ایک مہمورلڈم اس نے آگے پیش کیا جس میں شاید یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ پچھمی آئریڈیش کو دوہولکھلڈ یا مہرٹھ اور اگڑا کمیشنوں کو دہلی و پنجاب کے کچھ مشرقی ضلعوں کو ملا کر ایک نہا صوبہ کھوا کیا جائے۔ اس میں یہ بھی اصدہلی کے بھی بہت سے ممبران کے دستخط تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آندہ ہی آندہ کیا واقعہ ہوئے مگر اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چھ

مارچ میں हुई اسکی ایک بڑی جگہ V. I. P. کیمپ کا کرایہ کرنا تھا اور اگر یہ کیمپ نہ ہوتا تو شاید وہ حادثہ نہ ہوتا۔ ہندو کھانا سہولتوں سے پہلے کبھی کسی سہولتوں میں سے کچھ نہیں ہوئی۔ یہ ضروری ہے کہ اگر سہولتوں میں سرکار سے کم سے کم مدد لی جائے اور سارا بوجھ اس صورت پر ضلع کی بھودان کمیٹی (جہاں سہولتوں ہو) برداشت کرے اور اس علاقہ کی جگہ کا زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کیا جائے۔

ہمارے پریمی پاٹھک شایع یہ جانتے ہیں کہ کینوہا جی نے بھودان کھانا سہولتوں کو گوتم بুদ্ধ کا کام بتایا ہے اور اسے دھرم چکر پر چڑھائی ہے۔ یہ لفظ انہوں نے پہلی بار 9 مئی 1952 کو ہندو جمنٹی کے دن لکھنؤ میں کہہ دیا۔ ہندو کھانا سہولتوں نے یہ ثابت کر دیا کہ کینوہا جی کا یہ کہنا مبالغہ زدانی کی ہی آواز ہے۔ اس سہولتوں نے یہ دیکھا دیا کہ ہندوستان کی نئی نئی اخلاقی طاقت کے ساتھ اہمیت جاتدار ہیں اور سہج زور پکڑ سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ ایک نئی اور پاک کام کے لئے ملک کے نوجوان قربانی کے لئے آج بھی تیار ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان کو آئندہ ہل میں گھرا رہا ہے اور اس ہل کے ذریعہ دنیا کے دوسرے سبھی 'خوفناک' سے خوفناک، ہل کے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور سب سے خاص بات یہ نکلی کہ بھوکوان بدھ کی روش آتما نراکار روپ میں اشارہ کر رہی ہے کہ ہمارے جگہ-جگہ، قصہ کی جگہ شانتی اور جھوٹ کی جگہ سچ پر چلے ہمارے انسان اس دھرتی پر اب سہی سلامت زندہ نہیں رہ سکتا۔

22. 5. '54

سوریش رام بھائی

سوریش رام بھائی کی ایک بڑی جگہ V. I. P. کیمپ کا کرایہ کرنا تھا اور اگر یہ کیمپ نہ ہوتا تو شاید وہ حادثہ نہ ہوتا۔ ہندو کھانا سہولتوں سے پہلے کبھی کسی سہولتوں میں سے کچھ نہیں ہوئی۔ یہ ضروری ہے کہ اگر سہولتوں میں سرکار سے کم سے کم مدد لی جائے اور سارا بوجھ اس صورت پر ضلع کی بھودان کمیٹی (جہاں سہولتوں ہو) برداشت کرے اور اس علاقہ کی جگہ کا زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کیا جائے۔

ہمارے پریمی پاٹھک شایع یہ جانتے ہیں کہ کینوہا جی نے بھودان کھانا سہولتوں کو گوتم بুদ্ধ کا کام بتایا ہے اور اسے دھرم چکر پر چڑھائی ہے۔ یہ لفظ انہوں نے پہلی بار 9 مئی 1952 کو ہندو جمنٹی کے دن لکھنؤ میں کہہ دیا۔ ہندو کھانا سہولتوں نے یہ ثابت کر دیا کہ کینوہا جی کا یہ کہنا مبالغہ زدانی کی ہی آواز ہے۔ اس سہولتوں نے یہ دیکھا دیا کہ ہندوستان کی نئی نئی اخلاقی طاقت کے ساتھ اہمیت جاتدار ہیں اور سہج زور پکڑ سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ ایک نئی اور پاک کام کے لئے ملک کے نوجوان قربانی کے لئے آج بھی تیار ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان کو آئندہ ہل میں گھرا رہا ہے اور اس ہل کے ذریعہ دنیا کے دوسرے سبھی 'خوفناک' سے خوفناک، ہل کے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور سب سے خاص بات یہ نکلی کہ بھوکوان بدھ کی روش آتما نراکار روپ میں اشارہ کر رہی ہے کہ ہمارے جگہ-جگہ، قصہ کی جگہ شانتی اور جھوٹ کی جگہ سچ پر چلے ہمارے انسان اس دھرتی پر اب سہی سلامت زندہ نہیں رہ سکتا۔

— سوریش رام بھائی

22. 5. '54

ہندوستان کے نئے نقشہ کی تیاری

ہندوستان کی لڑائی کے بعد سے انگریز لوگ ہندوستان کے تھوڑے تھوڑے حصہ کو فتح کرتے گئے اور اپنا راج کھانا کرتے گئے۔ اپنی سہولتوں اور پالیسی کے مطابق انہوں نے ہندو کھانا سہولتوں سے پہلے کبھی کسی سہولتوں میں سے کچھ نہیں ہوئی۔ یہ ضروری ہے کہ اگر سہولتوں میں سرکار سے کم سے کم مدد لی جائے اور سارا بوجھ اس صورت پر ضلع کی بھودان کمیٹی (جہاں سہولتوں ہو) برداشت کرے اور اس علاقہ کی جگہ کا زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کیا جائے۔

ہندوستان کے نئے نقشہ کی تیاری

ہندوستان کی لڑائی کے بعد سے انگریز لوگ ہندوستان کے تھوڑے تھوڑے حصہ کو فتح کرتے گئے اور اپنا راج کھانا کرتے گئے۔ اپنی سہولتوں اور پالیسی کے مطابق انہوں نے ہندو کھانا سہولتوں سے پہلے کبھی کسی سہولتوں میں سے کچھ نہیں ہوئی۔ یہ ضروری ہے کہ اگر سہولتوں میں سرکار سے کم سے کم مدد لی جائے اور سارا بوجھ اس صورت پر ضلع کی بھودان کمیٹی (جہاں سہولتوں ہو) برداشت کرے اور اس علاقہ کی جگہ کا زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کیا جائے۔

'54 WPA

کیا کہ اس میں کافی نوجوان اٹھیں گے۔ اسی وقت 500 سے زائد لوگ آ گئے جن میں صدر کے اسرار پر چہ پرکاش بابو نے پورے کر لیا۔ اس طرح دوسرے دن کا آدھا وقت اس کام میں لگا۔

سمیلی کی آخری ہفتک دوسرے پھر کو ہوئی۔ اس میں پہلے تو پچھلے دن کی وہاں ہفتکوں کی کارروائی کا چھوڑ دیا گیا۔ پھر سہیلی کا خاص ٹھہراؤ— اور ایک ہی ٹھہراؤ— دروسوا ملک کے ملتی شری شکر راؤ جی دیو نے رکھا۔ اس ٹھہراؤ میں کہا گیا کہ کسی نہ کسی طرح دھن کا اٹکوا پورا کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے، آج جائداد اور مالکی کے بارے میں جو خیال سماج پر حاوی ہے اسے ہم جو مول سے بدلنا چاہتے ہیں۔ اس معنی میں ہوجی دان ہمارے آئینک انقلاب کا پہلا قدم ہے۔ ہمیں اُسود ہے اور یقین ہے کہ سماج میں نئے پیمانے قائم کرنے کی تمنا رکھنے والے سبھی بھائی بہن اس انقلابی اور جانبداری کے تجربہ کے لئے ایسا جہون دان دیں گے اور اسے جلدی ہی کامیاب بنائے گا۔ آپ کو کھدائی لگے۔

ٹھہراؤ پچھلے دن کے بعد شری شکر راؤ کی تقریر ہوئی جس میں انہوں نے کہا کہ ہودہ لگا سہیلی کا سندیسی یہی ہے کہ جہون ہی ایک یکہ ہے۔ اس بچے قائد راجندر پرشاد بھی آ گئے تھے۔ شکر راؤ جی کے بعد ان کا بھائی ہوا جس میں انہوں نے پچھلے دن سال میں ہودان یکہ کے کارن دیسی میں جو جاگرتی ہوتا ہوئی ہے اس پر سندیسی ظاہر کیا۔ انہوں نے یقین دکھایا کہ اس طرح کی مضبوط ہمدانوں پر جو ہودت ہلے گا وہ خود بحال اور ہائے دار ہوگا۔

اب سہیلی کا آخری پروگرام—ملت ونوبا کا پروگرام— انہوں نے آجاریہ کرپانی کی دی ہوئی چھٹاوتی پر سب کا دھوان کھینچا اور کہا کہ جہون دان کرنے کے معنی میں جہون شدھی کا فاصلہ۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں 'دھرم' اور 'پریم دھرم' میں تمیز کرنا چاہئے۔ دھرم لچھا ہوتا ہوئے بھی پریم دھرم میں لگنا چاہئے۔ انہوں نے آجاریہ کرپانی کی اس بات پر بھی دھاندلی ظاہر کی کہ راجدھنی کے قاہر میں ہونی چاہئے اور موجودہ سماجی نظام کو بدلنا چاہئے۔ مگر 'ونوبا جی ہولے' میں کہتا ہوں کہ طاقت ہمارے ہاتھ میں لہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، طاقت ہمارے کہنے میں رہے تو کافی ہے۔ پھر ہاتھ میں طاقت لہنے کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح طاقت کے ہمارے کو ہی لکر طاقت پر ادھکار کر سکتے ہیں تو طاقت ہاتھ میں لہنے کا سلیمت کون اٹھاتا۔ اس لئے جو انقلاب یا راجدھنی ہم چاہتے ہیں وہ ہلنا تکلیف کے لئے ہی ہوئی۔ ہم چاہتے ہیں کہ کرپانی

کیا کہ اس میں کافی نوجوان اٹھیں گے۔ اسی وقت 500 سے زائد لوگ آ گئے جن میں صدر کے اسرار پر چہ پرکاش بابو نے پورے کر لیا۔ اس طرح دوسرے دن کا آدھا وقت اس کام میں لگا۔

سمیلی کی آخری ہفتک دوسرے پھر کو ہوئی۔ اس میں پہلے تو پچھلے دن کی وہاں ہفتکوں کی کارروائی کا چھوڑ دیا گیا۔ پھر سہیلی کا خاص ٹھہراؤ— اور ایک ہی ٹھہراؤ— دروسوا ملک کے ملتی شری شکر راؤ جی دیو نے رکھا۔ اس ٹھہراؤ میں کہا گیا کہ کسی نہ کسی طرح دھن کا اٹکوا پورا کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے، آج جائداد اور مالکی کے بارے میں جو خیال سماج پر حاوی ہے اسے ہم جو مول سے بدلنا چاہتے ہیں۔ اس معنی میں ہوجی دان ہمارے آئینک انقلاب کا پہلا قدم ہے۔ ہمیں اُسود ہے اور یقین ہے کہ سماج میں نئے پیمانے قائم کرنے کی تمنا رکھنے والے سبھی بھائی بہن اس انقلابی اور جانبداری کے تجربہ کے لئے ایسا جہون دان دیں گے اور اسے جلدی ہی کامیاب بنائے گا۔ آپ کو کھدائی لگے۔

ٹھہراؤ پچھلے دن کے بعد شری شکر راؤ کی تقریر ہوئی جس میں انہوں نے کہا کہ ہودہ لگا سہیلی کا سندیسی یہی ہے کہ جہون ہی ایک یکہ ہے۔ اس بچے قائد راجندر پرشاد بھی آ گئے تھے۔ شکر راؤ جی کے بعد ان کا بھائی ہوا جس میں انہوں نے پچھلے دن سال میں ہودان یکہ کے کارن دیسی میں جو جاگرتی ہوتا ہوئی ہے اس پر سندیسی ظاہر کیا۔ انہوں نے یقین دکھایا کہ اس طرح کی مضبوط ہمدانوں پر جو ہودت ہلے گا وہ خود بحال اور ہائے دار ہوگا۔

اب سہیلی کا آخری پروگرام—ملت ونوبا کا پروگرام— انہوں نے آجاریہ کرپانی کی دی ہوئی چھٹاوتی پر سب کا دھوان کھینچا اور کہا کہ جہون دان کرنے کے معنی میں جہون شدھی کا فاصلہ۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں 'دھرم' اور 'پریم دھرم' میں تمیز کرنا چاہئے۔ دھرم لچھا ہوتا ہوئے بھی پریم دھرم میں لگنا چاہئے۔ انہوں نے آجاریہ کرپانی کی اس بات پر بھی دھاندلی ظاہر کی کہ راجدھنی کے قاہر میں ہونی چاہئے اور موجودہ سماجی نظام کو بدلنا چاہئے۔ مگر 'ونوبا جی ہولے' میں کہتا ہوں کہ طاقت ہمارے ہاتھ میں لہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، طاقت ہمارے کہنے میں رہے تو کافی ہے۔ پھر ہاتھ میں طاقت لہنے کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح طاقت کے ہمارے کو ہی لکر طاقت پر ادھکار کر سکتے ہیں تو طاقت ہاتھ میں لہنے کا سلیمت کون اٹھاتا۔ اس لئے جو انقلاب یا راجدھنی ہم چاہتے ہیں وہ ہلنا تکلیف کے لئے ہی ہوئی۔ ہم چاہتے ہیں کہ کرپانی

دھڑے کا جیون سندر و ہاک بلکا اور لکے لکے کارکن ہی انہیں ملے۔ آخر میں وہاں جی نے دعا کی کہ ہم سب جہ پرکاشی باہو کی طرح یکے بعد دیگرے والے ہوں۔

ان دنوں تقریبوں سے سہیل میں نئی جلیں آگئی۔ وہاں کی ہوا میں ہی مانو فرق آگیا۔ اس دن پرارتھنا کے بعد آجاریہ کرپانی کی اسٹیج ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ صرف پانچ کروڑ ایکڑ زمین جمع کرنے اور ہانت دینے سے کام نہیں چلتے والا ہے، راجستھان کو بھی اہلانا ہوگا یا اچے قابو میں کرنا ہوگا، ایسی چندتاویں انہوں نے دی۔ ہری جہ پرکاش کے فیصلہ کی تعریف کرتے ہوئے وہ بولے کہ مجھے یہی لالچ ہوا مگر میں نے کہا کہ ہرولیسر ہرے ہندو فیس ہے، میل ہے، انکو ختم کرنا چاہیئے کہونکہ دان اچھی چیز کا ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا قدم اٹھانے کے پہلے ہم کو ایسی من مٹاؤ، املکھن دھڑے متا دیلا چاہیئے۔

دوسرے دن 20 اپریل کو وہ ہوٹل جاسکا کبھی گمان ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ صبح کے وقت ونوبا جی نے ہری جہ پرکاش کو ایک خط بھیجا۔ وہ یہ تھا :—

”ہری جہ پرکاش“

کل آپ نے جو آواہن کیا تھا اس کے جواب میں ہودان یکہ مولک، ادھوک پردھان اہلسانک کرانتی کے لیے مہرا جہون سمریت ہے۔

—ونوبا—

اس خط کو پانچ کون دنگ نہیں رہ جائیگا اور کون صحت کرے گا کہ اسے اپنے پاس رکھے؟ جہ پرکاشی باہو نے سہیل کی صدر آشا بہن کو ایک چٹھی لکھی—

”بابا کا ایک پتر آیا ہے جو ساتھ بھیج دیا میں۔ چلوں نے ہم سب کو پرہیز کیا ہے وہی مجھے جیسے ناچھوڑ کر جہون دان کریں، اس پر کچھ کہا نہیں جاتا۔ اتنا ہی کہونگا کہ اس اصول دان کو جو پیکر کر سکیں اس کے ایک دم ناقابل ہوں۔ ہمیں تو جہون دان بہکوان کے نام پر بابا کو ہی کرنا ہے۔“

آشا بہن نے یہ دونوں خط سہیل میں پڑھ کر سنا۔ پھر کہا تھا۔ مانو جہون دان کی لکھا یہ نکلی۔ ہرے گلے سے آشا بہن نے کہا کہ مہرا پورا جہون اس کام کے لئے سمریت ہے۔ پھر لاؤں اسے پھر ہری دھڑیلندر بھائی آگے۔ انہوں نے کہا کہ کچھ کھراہمت کے ساتھ میں بھی اپنا جہون دان کرنا ہوں۔ کھراہمت اس لئے کہ جہون دان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زمین مانگنے کا کام ہڈی سے چلوتا بلکہ یہ کہ ہم سماج میں نئے تصانیف پہنچانے قائم کریں گے۔ انہوں نے یہاں ہمارے

تیسرے دن، بیس اپریل کو وہ ہو گیا جسکا کبھی گمان ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ صبح کے وقت ونوبا جی نے جی جی پرکاش جی کو ایک خط بھیجا۔ وہ یہ تھا :—

”جی جی پرکاش“

کلا آپ نے جو آواہن کیا تھا اس کے جواب میں ہودان یکہ مولک و پوجا प्रधान اہلسانک کرانتی کے لیے مہرا جہون سمریت ہے۔

—ونوبا—

اس خط کو پانچ کون دنگ نہیں رہ جائیگا اور کون صحت کرے گا کہ اسے اپنے پاس رکھے؟ جی جی پرکاش جی نے سہیل کی صدر آشا بہن کو ایک چٹھی لکھی—

”بابا کا ایک پتر آیا ہے جو ساتھ بھیج دیا میں۔ چلوں نے ہم سب کو پرہیز کیا ہے وہی مجھے جیسے ناچھوڑ کر جہون دان کریں، اس پر کچھ کہا نہیں جاتا۔ اتنا ہی کہونگا کہ اس اصول دان کو جو پیکر کر سکیں اس کے ایک دم ناقابل ہوں۔ ہمیں تو جہون دان بہکوان کے نام پر بابا کو ہی کرنا ہے۔“

آشا بہن نے یہ دونوں خط سہیل میں پڑھ کر سنا۔ پھر کہا تھا۔ مانو جہون دان کی لکھا یہ نکلی۔ ہرے گلے سے آشا بہن نے کہا کہ مہرا پورا جہون اس کام کے لیے سمریت ہے۔ پھر لاؤں اسے پھر ہری دھڑیلندر بھائی آگے۔ انہوں نے کہا کہ کچھ کھراہمت کے ساتھ میں بھی اپنا جہون دان کرنا ہوں۔ کھراہمت اس لئے کہ جہون دان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زمین مانگنے کا کام ہڈی سے چلوتا بلکہ یہ کہ ہم سماج میں نئے تصانیف پہنچانے قائم کریں گے۔ انہوں نے یہاں ہمارے

شام کی پراگشیا کے بعد اپنے ہر چہ میں ونہا جی نے لہجہ کیا کہ جو ہوں بہودان یکہ میں زمون کا دان نہیں کرتا وہ "دیہی دروہی" (غدار) ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہار میں جگتے بھی بہوسی دان میں چہوتے یا ہوتے آئے ہی دان پھر مجھے چاہئے۔

دوسرے دن صبح کے وقت الگ الگ وبہاگوں میں بہودان یکہ کے مختلف پہلوؤں پر چرچہ ہوئی۔ (1) بہودان تصریک زیادہ وبہاگ کہہ سکتے؟ (2) زمون کے بتوازے کا سوال (3) کام کرنے والوں کی ٹریننگ (4) সম্পتی دان یجہ اور ساخن دان، اور (5) گاں رचना اور نہی تالیم۔ دہرہ کے ہجلاس میں کچھ سبوں کے بہودان संबोजकों (کنوینروں) نے اپنے اپنے یहां کے کام پر روشنی ڈالی۔ سب سے دلچسپ چیخ یی مंगरौठ गांव की नई चिन्वगी की कहानी۔ یاد رہے کہ मंगरौठ उत्तर प्रदेश के हमीरपुर जिले में है और हिन्दुस्तान का पहला गांव है जिसके रहने वालों ने अपनी सारी जमीन सन्त विनोबा को दान में दे दी۔ आजकल मंगरौठ का काम बहां के 16 आदिमियों से बना सर्वोदय मन्डल देख रहा है۔ इस मन्डल के सभी (16) मेम्बर सम्मेलन के सामने हाजिर हुं۔ सुबाजाती हाल के बाद सम्मेलन की सबसे खास घटना हुई श्री जयप्रकाश बाबू की स्पीच۔

बिहार सुबे के बशिन्दा होने के नाते श्री जैप्रकाश जी ने इस बात पर दुख जाहिर किया कि बिहार में अब तक भी बाबा (विनोबा जी) की 32 लाख एकड़ की मांग को पूरा नहीं किया। बिहार यह काम कर सकता था मगर स्वासी पार्टियों के कारकुन कांग्रेस हो या प्रजा समाज-वादी—पूरी लगन के साथ इसमें नहीं जुटे۔ उन्होंने कहा कि इस आन्दोलन में मेरी श्रद्धा दिन दिन बढ़ती जा रही है۔ क्रान्ति विल जोड़ने में एकदम असमर्थ है। मगर फिर कौन ऐसी पार्टी है जो यह क्रान्ति बना सके कि जमीन पर अब निजी मिस्त्रियत न किसी फँ की रहेगी न सरकार की? उन्होंने संगीन हो कर कहा कि वज्रत था गया है जब हम लोगों को इस काम में अपना पूरा जीवन लगा देना चाहिये। अब एक बरस नहीं, पांच बरस नहीं, जीवन दान का सवाल है! मेरा सौभाग्य है कि इन जीवन दानियों की सूची में पहला नाम मैं अपना लिखा रहा हूँ।

बहुत ही गम्भीर और शान्त आवाज में विनोबा जी बोले कि अभी जो स्पीच हुई वह मानो एक दिल बोल रहा था۔ उन्होंने यकीन जाहिर किया कि भूदान यज्ञ की तहरीक कामयाब होते होते कितने के ही जीवन में फेर बदल कर उन्हें कामयाब बनावगी। विनोबा जी बोले कि अगर तामीरी काम करने वाले या गांधी वाले प्रेम से, चौके दिसारा और खुले दिल से काम करें तो एक

हम کو پراگشیا کے بعد اپنے ہر چہ میں ونہا جی نے لہجہ کیا کہ جو ہوں بہودان یکہ میں زمون کا دان نہیں کرتا وہ "دیہی دروہی" (غدار) ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہار میں جگتے بھی بہوسی دان میں چہوتے یا ہوتے آئے ہی دان پھر مجھے چاہئے۔

دوسرے دن صبح کے وقت الگ الگ وبہاگوں میں بہودان یکہ کے مختلف پہلوؤں پر چرچہ ہوئی۔ (1) بہودان تصریک زیادہ وبہاگ کہہ سکتے؟ (2) زمون کے بتوازے کا سوال (3) کام کرنے والوں کی ٹریننگ (4) سمپتی دان یکہ اور سادھن دان، اور (5) گاؤں رچنا اور نئی تعلیم۔ دو پھر کے اجلاس میں کچھ صوبوں کے بہودان سٹوڈنٹوں (کلیڈروں) نے اپنے اپنے یہاں کے کام پر روشنی ڈالی۔ سب سے دلچسپ چہوتے تھی سٹوڈنٹ گاؤں کی نئی زندگی کی کہانی۔ یاد رہے کہ سٹوڈنٹ اُنپروڈیٹ کے ہمبرپور ضلع میں ہے اور ہندوستان کا پہلا گاؤں ہے جس کے رہنے والوں نے اپنی ساری زمون سلنت ونہا کو دان میں دے دی۔ آجکل سٹوڈنٹ کا کام وہاں کے سولہ آدمیوں سے بنا سرورڈے منڈل دیکھ رہا ہے۔ اس منڈل کے سبھی (16) ممبر سمولن کے سامنے حاضر ہوئے۔ صوبہ جاتی حال کے بعد سمولن کی سب سے خاص گفتگو ہوئی تھی جہ پرکاش بابو کی اسٹیج۔

بہار صوبہ کے باہلندہ ہونے کے ناتے تھی جہ پرکاش جی نے اس بات پر دکھ ظاہر کیا کہ بہار میں اب تک بھی بابا (ونہا جی) کی 32 لاکھ ایکڑ کی مانگ کو پورا نہیں کیا۔ بہار یہ کام کر سکتا تھا مگر سیاسی پارٹیوں کے کارکن —کانگریسی ہوں یا پرچا سماج وادی—پوری لگن کے ساتھ اس میں نہیں جگتے۔ انہوں نے کہا کہ اس آندولن میں مہری شردھا دن دن ہوتی جارہی ہے۔ قانون دل چڑانے میں ایکدم آسرتہ ہے۔ پھر کون پارتی ایسی ہے جو یہ قانون بنا سکے کہ زمون پر اب نجی ملکیت نہ کسی فرد کی دھکی نہ سرکار کی؟ انہوں نے سلکھن ہوکر کہا کہ وقت آگیا ہے جب ہم لوگوں کو اس کام میں اپنا پورا جھون لگا دینا چاہئے۔ اب ایک برس نہیں، پانچ برس نہیں، چھون دان کا سوال ہے! مہرا سوہاگہ ہے کہ اس جھون دانوں کی سوچی میں پہلا نام میں اپنا لکھا رہا ہوں۔

بہت ہی کمبہر اور شانت آواز میں ونہا جی بولے کہ ابھی جو اسٹیج ہوئی وہ مانو ایک دل بول رہا تھا۔ انہوں نے یقین ظاہر کیا کہ بہودان یکہ کی تصریک کامیاب ہوتے ہوئے کتوں کے ہی جھون میں پھر بدل کر انہیں کامیاب بنائیں گی۔ ونہا جی بولے کہ اگر تصیری کام کرنے والے یا گندھی والے ہم سے چڑھے دماغ اور کھلے دل سے کام کریں تو ایک

अपनी पहली तक्रार में जो तारीख 18 को सेप्टर के व्रत हुई विनोबा जी ने पण्डित नेहरू के आगे मानो यह पद संवाल पेश किये :

2—पिछले तीन बरस में मुल्क के अन्दर एक नई हवा

3—जिस तरह इंग्लैंड में हर किसी को तैरना व बोटिंग

पण्डित जवाहरलाल ने अपने तरीके से जवाब देते हुये

पण्डित जवाहर लाल के बाद राधा कुरनन ने कहा

خیال ہے کہ کچھ کمونسٹ بھائی بھی موجود تھے مگر انہوں نے کوئی نمایاں حصہ نہ لیا۔ سیمپل کی صداقت شرمیلی اٹھا دیوی آزاد ناپکم نے کی۔

اپنی پہلی تقریر میں جو تاریخ 18 کوسہ پہر کے وقت ہوئی ونوبا جو نے بلڈت نہرو کے آگے مانو یہ چند سوال بھی لگے :

1—کھا ملکر کام کرنے کے لئے آفیس چاہئے ہی،
 کھا موجودہ عہدستان میں جو بے شمار بھوت بھاؤ ہیں وہ
 کافی آرت نہیں ہیں؟ چناؤ کے کارن جانی بھوت مضبوط
 ہو رہے ہیں۔ سمجھدار لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ اس
 میں کھا ترمیم کی جائے۔

2- پچھلے تین برس میں ملک کے اندر ایک نئی ہوا بھار ہوئی ہے جس کے اندر زمین کی مالکی کسی ایک شخص کی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ جو وہی طاقت ہو، چاہے دولت کی شکل میں، چاہے کسی شکل میں، اسکا اپہوک سب کے لئے ہونا چاہئے۔ جو وہی زمین پر مملکت کرنے کی تھاری دیکھتا ہے اسے زمین ملی ہی چاہئے جسے کہ پیسے کو پانی۔

3—جس طرح انگلینڈ میں ہر کسی کو لہرنا و ہولنگ آنا ہے اسی طرح ہندوستان میں ہر کسی کو سوت کالنا آنا چاہئے۔ یہ سوال بعض اُرتھک و ساماجک مہم نہیں بلکہ دیہی کی دکھا کا سوال ہے۔

ملفوظات خواجہ راج نے اپنے طریقہ سے جواب دیجئے ہوئے تھا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جانتا ہوں رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پیچھے سوال ہے جس کا واسطہ و دعائے ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بیہودان یگہہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک معجب و فریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا روپ بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ذرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بولے کہ ضرور اس سے فریبوں کو مدد پہنچتی ہے۔ لیکن آج نے زمانہ میں سائنس فی کموجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ملکیت جواہرِ دل کے بعد قائم و ادا کرشن نے کہا کہ ہودان سے اس ملک کے دیہاتوں میں انقلاب اُٹھتا اور ساتھ ہی ساتھ ایس کی چھوچھوت و بھد بھاؤ دور ہونگے۔ انہوں نے بتایا کہ اُسچ نہیچ یا چھوچھوت کے فرق رکھنے کے معنی ہیں انسان کی شان و شانِ مہینا پر چھوٹ کرنا جو ایک پانی ہے اور کسی دھرم میں جایز نہیں کہا گیا ہے۔ دھرم وہی ہے جو سماج کو جوڑتا ہے اور ادھرم وہ جو اس کے ٹکڑے کرے۔

اس سہیلی پر نظر قائم ہے پہلے پچھلے دو سہیلیوں پر کچھ تھوڑی سی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ بہودان تصدیق کی ضرورت 18 اپریل سن 1951 کو ہوئی جب حیدرآباد ریاست کے تھلکانہ نام کے علاقہ کے کوچہیلی گاؤں میں ونوبا جی کی 80 ایکڑ کی مانگ پر 100 ایکڑ زمین ملی۔ تقریب ایک سال تک ونوبا جی اگاہی ہی اس تصدیق کو چلاتے رہے اور جب لگ بھگ ایک لاکھ ایکڑ زمین انہیں مل گئی تو اپریل سن 1952 میں مہوا پوری (بھارم) میں ہونے والے چوتھے سرورڈے سہیلی میں سرورڈوا سنگھ نے اس کام کو باضابطہ اپنایا اور سرورڈے سہیلیوں نے یہ یون کیا کہ دو سال کے اندر کم سے کم 25 لاکھ ایکڑ زمین جمع کریں گے۔ اس کے بعد مارچ سن 1953 میں چاندل (بھارم) میں ہونے والے پانچویں سہیلی میں یہ چھوڑ ظاہر کی گئی کہ بہودان یکمہ کا مقصد دیہات دیہات گرام راج قائم کرنا ہے جس کے لئے موجودہ حالت میں پھر بدل ضروری ہوگا، یعنی آج جو سہیلی و مائی طاقت و دولت ایک ایک جگہ جمع ہے اسکو بانٹ بانٹ کر گاؤں گاؤں پہنچانا ہوگا۔ ونوبا جی نے صاف صاف اعلان کیا کہ ہمیں آزاد چن سکتی (عوام کی طاقت)۔ ہمیں کرنی ہوئی جو فوجی یا مذہبی شکتی کے خلاف ہوگی اور قانونی یا سرکاری شکتی سے علیحدہ ہوگی۔ اس دو سال کے اندر بہودان آندولن ملک کے اندر تیزی کے ساتھ پھیلے اور 2,37,022 داتاؤں سے 28,15,101 ایکڑ زمین حاصل ہوئی۔ اسکا مطلب ہے کہ سرچنگھار کی پرنسپل سے سہولتوں کا سہولت پورا ہوا اور تقریباً نو کروڑ لوگوں تک بہودان یکمہ کا سندھیں پہنچ گیا۔

ظاہر ہے کہ بہودا گیا سہیلی پر سرورڈے سماج کو اب آگے قدم رکھنا تھا اور ملک کے سامنے نئی تعمیر کا نقشہ پیش کرنا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سہیلی میں یہی کام ہوا اور قانونی تقریریں یا غیر ضروری ٹھہراؤ وغیرہ طبعی نہ ہوئے۔ اس سہیلی میں پہلے دن 'تاریخ 18 کو' پلنگت جواہر لال نہرو اور قائد راجندر گروہل نے شرکت کی۔ ان دونوں مہمانوں نے سہیلی میں تقریر کی اور پھر شام کو پراوتھما کے بعد ایک بڑے ہجوم کے سامنے بھی ونوبا جی کے پروجیکٹ کے بعد پلنگت جی کی اسٹیج ہوئی۔ تاریخ 19 کو آجادیہ کرپانی شریک ہوئے اور 20 تاریخ کو راجندر پتی، قائد راجندر، پرمہاد۔ ان کے علاوہ کانگریس پارٹی کے بہت سے کارکن و منسٹر (مرکزی و صوبائی) ہادی شریف لاکھ جملوں نے مختلف چرچوں میں حصہ لیا اور اس طرح پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نمائندوں نے بھی۔ ہمارا

آجادیہ کرپانی شریک ہوئے اور 20 تاریخ کو راجندر پتی، قائد راجندر، پرمہاد۔ ان کے علاوہ کانگریس پارٹی کے بہت سے کارکن و منسٹر (مرکزی و صوبائی) ہادی شریف لاکھ جملوں نے مختلف چرچوں میں حصہ لیا اور اس طرح پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نمائندوں نے بھی۔ ہمارا

آجادیہ کرپانی شریک ہوئے اور 20 تاریخ کو راجندر پتی، قائد راجندر، پرمہاد۔ ان کے علاوہ کانگریس پارٹی کے بہت سے کارکن و منسٹر (مرکزی و صوبائی) ہادی شریف لاکھ جملوں نے مختلف چرچوں میں حصہ لیا اور اس طرح پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نمائندوں نے بھی۔ ہمارا

कभी भी, किसी क्रिमच पर भी, हिन्दुस्तान की न छुटने देना चाहेंगे और न उसकी छूट में शरीक होंगे.

नई दिल्ली के नज़्ज़ारख़ाने में हमारी जैसी तृती की आवाज़ हरगिज़ सुनाई नहीं पड़ सकती. मगर हम यह कहना अपना कर्ष समझते हैं कि अज़्ज़र “इन्डिया लिमिटेड” का ख़्याल हमारे फ़ाइनेन्स मिनिस्टर के दिल में धर कर गया है तो यह बड़े अफ़सोस और दुःख और फ़िक्र की बात है. पार्लियामेन्ट के किसी भी मेम्बर को इस ख़्याल में कोई भी तकलीफ़ न पहुँचना और सबका उसे चुप चाप ग़वारा कर लेना और भी ज़्यादा क़र्बनाक बात है. क्या नई दिल्ली की हवा हमें सुन्न बनाती बली जा रही है? किधर ले जायगा हमारे मुल्क को यह पार्लियामेन्टरी निज़ाम, यह सियासत और यह पारटो-बाज़ी, यह बिज़ायतियों की नज़्ज़ल? बिस्वाशक, जैसा महात्मा गांधी ने “हिन्दू स्वराज्य” में कहा है, ख़ातमा व मोत की तरफ़.

हम नम्रता के साथ चेतावनी देना चाहते हैं कि “इन्डिया लिमिटेड” का कारोबार जोर शोर से जारी है और भारत माता की मिट्टी पत्नी की जा रही है. हमारे आँखा से आँखा दुष्काम जैसे फ्राइनेन्स मिनिस्टर इसमें कंधा लगा रहे हैं. यह राक्षसी कब तक चलेगी ? हिन्दुस्तान की जनता को यह कभी बरदाश्त न होगा.

23. 5. '54

—सुरेश रामभाई

کبھی بھی، کسی قوم پر بھی، ملحدستان کو نہ لگے دھڑکا
چاہیں گے اور نہ اسکی لپٹ میں ہریک ہونگے۔

نئی دلی کے نقارخانے میں ہماری چھٹی طوطی
کی آواز ہرگز سنائی نہیں دے سکتی۔ مگر ہم یہ کہنا
اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اگر "انڈیا لمیٹڈ" کا خیال
ہمارے فائننس منسٹر کے دل میں گھر کر گیا ہے تو یہ
بڑے افسوس اور دہہ اور فکر کی بات ہے۔ پارلیامنٹ کے
کسی بھی ممبر کو اس خیال پر کوئی تکلیف نہ
پہونچنا اور سب کا اسے چپ چاپ گوارا کر لینا اور بھی
زیادہ دردناک بات ہے۔ کیا نئی دلی کی ہوا ہمیں سن
بلاتی چلی جا رہی ہے؟ کدھر لے جائیگا ہمارے ملک
کو یہ پارلیامنٹری نظام؟ یہ سیاست اور یہ پارٹی بازی
یہ ولیتوں کی نقل؟ بلشک، جیسا سپانٹا گاندھی نے
"ہلڈ سوراج" میں کہا ہے، خاتمہ و موت کی طرف۔

ہم نمبرنا کے ساتھ چھتارنی دیلا جاتے ہیں کہ
 "ایڈیا لہوہ" کا کاروبار زور شور سے جاری ہے اور بھارت
 مانا کی مٹی پلہد کی جا رہی ہے۔ ہمارے اہلی سے اہلی
 حکم جوسہ فائہلس ماسٹر اس میں کدھا لگا رہ
 ہوں۔ یہ ہداری کب تک چلےگی؟ ہندستان کی
 چلتا کو یہ کہی ہوا اہت نہ ہوگا۔

— سدیش دام بھائی

23 . 5 . '54

बौद्ध गया सम्मेलन पर एक नज़र

अग्रैक महिने की तारीख 18, 19 और 20 को गया जिले के सरनाम मुक़ाम बौद्ध गया में सर्वोदय समाज का छठा साखाना जल्सा या सम्मेलन हुआ। यह सम्मेलन पिछले पाँचों सम्मेलनों के मुक़ाबले ज्यादा खिन्ना, खोरदार और जानदार था। ऐसा होना क्रूरती है और हमें हमीद है कि आगे के सम्मेलन इससे भी बढ़ बढ़ कर होंगे क्योंकि सन्त बिनोबा का भूदान यह आन्दोलन एक खिन्ना आन्दोलन है जो मुल्क की सोई हुई ताक़तों को जगा रहा है, समाज के दबे हुये हिस्सों को उभार रहा है और हर किसी को सोचने और अपनी जगह से हरकत करने के लिये मजबूर कर रहा है। इसलिये इसमें दिन दिन नये नये कारकुन आ रहे हैं और जब तक यह भूदान तहरीक खिन्ना तहरीक रहती है तब तक हर सर्वोदय सम्मेलन मुल्क की जनता को अपने मक़सद की तरफ बढ़ने की मन्त्रिण में मील के एक एक पत्थर की तरह साबित होगा।

بودہ گیا سمیلن پر ایک نظر

اپریل مہینے کی تاریخ 18، 19 اور 20 کو گہا ضلع کے
 ہر نام مقام پر وہ گہا میں سرورے سماج کا چھٹا سالانہ
 جلسہ یا سہماں ہوا۔ یہ سہماں چھلے پانچویں سہماں
 کے مقابلہ زیادہ 'زندہ' زوردار اور جاندار تھا۔ ایسا ہونا
 قدرتی ہے اور ہمیں اُسدھے کہ آئے کے سہماں اس سے
 پہلی وہ چوہ کر ہوئے کیونکہ سلامت ونوبا کا بہودان
 یگانہ آندولن ایک زندہ آندولن ہے جو ملک کی سوائی
 ہوئی طاقتوں کو جکا رہا ہے، سماج کے دیے ہوئے حصوں
 کو ابھار رہا ہے اور ہر کسی کو سوچنے سمجھنے اور پرانی
 جگہ سے حرکت کرنے پر لگے مہمور کر رہا ہے۔ اس لئے
 اسی دن دن نئے کارکن آ رہے ہوں اور جب تک یہ
 بہودان تحریک زندہ تحریک رہتی ہے تب تک ہر
 سرورے سہماں ملک کی چلتا کا اچھے مقصد کی طرف پروانے
 کی منزل میں مہل کے ایک ایک پتھر کی طرح ٹاہتا
 رہتا ہے۔

جس سے یہاں کی شہریوں کو یہ محسوس کر سکتی ہے کہ وہ بھی اس ملک کے کاروبار یعنی "انڈیا لیمیٹڈ" میں شریک ہے!

ہمیں دیکھنا اور جاننا ہے کہ کرائسٹس مینسٹر کے اس واقعہ پر پارلیامینٹ کے کسی بھی ممبر نے اس وقت اس پر غور کیا۔ کون نہیں جانتا کہ "انڈیا لیمیٹڈ" کے خیال کے پیچھے ہندوستان کی لڑائی اور تباہی کی کہانی بھری پڑی ہے۔ آج بھی "انڈیا لیمیٹڈ" کے نام سے ہندوستان میں انگریزوں اور دوسری ولایت والوں کے انہیں کارخانے اور دکانیں ہیں جن کی بدولت ہندوستان کے رہنے والے ادھوک دھندے میں رہ رہ کر ہیں اور یہاں کی بھی کھیتی بولت باہر چلی جا رہی ہے۔ اور جب تک "انڈیا لیمیٹڈ" نام کا کاروبار اس ملک میں چلتا ہے یہاں کے آدمی کو سر اٹھانے کے لئے موقع نہیں ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ آزاد سرکار کی یہ کوشش ہوئی کہ یہ "انڈیا لیمیٹڈ" کا دھندا اس ملک سے اٹھ جائے۔ مگر فائنلس مینسٹر کی بات سے ایسا لگتا ہے کہ یہ دھندا اور بھی گہری جڑیں پکڑ رہا ہے اور فائنلس مینسٹر اس میں پورا زور لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان دن دن زیادہ ویران ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے یہاں کے غریب لوگوں کے ساتھ زیادہ غریب اور امیر زیادہ امیر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے کرائسٹس مینسٹر جی چنتامان دیشمکھ پورائے آر۔ سی۔ ایس۔ ہیں اور انگریزی زبان میں آج بھی انہیں جگہوں پر رونق پاتے تھے۔ قدرتی طور پر ان کی نس نس میں انگریزی حکومت یعنی انڈیا لیمیٹڈ کی کلدہ سمانی ہوئی ہے اور وہ انگریزی آرٹیک قہارچہ کی ایک زبردست بددعا ہے۔ یہ لوگ ہی نہیں بلکہ اسکی پختہ بددعاوار ہیں۔ لہذا وہ ہر چہ انگریزی چشمہ سے دیکھتے ہیں اور یہ اس لحاظ کے کہ ہندوستان کی سرزمین کیا چاہتی ہے انگریزی طرز و لوت کو وہ اس دیکھ میں ہوں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تصویر انکا نہیں ہے اس تعلیم کا ہے جو انہوں نے پائی ہے اس ملازمت کا ہے جس میں وہ برسوں رہے اور اس چمک کا ہے جس نے انکی آنکھوں کو چوندھیا دیا ہے۔ خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی! آرٹیک معاملوں میں ہمارے پردھان مন্ত্রী بھی ان کے کئی ہم خیال ہیں۔

لیکن ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو جواہر لال نہرو سبھا میں "جے ہند" کی آواز بلند کرتے ہیں یا آزادی کے پہلے "بھارت ماتا کی جے" سے آسمان کو گونجتا کرتے تھے انہیں "انڈیا لیمیٹڈ" کا خیال ذرا بھی پردھان نہیں ہو سکتا تھا اور وہ

جس سے یہاں کی غریب چلتا ہے وہ محسوس کر سکتی ہے کہ وہ بھی اس ملک کے کاروبار یعنی "انڈیا لیمیٹڈ" میں شریک ہے!

ہمیں دیکھنا اور جاننا ہے کہ فائنلس مینسٹر کے اس لفظ پر پارلیامینٹ کے کسی بھی ممبر نے اس وقت اس پر غور کیا۔ کون نہیں جانتا کہ "انڈیا لیمیٹڈ" کے خیال کے پیچھے ہندوستان کی لڑائی اور تباہی کی کہانی بھری پڑی ہے۔ آج بھی "انڈیا لیمیٹڈ" کے نام سے ہندوستان میں انگریزوں اور دوسری ولایت والوں کے انہیں کارخانے اور دکانیں ہیں جن کی بدولت ہندوستان کے رہنے والے ادھوک دھندے میں رہ رہ کر ہیں اور یہاں کی بھی کھیتی بولت باہر چلی جا رہی ہے۔ اور جب تک "انڈیا لیمیٹڈ" نام کا کاروبار اس ملک میں چلتا ہے یہاں کے آدمی کو سر اٹھانے کے لئے موقع نہیں ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ آزاد سرکار کی یہ کوشش ہوئی کہ یہ "انڈیا لیمیٹڈ" کا دھندا اس ملک سے اٹھ جائے۔ مگر فائنلس مینسٹر کی بات سے ایسا لگتا ہے کہ یہ دھندا اور بھی گہری جڑیں پکڑ رہا ہے اور فائنلس مینسٹر اس میں پورا زور لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان دن دن زیادہ ویران ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے یہاں کے غریب لوگوں کے ساتھ زیادہ غریب اور امیر زیادہ امیر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے فائنلس مینسٹر جی چلتا من دیکھ کر براہ آئی۔ سی۔ ایس۔ ہیں اور انگریزی زبان میں آج بھی انہیں جگہوں پر رونق پاتے تھے۔ قدرتی طور پر ان کی نس نس میں انگریزی حکومت یعنی انڈیا لیمیٹڈ کی کلدہ سمانی ہوئی ہے اور وہ انگریزی آرٹیک قہارچہ کی ایک زبردست بددعا ہے۔ یہ لوگ ہی نہیں بلکہ اسکی پختہ بددعاوار ہیں۔ لہذا وہ ہر چہ انگریزی چشمہ سے دیکھتے ہیں اور یہ اس لحاظ کے کہ ہندوستان کی سرزمین کیا چاہتی ہے انگریزی طرز و لوت کو وہ اس دیکھ میں ہوں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تصویر انکا نہیں ہے اس تعلیم کا ہے جو انہوں نے پائی ہے اس ملازمت کا ہے جس میں وہ برسوں رہے اور اس چمک کا ہے جس نے انکی آنکھوں کو چوندھیا دیا ہے۔ خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی! آرٹیک معاملوں میں ہمارے پردھان مন্ত্রী بھی ان کے کئی ہم خیال ہیں۔

لیکن ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو جواہر لال نہرو سبھا میں "جے ہند" کی آواز بلند کرتے ہیں یا آزادی کے پہلے "بھارت ماتا کی جے" سے آسمان کو گونجتا کرتے تھے انہیں "انڈیا لیمیٹڈ" کا خیال ذرا بھی پردھان نہیں ہو سکتا تھا اور وہ

یہی چاہتے—ہمارے ساتھ یا ہندوستانی کلچر سوسائٹی کے ساتھ کون کی لگی ؟

اس وقت سے ہمیں ایک اور کچھ پرانی کہتا یاہ آگئی۔ ”بہکم سہتا“ نام کا جوڑ بھی ایک بار ہندوستانی کے حمایتیوں کے سر ملتا جا چکا ہے اور بھارت بھر میں گویا چکا ہے۔ ہم نے خوب پتہ لگانے کی کوشش کی۔ بہمت سے لوگوں سے پوچھا۔ اچھے سب سالہوں سے بھی پوچھا۔ جس ہندوستانی کہتی کے سر ”بہکم سہتا“ ملتا جا رہا تھا اس کے ایک ایک ممبر—بابو واجہندو پرشاد، ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر کالہکر، ڈاکٹر سہد مسعود اور سوچ پورا کے راجا راجندر من پرشادسلکھ—سب سے پوچھا۔ ہمیں کہیں بھی دیکھیں ہر مہوں کوئی ایسی کتاب نہ ملی جو کسی بھی ہندوستانی سہتا یا ہندوستانی کہتی کی نکلی یا منظور کی ہوئی ہو اور جس میں ”بہکم سہتا“ آتا ہو۔ اور اس کے بعد تو کہوں ”بہکم سہتا“ پر ہی گہاے والوں نے سلتو نہیں کہا۔ ہم نے اچھے کانوں سے ڈسوار ہندی پریموں کے منہ سے ”بادشاہ دھرتی“ ”شہزادہ لو“ اور ”مولوی وشیشہ“ بھی سنا ہے۔ دوسروں کو چوہانے کے لئے اپنی ناک کاٹنے والے ابھی دنیا سے مٹے نہیں اور ان میں سے کئی وہ لوگ ہوں جو کہلی سہتاؤں کے اندر نہ کہوں ”لڑ کر شہا“ ہی کہتے ہوں بلکہ اپنی دھرم پتلیوں کو ”لہدی آمک“ اور ”مسز آمک“ کہ کر پڑھتے کرتے ہیں !

ہم سوچنا کرتے ہیں کہ ہمارے شہدوں میں اب کلاہ اور کوڑا ہیں آئے لگا۔ اس لئے ہم اس نوٹ کو یہیں بلند کرتے ہیں۔ بہکوں ہم سب کو سوچتی ہیں کہ ہم سچائی، ایمانداری اور انصاف کو نگاہ میں رکھتے ہوئے شانتی اور پریم کے ساتھ چلتا کے ہمت میں بھاشا کے سوال اور دیہی کے اور۔ سب سوالوں پر وجہ کر سکیں اور ملکر چل سکیں۔

14. 5. '54

—سندھراجا

—سندھ لال

14. 5. '54

جے ہند یا ”انڈیا لیمیٹڈ“ ؟

ہماری پارلیامینٹ کے ہاؤس کے بجٹ اجلاس میں جب سرکار کی طرف سے لگنے والے نئے نئے ٹیکسوں پر چرچا چلی تو کچھ ممبران نے یہ کہا کہ انہوں نے بھی جو ٹیکس لگتے ہیں ان کا بہار دراصل فریبوں پر ہی ہوتا ہے اور پان، سہار، تمباکو جیسی ضرورت کی چیزوں پر ٹیکس تو سودہ ہی فریبوں کے تحت ہوتا ہے۔ یہاں جاتا ہے کہ اس پر ہمارے ٹانڈس منسٹر صاحب نے یہاں فریبوں پر ٹیکس لگنا ہی چاہئے اور انہیں یہ چھوڑ دیکھیں منظور کرنی چاہئے کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے

سے پراہنا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان شہدوں کی جگہ
 अधिक खपते हुए शब्द बतावें. अगर उन शब्दों के
 पीछे भी वही भाव होंगे और उनके बनाने में उन्हीं
 वस्त्वों से काम लिया गया होगा जिन से इस शब्दावली में
 लिखा गया है तो हम नये शब्दों को अपना लेंगे. यह भी
 ध्यान रखना होगा कि केवल हिन्दुस्तानी बोलने वाली
 जनता के सुभीते को ही नहीं देखना है, बल्कि हिन्दुस्तान
 भर में उस जनता के सुभीते को भी देखना है जो उसी
 परम्परा से निकले और बने दूसरे शब्दों को काम में
 लाती रही हैं."

हमें याद रखना चाहिये कि यह "शब्दावली" पांच
 बरस पहले की निकली हुई है. अगर हमारे हिन्दी प्रेमी
 आई ऊपर के पैर में हिन्दुस्तानी की जगह हिन्दी कर लें
 और सारी शब्दावली को ध्यान से पढ़ जावें तो हमें
 विश्वास है कि अब भी उसके तीत-चौथाई शब्द उन्हीं काफ़ी
 पसन्द आएंगे. यह "शब्दावली" इस नोट को लिखते समय
 हमारे सामने रक्खी हुई है. इसमें प्राइम मिनिस्टर
 (Prime Minister) के लिये केवल एक शब्द दिया
 गया है और वह शब्द है 'परम वजीर' यानी इस शब्दावली
 के अनुसार भी जवाहरलाल जी को 'पहलुभा' नहीं कहा जा
 सकता. प्रीमियर (Premier) के लिये कई शब्द हैं जिनमें
 एक शब्द 'पहलुभा' भी है. अंग्रेजी शब्द 'प्रीमियर' के कई
 अर्थ भी होते हैं. 'प्रीमियर' के लिये उसमें दूसरे शब्द
 हैं—'पहला वजीर' और 'बड़ा वजीर.' अंग्रेजी शब्द
 कैबिनेट के भी कई मानी होने हैं. इस "शब्दावली" में
 (Cabinet) का अर्थ कुटी और खान्नी भी दिया है और
 'काबिना' और 'वजीरायत' भी. 'काबिना' शब्द कैबिनेट के
 लिये दुनिया की बहुत सी भाषाओं में काम आता है और
 'वजीरायत' शब्द पंजाब के वज़न पर बनाया गया है.
 इस "शब्दावली" के तैयार करने वालों ने मिनिटर की
 जगह वजीर शब्द सुझाया है, इसलिये क्योंकि 'मंत्री'
 शब्द वह 'सेक्रेट्री' के लिये काम में लाये हैं और वजीर
 शब्द का जो सारे भारत में समझा जाता है उन्होंने बाईकाट
 करना ठीक नहीं समझा. सेन्टर के लिये उन्होंने अवश्य
 'विष विन्दी' शब्द सुझाया है.

पांच बरस पहले की छपी हुई हिन्दुस्तानी प्रचार सभा
 वर्षा की निकाली हुई उस "शब्दावली" के कोई शब्द
 किसी को अच्छे लगें या न लगें—हमें भी उसके कई शब्द
 अच्छे नहीं लगते—पर हिन्दुस्तानी कलचर सोसाइटी का
 निष्ठावादी भावना भारत के विधान का पूरा पूरा हिन्दी
 अनुवाद बाजार में बिक रहा है. उस सारे अनुवाद में न
 कहीं 'विषविन्दी' शब्द है न 'खोखी' और न 'पहलुभा'.
 फिर यह ज़रूरती—हम अधिक कड़ा शब्द काम में लाना

پر اولیٰ کتب میں کہ وہ ہمیں ان شہدوں کی
 جگہ अधिक खपते हुए शब्द बतावें. اگر ان شہدوں کے
 پیچھے بھی وہی ہوا ہوگا اور ان کے بنانے میں انہیں
 اُصولوں سے کام لیا گیا ہوگا جن سے اس شہداولیٰ میں لیا
 گیا ہے تو ہم نئے شہدوں کو اپنا لیں گے. یہ بھی دھیان
 رکھنا ہوگا کہ کچھ شہدائے ہندوستانی بولنے والی جلتا کے
 کو ہی نہیں دیکھنا ہے، بلکہ ہندوستان بھر میں اُس
 جلتا کے سمجھنے کو بھی دیکھنا ہے جو اُسی پر مبنی ہے نکلے
 اور بلکہ دوسرے شہدوں کو کام میں لائی دہی ہے."

میں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ "شہداولی" پانچ
 برس پہلے کی نکلی ہوئی ہے. اگر ہمارے ہندسی پر
 بھائی اور کے پورے میں ہندوستانی کی جگہ ہندسی کو
 لیں اور ساری شہداولی کو دھیان سے پڑھاویں تو ہمیں
 دھراس ہے کہ اب بھی اُس کے توں چوتھائی شہد انہوں
 کافی پسند آئیں گے. یہ "شہداولی" اُس وقت کو لکھی
 تھی ہمارے سامنے رکھی ہوئی ہے. اُس میں پرائم منسٹر
 (Prime Minister) کے لئے کچھ ایک شہد دیا گیا
 ہے اور وہ شہد ہے 'پریم وزیر' یعنی اس "شہداولی"
 کے انوسار بھی جواہر لال جی کو 'پہلوا' نہیں کہا جا
 سکتا. پریمیر (Premier) کے لئے کچھ نئی شہد ہیں
 جن میں ایک شہد 'پہلوا' بھی ہے. انگریزی شہد 'پریمیر'
 کے نئی اراہ بھی ہوتے ہیں. 'پریمیر' کے لئے کچھ اسمیں
 دو-دو شہد ہیں—'پہلے وزیر' اور 'بڑا وزیر' انگریزی
 شہد کابینہ کے بھی کچھ نئی معنی ہوتے ہیں. اُس
 "شہداولی" میں کابینہ (Cabinet) کا اراہ نئی
 اور کچھ بھی دیا ہے اور 'کابینا' اور 'وزیرایہ'
 بھی. 'کابینا' شہد کابینہ کے لئے دنیا کی بہت سی
 بھاشاؤں میں کام آتا ہے اور 'وزیرایہ' شہد پانچاب
 کے وزن پر بنایا گیا ہے. اس "شہداولی" کے تیار کرنے
 والوں نے منسٹر کی جگہ وزیر شہد سوچا ہے. اُس لئے
 کونیکہ 'منسٹری' شہد وہ 'سکریٹری' کے لئے کام میں لائے
 ہیں اور وزیر شہد کا جو سارے بھارت میں سمجھا جاتا
 ہے انہوں نے بالکل کرنا ٹھیک نہیں سمجھا. منسٹر کے
 لئے انہوں نے آؤشہم 'بیج ہندسی' شہد سوچا ہے..

پانچ برس پہلے کی چھپی ہوئی ہندوستانی پرچار
 سभा درمیان کی نکلی ہوئی اس "شہداولی" کے فولی
 شہد کسی کو اچھے لگیں یا نہ لگیں—ہمیں بھی اُس
 کے نئی شہد اچھے نہیں لگتے—پر ہندوستانی کالج
 سوسائٹی کا نکل ہوا بھارت کے دھیان کا پورا پورا ہندسی
 انواد بازار میں بک رہا ہے. اُس سارے انواد میں نہ
 کہیں 'بیج ہندسی' شہد ہے نہ 'کچھلی' اور نہ 'پہلوا'.
 پھر یہ زبردستی—ہم لکھک کو شہد کام میں لانا

से खींच कर अपनी राय ज्ञापन करें, इसी लिये “नया हिन्दू” के कार्यक्रम इस सभास की बहस के लिये चुने हैं, इस चर्चे पर कि बहस साम्य दंग से और उचित सीमाओं के अन्दर हो।

कुछ और भाइयों ने एक और “अमेज़ी हिन्दुस्तानी शब्दावली” में से कुछ शब्द चुन कर हिन्दुस्तानी कलचर खोसाइटी को दिक्कतमयी बनाने के अयोग्य साबित करने की कोशिश की है. इनमें से तीन शब्द यानी प्राइम मिनिस्टर (Prime Minister) के लिये ‘पहलुआ’, कैबिनेट (Cabinet) के लिये ‘खोली’ और सैन्टर (Centre) के लिये ‘बिच बिन्दी’ लगभग सारे हिन्दी जगत में गूँज गये. पार्लिमेन्ट में भी कई मेम्बरों ने इन्हें खूब छद्माक्षा और इनके आधार पर दुनिया को यह साबित करने की कोशिश की कि हिन्दुस्तानी कलचर खोसाइटी को दिक्कतमयी बनाने का काम नहीं मिलना चाहिये था.

पहली बात तो यह कि हिन्दुस्तानी कलचर सोसाइटी ने आज तक कभी इस तरह की कोई 'शब्दावली' नहीं निकाली, जिस शब्दावली में से यह शब्द लिये गये हैं उस पर कहीं हिन्दुस्तानी कलचर सोसाइटी का नाम नहीं। वह शब्दावली निकाली हुई है हिन्दुस्तानी प्रचार सभा वर्षा की और पांच बरस पहले की निकली हुई है, 'शब्दावली' की भूमिका लेखकों में चार नाम हैं, उनमें एक हमारा नाम भी है, चार नाम यह हैं :—काका कालेलकर, रामेश्वरी नेहरू, सत्य नारायण और सुन्दरलाल। भूमिका लेखकों ने उस "शब्दावली" को केवल एक सुझाव के तौर पर हिन्दी जगत के सामने रक्खा है, उसके अधिकतर शब्द बालू और रोजमर्रा की बाजबाल के शब्द हैं जैसे—सेक्रेट्री के लिये 'मन्त्री,' सिडिशन (Sedition) के लिये 'राजद्रोह', लिबर्टी (Liberty) के लिये 'स्वतंत्रता,' डिमान्ड (Demand) के लिये 'मांग', हाउस (House) के लिये 'सदन' वगैरह। जो बांटे से शब्द मये गढ़े गये हैं उनके बारे में भूमिका लेखकों ने अपनी भूमिका में लिखा है कि :—

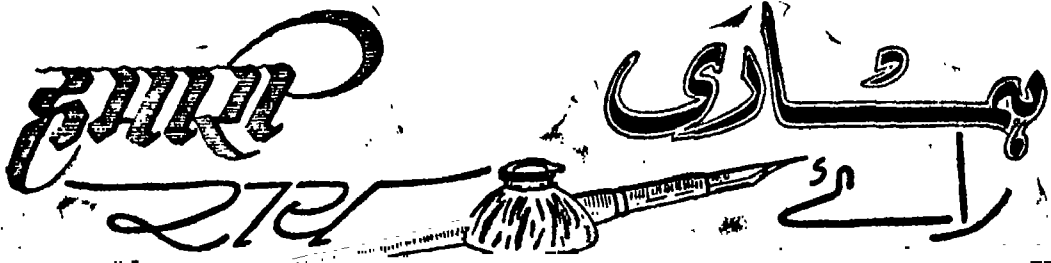
“हम यह शब्दावली जनता के सामने यह दिखाने के लिये रख रहे हैं कि ऐसे आसान शब्द बनाये जा सकते हैं जिन्हें आम जनता समझ सके और जिन से बोली को आसान भी किया जा सके और साथ ही साथ मात्तमात्त भी. हम यह दावा नहीं करते कि इन अंग्रेजी शब्दों के जोड़ के और हिन्दुस्तानी शब्द नहीं बन सकते, और न यह दावा करते हैं कि इसमें कोई कमी नहीं रही. कई जगह अधिक खपते हुए शब्द मिल सकते हैं या बढाये भी जा सकते हैं. हम सब मित्रों

سے سو چکر ابھی دائے قائم نہیں۔ اسی لئے ”انہا ہند“ کے
کالم اس سوال کی بحث کے لئے کہلے ہیں، اس شرط پر
کہ بحث شائع قلمک سے اور اچھت سماؤں کے اندر
ہو۔

کچھ اور پھانسیوں نے ایک اور "انگریزی هندوستانی شہزادوں" میں سے کچھ شہد چونکر ہندوستانی کلچر سوسائٹی کو قذشری بلالے کے ایڑیہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں تین شہد یعنی پرائم منسٹر (Prime Minister) کے لئے 'پہلو' کوہنت (Cabinet) کے لئے 'ہولہ' اور سنٹر (Centre) کے لئے 'بیج ہندی' ایک ہر ایک سارے ہندی جگت میں گونج گئے۔ پارلیمنٹ میں بھی کئی ممبروں نے انہیں خوب اچھا اور ان کے آدمار پر دنیا کو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستانی کلچر سوسائٹی کو قذشری بلالے کا کام نہیں ملتا چاہئے تھا۔

اپنی بات تو یہ کہ ہندوستانی کلچر سوسائٹی نے آج تک کبھی اس طرح کی کوئی ”شہداولی“ نہیں نکالی، جس ”شہداولی“ میں سے یہ شہد لہکے گئے ہوں۔ اُس پر کہوں ہندوستانی کلچر سوسائٹی کا نام نہیں۔ وہ ”شہداولی“ نکالی ہوئی ہے ہندوستانی پرچار سبھا وردھا کی اور پانچ برس پہلے کی نکلی ہوئی ہے۔ ”شہداولی“ کی بھوسکا لہکے ہیں میں چار نام ہوں، اُن میں ایک ہمارا نام بھی ہے۔ چار نام یہ ہوں :- کاکا کالونگر، رامشوری نہرو، ستھہ نارائن اور سلندر لال۔ بھوسکا لہکے ہیں اُس ”شہداولی“ کو کہہ دو ایک سوچاؤ کے طور پر ہندی حکمت کے سامنے رکھا ہے۔ اُس کے آدھک تو شہد چالو اور روزمرہ کی ہوئے چال کے شہد ہیں جیسے — سہکریہی کے لئے ’سلیبری‘ سڈیشن (Sedition) کے لئے ’راچنبرہ‘ لبرٹی (Liberty) کے لئے ’سولنبرٹا‘ (House) کے لئے ’سڈن‘ وگھڑہ جو تھوڑے سے شہد نہ لے کر لے گئے ہوں اُن کے بارے میں بھوسکا لہکے ہیں نے اپنی بھوسکا میں لکھا ہے کہ :-

”ہم یہ شہد اولیٰ چلتا کے سامنے یہ دکھانے کے لئے رہے
 رہے ہوں کہ ایسے اُسان شہد بدلتے جا سکتے ہیں چلتے عام
 چلتا سمجھ سکے اور جن سے بولی کو اُسان بھی کہا جا
 سکے اور ساتھ ہی ساتھ مالا مال بھی ۔ ہم یہ دعویٰ نہیں
 کرتے کہ ان انگریزی شہدوں کے جوڑ کے اور ملحدستانی شہد
 نہیں ہی سکتے‘ اور نہ یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ اُس میں
 کوئی کمی نہیں رہی۔ لگی جبکہ آدھک کھتے ہوئے شہد
 مل سکتے ہوں یا بدلتے بھی جا سکتے ہیں۔ ہم سب مکتوں



ہمارے ہندی پرمی भाई

ہمارے ہندی پرمی بھائی

جب سے پارلیمنٹ میں ہندوستانی کلتور سوسائٹی کو انگریزی ہندی ڈکشنری بنانے کے لیے گرانٹ کی درخواست دی گئی ہے تب سے کئی ہندی پत्रوں میں اس وقت تک لکھ لکھ چکے ہیں۔ ہم نے ان سب کو نہیں پڑھا۔ ان لکھوں کی جن خاص خاص باتوں کی طرف ہمارا دھیان دینا چاہیے وہ یہ ہیں۔

ایک بھائی نے جو ایلاہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اپنے لکھے لکھے میں ”نیا ہند“ کے کچھ لکھوں سے بڑے بڑے واقعات کو یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بھاشا کے بارے میں ہندوستانی کلتور سوسائٹی کی نیتی کیا ہے اور اس نیتی کو پورا کیا گیا ہے۔ ان واقعات میں سے ایک ہی واقعہ سہادک کے کسی لکھ یا نوٹ سے نہیں ہے۔ ہمارے دھیان بھائی کو یہ تو ضرور معلوم ہوا کہ کسی پتر یا پتریکا میں جتنے لکھ لکھے ہیں یہ آدھار نہیں ہوتا کہ ان لکھوں میں ہرگز کئے ہوئے وچار سہادک کے یا پتر یا پتریکا کے مالک کے وچار ہیں۔ انہوں نے جب ”نیا ہند“ کی فائل کو الٹ دھیان سے پڑھا تو یہ بھی ناممکن ہے کہ بھاشا کے پتر پر ”نیا ہند“ سہادک کے لکھ نہ دیکھے ہوں۔ بھارت کا دھیان پاس ہوتا ہے ”نیا ہند“ میں ہمارا ایک لکھا لکھا لکھ دھیان کی بھاشا سہادک نہیں ہر نکل چکا ہے۔ ہمارے بھائی نے اسی کو پڑھ لیا ہوتا تو ان کے سب سہادک دور ہوگئے ہوتے۔ ہندوستانی کلتور سوسائٹی کی دوجہ سے آدھار کتابیں ہندی میں لکھ چکی ہیں۔ ان کتابوں میں نہیں ہی وہ شہد نام میں نہیں لائے گئے۔ ہمارے بھائی نے دوسرے لکھوں کے لکھ کے اعداد پر شکایت کی ہے۔ پھر انہوں نے ہندوستانی کلتور سوسائٹی یا ”نیا ہند“ کے ساتھ یہ صاف فریاد کیوں کی یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ہاں، ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس سمجھوتہ پر ہندی دھیان سب طرح کے وچاروں کو سلیں اور ان پر شانتی

ایک بھائی نے جو ایلاہ آباد یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اپنے لکھے لکھے میں ”نیا ہند“ کے کچھ لکھوں سے بڑے بڑے واقعات کو یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بھاشا کے بارے میں ہندوستانی کلتور سوسائٹی کی نیتی کیا ہے اور اس نیتی کو پورا کیا گیا ہے۔ ان واقعات میں سے ایک ہی واقعہ سہادک کے کسی لکھ یا نوٹ سے نہیں ہے۔ ہمارے دھیان بھائی کو یہ تو ضرور معلوم ہوا کہ کسی پتر یا پتریکا میں جتنے لکھ لکھے ہیں یہ آدھار نہیں ہوتا کہ ان لکھوں میں ہرگز کئے ہوئے وچار سہادک کے یا پتر یا پتریکا کے مالک کے وچار ہیں۔ انہوں نے جب ”نیا ہند“ کی فائل کو الٹ دھیان سے پڑھا تو یہ بھی ناممکن ہے کہ بھاشا کے پتر پر ”نیا ہند“ سہادک کے لکھ نہ دیکھے ہوں۔ بھارت کا دھیان پاس ہوتا ہے ”نیا ہند“ میں ہمارا ایک لکھا لکھا لکھ دھیان کی بھاشا سہادک نہیں ہر نکل چکا ہے۔ ہمارے بھائی نے اسی کو پڑھ لیا ہوتا تو ان کے سب سہادک دور ہوگئے ہوتے۔ ہندوستانی کلتور سوسائٹی کی دوجہ سے آدھار کتابیں ہندی میں لکھ چکی ہیں۔ ان کتابوں میں نہیں ہی وہ شہد نام میں نہیں لائے گئے۔ ہمارے بھائی نے دوسرے لکھوں کے لکھ کے اعداد پر شکایت کی ہے۔ پھر انہوں نے ہندوستانی کلتور سوسائٹی یا ”نیا ہند“ کے ساتھ یہ صاف فریاد کیوں کی یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ہاں، ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس سمجھوتہ پر ہندی دھیان سب طرح کے وچاروں کو سلیں اور ان پر شانتی

سہاہتہا پر داناں کرے گا لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارے لکھک اپنی چھوٹے چھوٹے فرقوں کو ملنا کر ساتھ ساتھ سوا کے بہاؤ سے اپنا سہوگ پرہان نہیں ۔

زیادہ تر لوگ پاتھک کو گلی دیتے ہوں کہ وہ لکھتا چھوڑیں پڑھتا ہے اور اچھے ساتھ ساتھ کو نہیں چھوڑتا ۔ لیکن اصل کارن مالی ہے ' پاتھکوں کو آمد آمد اچھے ساتھ ساتھ ہوں ہی آتا ہے ۔ بہت دنوں سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی ایسی پتھر کا نکالی جائے جو سچے سچ لکھائی ساتھ ساتھ کی پرتلندی ہو اور اس کا دام بھی کم ہو ۔ " لکھائی " نے یہ کسی پڑوسی کو دی ہے ۔ اچھے ۔ لکھائی نے لکھے سمجھائیوں کو پتھائی ملتی چاہئے لکھائی چار آنہ دام دیکر " لکھائی " کے پتھک دم بدھائی کے پاتھ نہیں ہوں ۔

—موجہ بردھوی

سہاہتہا پر داناں کرے گا لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارے لکھک اپنی چھوٹے چھوٹے فرقوں کو ملنا کر ساتھ ساتھ سوا کے بہاؤ سے اپنا سہوگ پرہان نہیں ۔

زیادہ تر لوگ پاتھک کو گلی دیتے ہوں کہ وہ لکھتا چھوڑیں پڑھتا ہے اور اچھے ساتھ ساتھ کو نہیں چھوڑتا ۔ لیکن اصل کارن مالی ہے ' پاتھکوں کو آمد آمد اچھے ساتھ ساتھ ہوں ہی آتا ہے ۔ بہت دنوں سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی ایسی پتھر کا نکالی جائے جو سچے سچ لکھائی ساتھ ساتھ کی پرتلندی ہو اور اس کا دام بھی کم ہو ۔ " لکھائی " نے یہ کسی پڑوسی کو دی ہے ۔ اچھے ۔ لکھائی نے لکھے سمجھائیوں کو پتھائی ملتی چاہئے لکھائی چار آنہ دام دیکر " لکھائی " کے پتھک دم بدھائی کے پاتھ نہیں ہوں ۔

—موجہ بردھوی

کھیل-کھلونے

کھیل-کھلونے

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

—چیتن کمار شارما

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

لوک—راجندر یادو؛ نکالنے والے—بھارتیہ کھان پوٹھ، کافی، بھاشا—ہندی؛ صفحہ 152؛ قیمت—روپہہ۔

—چیتن کمار شارما

कहानी

माहवारी पत्रिका, लिखावट—हिन्दी; सम्पादक—श्रीपत राय श्यामू संयासी, मैरों प्रसाद गुप्त; एक कापी का दाम—चार आना; साजाना चंदा—तीन रुपया; मिलने का पता—सरस्वती प्रेस, 11 सवोर पटेल मार्ग, इलाहाबाद.

“कहानी” का पुनर्जन्म हुआ है. पहले यह पत्रिका बनारस से निकलती थी. फिर किन्हीं कारणों से बन्द हो गई. बन्द होने पर अच्छी कहानियों के पाठकों का दुख हुआ था. और अब जब कहानी फिर निकल रही है पाठकों को विली खुशी हुई है इस खुशी का प्रमाण यह है कि हर रोज पचास पचास की तादाद में इसके ग्राहक बन रहे हैं.

“कहानी” में कहानियां ही छपती हैं. इन कहानियों का स्तर बाफारू नहीं होता और न आबारागर्ही बढ़ाने वाले जिम्सी चटखारे इसमें मिलते हैं. “कहानी” के सारीदार को कबर वलट कर देखने की जरूरत नहीं है कि इस अंक में कोई अच्छी कहानी है या नहीं. “कहानी” में कोई घटिया कहानी छपती ही नहीं.

“कहानी” में शुद्ध साहित्य सेवा का भाव मिलता है. संगदिखी का नाम इस पत्रिका के पत्रों से ग्रायब है. भारती और विदेशी सभी भाशाओं की अच्छी कहानियां “कहानी” में पढ़ने को मिलती हैं. इसमें मरहटो की कहानियां छपती हैं, उर्दू की कहानियां छपती हैं, रूनी, चीनी, अंग्रेजी सभी भाशाओं की कहानियां जगह पाता हैं.

“कहानी” की एक और विशेषता भी है. दूसरी पत्रिकाएं नाम पर बौद्धती हैं और बन बनका लक्ष होता है. “कहानी” नये लेखकों को प्रोत्साहित करना अपना कर्ज समझती है. इसीलिये कुरनचन्द्र, रुवाजा अहमद अन्वास, गुरबकश सिंह और दूसरे बड़े लेखकों के साथ साथ नये लेखकों की कहानियां पढ़ने को मिलती हैं और इस बात का अन्वाजा लगाने में आसानी होती है कि कहानी साहित्य में कैसे-कैसे रुझान पैदा हो रहे हैं और नये लेखक आगे बढ़ रहे हैं या नहीं?

“कहानी” सम्पादकों ने “कहानी क्लब” नाम से एक स्तम्भ खोला है. इस स्तम्भ से साहित्यकारों को बहुत सहायता मिलेगी, पाठकों को इस से विलचस्पी तो होगी ही. आज बहुत सी समस्याएं हैं. लेखक व्यक्तिगत रूप से इन समस्याओं की चर्चा करते हैं लेकिन कोई ऐसा जरिया नहीं है जिसमें सामुहिक चर्चा हो सके और रचनात्मक साहित्य को आगे बढ़ाने वाले नतीजे निकाले जा सकें. दूसरी कुछ पत्रिकाएं कभी कभी ऐसी चर्चा करती हैं लेकिन उनके स्तर तानाबाजी से ऊपर नहीं उठ पाता. “कहानी क्लब” शुद्ध साहित्य को पैदा करने में जरूरत

कहानी

माहवारी पत्रिका; लिखावट—हिन्दी; सम्पादक—श्रीपत राय श्यामू संयासी, मैरों प्रसाद गुप्त; एक कापी का दाम—चार आना; साजाना चंदा—तीन रुपया; मिलने का पता—सरस्वती प्रेस, 11 सवोर पटेल मार्ग, इलाहाबाद.

“कहानी” का पुनर्जन्म हुआ है. पहले यह पत्रिका बनारस से निकलती थी. फिर किन्हीं कारणों से बन्द हो गई. बन्द होने पर अच्छी कहानियों के पाठकों का दुख हुआ था. और अब जब कहानी फिर निकल रही है पाठकों को विली खुशी हुई है इस खुशी का प्रमाण यह है कि हर रोज पचास पचास की तादाद में इसके ग्राहक बन रहे हैं.

“कहानी” में कहानियां ही छपती हैं. इन कहानियों का स्तर बाफारू नहीं होता और न आबारागर्ही बढ़ाने वाले जिम्सी चटखारे इसमें मिलते हैं. “कहानी” के सारीदार को कबर वलट कर देखने की जरूरत नहीं है कि इस अंक में कोई अच्छी कहानी है या नहीं. “कहानी” में कोई घटिया कहानी छपती ही नहीं.

“कहानी” में शुद्ध साहित्य सेवा का भाव मिलता है. संगदिखी का नाम इस पत्रिका के पत्रों से ग्रायब है. भारती और विदेशी सभी भाशाओं की अच्छी कहानियां “कहानी” में पढ़ने को मिलती हैं. इसमें मरहटो की कहानियां छपती हैं, उर्दू की कहानियां छपती हैं, रूनी, चीनी, अंग्रेजी सभी भाशाओं की कहानियां जगह पाता हैं.

“कहानी” की एक और विशेषता भी है. दूसरी पत्रिकाएं नाम पर बौद्धती हैं और बन बनका लक्ष होता है. “कहानी” नये लेखकों को प्रोत्साहित करना अपना कर्ज समझती है. इसीलिये कुरनचन्द्र, रुवाजा अहमद अन्वास, गुरबकश सिंह और दूसरे बड़े लेखकों के साथ साथ नये लेखकों की कहानियां पढ़ने को मिलती हैं और इस बात का अन्वाजा लगाने में आसानी होती है कि कहानी साहित्य में कैसे-कैसे रुझान पैदा हो रहे हैं और नये लेखक आगे बढ़ रहे हैं या नहीं?

“कहानी” सम्पादकों ने “कहानी क्लब” नाम से एक स्तम्भ खोला है. इस स्तम्भ से साहित्यकारों को बहुत सहायता मिलेगी, पाठकों को इस से विलचस्पी तो होगी ही. आज बहुत सी समस्याएं हैं. लेखक व्यक्तिगत रूप से इन समस्याओं की चर्चा करते हैं लेकिन कोई ऐसा जरिया नहीं है जिसमें सामुहिक चर्चा हो सके और रचनात्मक साहित्य को आगे बढ़ाने वाले नतीजे निकाले जा सकें. दूसरी कुछ पत्रिकाएं कभी कभी ऐसी चर्चा करती हैं लेकिन उनके स्तर तानाबाजी से ऊपर नहीं उठ पाता. “कहानी क्लब” शुद्ध साहित्य को पैदा करने में जरूरत

والی ریاست تھے بقول غالب انہوں نے کچھ دن بعد دس ہزار کے پانچ ہزار سالانہ گراؤے اور خواجہ حاجی کو بھی اس میں دو ہزار کا شریک کر دیا جو بین غالب اور ان کے بھائی کو صرف پندرہ سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ نواب احمد بخش خاں خانہ نشین ہوئے۔ ریاست دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی۔ فیروز پور جہر کہ شمس الدین کو ملا اور لہو دایم الدین خاں کو۔ شمس الدین خاں کی خاندان کے دیگر افراد سے بنتی نہ تھی۔ شمس الدین نے غالب کی پیش اور بیگم غالب کا وظیفہ بھی بند کر دیا۔ آمدنی کے وسائل مسدود و احتراجا کی تنگی نے پریشانی کر دیا۔ غالب پہلے تو نواب احمد بخش خاں کے پاس گئے کہ ان سے مل کر معاملہ کو سلجھائیں، لیکن نواب صاحب نے ہاتھوں سے ہلا دیا۔ غالب نے مجبور ہو کر قانونی چارہ جوئی کا ارادہ کیا۔

اس زمانہ تک غالب کی زندگی بہ طور فراغت میں بسر ہوئی۔ انہیں اس سے والدہ کی معرفت کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ نواب احمد بخش خاں بھی کچھ نہ کچھ پنشن کے علاوہ دیتے رہتے تھے۔ سسرال سے بھی مدد ملتی رہتی تھی۔ بے فکری سے اس لئے بسر ہوتی تھی کہ خرچ برداشت کرنے والے تھے۔ نواب کہلاتے تھے۔ انہی امام کے متعلق ایک خط میں اشارہ کیلئے ہے۔

”بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں، اور مقررہ اس سے قرض لیا، اور درباری مل کو ہمارا، اور خوب چند چہین سکھ کی کوٹھی جالوئی ہر ایک کے پاس تھمسک جہی موجود، شہر لگاؤ، چائو، نمول، نہ سو۔ اس سے بڑھ کر بات کہ کوئی کا خرچ بچو بھی کے سر، بایں ہمدی خاں کے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوادیا، کبھی ماں نے اگرہ سے کچھ بھیج دیا“

۱۸۶۵ء کے بعد ان امور میں تغیر واقع ہوا۔ قرضہ ہوں نے تنگ کیا ہوا دیکھا جو گر خان (نواب احمد بخش خاں) کے رویت میں تبدیلی ظاہر ہے۔ خاص کر ان کے بیٹے شمس الدین خاں نے غالب کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

جس جہد کی ہم بات کر رہے ہیں وہ بڑی اتنی کا دھنکا، مگر جے آگرینوں نے حالات کو کچھ نہ کچھ بہتر بنادیا تھا مگر اہل ہند، معاشی و اقتصادی حیثیت سے بہت پریشان حال تھے۔ غالب نواب تھے، مگر جاگیر نہ تھی جہاں نہ تھی انتہایہ کچھ مکان تک نہ تھا۔ اٹھنا بیٹھنا، امیروں، جاگیرداروں

پر دوش پانی سپہ وہ اس کو بندہ سطح سے نیچے آکر دیوڑنہ گری، تعلق اور کچھ سرحدیں داخل نہیں ہونے دیتی مگر حسب اس کے بھی خواہ، ہاسکی زندگی کی قربانی سے متاثر ہوتے ہوئے اس کو مشورہ دیتے ہیں کہ ابنا کی موجودہ روش کو دیکھو، جو تم سے کم مرتبہ ہیں مگر داویدیش دے رہے ہو کہ انہوں نے زمانہ سے سمجھ نہ کر لیا ہے۔ تم بھی ”گر زمانہ باقوسا ز قلمنا“ نہ پھل کرو۔ پس بروقت کے اس مشورہ سے اس کے احساس برتری کو کتری کی کھاکش زیادہ دتیر ہوتی ہے، اور وہ کبھی کبھی چند لچات کے رک کر زمانہ سے عارضی صلح کر لیتا ہے، اور ان مشوروں پر عمل پیرا آتا ہے جو اپنی سطح سے نیچے اترتا ہے۔ عرش سے فرش کی راہ لیتا ہے۔ دین کا بھیس بنا کر وہ ”تاشلئے اہل کرم“ دیکھنے لگتا ہے۔ مگر اس نہ گری میں اس کا احساس اور زیادہ مجروح ہوتا ہے۔ وہ ”انا“ جس نے تو مٹی دیر کے لئے انگ کر دیا تھا اس کے اندر پھرا پھرتی ہے اور پھرتے دکھنا گروانہ ہوا کی منزل پر لاکھڑا کرتی ہے۔ وہ دوسروں کا میں پاتا، بلکہ خود اپنا بن جاتا ہے اور اپنے کرم فراؤں سے کہہ دیتا ہے کہ میں سے مری تہمت عالی نے مجھ پر۔

احساس و شعور کی آواز میں اور قوت اہل کے تاریخی بہادری سے تصادم نتائج کا عکس ہیں غالب کی زندگی میں بہ تمام و کمال نظر آتا ہے اور ہم آدیش کشکش اور تصادم کے چند ہیرو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ س کے آگرینوں سے روابط کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ مگر ان روایا تک جن زاویوں پر اسے دیکھا جاتا رہا ہے، ان میں ان روایات عوامی، اس زمانہ کی سیاست اور اقتدار جیات، کو پیش نظر نہ رکھنے کی کمی ناہماتی ہے۔ غالب کے ذہنی رجحانات، خاندانی مراتب عظمت کو بھی انفرادی حیثیت سے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

غالب نے جب ہوش سنبھالا، باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ اپنے سر پرستی فرمائی، غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے، آگرہ کو انہوں نے آگرینوں کے حوالہ کر دیا اور اب احمد بخش خاں کی سفارش پر آگرینوں کی فوج میں رسالہ دار ہو گئے۔ ہزار گڑہ اندازہ فعلی بعض ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ اور ایک جاگیر رسالہ کے حق کے لئے مقرب ہو گئی۔ مگر غالب نو برس ہی کے تھے کہ چچا باقی سے مگر کر رالہ کا کو سودھا ہے۔ آگرینوں نے صلہ خدمات و جاگیر کے عوض ان ہزار روپے سالانہ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے متوسلین پنشن دیاست فیروز پور جہر کے سے وابستہ کر دی۔ نواب احمد بخش خاں

ماحول اور معاملات کا مطالعہ وقت و قدر سے نہیں کیا ورنہ وہ منزل کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کرتے۔ غالب معاشی بحران میں مبتلا تھے جس کے متعلق بیان گزرجکا۔ نیز قدر شناسی کے اسیر بھی تھے جس کی شکایت انہیں ہمیشہ رہی، غالب ہمیشہ شاعر، ترقی، نظری، ظہوری وغیرہ سے کم مرتبہ نہ تھے بلکہ ان کا مرتبہ کچھ بلند ہی ہے۔ ان شعرا کی قدر منزلت کی داستانیں معلوم تھیں۔ غالب بھی ایسی ہی قدر و منزلت کے خواہاں تھے اس میدان میں بھی ان کو اپنی برتری کا احساس بہر حال رہا۔ لیکن زمانے نے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس سے شعور کتری کا پیدا ہونا ایک لاجبی امر تھا۔ غالب نے اپنی برتری کے لئے کوشش کی اور انہیں انگریزوں کے علاوہ اور کوئی نظر نہ آیا جو انہیں بلند مرتبہ دے سکتا۔ چنانچہ خود کو ملکہ کا شاعر بنانے جلے کی تمنا کا انہیں راسی بنا کر کیا ہے۔ ورنہ کلکتہ کے دوران قیام سے لے کر آخر تک انگریزوں کے متعلق جتنے قطعات اور قصائد لکھے۔ ان میں سے زیادہ تر منظم عروضیاں ہیں ان کا منشا یہی تھا کہ حکام وقت، پٹن، خلعت، دربار اور خطاب کے بارے میں میری مدد کریں۔ غالب ۱۸۳۲ء میں سپریم کونسل کے ممبر مسٹر چارلس شکاف کی مدد میں قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے پس منظر دیکھنے بالکل مرضی ہیں۔ قصیدہ سے مستبعد ہوتا ہے کہ مسٹر چارلس شکاف دہلی آئے ہیں غالب کلکتہ میں ان سے مل چکے تھے۔ تشبیب کے بعد مدد میں وہی مبالغہ آمیز باتیں دہرائی گئی ہیں جو ہر ایک کے لئے بالذات تغیر بیان ہوتی رہی ہیں پھر اپنی حالت زار بیان کر کے مطلب کا انہار اس طرح کرتے ہیں۔

پہنچ مطلب تو ام بہت بند گونہ امید
خواہم آن پنج علی الزعم خسود و غنا
اول ایست کہ در باب معاشے کہ راست
کنی اندیشہ مکمل بہ طریق ایجاب
ہر چہ در زفر تبر کا بود نقش پذیر
ہم باند آردہ آن نقش شوی ماند ساز
دوم آن کز اثر عدل تو اسے سحر جہد
غیر باندہ دریں و جہر نہ باشد انبار
سوم آنست کہ دیگر گنم دست طلب

پیش فرمانہ میوات، بدریوزہ دماز
ہم گنجینہ سرکار براتے خواہم
دادہ انصاف بدیں یافتگی اذین جلا
چارم آنست کہ باقی لید چندی سالہ
بے نزار و جہل و جہد بین گرد باز
پنجم آن کز پس اس فسخ کہ بناید وٹے
دہم مژدہ اگر ام و نوید اعزاز
بخشند نازہ خطابی دہراں افزا ہے
خلعتی در خور میں دولت جادید طراز

غالب کی قادر الکلامی قابل داد ہے کہ اپنے مطالب کو کیسے عموماً پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس مدحت طرازی کی علت غائی معاشی تنگی سے نجات تھی ورنہ ۱۸۲۷ء سے قبل انہوں نے کسی انگریز کی مدد میں ایک شعر بھی نہیں لکھا۔ پس اس کو مطلب برآری کا وسیلہ ہی کہا جائیگا۔ غالب شاعر تھے، انہوں نے صحیح راستہ اختیار کیا کہ شعر کو ذریعہ اظہار و دعا قرار دیا، شر کے مقابلہ میں شعر کی تاثیر مسلم، اگرچہ غالب کے حق میں شعر کی تاثیر بھی معدوم ہی نہ تھی۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب نے ہندوستانی امور و سلاطین کی شان میں بھی قصیدے لکھے ہیں لیکن انہوں نے غالب سے کیا سلوک کیا؟ یہ بات سب پر روشن ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے بھی حکیم آصف علی خان اور حضرت کائے صاحب کی سفارشات پر غالب کو ملازم رکھا اور تنخواہ صرف پچاس روپے ماہانہ، تاریخ نویسی خدمت، بعد میں اصلاح شعر کا حکم بھی سپرد ہوا۔ انگریزوں کے خزانہ سے سارے باسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے جس کے عوض کوئی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ خدر کے بعد نوابین رامپور نے صندوق (جولائی ۱۸۵۹ء سے) سو روپے ماہانہ سے مدد کی۔ پس یہ اس زمانہ کا طریق تھا کہ شاعر کا جس سے توسل ہوتا اس کی مدد سرائی کرتا۔ اگر غالب کا تعلق پٹن کی وجہ سے انگریزوں کے ساتھ نہ ہوتا تو غالب بھی اوروں کی طرح انگریزوں کی مدد کرتے۔ غالب کی اس مدحت طرازی کی حقیقت اس وقت واضح ہو جاتی ہے جبکہ ہکنس مگال غالب کے خلاف راپورٹ کرتا ہے تو غالب اس کی قدر پر اتر آتے ہیں اس کا ایک ہی مطلب ہوا کہ جس سے

قدیم صاحب سیکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جبکہ نہ وہ انہر سے آئے نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سیکرٹری نے جھدار پر پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکہ جاتا۔ جھدار نے جا کہ پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا، جب آپ دربار گورنری میں جہنیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی، لیکن اس وقت آپ نوکر ہی کے لئے آئے ہیں اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت، باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں نہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں! صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں مرزا صاحب! رخصت ہو کر چلے آئے۔

جیمس ٹامسن جی کے ساتھ یہ معاملہ گزرا غالب کے پرانے جاننے والوں میں سے تھے۔ ان کی مدت میں قطعہ ملا، قصیدہ ملا اور دلکش کی آخری غزل کلیات میں موجود ہے۔ پنج آہنگ میں ان کے نام تین خط ہیں جن میں غزل اور قطعہ بھی شامل ہے۔ یہ پہلے گورنمنٹ کے سیکرٹری پھر فارن سیکرٹری اور بعد کو بی بی کے لغٹ گورنر ہوئے۔ دہلی اس زمانہ میں یوپی میں شامل تھی۔ ایسے شخص کے بعد مرزا غالب کی یہ جہارت غیر معمولی بات نہیں، اور بغیر ملاقات لوٹ آنا بھی ایک غیر متداولہ فعل ہی کہا جاسکتا ہے۔ یا عظمت و برتری کے شدید احساس کا نتیجہ۔ ان کے بعد مومن خاں مومن کو بلایا جاتا ہے وہ بھی ملازمت کرنے سے منع کر دیتے ہیں صرف اس لئے کہ ان کو سو کی جگہ انہی روپے ماہانہ دینا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے ملازمت عورت کی خاطر قبول نہ کی اور مومن خاں مومن نے صرف بیس روپے کی کمی کی وجہ سے۔ دونوں کافرق واضح ہے۔

غالب ۱۸۴۲ء میں پنشن کے معاملہ میں بالکل مایوس ہو چکے تھے لیکن ان کو نئے خطاب و اسوازی کلک و کنویر سے امید تھی۔ یہ امید آخری دم تک رہی جو پوری نہ ہوئی تھی نہ ہوئی۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۴ء تک غالب شاہ دہلی سے وابستہ رہے۔ اس زمانہ میں بھی انگریزوں سے رسمی تعلقات تھے۔ وہ شد و بد باقی نہ رہی جس کا ظہور ۱۸۵۲ء سے ۱۸۴۴ء تک ہوا۔ یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ غالب کی مدحت طرازی

مطلب برتری میں امداد ملنے کی فدا سی بھی توقع ہوئی اس کو خوش کر کے اپنا کام نکالنا چاہا اور تعریف و توصیف سے اپنی طرف مائل کیا۔ جس نے مخالفت کی اس کی پرائی گوی۔

غالب کی سلامتی طبع کے ثبوت ان کی تحریروں میں جا بجا ملے ہیں جو اس بات کی بین دلیل ہیں کہ غالب انگریزوں کے متعلق اچھی رائے رکھنے کے باوجود ان کے افعال پر کڑی نگاہ چینی کرتے تھے۔ مولوی سراج الدین احمد کو انگریزوں کے عدل و انصاف کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ہیہات! اگر معاش من ہمیں پنج ہزار روپیہ سالانہ ہم میں قسطنطنیہ از روئے دفتر سرکار کہ سادہ لوحان آتزا معدلت آثار گویند ثابت شدہ بود با یستہ کہ صاحبان صدر مرا از پیش راندندے۔"

"سادہ لوحان آتزا معدلت آثار گویند" میں کتنا گہرا طنز ہے۔ اسی طرح جب مولوی فضل حق نے مرثیہ داری عدالت سے استغفا دیا ہے تو اہل شہر کو سخت صدمہ ہوا۔ بہادر شاہ ظفر ولی عہد سلطنت تھے انہوں نے بھی بہتر ارشیوں و بکامو مولوی صاحب کو رخصت کیا۔ غالب نے یہ تمام حالات مولوی سراج الدین احمد کو ۳۱ جنوری ۱۸۴۲ء کے خط میں لکھے ہیں۔ انگریزوں کے متعلق لکھتے ہیں "بے تیزی و قدر ناشناسی حکام رنگ آن ریخت" یہ وہ زمانہ ہے کہ غالب کا مقدمہ حکومت کے سامنے ہے۔ ان تمام امور سے قطع نظر، اگر صرف معاملہ ملازمت مدد ہی دہلی کلک کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جائے کہ غالب کی خود داری کس منزل تک پہنچی ہوئی تھی یہ واقعہ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں، بعنوان "کیا آن تان ہے لکھا ہے۔"

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لغٹ گورنر بھی رہے اس وقت سیکرٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ پیپے کا ایک مدرس عربی کے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کالوں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحبہ کو اطلاع ہوئی، مگر یہ پامی سے انکر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور

ماہ نو کراچی، فروری ۱۹۳۳ء

ذرا یہ بتایا ہے۔ اردو خطوط میں بھی دہلی اور اہل دہلی کی بربادی پر
دو رنگ بیانات موجود ہیں سب سے پہلے قطعہ غدر یہ ملاحظہ فرمائیے۔

یہ علاؤ الدین خاں علانی کو اسی زمانہ میں تحریر کیا تھا۔

بسکہ فعال مایہ پر ہے آج

ہر سلسلہ شور انگشتاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے

زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا

چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے

گھر بنا ہے نمودِ زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک

قشہٴ خوں ہے ہر مسلمان کا

کوئی داں سے نہ آئے یاں تک

آدمی داں نہ جاسکے یاں کا

میں نے مانا کر مل گئے، پھر کیا؟

وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کئے مشکوہ

سوزش داغہائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کئے باہم

ماجرہ دیدہ ہائے گرماں کا

اس طرح کے وصال سے یارِ ب

کیا ملے دل سے داغِ بھراں کا

انگریز سپاہیوں کی مطلق العنانی، مسلمانوں کا قتل عام

ان کی تباہی حالات، جمہوری بے بسی اس سے زیادہ کیا بیان

ہو سکتی تھی اب دیکھئے انگریزوں کے ترجمہ کی مثال بے مثال

غلبہ ہی کا قلم لکھ سکتا ہے۔

"ہر شخص کی سرفروشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی

قانون ہے، نہ قاعدہ ہے، نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے

ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دوسو روپے کی پنشن کی

منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں، سو سو روپے مہینہ

۱۔ خطوط غلبہ ص ۱۵۷

ماہ نو بیچ کر نئی گیسرو

جندہ چاروہ نئی گیسرو

شاہ، ماہ گرفتہ را ماند

نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

بادشاہ گہن لگا چاند تخیل کی بلندی کا کمال ہے اور اس کی بے بسی

اور مجبوری کی کتنی عجیب و لطیف مثال ہے۔ بادشاہ اور شہزادگان

کے حالات، فتح و ہلاکت کے بعد لکھتے ہوئے کلیو مذکور آتا ہو گا۔ اس لئے

بات کو اس طرح مثال جاتے ہیں:-

"اگر کہ فرجام کار بادشاہ و بادشاہزادگان کے بیچ لگا دیا جائے

کشائش شہر بایتے، نخست نہ گمشدہ ام۔ لایع اینست کہ مراندین نام

شنیدن سرمایہ گفتار و ہنوز سخنہائے ناشنیدہ بسیار است۔"

لیکن ایک موقع پر بادشاہ و شاہزادگان کے متعلق افوس

کہتے ہوئے لکھا ہے:-

"از شاہزادگان بیرون ازیں نتوان سرود کہ اندر را اندوختے

مرگ بدبان زخم گلوک تغنگ فرد برد۔ و چندے رادر ہم بند چاہتے

بکشاکش رس رواں در تن افرد۔ و افسردہ چند ازاں میان زندان

نشین اند۔ و شمرہ چند ازاں دودماں آوارہ روئے زمین۔ بر بادشاہ

ایک آرام گاہ کہ ماتم زوہ کتاب و قوال است، فرمان گیر و دار

باندازہ باز پرس رواں ہست۔"

آخر کار دستبند کی تحریر تک اگست ۱۸۵۷ء کو ختم کر دی

خاتمہ پر لکھتے ہیں:-

"کہن پس اگر بدست آید نیز رنگ از آئینہ نمی زواید۔۔۔۔۔"

کاش در بارہ آن خواہش ہائے سرگنا، ہمانا جس پر خوال و سر پائے

پائے، چنانکہ ہم دین نگارش ازاں گزارش آہی و لوہ ام و اینک

چشم نگراں بدل و دختہ دل بر امید بدان نہادہ ام۔"

گویا دستبند کو بھی خطاب، خلعت اور پنشن کی بھالی کا

۱۔ کلیات نشر ص ۲۸۷

۲۔ کلیات نشر ص ۲۸۷

۳۔ کلیات نشر ص ۲۸۷

۴۔ کلیات نشر ص ۲۸۷

پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چہ بچہ تمہارے بھائی مجرم تھے۔ تمہاری پنشن ضبط، بطریق ترمیم دس دس روپے مہینہ نام کوٹے گا۔ ترمیم سے تو تغافل کیا قہر ہوگا! میں خود موجود ہوں، حکام صدر کا روشناس، سکتا ہے۔

یہ داستان دراز سے دراز تر ہوتی جا رہی ہے غالب نے غدر کے حالات بہت زیادہ لکھے ہیں صرف دو واقعے اور ملاحظہ فرمائیے، غدر کے بعد دہلی کی عمارات بھی انگریزوں کی تباہی و بربادی کا نشانہ بنیں۔ بہت سی عالی شان عمارتیں برباد ہوئیں۔ مسجدیں مسمار کی گئیں، امام باڑے ڈھائے گئے۔ مولوی محمد باقر امام باڑہ ڈھایا گیا تو غالب کو بڑا دکھ ہوا۔ شہر کی بربادی، مسجدوں کی مسماری میں انگریزوں کی حرکتیں ملاحظہ فرمائیے۔

”بڑے دربار کا دروازہ ڈھایا گیا، قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پوند ہو گئی، مرکز کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ! گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہرتے ہیں ایک شیر نر اور پیل تن بندر پیدا ہوئے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پڑتا ہے۔ فیض اللہ علی بخش کی حویلی پر جگمگاتے ہیں جن کو عوام گری کہتے ہیں، انہیں ہلاک ایک ایک بنیاد ڈھادی، اینٹ سے اینٹ بجا دی، واہ رے بندر! یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔“

انگریز کو بندر کہنا کتنی بے مثال تشبیہ ہے۔ میرے لڑکپن تک انگریزوں کے لئے یہ لفظ بچوں اور لڑکوں کی زبان پر تھا۔ مگر غالب نے اس سے جو فائدہ اٹھایا ہے۔ اور جس موقع پر استعمال کیا ہے وہ بلاغت کی انتہا ہے۔ بندر کی فطرت کو سامنے رکھتے اور اس انگریز کی حرکت کو دیکھتے اور تشبیہ کا لطف اٹھائیے۔ اسی طرح انگریز حکام کی جہالت کا خاکہ کتنے پر لطف اندازیں اڑا رہے ہندوستان میں عرف کی دبا عام ہے۔ نام اور عرف کو انگریز نہ ایک جانتے ہیں اور نہ مانتے ہیں۔

۱۰ خطوط غالب ۳۹۵

۱۱ خطوط غالب ۳۹۹

۱۲ خطوط غالب ۳۹۹

”ایک لطیفہ پرسوں کا سنا! حافظ متو بے گناہ ثابت ہو چکے ہیں، رابٹی پانچکے، حاکم کے سلسلے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اہلکسا پنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا۔ صرف حکم کی در، پرسوں وہ حاضر ہوئے، مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کوئی؟ عرض کیا کہ میں! پھر پوچھا، حافظ متو کون؟ عرض کیا کہ میں! اہل نام میرا محمد بخش ہے متو متو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ متو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں متو اپنے گھر چلے آئے۔“

ان واقعات میں انگریزوں کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کم نہیں ہے اب انگریزی فوج کے متعلق بھی سن ہی لیجئے۔ غالب باغیوں کی طرح، انگریزی فوج کو بھی اپنا خیال نہ کرتے تھے۔

”ایک خدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ ہندام مکانات کا، ایک آفت ویاکی، ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔“

کتنے لشکروں کا دہلی پر حملہ ہوا، اور انگریزی فوج نے کیا کیا لوٹا اس کی تفصیل غالب ہی سے سنئے۔

”پانچ لشکر کا حملہ ہے درپے اس شہر ہوا پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار تھا۔ دوسرا لشکر خاکینوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و سکین و آسمان و زمین و آثار ہستی ہل کر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے پڑے۔ لشکر چھٹے کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔“

انگریزوں نے دہلی میں جو تباہی مچائی تھی اس کو کتنے مختصر اور جامع لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ تفسیر کی جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ غالب کا مسلمانوں کی زبوں حالی پر افسوس ایک فطری

۱۰ خطوط غالب ۳۹۵

۱۱ خطوط غالب ۳۹۵

۱۲ انگریزی پنج، خاک دردی کی وجہ سے یہ نام دہلیہ دیگ خطوط میں بھی خلی
یعنی انگریزی سپاہی مجھ ہے۔

۱۳ خطوط غالب ۳۹۵

آعطیہ یر اللہی ہے۔

اولیوسف مرزا سے جب خواجہ جان نے کہا کہ فیشن کی بجالی میں
والٹی رامپور نواب یوسف علی خاں باقم کا ہاتھ ہے تو انہیں جواب دیا۔
”خواجہ جان جھوٹ بول رہے۔ والٹی رامپور کو اس فیشن کے کھانا
میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خدا سنا ہے، بہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔
یہی اصل خلعت دربار کا بھی ہے۔ مرزا صاحب کو دربار میں داخل ہونے
دوسوں تجربہ پر کسی ملحق تھی۔ ہفت پارچہ دوسرے قوم چاہر خلعت میں
مطلق تھے۔ خد کے زمانہ میں اس کی بھی توقع نہ رہی ۱۸۶۳ء میں سربراہ برٹ
منگمری نے دربار کیا مرزا صاحب کو بلا دیا گیا تھا۔ لیکن ۱۳ مارچ کو کوٹ
نے لگا دیا اور خلعت عطا کیا اور بار کا شہرہ سنایا کہ ابتلا جاؤ وہاں دربار
ہو گا اور خلعت پاؤ۔ غالب نے اس کی اطلاع قریب قریب سب سنے
والوں کو دی ہے مگر بعض حضرات اس کو درست نہیں مانتے اور کہتے ہیں
کہ ہو سکتا ہے کہ غالب نے خلعت ملنے کی خبر اپنی کسی مصلحت سے اڑا دی ہو۔
ان حضرات کی یہ رائے اس نے تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ غالب نے جو حضرت
کی اطلاع دی ہے سب کو کھلے کھلے گوشہ نشین نے اپنی طرف سے
خلعت دیا۔ اس خبر کو بہنوں نے اخلاعات میں بھی شائع کرنے کی کوشش کی
ہے خط بنام منشی نو لکھنؤ میں بھی خط نے خلعت کا ذکر موجود ہے۔ یہ خط
اور اخبار میں شائع ہوا تھا۔ شیونرائٹ کو بھی خط لکھا ہے ان کا بھی اخبار
نکلا کرتا تھا قیاس ہے کہ اس میں بھی یہ خبر شائع ہوئی ہوگی۔ نواب یوسف علی
خاں والٹی رامپور منشی غلام خوش خاں نے خبر منشی لغٹ کو دینے والی
کو بھی لکھا ہے۔ اچھے حضرات کو غلط خبر دینی کسی طرح مناسب نہیں معلوم
ہوتی۔ اخبار میں اشاعت مفید ہی نہیں بلکہ مضرت ثابت ہو سکتی تھی غالب
ایسی غلطی کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں نواب
کلب علی خاں کو جو خط دربار اور خلعت کے سلسلہ میں لکھا ہے اس سے
یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ لغٹ کو دربار نے دلی
میں ایک دوبار تالیف قلوب کی خاطر کیا تھا جس میں صاحبان فن و کلام
کو شرکت کا اعزاز بخشا گیا تھا یہ عام درباروں سے جداگانہ نوعیت کا
دربار تھا۔ لغٹ کو دربار نے اردو میں تقریر کی تھی۔ اس میں خلعت و

امرتھا خطوط میں جا بجا اس کا اظہار پایا جاتا ہے۔ مسجدوں کے
انہدام اور ہندوؤں کے مکانات کی شان و شوکت کا مقابلہ جس
درناک انداز میں کیا ہے وہ پہلے گزر چکا۔ مولانا سالی نے یا نگار
غالب میں لکھا ہے کہ مرزا کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں
ہے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر
درج و تاسف ہوتا ہے؟ ان کے کلام میں اس موضوع پر بھی بہت
کچھ پایا جاتا ہے۔ جب پنجاب میں سکھوں کا زور تھا تو مسلمانوں پر
عصرہ حیات تنگ تھا، شمالی ہند میں سکھوں کے خلاف کافی فحش و غصہ
کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مولانا سید احمد شہید اور مولانا امینعل شہید نے
اپنی کے خلاف جہاد کیا تھا، مومن نے شرکت جہاد کی تمنا کی تھی۔
غالب نے بھی اپنی حسرت کا اظہار بارڈنگ کے قصیدہ میں جو
فتح پنجاب کی خوشی میں لکھا ہے، اس طرح کیا ہے۔

گزارش شیون من نیست راست یگیم دریں زمانہ مرا لیوے از زبان شباب
پے شکستن کفار پیستے بہ نبرد کمر بہ سر خوشی نیت حصول ثواب
اسی طرح ایک غزل میں درگاہ ربان حضرت میں کتنے اچھے
انداز میں شکوہ پیش کیا ہے۔

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را لے برسا بچھاں کردہ نے لب سبیل
غرض غالب نے خدا محرمات خدا نتائج خدا کے بیان میں
ملائی طبع کا شیون دیا ہے۔ انگریزوں کے موافق و مخالف تا خدات کا لہا
گزر چکا ہے۔ اب پیش اور دہا کے متعلق مختصر بیان کیا جا رہا ہے۔ انگریز
پیش ہی ۱۸۵۷ء سے بند ہو گئی تھی اور ۱۸۶۰ء میں بحال ہوئی۔ اس
سلسلہ میں انہوں نے متعدد طریقہ سے کوشش کی۔ ان کے احباب
اور قدر دانوں نے بھی خفی الامکان سی و سفارش کی، دوسروں کی سعی و
سفارش منظر عام پر نہیں آسکی، لیکن بمقتضائے ہمدردی اس سے انکار
کی بھی گنجائش نہیں کہ دوسروں نے درپردہ اس بارے میں ضرور مدد
دی ہوگی۔ مگر غالب اس کو عطیہ یر اللہی قرار دیتے ہیں۔

”میرا داد گیرے بچا کر امت اسد اللہی ہے۔ ان پیسوں فیشن کا ہاتھ

۱۔ یادگار غالب ۱۵۰

۲۔ کلیات نظم ۱۴۵

۳۔ کلیات نظم ۱۴۵

۱۔ خطوط غالب ۳۸۹

۲۔ خطوط غالب ۳۸۵

غالب کا کوہ گیارہ تھا اور کسی کو نہیں جس کا اظہار و انداد و بادشاہی بھی
ہے اور غنیمت گونہ نے بھی اپنی تقریر میں اردو کی تحریف کرتے ہوئے
اس طرح لکھتے ہیں: اس کی شہادت آپ کے مشہور شاعر مرزا نوشہ کے کلام
سے جن کو ابھی خلعت دی گئی ہے ظاہر ہے۔ کیونکہ معمول کے مطابق دیا
نہ تھا اس لئے اس میں خلعت ملنے کی توقع بے محل تھی اس لئے غالب نے
یہ صحیح لکھا ہے نہ مجھے احتمال، نہ صاحب کشنر بہادر شہر کو علم اور
غالب کے اس لکھنے کو ”بعد غد“ اگرچہ نہیں اور دربار بھل رہا۔
لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ سپہ پر معمول کرنا چاہیے۔

غالب کے انگریز حکام کے علاوہ دوسروں سے بھی مرام
تھے۔ جن میں منتر جان جا کوہ اور انگریز ہیدرے کا نام مرفوض
ہے انگریزوں کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”انگریز قوم میں سے جو ان روسیہ کالوں کے ہاتھوں

قتل ہوئے۔ ان میں سے کوئی میرا مہک کا تھا اور

کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست، اور کوئی میرا یار اور
کوئی میرا شاگرد۔“

شہر جان جا کوہ سے بہت دیرینہ مراسم تھے۔ یہ فارسی کا بڑا بھپا
ذائقہ رکھتا تھا۔ دیوان حافظ کو مرتب کر کے چھپوایا تھا غالب سے دیر
لکھنا چاہا مگر غالب نے تقریظ لکھ دی جو کلیات نشر میں موجود ہے۔
خط و کتابت بھی تھی۔ مکان اور کتبوں کی تاریخیں بھی لکھی تھیں جو کلیات
نظم میں شامل ہیں قطعہ ۳۳ میں اس کا زائچہ بھی نظم کیا ہے۔ یہ غدر
مار گیا تھا۔ ماتم علی تہر کو لکھتے ہیں:-

”ہائے سحر جان جا کوہ کیا جو ان مار گیا ہے اس کا

شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مالچ آتا اور فارسی

زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی نہیں

ہے جن کا میں حاجی ہوں۔“

اور منشی آفت کو تقریظ دیوان حافظ کے متعلق لکھتے ہیں:-

”جو تقریظ دیوان حافظ کی بموجب فرمائش میر
جان جا کوہ بہادر کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ
فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی
ہے اور باقی ساری نشر میں کچھ اور ہی مطالبہ ہیں۔“

انگریز ہیدرے ایک فرانسیسی خاندان کا فرد تھا۔ اس کے باپ
کسی ہندوستانی عورت سے شادی کر لی تھی۔ اور وہ بڑا اچھا فاع تھا۔
ابتداء میں زمین العابدین خاں عارف سے شرف تلمذ تھا۔ ۱۸۶۱ء جولائی
۱۸۶۱ء کو انتقال ہوا۔ اس کے بھائی تانس ہیدرے نے اس کا دیوان
شائع کرایا تھا جس میں غالب سے بھی تلمذ گور ہے مگر غالب کے
کسی خط سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اپریل ۱۸۶۰ء میں یوسف خوا
کو لکھا ہے:-

”انگریز ہیدرے صاحب میرے دوست کے

فرزند ہیں اور نیک نعت و سخاوت مند ہیں۔۔۔

۔۔۔ دوستوں میں میں نے انہیں خط لکھے مگر

انہوں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا اور ان مقدرو
میں سفارش بھی نہیں کی۔“

پھر ۱۸۶۰ء کو انہی کو لکھا ہے:-

”تانس ہیدرے صاحب سے میری ملاقات نہیں

ہے۔ ہاں الگ صاحب سے ہے، سوان کے ہاک کا

خط لکھا، جام کو بھیجتا ہوں۔“

میر جہدی بخروا لکھا ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”انگریز ہیدرے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہر ان کی

مصاحبت نہیں دونوں کچھ کو ضرور خط لکھتا رہتا ہے۔“

پھر انہی کو اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”انگریز ہیدرے شہر بہ الگ صاحب مر گیا۔ واقعی

بے تکلف و دیر حزنیز اور ترقی خواہ اور راج میں

لے خطوط غالب ۳۱

لے مقالات ماجد ۳۱

لے خطوط غالب ۳۱

لے خطوط غالب ۳۱

لے خطوط غالب ۳۱

لے غالب از ہر ۳۱

لے کلیات نشر ۳۱

لے ۔ ۔ ۔ ۳۱

لے ۔ ۔ ۔ از ۳۱ تا ۳۱

لے خطوط غالب ۳۱

حکومت دارالحکومت تھا پٹن کے مقدمہ میں جہاں ان کو
ٹھہرا پڑا۔ اس قیام کا اثر ان پر بہت اچھا ثابت ہوا۔ انگریزی ایجا
سے وہ شعوری اور لاشعوری طور پر متاثر ہوئے اور انہیں ایک
بگنے والے دور کا شدید احساس ہوا۔ ان کے طبی میلانات اس
دور آئندہ سے مناسبت رکھتے تھے چنانچہ وہ سب سے پہلے اس
آثار کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ایسے آثار قائم کئے
اور ایسے نقوش چھوڑے کہ ان کے بعد والوں نے انہی کو نشان راہ
بنایا اور ایک منزل ارتقا کی طرف قافلہ ٹرھایا۔ اس دور آئندہ کے
نشانات ان کے سلام میں بکثرت ملتے ہیں مثلاً :

مژدہ صبح دریں تیرہ خیام دادند شمع کشتند فذخو رشید خیام دادند
"مژدہ صبح" سے مراد دور آئندہ الذہ تیرہ شبان سے مراد دوستی و برادر
ہو تو کیا تعجب ہے اور مصرع ثانی ترقی کی نشان دہی کے لئے اشارہ ہو تو کیا
مید ہے مگر یہاں تاریخی شعور سے کام لیا جائے تو بات بنتی ہے کہ انگریزوں
نے ہندوستان کی دولت ضرور لوٹی، مگر ایک نیا ذہن اور جدید شعور
انہی کی بدولت حاصل ہوا۔ غالب کے معاصرین کا کلام دیکھئے وہ اپنے
مفروضہ، تنگ اور محدود دائرے سے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے مگر
غالب طرح طرح سے دور جدید کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک غزل ہے
جس کی روایف "مخپ ہے پوری غزل ایک پیام بیداری ہے شجیہ
وامتدار کے پیرائے ہیں بہت کچھ کہہ دیا ہے پوری غزل پڑھئے اور سوچئے
کہ غالب نے کیسے عالم میں بیدار کر کے کی کوشش کی ہے یا مخصوص یہ شعر :

سحر و میدہ و جل درو میدنت، مخپ!

جہاں جہاں بھل نظارہ چیدنت مخپ!

تو محو خواب و سحر در تاسف اندانم

بہشت دست بدندان گزیدنت مخپ!

نشان زندگی دل درویدنت مابیت

ملائے آئینہ چشم دیدنت، مخپ!

اور بہت سی غزلوں میں بھی احساس کارفرما ہے چند شعرا اور ملاحظہ
فرمائیے !

زخم کہ بگلی ز تبا شاہر انگسٹم

در بزم دنگ و بونٹے دگیسٹم

اور مجھ میں متوسط تھا۔

ان بیانات میں شاگردی کا ذکر کہیں نہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ عارف
کے انتقال کے بعد اس نے غالب سے غرور اصلاح لی ہوگی تا مگر
نے بھی اپنے دیباچہ میں اس کا اعتراف نہیں کیا، البتہ منشی شوکت علی صاحب
کے دیباچہ میں غالب کی شاگردی کا ذکر ہے۔

اب تک غالب کے انگریزوں سے روابط بیان کئے گئے۔ مجید
جان جاکوب اور لگنڈ ہڈرلے کے علاوہ اور وہ سے تعلق تمام تہذیب
فلسفہ اور ادب کے سلسلہ میں رہا۔ حصول عظمت و برتری کی خاطر
غالب ان روابط کے لئے مجبور تھے۔ اگر غالب نے انگریزوں کی مدد مافی
کے تھ تو ان کی برائی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ لیکن ان روابط نے
غالب کو فائدہ بھی پہنچایا ہے۔ غالب طبعاً جدت پسند تھے، شاہراہ غا
سے الگ چلنا بھی ان کی فطرت میں تھا۔ طبع معنی باب و فکر دور رس پائی تھی۔
پیش کے تفسیر میں انہیں مالی فائدہ تو نہیں پہنچا، مگر فکر و نظر کے لئے
اسباب انادیت فراہم ہوتے رہے۔ دہلی سے کلکتہ کو چلے راستہ میں
ججرات حاصل ہوئے۔ یہ احساس برتری ہی تھا کہ لکھنؤ میں محمد اللہ
آغا میر سے صرف اس لئے نہ ملے کہ اس نے غالب کی یہ دو شرطیں منظور
نہ کہیں اول یہ کہ نائب السلطنت غالب کی تعظیم دیں، دوسرے مذہب
کرنے سے معاف رکھا جائے باندہ، بنارس، مرشد آباد کھانپور میں
بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ بنارس بہت پسند آیا اس سے تعلق
مشنوی چراغ دیر ایک عمدہ مشنوی ہے۔ کلکتہ پہنچے۔ وہاں کی ادبی
کلامہ آرائی نے غالب کو غفلت مضمر نہ چنے میں بڑی تقویت پہنچائی۔
اس بحث میں بھی احساس برتری اور شعور کمتری کی آویزش کو ٹر بادل
ہے۔ ایرانیوں کی تعریف نے دل کے حوصلے بڑھائے۔ مرزا کوچک
ایک ایرانی فاضل نے بھی محفل میں غالب کے متعلق کہہ دیا کہ آج اس
درجہ کا شاعر سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں ہے۔ غالب کی صلح جوئی
بھی "اد مخالفہ" کے روپ میں دھلی۔

۱۔ خطوط غالب ص ۲۹

۲۔ مقالات ماجد ص ۱۰

۳۔ یادگار غالب ص ۳۰

۴۔ غالب از جہر حاشیہ ص ۱۲

تا ہادہ تلخ تر شود و سینہ دریش تر
بگدا ز مہم بگینہ و در ساغر انگنم
بخت و زواج است / ہنوز ہم کہ بیلاش کنم
بارہ غوغائے محشر کو کہ در کاوش کنم
ہیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم
قضا بگردش و طل گراں بگردانیم

اور اردو میں مشہور قطعہ :-

اے تازہ دار فان بساط چولہے دل
ز نہار گر تہیں ہوس ناؤ نوش ہے

میں جو کیفیت ہے اس کو دیکھتے ہو تو آواز گوش حقیقت بیوش ہی کی ضرورت ہے کہ نہ نکاس کا سرچشمہ نہ اسے سروش ہے گویا دم کوڑتی ہوئی مغلیہ تہذیب کی تصویر ان کے علاوہ غالب کی پیش بینی اور نئے دور کی طرف کھلے اشارے، آئین اکبری کی تقریظ میں ملتے ہیں جو سرسید احمد خاں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی اس مثنوی میں انہوں نے سرسید احمد خاں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پہلے آئین درویش کو چھوڑ کر نئے آئین و ایجادات کی طرف متوجہ ہوں۔ دیکھیں کہ انگریزوں نے دغائی شتی، ریل، موٹو، ٹیلیگراف، ٹیلیفون، گراموفون، گیس کی روشنی، دیاسلٹ وغیرہ ایجاد کی ہیں اگرچہ سرسید احمد خاں نے اس وقت اس مثنوی کو قبول نہ کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ غالب نے یہ بات اپنی روشن طبع اور باطن نظری کی وجہ سے بہت پہلے محسوس کر کے لکھ دی تھی۔ غالب کی نگاہ دور میں، اس قدیم دور در تہذیب کو ختم ہونے دیکھ رہی تھی۔ اے ایک نئے دور کی آمد کا شعیر احساس تھا۔ اس سے دور جدید کی طرف رخ بدلنے کا عمل بین طور پر دکھائی دیتا ہے جس کی روح، عقل، عمل اور تجسس ہے۔ تاہم ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید احمد خاں کو غالب کے بتائے ہوئے راستہ کو اختیار کرنا پڑا۔

غالب نے صرف انگریزوں کی ایجادات اور آئین ہی کی طرف توجہ

نہیں کی بلکہ انگریزی زبان کے الفاظ کو بھی بکثرت استعمال کیا ہے۔ ان کے معاصرین کے ہاں اس کثرت سے نہیں پائے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن حالات سے انہیں دوچار ہونا پڑا ان کے ہم عصر، ان حالات سے بہت دور تھے۔ فنن کے تفسیر اور مقدمہ، بندش اور سجائی غنعت و دربار کے معاملہ میں انہیں بعض انگریزی لفظوں سے واسطہ پڑا اور انہیں بے محلف اپنی اردو اور فارسی تحریروں میں استعمال کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں،

”چاہی، کہ بانی فارسی اور پلے حلقی ہے کالی اور پانی اور پانی یہ کافیہ ہمدگر ہو سکتے ہیں۔ چاہی، لغت انگریزی ہے۔ اس نزلے میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے۔ بلکہ مزاد تیلے، نا زکی اور دغائی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دئے ہیں۔ اور وں نے بھی باندھے ہیں اور بکاری اور طلبی اور موجود اور ی اور سرشتہ داری، خود یہ الفاظ میں نے پاندھے ہیں۔ چاہی بہ محلی کلید شوق سے لکھو نہ چاہی“

الفاظ کا اصطلاحات کے علاوہ بہت سے لفظوں کا ترجمہ بھی کیا ہے مثلاً، ماچس کو انگریزی دیا سلائی۔ نوٹ کو آئین کی تصویر، عکس کی تصویر، مارشل لا کو جنرلی بندوبست۔ گورنر جنرل کو حاکم اکبر لکھا ہے۔ دیکھئے ! صاحب، امیم اور بابا کو کیسے عمدہ طور سے اپنے بیوی اور بچوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ پھر صاحب اولیم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ چک، نوٹ، پلوٹ کو نظم بھی کیا ہے :

آرے نہ چک بود نہ تمسک نہ ہر کہ ہست
لے دستخط نہ ہرن نام و نشان دوست
مضمون شعر نوٹ بودنی زمانہ
یعنی بدست ہر کہ بیفتا دان دوست

غالب کے نزدیک ولایتی یعنی انگریز اور دو کو کا حقہ نہیں سمجھ سکتے تھے یہ حبیب اللہ خاں ڈاکو لکھتے ہیں :-

”آپ ولایتی ہی نہیں جو میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اردو

لے خدر کے بعد جیلوری ظاہر ہے غالب کی پیش بینی قابلِ داد ہے۔

لے مثنوی کلیات نظم ص ۱۰ اس سلسلہ میں میرا مضمون غالب اور سرسید مطبوعہ ماہ و شمارہ بابت فروری ۱۹۶۱ء کی ملاحظہ کیا جائے۔

لے خطوط غالب ص ۵۴

لے خطوط غالب ص ۵۴
لے کلیات نظم ص ۱۰

مولانا ابوالکلام آزاد کے بیان میں ہمیں اس لئے قائل ہے کہ غالب نے پنج آہنگ کا دیباچہ اور آہنگ اول ۲۵ میں ارجحاً لا تین لفظوں میں مرتب کر دیا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں،

”ادب نامہ اس جانتا ہے کہ نگارش میں میری روش

یہ ہے کہ جب کاغذ و قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو کہتا ہوں

کو اس کے مرتبہ کے لائق لفظ سے خطاب کرتا ہوں

اور مدعا بیان کرنے لگتا ہوں۔ القاب، آداب

خیریت گوئی اور عافیت جوئی حشو و زاید میں

دیباچہ ہی میں مکتوب نگار کو ہدایات فرمائی ہیں بیشیز امور کو ترک کرنے اور اختیار کرنے کے متعلق لکھا ہے ابتدا میں لکھتے ہیں:-

”نامہ نگار کو چاہیے کہ نگارش کو گذارش سے الگ

ذکرے تحریر کو تقریر کا رنگ دے۔ مطلب کو اس طرح

ادا کرے کہ اس کا سمجھنا دشوار نہ ہو۔“

غرض غالب کے دیباچہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا چاہیے

نہیں کہ یہ اسلوب ان کا اپنا ایجاد کردہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ

انگریزوں سے ان کے مراسم نہ تھے۔ سبکدستی کی سیر تو درکنار سفر

سبکدستی کا خیال بھی نہ تھا۔ مولانا آزاد نے قیاس سے کام لیا ہے تحقیقی

بات نہیں ہے۔ مگر پبلٹ ذلتا تر کی ہے آجکل دہلی بابت ستمبر ۱۹۵۲ء

میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں غالب کی طرز خطوط نویسی کو غالب کی

ایجاد تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ منشی راجندر کے ایک مضمون مطبوعہ رسالہ

محبت ہند جلد ۲۹ بابت دسمبر ۱۹۴۶ء و جنوری ۱۹۵۰ء سے اثر

پذیر گیا کہ نتیجہ اور کامیاب تقلید کا نمونہ قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق

پھر کبھی سیر حاصل بحث کی جائے گی سر دست یہی کافی ہے کہ ۱۸۲۵ء

کی تحریر کی موجودگی میں یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ منشی راجندر کا مضمون

غالب سے استفادہ کا نتیجہ ہے۔

اختصار یہ امور بد گوارہ ہمارے نزدیک رابطہ ترجمہ میں چہاں کا

جوابت سے استنباط مطلب اچھی طرح ذکر کر کے ہے

انگریز اور دو سے نا بلند ہونے کی وجہ سے غلط اردو بولتے تھے اس کے

متعلق میں اشارہ کرتے ہیں مثلاً ”اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟ یا ایک

اور جگہ لکھتے ہیں فریاد مؤنث، فریاد کر لینی چاہیے۔ فریاد کر لینا، انگریز

بولد ہے۔“ غالب اس فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آج ہم بھی یہی کہتے ہیں

کہ اردو کو انگریزی محاورہ سے بچایا جائے۔ انگریزی کے رواج کے متعلق

لکھتے ہیں۔ ”مگر، جنو، پھانسی انگریزی لغت ہے۔ انگریزی زبان نے

بنگالے میں سو برس اور دہلی، اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا“

غالب کی تحریروں میں بعض انگریزی لفظوں کا تلفظ بدلا ہوا ہے

مثلاً لاٹو کو لاٹو اور لاٹ لکھتے ہیں بیش کو بیش، بریکٹیر کو برگڈیر،

سائیکلیٹ کو سارنی فلٹ، اسٹیشن کو اسٹین، کیمپ کو کپ اندر

کنپ، نمبر کو لمبر لکھا ہے مرزا جاں نخت کے سہرے میں لمبری نظم کیا ہے:-

سہرے چڑھنا کچھ چھینکے پہلے طرف کلاہ

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترابرس سہرا

اسی طرح محک کو کسی معنی میں استعمال کیا ہے بلکہ اسٹارپ،

محک۔ اجابت نامہ رپٹ محک۔ ملاقاتی کا رڈ۔ انگریزی الفاظ کی

ایک فہرست آخر میں شامل کی جا رہی ہے۔

غالب کی اردو و نثر میں، خطوط قابل ذکر ہیں۔ ان کی طرز

تحریر کے متعلق اکثر حضرات کا یہ کہنا ہے کہ یہ انگریزی طرز سے تاثر کا

نتیجہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں،

”خط و کتابت میں قدیم اسلوب القاب و خطاب سے کئی

احترام اور محض کسی ایک نام و لقب سے یاد کر کے براہ راست حرف

مطلب پر آجاتا، جو اس جہد میں ایک غیر معمولی بات تھی۔ یقیناً انگریزی

اسلوب کے تاثر سے سامنے آئی۔“

۱۔ خطوط غالب ۱۸۵۵ء

۲۔ خطوط غالب ۱۸۵۹ء

۳۔ خطوط غالب ۱۸۵۵ء

۴۔ خطوط غالب ۱۸۵۵ء

۵۔ غالب از ہر مکتبہ

۱۔ کلیات نثر مش

۲۔ کلیات نثر مش (نور)

۳۔ کلیات نثر مش (ترجمہ)

اب میں غالب کے بہتے ہوئے انگریزی الفاظ کی فہرست پیش کرتا ہوں:

1. TICKET. ٹکٹ
2. GOVERNMENT. گورنمنٹ - گورنمنٹ
3. PENSION. پنشن
4. DIVISION. کمشنری
5. DOCTOR. ڈاکٹر
6. CAMP. کیمپ - کیمپ
7. AGREEMENT. اگریمینٹ
8. COLLECTORATE. کلکٹوریٹ
9. INCOME TAX. انکم ٹیکس
10. PARCEL. پارسل
11. TIFFIN. ٹیفن
12. DEPUTY. ڈیپٹی
13. COMMITTEE. کمیٹی
14. RAIL. ریل
15. REPORT. رپورٹ
16. AGENT. ایجنٹ - ایجنٹ
17. POST PAID. پوسٹ پیڈ
18. DEPUTY COMMISSIONER. ڈپٹی کمشنر
19. REPLY POST CARD. ڈیل خطا پوسٹ پیڈ
20. MARTIAL LAW. جرنیلی بندوبست
21. BANK. بینک
22. REGISTERED. رجسٹری
23. GOVERNOR GENERAL. حکم اکبر گورنر جنرل
24. POCKET. پاکٹ
25. LIEUTENANT GOVERNOR. لفٹننٹ گورنر
26. PAMPHLET POCKET. پمفلٹ پاکٹ
27. BABU. بابو
28. COPY. کاپی
29. FRENCH. فرنچ (کاغذ کا نام)
30. NUMBER. نمبر، نمبر

تعلق تمام تر خاندانی اعزازات کی برقراری ہم سے نہیں بلکہ غالب کی معیشت سے بھی گہرا رابطہ ہے۔ اور ان دونوں نے نفسیاتی طور پر ان کو متاثر کیا تھا۔ البتہ جدید آئین و سجاوٹ سے دلچسپی ان کی ترقی پذیر طبیعت اور جدت پسند فطرت سے مناسبت کے باعث ہے۔ وہ خود ماحصا دتھ ماکوڑ کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ انہوں نے "مے فرنگ" میں نفاست، لذت، بول رنگ، ہتھکڑیاں، اس کے فرنیچر جو گئے۔ اولڈ ٹام، فرنگ، شام چین، کاس ٹین، وغیرہ سے رغبت ہو گئی۔ اور شراب قندہ می ہند سے ہمیشہ نفرت رہی بلکہ اس کے مقابلہ میں شراب کشمیری کو بہتر خیال کرتے تھے:

غالب شراب قندہ می ہندم کباب کرد

نرس بعد بادہ بائے گوا لاکشید کرد

شراب قندہ می ہند وستان دھام نہوت

ز شہرہ خانہ کشمیر آدرند شراب

ان رد و بط کے سلسلہ میں باب چھرا سکر کر پڑا جاتی ہے کہ غالب کی زندگی کے حالات زمانہ کی تاریخی رو سے متصادم ہوئے اور غالب کو کبھی کسی اپنے بلند معیار سے نیچے اتار کر باتیں کرنی پڑیں۔ نہ صرف انگریزوں کی مدح سرائی بلکہ مسلمان اور ہندو زعماء اور حکمرانوں کی شان میں قصیدہ خوانی بھی ان منزلے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ خود کہتے ہیں:

لیک ناہد زمیں کہ درخشاں

مدحت لارہ سو رواں گنم

صاحبان دولت و حکومت کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی میں جو وقت برباد ہوا اور جو قوت بیان ضائع ہوئی ان کا احساس برتری اس پر آخر میرزا آف، س کرتا رہا۔ تعلیمات میں اپنی زندگی کا محاسبہ کرنے پر وہ لکھتے ہیں:

"دہوائے گہاں بالا خوانی زدہ ام و دل وایک

خود را بشکر نی ستودہ ام، نمہ راں شاہد زبیت

یعنی ہوا برستی و نمہ دیو تہ آفرینا نیست یعنی ہوا خوانی

... شاد م انداز دی کہ بد سخن بھی عشق باز

گزارہستم، و داغم آرا ز مندی کہ درنی چند بگردار

دنیا طلبان، و مدح اہل جاہ سیرہستم۔"

ملکیت اثر صاف و ملکیت نظم مش

ماہنامہ کراچی، جنوری ۱۹۴۴ء

31. COUNCIL.	کونسل	63. PRESIDENT.	پریسیڈنٹ (پریسیڈنٹ)
32. FRAME. (PLATE)	فریم	64. LONDON.	لندن
33. SECRETARY.	سکریٹری	65. ENGLAND	انگلینڈ
34. FRENCH.	فرنگ (شراب کا نام)	66. COMMANDER-IN-CHIEF.	کمانڈر چیف
35. CAMPAIGN	شام بین	67. POST MASTER.	پوسٹ ماسٹر
36. POLICE.	پولیس	68. STAMP.	اسٹامپ
37. STAMP PAID.	اسٹامپ پیڈ	69. PERMIT.	پریمٹ
38. DOUBLE TICKET.	ڈبل ٹکٹ	70. COMMISSIONER.	کمشنر
39. GAZETTE.	گزٹ	71. COURT.	کورت
40. LORDS.	لارڈ۔ لارڈ۔ لائٹ	72. TELEGRAM.	تار برقی (ٹیلیگرام)
41. SECRETARY.	سکرٹری۔ سکرٹر	73. FINANCIAL COMMISSIONER.	فینانشل کمشنر
42. SICK NUMBER.	سکد لبر (بیمار)	74. NOTE.	نوٹ
43. CERTIFICATE.	سرٹیفیکٹ۔ سارقی ٹکٹ	75. CHEQUE.	چک
44. LIQUOR.	لیکور	76. SESSIONS JUDGE.	سشن جج
45. TICKET.	ٹکٹ (ملاقاتی کارڈ)	77. EXTRA ASSISTANT.	اکسٹرا اسسٹنٹ
46. DEPUTY COLLECTOR.	ڈپٹی کالیکٹر	78. BOX.	بکس
47. COMPANY.	کمپنی	79. HOSPITAL.	اسپتال
48. APPEAL.	اپیل	80. GALLIOWS.	گل (پھانسی)
49. ENGLISH.	انگلس	81. COSTUME (?)	کاسٹم (شراب)
50. POST.	پوسٹ (ٹکٹ چسپاں)	82. OLD TOM.	اولڈ ٹام (شراب)
51. PAID.	پیڈ (ٹکٹ چسپاں)	83. QUEEN'S POET.	کونٹس پوسٹ
52. STATION.	اسٹیشن	84. BRIGADIER.	بریگیڈیئر
53. COURT OF DIRECTORS.	کورت آف ڈرکٹر	85. GENERAL.	جنرل
54. REVENUE BOARD.	ریونیو بورڈ	86. INDIAN GOVERNMENT.	انڈیا گورنمنٹ
55. RESIDENT.	ریسڈنٹ۔ ریزیڈنٹ	87. BARRACK.	بارک
56. RESIDENCY.	ریسڈنسی۔ ریزیڈنسی	88. MISS.	مس
57. AGENCY.	ایجینسی۔ ایجنسی	89. MISTER. (MR)	مستر
58. AGENT.	ایجنٹ۔ ایجنٹ	90. TICKET. (PERMIT)	ٹکٹ (اجازت نامہ)
59. DECREE.	ڈگری	91. STEAMER.	دھانی جہاز
60. MAGISTRATE.	ماجسٹریٹ	92. MATCH.	انگرمیری دیاسلائی
61. ASSISTANT SECRETARY.	اسسٹنٹ سکرٹری	93. COUNCIL.	کونسل (باہمی مشورہ)
62. CHIEF SECRETARY.	چیف سکرٹری		

باقی صفحہ پر

”گنجفہ بازِ خیال“

(ایک تصور یہ)

رفیق خاور

وہی ہے۔ وہی خنزہ معصومیت جس میں کثافت کا کوئی شائبہ نہیں۔ وہ پست دیوار جس کے عقب میں وہ اس قدر متانت سے جلوہ افروز ہے، اس کے پر تو جمال سے کیسی سنور گئی ہے! دیوار پر ہمارے نام کندہ! ان کی بجائے گی میں کس قدر کیف ہے! ایک مقدس محراب پر اب دی اقسام! یہ دیوار پر لکیریں جیسے مرمریں کف دست پر ہمدرد پیوستہ خطوط، یہ سبز زنگری۔ کچھ بھی نہ ہوں پھر بھی سب کچھ ہیں۔ یہ کیا طلسم تھا جس نے مجھے اس قدر محو کر دیا! میرے دست حویلی کی چھت پر کنگوے اڑا رہے تھے۔ کیسے عجیب و غریب کنگوے تھے اور ہم کس ذوق و شوق سے حلقہ باندھ کر لایا لیا نہ رقص کرتے، گاتے اور تالیاں بجاتے تھے۔ ایک ایک کر کے دور اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اڑتی ہوئی پریزاد جیسی نکلیا کو طرح طرح کے پھیر دیتے اور بھاؤ تانے کی ان گنت صورتیں پیدا کرتے۔ اس سے بے خبر کچھت کے نیچے مگر دالوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اور جو یہی اس حلقہ میں کھڑے کھڑے مجھے دور سے لغت کی جھلک دکھائی دی! جیسے یکلخت قدیم ایرانی کاریگر کا ایک جھلکی برنجی طبقہ نظر کے سامنے جھگا اٹھے، میں سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف ایک بے پناہ داپہیت کے ساتھ دوڑ پڑا۔ جیسے ایک نہایت قوی مقناطیس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ وہ غلوٹا کم سی تمکنت کی تصویر تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُس نو مشقی کے عالم میں بھی بے اختیار کیا جست شعر منہ سے نکل گیا جیسے عین وقت پر روح القدس کی طرف سے فیضان ہوا ہو۔

خوشیوں سے تماشہ ادا نکلتی ہے

نگاہ دل سے تری مرمر سا نکلتی ہے

باتی غزل تو برسوں بعد جیسے بنی سو بنی مگر خلوص اور واقفیت نے مطلع میں جو رنگ پیدا کر دیا ہے، اسی کا حصہ ہے لغتہ سر پہ لپکا

یہ روشنیاں بعض دھیمی دھیمی دھندلی دھندلی بعض نکستی بجھتی اور کچھ ایسی جیسے وہ بگڑ چکی ہوں یا کبر کے بوجھل پردے میں روپوش ہو چکی ہوں۔ یہ سلسلہ دور تک پھیلا ہوا۔ بہت دور! اس قدر کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے نگاہ ابلہ پا ہو جائے۔ کتنا دلچسپ اور عجیب ہے! وہ آخری قندیل۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کوکشی تیز ہو گئی! اس کی حرارت سے شیشے پرچی ہوئی نہی کتنی سرعت سے نیچے اترتی جا رہی ہے۔ ہوا وہی سماں جو میں نے کلکتہ کی ایک فرنگی تماشہ گاہ میں دیکھا تھا! جہاں صبح صادق کے مانند کھلتے رنگ کا اجلا اجلا پردہ سرکنے کا عمل ہو رہا ہے۔ صغودی نہیں۔ جیسے اک بھگا ر آتشیں رخ کے تابناک چہرے سے ملاحت آمیز انگوری، سیمائی، آنجل اغزیہ لغزیدہ مائل بنشید ہو۔ تمازت آفتاب کی بدولت آج سے تمام دن کے ابھرتے ہوئے بخارات بھی تو کچھ کم طلسم آفریں نہیں جو پہنائے نظر میں کسی ہروش کے صندلی شانوں پر شبرنگ زلفائے پریشاں کا سماں پیدا کر رہے ہیں۔

چاندنی چوک کی یہ دلاؤ نریاں کیونکر خاموش کی جاسکتی ہیں۔ میزب نماہر جیسے کسی نے دور تک سیال چاندنی بچھا دی ہو۔ شام کو انسان یہاں نہ آئے تو کہاں جلے۔ لو، قندیل ہلک جھپکنے میں اور تیز! اس قدر خیر و کن! کیونکہ بخارات کا ملل کی طرح باریک غلاف اب بالکل اتر چکا ہے اور روشنی اپنی پوری برائی کے ساتھ کسرت کے شفاف سینے سے چھین چھین کر آنے لگی ہے۔ بار اہنا! یہ کون سے کی لپک! جیسے جبریل امیں دفعتاً اپنی پوری اہامی وجاہت اور کور فرمے آشکار ہوں۔ لغتہ! ہو ہو وہی! وہی ملگو تو جہیں! وہی بلا ہوتی چروا ایک پرچمیں شعلہ جوار، مہار اور حقیقت کے جمیل ترین امتزاج کی کی فروزاں تھلیل تھلیلک برس ہونے کو آئے لیکن اس کا زردانی شکوہ

نظر آتی تھی۔ اللہ اللہ! میرے لئے — جذباتی اور وجدانی نشے —
اس کے مافوق البشر رنگ سے کیسے شاداب و سرشار ہوئے۔ اور
ان کی مستیوں میں رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں دوڑ دوڑ کر میرے
اشعار۔ ان کے بھور۔ ان کے ترنم۔ ان کے لفظ لفظ میں کسی التہابی
شعریت کے ساتھ سرایت کر گئیں۔ اس اویں احساس غیرے
دل و دماغ کے ہنساں خانوں میں کیا کیا پڑکار یا دیں چھوڑ دی ہیں۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کا دوبار شوق کسے
ذوق نظارہ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شور سودائے خط و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
بس بس یہیں تک۔ اس غزل کا برا ہو۔ آدمی چلتا کس طرف ہے
اور یہ اسے کھینچ کھینچ کر کہاں لے جاتی ہے۔ معاذ اللہ! میں یہ غزل
نکلتے نکلتے بہک کر کہاں کا کہاں چلا گیا۔ یہ بھی میں نے کہنے ہی کو
کہہ دیا تھا کہ ”اب وہ رعنائی خیال کہاں“۔ ورنہ خوب جانتا ہوں
میری شخصیت، میرے کلام کا کوئی ذرہ بے پر تو خیر شید نہیں۔
اس میں نغمہ ہی کی بھرپور رعنائی کا تامل ہے۔

طبع انسانی ہی کی طرح فرما شہ ہے۔ یہ احساس تھا کہ کلاور
اداکب ہوا۔ گویا میں اسے اتنے برس اپنے ساتھ لئے پھرا۔ اب کسی
کو یہ بتاؤں تو وہ مجھ پر بے اختیار ہنس دے گا۔ کہے گا ”بچ بچ
سٹھیا گئے ہو۔ لیکن یہ راز تو میں ہی جانتا ہوں کہ جب قوی مضحل
ہو گئے اور عناصر میں کوئی اعتدال نہ رہا۔ تو کوئی کرشمہ غیبی رسولؐ
دل کی تہوں میں خریدہ احساس کو بروئے کار لے آیا۔ اب اگر
اس میں بچنے کے چھل پن اور شباب کے شور و مستی کی بجائے بڑھاپے
کی مٹھل انصافیت نہ ہو تو اچھا کیا ہو؟

ایک محبت ثبات پیدا کرتی ہے، دوسری بیزاری۔ نغمہ
نے — میں اسے محبت کہوں یا وفاق روحانی مجھے اس محبت
کا کیف سردی عطا کیا جو ثبات پیدا کرتی ہے۔ یہ بھی اس کے ”ماون کراچی“

تک جلال تھی۔ اس کی نموشی میرے لائیاں بن پر ایک تین سرزنش
تھی۔ وہ میرے دل و دماغ پر یہ گہرا نقش ثبت کر کے نہ جانے
کہاں چلی گئی، مگر خلاؤں میں روپوش ہو گئی۔ لیکن کوئی خلا سے جذب
نہیں کر سکتا۔ وہ اب بھی جب چاہے سراپا دہ اسرار سے نکل کر اسی
سطوت و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ نغمہ مجھ سے دور نہیں
ہوئی۔ وہ میری تھی، وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی اور زندگی کی حبیب
پستیوں۔ فاختانہ سر بلند یوں۔ شدید سے شدید بھانوں عظیم عظیم
طوفانوں اور زبوں سے زبوں فتنوں میں میرے ساتھ رہی جیسے
خود حسن مثالی کی شان کبریائی کائنات سفلی پر دائما پر تو ڈالتی ہے۔
اسی طرح اس کلمہ پیکر جمیل بھی میری ہستی پر پرتو فگن ہے۔ میری زندگی
کے ہمیشہ دو دھارے رہے۔ نغمہ نے دفعہ نمودار ہو کر ان میں ایک اور
زبردست دھارا ملا دیا۔ اس نے زیریں دھارے میں — میں اسے زیریں
ہی کہوں گا کیونکہ گویہ بظاہر اترنا نمایاں نہ تھا لیکن تھا زیادہ گہرا اور پڑھ
— ایک طوفانی کیفیت پیدا کر دی جیسے قدرت نے اس کو دفعہ
ایک اور ہی قوت اور گیرائی عطا کر دی ہو۔

مجھے خوب یاد ہے۔ اس دن اور اس کے بعد جب بھی میں
تاج محل گیا مجھے اس میں ایک اور ہی شان، اور ہی معنی دکھائی دیے۔
مجھے اس میں نغمہ ہی نغمہ تحلیل نظر آتی تھی۔ اور اس کی نمکنت نے اسے
مناات سے ماورا منات، جمال سے ماورا جمال عطا کر دیا تھا۔ اور
تاج محل پر ہی کیا منحصر ہے، مجھے اپنے ہر فعل، ہر خیال، ہر لفظ اور قدرت
کی ہر چیز میں ہی شان اور جمندی دکھائی دینے لگی۔ اب اس قدر دل نے
دفعہ روشن ہو کر جو یہ کہربانی صورت اختیار کر لی ہے۔ تو اس سے
مدح میں پھر کس قدر تجلیاں بھوٹ رہی ہیں اور کتنے ہی تار تپ تپ
کر دینے لگے ہیں۔ سرخ رنگ بھی کیا قیامت ہے۔ مجھے پھر یاد آیا۔
اس شعر نغمہ کی کیسی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ ہاں ہاں نغمہ ہی کے
شفق گول چہرے کی چھوٹ،

نشہ ہا شاداب رنگ دسا زہامت طرب
شیشے سے سرو سبز جو تبار نغمہ ہے

اب کسی کو کیا معلوم کہ یہ سچ کے نشے یا کتنا رجو مضل تاؤ نوش کا
ذکر نہیں بلکہ شیشے سے کسی کے جمیل پیکر کی مبدل صورت ہے۔
جو نو برس کی عمر میں بھی سرو کی سی بلندی اور تحمل پیدا کرتی ہوئی

ہونے کا عجیب کرشمہ تھا۔ یہ حسرت آمیز غزل اس ہی کی تھیں،
یار دروہد جوانی بہ کنار آمد و رفت
ہنچو عیدے کہ بہ ایام بہار آمد و رفت
یہ کیا لطیف درد تھا جو نغمہ نے مجھے عطا کیا اور روپوش ہو گئی۔
کیا خبر ظہوری کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوا ہو اور اس نے میرے ہی دل
کی کیفیت شعر کے پردے میں یوں کھول کر رکھ دی ہو۔
شد طیب ما محبت۔ منتشیر جان ما
محنت ما، راحت ما، درد ما، آزار ما
اور رومی کی روح ابدالاً باتک خوش رہے جس نے یہ ترانہ الہامی
انشا کیا:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طیب جمد علتہائے ما

کچھ ان اشعار کا دلہانہ کیف۔ کچھ احساس جبلی اور کچھ طبع زود رس
اور تخیل شکر فکار کی کار فرمائی۔ یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں
تھا۔ مجھے بھی ان کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس احساس کی ترجمانی
کرتے ہی ہن پڑی۔ کیا اچھا ہو اگر اس احساس میں ان دونوں اہل دل
اور میرے شعور کی رو میں بیجا ہو گئیں۔ یہ احساس میرے دل پر چھا گیا،
میرا بن گیا، میں اسے اپناتے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا مجال کوئی خیال ایک
اپنی ندرت، مسائل حیات پر غور و فکر یا دوسروں سے اثر پذیری
کے سبب ایک بار ذہن میں جاگزین ہو جائے اور نطق کے سانچے
میں نہ ڈھلے۔ چنانچہ یہ گراں مایہ احساس بھی لباس نغمی سے آراستہ
ہو کر رہا اور کس شان سے:

عشق سے طبیعت نے زلیست کا مزا پایا

درد کی دو اپائی، دردِ لا دوا پایا

اس میں "درد لا دوا" کی رمز خفی اور کسک کو میرے سوا

اور کون جانے؟ ہائے یہ شور یدگی! یہ مستی! اس نے مجھے
کہیں کا نہیں رکھا۔ خوب یاد آیا۔ جب میں اور تفرقے سے
کھڑے تھے۔ ایک تمام حسن، ایک تمام شوق۔ ایک سراپا تجلی،
ایک سراپا نظارہ۔ اور ہم ایک خاموش تکلم سے اپنے واردات
کو تشکیل کر رہے تھے تو میں ایسا محسوس کرتا تھا گویا قدرت نے
مجھے ایک لباس فاخر پہنا دیا ہے۔ میں اتنا سر بلند ہو گیا ہوں

کہ میرا سر آسمان بوس ہے اور جسم کی گیرائی کو تمام آفاق پر مستولی
خدا جانے یہ کیسا احساس تھا۔ ایک عجیب احساس۔ اور پھر
عجیب تر پیکر میرے شعور میں کچھ ایسی دکاوت۔ حواس میں ایسی
تیزی اور تخیل میں ایسی براہِ نیچہنگلی پیدا ہوئی گویا دفعہ مجھ پر
سیفکڑوں دروازے کھل گئے۔ دل کی حقیقت ترین تہوں سے خیال
پر خیال شلالہ وار بلند ہوئے یہ کیوں ہوا۔ کیسے ہوا؟ آج بھی میری
عقل اس سلسلہ میں میری ذہنی نہیں، کئی تینتی عجیب بات ہے میں
نے کاوش فکر سے تو کبھی ان خیالات کا ادراک کیا ہی نہیں تھا۔
نہ مجھ پر سچ کچھ کوئی کیفیت طاری ہوئی اور نہ کوئی ایسے ارباب
ہی تھے جو میں نے کبھی قبول کئے اور دل کے گوشے میں محفوظ کر لئے
تاکہ انہیں دریا برد ہونے کے بعد پھر برآمد کروں مگر کوئی یہ
کہے بھی تو میں نہیں مانوں گا نظر اہری قوی نے اس حشر خیز حالات میں
حقہ لیا۔ پھر یہ یک بیک نمودار کیسے ہو گئے؟ میں تو یہ سوچتے سوچتے
حاجز آ گیا ہوں۔ شاید ہم ان اجرام سماوی کی طرح ہیں جو روشنی کے
ایک سیمائی غبار میں گردش کرتے ہیں۔ اس لئے جوں جوں ہم اس
کے مختلف طبقات میں داخل ہوتے ہیں۔ کوئی طلسماتی پارہ دچا
ہوتا ہے۔ یا پھر یہ ستارہ ستارہ غبارِ شایرہ انسانی فطرت کے
عالمِ صغیر میں پہنچا ہے، جزا اتر آئے، اکبر بھوسے۔ اگر اسے عجیب
ذہنوں تو اور کیا کہوں!

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

آج یہ پرانی یادیں پھر میرے دل میں رہ رہ کر گہراں بھری

ہیں؟ یاد آئے دو۔ یہ یادیں بہت لطیف ہیں۔ یہ میری تمام
زندگی کا حاصل ہیں۔ محبت کیا ہے؟ نغمہ کی ملاقات نے مجھے پہچنے
پر مجھ کو دیا۔ کئی دن تک نہ کھیلنے کو چاہا اور نہ کہیں آنے جانے کو۔
میں اپنے آپ میں کھو گیا تھا۔ چاندنی رات کو برجِ مٹھن کے پاس
جہاں سے تلخ محل کا گنبد نورِ اعلیٰ نور دکھائی دیتا تھا اور کائنات
کے بقعہ نور میں ایک اور جگہ نورانی معلوم ہوتا تھا۔ ایک گھاس
کے تختے پر بیٹھ جاتا۔ اور سوچنے لگتا۔ چاندنی کی طرح صاف و صلی
ہوئی محبت میں بھی کیا جاوے! دور جہاں کی ہر ہلکی، ہلکی، دھیمی، دھیمی،
مگناتی ہوتی ہرول کی طلسمی آواز مجھے نغمہ کا خاموش محکم معلوم ہوتی۔

جس میں وہ دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ ہر چند نغمہ سے دید و وادید فبات آشنا نہ ہوئی پھر بھی قدرت اس کا بدلہ ہی گئی۔ اس کے رنگارنگ جلوے اس کا کس پیش کرنے لگے اور ان میں باوجود مغایرت ایک شادی وحدت منعکس ہوئی۔ کائنات کے ذرہ اقصیٰ پر ایک انتہائی مجسمہ نصب ہو گیا جس کے پاؤں دنیائے آب و گل کی قدم گاہ پر ٹپکتے تھے۔ یہ مجسمہ نغمہ ہی کا بروز تھا۔ آخر یہ کائنات ایک "ایندھی آتش" کا فروغ نہیں تولد کیا ہے؟

اب پھر وہی طلسم ایک وجد۔ ایک استغراق کی لہر مجھے اپنے جسمانی حدود سے پرے لے گئی۔ وہی عشق کی دالہ نہ شورش جواش کو صوفیا کی مستی و حال سے روشناس کرتی ہے۔ ہاں ہاں یہ صوفی بھی تو دیوانگان عشق ہی کے ہم طبع ہیں۔ انہیں سماع اور حال کی طلب کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ ایک محیط اعظم میں پہنچ جائیں۔ کائنات اول کس کا محیط؟ شاید دونوں کا۔ اس کا سبب؟ دنیائے مجاز سے گریز؟ نہیں۔ بلکہ ایک وسیع تر عالم کا ادراک۔

ہاں تخیل کی لہر مجھے دور لے جاتی ہے۔ وہ دیکھو ایک طلسمی منبع نور سے تجلی کی ایک سیل جاری ہوئی۔ جو لگا تار بچہ جاتی ہے۔ یہ جو ہر یہ عرض۔ یہ سبز۔ یہ گل۔ یہ ابر۔ یہ "ہری چہرہ لوگ" تمام اسی کے مظاہر ہیں اور اس سیل تجلی کے اجزاء ہوتے کیا ہے؟ ایک بہاؤ۔ اس بہاؤ کی روح وحدت ہے، کثرت نہیں۔ میں تو یہ کہتے کہتے تنہک گیا اور شاید آخری دم تک کہتا رہوں گا کہ

نہ ہو ہرزہ بیاباں نورد و ہم وجود

ہنوز تیرے تصور میں ہیں فطیب و فرار

میں نے اسی بہاؤ میں بہنا شروع کیا۔ یہ مجھے نغمہ ہی کے وجدانی اثر کی ودیعت تھی۔ میں نے دیکھا ہی نہیں۔ یہ خیر کن قبول مدح ہوتے ہوئے بھگ گئی۔ اس کی روشنی نے گرد و پیش کے بخارات سے کتے ہیولے پیدا کئے۔ اور اب وہ کہاں ہوا ہو گئی؟ یہ ادھر پاس ہی ایک اور چراغ تہ دامان سے بخارات کا پردہ ہٹ گیا لیکن "موج ہائے دود" اسے بدستور لپٹی ہیں۔ اس سے نظروں ہٹا رہی لی جائیں تو بہتر ہے۔ میں بھی کیا "خفقانی" ہوں بلکہ تابناک تندرل سے، مہووم باتوں کے تابدہ و دوسے "افسانہ" کا خیر مکرر

ہے نے محسوس کیا کہ محبت انسان کو کچھ اور ہی بنا دیتی ہے۔ وہ دنیا سے آب و گل میں پابجولاں نہیں رہتا۔ اس کی روح اس دنیا سے روم نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس کی صہ کو اپنے اندر جذب رکے اس سے بلند تر ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک زبردست ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ جیسے اس کے جان و دل میں کسی نے برقی جھرر بر دیئے ہوں۔ اس کی روح میں ایک بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ اپنے پہلو میں زندگی کی ایک نئی دھڑکن محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو یزدانی قوتوں کا مظہر اتم تصور کرنے لگتا ہے۔ یہ پھر یہ ذوق و شوق کتنا جانگس، کتنا جانگداز ہے! میں نے نغمہ سے جدا ہو کر ایسا محسوس کیا تو گویا میں اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اور میرے دل میں ایک خلش پیدا ہوئی۔ یہ خلش رفتہ رفتہ جاوداں ہو گئی۔ نہیں یہ شروع ہی سے جاوداں تھی۔ یہ تو ایک ایسی روداد ہے جو اپنے اطراف و جوانب سے مختلف النوع ذریعہ و نفرتی پارے اور لعل و جواہر جمع کرتی اور پاکیزہ چکنی مٹی سے آئینہ ہو کر خبر نہیں کیسے و کش اور حسین قالب اختیار کرتی ہے۔ اس نے میرے تخیل کی دنیا میں کیا کیا رنگ رنگی پیدا نہیں کی۔

روشنی ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے

انجن بے شمع ہے گر برق خرمین میں نہیں

کب سے ہوئی کیا بتاؤں جہاں خراب ہیں

شہائے ہجر کو بھی رکھوں گز حساب میں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

تساوی ملاقات میرا سب سے بڑا المیہ تھی اور سب سے بڑا راز بھی۔ تو میرے ذہن پر حسن مثالی بن کر کچھ اس طرح نقش ہو گئی کہ میں اور کسی پیکر جمال سے مطمئن نہ ہو سکا۔ تیرے مثیل کی تلاش ایک مستقل جدوجہد اور لب کشائی کا باعث ہوئی۔ میری اپنی فریقہ حیات اور لوگیم ہزاروں میں لیک ہو، پھر بھی کیا۔ وہ نغمہ کی مثیل نہیں ہو سکتی۔

سوچتا ہوں یہ خواب اور شہائے ہجر کا ذکر محض تقاضائے میاں سے ہوا۔ ورنہ حقیقتاً ہجر کی ایک مستقل رات ہے اور وہ میدان کا جس میں مجرب سے ملاقات ہو ایک جاودانی خواب

لئے کس قدر رنگین تھے۔ جب حسن و رحنائی کے یاسمن زار پوری آب و تاب سے جلوہ فروش تھے۔ نشہ فکر کے عالم میں اس لطافت نے شوخی تحریک کی بدولت صفحہ قرطاس پر شعر کا کیسا اندر سیکھ اختیار کیا۔

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا
میں اس سرچشمہ فیض، نغمہ کا احسان کیسے فراموش کروں
کہ جب گلنار کی بالائیں رحنائی مجھے نہ جانے کن گہرائیوں میں
لے گئی تو۔ اب ان بے پایاں نوازشوں کا تذکرہ ہی کیا جن سے
میری حیات ابد تک زیر بار رہے گی۔

لو، وہ اس سرے کی قندیل پھر بیکار کیسے چمک اٹھی۔
اس کی وہ سرخ لوفانوس بلوریں اور بخارات سے چھن چھن کر آتی
ہوئی کتنی بایده معلوم ہوتی ہے۔ ساری قندیل ایک دکھنا دکھاو
ہے انگارہ۔ ایک دکھنا چہرہ! اتنا کشادہ، اتنا باوقار، ملوٹی اور
جلیل۔ جیسے گلاب کا تمنا تا ہوا پھول! میری ہی طرف غنائ گیت
رواں ہے۔ یہ کہیں قریب ہی ہے۔ بہت ہی قریب! دیوار کے
اس طرف، یہیں ادھر۔ یہ بھوکا، جو کسی دھند میں گھرے ہوئے
گوشتے سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک شعلہ جوال! یہ لو، یہ
زبان آتشیں، اس قدر قریب۔ جیسے یہ میری نظر، میرے دل سے
خروج کر رہی ہو! کوئی سمجھے، انفس و آفاق مدغم ہو گئے ہیں اور
ان کے مطلع پر ایک برقی تجلی خود فگن ہے۔ قندیل!؟ غنیمت
کون؟ کون؟

طرح دیتا ہوں۔ یہ تیغ ہے۔ یہ قلعہ اکبر آباد ہے، یہ جامع مسجد، یہ
چاندنی چوک، یہ قلعہ شاہجہاں۔ اور یہ میرا اپنا کلبہ احاطہ دنیا اور
اس کے قماشہ ہائے روز و شب سے دل بستگی۔ فانوس خیال میں
رقتی اسی کی شرمندہ احساں ہے۔ کہیں انسانی تنناؤں کے چراغ
بھی بجھ ہیں۔ یہ تو آخری دم تک اس کے نہاں خاندہ دل میں روشن
رہیں گے۔ آج جب "گنجد باز خیال" نے نئے ورق الٹا الٹ کر
"نیرنگ یک بت خاد" کا منظر دکھا رہا ہے، مجھے سالہا سال کے
فراموش شدہ افسانے یاد آتے ہیں۔ کتنی ہی آرزوؤں اور صرتوں کے
تصور میرے ذہن میں رقص کرتے ہیں۔ ہائے! اس "کافرا" اور
"رہزن تمکین و ہوش" گلنار سے "رسم درہ شوق" جس کی
وجہ سے امر او بیگم کے ساتھ اس قدر خلفشار پیدا ہوا۔ بیچا ہوں
بھی تو ان جنت نگاہ اور فردوس گوش عشرتوں کو صفحہ خاطر سے غور
نہیں کر سکتا۔ میں نے اس وقت بے محابا کہہ دیا تھا اور بعد میں بھی
بار بار زبان پر لاتا رہا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان یکنی پھر بھی کم نکلے
وہ زبان پھر کہاں سے لائوں جس نے کسی اس پارہ سحر کو پردہ جنب
سے منقذ شہر بدر جلوہ گر کیا تھا!

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا محلہ
دل فرد جمع و خیر زباں ہائے لال ہے
مگر میں پوچھتا ہوں۔ عشرت شباب سے گریز کیوں؟ یہ تو عین متغنائے
حیات ہے اور گرمی طبیعت جو یائے نشاط۔ یہ چند در چند خوشگوار
لئے! وہ حریفان خود آرا سے تعلق کا جوبی۔ عشرت کے یہ بھرائی

غالب کا رابطہ فرنگ۔۔۔ بقیہ صفحہ ۳۵

- | | | | |
|----------------------|------------------------|----------------------------------|------------------------------|
| 94. MAJOR. | مجر | 99. PHOTOGRAPH. (PHOTO) | عکس کی تصویر۔ آئینہ کی تصویر |
| 95. PIECES OF STAMP. | اشاپ کے ٹکڑے | 100. (P.M.G) POST MASTER GENERAL | برائرسٹ ماسٹر |
| 96. DOUBLE. | ڈبل | 101. GOVERNOR GENERAL. | گورنر جنرل |
| 97. CHAPPY. | چاپی (کھوٹا، شکاف دار) | 102. GOVERNOR. | گورنر |
| 98. MAGAZINE. | مگزمین (ماہنامہ) | 103. COLONEL. | کرنل |

”اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے“
 (عقاب اعلیٰ دہلی) Date: 13.1.11.73

قربان حسین

ہائی دھڑکی یعنی غلیظ۔ یا اٹکل دھڑ۔ ہر وہ جگہ جہاں مرتا فتنہ ادا ہو کے ہو اٹھا ہوں گا گور ہو۔ قلب کی دھڑکن کہاں نہیں ہے اس لئے کہ خداوند بخشنے والا اور باغ دشتِ درودی کوئی تعمیر نہیں جبکہ جگہ ہوں خود بخود سے اندر کھن کے پا کو۔

نہا ہر پند میں مرد دل جلیہ صبح و غائب درۃ العین مآلوہ کو یاد رکھے کہ نشین بہشتی نگہ و ید نہ و مجروح جہاں گرایند غلبہ کے اپنے غلبہ میں۔۔۔۔۔

”دشت پر میری حمد آفاق (افلاک و اجنگ تھا۔ کچھ تعجب نہیں کہ عالم ارواح اور حواریہ خلد (جس میں لاکھوں.....) سے بیزار ہو کر یہ جہنم جہاں پھر عالمِ ایساں کی طرف آ نکلا ہو۔ اُس دہے نہیں بار تو میری ہی ہوائے ابدہ ایک بزرگ کی شکل میں اٹکل دھڑ کے حل ساکن، قربانی حسین کے ہم سفر ہوئے ہوں۔ اس نوبت ثانی کا ثبوت مدبر ”ماوہ“ کے اس شاخ سے بھی بہرہ پہنچتا ہے کہ اس سفر پر سنگ و میل ادا حریفہ بزرگ و سامان میں مصنف ہجر کے ساتھ ساتھ مرتبہ شریک سفر اور ”دفع ہم زبانی“ ہے۔ اصل شہود شاہد و شہود ایک ہے۔ میر حال یہ سب

اجرا ”اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طہور کی۔۔۔۔۔ (درخ)

نہ کوئی چہار آٹا جاسکے۔ امریکی، انگریز، فرانسیسی، جرمن، اطالوی
ہولینڈ، غرض قدرت کے کارخانے کے ہر نمونے کو یہاں دیکھ سکتے
ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی اپنے پیارے وطن سے بھی آیا ہو۔ اس سے مل کر
پوچھیں: تمس حال میں ہیں یا رلین وطن؟ انہی کہیں گے، ان کی سنیں گے
اور کچھ نہیں تو گھر کے واقعات سے ہی، گھڑی ہوگی۔ سو ہم جیسے دُر
اقدا دل کے لئے یہ بھی کیا کام ہے۔

چلتے چلائے جاپان ایئر لائن کی طرف جانے۔ ہر طرف زمینیں،
گھٹاریاں، نشا اور خوش وقتی نظریں۔ یہ مشرقی قوت تھی۔ دیکھ کر خاک
وطن یاد آگئی۔ ابھی دو روز پہلے گیا تھا کہ دو ایک سیاہ ٹوپی نظر پڑی۔
دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ سو چار سو کوئی پیارا لہو وطن ہے۔ مگر نہ دیکھا
جا کر دیکھا۔ یہ آج کل کی سیاہ قزاقی قوت تھی۔ مگر اس کی ہر رنگ
کلاہ ہا پاؤں ضرور تھی۔ یہ ایک نوجوان درہنگ تھے۔ بڑھ کر اس کا حکیم
قبلا کا ادب عرض کرتا ہوں آؤ داغ دیا۔ بڑے میاں نے میسے سراپا کو
دیکھا اور جواب میں کہنے لگے میاں لڑکے، ہم بڑے بڑے وطن سے تھے۔

دل قدمے اداس تھلا سوچے لگا کیا کروں کئی خیال آئے۔
کبھی سوچا کافی شاپ میں چل کر ٹیپوں کبھی یہ کہ کوئی فلم دیکھ لیا جائے
مگر کوئی تجویز بھی نہ تھی پھر سوچا کسی دوست سے ملنے جاؤں، مگر
دوسرے ہوا کہ اس سے ملنے گئے اور وہ نہ ملا یا اس کا کوئی اور
پروگرام ہوا تو سخت کوفت ہو گئی۔ اس جیسے بحث کے بعد فیصلہ کیا
کہ چلو انٹر نیشنل پورٹ میں چلا جائے جہاں تازہ واردان بھارت ہوں
کو دیکھنے اور نئے نئے چہرے دیکھنا رنگ لباس۔ دیس دیس کے لوگوں کو
دیکھ کر قوت گننے لے کر اٹھنے لگا۔ یوں ہر ہی ہیر و خاں، سو وہ کچھ ہم کو۔
اپنے پاس اس ترین کی دہی پلانی "فورڈ" تھی۔ اس ہم کو
دیرینہ کا ساتھ چھوڑنا دل کو کھانا نہ ہوا، اس لئے اسی پر سوار ہو کر
چل نکلے۔ سڑک کی اونگھ نیچے اور گڑھوں سے بچتے چلتے،
چھکولے کھاتے کسی نہ کسی طرح انٹر پورٹ تک پہنچ ہی گئے اور سڑک کی
"پارکنگ سٹ" میں کھڑ کر دیا۔

سوچا گیلری سے نظارہ اچھا رہیگا۔ ہر دو منٹ بعد کوئی

باس کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ نہ سر پر ٹوپی، نہ چھوٹوں کا پاس نہ ٹبروں کا ادب۔ میں کچھ عجوب ہو گیا اور شمس صودت بنا کر کہا مخدلت کا خواستگار ہوں۔ بولتے خیر، جانے دو اس بات کو مگر یہ تو بتاؤ تم کوں ہوا اور کیا شغل ہے؟ عرض کیا: خفص، مجھے قرآن کہتے ہیں۔ طلب علم کے لیے یہاں آیا ہوں۔

”خوب، خوب، نام بھی خوب ہے، قرآن جلیے۔ مگر کہاں سے آنا ہوا؟“

”پاکستان سے۔“

”خوب۔ بلکہ خوب تر شد۔“

”حضور نے ادھر کیسے تکلیف فرمائی؟“

”بھئی بہت زمانہ سے جنت کی فضاؤں میں رہا ہوا تھا، دل اچاٹ ہو گیا۔ وہی خود وہی تصور، میں سیلابی جیوٹا ٹھہرا، سوچا پھر سیر دنیا کے لئے نکل چلوں۔ رضوان سے بہت ہی لڑائی ہوئی مگر آخر کار اس نے دودن کی رخصت دے ہی دی۔ میاں، یہ تو جانتے ہی ہو کر آساں کا دسکھ تو یہاں کی ہر چیز نظر آتی ہے۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ ایک مقام پر بہت بڑے مینار اور بڑی چہل پہل نظر آئی۔ مینار اور ساتی بھی ساتھ ساتھ دکھائی دئے۔ مسجد کے زیر سایہ خرابیاں چاہتے، میں پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ غور کیا تو ایک جال سا بچھا ہوا نظر آیا۔ ریل کو تو پہچان لیا مگر اور نئی سوا سوا۔ کیا برقی رفتار نظر آئیں اور کیا کیا کلیں کہ دیکھ کر

اچھٹا ہوا۔ مگر دانا یاں فرنگ سے کچھ بعید نہیں۔ میدان بھی خوب دکھائی دیتے تھیل تھیلے بھی کیا کیا عجوبہ نظر آئے۔ ایک جگہ تو کیونظر آیا۔ حد نظر بنیال، وہ گنزار والی لمبی چوڑی سڑک، رات کی روشنیاں۔ گویا ایک نادر چراغ تھا سرسبز کچی قاہرہ کا جمال دکھائی دیا۔ ہائے وہاں کہہ! مجھے اب یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ خضر کی صورت۔ لے ہندگ کون تھے حضرت غالب کی معیت میں میں آگے ہی بڑھتا آکھنگے، ہم نے قس دنیا کا بس دودھ سے نظارہ کیا ہے۔ جی چاہے نہ نزدیک سے بھی دیکھوں۔ تم یہاں کافی عرصہ سے رہتے ہو، ضرور بد بتاؤ گے کہ کون کون سے مقامات دیکھنے چاہئیں۔“

عرض کیا قبلہ بجا ارشاد ہے۔ مگر یہ تو فرمائیے کس کس جگہ کی سیر کا شوق زیادہ ہے۔ یہاں تفرق کا کیا ٹھکانہ۔ سیر کی جگہوں کی

کسی نہیں۔ ادبی شوق ہو تو داہلہ لاطالعہ جگہ جگہ موجود ہیں۔ عجائبات بھی ہے، مگر پہلے میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیں تو عین کرم ہو۔ معاملہ طے ہو گیا اور میں حضرت کو لے کر اس پرانی قور میں آن بیٹھا۔ چند ریل کی مسافت کے بعد گھر آگیا۔ دروازہ کھولا اور خضر تک اندر لے گیا۔ فرمائے گئے ہاں میاں تم نے کہا تھا کسی نے میری غزلیں گائی ہیں۔ ہاں وہ کیا چیز ہوتی ہے ریکارڈ؟ تو انہیں سنواؤ تا جو فردوس گوش بھی میسر ہو۔ کیا یہ ریکارڈ سنائے گی؟

میں مسکرایا۔ نہیں حضور، سہو ہوا یہ تو ٹاپ لاٹری ہے۔ اس اجمال کی تفصیل پھر عرض کروں گا۔ مردست یہ ارشاد ہو کہ آپ پتہ لگے کیا چائے یا کافی؟

”بھئی پیئے کی جو بھی چیز ہو پی لیتا ہوں۔ تم جب ساتی گری کی شرم کرو گے تو مجھے بھلا کیا عذر ہو گا؟“

میں سمجھ گیا کہ میاں کچھ نہیں سمجھے اور اپنے ذہنی مشروب کا خود ہی سرور دیتے رہے اور جب میں نے جگ بھر کر کافی ساٹھ دھکا اور حضرت نے چکی لینی شروع کی تو گویا ہونے، بھئی شے عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر کیا خاک مزا ہے۔ تم ہی اس کا کچھ لطف اٹھاتے ہو گے کوئی ایسا شغل نہیں کہ کہہ کہ گونہ بخود کا موجب ہے؟ دست بستہ عرض کیا حضور میں تو نر ازادہ تک ہوں۔

”تو یہاں پھولنے کو کیوں زندوں میں شمار کرتے ہو؟“

”بس جے جارہے ہیں۔ ویسے پاس خاطر والا نزدیک کے

ہوٹل میں جلتا ہوں۔ تشریف لے لے اور بعد نمک کے خانہ سرور کو بھی دیکھئے۔ گمراہ عرض ہے۔ یہ مقام ایسا ہے کہ جب تک یہاں کی وضو قماش اختیار نہ کی جائے محفل کا لطف زیادہ نہ اٹھایا جائے گا۔ لوگ اجنبی سمجھیں گے، دور دور میں گے تماشہ بن جائیں گے۔“

”ہاں بھئی یہ تو ٹھیک ہے، جیسا دیں ویسا بھیں۔ تو پھر کیا تجویز ہے؟“

”تجویر یہ کہ آپ میرا ایک سوٹ پہن لیں اسے پہن کر ادھر چلیے۔“

چنانچہ انہیں مغربی لباس پہنا دیا گیا۔ گھر سے نکل کر سڑک پر

اور ایشیائی کے سنگم پر حیات ہاؤس کو انتخاب کیا۔ اس کا مالک

کوئی ایرانی معلوم ہوتا تھا۔ یہ جگہ تھی بھی خوب۔ خواتین کا رنگین ہجوم،

باس میں ہر درجہ اختصار نیم تاریک ایوان رقص۔ ہر کوئی ایک دوسرے

بابت آپ ہی کی بات دہراؤں۔ کچھ طبیعت ادھر نہیں آتی۔ خوف یہ کہ چھوٹے گیری ان حرکتوں سے کیا سبق لیں گے اور بڑے سب سے کیا سبق لیں گے۔ غرض ان اندیشہ ہائے دور دراز میں غور کرتے ہوئے۔

”میاں ابھی تمہاری عمر کی کیا ہے کہ مولوی صدیق اللہ صدور نے جا رہے ہو۔ کچھ تو فریب آرزو دکھاؤ کہ زیست کا مزہ پاؤ۔“

”خوب ارشاد ہوا۔ میں نے مسکرا کر دہرای۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک اور قہر شال خوبی ادھر آنکلی۔ اس نے ساقی گری کی شرم رکھ لی اور حضرت کو جام بھر کر پیش کر ہی دیا۔ مسکرائی اولادائے خاص سے لچکتی چلتی جس تیزی کے ساتھ ادھر آئی تھی اسی تیزی سے نکل کر ایک دوریز کی طرف بڑھ گئی۔ حضرت کا سرور اوج پر تھا اور مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے:

”بھئی بڑا لطف رہا۔ مگر اب کہیں اور چلنا چاہیے۔ آدھی کو شہر کی مکھی بننا چاہیے۔ کہیں اور چل کر کسی اور جلوہ گاہ کی سیر کریں۔ کسی اور کے ہاتھ سے جام پیں، سرور سے سرور پیدا ہوں، قدر کمتر کا مزہ آئے۔“ مگر میں نے بات کاٹ کر کہا حضور آپ ہی تو فرماتے ہیں۔

”ساقی گری کی مشرم کرو آج ورنہ ہم

ہر شب پیہا ہی کرتے ہیں۔ جتنی دیر ملے“

اس پر حضرت پھر کچھ مسکرائے اور کہنے لگے: ”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھئے کہ

بلے کے ہے طاقت آشوب آگہی

کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خطایا غ کا“

میں نے عرض کیا: ”جاں تک پینے پلانے کے مسئلہ کا تعلق ہے

کون کا فرسہ جواب کی بات رو کرے۔ چلے کہیں اور چلتے ہیں۔“

یہ کہہ کر ہم باہر گئے اور دائرہ لوٹ کی دوسری جانب ٹیٹھڑی

نامی منغلے میں پہنچے۔ یہاں بھی وہی عالم نیم تاریک ایوان رقص و سرور

مگر بدلا ہوا انداز، تیز تیز موسیقی اور مغربی رقص کی ساری کافر ماجرا

جلی دشمنی حقیقتیں سلنے تھیں۔

اگلے وقت کی وضع پر ہی ہوئی برقی شمعیں روشن تھیں۔

مگر افسوس! پروانہ تھانہ پتھکا، بس ایک شمع ہی رہ گئی تھی سو وہ بھی

نیم سوختہ۔ اور جام بھی وہی مالوس مالوس ناموں کے تھے۔ برتن،

اولاد کرو، سکاچ، ماٹینی، کلی لاریج، شکر، اولہک غرض ہر قسم کی

سب سے پرانا اپنی ہی دمن میں مست کبھی اپنے سے بھی بے خبر۔ اور

اُدھر ساقی جلوہ دشمن ایمان و آگہی موجود تو ادھر مطرب بہ نغمہ رہنما

تمکینیں دھو ش۔ بھی۔ ڈھلتی دو پہر سے جو بزم نشاط میں ہوتی ہے تو

تاروں کے آخری جھلکے تک ہر ماٹنی ہے۔ جو آٹھ ایک خاص انداز

دلہرائی سے اور دیکھنے والوں کے دماغ میں ہوش تارتا۔!

بہر کیف ہم بلا کشانی محبت اس مقام تک پہنچ ہی گئے۔ بیٹھتے ہی

حضرت نے ”میاں زبان فرنگ میں اس کی انواع و اقسام کو کیا کیا

کہتے ہیں، یہ تو تم جانو۔ مگر کہو: گھلے کے برف میں ساقی صراحی سے لا“

اور جلدلا۔ اب یہاں پہنچ کر تاب و قواں رخصت ہوا چاہتے ہیں۔“

”ابھی لیجئے، حضرت“

ہمارے بیٹھے ہی ایک حوالہ فی کھٹ کھٹ کرتی، ہاتھ میں کاغذ

تھلے آن پہنچا۔ اس نے بھی لباس کا زیادہ مختلف مناسب نہیں سمجھا۔

کہنے لگی: ”کیا خدمت کی جائے؟“

میں نے عرض کیا: ”کوئی بھی سرور اور شے لے آؤ۔“

”مگر کیا ہو کہ برا بھلا، مارٹنی۔ رم۔ جن؟“

حضرت نے اس کے سراپا کا جائزہ لیٹھ کے بعد فرمایا: ”بھئی

خوب خوب نام ہیں۔ میں تو رم کو رم آہو سے پہچانا اور یہ جن بھوت

بھلا کیا شراب ہوگی، ہم تو اولادِ طام پسند کرتے تھے۔ خالص ہنگوینی

شے تھی، مگر اب نیا نیا نہ ہے، جو بھی آجائے۔“

”حضرت نام میں کیا رکھا ہے۔ میں تو اتنی ہی معلومات

رکھتا ہوں کہ ان کے چند نام آتے ہیں۔ یوں اس ساقی کو بھلنے

کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں کہ جو بھی لاؤ تیز عمل شے ہوئے چنانچہ اس ہی طرح

کہہ دیا۔

کچھ دیر غل رہا۔ سرور گھٹنے لگا تو حضرت بولے: ”میاں اس طرح

کو تو بلاؤ۔ کیا ہم اسے بلا سکتے ہیں؟“

”کیوں؟ کیا کوئی خاص بات کہتی ہے؟“

”میاں تم بھی عجیب تماشہ ہو۔ اپنے آپ کو زندوں میں شمار

کرتے ہو۔ نہ جیتے ہو نہ کافر اداؤں کی داد دیتے ہو۔“

عرض کیا: ”حضرت آپ کا پیشہ تو سولہت سے سپہ گری

رہا ہے۔ میں نے بھی اس شعار کو اختیار کیا اور بڑی پابندی سے کیا۔

بلکہ اب تو زندگی کا جزو ہو گیا ہے۔ مگر یہ جو بات آپ نے کہی اس کی

جوئے نمی نظر کرتے، دنیا و ما فیہا سے بے خبر، ہاتھ میں ہاتھ دے چلے جا رہے تھے، کوئی دیکھتا تو وہ مسکلا دیتے۔ حضرت بھی ہر کباب تھے۔ یہ سب کچھ دیکھتے چلے جا رہے تھے کہ ان سے رہا نہ گیا اور فرما لگے "عجب زندہ دل لوگ ہیں۔ دل پیچیک۔ مگر تم نے اس میدان کی کتنی سیر کی؟"

عرض کیا "مجھے اس دنیا سے علاقت نہ رہا۔ وہی آپ کی بات:

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی

کبھی کو دکی میں جس نے نہ سنی موی کمانی

اصل میں میں اس راہ پر آیا ہی نہیں۔"

"تو میاں پھر دعا کرو کہ اپنی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ

کہنگ مرے عدو کو یا سب لے میری زندگانی؟"

اس پر میں اور تو کچھ نہیں مگر ہاں آنا ضرور کہہ سکا "خدا

اس دعا کو قبول کرے! یہ بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ پھر ایک پسکے

خوبی سامنے نظر آئی۔ لباس کے اختصار کا وہی عالم۔ حضرت بول پڑے

"مے نے کیا ہے حق خدا را کو بے نقاب"

"لیکن حضرت! شوق کو یاں اجازت تسلیم و ہوش تو ممکن

ہیں؟"

اس پر خوب ہنسے اور یونہی راستہ گنتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں

بارش ہونے لگی۔ ایک دم تیز ہوا چلنے لگی اور ایسا لگا جیسے کسی جھکڑ

مجھے اٹھا کر دیوار سے ٹکرا دیا ہے!

مگر یکدم چونکا۔ غور کیا تو معلوم ہوا یہ سب عالم رویا تھا،

ایک خواب تھا حقیقت نہا۔

ٹیبیل ہر دکھا ہوا پانی کا گھلا سگر کر کر ٹوٹ چکا تھا۔ پانی نے

کتابوں کا غزوہ کو مثل لور کر دیا تھا اور یہ سیل بے محابا اب میرے

ہاتھوں تک پہنچا تھا! :

یہ بھی موجود۔ وہ پچھلے جام اور آنکھوں کے تن کے مگر خوب سچے

ہانے والے بیانات ہر قدم ہر طرف تہمت، ہر جانب سرگوشیاں

کن آنکھیوں کے اشارے، مسکلا نہیں۔ اسے جنت ارضی کہنے میں

کے پاک ہوگا! جو خود سرور کے چنگل میں تھے وہ تو خیر تھے ہی، جو

صفا انہیں دیکھ رہے تھے وہ بھی کم کم نہ تھے۔ جولانی، امگ، قوس

لوک جھونک، تروت، سادگی، ہر کاری۔ کیا کیا نہ تھا۔ "چا چا"

اور ٹوسٹ کی موسیقی کے درمیان زلفوں کا گھنیرا اندھیرا۔

نیم سوختہ شمعیں۔

سوچتا تھا منزل منزل دل بچھلے گا! مگر خیر دامن کشا

ایک طرف گوشہ عافیت میسر آ ہی گیا اور ہم بیٹھے ہی تھے کہ آواز

کرتی اور کالافقہ دریافت کرتی ہوئی ایک جلوہ فرور تھا ہاتھوں

کرتی ایک لڑکی کے ساتھ تیرتی ہوئی ہمارے قریب آ پہنچی

بڑھتا ہوا اندھیرا، بڑھتی ہوئی ہمارے تیز رفتار موسیقی،

چلے سرور پر تیس کرنے والوں کا بھی قریب آنا، کبھی دور چلے جانا

۔ عجب سماں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ محفل ہا و ہو، شب کو ایک بجے

سے پہلے ختم ہونے والی نہیں۔ اور اب وہ لمحہ بھی آپہنچا تھا

یعنی وداع جلوہ کی ساعت قریب تھی اور خواب تھا جو کچھ دکھایا،

جو سنا افسانہ تھا "بتا دینے والا اعلان بھی ہونے لگا۔ بساط ہوا

دل اٹھنے لگی اور ہم ادب محزول باہر آئے۔

•

دوسرے روز صبح تقریباً نو بجے بیدار ہوا۔ ناشتہ سے

فارغ ہو کر شہر کا رخ کیا۔ وہی "ڈاون ٹاؤن" گویا اپنے علاقے

صدن کی طرف نکل گئے۔ ہر شخص رواں دواں زندگی کے دھارے پر

سچے چلا جا رہا تھا۔ تیز رفتاری، ٹہرے بڑے اسٹور، مالیشان عمارتیں۔

ہر قوم، نسل، رنگ، عمر اور وضع واد کی خلائین کا ہجوم۔ رومانی

* ستارہ سحری

(اسلام آباد)

سلیم خان گنتی

اقبال نے کہا تھا: ہم کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد۔

مگر آج پاکستان میں ایک نہیں، کئی تازہ بستیاں زیر تعمیر ہیں اور یہ آباد و شاد کے عمل کا تسلسلہ وجہ طمانیت ہی نہیں حیرانی کا سبب بھی ہے۔ قلب و نظر ان معنوں میں حیران ہیں کہ ایک قوم اتنے مختصر عرصہ میں تعمیر و آبادی کے اتنے کثیف مرحلے کیسے طے کر گئی اور کر رہی ہے حقیقت ہے کہ اب پاکستان میں تازہ بستیاں آباد کرنے والے اہل نظر کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ پریشانیوں جو دیدہ و دل کو پابند بنا رکھے ہوئے تھیں ۱۹۵۸ء کے انقلابِ ندریں میں ختم ہو گئیں۔ وقت نئی اور جوصلہ افزا بشارتیں لے کر آیا۔ انقلاب کے چار سال بعد آج بشارتیں بچائی کے نور سے فروزاں ہیں اور انہیں ایک دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دنگ ہے۔ آفتاب آمد و دلیل آفتاب۔

انقلاب کی مسرت افزا بشارتوں میں سے ایک بشارت قومی دارالحکومت کے قیام و تعمیر کی بھی تھی۔ آج یہ بشارت اسلام آباد کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر بستی آباد کرنے والے اہل نظر کہلا سکتے ہیں تو تازہ شہر آباد کرنے والوں کو قوم کس طرح یاد کرے گی؟ قوم انہیں اہل نظر، اہل ایمان اور اہل ہمت کہہ سکتی ہے۔ حد پ پاکستان محمد ایوب خان اور ان کے رفقاء یقیناً ان تینوں خوبیوں بلکہ نصرت کی زبان میں، ان تینوں کیفیتوں کے مالک ہیں۔ یقیناً ان خوبیوں اور کیفیتوں کے بغیر اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔

اصل میں اسلام آباد ہماری نئی ثقافت کا مظہر ہے۔ ایک نیا جہل، نئی ثقافت تو ابھی ہے اور اسلامی بھی، بالکل اسی طرح جس طرح اسلام آباد کے معمار قلبِ مومن بھی لکھتے ہیں اور عہدِ جدید کے تقاضوں کے ریزشاس بھی ہیں۔ اس دعویٰ کی تصدیق ہر وہ شخص کرے گا جو اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل کے مرحلے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ان دیکھنے والوں میں اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران اور فرزانہ لائے اعلیٰ ملایا جیسی بستیاں بھی ہیں اور مشرقی اور مغربی

* ستارہ سحری خرمہ بیگم کے دستِ غالب

پاکستان کے کسان اور طالب علم بھی۔

اسلام آباد خطرہ پوٹھوہار کے عین قلب میں واقع ہے۔ پوٹھوہار پاکستان کا وہ خطہ ہے جو صدیوں تک نئی اور پرانی تہذیبوں کا وارث، امین اور جلالی گاہ رہا ہے۔ اس خطے میں برف کے عہد کی ثقافت، پتھلوار و دھات کے زمانے کے آثار، گچھاہستانی ثقافت اور کول، دراوڑ، آریائی، ایرانی، یونانی، باختری، منگول، ستیعین غرض کوئی بیس ثقافتیں اپنے اپنے عہد میں پروان چڑھیں۔ آج یہی خطہ پاکستان کی اسلامی ثقافت کا مرکز ہے اور اسلام آباد اس خطہ کا مینوسوا اور آج شام و سحر تعمیر و تکمیل کے مرحلوں سے گزر رہا ہے۔

پاکستان کے لئے نئے قومی دارالحکومت کی ضرورت آزادی کے حصول کے ساتھ ہی محسوس ہو چکی تھی مگر پرامن انقلاب سے پہلے اس احساس عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ نیم دلی کے ساتھ کوششیں ہوئیں مگر نیم دلی سے کبھی کوئی کام سرانجام نہیں پاسکتا۔ ماری پور، گڈپ اور مضرے کے دفاع کو قومی دارالحکومت کے لئے چننا گیا مگر تعمیر کا مرحلہ کبھی نہ آیا۔ کراچی کے ساحلی شہر میں بکھری ہوئی عمارتوں میں مرکزی حکومت کے دفاتر قائم ہوئے، اور کام کرتے رہے مگر ان دفاتر کی ماضی عمارتوں سے چھٹکارا حاصل نہ ہو سکا۔ آخر اکتوبر ۱۹۵۸ء میں انقلاب آیا تو نئے عزم اور نئی ہمت کے چلنے بھی روشن ہوئے۔ مردہ دلی اور پرانہ خیالی کے اندھیرے دور ہوئے اور اس طرح وطن تعمیر و ترقی کے ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدر ایوب نے ہی قومی دارالحکومت کے اس منصوبہ کی طرف پوری طرح توجہ دی جو دس سال سے گولگلی حالت میں چلا آ رہا تھا۔ اس سلسلہ کا جائزہ لینے کے لئے فروری ۱۹۵۹ء میں آٹھ افراد پر مشتمل ایک کمیشن قائم ہوا جس کے چیرمین میجر جنرل اے۔ ایم۔ بھٹی خاں تھے۔ کمیشن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ قومی دارالحکومت کی حیثیت سے کراچی کی موجودہ پرچند کرے اور اگر کراچی قومی دارالحکومت کے لئے موزوں نہ ہو تو کسی دوسرے

اور اپنی رپورٹیں پیش کر کے کام کو آگے بڑھایا۔

فروری ۱۹۶۰ء میں وفاقی دارالحکومت کے رقبہ کو اسلام آباد کا مبارک نام عطا کیا گیا۔ اور اسی سال ہی میں کمیشن نے ابتدائی عظیم منصوبہ تیار کیا جس پر صدارتی کابینہ کے اجلاس میں سوچ بچار کیا گیا اس اجلاس کو اس اعتبار سے تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ یہ اسلام آباد کی پہاڑی، شکر ٹریاں پر منعقد ہوا تھا، یعنی تعمیراتی شروعات ہوئی۔ یوں اسلام آباد کی تعمیر دس سال میں مکمل ہو گئی۔ مگر تعمیری مرحلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے پنج سالہ منصوبہ (۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک) کے مقاصد طلب ذیل رکھے گئے ہیں۔

(۱) پچیس ہزار ایکڑ اراضی کا حصول (۲) چھ ہزار سرکاری ملازموں کے لئے مکانات (۳) چھ ہزار سرکاری ملازموں کے لئے دفاتر (۴) دوسو بیس کمروں پر مشتمل پاکستان ہاؤس کی تعمیر (۵) اٹھاونے سو بیس کمروں اور راستوں کی تعمیر و پختگی (۶) پچاس ہزار نفوس کی آبادی کے لئے آب رسانی (۷) پچاس ہزار کی آبادی کے مکانات اور دوکانوں اور دفاتروں کی آب نکاسی (۸) اٹھارہ ہزار ایک سو پچاس ایکڑ اراضی کی تزیین اور شجرکاری (۹) ایوان صدر، سپریم کورٹ اور پارلیمنٹ کی تعمیر (۱۰) سفارتی بستی کے دوسوا ایکڑوں کی ترقی (۱۱) ساٹھ ایکڑ کے رقبہ میں چھوٹی صنعتوں کی تنصیب (۱۲) تعلیمی اور دفائی اداروں (مدرسے۔ ڈاک خانے وغیرہ) کی تعمیر (۱۳) بجلی کی فراہمی (۱۴) اسلام آباد کے رقبہ کے کاشتکاروں اور زمینداروں کی قبائل آباد کاری۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک کے پنج سالہ منصوبہ پرانی دوسالوں

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک میں جو کام ہوئے ہیں ان کا اجمالی ذکر بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔

اسلام آباد کے لئے اراضی حاصل کی جا چکی ہے۔ سرکاری ملازموں کی رہائش کے لئے چھ سو مکانات بن کر تیار ہو چکے ہیں۔ چھ سو مکاناتوں کی اس سٹی کو "آب پارا" کا نام دیا گیا ہے۔ آب پارا میں بجلی اور پانی کا نظام مکمل ہے۔ یہاں تاجر اور ڈاک خانہ کام کر رہے ہیں۔ اس سٹی کی آٹھ دوکانیں بھی تعمیر ہو چکی ہیں۔ محکمہ ادا ہوی نے اپنا سٹور یہاں قائم کیا ہے اور محکمہ صحت کی طرف سے شفا خانہ بھی موجود ہے۔ بچوں کے لئے سکول اور پارکوں کا انتظام ہو چکا ہے۔ غرض آب پارا میں زندگی کی ہر سائش فراہم ہو چکی ہے۔ ایک ہزار چار سو پندرہ مکانات کی تعمیر عرق قرب مکمل ہو جائیگی۔

جنگ کی بابت غور کرے۔ کمیشن نے چار ماہ کے کافی غور و فکر کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی کہ کراچی صنعتی و تجارتی اعتبار سے تو موزوں شہر ہے مگر قومی دارالحکومت کے تقاضے پورا کرنے سے قاصر ہے۔ کمیشن نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کا کوئی بھی شہر قومی دارالحکومت بننے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ نیا وفاقی دارالحکومت الگ ہی تعمیر کیا جائے۔ اس غرض کے لئے لاہور، لنڈی کے شمال اور شمال مشرق میں اسلام آباد کے رقبہ کو منتخب کیا گیا کیونکہ یہ رقبہ آب و ہوا، پیداوار، قدرتی وسائل، دفاع اور مواصلات کے اعتبار سے بھی پاکستان کا موزوں ترین علاقہ تھا جو اس مقصد کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔

لیجئے اب کچھ حال اس مقام کا بھی سن لیجئے۔ اسلام آباد کا رقبہ ڈھائی سو مربع میل کو محیط ہے۔ اس رقبہ کی سطح سمندر سے ڈیڑھ ہزار فٹ سے دو ہزار فٹ تک بلند ہے۔ اس کے شمال میں مرگھ کی پہاڑیاں، شمال مشرق میں سری کی پہاڑیاں، جنوب مغرب میں شاہراہ اعظم اور جنوب میں ایتھراڑ روڈ واقع ہیں۔ آب و ہوا بڑی خوشگوار ہے۔ زیادہ سے زیادہ اوسط درجہ حرارت ایک سو تین اور کم سے کم اوسط درجہ حرارت اڑتیس درجے رہتا ہے۔ اسلام آباد کے رقبہ میں چار دریا۔ سواں، کورنگ، یٹک اور کس۔ بہتے ہیں۔ مرگھ اور سری کی پہاڑیوں میں چشموں، آبشاروں اور جھروں کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں تعمیراتی سلا بھی بخوبی مل جاتا ہے۔ بہتر کم کی سبزیاں، ترکاریاں، بھافراط ہیں۔ اشیائے خورد و نوش بآفراط دستیاب ہوتی ہیں۔ غرضیکہ اسلام آباد کے علاقہ میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو کسی قومی دارالحکومت کے لئے ضروری سمجھے جاسکتے ہیں۔

جن ۱۹۵۹ء میں صدارتی حکومت نے اسلام آباد کے رقبہ کو وفاقی دارالحکومت کے لئے موزوں قرار دئے جانے کی رپورٹ منظور کی اور اس کے بعد ستمبر ۱۹۵۹ء میں فیڈرل کپٹل کمیشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا گیا۔ اس کمیشن نے اسلام آباد کے لئے عظیم منصوبہ اور عظیم لائوٹیشن تیار کیا۔ اس غرض کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ایک سو ماہرین نے باہم مل کر کام کیا۔ یہ ماہرین مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ہمیا بیس محکموں سے لئے گئے تھے اور جو دہ کیٹیوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ اپنے کاموں کو مکمل کر رہے تھے۔ ان کیٹیوں نے اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل کے ہر پہلو پر پابہراندہ انداز میں اور بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا

اولیٰ کی بجائی ۱۹۶۳ء

پھیلا ہوا ہے اور اس میں ایک لاکھ اور پودے شہر کاری کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ راول جھیل، پرانی قریبی روڈ اور ملحقہ راستوں پر بھی باغ لگانے جائیں گے، چنانچہ اس غرض کے لئے زمین ہوا اور جڑی ہے اور یہ جگہ غریب لالہ زار بن جائے گی۔

ایوان صدر سپریم کورٹ اور پارلیمنٹ کی عمارتیں استقامی حلقہ (سیکٹر) میں ہوں گی۔ ان عمارتوں کے علاوہ اسی حلقہ میں ثقافتی اہمیت کی عمارات جیسے قومی کتب خانہ، قومی عجائب گھر اور سیکرٹریٹ کی عمارتیں بھی ہوں گی۔ ان عمارتوں کی منصوبہ بندی پر بیرونی مالک کے کئی ماہروں سے بھی مشورہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض عمارتوں کی منصوبہ بندی کا کام مکمل ہو گیا ہے اور تعمیر کا سلسلہ غریب شروع ہونے والا ہے۔

یہاں ایک سفارتی علاقہ بھی ہوگا۔ اس علاقہ میں سے دو لاکھ اڑسٹھ ہزار نو سو بہتر اعمار پر تراسی مربع گز رقبہ چنے پر دیا بھی جا چکا ہے۔ اب تک آسٹریلیا، سوئیڈن، برطانیہ، ہندوستان، اٹلی، برما، فرانس، آسٹریا اور نیدرلینڈ کے سفارت خانے یا قونصل خانے اپنے اپنے لئے زمینیں لے چکے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس زمین سے کیپٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کو تین لاکھ اناسی ہزار چار سو چھپن روپے کی رقم وصول ہوگی۔ نلاح عامہ کے کاموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اور چھوٹی صنعتوں کی تنصیب کے لئے اب تک انیس پلاٹ الاٹ کئے گئے ہیں۔ صنعت کاروں نے اپنے کارخانوں کے لئے تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے سینٹ تیار کرنے اور پتھر کوٹنے کے کارخانے قائم بھی ہو چکے ہیں۔

تعلیمی اور رہائشی اداروں کی تعمیر کا منصوبہ منظور ہو چکا ہے۔ جس کے تحت اس وقت چار پانچری سکولوں کی عمارتیں بن رہی ہیں۔ حکومت مغربی پاکستان راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان ایک ڈگری کالج بھی قائم کرے گی جس کی تعمیر جاری ہے۔ اسی طرح پارکوں، ڈاک خانوں، تانگھروں، کھیلوں، کھیل کے میدانوں، تھانوں اور کھیتوں کی تعمیر بھی مختلف مراحل سے گزر رہی ہے۔

برقی قوت کی فراہمی کے سلسلے میں حکام ہر لمحہ وہ بھی بڑا اہمیت افزا ہے۔ چنانچہ اس وقت اسلام آباد میں ایک سو تیس کلو واٹ کا بجلی گھر قائم کیا جا رہا ہے جس پر تاسی فی صد کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ بجلی گھر واپٹانک

سرکاری ملازموں کے لئے دفاتر کی منصوبہ بندی جلد ہی ہو چکا ہے۔ اس میں دو تعمیر کے علاوہ ایک اعلیٰ درجہ کے ہوش کی تعمیر جلد مکمل ہو جائے گی۔ اس ہوش کی تعمیر کا ساٹھ ہزار مربع گز ہوگا۔ اس کی پانچ منزلیں رکھی گئی ہیں جن میں سے تین منزلیں تعمیر بھی ہو چکی ہیں اور چوتھی منزل کا کام جاری ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو اس عمارت کی چوتھی منزل بھی تعمیر کی جائیگی۔

سرکوں کی تعمیر کے لئے زمین ہوا رہی ہے۔ نیشنل پارک روڈ پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ دریائے گورنگ پرپل کی تعمیر ۱۹۶۳ء میں مکمل ہو جائے گی۔ اسلام آباد میں چار بڑے پل بھی ہوں گے جن میں سے ایک دریائے گورنگ کا پل ہوگا۔ مرگہ جیب روڈ پر بھی کام ہو رہا ہے اور اب تک اس سڑک کے میں پل مکمل ہو چکے ہیں۔ آپ بھگت علی کوچوں، راستوں اور ملحقہ سڑکوں پر جو کام ہو رہا ہے اس کے جلد مکمل ہو جانے کی توقع ہے۔

سید پور اور نور پور شاہان کے آبی ذخیرے یہاں کا خاص سڑک ہیں جن سے کام لیا جائے گا۔ شکر پڑیاں کی پہاڑی پر جو آبی ذخیرہ زیر تعمیر ہے وہ مکمل کو پہنچنے والا ہے۔ چنانچہ اس آبی ذخیرہ میں ساٹھ چار لاکھ ٹین پانی جمع رہے گا اور اسلام آباد کے بعض ذیلی حلقوں میں پائپ لائنیں بھائی جا رہی ہیں، اس طرح ہر جگہ صحت بخش پانی پہنچ سکے گا۔

اسلام آباد کی زمین اور شہر کاری پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ جاپان کے ایک ماہر کیمونو کنڈو نے نیشنل سپورٹس سینٹر کی تعمیر، زمین اور منظر سازی کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں کھیل کے میدان، بچوں اور عورتوں کے لئے پارک، گولف کے میدان ہوں گے۔ ایک مصنوعی جھیل، چمن زار اور کشتی رانی کے کلبوں کے لئے بھی خاکے تیار کئے گئے ہیں۔ شکر پڑیاں کی پہاڑی پر جو زہ باغوں کے لئے زمین ہوا کر لی گئی ہے جس جگہ پھر ڈیوب اور ان کی کاہنہ نے اسلام آباد کے ابتدائی تنظیمی منصوبہ پر پھر روغن کیا تھا وہ جگہ اب ایک تاریخی اہمیت اختیار کر گئی ہے اور اب وہاں پھول کھلتے نظر آتے ہیں۔ اس پہاڑی کے ایک سو ایکڑ رقبہ پر شہر کاری کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اب تک پانچ ہزار آٹھ سو ستر ایکڑ رقبہ میں پودے لگائے جا چکے ہیں۔ اسلام آباد میں اس وقت دو لاکھ پودے بالکل تیار ہیں۔ اسلام آباد کے میں پودوں سے پودے لئے جاتے ہیں وہ خود کافی بڑا ہے یعنی تیس ایکڑ رقبہ میں

بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارۃ

(مشرق پاکستان — مانجھیوں کا دیس)

یونس (جس)

تلاطم خیز موجوں کا مقابلہ کچھ اپنی بلاکش مانجھیوں کا کام ہے۔
وقت اور موسم کی طرح ماہی گیری کو سال و سن سے بھی کوئی
نسبت نہیں خواہ بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے ہوں یا کڑا لکے کی سردی
پڑ رہی ہو۔ مشرقی پاکستان کے دیہات میں سردی اس ہلاکی پڑتی ہے
کہ اکثر دانت سے دانت بجنے لگتے ہیں، بالکل ایسی سردی جیسے مغربی
پاکستان کے میدانی علاقوں میں پڑتی ہے اور پانی جھنکے لگتا ہے۔
بڑے بڑے دریا ابل رہے ہوں یا ٹھنڈوں ٹھنڈوں پانی کھڑا ہو، گھر سے
دور نہریں بہہ رہی ہوں یا پاس ہی چھوٹی سی پرسکون ندی بہتے گاتے بہہ
جاری ہو، ماہی گیری اپنے کام میں لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ اُدھر صبح کا تارا
نمودار اترتا اور دھریہ لوگ کام کے لئے نکل کھڑے ہوئے اور پھر غریب کی
بات یہ ہے کہ شخص دنیا دایہا سے بے خبر اپنی دھن میں لگا ہوا نظر
آئے گا، خواہ وہ بچہ ہو یا پوپلا پوٹھا، ناخبر بہ کار لڑکا ہو یا سرد و گرم
چشیدہ مانجھی۔ اپنے ساتھیوں سمیت چنگھاڑتے دریاؤں میں
جال پھینکنے سے اسے کوئی چیز نہیں رکت سکتی۔ اگر وہ اکیلا بھی ہے
تو کنارے پر کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا پھلی کا شکار غرور و تکبر رہا ہوگا۔ اگر
موسم خشک ہے تب بھی وہ پورا آل جال ضرور پھینک دے گا یا
”بیل“ نلے کے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں گھس کر مچھلیاں پکڑے گا کہ سن
بچوں کی کھپ کی کھپ ہاتھوں سے ہی مچھلیاں پکڑتی الگ نظر آئے گی۔
جب ان کی قسمت یاوری کرتی ہے تو مچھلیاں اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے
کو دکھاتے اور خوش ہوتے ہیں۔

مشرق پاکستان میں عوام کے لئے ماہی گیری تفریح بھی ہے
اور پیشہ بھی شہری لوگ بھی مچھلی کا شکار کرتے ہیں مگر صرف تفریح کے لئے
ناکالان کی مچھلیاں یا فالتو وقت ہنسی خوشی گزر جائے۔ یہ لوگ شہر سے
باہر نکل جاتے ہیں اور مچھلی کے شکار کا لطف اٹھاتے ہیں۔ لیکن دیہات

اندھیرے ابلے، صبح شام، ہر آن، ہر وقت، یہاں تک
کہ سوتے جاگتے بھی ایک ہی شکل — ماہی گیری جیسے یہ لوگ دھرتی
نہیں پانی کے باسی ہوں۔ ندیاں نلے دریا مچھلیوں کا لاب، ان سب کا
ہبتا، ٹھہرا پانی، ان کا اڑھنا بچھوٹا ہے۔ آپ کہیں گے ماہی گیری
جاگتے میں تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر سوتے میں؛ بیشک، یہ لوگ بہتے
ہیں سمانت سمانت کی کشتیوں، ڈونگوں اور ناؤوں میں ہی۔ ان کے
گھوہی لکڑی کے چلتے پھرتے گھر ہیں۔ وہ سوتے ہیں تو اگلے دن ماہی گیری
کے لئے کیل کاٹنے سے لیس ہو کر اور زمین میں بھی اس ہی کے خواب دیکھتے ہوئے۔
اس لئے جاگتے کے ساتھ سوتے نہ ہوا اور کیا ہو؟ ماہی گیری ان لوگوں
کی گھٹی میں پڑی ہے اور اس کا کوئی وقت، کوئی موسم نہیں۔

یہ کون نہیں جانتا کہ مشرقی پاکستان مچھلی، تال، ندی نالوں اور
دریاؤں کی سرزمین ہے اور یہاں کی بود و باش پرستیاں چاندی کی روٹیاں
دواں چادروں کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہی بات ہے جس نے ہمارے
مشرق بازو کے پرشور ندی نالوں کی تند و تیز موجوں کا منہ پھیر دینے والے
جیلے مانجھیوں کو دنیا کے بہترین تلاح بنا دیا ہے۔ جگہ جگہ ندیاں، قدم قدم
پر مچھلیاں، گھر گھر تالاب۔ آب رواں کے کنارے کنارے بستیاں، بازار
اٹ، منڈی بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر تک جانے کے لئے بھی بھٹی دھا
ڈونگے کشتیاں ہی کام میں لائی جاتی ہیں۔ ہر وقت طوفانوں اور سیلابوں
کا سامنا تیز و تند موجوں سے زور آزمائی۔ اس لئے یہاں کے جفاکش اور
پٹیلے لوگ کو خطرے لگے پٹیلے پٹیلے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔ خبر نہیں کب سے
یہ سلسلہ نسل بعد نسل چلا آتا ہے جس طرح پانی کے ساتھ ان کا چھل دامن کا
ساتھ ہے، اسی طرح ماہی گیری سے بھی ہے۔ یہ ان کا پیشہ بن چکا ہے۔

ان کی شکل و شباہت جسمانی ساخت اس شخص زندگی کے سانچے میں
پوری طرح ڈھل چکی ہے۔ پڑا شوب دریاؤں کے سینے پر چڑھ کر ان کی تند

والے، کھیتی باڑی کرنے والے، حیر، گانا شروع کر دیتے ہیں، یا کوئی سہانا ٹپٹہ یا مایہ الاطاف شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے مانجھی چنڈ چلاتے، ڈانڈ یا پتوار تھامے اور مچھیرے جال پھینکتے اور مچھلیاں بھرتے، زور زور سے کشتیاں کھینچتے ہیں تو کام کے دوران کیا مکان دور کرنے کے لئے طرح طرح کے گیت بھی الاپتے رہتے ہیں۔ یہ گیت ان لوگوں کی جان ہیں اور ان سے سارے مشرقی پاکستان کی فضا سی بسی ہوئی ہے۔ پیرے سارے مانجھی مچھیرے کھن زندگی کے آثار چھوڑاؤ، خوشی، غمی، ہمت و جرأت کے یہ میٹھے سریلے گیت گانا گانا کر کچھ ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ ساری فضا پر ایک کیف چھایا رہتا ہے۔ یہ گیت ان لوگوں کے فانی احساسات کی ترجمانی کر کے زندگی کو گوارا ہی نہیں خوش گوار بھی بنا دیتے ہیں۔ عام گیتوں کے علاوہ جو لوگ خود ہی گھر لیتے ہیں، یا وہ خود بخود ان میں پیدا ہو جاتے ہیں، بعض پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں جن کو خدا نے ایسے گیت مرتب کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ کوئی جیم الدین کو کون نہیں جانتا وہ لہجے لہجے کے کساؤں، مچھیروں، مانجھیوں کے دل کی دھڑکنیں خوب جانتے ہیں اور بڑی ہی سادگی سے ان کو گیتوں میں سمو دینے کا ڈمٹنگ خوب جانتے ہیں۔ ان کا ایک گیت ہے ”ندیا کے پار“۔ اس کو پڑھ کر وہاں کے لوگ تو دیکھ کر ہرماں کے لوگ بھی خود بخود گنگناٹے لگتے ہیں اور ایک عجیب حظ محسوس کرتے ہیں گویا یہ ہمارے اپنے ہی گیت ہوں اور ہم مشرقی پاکستان میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے پورا پورا قرب محسوس کرتے ہیں۔

ندیا کے پار :-

مانجھی رے —

کروں کیسے میں ندیا کو پار !

مجھے لے چلے جو اس پار رے

اسے دوں گی میں پھولوں کا ہار رے

مانجھی رے —

اس پار میں بھیا نک ندی کے

چلی جاؤں گی ساجن کے دھار رے

مجھے لے چل تو ندیا کے پار رے !

یہ ہے ایک بھٹیائی گیت اور اس دوسرے میں بھی ایسا ہی رس گھلا

کی عام آبادی کی بات اور ہے۔ بلاشبہ دیہات میں رہنے والے عرصے ساہو عام ماہی گیری سے سال کے بارہ مہینے خوب خوب لطف اٹھاتے ہیں مگر ساتھ ہی مچھلیاں پکڑ کر اپنی معاشی حالت بھی بہتر بناتے رہتے ہیں ان میں جو ذرا چاق و چوبند تندرست اور کس بل والے ہیں، وہ اتنی پھلی ہونڈ پکڑ لیتے ہیں کہ ان کا کنبہ بھی خوب سیر ہو کر کھائے اور باقی ”ماچھ“ بیچ کر کچھ پیسے بھی کمالیں۔ یہ ادھر ادھر چل پھر کر اپنی ”ماچھ“ ضرور کسی کے گھر فروخت کر ڈالتے ہیں۔ خاص کر کھاتے پیتے گھرانوں میں تازہ پکڑی ہوئی پھلی کی بڑی مانگ ہوتی ہے۔ جب گھر بیٹھے سستے دامن تازہ عمدہ ”ماچھ“ آجائے تو بازار باٹ کون جانتا ہے۔ اگر پھلی کافی مقدار میں پکڑی گئی تو قریب کے بازاروں میں بھی کثرت سے نظر آتی ہے۔ ویسے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے ادھر پختے صرف اتنی ہی پھلی پکڑتے ہیں جتنی انہیں ضرورت ہو۔

گھاؤں کے وہ بڑے بڑے یا جوان جو صرف ذوق و شوق کی خاطر ضرورت سے زیادہ پھلی پکڑ لیتے ہیں وہ نہ صرف اپنے علاقوں بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں، حتیٰ کہ دور دست ڈھاکہ تک اپنی پھلی بیکے کو بیچ دیتے ہیں۔ ادھر بیبیاں بھی خوش ہوتی ہیں کہ چلو گھر بیٹھے اچھی ”ماچھ“ ہاتھ آگئی، لڑکے تو بازار جا کر بھی خالی ہاتھ لوٹ آئے گا کہ جی آج تو ”ماچھ“ بہت ہی ہنسی مٹی !

پھلی پکڑنے والے یہ شوقین یا تولیسی ہی کے شوقین اور جیلے ہوتے ہیں یا پھر بچا سے کم تنخواہ دار ملازم جو اپنا فرسٹ کاؤت اس کام میں لگا کر کچھ نہ کچھ کمائی لیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ لوگ ان نشیبی علاقوں میں مچھلیاں پکڑتے ہیں جہاں سیلاب کے دنوں میں قریب کے دریاؤں، ندیوں، نالوں کا پانی چڑھ آیا تھا اور اب اتر گیا ہے۔ یہاں پھلی عمدہ اور بکثرت ملتی ہے۔ خود ڈھاکہ میں ایسے بے شمار تالاب ہیں جو کسی کی ملکیت نہیں اور لوگ یہاں کثرت سے آتے اور پھلی پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ مگر ایسی کڑی زندگی جس میں کشمکش ہی کشمکش ہو اور

انسان دن رات موجوں کے خلاف سینہ سپر اور ان کے ساتھ پہرہاں نبرد آزما رہے، کسی دلخوش کن تفریح کے بغیر کیسے بسر ہو سکتی ہے۔ جیسے مغربی پاکستان میں چچی پیسنے والیاں دل بہلانے یا مشقت کا احساس دور کرنے کے لئے گیت بھی گاتی جاتی ہیں یا رہٹ چلاتے

ہوا ہے :-

رنگ برنگی ناؤ کے انجی

آؤ باندھو ناؤ یہاں

چھٹیروں دل کی داستاں

سُن بھٹیالی گیت کو تیرے

نیر بھائے ساگر

اس کی لہر بہا لے جائے

میری کمر سے گاکر

لنگر اس فوکا سا بھی

مست ہوا سے اڑتا جائے

ساری کا آنچل میرا

رہ رہ کر بن کھائے

مانجی تیری پیت میں شاید

دل نہ کسی کا ٹوٹا ہوگا

نہ کسی دل نے لہر گئی ہیں

نہ کوئی گاکر چھوٹا ہوگا

اور حق یہ ہے کہ نہ تو مشرقی پاکستان نہ بنگلہ شاہی کا دامن تافہی

نڈلا سلام کے اس بھڑے گیتوں سے خالی رہ سکتا ہے۔ اس کی

ایک مدھرتان کی صدائے بازگشت، نظم نہ ہسی، نشر ہی میں ہسی:

اے گہری ندی کی موجو!

جنم جنم سے تم مجھ کو خس و خاشاک کی مانند

بہاتی رہی ہوا

میں نے اپنے لئے جو گھر تعمیر کیا تھا

اے ندی! اسے بھی تمہاری موجیں بہا گئیں!

پھر میں نے چتر میں پناہ لیتی چاہی مگر وہ

بھی نذرِ آب ہو گیا!

اب میں سب کچھ لٹا کر سب کچھ کھو کر موجوں کے ساتھ

بہتا جا رہا ہوں!

میں گھر دو بارہ تعمیر کر سکتا ہوں

لیکن دل کا گوہر نایاب گم ہو جانے کے بعد کہاں لے گا؟

بھٹا میں ایک بار دل کھو جائے تو وہ بھی

جوار کی طرف نہیں جانا پتا!

اے ندی!

تمہاری موجیں ساحل کا ایک ہی حصہ کاٹتی ہیں

لیکن جن کی ندی کا وہ ایک کنارہ بھی نہیں چھوڑتی!

اور اس ٹیپ کے سر کے بعد ظاہر ہے اور کوئی سر کیا ہوگا اور کیا

کیف پیدا کر سکے گا۔ بے شک "بھٹا" میں ایک بار دل کھو جائے

تو وہ جوار کی طرف نہیں جانا چاہتا!

مسلم بنگالی ادب

بنگلہ سے ترجمہ

ڈاکٹر انعام الحق، ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے

کہ اس زبان کی نشو و نما و ارتقائی و تہذیبی پس منظر میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ

بہت مکمل اور تحقیقی و تفصیلی کا شاہکار ہے۔

پورے کتاب نویس اور ڈاکٹر میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور رنگین۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳۲ کراچی

”چشم بکشا اندریں دیر کین“

محمد اعلیٰ عثمان

بہنیدہ حکیم فتح کے الفاظ، کھول آکھ، نہیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ مگر یہ آکھ سے کوئی سوہن
پہلے تقریباً آئین اکبری معر سرسید میں خاصہ غالب سے برص کا رنگ تھے۔ میر نے ”نئی روشنی“ یعنی
مغربی علم و حکمت کی نئی نرا خدائی سے تحسین کی تھی۔ اسی مناسب باہمی کی بنا پر ہم عنوان بالا کے تحت
سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان کے چوتھے سالانہ اجلاس کی کارروائی اور اس کا خطبہ صدارت
یہاں پیش کر رہے ہیں۔ (ادامہ)

خود بھی اہم تر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک سنجیدہ، ذہین اور علمی مجلس
وہ اجتماع تھا جو کچھ دنوں پہلے منعقد ہوا۔
میں سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کی اس سہ روزہ کانفرنس
کے بارے میں ذکر کر رہا ہوں جس کا ہمارے شہر میں کافی دنوں سے
چرچا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیشتر دوسری شہری سرگرمیوں پر اسے
توقیت حاصل ہو گئی تھی تو شاید یہ بات بے محل نہ ہوگی۔ اس لئے
کہ مذکورہ جماعت کے پیش نظر جو مقصد ہے وہ نہایت اہم ہے اور
موجودہ وقت کا تقاضا بھی۔
آئیے ایک نظر اس مقصد کی طرف بھی ڈالتے چلیں جیسے میں نے
”نہایت اہم“ کہہ لیا۔ ان مخصوص نشستوں کو جانے دیجئے جو اردو کے
شاعر اور ادیب بھی گھما رہے تھے بلکہ ذرا ان کانفرنسوں یا
جلسے جلسوں کا تصور کیجئے جو ملک گیر میانہ پر منعقد ہوتے رہتے ہیں۔
کیسا ان سب کی کارروائی اردو میں ہوتی ہے؟ اکثر کی نہیں۔
ایسے ماحول میں جہاں معیشت کے ادنیٰ سے شعبوں میں بھی توقیت کسی غیر کی
زبان کو دی جانے کسی ملک گیر کانفرنس کی تائید کا اردو میں
ہو تو کیا یہ چوکنے کی بات نہیں؟ یہ کانفرنس ”نہایت اہم“ اس لئے تھی
کہ اس میں ہر سہ لفظ جو بولا گیا وہ اس زبان میں تھا جسے یہاں کے لوگوں
کی ایک کثیر تعداد بولتی اور سمجھتی ہے اور ہر ایسی قومی زبانوں میں سے ایک
ہے کہ کانفرنس کی مجلس استقبال کے صدر کے الفاظ میں یہ نہایت اہم

”کراچی جیسے شہر میں جو علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے
سوسائٹی کی طرف سے کانفرنس کا اعلان کوئی ایسی بات نہیں
تھی جس پر غیر معمولی حیرت یا مسرت کا اظہار کیا جائے۔ یہ تھے
لفاظ جو جن علی عبدالرحمن صاحب نے ”سندھ مدرستہ الاسلام“
ایم تارکی عمارت میں سائنٹفک سوسائٹی، پاکستان کی چوتھی سالانہ
کنس کے موقع پر اپنے خطبہ استقبال میں کہے۔
اس میں شک نہیں کہ کراچی کی پہلو دار زندگی میں ہر روز
ایک نئی ثقافتی یا علمی محفل کا انعقاد کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں۔
اسرا کے رو پہلے سورج میں کبھی خام کے ٹکے دھندلے میں کبھی
مکھی جب پورے شہر میں لڑکھائیں کے شش رنگی خیابانیں آہستہ آہستہ
انی لے کر یوں بیدار ہوتا ہے جیسے سمندر کے جھاگ اٹھتے پانیوں
میں بیدار ہو رہی ہو یہاں اس بام سے اس بام تک، چنگ و
ما، شعر و سخن و لغت و فصاحت اور علم و ادب کی محفلیں سمجھتی ہی رہتی ہیں
محل کر اس شہر کی ایک شخصیت ترقیب پاتی رہتی ہے، اس کا
دارا اسی طرح تراشا گیا ہے۔ اس شہر کی شخصیت ”اور کردار“ اس کا
محفل میں ان سب عناصر کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے لیکن
ناپوری بھی ہوتا ہے کہ کوئی محفل بذات خود اس درجہ اہم ہوتی ہے کہ
نڈا آگے بڑھ کر شخصیت سازی کے اس محل میں سب سے نازک
بلکہ تعمیل پختہ ہونے میں لیتی ہے اور پوری شخصیت کے ساتھ

اس لئے بھی تھی کہ اس کا فرائض کے دوطرف آپ دیکھیں گے کہ طبیعت کی کیا، ریاضی، حیاتیات اور دوسرے علوم کے مشکل سے مشکل مضمون کس سادگی اور صفائی کے ساتھ اردو کے سانچے میں لکھتے اور سننے والے کے ذہن میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے اردو کی گراں مانگی اور اظہار مطالب پر اس کی قدرت کا ایک اور ثبوت پیش کیا۔

یادش بخیر! یہ وہی سوسائٹی ہے جس کی داغ بیل اب سے سوسلی پیپل سرسید نے ڈالی تھی اور جس کا وقع اگر تہذیب الاخلاق کا ملی وادنی کام ہم سب کے سامنے ہے اور اسی جماعت کے فدیے سرسید نے پساندہ مسلمانوں کو یاسیت کے غول سے نکل کر نئی دنیا اور اس کی ترقیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ترغیب دی تھی، سرسید کے جذبہ عمل، ان کی بے لوثی اور صداقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ یہ سوسائٹی جدید سائنسی علوم کی تحصیل کا ذوق عوام میں پھیلانے کے سلسلے میں اردو کے سرسید سے کام لے رہی ہے اور اسی طرح جو شیخ سرسید نے روشن کی تھی اسے روشن رکھنے کی سعی کر رہی ہے۔

دوسری سرودی تھی جمعہ کا دن تھا سہ پہر کے وقت یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ پروگرام کے مطابق اس نیک کام کی ابتدا تلاوت قرآن پاک سے ہوئی۔ جناب ماہر القادری نے تلاوت فرمائی اور اس کے خاتمے پر جناب حسن علی عبدالرحمن (صدر مجلس استقبالیہ) نے اپنا خطبہ استقبالیہ پڑھا جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ خطبہ کیا تھا، بجائے اختصار سے چند جملوں میں سوسائٹی کے مقاصد پر نظر ڈالی گئی تھی اور ان خدمات کو بھی ذکر کیا جو اس سوسائٹی نے اپنے قیام سے آج تک ملک کی ذہنی نشوونما اور اردو میں سائنسی علوم کی ترویج کے سلسلے میں کیا ہے۔

ڈاکٹر نہایت سادگی سے سہا ہوا تھا۔ حاضرین محفل کے عینی سامنے جو ڈاکٹر کا عقبی حصہ تھا، نہایت جلی حروف میں یہ قرآنی آیت ہمیں دعوت عمل دے رہی تھی۔ سَتَحَابُّكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ دُعا ہمارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے ہمارے معنی کے اعتبار سے یہ آیت کس قدر باموقع ہے اس کی داد ہر شخص دے رہا تھا۔ اصل میں شیخ علم کے نقش کے ساتھ یہ آیت خود اس سوسائٹی کا

مولو اور مولو گرام بھی ہے اور کس قدر معجزوں۔ ہم میں سے اکثر و بیشتر نے حالی کو نہیں دیکھا لیکن حالی کی زندگی، اعلان کے جذبات کے بارے میں سنا یا پڑھا ضرور ہے بلکہ ہمارے بزرگوں سے کراہ تک ہم برابر حالی کے خلوص، فیضان حاصل کر رہے ہیں۔ آج اسی جذبہ کی بازگشت بنا دے رہی تھی۔ استقبالیہ خطبہ کے بعد جو خطبہ افتتاحیہ پڑھا گیا اس کا لب و لہجہ بعینہ دہرایا تھا جیسا حالی کے مضامین ان کے مدرس اور قومی نظموں کی دلسوزی کا ہے۔ مدہم مدہم درد مند لیکن موثر الفاظ و لہجہ۔ یہ خطبہ جو کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر چانسلر، جناب اشتیاق حسین قریشی نے پڑھا تھا بلاشبہ دلوں پر نقش چھوڑنے میں کامیاب ہوا۔ شاید اس کی وجہ پڑھنے والے کا اپنا درد تھا اور اس کے لہجے کی بے لوثی تھی! یوں محسوس ہوتا تھا جو کچھ پڑھا جا رہا ہے وہ پڑھنے والے کے اپنے محسوسات ہیں انصاف سے عاری!۔ صرف خلوص اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک پیغام عمل۔ انہوں نے اپنے خطبہ کا آغاز اس شکر یہ سے کیا جو بقول ان کے اس عزت افزائی پر ان کے ذمہ واجب الادا تھا۔ پورا خطبہ ٹبری سلیس، شستہ، سادہ لیکن اثر انگیز اور وہیں تھا۔ ان کا مؤرخ ذہن برابر ان اسباب و علل پر مرکوز تھا جو کسی قوم کو ٹھیک اس وقت جبکہ وہ اپنے عروج کی بلند ترین سنگھاس پر فروکش ہوتی ہے، دھکیل کر قحط زلزلت کی طرف لے جاتے ہیں۔ ان تمام اسباب و علل کو نہایت وضاحت سے کھول کھول کر سامعین کے سامنے پیش کیا محسوس ہوتا تھا حاضرین وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں جو ایک دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے۔

ان کے خطبہ کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں انہوں نے ہمیں اپنی انفرادی ثقافت کی تعمیر پر نودیا تھا۔ فرمایا "اگر ہمارے دلوں میں اپنی ثقافت کی محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو ہم ہندوستان کی تہذیب میں جذب ہونے پر تیار ہو جاتے اور اپنی انفرادیت کو قائم کرنے کے لئے ان سب مصائب کا مقابلہ نہ کرتے جو ہمیں پاکستان کے حصول کی راہ میں پیش آئے۔ ظاہر ہے ہند کیا برا تھا اگر اس کی ثقافت ہمارے لئے قابل قبول تھی لیکن ہمیں اپنی شخصیت، الگ بنانی تھی۔ انفرادی شخصیت محض ایک قوی تر کافنی میں خم ہو کر اپنے تھوڑے بہت

جی آگاہ کیا گیا تھا۔ اس بصیرت افروز خطبہ کو سننے کے بعد یہ احسا بالکل بجا تھا کہ ہادی زبان ہرگز کم مایہ نہیں بلکہ اس میں تمام جدید اصطلاحات کو کچھ دھڑی اپنے میں سمو لینے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔ ضرورت صرف اس محنت کی ہے جو اسے درج کر سکے اور فروغ دینے میں خود اہل علم آگے ٹریں۔

اس خطبہ کے بعد نور شیعہ حسن صاحب (شریک ممتاز) نے ملک کے مختلف گوشوں سے موصول ہونے والے خیر مقدمی پیغام پھر کر سنائے۔ گزردہ مرنے پاکستان اور وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی کے پیغامات خاص کی چیز تھے۔ رضی الدین صدیقی صاحب کا پیغام اہمیت کا بھجپ تھا۔ دراصل یہ ایک "چیلنج" پر مشتمل تھا۔ یہی کہ بندہ یلہ اللہ جدید سائنسی علوم کا فروغ ان کی ترویج و اشاعت ممکن نہیں! مگر حقیقت یہ ہے کہ اس پیغام کے پیچھے ایک مخلصانہ جذبہ ہی کارفرما تھا ورنہ اگر مقصد مخالفانہ ہوتا تو جناب رضی الدین صاحب اپنی یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جاتی افتادہ حیوں میں اس جوش و جذبہ کے ساتھ اردو میں تمام جدید علوم کے تراجم اور فروغ کے لئے اٹھ کر کام نہ کرتے۔

جلسہ کا اگلا پروگرام "دوا دوا سالانہ" تھا۔ اسے شریک ممتاز پڑھ کر سنایا اور پھر عصرانہ کے بعد ایم سینا پر ایک نہایت پر مغز لیکچر کے ساتھ آج کا پروگرام بطریق احسن ختم ہوا یہ لیکچر جناب سلیم الزماں صاحب نے دیا تھا اور جلسہ کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد نے کی۔

آٹے روز کوئی ڈھائی بجے، سہ پہر کے وقت مختلف شعبہ جاتی اجلاس منعقد ہوئے مثلاً شعبہ علوم طبیعی، علوم حیاتیاتی، علوم ارضیات اور شعبہ تعلیم وغیرہ۔ ان تمام مجالس میں نہایت پر مغز تحقیقی مقالات اور دوسری میں پڑھے گئے جسے صاحب ذوق حضرات نے پسند کیا۔ ان علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی مساعی کو سراہا۔

بچے شام بلدیہ کراچی کی جانب سے ایک عصرانہ کا اہتمام بھی ہوا اور پھر ایک عام فہم لیکچر "بازاری غذاؤں میں بیماری کے جراثیم" پڑھا گیا جسے ڈاکٹر احمد علی احمد صدر شعبہ خود پاک و حیاتیات کراچی یونیورسٹی نے پڑھا تھا اسے بھی بہت پسند کیا گیا کیونکہ عوام کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔

یہ سہ روزہ کانفرنس کا آخری دن تھا۔ جلسہ ۹ بجے صبح شروع ہوا مختلف شعبوں میں تحقیقی مقالات پڑھے گئے، ہمارے بچے (۵۹ پر)

میزان سے دستبردار نہ ہونا تھا۔

اخلاق کی بلندی، علم و عمل کے میدان میں ترقی یہ تمام باتیں ان کے خیال میں دیگر اقوام کی اندھی پیروی میں انہی زبان سے دستبردار نہ کر حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ اس طرح ترقی تو کیا اس کی تلخ میوہ ہاتھ نہ آسکے گی۔ اگر اسی خوشحالی و تنگ تمیصوں، چست تیلوں و جسم کی ساخت کی ناکش سے ہاتھ آسکتی تو پھر کیا تھا۔ نہ کتب خانہ کی ضرورت تھی نہ محل کی، نہ کسی جامعہ کی نہ کسی دانشگاہ کی بچہ تو اب افسوس تھا جو ہاتھ آجانا کہ جو کچھ اردو نے خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا وہ ہمیں درزیوں کی سحر سے مل جاتا۔

"جس قوم کو اپنی کوئی چیز بھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر اور پر فریفتہ ہو وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے؟ کوئی قوم اس وقت تک جی نہیں کر سکتی جب تک وہ خود آگاہ نہ ہو۔ جب تک اسے خود اپنے لافنی ورثے سے دستبردار نہ ہو۔ تاریخ کا کونسا طالب علم ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ ہمارے ہاں علم و ادب اور یونانی زبانوں کی جگہ بند میں اسے دہاں اور تاریکی ختم نہ ہوا؟

اپنے خطبے کے آخری حصہ میں انہوں نے قوم کے باشعور و ذہین افراد سے بطور خاص دو باتوں کے لئے درخواست کی: (الف) اگر طبی علوم کے ماہر اس قوم میں ان علوم کا ذوق صحیح پیدا کرنا چاہتے ہوں تو ان کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ انہی زبان میں سوچیں، لکھیں، سمجھیں اور سمجھائیں تاکہ یہ علوم پھیلیں اور عوام تک رسائی حاصل ہو سکیں۔ (ب) کہ اگر قوم کو تباہی سے بچانا مقصود ہے تو اس فاصلہ کو اس سے کم کر دیا جائے جو اس کے اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے مابین ہے۔ اور یہ فاصلہ نصاب تعلیم اور مدت تعلیم میں کمی سے نہیں مٹایا جاسکتا۔

صدارتی خطبہ ڈاکٹر افضل حسین قادری (کراچی یونیورسٹی) پڑھا جس کا عنوان "پاکستان کی حیاتی جغرافیائی ماحولیات" تھا۔ یہ بہت دقیق سائنسی موضوع پر محیط ہونے کے باوجود بڑا عام فہم تھا بڑی روانی اور دہلیں پڑھا گیا کہ حاضرین کو اس کی شمولات ذہن میں لگنے میں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس امر کی حقیقت اس وقت کی گئی تھی کہ انگریزی مصطلحات سے گریز کیا جائے اور جہاں جہاں ممکن ہو انگریزی کے ساتھ ساتھ ان کی ہم معنی اردو اصطلاحات

”اترائے کیوں نہ خاک...“

مرفت جاوید

وہ چھوٹا سا قلم جو پہلے بھی اپنے ہمدرد دکھا چکا ہے۔ اب پھر میدان میں آتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ خاتمہ غالب کی آتش افشانی — چو کہ یہ شمارہ اسی بزرگ سے منسوب ہے، اس نے ہر بات میں اس کا حال مناسب ہے۔ کے برعکس اس کے خاتمہ خوردین اب بھی وہی دم ہے۔ (ادارہ)

قوم اور ملک کا دست و بازو۔ ان کا سہارا۔ ان کے محافظ سلطان کو پشت و پناہ۔ وہ لوگ جو ہمارے بڑے بڑے نازک وقتوں پر کا۔ آئے۔ یہاں تک کہ ہمارا آخری سب سے بڑا انقلاب بھی ان ہی کے دم قدم سے ہوا۔

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شکر خورے کو کسی نہ کسی طرح شکر مل ہی جاتی ہے۔ اب یہ سچ کی شکر ہو یا شکر کی بنی ہوئی چیز یعنی مٹھائی جس کے لڑکے بالے دیوانے ہوتے ہیں۔ یا ویسے ہی کوئی نہ سلی چیز۔ چنانچہ ہمیں بھی جو پرچم کے فرزند ہمارے اور ہم پرچم کرتی فوج کا دھوم دھام سے مظاہرے کرنے کے رسیا ہیں۔ اس سال بھی ایک موقع مل ہی گیا کہ ہم ان کے قریب آئیں۔ اور اپنی آنکھوں سے ان کے کارنامے دیکھیں۔

ہو ایوں کہ کھاری لیڈی پنسل نے ہم لوگوں کو یاد فرمایا۔ ان کے ہاتھ میں دو بڑے ہی خوبصورت چھپے ہوئے رسالے تھے اور کچھ کاغذات۔ ایک رسالے پر تین بیضوی قسم کے رنگین پکڑتے اور دو تلواروں میں چاند تارا۔ ایسا عمدہ چمکتا دبیز کاغذ کہ خود بخود چھوٹے کوچی چاہا۔ اس نے اور بھی کاس قسم کا بہترین کاغذ بھی ہمارے وطن عزیز کے دوسرے حصے مشرقی پاکستان میں تیار ہوتا ہے اور اس سے ہمیں باہر سے کتنا ہی روپیہ ہاتھ آتا ہے۔ بعد میں اس سے معلوم ہوا کہ یہ سلع افواج کے چوتھے دم کے لئے ہوا گئے دن ہرجوئی کو منایا جائے گا۔ سو مزید چھپا ہے۔ میں نے جوں توں کر کے یہ تحفے

اور یہ خاک، پاکستان کی خاک پاک کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ جس ہر سال کے سال ہمارے فوجی بھائی یوم مسلح افواج کے سلسلے میں پرہیز کرتے ہوئے پاکستانی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں اور اپنے شہری بھائیوں سے گھل مل کر ہنسی خوشی وقت گزارتے ہیں۔ اس دن اپنے قومی جھنڈے کو لہراتے ہوئے دیکھ کر جی کتنا خوش ہوتا ہے اور منہ سے بے اختیار یہ بول نکلتے ہیں: جھنڈا اڑتا ہے ہمارا۔ اور اڑتا ہی نہیں بلکہ جھنڈا اونچا ہے ہمارا۔ یقین جانیے جب بھی مجھے پاکستان کا چاند تارے سے آراستہ پرچم لہراتا نظر آتا ہے تو اس کے ساتھ میرا دل بھی آپ ہی آپ اونچا ہی اونچا اڑنے لگتا ہے اور جب کوئی ایسا موقع آتا ہے کہ یہ پرچم لہرایا جائے۔ تو میرا دل پھر پھڑانے لگتا ہے کہ میں اس کے آن بان سے لہرنے کا منتظر کیوں۔ اور جہاں اس پرچم سے ہمارے پرچم کے ساتھ ہماری مایہ ناز فوج۔ اس کے جیلے جوانوں، اس کے ہر دلعزیز پاسبانوں کی پرہیز اور بینڈ باجے کے ساتھ یا اس کے بغیر کوچ اور اس کے شاہینوں کی پرواز بھی شامل ہو۔ تو پھر کیا کہنے۔ سچ جانیے اس کے تصور ہی سے دل ملیں اچھلنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ اے کاش! ایسے مظاہرے روز روز ہوں۔ خاکی، سفید، نیلی و بدوی میرے لئے خوشی کی انتہا ہے۔ اپنے وطن کے ان مایہ ناز سپاہیوں کو دیکھ کر انسان پھولا نہیں جاتا۔ اور سینہ خود بخود غر سے تن جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہم چھوٹے چھوٹے پاکستانی ہی تو ہیں جو آگے جل کر اپنے وطن کا مان سپاہی نہیں گے۔

کس طرح اپنے معیار اور استعداد کو برقرار رکھئے۔ اس دن ہر قسم کے لوگ، ہماری طرح چھوٹے بھی اور بڑے بھی، اگر اپنے فوجی بھائیوں سے مل سکتے ہیں جس سے خود بخود ان کے متعلق بھروسہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ہم جان جلتے ہیں کہ ہمارا ملک مضبوط اور توانا ہاتھوں میں ہے۔ اور ہمیں اس کے بارے میں ذرا بھی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔ ان خوبصورت رسالوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارے بعض فوجی بھائیوں خصوصاً افسروں اور دوسرے کارکنوں نے بڑی بڑی عالمی مشقوں میں خوب کام کیا ہے۔ یومِ صلح افواج سے صرف ہمیں کو ان کا حال معلوم نہیں ہوتا بلکہ باہر کے لوگ بھی ان کا کس بل خوب جان جاتے ہیں۔

میں تو دو پہلی صفوں پر چھپے ہوئے ہر دو گرام ہی میں کھو گیا۔ واہ واہ! کیا کیا باتیں ہوں گی۔ صدر پاکستان کا حفاظتی دستہ شہر کا گھونٹا کھانے۔ میوزیکل سواری اور سنڈ پانگ کے کیا کیا کمالات دکھائے گا۔ چرکاں بازی تو ہم پاکستانیوں کا خاص مواد کھیل ہے۔ اس کا شاندار منظر بھی ہوگا۔ دن بھر بینڈ باجی کی سنگت کتنا مزہ دے گی۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ ورزش کے مظاہرے، لوگ ناچ خاص کر ہمارے پٹھان بھائیوں کا مشہور جیالا خٹک ناچ۔ یہ تو خیر تو فوجی باتیں ہوں گی۔ بڑی بات تو خالص فوجی قسم کے مظاہرے ہوں گے۔ یہ کہ حملہ کیسے ہوتا ہے۔ بچاؤ کیسے کیا جاتا ہے۔ دشمن کے ٹھکانوں پر بے پناہ گولہ باری۔ ساتھ ہی توپیں، سنگل کرنے کا سامان۔ فوجی فارمن اور فیکٹریوں کی پیداوار میں۔ چھوٹی چھوٹی بند قوس سے نشانہ باری اور بیمار یا زخمی فوجیوں کا علاج معالجہ کیسے ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مزے کی بات یہ کہ لوگوں میں ہم جیسے شوقین لوگوں کو بھی نشاد بازی کا موقع دیا جائے گا۔

اُدھر پاکستانی کے مایناز بحری جہاز بھی ڈاک یا انڈین کھڑے ہوں گے تاکہ ان کو دیکھنے کے دلدادہ شہری جوق جوق آئیں۔ اور وہ ساحلی فرد گاہیں جو بحریہ کی مدد اور ضرورتوں کے لئے بنائی گئی ہیں یعنی "کار سائز اور بہادر" لوگوں کے لئے کھلے ہوں گی کہ وہ ان میں اور ان کو دیکھیں۔ رات کو ان مقامات گودی اور جہازوں پر ایسا شاندار چراغاں ہوگا کہ وہ جنگل جنگل کر اٹھیں گے۔ بحری حملہ کے بینڈ بے پناہ پروگرام بھی میں نہیں فریال میں بھی بچتے رہیں گے۔

انتہائی لئے۔ اور ان میں اپنی بڑی، بحری اور ہوائی فوجوں کی تقریبیں دیکھ دیکھ کر اچھل اچھل پڑا۔ فوج ہو تو ایسی اور اس کا ساز و سامان اس کے کارنامے۔

خیر تو پرنسپل صاحب نے کہا: "لوگو! کل خوب چاق و چوبند ہو کر آؤ۔ کل اتوار کو بڑا ہی شاندار میلہ ہوگا۔ فوجیوں کا میلہ جس میں تمہارے فوجی بھائی تمہارے پاس آئیں گے۔ بات چیت کریں گے طرح طرح کے کمالات دکھائیں گے۔ جن کو دیکھ کر تمہاری طبیعت میں ولولہ بھی پیدا ہوگا اور تم بہت خوش بھی ہو گے۔ اور سنو، تمہیں کرایہ دے دے کر نہیں جانا پڑے گا۔ بلکہ فوجی میں خود آئیں گی اور تمہیں پولو گراؤنڈ میں یا دوسری جگہوں میں جہاں ایسا ہی فوجی ملن ہوگا تم جہل جانا پڑے گا۔ اور سنو میلہ تو ہوگا ہی اور ٹیڈا شاندار لیکن ساتھ ہی اس خوشی اور میلے سے فوجی بھائیوں سے ملنے کے موقع پر مٹھائی بھی تقسیم ہوگی۔"

یہ سن کر تو یار لوگوں کی باجھیں کھل گئیں۔ اور بعض کے دل میں اسی وقت لڑدھڑھانے لگے۔ اس لئے نہیں کہ مٹھائی ملے گی بلکہ یہ مٹھائی ہمارے فوجی بھائی دیں گے جس کی مناس دوہری ہوگی۔ کیونکہ ہر محنت کی مناس سے زیادہ مناس اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ بھی خوشی کہ نہ مٹی کہ گھر کے قید خانے سے نجات ہوگی اور ہم تھوڑی دیر کھلی جوا میں دم میں گئے۔ پڑھائی و ڈھائی یا یومِ ناک کا سمجھت بھی نہ ہوگا۔ بعض اس خوشی سے اچھل رہے تھے کہ طرح طرح کے بینڈ باجے سنیں گے، رنگ بنگا فوجیں دیکھیں گے اور خوب موج میلہ ہوگا۔ چھٹی کی تو بات ہی کیا ہے۔ کیونکہ اس دن تو ہم بڑا تھا۔ اور چھٹی ہوتی تھی تو اس کی خوشی کی باجھیں بڑھتی ہیں۔ پاکستانی کے نہ ہال پڑھائی سے کیوں بھاگیں۔ پڑھائی پڑھائی ہے وہ کھیل کھیل۔ اور حق پر چھٹے تو کھیل تماشا ہے بھی کھیل کے کھیل اور پڑھائی کی پڑھائی یعنی سکھائی ہیں۔

تو صاحب وہ دن آیا۔ کتنا سہانا دن! ہم سب لڑکے لڑکیاں۔ انبجے تک کیا ۹ بجے ہی دھڑا دھڑا سڑک کے کیونڈ میں جمع ہو گئے۔ بس آئی۔ ہم سب لپک لپک کر اس پر سوار ہو گئے۔ واہ کس شاندار کیس تھی کہ گندوں پر بیٹھتے ہی حرا آگیا۔ وہ دھڑل چل رہی تھی جیسے نیچے سرک ہی ہو۔ اس وقت ہمیں وہ رسالے کام آئے۔ اور ہم ان کے ورق الٹ الٹ کر دیکھنے لگے۔ وہ پہلی اوراق پر سارا پروگرام درج تھا۔ پتے کی بات تو ایک ہی تھی۔ یہ کہ اس یوم کا مقصد ہے۔ یہ تہانہ کہ ہماری افواج نے

اور سارا دن خوب رونق رہے گی۔

ایک بات بہت اچھی لگی۔ یہ کہ اس دن ہمارے فوجی بھائی قوم کے لئے "ایٹ ہوم" ہوں گے۔ اور یہ اب کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ کیونکہ ہم لوگ جلد ہی منزل مقصود پر جا پہنچے۔ اور اچھل اچھل کر جلدی جلدی بس سے نیچے اتر گئے۔ دیکھا تو دوسرے اسکولوں سے بھی لڑکے لڑکیاں دھڑ دھڑا کر آ رہی تھیں اور سب کے سب خوشی سے چہرہ ہار رہے تھے۔ دوسرے لوگوں کے بھی ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے اور سچ ایسی بڑی گراؤنڈ پر بہت بڑا میلہ لگا ہوا تھا۔ ہر طرف رونق ہی رونق اور گہما گہمی بڑک کر کی ایک طرف جوجو تڑپنا ہے، اس پر کراچی کی فز چلنے والی ہوا میں ہمارا قومی جھنڈا کس شان سے لہرا رہا تھا۔ اور اس کے سامنے سے پلٹنیں سلائی دیتی ہوئی گزر رہی تھیں ہماری بڑی افواج کا دم خم دیکھنے کے لائق تھا۔ تربیت یافتہ فوجی کیسے ان بان سے ایک ساتھ قدم اٹھا اٹھا کر چل رہے تھے۔ اور ان کے پوری ہم آہنگی کے ساتھ اٹھتے ہوئے قدموں کی جھلک پاکستان کے ہر شہر لاہور، کوئٹہ، پشاور، ملتان، ڈسکہ میں ہر کہیں نظر آ رہی تھی جہاں ہماری مسلح افواج کا دن اس ہی وقت بالکل اسی اہتمام سے منایا جا رہا تھا۔ ہمارے یہ کھیل جولا کیلئے صحت، قوت، بہادری، تربیت اور نظم و ضبط کی چلتی پھرتی تصویریں۔ اوی کو دیکھ کر ہمارے چھوٹے چھوٹے سینے میں خود کو دو توجہ جیسے نہ نہیں ہم مارچ کر رہے ہوں۔ اور اس میں تعجب بھی کیا ہے۔ آخر ہم جیسے قوم کے نو نابل ہی تو ابھی تعلیم، اچھی تربیت پاکر فوج میں شامل ہوں گے۔ کوئی فوجی جوان نہیں گے، کوئی بحریہ کے سپوت اور کوئی شاہین۔ میرے خدا بیٹوں کی وہ شاندار قطار اور بڑی بڑی لہریں جن کی سلائی کی پہلی پہلی گھن گرج اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی۔ بیگ پانیوں کی سرسبلی مست کن آواز اور ڈھول کی دھڑلہ انگیز ضرب۔ آگے آگے رنگ، رنگی دھڑی پہنے روپہلی عصا ہلاتا اور کبھی کبھی ہوا میں اچھالتا قوی ہیکل جوان، کتنا مزا آتا تھا اس کو دیکھ کر۔ وہ سر پہ سفید براق بھرپور قطار اندر قطار وہی لمطراق وہی گون بان۔ اور شاہین۔ زمین پر یوں چلتے ہوئے جیسے وہاؤچی فضاؤں میں شاہانہ پرواز کر رہے ہوں۔ دیکھنے میں فوج کے باندھنیں مگر حقیقت مکمل طور پر ایک۔ وہ اور ان کا ساز و سامان بھی ملک کی زیادہ سے زیادہ طاقت اور حفاظت کے عناصر میں جیسے توڑے گئے

وقت میں بھی یہ قوم کے کام آسکے۔ اور ملک کے اندر ہی کیا باہر بھی انہوں نے پاکستان کی ایسی دھاک قائم کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کون نہیں جانتا کہ مغربی ایران اور کانگو میں ہماری فوج کچھ چلائے جواؤں نے کیا کیا کاروائے نمایاں انجام دیئے۔ ہمارے سپاہی اور ملارج اقوام متحدہ کے زیر سرکردگی ان دونوں ملکوں میں گئے۔ لطف یہ کہ انڈونیشیا اور ہالینڈ دونوں حریفوں نے بڑی خوشی سے ان کا اپنے یہاں آکر خدمات انجام دینا قبول کیا۔ ہمارے فوجی بھائیوں نے دو گنا جگہ بڑی ہی تن دہی مستعدی اور خلوص سے کام کیا۔ اور اپنے حسن سلوک اور حسن عمل سے کانگو اور مغربی ایران دونوں کے باشندوں کو اپنا دوست اور گرویدہ بنا لیا۔ یہ دیکھ کر تو اقوام متحدہ نے طے کر لیا کہ آئندہ جب بھی امن کی خاطر فوجی امداد کی ضرورت پیش آئے گی، تو پاکستان کا نام سر پر فرست دیا جائے گا۔

اور یہ کوئی اچھے کی بات نہیں۔ وہ علاقہ جو آج پاکستان کہلاتا ہے، صدیوں سے ایسے لوگوں کا گہوارہ رہا ہے۔ جو سپاہی بننے پر ناز کرتے ہیں۔ شجاعت اور بہادری ان کی روایات ہی میں نہیں ان کے خون میں داخل ہے۔ ان کے نزدیک فوجی ہندوستان سے زیادہ فخر کی بات ہے۔ بھجپہ وقت آنے پر سپاہی بننے کا اہل ہے۔ فراموشی تربیت دی اور وہ سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ جیسی تو ہمارے فوجی ہمارا مان ہیں۔ اور دنیا بھر میں بہترین مانے جاتے ہیں۔ آج ہماری فوج مشرق میں سب سے زیادہ چاق و چوبند فوج ہے جو ہر جہم میں پوری اتر سکتی ہے۔ کئی رجمنٹیں تو ایسی ہیں جن کا سنہ دو سو سال سے قائم ہے۔ اور انہوں نے فوٹوں ملی جگہوں میں میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری فوج میں اچھے اچھے نامور کھلاڑی بھی پیدا کئے ہیں۔ مثلاً میجر حمیدی اور میجر عارف جو باکی کے مشہور کھلاڑی ہیں۔

خوب یاد آیا۔ یہ ہماری فضائیہ ہی کا ایک فوجان تھا جس نے ہلاک مستعدی سے ایک در آنے والے لڑاکا جہاز کو ہلاک سمیت مار گرایا تھا جو ہمارے فوجی ٹھکانوں کے نوٹ لینے آیا تھا۔ ہماری پیدل فوج کو بجا طور پر میدان جنگ کی ملک کہا جاتا ہے۔ پنجاب رجمنٹ، بلوچ رجمنٹ اور فرنٹیر فورس رجمنٹ سب کی سب اپنی بہادری اور جوان مردی کے لئے شہرہ آفاق ہیں۔ فوجی افراد

گوسارا دن اور صبح چلتے پھرتے۔ کبھی سرکاری فوجی بسوں۔ اور کبھی ٹینکوں میں۔ گزرا جس سے مکان تو ضرور ہوئی لیکن جو تفریح ہوئی اس سے ایسا لگا جیسے ہم اسی طرح بکاش بکاش گھر واپس آ رہے ہیں۔ جیسے صبح روانہ ہوئے تھے۔

بہت اچھا ہے کہ یہ دن ہر سال اسی طرح منایا جائے۔ یہاں تک کہ ہم نئی پود کے لوگ بنے ہو کر خود کیڈٹ بنیں اور اپنے بعد کی نانی کو پاکستانی فوج کا ایسا ہی خاندان نظر دکھا سکیں +

”چشم بکشا اندیں دیر کہن“، — بقیہ صفحہ ۵۵

اجلاس ختم ہوا۔

سہ پہر ۳ سے ۵ بجے تک ایک مذاکرہ بعنوان ”ملک کی معاشی ترقی کے لئے وسائل کا استعمال“ منعقد ہوا جس کا افتتاح جناب غلام فاروق صاحب سائنس گورنمنٹ شرعی پاکستان نے کیا اور صدارت جناب رضی الدین صدیقی نے فرمائی، اس میں ملک کے مشہور دانشوروں نے شرکت کی اور اسے ان اجتماعات کا اگر محل سرسبز کہا جائے تو بجا نہ ہوگا۔

شام ۵ بجے سندھ مدرسہ بورڈ کی جانب سے جس نے اس کا نفرس کے انعقاد کے سلسلہ میں جمالی نوازی کے فرائض قبول کئے، ایک عصرانہ کا اہتمام بھی ہوا اور اس طوع یہ سہ روزہ کانفرنس ٹہری کا بیانیہ کے ساتھ ختم ہوئی۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ملک کے میٹروپولیٹن سائنسدان اور دانشور ملک کی ضرورتوں کو محسوس کر رہے ہیں اور جلد ہی بدیر نہیں یہ احساس ہو گیا ہے کہ انہی زبان ہی انہی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے اور ملک میں سائنس و ٹکنالوجی کے فروغ میں ہماری زبان بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے اور اسی تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے خلائی و فضائی دور میں ہم دوسروں کے ساتھ اگر ہمت قدم نہ ہٹا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو ان علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ کرنا پڑے گا اور جیسا کہ خود صدر پاکستان بابر ہار ہمارے نوجوانوں کو تلقین کر رہے ہیں ملک کو سائنس کے فیضان سے بہرہ ور ہونا چاہیے مگر ساتھ ہی اپنی روحانی و ثقافتی اقدار کے سرچشموں سے بھی ہمیں دور نہیں جانا چاہیے کیونکہ علم اور عمل کی راہیں ہمیں اپنی منزل کی طرف تباہی لے جاسکتی ہیں جب ہم اپنے ماضی کے درخشاں پہلوؤں سے بھی آگاہ ہوں اور نئے تقاضوں کو بھی اپنی زندگی کا آدرش بنائیں +

اور صبح کے لئے اسٹاف کلرک کو مٹر دنیا کے اہم ترین کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس مودیر میں دنیا کا نقشہ کیسا عمدہ بنایا گیا ہے۔ اور اس میں مشرقی و مغربی پاکستانی اور اہم فوجی مقامات کس خوش اسلوبی سے دکھائے گئے ہیں۔ گھر آ کر میں بھی برش اور کلرکس نے کر بیٹھ گیا کہ ایسا ہی خوب ڈرائنگ بناؤں اور اس کو دیوار پر لٹکا دوں۔ ہاں، اور وہ جو فوجی جوانوں کو رسمیں پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھتے دکھایا گیا ہے، اسی طرح ریسوں کو پکڑ کر میں بھی اوپر چڑھنے کی مشق کرتا رہا۔

جہاز سازی کی گودی ہمارا ایک اور بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی واقعی بڑی ضرورت تھی۔ اب ہمارا بحریہ، خدائے فضل سے ہر طرح اتنی ترقی کر چکا ہے کہ یہ دونوں بازوؤں کی پوری پوری حفاظت کیلئے۔ اس میں سیکھائی، ساز و سامان اور درستی و درست سب کا پورا پورا اہتمام ہے۔ ساحل ساحل بحری فرو دگا ہیں بھی ہیں۔ بہادر، ہمالیہ، دلاور۔ اس طرح ۱۵ ایک سال میں بحریہ کچھ ہو گئی ہے۔ جہاز خریدے گئے، تربیتی ادارے قائم ہوئے، مرمت و درستی کا انتظام ہوا۔ اور دوسرے ملکوں کے ساتھ مل کر کتنی ہی مشقیں بھی ہوئی ہیں۔ پی۔ این۔ این۔ ہالہ۔ نگار ساز۔ ہمالیہ۔ لڑکوں میں بڑے ادارے ہیں۔ طوفان اور سیلابوں کی روک تھام، ان کے سلسلے میں مدد و سمندر کی تہ کی پیکش اور جائزہ۔ اور ساحلی پیکش کے سلسلے میں بڑا کام ہو رہا ہے۔ مشرقی پاکستان میں چائنا کی نئی بندرگاہ اس ہی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ چائنا کام میں جو سمندری اکیڈمی قائم ہوئی ہے، وہ اچھے اچھے افسر اور جہاز راں پیدا کرے گی۔ زمین، پانی، اپنی جگہ ہیں، ہوا اپنی جگہ۔ اور اس کی بات ہی کیا ہے۔ آگے سے آگے بڑھ جاتے کے لئے فضا ہی کام آتی ہے اور ہم ایسا کر رہے ہیں۔ تربیتی ادارے قائم ہوئے۔ نئی وضع کے جہاز بنا کر تیار، ہارڈ ویئر وغیرہ خریدے گئے۔ اور اب توجہ طیاروں کا دور ہے۔ سب سے بڑی بات رائل پاکستان ایئر فورس کب کا صرف پاکستان ایئر فورس بن چکا ہے۔ اور یوں کتنے ہی خواب ہیں جو پورے ہو چکے ہیں۔ ہمارے شاہین اور شاہباز برابر عالمی مشقوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اور ملک میں جو ٹیڈی دل آتے رہتے ہیں، ان کو طیارہ میٹ کرنے میں فضائی بیڑے نے بڑا کام کیا ہے۔ سیلابی مہل کی امداد کے سلسلے میں جو کام کیا گیا ہے، اس کو کبھی نہیں بھلا یا جاسکتا۔ یہ سب کچھ میں نے اور میرے ساتھ ہزار پاکستانیوں، چھوٹوں اور بڑوں نے بڑھا ہی نہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور

آزاد بنام غالب — بقیہ صفحہ ۱۱

عجب احوال ہے میرا کہ جب خط اس کو لکھتا ہوں تو دل کچھا دیکھتا ہے، قلم کچھا اور کہتی ہے بلکہ اگر خود مولانا آزاد کا اقتدار کیا جائے تو یہ شعر ظفر کا نہیں بلکہ ان کے اپنے استاد ذوق کا ہے کیونکہ یہ ظفر کے دیوان سوم میں ہے۔ (ص ۱۵۴)

۱۰۔ التماس دتی میں مذکر۔ اور لکھنؤ میں مونث ہے۔ اگر بری لفظوں کی تذکرہ و تائید کا اس زمانے تک تعین ہی کہاں ہوا تھا کہ اس پر اعتراض ہو، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک اس بارے میں کوئی ایک قاعدہ متعین نہیں ہوا۔ ایک ہی لفظ کوئی ذکر کھدکھائی کوئی مونث۔

یہ ہے مولانا آزاد مرحوم کی فرد جرم غالب کے خلاف۔ اسے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ۔

۱۱۔ غالب دراصل اردو کے نہیں فارسی کے شاعر تھے۔ اس ان کی تعلیم و تربیت ناقص رہ جانے سے وہ اس میں بھی صبیح اور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے، (۳) اردو میں ان کا اکثر کلام ناقابلِ فہم یا دوسرے لفظوں میں بے معنی ہے،

(۴) اردو میں وہ غلط محاورہ اور زمرہ لکھتے ہیں، (۵) وہ اردو شعر میں فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ لکھتے ہیں جو اردو کے اہل زبان کے روزمرہ کے خلاف ہوتا ہے،

(۶) ان کی اردو سولے غیر سنجیدہ تحریک کے اور کسی سحر فکری نہیں (۷) ان کے اردو خطوط عام قاری کے لئے بے مزہ ہیں؛

خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں ملائے گئے، تو اس انداز میں ممکن نہیں“ (ص ۶۴۹) اس پر مزید عاشرہ رائی کی ضرورت نہیں مان کا مدعا یہ ہے کہ اردو کی اصلی زبان صرف اس وقت اور خط و کتابت (اور وہ بھی غیر سنجیدہ موضوعات پر) تک کا نام دے سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس زبان پر کسی اہم موضوع کا ریکارڈ یا اس خاص علم کا بیان کرنا چاہے، تو یہ زبان اس طرح کے مفہوم کے ادا کرنے میں قاصر رہے گی۔

۸۔ پھر اس پر بس نہیں کرتے۔ عام خیال ہے اور یہ ہے بھی درست کہ اردو کی اصلی کے خطوط کی زبان، ان کا فکا ہی انداز اور بے ساختہ ایسا ہے کہ انسان اگر انہیں پڑھنا شروع کرے، تو بے مکان ٹپرتا ہی چلا جائے اور اس کی سبھی نہ ہو۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

”لو! لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آئے کہ جو خود ان کے حال سے اور مکتوب ایہوں کی حال و حال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لئے اگر ناواقف آدمی پھر لوگوں کو اس میں مزہ نہ آئے، تو کچھ تعجب نہیں“ (ایضاً)

۹۔ اس کتاب میں قلم، التماس کو مونث، پنشن، بیلہ، ٹانگہ کو مذکر فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: میرا اردو بے نسبت اردو کے فصیح ہو گا“ (ایضاً) یوں معلوم ہوتا ہے کہ قلم، غالب کے زمانے تک مونث بھی لکھا جاتا تھا۔ ظفر کا شعر ہے۔

غالب بنو وثیرہ من قافیہ بندی
ظلمے بہت کر بہ کلمہ و دقہ نم ہشت

نقش فریدی ہے کسی شوقی تحریک
کاغذی ہے پیرانہ سچا تصور کا

نقد و نظر:-

”راہ سخن واکرے کوئی“

عبداللہ خاور

کچھ عرصہ گزرا ہم نے نقد و نظر کے لئے یہ تازہ عنوان لے کیا تھا لیکن فردا نہیں فردا ملتی ہوئے ہوتے تو بیت اس شاعر ملک پہنچی جو غالب سے منسوب ہے اور اس طرح حق اتر چکا رنگ پہنچ گیا بھگت خورہ سخن واکرے کی بجائے ہم یہ ہم ایسے مرد کاروان کے سپرد کر رہے ہیں جو شاعر اور پھر دونوں کے لئے ”دل گراختہ“ رکھتا ہے۔ کا وہم از راز وہم از ساز آگہست۔ اور یہ راز و سنا تھار ہے غالب کا فارسی کلام اور اس کے نکات و معانی ہی ہیں۔ رنج نہ ہی رنج یعنی عید اللہ خاور ہی! — (اوارہ)

بحث کے ساتھ کلام کا انتخاب بھی کیا۔ چند اور اہل ذوق، مثلاً نیاز فتح پوری، عروسی، غلام رسول جہر، مالک رام اور ڈاکٹر یوسف حسین وغیرہ نے اپنی تحریروں میں غالب کی فارسی شاعری کا ذکر کیا، مگر اس پر زیادہ گہری نظر نہیں ڈالی، خلیفہ عبدالحمید مرحوم نے بھی اس کو یہ انداز محرام نہ دیکھا۔ بہر حال اس کا اعتراف تقریباً سب ہی کو ہے کہ غالب کا فارسی کلام اساتذہ ایران کے کلام کے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے ”نقش ہائے رنگ و رنگ“ کسی نے نہ دیکھے اور ان پر تازہ کی کے دبیز پردے ہی پرے رہے۔ ڈاکٹر حارف شاد گیلانی نے، خون گرم کوکھن دار درگ قیال ما، کے مصداق اور توجہ دی اور اپنا تحقیقی کا نامہ ”غالب، اس کی زندگی اور فارسی شاعری“ (بزبان انگریزی) پیش کیا جس میں شاعر کی زندگی اور اس کے فن کے کئی گوشے اجاگر کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں غالب کے متعلق پورا سرمایہ پیش نظر رکھا گیا ہے اور اردو فارسی نظم و نثر کی تمام اصناف سخن پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ مآخذ کا وسیع و عریض میدان بھلے خود ناقد کی ہمت عالی کا آئینہ دار ہے۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے میں غالب کے حالات ہیں اور دوسرے میں ان کی شاعری اور فن پر گفتگو ہے۔ آخری حصہ کی ترتیب میں مصنف نے فارسی شاعری کی اصناف پر بھی گہری نظر ڈالی ہے تاکہ فارسی شاعر کی حیثیت سے غالب کے صحیح مقام کا تعین کیا جاسکے۔

غالب نے کہا اور بیت زود شو سے کہا کہ بر صغیر میں فارسی سخن آرائی کا سلسلہ نہ صرف عرفی و طالب بہ غالب رسید۔ اور یہ کہ از باز پسین کچھ گزرا ان پیشم یہاں تک کہ اردو کو بے رنگ من است“ قرار دے کر فارسی نثر تا ثبوتی نقش ہائے رنگ و رنگ“ کا آواز بلند کیا۔ لیکن منکر اور شعر من“ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض فارسی دوستوں نے بادل فارسی سے سرمست سخن ہونے کی کوشش کی ہے۔ پھر بچن جو میخانے، بقول شاعر ”در بن ہر لفظ چیدہ ہیں وہ بری حد تک ناشاید“ نادیدہ اور ناحیث دیدہ ہی رہے۔

ہماری یہاں فنکار تخلیق کرتا ہے اور نقد فیصلے صادر کرتے ہیں۔ غالب نے کہا ”فارسی میں“ نقاد نے کہا یہ تو ذوق سے کہا ہے، ہم سے نہیں۔ اور ہم سے بھی کہا ہے تو اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ غالب کا اردو کلام ان کی بقائے دوام کا ضامن ہے جس کی عظمت کا خود انہیں اندازہ نہ تھا۔ چنانچہ غالب کی زندگی طعنت غالب اور ان کی اردو شاعری کے علاوہ ان کے خطوط — غرض سب ہی کچھ زیر بحث آئے۔ ذاتی توان کی فارسی شاعری —

سرسید نے تذکرہ اہل ہنر میں سب سے پہلے غالب کا ذکر فارسی شعر کے زمرہ میں کیا۔ حالی نے یادگار غالب میں ان کے فارسی کلام کے تجزیہ اور افہام و تفہیم کی طرف توجہ کی۔ پھر ایک جگہ بیت گیا اور شیخ محمد اکرام غالب کے فارسی کلام کی طرف توجہ ہوئے۔ انہوں نے تفصیلی

تہذیب میں سب سے پہلے عصر غالب کا سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی جائزہ اس طرح لیا گیا ہے کہ پورے دور کی تصویرِ نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ دور انقلابوں اور آشوبوں کا دور تھا جس میں غالب کو اپنی پوری زندگی گزارنی پڑی۔ پہلے حصہ میں غالب کی تاریخِ ولادت، ان کی تعلیم و تربیت، خاندانی حالات، اساتذہ کا ذکر، دلی منتقل ہونے کی تاریخ، دہلی میں قیام، کردار، قید و بند، حلیہ، مذہبی عقائد، حالات اور وفات تک کوئی ایسا اہم پہلو نہیں جس پر مصنف نے تحقیقی نظر ڈال کر کوئی فیصلہ نہ دیا ہو۔ ان معاملات میں جو دلائل اور شواہد پیش کئے گئے ہیں ان میں غالب کے متعلق بعض نئی معلومات اور تحقیقات بھی سامنے آئی ہیں اور غالب کی عقل کے سامنے نئی راہیں کشادہ ہوتی نظر آتی ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں غالب کی فارسی شاعری کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں غالب کی فارسی استعداد و ان پر اساتذہ ایران کے اثر، نظیری اور بیدل کے تنبیہ، اور پھر مصنف دار غالب کی شاعری کا ایک بسبب جائزہ ملتا ہے۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں چھوڑی گئی جو فارسی شاعر کی حیثیت سے غالب کا صحیح مقام متعین کرنے میں ہماری رہنمائی نہ کرے۔

مصنف خود فارسی کا شاعر ہے اور فارسی زبان و ادب پر عبور رکھتا ہے اس کا انداز فکر سائنسی ہے جس کا ثبوت کلام غالب کی تنقید و تبصرہ میں ملاحظہ ہو۔ ہر صنف میں غالب کے فن اور انداز کلام کی خصوصیات، اساتذہ سے موازنہ اور ان کی تاریخی اہمیت واضح کرتے ہوئے غالب کا مقام متعین کرنے کی جس طرح کوشش کی گئی ہے وہ نقد کے اعتبار سے بھی اہم ہے اور حقائق کی تفصیل و تجزیہ کے اعتبار سے بھی۔ خصوصاً تصانیف کا کاجام تحریہ اپنی ہر جگہ حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کا کلام ابتداً زبانِ فنی ایک ہائیک میں شاعر کا کلام ہے اور اسے پرکھنے کے لئے پہلے اس کی وسیع کائنات پر حاوی ہونے کی ضرورت ہے۔ مصنف

نے تقریباً بیس برس اس پر صرف کئے ہیں۔ اس لئے غالب کے فارسی کلام میں اسے جو کچھ نظر آئے وہاں تک شاید بعض معروف مبصرین غالب کی نگاہیں بھی کم پہنچی ہوگی۔ غالب کے نظریہ شعر و فن کا خود غالب ہی کے اشعار اور تحریروں سے جس طرح استنباط کیا گیا ہے وہ بھی مصنف کی نکتہ رسی و وقت نظر کی ایک روشن مثال ہے۔ غالب میں ابہام کی دریافت تو کوئی نئی بات نہیں البتہ اس کے متعلق مصنف کا یہ جواز ضرور قابلِ غور ہے کہ غالب میں ہمیشہ گہرائی اور ندرت کا جوہر ملتا ہے اور ان کے کلام تک پہنچنے کے لئے قاری کو اپنے اندر فکر و خیال کی وسعت بھی پیدا کرنی پڑتی ہے اور زحمت بھی۔ غالب خود باریک بین ہیں اور اپنے قاری سے بھی باریک بینی کی توقع رکھتے ہیں مصنف نے یہ کہنے کی خاطر ہی نہیں کہا ہے بلکہ اپنی اس تصنیف میں غالب کے ساتھ اپنی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔

غالب کے مقام کا تعین کرنے میں جس وقت نظر سے کام لیا گیا اس کا اندازہ ان عنوانات سے بھی لگایا جاسکتا ہے :
۱۔ کیا غالب تقلیدی شاعر تھا؟ اس فارسی شاعری میں غالب کا مرتبہ۔ (۳) ہماری شاعری میں غالب کا مقام۔ (۴) معاصر شعراء میں غالب کا درجہ (۵) غالب کا اندازہ اپنے بارے میں۔ (۶) معاصرین کی رائے۔ (۷) پیغام۔ ان توضیحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ اس سے زیادہ شرح و بسط کیساتھ اب تک پیش نہیں کیا گیا تھا۔

یوں تصنیف کے بعض مباحث سے جزوی اختلاف ہو سکتا ہے اور ان امکانات کے پیش نظر ہی مصنف نے لکھا :
"میں تکمیل کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اگر تکمیل کے حصول میں صاحبِ نظر حضرات تعمیری مشورے دیں تو ذاتی طور پر ہمنون ہوں گا۔"
کہ کئی کا سلسلہ یہیں نہیں ختم ہو جانا بلکہ ایک اور جوئے شیر بھی نکالی گئی ہے یعنی غالب کا تمام فارسی کلام پیش نظر رکھ کر کتاب کے آخر میں ایک ہزار اشعار کا برجستہ انتخاب بھی دیا گیا ہے جس نے تصنیف زیرِ نظر کو ہر اعتبار سے مکمل اور قابلِ قدر بنا دیا ہے۔

رنج گراں نشیں

آج ہمیں رنج گراں نشیں کی شکایت کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس سے ہمارے قلب و جگر ٹکا رہا اور آنکھوں سے جوتے خون رواں ہے۔ بیدار اجل نے ہمیں پھر ناگہاں ایک ایسے ستارہ روشن سے محروم کر دیا ہے جو ہمارے افقِ ملت کے لئے دجہ فروغ تھا اور مشرقی پاکستان ہو یا مغربی، اس کے ماتم میں سید پوش ہے۔ ہمارے وزیر خارجہ جناب محمد علی — جو پہلے بحیثیت سفیر پاکستان اور پھر وزیر اعظم کی حیثیت سے ملت کے افق پر بڑی آب و تاب سے فروزاں ہوئے تھے اور اب پھر جب دور انقلاب کے بعد نئے آئین نے جمہوریت کی شعاعوں سے معمور، روشن تر فضا پیدا کر دی تھی وہ اور بھی آب و تاب سے ایک نیاحیات افروز کردار ادا کرنے کے لئے منظر عام پر آئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے نئے عہدے کی مختصر مدت — خوش و خرم و شید و لے دولت مستعجل بودا — میں اس کا نمایاں ثبوت بھی دیا تھا۔ اس لئے تمام افرادِ ملت کی نگاہیں اُن پر مرکوز تھیں اور اُن کی ذاتِ گرمی سے اُن کی بہترین امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن افسوس! وہ جانکا ہوا مرض جس کا شکوہ انسان کو ازل ہی سے رہا ہے، اس نے بہت ہی بے وقت ہمیں اس ستارہ روشن کی تابانیوں سے محروم کر دیا۔ عین اس وقت جب وہ ہمارے ملی اور بین الاقوامی لائحہ عمل میں ایک نئی جوت جگا رہا تھا، اس کی شعاعوں میں ایک نئی تابانی پیدا ہو رہی تھی اور اہل ملک کو اس کی بصیرت افروز رہ نمائی کی اشد ضرورت تھی، اس ستارے کا روپوش ہو جانا جو ہماری ملت کے مقدر کی تشکیل کا ضامن تھا، یقیناً ایک عظیم سانحہ ملی اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے، جس پر قوم کا ہر فرد اشکِ خون بہا ہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وعلیٰ کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پاکستان کی جس ترقی و خوشحالی کا خواب وہ عمر بھر دیکھتے رہے اور جس کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر آخری دم تک کوشاں رہے، وہ حقیقی معنوں میں روشناسِ تعبیر ہو۔ پاکستان کی اس مایہ ناز ہستی کے پسماندہ گاہ اور سونگہ ارانِ ملت کو گہم کوئی بات وجہ تسلی ہو سکتی ہے تو یہ کہ:

مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

”ماکافو“ اشاعت خاص

مارچ ۱۹۶۳ء

سابقہ روایات کے مطابق اس سال ہی ”ماکافو“ یوم پاکستان کی تقریب پر اپنا خاص نمبر شائع کر رہا ہے جس کی ترتیب کا کام شروع ہو چکا ہے۔
بوصغیر کے ممتاز اہل قلم اس میں حصہ لے رہے ہیں

★

چار صفحے کی آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی رنگین و دیدہ زیب تصاویر
۱۲ صفحے کی سادہ تصاویر

— فن — تاریخ — معاشرہ — ثقافت — ادب —
— علاقائی شہ پارے — کہانیاں —

— نامور شعرا کا تازہ کلام —
سرورق، نفیس نقاشی کا نادر نمونہ
ضخامت، دگنی

★

فی کاپی ایک۔ دو پیسہ ۲۵ پیسہ
سالانہ خریداروں کو یہ اشاعت خاص
اور اکتوبر میں شائع ہونے والی ایک اور
خاص اشاعت سالانہ چندہ ہی میں
پیش کی جاتی ہے۔

مشہرین اور ایجنٹ حضرات فی الفور توجہ فرمائیں

(نہجی)

اکثر مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

صحت اور دانت



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کپڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن: جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد مکمل کیا گیا ہے دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو اسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش:- ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے محوین وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ:- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے تھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار:- ہمدرد منجن کی دیرپا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔



ہمدرد منجن

مسکراہٹ میں شش اور دانتوں میں بچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے۔

ہمدرد دواخانہ (وقف)، پاکستان
کراچی ڈسٹرکٹ لاہور



مسلم بنگالی ادب کے پامس

(بنگلہ سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتابت نفیس اردو نائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔

سرورق دیدہ زیب اور رنگین - ضخامت . . . صفحات

قیمت چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کر سکے اور ہمیں اپنے وطن کی ناک سر زمین کی عظمت اور اس سے روشناس کر سکے۔

”نوائے پاک“ میں ملک کے نامور شعرا کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں، گیت اور ترانے درج ہیں

کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گردوپیش سے آراستہ

گٹ اپ بہت نفیس اور دیدہ زیب -

قیمت صرف ایک روپیہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

نئی کتابیں

پیر حکومت، ————— مصری مصنف علامہ عبدالرازق کی عربی تصنیف کا ترجمہ
 مناسب میں اس نظریہ کو پیش کیا گیا ہے کہ خلافت ایک اسلامی ادارے کی حیثیت سے ختم کر دینی چاہیے۔ خلیفہ کو قرآن اور سنت کے
 کوئی سند حاصل نہیں ہو کہ دو قس میں محض اصول احکام ہیں۔ خلافت کے دینی و دنیاوی ہونے کا نظریہ رسول اکرم کے منصب رسالت کی
 غلط تاویلات پر مبنی ہے۔ آنحضرت کی بعثت کا مقصد یہ نہ تھا کہ دنیا میں ایک نئی ریاست یا ایک نئی حکومت وجود میں آئے۔ رسول کریم کی حاکمیت
 دینی تھی نہ کہ دنیاوی ————— قیمت چاندو ہے

موسیقی : ————— موسیقی محض نفاذ روح کا سامان ہی نہیں ہمارا ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ بھی ہے۔

تالیف: کنور خالد محمود ————— عنایت الہی ملک ————— کلاسیک موسیقی سے متعلق لٹریچر کی کمی ایک عرصے سے محسوس ہو رہی تھی
 اس کتاب میں جہاں موسیقی کی تکنیک اور روایات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ وہیں یہ کتاب موسیقی کا فن جاننے اور سیکھنے والوں کی بجا طور پر
 رہنمائی بھی کرتی ہے۔ (دکھن آرابیگم) قیمت: پانچ روپے

چتر لیکھا، ————— ہندی کا شاہکار ناول

چتر لیکھا اس نام کی ایک بانڈری عورت کی داستان ہے جو گناہ کا مجسمہ بن کر ناول میں داخل ہوتی ہے لیکن ناول کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ
 اس کا کردار بدل جاتا ہے۔ وہ ایک سنیاسی کی رگری کی تلقین سے متاثر ہو کر سنیاس لے لیتی ہے اور اس کے آشرم میں پناہ لے لیتی ہے لیکن کارگری کی دلی کپی
 ہوئی منہ سے خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ یہی ناول کا نقطہ عروج ہے۔ عمدہ کہایت و طبعیت۔ جالب نظر کردار، قیمت ۴ روپے

نظم	پنجابی ادب	تاریخ و سوانح
۱۔ ویرم منزلیا: عبدالحمید ساک ۲۵-۳	۱۔ ڈوہنگیاں شاماں { ۲-۵۰	۱۔ اسلام اور اصول حکومت، علی عبداللہ نقی ۳۰-۱۰
۲۔ موی خوں، احمد راضی ۵	۲۔ دکھانیاں: (نواں)	۲۔ حکیم فلسفی، عبدالرزاق ملک (دیرپہ)
۳۔ ناول و ڈرامہ	۳۔ جھانپناں (مضمون): خرنیا کچھیا ۲۰-۲۵	۳۔ انسان کا عروج و رضیہ سجاد ظہیر ۲۰-۵۰
۴۔ سحر سے پہلے، رابعہ سید ۳۰-۵۰	۴۔ سادے پتر (نظماں)، موہن سنگھ ۲۰-۵۰	۴۔ ہمارے کھیل (مقبول مام کھیلوں کے قواعد پر اردو میں پہلی کتاب) ۳۰-۵۰
۵۔ لغزش، عبدالحمید بھٹی ۲۰-۵۰	۵۔ پنجابی ادب تے ساک { ۱-۵۰	۵۔ بیڈن پاؤں (دسکاؤٹ تحریک کے لاہنا کے حالات زندگی) ۲۰-۵۰
۶۔ چپان کی مٹی، خدیجہ خٹیم ۲۰-۵۰	۶۔ ساک مرحوم دیاں پنجابی تحریروں { ۳-۱۰	۶۔ صباہ اور سائنس ڈائیسی کارٹر ۲۰-۵۰
۷۔ چتر لیکھا، جگموتی چرن ویرما ۴-۱۰	۷۔ تریجن (نظماں)، احمد راجی ۲۰-۱۰	۷۔ شخصیتیں، عبدالقدیر بدیع (دیرپہ)
۸۔ شیشے کی دیوار، (محمد زولایہ) ۲۰-۲۵		

پیپلز پبلشنگ ہاؤس

الختار مارکیٹ ————— چوک انارکلی ————— لاہور

شماره ۳

ماہِ نو

جلد ۱۶

شمارہ خصوصی — مارچ ۱۹۶۲ء
مدیر۔ ظفر قریشی

نجوم پرین

۳۸	صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان	بدست صبا (اپنی قلم کے نام پر)	تلاشِ بہادران
۴۹	(اہلاس انجمن مصنفین پاکستان لاہور)	بہارِ تازہ	
		★	
۸	سید رضی ترمذی	"مرے شہر کو آج دیکھو" (نظم)	آہنگِ زیور
۱۰	عبداللہ خٹاور	سازِ شرفو (نظم)	
۱۱	رشید آفریں	"خوش روزگارے؟" (نظم)	
۱۷	اقترانصاری اکبر آبادی	تعمیرِ اشیاں (نظم)	
		★	
۱۲	شہابِ رفعت	"زخ ہوا کا" (عمومی جائزہ)	گرد و پیش
۱۸	کنیز اختر	فردوس جو فردوس نہیں (خصوصی جائزہ)	
		★	
۲۱	ڈاکٹر سید عبداللہ	غالب کی تصویر آفرینی	خیابانِ ادب
۲۲	ڈاکٹر ابوالکلیث صدیقی	سخنِ فہمی و سخنِ شتاسی	
۲۷	ڈاکٹر گیان چند	تمیر کی عشقیہ مثنویاں	
۴۴	ڈاکٹر شوکت سبزواری	علمی اصطلاحات کے ارد و ترجمے	
۳۱	سید قدرت نقوی	"میں نے لاہور جانا ہے؟" (ایک سانی تحقیق)	
		★	
۵۳	ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی	مسجد نبوی (تعمیرِ مساجد کی مقدس ابتدا)	دیرینہ و نو
۶۲	جناب اے کے ایم فضل القادر چودھری	"... ہازرہ تعمیرِ چہاں خیزندہ"	
۶۰	ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم)	نواب محسن الملک مرحوم	
۶۴	شہنشاہ فیض آباد	داستانِ قفس (بہادر شاہ ظفر)	

۷۱	انور	لج و ظلم، دھنڈے شلمہ، پھرتا ہے یہ دن، یہ راتیں (دہلوتیان)	
۷۵	ابوسعید قریشی	بیل (افسانہ)	
۸۵	یونس احسر	دکھی شاہ زادی (ہنگلا نوک کہانی)	
۸۸	اصغر پٹ	نا آسنا ٹہلمہ	
۷۸	حمید کاٹھیسری	خون کے پیاسے! (افسانہ)	
۱۰۱	الشہنشاہ راجپوت	”جہاں رنگینیاں آگتی ہیں“ (دہلوتیان)	
۱۱۳	شفیع عقیل	”سنہری بالوں والی شہزادی“ (بجانبی نوک کہانی)	
		★	
۱۲۴	وقار اشدری	جسیم الدین: (شخصیت اور شاعری)	دکارستان مشرق،
		★	
۱۲۸	محمد عدیل	ایوان زریں (آسیہ آرٹ سوسائٹی، نائنٹھ نقاشی)	پہاڑے رنگ (فن):
		★	
۵۰	رفیق خسار	”... کہ نہ دیکھا کرے کوئی!“ (طویل نظم)	اعتبار نغمہ:
۴۷	جستیل نقوی	”نوائے دوش“ (نظم)	
۶۸	عارف حجازی	شعلہ بھڑالہ (نظم)	
۱۲۳	خواجہ غلام فرید ہلالپور کا ترجمہ، حشمت افضل	”رم جہم یہ پھرا“ (کافی)	
		★	
۶۹	مشرید ایونی	—	نغمہ زار (غزلیں)،
۷۰	مشتاق مبارک	—	شاہد عشقی
		★	
۱۱۹	سلیم خان گتی	ایک تصویر، دو رخ (تبصرہ)	سخن ہلے گفتنی،
۱۳۵	ر۔ رخ	”راہ سخن واکرے کوئی“ (تبصرہ)	
		★	
۱۳۰	امیر حسن سیال	”کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟“ (سرمایہ کاری)	
		★	
۱۴۱	صہب اختر	اپنی ذیلیں میں (مصو فی، حادثات)۔ ذرا بیک بیک کے چل!	
		★	
	رنگین نقش: مریم خان	طاووس	سرورق:

سلاخ چندہ
پانچ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ
اکادمی مطبوعات پاکستان پبلسٹ بکس لاہور

قیمت فی کاپی
ایک روپیہ ۲۵ پیسہ

”مرے شہر کو آج دیکھو“

سینڈ جی ترمذی

خاک بر سر کھڑے تھے

دل آفکار لب بستہ، نوحہ کٹاں!

یہ مرا شہر، میرا وطن، یہ ہمیں

اس میں میں نے ان آنکھوں سے وہ دن بھی دیکھا

کہ پھولوں سے زخماں اپنے ہی مڑکھان کے کانٹوں سے زخمی ہوئے

میں نے اس دیکھتی آنکھ سے

جیسے شاخوں پہ اگتے ہوئے زخم دیکھے

تو میں چیخا کھڑا گیا — ”اے درندہ آسنو، یہ بہاریں نہیں“

میرے پہلو میں نغمہ سی اک آبجو دیکھتے دیکھتے جوئے خوں بہا گئی

اور میں کہتا رہا،

”چھوڑ دو جشیو، شہر ویران ہو جائیں گے، کھیتیں بائیں گے۔“

اس بھوے ہونٹ گیتوں سے محروم ہوتے ہوئے دیکھ کر

میں نے ہر اک کو آواز دی،

مرا شہر، میرا یہی شہر، جس میں

نہی سے مہکتے، دو خشاں شگوفوں سے حد نظر تک چراغاں ہے

اس شہر میں ایک دن روشنی کا نشان تک نہیں تھا

یہ ایوانی — یہ جگہ گاتے ہوئے سب دروہام

سنان تیار کیوں کا کھن اور کھریوں کھڑے تھے

کہ جیسے زمانوں کے اُجڑے ہوئے جگہوں کا ساں

جہاں بے رنگ، بے برگ، نیگے دھنوں کے سانسوں کی پُھول آواز ہوتی ہے

ساری فضا جیسے روتی ہے!

یہ سلانے — جو آجائوں میں پہلے ہوئے راستے ہیں، یہاں

جیسے جھوٹ کے کتنے مسکتے ہوئے خواب

شاموں کے منسلے ہوئے گیت

کھسکے پڑے تھے پونہی لائیکل

اور مرے دوست سب نغمہ خواں

”ہم گمراہی سے لہو مت پھوٹو، پشیم نہیں ہے“

یہاں شیطن کے گھساٹوپ اندھیروں میں

جب ایک اک مورقی رات بھر معدوں میں کلاہی

تو میں خوف سے کانپ اٹھا

میں نے سب کو جھنجھوڑا، کہ یکیل اچھا نہیں،

یہ مقدس اُجالے نہ غارت کرو، باز آؤ

— مگر یہ مرا شہر

میرا چمن، اس طح ٹٹ گیا

جیسے صدیوں کا کوئی پراانا خرابہ ہو جس میں

ہر اک صفت عفریت پرچم اُٹاتے، لہو پاشتے، ناچتے پھر رہے تھے،

اُسی شہر کو آج دیکھو!

مرے شہر کو آج دیکھو

جہاں زندگی کی نمی سے درخشاں، ہلکتے شکوفوں سے

حز نظر تک

ہر اک راستے، ہر روش میں چراغاں ہے

دیکھو، اٹھو دوستو

یاس کی سرو، تاریک عبرت سراؤں سے نکلو

جہاں زندگی اپنے اک آخری سانس کے کرب میں مبتلا ہے،

اذیت میں جکڑی ہوئی ہے،

اٹھو، اپنی بیچارگی کے سید، اڑگئے مقبروں سے نکل کر

اُبھرتے ہوئے آج کے آفتاب درخشاں کو دیکھو

یہ پُرشور، بیباک، آزاد دریا،

ہواؤں کے سرسبز، شاداب جھونکے

ہلکتے درختوں کے گاتے ہوئے سانس

— ان سے محبت کرو!

چاندنی میں نہاتی ہوئی کونپلیں

باغ کی داہنیں،

یہ ستاروں کی شبنم میں ٹھنڈے گلابوں کے پیالے

جھپکتی، چمکتی ہوئی، نرم، دوشیزہ شاہیں

— یہ سب محترم ہیں،

یہ پھیلے ہوئے کھیت، مٹی کی خوشبو بھلی دھوپ، سورج کا آئینہ اُجھا

پھلوں سے لدے، جھومتے، جھلگاتے جوان پٹیر

— سب زندگی ہیں!

اٹھو، دوستو،

ان کی عظمت سے

امید کا حسن لے کر،

گھروں کو سجالو —

صدر جمہور کے ساتھ

سیل جمہور ہے، ہنگامہ جمہور ہے آج

حفظ ناموس وطن، جذبہ بے تاب عروج

روز و شب اپنا یہ دستور ہے آج

سازنیہ نو

عبداللہ خاورد

واوئی دل میں چراغاں کر دو

شمعِ جمہور سر و زان کر دو

ذرہ خاک میں کرنوں کے چلن جاگ اٹھے

صبح آئی تو سبھی کوہ و دمن جاگ اٹھے

نکبتِ گل ہے پرستارِ صبا

اور صبا دید کا پیغام لئے۔

گنگنائی ہے درِ دل کے قریں۔

زندگی ہے کہ ابھی ہی چلی آتی ہے

کوہساروں پہ چلا پرتو مہتاب کی ہے

از افق تا بہ افق

دادیاں۔ بنتو بہار۔

قریب دُشہر و خرابات کہن جاگ اٹھے۔

صدر جمہور کے لب ہائے تبسم کا فسون

فاصلے رشتہ وحدت میں پروئے جس نے

خاک کے دل میں نئے عزم سموئے جس نے

ساحلِ سندھ سے تا ارضِ جبال

ہے بپا جتنِ طرب شب ہمہ شب، روز بروز

شرق کے زہرہ جیسے رقص کناں

غرب کے ہاتھ میں ہے سازنیہ نو۔

نغمہ گر، نغمہ سرا بادف و طنبورہ و چنگ

نغمہ نو کی گنگ دادیوں، کہساروں میں؛

کلی کلی میں آج تری رشتائی ہے

ساتی بن کر روج بہاراں آئی ہے

پھوٹی ہے چہروں پہ شفق کی رنگینی

تو سبز تریج ہے قوس میں یا انگڑائی ہے

امیدوں کے پھول کھلے دامنِ دہی

پھولوں کی ریت گیتوں میں اُڑائی ہے

ساحلِ دوست میں، صحرائیں، ستاروں کا ہجوم

مہ و انجم سرِ سیمائے وطن جاگ اٹھے۔

پاسِ بابائین وطن با ہمہ سطوت، جبروت

خیل و خیل چلے آتے ہیں۔

ان کے تیور سے پہاڑوں کی صلابت لرزاں

ان کی نظروں میں پھرتے ہوئے طوفانِ بہاں

خوشا روزگارے!

رشید آفرین

بجھ رہا تھا عزت و ناموسِ ملت کا چسراغ
جس طرح سب پھول ہوں فصلِ خزاں میں زندہ زرد
ہر طرف تھی تیرگی اور راہ ناہموار تھی
اس طرف نشوونما کے بند تھے سب راستے
مائل پروانہ تھے سب نت نئے انداز سے
قوم تھی دنیا میں جس کا پاسباں کوئی نہ تھا
آسمان پر خون تھا یا ایک رنگِ بے کسی
حالِ ملت دیکھ کر دل اہلِ دل کے ہل گئے
بر محبتِ قوم کا دل رو رہا تھا دہریہ میں
آخر اٹھا اک مجاہدِ باندھ کر سر پر کفن
کاٹ ڈالا اس نے جسمِ قوم کے ناشور کو
دن کو دن سجھانا اس نے شب کو شب جانا کبھی
نامِ ملت کر دیا دنیا کی نظروں میں بلند
اس پہ احساسات کے ہر سو دیئے جلنے لگے

نوعِ و سِ ملک کی تاباں جبیں تھی دلخ دلاخ
یوں ہوا سال تھا ہماری انجمن کا فرد فرد
کیا کہیں یہ قوم کن آفات سے دوچار تھی
اور دنیا کے بدلتے جا رہے تھے زاویے
تھے ہمیں محسوس لیکن قوتِ پرواز سے
راہبر کوئی نہ تھا اور کارواں کوئی نہ تھا
مرغِ بیل کی طرح دم توڑتی تھی زندگی
آرزوؤں کے شگوفے خاک میں یوں مل گئے
سب ہی پتے جا رہے تھے بے بسی کی لہریں
جس کے دل میں عظمتِ ملت کی تھی روشن کرن
زندگی بخشی نئی پھر ملتِ محبوبہ کو
اس سے جو بھی ہو سکا اس کام کی تکمیل کی
پھر نہ ملت کو ملے گا کوئی ایسا دمِ مند
راہرو اس روشنی میں شادماں چلنے لگے

کھل اٹھے جوشِ عمل سے ہر طرف گویا چمن

کر لیا زیبِ بدنِ ملت نے اُجلا پیرہن

جائزہ :

”نسخ ہوا کا“

شہلہ رفعت

سے مبارقار ہونے کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے اس امر کے لئے سعی ملیں کرنے میں کوئی کسر نہ کیا۔ وہ اصلاح و تطہیر سے کام لیتے ہوئے ایک نئے، تندہمت و دانشور و غما کی داغ بیل ڈالی۔ چنانچہ منجملہ دیگر امور کے نئے دستور کی وضع و تشکیل اور بنیادی جمہوریتوں کا تجربہ اس دور کے آئندہ تاریخ میں۔ ان کا مقصد واقعی تمام قوم پرستی کا ملک و قوم کی نئے سرے سے چمن بندی کی جائے اور جس دعا شاگ کو دور کر کے اس چمن میں نئی کوئلوں کو ابھرنے اور نئے رنگ و بار کو پیدا ہونے کا موقع دیا جائے۔

جیسا کہ لازم تھا، سربراہان قوم کی کوشش یہ تھی کہ انقلاب کی بدولت جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے برقرار رکھا جائے، ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ یہ راہ و مطلق انصاف نہیں بلکہ مناسب و متوازن آزادی ہے۔ ان کا ملکی نظریہ۔ چنانچہ نئے دستور میں اس کا لحاظ، اہتمام کیا گیا۔ انتخابات میں خود مرض عناصر کو کھل کھیلے کلموتیہ دینے کی بجائے عوام کے ان نمائندوں کے سامنے آنے کا بندوبست کیا گیا جو ان میں سے ہوتے ہوئے ان سے سب سے زیادہ قریب ہوں اور جنہیں وہ جانتے اور انہیں وہ جانتے ہوں یہ ایک ایسی جمہوریت کی نمود تھی جو قوم کے حالات و ضروریات کے لئے مفید ہو۔ اس دور میں اس کی حالت پر مشتمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شروع ہی سے ان امور پر توجہ دیتے ہیں جو اسلامی معاشرہ کے لئے ضروری ہیں۔ مدعا ملی زندگی کو بحال کرنا ہے اس طرح کہ اس کی تندہمت نشو و نما ممکن ہو۔ بڑے سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کے ملک دشمن عناصر کو کچھ میدان میں لا ڈالنا پھر انہی دشمنی عناصر کو برسر کار آنے کا موقع دینا ہوگا۔ جس سے فتنہ و آشوب کے دروازے چوڑے کھل گئے تھے۔ ایک تندہمت حزب مخالف ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ وہ ضروری ہے۔ چنانچہ وہ کہتا آہستہ ملک میں ابھر رہی ہے۔

موجودہ حکومت کیا ہے؟ نئی صورت حالات کے ابھرنے کی تجدید اس۔ اس لئے اس کی روش نرم ہے۔ اس میں کسی پہلو بھی سختی کی

یہ ظاہر ہے کہ دور انقلاب کے بعد ایک نیا دور شروع ہوا ہے جو کچھ تمام دوروں سے مختلف ہے۔ نہ صرف سیاسی بلکہ ہر اعتبار سے اس میں گویا ہماری حیات ملیہ اور اس کے تمام مظاہر از سر نو مرتب ہوئے ہیں۔ جو نامور و بھرپور تھے۔ اب وہ نئے سرے سے مل جل کر ایک اور ہی انداز میں مریض ہونے لگے ہیں جس کے معنی ہیں ایک نئی ترتیب، ایک نئی شیرازہ بندی۔

دور انقلاب سے پہلے جو کیفیت تھی وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس صورت سے زمانے کو چھوڑتے ہوئے جو قائد اعظم اور لیاقت علی خاں کا زیر قیادت گنڈا، باقی سارا زمانہ بڑی ہی افراتفری اور قومی بکرائی کا زمانہ تھا جس میں ایک نہیں ہزاروں خرابیاں جمع ہو گئی تھیں۔ اور یہ بنیادیں اُٹھنا ہوا ملک تھی نئی پیدا شدہ قوم، برسی طرح تخریبی عنصر کی کھینچا تانی کا شکار تھی۔ اس لئے ملک بھی اور قوم بھی دونوں تقریباً تباہی کے کالمہ آں لگے تھے ایسے حالات میں دوسری باتیں ممکن تھیں۔ عین وقت پر تندہمت طوفانی ہوائیں اس ملک کو چکنا چور کر دیتیں، یا کوئی مردے از غیب سامنے آکر اسے سنبھال لیتا۔ یہ ایک خدا ساز اتفاق تھا کہ انقلاب ۱۹۵۸ء نے صدر پاکستان فیصلہ مارشل محمد ایوب خان جیسے دانا، بینا اور دانا انسان اور یہی خواہ قوم و ملک کی زیر قیادت اسے عین وقت پر سنبھال لیا اور اسے ہنگامہ زار حیات میں برقرار رہنے کا ایک اور موقع ملا۔ مگر انقلاب، اور وہ بھی تعمیری انقلاب، جو ابتدا مارشل لا کے ہنگامی ضوابط کا سہارا لینے کے لئے قدرتاً مجبور تھا، ایک آزاد و جمہوریت پسند ملک میں دائمی طور پر اس وسیلہ سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ حقیقی ملکی انقلاب و فلاح زیادہ آزاد و جمہوری فضا میں ہی بروئے کار آسکتی ہے، جس کے لئے اس دور انقلاب میں تطہیر و تعمیر کے دو اہم وسیلوں سے کام لیا گیا تھا۔

بائیں انقلاب خصوصاً صدر پاکستان جیسے جہاں دیدہ اور بالغ نظر انسان کو اس حقیقت کا پورا پورا علم و احساس تھا۔ اس لئے انہوں نے دور انقلاب کو زیادہ سے زیادہ سنبھالنے اور قوم کے لئے نئے

استقلال سے قائم ہے۔ اسے حق اور صرف حق سے سروکار ہے۔ اس کا دوسروں کے ساتھ تعاون شرط ہے۔ اگر سٹیٹ اسٹیٹو فی الحقیقت اس کے قومی احساسات کے حامی و مددگار ہوں تو وہ ان کا حلیف رہے گا۔ ایسے ہی اس کے بدلے دوست واقعی دوست ہیں تو وہ ان کی دوستی پر قائم ہے۔ لیکن اگر وہ کسی اور کی اس طرح اطلاع و پشت پناہی کریں کہ وہ پکٹا کے مذاکے خلاف ہو تو ضروری نہیں کہ وہ اپنے عہد وفا ہی کا پاس کئے جائے۔

بلا سے گر مڑا یا رشتہ خوئے
رکھوں کچھ اپنی بھی مڑگان خوئے نڈاں کے لئے

پاکستان کی پالیسی لاتہدیل نہیں۔ اگر حالات اسے مجبور کریں تو وہ اپنا رویہ بدل بھی سکتا ہے۔ بنابرین اگر اس کے موجودہ لائحہ عمل میں اس تبدیلی تصور کا عکس نظر کئے تو کچھ عجب نہیں۔

ان تمام امور سے ایک بات بخوبی نمایاں ہے۔ ہمارے نفاذیاتی کا خلوص، بیداری اور چوکتا پن۔ وہ نہ کسی کے ہاتھ کیے ہوئے ہیں اور نہ حالات کے تقاضوں سے بے خبر۔ اس لئے وہ ہر قدم انتہائی احتیاط سے، پورے غور و غوض کے بعد، اٹھا رہے ہیں۔ اور اس ہم ذمہ داری اور ذوق و شوق ہی پر حقیقی ترقی کا دار و مدار ہوا کرتا ہے۔ ادب اور فن کبھی اپنے گرد پیش کے حالات کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی نہیں دیتے۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں بشرط یہ ہے کہ ان میں زندگی اور توانائی کی روح موجزن ہو۔ وہ حقیقی معنوں میں جاندار معلوم ہوں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ان میں یکدم قدامت و شخصیتیں پیدا ہوں اور کثیر تعداد میں بیکایک بڑے شاہکار پیدا ہوں۔ اتنا ہی کافی ہے کہ وقتاً فوقتاً اچھے خاصے فن کار اور اچھی اچھی پیشکش پیدا ہوتی رہیں۔ مصوری، سنگ تراشی، موسیقی وغیرہ میں ایسی عام و سبھی موجود ہے اور ان میں نئی نئی کوششیں بروئے کار آتی رہتی ہیں۔ زیادہ بنیادی بات اس دلچسپی کا موجود ہونا ہے۔ اور ان میں لگاتار تخلیق۔ تاکہ سلسلہ کہیں ختم نہ جائے۔ اس وقت ہمارے یہاں مشرق و مغرب کے اختلاف کا دور ہے۔ اس لئے ہر میدان میں نئے نئے طریقے، پیرائے اور طریق رواج پار رہی ہیں۔ اور دعائے بہت ہی طے جلتے ہیں۔ بعض اوقات نکل بے جوڑ کی موم کی کہیں کوئی سلسلہ بہت ہی پیچھے رہ گیا ہے۔ پھر بھی وہ بدستور موجود ہے۔ کوئی سلسلہ درمیان کہیں پہنچا ہے۔ اور کوئی بہت ہی دور، بہت آگے، نکل گیا ہے۔ جیسے زندگی میں ہے۔

نہیں۔ چنانچہ فوجی نظم و ضبط کی جگہ شہری نظم و ضبط کا دور دورہ ہونا چاہیے۔ وہ خدمات جن کی سماعت پہلے فوجی عدالتیں کرتی تھیں۔ اب سول عدالتوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ پولیس کی آزادی اس کے دیکھ بڑھتے ہوئے مکنت چینی کے روحان سے ظاہر ہے، چنانچہ حکومت کی کارروائیوں پر بصورت مندانہ جرح ہوتی ہے اس پر خود بھی کیا جاتا ہے۔ تاکہ عوامی میلان سے ہم آہنگی برقرار رکھی جاسکے جو اس دور کا خصوصی طبع نظر ہے۔ انتہائی کہ ایٹم زدہ سیاست دانوں کے معاملہ پر بھی نظر کی جاسکتی ہے۔ ان تمام امور سے حالات ٹہری حد تک معمول پر آچکے ہیں اور وزیر درخشاں زیادہ معتدل ہوتی جا رہے ہیں۔

تاحال اپنے مختصر دوران میں حکومت نے رفاد عامہ اور رد برائی حالات کے لئے سرتوڑ کوشش کی ہے۔ اور بعض اہم اقدامات بھی کیے ہیں۔ ایک اہم اقدام مشرقی پاکستان میں ترقیات عامہ کے لئے مشرقی پی۔ آئی۔ ڈی سی کا قیام ہے جس سے جلد ہی اہم تنہائی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کے متعلق ایک برطانوی ادیب مسٹر جینز محل نے اپنے مضمون مطبوعہ دی سٹیشن میں بڑا اہم انکشاف کیلئے۔ اس نے لکھا ہے کہ صدر ایب نے مشرقی پاکستان کے طویل المیعاد سرمایہ کاری کے میزانہ کو دوگنا کر دیا ہے اور ایسی آئیں جاری کی ہیں جو اس کے مواصلاتی نظام کو بہت بہتر بنادیں گی۔ اور صرف مشرقی پاکستان ہی نہیں۔ مغربی پاکستان کے تمام حصوں میں بھی رفتار ترقی کا یہی عالم ہے۔ قومی نو، وقار و عروج و ترقی کی واضح علامت کے طور پر اسلام آباد میں نئے دارالحکومت اور ڈھاکہ میں ایک نئے ذیلی دارالحکومت کی تعمیر جیزی سے جاری ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ دونوں پلہ دی آب و تاب سے منظر عام پر آجائیں گے۔

ایک اہم اقدام نفاذ کیش کی سفارشات پر عملدرآمد ہے۔ چنانچہ ادنیٰ اور تان گزیشہ عہد کے لئے تجویز ہوں اور اسکیلوں کا احاطہ ہو چکا ہے۔ اور گزیشہ اسٹاف کے بارے میں احلان ہونے ہی والا ہے۔ چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ جس سے امن و دینی کی خواہش نمایاں ہے اور دیگر تازہ ترین اقدامات ان کے علاوہ ہیں۔ قوم اور حکومت دونوں کی حمت، بیداری اور عمل کی کوئی کشمیر ہے جس کے حق خود اختیار کئے اہل پاکستان نے معین عہد بھی کر رکھا ہے۔ اور وعدہ بھی۔ یہ بھی امن عالم کے قیام ہی کی ایک صورت ہے اور پاکستان اس پر پورے

ویسے ہی فوجی ادب اور صحافت میں بھی ہے۔ کہیں تمام تر وضع پابند کہیں تمام تر آزاد۔ فکر میں بھی اور طرز روش میں بھی۔

اس موضوع کی بے ساختہ بہت وسیع ہے۔ اس لئے ہم فی الحال صرف مذکورہ بعض بالخصوص پر معنی تازہ کاریوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ اول تنقید و ادبی خیالات کے دھڑے سے پرے ہٹنے میں کوشاں ہے۔ جہاں اکثر آوازیں اب بھی روایت، روایت، پکارتی ہیں وہاں بعض اس سے روگرداں ہو کر دوسری انتہا — انج — کو اپناتی ہیں۔ کہیں ادبی، کہیں نجی، کہیں غیب، کہیں برعل بنجیدہ تنقید اب شعرو ادب کے بعض جدید مظاہر کو جدید تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ ”ادبی دنیا“ کے ایک مضمون نگار نے بیحد تجزیہ کے بعد فیض کو رجعت پسند قرار دینے کی ہمت کی ہے۔ اور اس کی رائے میں بہت وزن ہے۔ ایسے ہی حاتی، راشد میراجی وغیرہ کے بارے میں بھی بعض چوٹ کا دینے والی باتیں کہی گئی ہیں۔ ایسی آزاد اور نظر نے ایک واضح رجحان کی علامت ہیں۔ اب فن برائے جہات، فن برائے افادیت و مقصدیت جیسے نظریات کو بلا حیل و حجت تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔ بلکہ اس سے مدلل وجوہ کی بنا پر شدید اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی میں ادب و فن کا نئی نگاہوں سے جائزہ اور ان میں پیغام حقائق اور شد و ہدایت کی بجائے دوسری اہم قدروں کی تلاش جنہیں معنوی قدروں کی بجائے فنی قدروں کہنا بجا ہو گا۔ اس لئے ادب و فن کا ایک نیا تصور بنایا جاتا ہے جس کے باعث سابقہ آزاد اور فیصلوں پر نظر ثانی لازم آتی ہے۔ اور کئی صورتوں میں ان کا استرداد و تجدید بھی لازم قرار پاتی ہے۔

شاعری میں بھی ایک نیا انداز مشاہدہ و پیشکش کافی حد تک نمایاں ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا غزل پر بھی شدید غلبہ نظر آتا ہے۔ اس قدر کہ اس کی روایتی وضع، لب و لہجہ، مضامین بڑی حد تک دب چکے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار لیجئے جنہیں کسی طرح بھی غزل کے ذیل میں لانا ممکن نہیں۔ ان میں صرف نظم ہی کے تیور چھلکتے ہیں۔ اور غزلوں پر غزلیں ایسی ہیں جو نظم سے قریب تر ہیں:

ہو میں نہ کسی پھولوں کی داس و دآئی
مرے خیال میں یہ کس کی آنکھ بھر آئی
وہ دیکھو باغ میں کھنار کے درختوں پر

لگا کے کیسری ہندی شفق اتر آئی
وہ کون آیا ہے؟ اس چھت پر دیکھنا آج
کنارہ بام سے قوس قزح ابھرا آئی
نظم میں الفاظ، آہنگ، تمثیلات، تکنیک سے لے کر تصور تک ایک نئی جست نظر آتی ہے۔

سر دہلی اور اس میں عسریاں بدن
شپرک سالیوں کی بے انکاس رو
ننگ خوردہ نیم خوابیدہ بسیں
شہر کے گوشے میں روشن تار دیک
ایک شیدی ڈھول کی آواز ہے

موتی چو رملیگر ہا سی
اپسرا میں شب تار دیک میں چھاپا پھر ہے

ہر بارہ اسی طرح سے ... شافیں
کھلتی ہوئی گونپیں اٹھائے

رستوں کے سلاخوں سے لگ کر

ہر صبح ہی ہنستی دوری

ہر صبح ہی کھنڈ اور آندو

ایسی ہی بے شمار مثالیں اور بھی ہیں جنہیں کسی طرح بھلا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور یہ سب کچھ باطل حالی کی بات ہے۔ اقبال میراجی، فیض سے بہت بعد کی۔ ان سے بھی زیادہ شاعری میں نئی وضع کی ایمائیت و علامتیت ہے۔ اس سے مراد محض کوئی منفوی نکتہ نہیں بلکہ قسم قسم کی تاریکیاں ہیں۔ جن پر ہر اکھراؤ دوسرے مضمون نگار ماہ نو کے بعض کچھ شماروں میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ علامتیت کو ہمارے یہاں بالکل بدیہی معنوں میں سمجھا گیا ہے۔ یعنی لا۔ قسم کی مسافات۔ چنانچہ مستقل مضامین — ”اقبال اور اس کے رموز و علامت“ — اور ”شاعری کے علامت میں ساقی۔ مینا وے۔ شاہین۔ کلیم وغیرہ معین دلال کی معین اصطلاحات

ہے۔ کیونکہ اظہار سیدھی لکیر کی طرح آگے نہیں بڑھتا۔ اور بہت سے علاقائی کو خود اپنے تخیل سے پر کرنے پڑتے ہیں۔ واقعات سارے کے سارے آپ ہی آپ بیان نہیں کر دئے گئے۔ اور سلسلہ بدیہی نہیں ہے اور نہ ایک بات سے دوسری بات مکمل منطقی ہے بلکہ بات تلامذات سے آگے بڑھتی ہے۔ شدید دھچکے کے ساتھ جس کا بادی النظر میں جواز نظر نہیں آتا۔ لیکن ہوتے ہوئے سب کچھ بلو جاتا، احساس کے بہاؤ میں ایک چیز دوسری کے ساتھ گھٹی جلی جاتی ہے۔ سب سے پہلے۔ ”لو پھر ہم تم دونوں آئیں چلیں“ میں تم عام مخاطب نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ شخص جسے راوی اپنے دل کی بات بنانا چاہتا ہے۔ یہ جھپٹے کا وقت ہے۔ نہ دن نہ رات۔ اور یہ سماں ساری نظم پر چھایا ہوا، اس کی روح رفا ہے۔ اور اس سے کتنی ہی گہرائیوں کے سونے پھوٹے آتے ہیں۔ لاشعور کا دھندلکا۔ دھما دھما دبا دبا لہجہ جھکتا۔ جھکتا انکشاف خارج باطن، ظاہر یہاں کا ملاپ۔ LIKE A PATIENT ETHERIZED ON A TABLE کے ساتھ یہ دونوں وقت طے کی دنیا۔ زندگی اور موت کے درمیان کی سرحد ایک سنگم بن جاتی ہے۔ ساتھ ہی ایک بیمار دنیا اور آپریشن کے کمرے کی فضا بھی پیدا ہوتی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ راوی کو اپنا آپریشن کرنے کو ہے۔ یا کم از کم اپنا طبی امتحان کر رہا ہے۔ بیمار وہ خود بھی ہے اور اس کی دنیا بھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ بیمار کی علامت بعینہ وہ ذاتی قسم کی علامت ہے جس کے علامت جگہ حامل ہیں۔ ادھر یہ کوئی معر نہیں۔ بلکہ تغیل میں وہ پھیلاؤ، وہ گھبراہٹ پیدا کرتا ہے جو عام ذرائع سے ممکن نہیں۔

یہی خصوصیات ہیں جو ایسی شاعری کو مرکب بناتی ہیں اس شاعر نے بعض نظموں کی راہ سے اردو میں صرف راہ ہی نہیں پائی بلکہ کچھ نئے طریقے بھی رسائی پیدا کی ہے۔ چونکہ نظمیں مرکب ہیں اس لئے ان میں سے ہر ایک میں ہندسی بند ہیں جنہیں وکرنے پر داستان خاصی دما ز ہو جاتی ہے۔ اس لئے صرف ایک نظم... کہ نہ دیکھا کرے کوئی؟ پرچہ حال ہی میں حلقہ ارباب ذوق، کلچر میں شری گئی تھی، سرسری نظر ڈالی جاتی ہے عنوان ہی میں مرکب وضع، نظم کے فانیہ کا اچھوتے پرانے میں انکشاف۔ نظم دراصل ایک افسانہ ہے۔ ایک فن کار کی نگاہ کوئی جلوہ مشاہدہ کرتی ہے۔ اور وہ اسے اپنے فن کی گرفت میں لانا چاہتا

ہیں۔ حقیقی علامت جگہ کی اس سے بہت مختلف ہے۔ اس کی علامات نہ اتنی کھلی ہوتی ہیں نہ عام۔ اس لئے وہ زیادہ اچھوتی، تخلیقی، طبع اور نادر ہوتی ہیں۔ فرانسیسی علامت جگہ کی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالرشید نے اس کو ایک طرح کی ٹنگی قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ معنی کو قاری سے چھپا دیتی ہے۔ اعلیٰ درجے کی علامت جگہ کی بھی حجاب نہیں ہوتی۔ وہ ایک لطیف حجاب ہوتی ہے جیسے لطیف ابہام۔ حجاب ہوتے ہوئے بدیع قسم کا انکشاف۔ الفاظ کی طرح ان علامات کا انتخاب بھی ذاتی ہوتا ہے لیکن ایسا ذاتی نہیں کہ معنی فی البطن شاعر کو رہ جائے اگر کوئی شاعر اظہار کی مناسبت اس قسم کی علامات میں پالے کہ

سایہ زربک گئی ہے بے پری
کھینچتی ہے ایک تازہ زاویہ
اک خط سا کفن سے روح جاہری

یا

وقت کے ذرے ہوں میں گڑ گئے
عقرب ساعت کی نوک تیز سے
نیل سے دیوارِ دل میں پڑ گئے

تو اس کے ذاتی انتخاب الفاظ و علامات میں کیا برائی ہے؟ یہ تو اس کے مافی الضمیر کو زیادہ موثر و برجستہ طور سے ادا کرنے کی تدبیر ہے۔ ایسی علامتیں زیادہ گہرائیوں اور زیادہ رسائیوں کی خبر دیتی ہے۔ اسی لئے اس کا درجہ علامتیت سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ جو جوں شاعری زیادہ گہری اور مرکب ہوتی جاتی ہے۔ اتنا ہی زیادہ اسے اس قسم کی علامتیت پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو ساتھ ہی ساتھ بلین اشارہ و کنایہ کی حامل بھی ہوتی ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کی علامتی منظومات ہمارے ذہن طیف میں جس طرح کثرت

زیر مطالعہ رہی ہیں۔ اس سے یہ توقع تھی کہ علامت جگہ کی کا یہ اعلیٰ تصور بہت جلد متعارف ہو جائے گا لیکن اتفاق سے ایسا نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے ایلیٹ کی THE LOVE SONG OF J. ALFRED PRUFROCK پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میں بات نہ سیدھے سمجھاؤ گئی گئی؟ اور نہ بے سمجھاؤ۔ محض ایک نامہ بنادے۔ محض بہر حال حکم کھلا چین بھٹ ادا کر دھاڑے بہتر ہے کیونکہ اس میں حکمت تو ہے۔ ایلیٹ کی یہ نظم نور داغ نور دی نہیں جست برجست بھی

مخلوں میں۔ مسلمانوں کے یہاں بھی خود رو لہان جلانے کا کسے علم نہیں۔ اور لہان نہ صرف خود مرئی مائل اداس نئے آگ کے مشابہ ہے بلکہ اسے جلایا بھی جاتا ہے۔ جس سے شعلے ہی نہیں، پیچ و پھینک خورے بھی اٹتے ہیں اور خوشہ کے بھیکے کبھی چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ شاعر نے انہی شعلوں اور خوروں سے اپنے شاہدہ کردہ جلوہ کے عکس کھینچا ہے۔ اداس کی پاکیزگی و سچ پن کا احساس پیدا کیا۔ بلکہ اس کا جا دو کھچا یا یہ تینوں تمثیلیں مل کر آنے والے نقشے کے لئے تیار کر دیتی ہیں۔ جیسے کسی مقدس ایوانِ جمال و جلال کی لوح پر کندہ طلسمی نقوش ہیں۔ اور بلند شانِ تجلیات کے مبشر۔ گھونگر گھونگر کھلیاں، اک نکلا آتشیں رخ سر کھلا کی بڑی ہی کائیاں عکاسی ہے۔ گویا اس میں بھی یہ صفائی برقی تھی کہ اس کی جذبات جلوہ کی عکاسی بھی کہا جاسکتا ہے۔

ساری نظم میں مسئلہ تعمیر کی کڑیاں اس ہی طرح مضمر ہیں۔ اور یہی ان کی خوبی ہے۔ اگر ان سب باتوں کو کھول کر بیان کیا جائے تو نظم سے سوجھا جگہ درکار ہوگی۔ اس ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرکب شاعری کھیرا یہ عام بایا نیہ پیرا ہے، جو ہمارے یہاں اب تک رائج ہے، کس قدر بھرپور، جامع اور سہ حاصل ہے۔ اس مختصر جائزہ میں صرف دو ہی اور نکات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ پیکر جلوہ ہی کا شخص شاعر نے سلفالات جولا سے کیا ہے۔ یہ مرکب ملاقاتی شاعری کا مخصوص بلیغ پیرا ہے۔ سلفا کا اشارہ مشہور پنجابی لوک گیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ،
ان نہا کے چھڑ دچوں نکلی
سلنے دی لاٹ ودگی

احمد ندیم قاسمی نے اس کی یوں تشریح کی ہے: "اگر آپ سلنے کی لاٹ کو خور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا سرا چوٹا اور سیاہی مالا ہوتا ہے۔ درمیانہ حصہ قدرے چوڑا اور بے حد روشن اور نرمی سے تھکتا ہے۔ اگر یہ پھر چھوٹا ہو جاتا ہے تو لیکن زیادہ اہم بات شعلے کا لالہ سمیٹا ہوا ہے جو سرخ تھکتا ہے جس کے ساتھ شدید مٹا بہت رکھتا ہے۔ اور پھر وہ تھکتا ہوا جسم جو چھپ چھپ میں نہلنے دھونے سے دو آتش بن چکا ہو۔ پنجابی گیت کی تمثیل کا جواب نہیں۔ مگر اردو شاعر کی استاد کی بھی قابلِ داد ہے کہ وہ اسے صاف اچک کر لے گیا ہے اور اس نے تمییزاً بلکہ کٹاوت سے کلام میں سمود یا ہے۔ اور وہ اس سے بھی لوک قدم ہنگے بڑھتا ہے: اطلالِ الحرا۔ الحرا تمام رنگ سرخ کی لاجب تعمیر ہے۔ گونگوں و غنائوں کا مرقع مرقع بلکہ مجرور۔ شاعر نے اپنے جلوہ مقصود کو اطلالِ الحرا کہہ کر ایک دم

ہے۔ وہ اس کو ہوبہو پیش کرنے کے لئے بہترین ساز و سامان تلاش کرتا ہے۔ گوناگوں رنگ، روغن، کفراس، موقلم۔ اور وہ بیروں ریاض کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ۸۰ سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ آخر وہ تمثال تیار ہو جاتا ہے۔ عین اس لمحہ کھرازی میں وہ انہی لمحوں سے جنہوں نے شاہکار بنایا تھا، اپنی بصارت چھین لیتا ہے۔ تاکہ وہ حقیقت منتظر لباس مجاز میں آنے کے باوجود حقیقت منتظر ہی رہے۔ اور وہ ذہن میں اس کے تمثال کا منت نیا تصور کر لیا اور اسے نت نئے پیراؤں میں جلوہ گر کرنے کی حکمتیں سوچتا ہی رہے۔ اس طرح عنوان کی بات بڑی خوش اسلوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔ اس فن کار کے لئے حقیقتی معنوں میں دیکھنا یہی ہے کہ وہ نہ دیکھے اور اس کا فن برابر نہو پذیر رہے۔ کیا آپ اسے فنی رشک کہیں گے جو فن کی حدیں ختم ہونا بند نہیں کرتا یا مسلسل نشو و نما کے فن کی تمتا یا عین عشق جو محبوب کو شرمندہ عکاسی یا مطلق کو شرمندہ تعین دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔

شاعر نے قصداً اس کو آگ سے تمثیل دی ہے جو روانی و مجاز دونوں اعتبار سے بجا ہے۔ پہلے بند میں اسی آتشیں ہیولی یا پیکر کو نمایا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ یہ بات قاری کے شعور پر چھوڑ دی گئی ہے کہ اس آتشیں تمثیل کی کار کا مدعا کیا ہے۔ اس مظہر کا کتنا بڑا انکشاف جو فن کار کے ذوق و سوق کا محرک ہوا ہے برق شعلہ آتش کے استعاروں کا ہجوم اشارتاً اس محرک کا تصور پیدا کرتا ہے۔ شدتِ جمال، شدتِ احساس، شدتِ اظہار اور شدتِ ارتقاع کے لئے آگ ہی کا عنصر بہہ وجوہ مناسب ہے۔ بہہ نور، بہہ نار، گداز، مرئی، رفعت کو ش۔ تمثیلات مجازی حقیقی دونوں کے حسبِ حال ہیں۔ یہ اردو میں اپنی قسم کی پہلی بیسٹ تمثیل ہے۔ نظم کا آفانہی بلیغ علامت نگاری سے ہوتا ہے، اشیری، گہرا۔ لوبانی۔

پہلا لفظ فلک اشیر کی رعایت سے ہے۔ یعنی آگ اپنے لطیف ترین، ارفع و اعلیٰ، آسانی روپ میں۔ گہرا پھر ایک معروف خانہ زاد رنگ ہے، آگ سے مشابہ۔ مزید یہ کہ آگ کے جل کر لوگ فلسفہ کے اس تصور کی وضاحت ہے کہ جوں جوں ریاضت بڑھتی جاتی ہے۔ ریشہ کی تپسی کے بہرے سیدھے ہو کر کنول کا روپ دھارتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب ایک کنول ہا بن جاتے ہیں۔ یعنی انسان و حیوانی طور پر اشراق ہی اشراق بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت ریاض فن کی بھی ہے۔ اس لحاظ سے شاعر محلی ناز حسن ہے۔ تیسری تمثیل لوبانی۔ ہندو کے ہوں یا پھر مقدس

تعمیرِ آشیان

اختر انصاری اکبر آبادی

دہلیکستانی اہل قلم کو صوبہ پاکستان کے
حالیہ ارشادات کی روشنی میں

روشن کرو اس عالمِ امکان کو کھل کے
دنیا پر ہنس چھائے ہوئے پُر ہول دھندلے
انسان کی خرابی پر یہ حالِ دل صد چاک
رہ جاتا ہے آنکھوں میں لہو دل کا ابل کے
پھر اس کے جذلوں کو حیاتِ ابدی دو
جلتی ہوئی دنیا کہیں رہ جائے زجل کے
ہاں راہ میں ہے سنگ گراں وحشتِ تخریب
اس دور کو پیغامِ محبت دو سنبھل کے
مشرق کے افق پر جو ابھرائیں گی کرنیں
رہ جائیں گے مغرب کے اندھیرے بھی کچل کے

سرایہٗ اخلاص تقاضا ہے وطن کا
روشن کرو ہر راہ کو جوں شمعِ گچھل کے
لے ہم سخاوت اب ہے نئے دور کا آغاز
آزادی انکارِ خیالات سے چھلکے

ہو شعر اگر حاملِ احساسِ غم و درد
رکھ دو گے نئی زلیست کی اقتدارِ بدل کے
اب ضبطیں تبدیل ہوتی جنسِ ہوس کی
ہیں آج کے ایوب سکندر تھے جو کل کے

کتنی ہی باتیں اکٹھی کر دی ہیں۔ انسانی حسن، آسانی حسن، مشرق، مغرب،
زندگی، فن۔ اطلس سے سرخ و دہری اور اطلس کی بڑائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔
وہ مقام جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ فن کدراچی ہاتھوں سے اپنی انگوٹھی
کو بے نور کر دیتا ہے جن سے اس نے اس نورِ ملای نورِ شمال کو جلوہ گر کیا تھا۔
بالخصوص ہنرمندان ہے۔ اور اپنے اچانک انکشاف میں بے حد ڈرامائی۔
ہاتھوں کے برابر — نور ہی نور! اب آنکھوں میں

اور دور ہی دور — اب دور ہی دور۔ اب آنکھوں سے!
ساری نظم میں قریب قریب ہر مصرعے میں ایسی ہی نو ایجاد مناعیلا
نہایاں ہیں۔ ان سے یہی قیہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر ہماری شاعری اس راہ پر چلے گئی ہے
قوی امکان ہے کہ وہ بڑھ جائے، تو اس کا دھارا یکسر بدل جائے گا۔ اور جدید تر
و جدید ترین کا فرق نمایاں طور پر دکھائی دے گا۔ اور دو شاعری سے قطع نظر
اس نظم کی تکنیک ایسی ہے کہ اس سے عالمی شاعری میں بھی ایک نیا قدم اٹھتا
ہے۔ ابجرامیں ایلٹ کا حوالہ آپ کو یاد ہو گا۔ دی بوسانگ آف جے الفریڈ
پروفرک اور ویٹ لینڈ دونوں میں راوی کا سلسلہ بیان اور لہجہ اہل
واقعہ ہے۔ اس کی آواز زندہ سی ہوتی ہے اور وہ صاف اپنے من کی بات بتاتا
ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس نظم میں یہ دونوں باتیں نہیں۔ اگر شاعری بھیا
کہ ایلٹ نے کہا ہے سبذبات کا بے تحاشا انڈیل دینا نہیں بلکہ ان سے
دارستگی ہے۔ تو یہ نظم اس کی پوری طرح مصداق ہے۔ اس میں معروفی مترادف
فی الحقیقت معروفی ہے۔ راوی کی رقت یا جذباتیت کہیں بھی چھلک چھلک
نہیں پھٹتی۔ بلکہ فن کی پوری قدرت کے ساتھ بروئے کار آتی ہے۔ دوسرے
حکایت یا روایت کہیں بھی فاش نہیں ہوتی۔ راوی کا احساس اور نظم کا
مضمون دونوں پردہ پنہاں رہتا ہے مگر ایسے کہ

پہننے دھوپ ہمیں لباس
جتنا دور آتا ہی پاس

راوی کا مدعا قاری خود اشارات و کنایات سے اخذ کرتا ہے۔ راوی
خود اپنے بیانی سے اس کی غمازی نہیں کرتا۔

چونکہ یہ تجربہ اردو شاعری میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے،
اس لئے اس کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے
شاعروں کا شعور اور اس کے ساتھ خود زندگی بھی ایک نئے موڑ پر ہے۔
اگر ہم یہ موڑ مٹ گئے تو ہماری جولان گاہیں بہت مختلف ہوں گی۔ ہمارے
لئے نئے میدان، نئے نئے افق ابھر رہے ہیں چلے جائیں گے:

”فردوس جو فردوس نہیں!“

گنہگار

اور خود کو آزادی و حریت کے جلاں نثار سپوت اور محافظ ثابت کیے ہیں۔ کیا ہم اس داستان کو قتلِ کبیر، ہلاکتِ یسوع، ایک تمثیل ہے۔ بے حد زندہ، جاندار، پر معنی، لطیف۔ عجب نہیں کہ ان کی کیا دینے والے حادثے نے جو اس قوم نجیب پر بعد نازل ہونے والے تھے، پہلے ہی اپنا سایہ ڈال دیا ہو۔ اور ان کے دل و دماغ میں اس تمثیلی داستان کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہوں۔ یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ ایک تلخ و جاگمگلاں حقیقت۔

اہل کشمیر کے لئے یہ کوئی طلسمی داستان نہیں اور نہ محض قطعہ۔ یہ تولدِ خونیں کفن کی وادی جو کبھی سودِ دجرا اور گل و یاسمن کی پھیلائی وادی تھی، کی خوشچال آپ بیتی ہے۔ تاثر میں جگرخوں کن حوادث کی اشک آفریں سرگزشت۔ ایسے حوادث جو حریت کش اور آزادی دشمن قوتوں کے ہاتھوں سالہا سال وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ اور آج بھی اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں ہاتھ اس وادی بہاریں کے لئے جلاں لیوا ثابت ہو رہا ہے۔ فوش لب، مست ناز، نازست، ڈونگی اور نچی فصیلوں والے دیونا دھنوں اور طلسم اندر طلسم دلوں میں اسی طرح کیا یہ سب جیتی جاگتی ہستیاں نہیں؟ کیا ان کا اسیرِ دام ہونا ایک پاد ہو اخیالی قطعہ ہے؟ جب دنیا کے کسی بھی خطے میں آزادی، روشن ضمیری اور رواداری کے حسین تخیلات محکومی، جہالت اور بربریت کے آہنی پہلوں میں گرفتار ہو کر دم توڑ رہے ہوں تو کیا ہم اس کو قصص و حکایات کے نام سے یاد کریں گے؟ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ ہماری ذہنی نارسائی اور فقدانِ بعیرت کی دلیل ہوگا۔ یہ تو ایک انہی وادی داستان ہے۔ اور اس کے مظاہر جس قدر قدیم ہیں اتنے ہی جدید بھی ہیں۔ دُنویں بہت قریب۔ ایسے کہ اگر ہم اپنے ہاتھ آگے بڑھائیں تو وہ اپنی شعلیں تندو تیز سے جل کر خاک ہو جائیں۔ جبر و حریت کی کشمکش، نوحیوں کی

ہراسانہ کی تہ میں کوئی ذکوئی حقیقت ضرور پنہاں ہوتی ہے۔ اگر کوئی داستان صحیح معنوں میں اس کی مصداق ہے تو وہ کشمیر کی عوامی داستانِ ظلم ہے۔ اس کا ہیرو تمام طلسمی داستانوں کے ہیروؤں کی طرح جن بھوتوں کے رولر تیجوتی سے تود دھار ہوتا ہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی صنفِ نازک یعنی پریوں کے مکر و فریب سے بھی دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس بلاکشی میں اُس کا دوست وزیر زادہ بھی حسبِ معمول شریک ہوتا ہے۔ غیبی تم شاعر — قدرتی جفا کار — ”دریائے اہم“ اور ”کوہِ ستم“ بھی ہیں — اور ان دونوں کو ایسی ایسی مصیبتوں اور دشواریوں میں مبتلا کرتے ہیں کہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا ارادہ ترک کر کے اپنی دنیا کو بے نیل مرام واپس آجاتا۔ مگر ان دونوں کی ہمت و استقلال قابلِ داد ہے کہ وہ طوفانِ حوادث سے منہ نہیں موڑتے اور آخر کار گو ہر مقصود حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

یہ عوامی داستان کشمیر کی وادیِ دلالت میں بے حد مقبول ہے۔ بہار و خزاں ہو یا گرا و سرما، کشمیر کے لوگ — مزدور، تاجر، مزدور، عورتیں بچے — بھی اس مظلوم داستان کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ غالباً اس لئے کہ ان میں ہمت بلند اور اعلیٰ کردار کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔ اہ اس کے افراد انسانیت کی گراں بہا قدروں کے امین اور پاسبان ہیں۔ وہ آسمانوں کی طاغوتی آمریت اور پریوں کی شیطانی خدشہ و ترغیب کی ہوا نہیں کرتے۔ دریائے اہم کی بے خروش، تلاطم آفریں موجیں ان کو اپنے غم و ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتیں اور کوہِ ستم کی کزحمت، خوشحال چٹانیں ان کے پائے شوق کو متحرک ہونے سے نہیں روک سکتیں۔ وہ انتہائی دالہاد پن سے ”جلاجل جانبِ نعل چلاجل“ کا دلدارانِ تحریک کاتے ہوئے برابر آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں

- ۳: فصل پک کر تیار ہو گئی۔ ہمارا جہ کے کارنر سے ڈوگرہ سپاہی آئے اور سفینوں کے زور پر سارا اناج اٹھا کر لے گئے۔
- ۴: ہوا اور پانی کے سوا ہر چیز پر ٹیکس، یہاں تک کہ قبر کی کھدائی پر بھی ٹیکس، گورکنوں پر!
- ۵: رشیم، زعفران، قباکو، کاغذ، نمک اور اناج کی خرید و فروخت۔ ریاستی حکومت کا اجارہ۔
- ۶: دکاندار، نانیاں، کنجڑے، قصاب، طماع اور مزدور سب کی آدمی پورمید کمائی سرکاری خزانہ میں جمع!
- ۷: عیدین پر بکرے، دنبے، حلال کرنے پر فی بجک یا فی دنبہ ٹیکس۔
- ۸: بیٹریں بکریاں پالنے پر ٹیکس۔
- ۹: اگر کوئی ہندو مسلمان ہو جائے تو اپنی جائیداد منقولہ وغیرہ منقولہ سے محروم۔
- ۱۰: گلے حلال کرنے پر سزائے موت۔
- ۱۱: ہمارا جہ یا اس کے کارندے مسلمانوں سے بیگار لیتے رہتے تھے۔
- ۱۲: مسلمان سارے علاقے میں،، فی ہمد مگر ملازمتوں میں ان کا تناسب اس کے برعکس شیخ محمد عبداللہ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک معمولی اسٹنٹ کی اسامی پر بھی متعین نہ کئے جاسکے، محض اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ہر چند کہ یہ اسامی خالی پڑی رہی!
- ۱۳: ڈوگرہ فوج میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد ۱۵ فیصد اور باقی سب غیر مسلم۔ اس تناسب کو برقرار رکھنے کے لئے غیر ریاستی ڈوگروں، گورکھوں اور سکھوں کو بھرتی کیا جاتا تھا اور ریاست کے مسلمان پنجاب میں آکر انگریزی فوج میں بھرتی ہوتے۔
- ۱۴: ڈوگرہ عہد میں ۲۸ وزیر اعظم ہوئے ان میں سے ایک بھی مسلمان نہ تھا۔
- ۱۵: جب ۱۸۷۷ء میں مجدد ہمارا جہ رنیر سنگھ قحط پڑا تو قحط زدہ آبادی کو غلہ پہنچانے کے بجائے ریاست کے مسلمانوں کو کشتیوں میں لاد کر جمیل وکر میں خرق کر دیا گیا! اس ظلم کی شکایت اُس وقت کے برطانوی وائسرائے سے دہلی میں بھی کی گئی تھی۔

کی شکست، براہ جاری ہے کسی محرابیں کسی دادی میں، کسی کو ہستان میں اور کسی شاعر کے الفاظ میں بہار سدا آزادی کے نشین رہے ہوں، لیکن قدرت کی ستم نظریں سے شاید کسی کو ہستان میں یہ کیفیت نہ رہے اور وہ جلاوختریت میں آزادی پسندوں کا قافلہ سالار بن جائے۔ بیرون صدی کا دیوا ستبد اور جہوری قبا میں پائے کو ب — مگر تاجکے؟

دادی سرور چار جب تقدیر کے، ایک انوکھے کھیل، ایک عہد بند سے ان لوگوں کے ہاتھ آئی، جنہیں باذوق اہل ایرلن، سچ ہانکے نام سے یاد کرتے ہیں، تو وہ تاریخی طرفہ تماشا بروئے کار آیا جسے ”سیکھا شہی“ کہتے ہیں۔ جب سکھوں نے انگریزوں کے ہاتھ شکست فاش کھائی تو یہ افسوسناک حادثہ رونما ہوا کہ انہوں نے ریاست جوں و کشمیر کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔۔۔ اور کس قدر اڑلاں! برصغیر پاک و ہند میں انگریز تاجرین کو آئے تھے اوروہ جب تک یہاں رہے ان کی تاجرانہ ذہنیت سیاست میں بھی برقرار رہی جب شکست خوردہ سکھوں نے وادی کشمیر اور ملحقہ علاقہ جات انگریزوں کے حوالے کر دیئے تو انگریزوں نے اپنے خالی خزانے بھرنے اور اپنے ایک فادار ساتھی، راجہ گلاب سنگھ عرف گلابو کو خوش کرنے کے لئے مذکورہ علاقہ جات اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ انگریز تاجروں نے قوم نجیب و چرب بست و تردیع کو ڈوگرہ گلابو کے حوالے کرتے وقت اس امر کی طرف زہ بھر توجہ نہ دی کہ وہ اپنی اس حرکت سے انسانیت اور جہوریت دونوں پر ظلم کر رہے ہیں۔

ڈوگرہ جانشینان گلابو نے کشمیر اور کشمیر سے ملحقہ علاقہ جات یو سال حکومت کی۔ اور اس دوران میں جو جرم گل کھلائے چرب و دست و ترغ قوم نجیب پر جو جو نوازش ہائے بے پایاں ہوئیں ان کے کیا کھنڈاے کاش! اب یاتب ان میں کوئی یاترن پیدا ہوتا جس نے پوٹان سلسلے میں آتش فوانی کا ثبوت دیا تھا۔ ”دیائے الم“ کے چند شوبہ ”کہ کوہ الم“ کی چند احضار شکنی سنگینیاں ملخصہ ہوں۔

ریاست کی تمام مزدور و صغیر و کبیرہ کا مالک ہمارا جہ کیانوں پر کاشتکاروں کے حقوق ملکیت کا عدم۔ مسلمانوں کی حالت کھیت مزدوروں سے بھی بدتر!

سیاسی اطاعت اور انتظامی حمایت کے لئے ہندو باغیروں، مسلمان مزارعوں سے فرائض کا سلوک۔

۱۶ ریاست کے بہت سے حکموں، پولیس، مال، وغیرہ کے کارندوں کو ریاستی خزانہ سے تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ انہیں اجازت تھی کہ وہ ریاست کے مسلمانوں سے جس قدر چاہیں رشوت لے لیں، وہی ان کی "تنخواہ" تھی۔ رشوت کے کئی طریقے رائج تھے جن کو "رسوم" کہا جاتا تھا۔ کیا یہ ایسی حکومت ہے جس کے ہتھکڑی کے لئے ہنگامہ آرائی کی جائے یا اسے کسی بھی قول و قرار کے لائق سمجھا جائے؟ جب معمار خشت اقل ہی کج رکے تو دیوار تریا تک پہنچنا تو کجا، چند ماہ بھی بلند نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جسے ہر حال پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ اس کے بعد جو ہنگامے ہوں ان کی نوعیت اظہار میں شمس ہے۔

یہاں ان تلخ و افسوس ناک حالات و واقعات کا اعادہ لازم ہے جو اس افتاد کے بعد رونما ہوئے۔ حلی کا معلق تمام تر کسی قدم کے جائز حقوق اس کی آزا دی، اس کے حق خود اختیاری انسانوں کے ساتھ پنج شیلہ کے اصولوں سے مطابق سلوک، بین الاقوامی روابط، باخبروں پاک و ہند کے خوش گوار تعلقات اور امن عالم سے ہے۔ کشمیر کے بارے میں کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ وہ ایشیا کا فلیٹ بارڈ ہے۔ خداسی جنگجاری سے دنیا بھر کا امن بھک سے اڑ جائے گا۔ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اور یہ بہت چھوٹے پیالے پر ہوا تھا۔ اگر خدا نخواستہ یہ لوگ پھر پھر اٹھیں، اور قوی اندیشہ ہے کہ یہ بڑے ہی زور شور سے بھوک اٹھیں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ دوسروں کو بھرکانے اور لڑا بھڑا کر اپنا مقصد پورا کرنے والی فتنہ کیش طاقتیں پہلے بھی موجود تھیں اور اب بھی موجود ہیں۔ تباہی و بربادی کا اولین تختہ مشق یہ دور افتادہ طاقتیں نہیں بلکہ ہم ہوں گے۔

جہاں تک اس دیرینہ قضیہ پر بحث و مباحثہ اور ان کی چھان بین کا تعلق ہے یہ سب کارروائیاں ہو چکی ہیں اور یہ وقت نہیں کہ ان کے موافق و مخالف پہلوؤں پر بحث کی جائے اور کیا جائے کہ کوئی سچا ہے اور کون جھوٹا۔ یہ کھیل صد بار س تک کھیلا جاسکتا ہے اور اس کا نتیجہ ناخوش گوار روابط اور مسلسل ہتھیار بندی کے سوا اور کچھ نہیں جس سے برصغیر کا کوئی حصہ بھی خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتا۔

حالات تھوڑی سی دیر میں کیا صورت اختیار کر سکتے ہیں اس کی ایک تھوڑی سی جھلک اسی حال میں دکھائی دے بھی چکی ہے۔ اور اس سے وہ احساس پیدا ہونا چاہئے جو نازک حالات سے پیدا ہونا لازم ہے۔ چین اور ہندوستان کے مابین شمالی سرحدات کے بارے میں مدت سے اختلاف ہے جو وہ کہہ کر خاش کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ ابھی چند ہی دن کی بات ہے کہ اس نے یکایک ہمارے ہمسایہ ہندوستان کے لئے جس کی دوستی کے ہم ہمیشہ تہہ دل سے خواہاں رہے ہیں، بے حد نازک صورت حال اختیار کر لی۔

اس نے پہلی بار یہ محسوس کیا سارے حریف چیدرا آباد (دکن) جو ناکرہ یا گوا نہیں ہیں کہ ان کے لئے "پولیس ایکشن" کافی ہو۔ ظاہر ہے کہ چھوٹی چھوٹی اندرونی جہات کی وہ کیفیت نہیں جو برٹنی جہات کی ہے۔ اس لئے اب ہندوستان کو مجبوراً اپنی غیر جانبداری کا لبادہ دور کر کے بیرونی امداد کے لئے دست سوال دراز کرنا ہی پڑا ہے اور اپنی عسکری کمزوری کا احساس کرتے ہوئے ساری قوت دفاع پر صرف کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ جو کل ہوا ہے وہ آج بھی پھٹتا ہے۔ چین کے ساتھ سرحد کا تنازعہ بدستور موجود ہے اور کسی وقت بھی پُر آشوب شکل اختیار کر سکتا ہے۔ آخر یہ ایک مسئلہ نہیں تو اور کیا ہے کہ پاکستان نے ہمیشہ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مصالحانہ فیصلہ پر زور دیا ہے۔ اس کے لئے سر توڑ کوشش کی ہے۔ اس نے ہمیشہ مصالحت کا ہاتھ آگے بڑھایا ہے اور اب بھی اس کے لئے تیار ہے۔ شک ہے کہ ہماری نیکدل اور ذی فہم حکومت نے بھی موجودہ تجربہ کے باعث مصالحانہ فیصلہ کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور باہمی صلاح و مشورہ کی دعوت کو رد نہیں کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند کانفرنسیں منعقد بھی ہو چکی ہیں۔ ان کے نتیجوں فی الحال کوئی اہم صورت تو رونما نہیں ہوئی ہے۔ لیکن کم از کم ہندوستان کا رویہ دنیا کے سامنے ضرور آچکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ باہمی مفاہمت و گفت و شنید کی فضا خیر سگالی کی بنیاد ثابت ہو۔ امید رکھنا چاہئے کہ شعوس اور دو قلعہ تنازع جلد رونما ہوں گے۔ اہل چیز دل کا بدلنا ہے۔ بہتر پالیسی یہی ہے کہ اس باب میں بالکل ناامید نہ ہوں۔ اور دل کی بے تبدیلی کے لئے کوشش کریں۔

جہاں تک ناگزیر نے آخری اجتماع میں کچھ چھینٹے پھینکے ہیں۔

غالب کی تصویر آفرینی

ڈاکٹر متین جہاں اللہ

ہے۔ اور اس سے شاعر کے ذہن و نفس کا مطالعہ ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے آئینے میں شاعر کا اصلی چہرہ نظر آ جاتا ہے۔ شاعر، اپنی شاعری کے پردے میں اپنی ذات کو چھپا نا بھی چاہتا ہو تب بھی انھوں نے ذات کی کوئی کوشش کا مکیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی تصویریں ہر بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ شاعر کو اس کی لفظی تصویروں میں تلاش کرو کیونکہ اس کی دریافت کا بڑا ذریعہ اس کی تصویریں ہیں۔ آئیے۔ اس آئینے میں غالب کی مثال پر نظر ڈالیں۔

غالب ایک کامیاب مصوّر جذبات ہیں، اور انہوں نے معاملہ بند کا بھی ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے۔ معاملہ بند سے مراد معاملاتِ محبت کی گفتگو ہے، معاملات میں محبوب سے میل جول، اس کے بات چیت، گلہ شکوہ، اس کے حسن اور اس کے اندازِ ادا کا براہِ راست بیان ہی نہیں خود محبوب سے، اس کی اداؤں کا ذکر اور تذکرہ۔ یہ سب چیزیں شامل ہیں۔ معاملہ میں محض داخلی تاثر نہیں خارجی وصف الحال اہمیت رکھتا ہے۔ غالب کے یہاں معاملہ بندی کی ایک خاص صورت موجود ہے جس کی گفتگو کا یہ موقع نہیں۔ مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ غالب کے ذہن کا رخ محسوس سے تجرد کی طرف ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب کے ذہن کا فکری رجحان اس کے باقی اوصاف پر غالب ہے۔ غالب، ادا کی زندگی کے ذوق سے بے ہوش ہے۔ کیونکہ وہ نہیں، اپنے فن اور فکر میں وہ مادے سے تجربہ کی خفیتوں کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں۔ ان کی دیدہ وری اور ہنر وری ان کو مادیات سے حقائق اور تصورات کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ مفکر شاعر نہیں اور مفکر اس معنی میں کہ خالص فکر ان کی منزل مقصود ہے۔ وہ اپنے شاعرانہ عمل میں جب بھی رفعت طلب ہوتے ہیں، زمینی ماحول سے اگر کفر فضا ہے علوی یا فضا ہے تجریدی کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔

تصویر آفرینی۔۔۔ یہ میں نے "ایمگری" (IMAGERY) کا ترجمہ کیا ہے! ایمگری سے مراد وہ تصویر آفرینی ہے جو محسوس اشیاء کو لفظوں کی مدد سے چشم خیال کے سامنے یوں لے آتی ہے گویا بڑی ہمین مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تصویر آفرینی کسی خارجی تحریک سے یا بلا لاد نہیں ہوتی بلکہ اظہار کے دوران، مزید توضیح یا تزیین کی خاطر تخیل کے اندر کسی تصور بے یا ارادے کے بغیر ابھرتی ہے۔ (اسی کو انگریزی میں WITHOUT EXTERNAL STIMULUS کہتے ہیں) اور یہی چیز اس کو ڈسکرپشن (DESCRIPTION) یا وصف الحال سے جدا کرتی ہے۔

کہا گیا ہے کہ شاعری کے قماش میں مصوری اور موسیقی کو آنے والے کی حیثیت حاصل ہے۔ شاعری میں اگر تصویریت یعنی زائد توضیحی تصویریں نہ ہوں تو شاعری بے رنگ ہو جائے۔ شاعر دراصل تصویر سازی ہی ہوتا ہے۔ موسیقی کا نمبر مصوری کے بعد آتا ہے۔ کیونکہ موسیقی یا غنائی و بدون الفاظ بھی ممکن ہے اور ادھر محض آواز ہی کسی کو شاعر نہیں بنا سکتی۔

شاعرانہ تصویریں اپنے ظہور کے لئے کسی تشبیہ یا استعارے یا صفت کی محتاج ہوتی ہیں۔ اور انہی کے پیچ در پیچ عمل سے شاعری کی سطح کو اس طرح رنگین کرتی رہتی ہیں کہ یہ تصاویر بذاتِ خود ایک وسیع رقع بن جاتی ہیں، یعنی شاعر کے افکار اور مضامین کی پہلی صف کے عتبہ میں، احساسات و جذبات کی محض انوار اور مستقل قطاریں، استوار ہوتی رہتی ہیں، اور شاعری کا یہ وہ مواد ہوتا ہے جو شاعر کے افکار کے پس و پیش و بار بار اپنا کام دیتا ہے، یہ شاعر کے (شعوری طور پر ظاہر کئے ہوئے) رجحانات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہوتا ہے، اس کی امداد سے شاعر کے ذوق اور میلان کے توہمات کا صحیح سمجھنا ہو سکتا

میں نے غالب کی اس ذہنی سمت کا پتہ چلانے کے لئے ان کی لفظی تصویروں پر برسرِ ہی نظر ڈالی ہے۔ یوں تو غالب کی تصویریں وضعیہ مواد (DESCRIPTIVE) بھی مل جاتیں ہیں اور اس کے ثبوت میں بہت سے اشعار بھی پیش کئے جاسکتے ہیں، مگر میں نے اس غرض کے لئے جو کلمات تیار کئے ہیں۔ ان میں مجھے غالب، ذہنی کیفیت، تصویری اور تجربی آدمی معلوم ہوئے ہیں۔

اس کے ثبوت میں بغرض اختصار میں غالب کی ایک غزل پیش کرتا ہوں۔

مکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد ویدہ ہوں

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں جو تصویر ہے بظاہر VISUAL اُبھر معلوم ہوتی ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ دشت اور آہوا اور صیاد کے باوجود اصل تصویر اس کیفیت کی مقصود ہے جو صیاد ویدہ آہو کی ہونی چاہئے۔ یہ کیفیت مرنی نہیں، اس کا صرف تصور کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا شعر ہے۔

ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالہ کشیدہ گہ اشکب چشیدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
یعنی کلام غمزہ نے ناشنیدہ ہوں

لے ناشنیدہ میں مہجوم اور معدوم کے درمیانی فاصلے تقریباً مٹ گئے ہیں۔

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
اس شعر میں مجسم اور محسوس کی مدد سے مہجوم اور معدوم کا تصور دلایا ہے۔

میں چشمِ داگشاہ و گلشنِ نظر فریب
لیکن عبت کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

اس شعر میں بھی ذہن کا رخ محسوس سے مہجوم و معدوم کی جانب ہے۔

ان مثالوں سے یہ سمجھ لیا جائے کہ غالب کی مصوری میں VISUAL اور محسوس اشیا موجود ہی نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ غالب کا ذہن، ان محسوسات کی تصویر کو مقصود نہیں سمجھتا۔ وہ ان کے اشارے سے ایک ایسی فضا پیدا کرتا ہے یا ایسے معانی کی رہنمائی کرتا ہے جو فکری ہیں مگر

تصور یا اور اک سے سمجھا جاسکتا ہے، جو اس سے محسوس نہیں کیا جاسکتا۔

میں اس نکتے کی مزید تشریح کے لئے میر تقی میر کے کلام سے چند مثالیں پیش کر کے یہ واضح کر سکوں گا کہ میر کا ذہنی رخ محسوسات (محاسن) میں آنے والی چیزوں کی طرف ہے۔ وہ معاملات اور کیفیات دونوں کی توضیح کے لئے جب امجری لاتے ہیں تو ان کی IMAGES بالکل

محسوس اور قطعی جسم و جان رکھنے والی ہوتی ہیں۔

خوبی رُو چشم سے آنکھیں اٹک گئیں

پلکوں کی صف کو دیکھ کے بھڑکیں مر گئیں

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں عجیب قسم کی مرکب تصویر ہے جو سراپا محسوس ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ بھڑکیں خوف کے موقع پر گھبرا کر سب کی سب کسی ایک سمت سرک کر خوف کو ٹالنے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔ تصویر میں کیفیت بھی ہے اور مشاہدہ بھی واضح ہے۔

ترجھی نگاہیں پلکیں پھریں اس کی پھر پھریں
سوفجیں جو دودستہ کھڑی تھیں ٹھٹک گئیں

چلتے سمند ناز کی شوخی کو اس کی دیکھ
گھوڑوں کی بالیں دستِ سپہ سے اچک گئیں

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس گھر کی طرف

اب فائدہ سراغ سے بلبل کے باغیاں
اطرافِ باغ ہوں گے پڑے مشتِ پرکھیں

سُدھ لے گھر کی بھی شعلہ آواز
دُود کچھ آشیاں سے اٹھتا ہے

اس کے کوہے سے جڑاٹھ ابل و فاجاتے ہیں
تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

اس شعر میں طوفان ایک مرئی (VISUAL) چیز ہے جس سے تصور کو مدد ملی ہے مگر مبالغہ سے کام لے کر تصویر کو محترم کرنے کی بجائے خیالی کر دیا گیا ہے۔

بعض اوقات تصویر کے دونوں رخ محسوس ہیں لیکن تصویر پھوکی تصویر ہے، حقیقی نہیں ہے۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد شوق

آئینہ باندا ز گل آغوشش کشا ہے

ظاہر ہے کہ آئینہ لاکھا آغوش کشائی کرے پھوکی وہ آغوش سے محروم

قمری کعبہ خاکستر و بیل قفس رنگ

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

قمری کو کعبہ خاکستر کہنا ٹھیک مگر بیل کو قفس رنگ کہہ کر تصویریت کو بہم اور محسوس حقیقتوں سے دور لے جایا گیا ہے۔

غالب کی میجر کی بحث بے حد نجس ہے۔ مگر اس مختصر مضمون میں اس کے تفصیلی مطالعہ کی گنجائش نہیں۔

غالب کی چند ذہنی کیفیات بہر طور واضح ہیں،

اول: تقلیل الفاظ کی سعی یعنی تصویروں کو سمیٹ کر پیش کرنا۔

ان کا ذہن میر سے مختلف ہے جو جزئیات کے پھیلا دینے میں لطف خاص

حاصل کرتا ہے۔ غالب وصف الحال میں بھی پھیلاؤ سے بچتے ہیں مثلاً

بجلی اک کو زند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ قمری بھی تھا

بجلی اک کو زند گئی — بجلی کے مانند آنکھوں کے آگے آگے وہ جوت

سے غائب ہو گئے! یہاں غالب نے ساری بات کو زند گئی کہہ کر داکر دیا

ہے — اور ”سمیٹنے“ کی یہ خواہش غالب کے ذہن کی ایک

عام حالت ہے۔

غالب کی دوسری ذہنی کیفیت ”غیر معمولی“ کی جستجو اور آواز ہے

اسی لئے وہ معمولی تشبیہات سے دامن بچا کر چلتے ہیں۔ اس کو شش میں

وہ عام فہم حقیقتوں سے دور چلے جاتے ہیں۔ اور MYTH کی تخلیق

میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

غالب کے ذہن کی تیسری کیفیت، ان کا یہ احساس ہے کہ

ان سب اشعار میں حالات یا کیفیات کو روشن کرنے کے لئے تصویر یا وار در ہوئی ہیں، وہ قطعی، ٹھوس اور ہماری مشاہداتی جس یا تصور کے لئے حد درجہ تسلی بخش ہیں۔ — میر کا ذہن عموماً تجزوات اور مہومات سے ٹھوس محسوسات کی طرف سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ — میر کا ذہنی مشاہدہ اور زمینی شوق ان کو زمین سے متعلق رکھتا ہے۔ ان کے برعکس غالب اپنے زمینی شوق کے باوجود سرحد دراک کے پرے کی دنیا کی طرف بڑھتے ہیں۔ — ان کی زمینی رخ والی تصویریں بھی ذہن کو تجرید کی رفعت اور مہویت کی طرف لے جاتی ہیں۔

غالب عہد مغلیہ کی فارسی شاعری سے (جیسا کہ معلوم ہے)

بے حد اثر پذیر تھے۔ اکبری، جہانگیری دور کے شعرا (ماسواغیظی کے)

واضح تصویر آفرینی سے کم دلچسپی رکھتے تھے۔ — وہ تصویر سے زیادہ

تأثر کی شدت میں اعتقاد رکھتے تھے۔ — اسی لئے محسوس تصویریں

ان کو بے مزہ معلوم ہوتی تھیں۔ — عربی کی جوشیلی اور مشتعل طبیعت حقیقت

سے مطمئن نہ تھی، اسی لئے وہ اپنی دنیا سے بیزار ہو کر بے جا چیزوں کے

تیلے بنا بنا کر (PERSONIFY کر کر کے) لایہ مدہ بھونکتے رہتے

تھے۔ — فیضی اپنے رنگ خاص میں محسوسات سے گریزاں تھے

مگر ان سب تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔ غالب بھی اس دور کی پوجانی

شاعری سے متاثر ہوئے جو دور مغلیہ کے آخر تک عزت کی نظر سے

دیکھی جاتی رہی، ایک آدھ مثال دیکھئے۔ اس دور میں واضح تصویر سازی

کے بجائے بہم ذرائع سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ غالب کے یہاں بھی یہی

ہے۔ مثلاً قہار کے ذریعے مبالغہ کرنا شاعروں کی عام عادت تھی مثلاً

دورے ہے پھر ہر ایک گل ولالہ پر خیال

صد گمستان بچا ہ کا سماں کئے ہوئے

پھر تپش حرارت دل کو چلا ہے عشق

سماں صد ہزار نمک وال کئے ہوئے

تصویریت کا یہ انداز مبالغہ بعض ایسی اشیاء کی مدد سے

نورنیا یا گیا ہے جو شدت، افراط اور وسعت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مثلاً

لفظ طوفان

اے عندلیب یک کعبہ جس پہر اشیاء

طوفانی آمد آمد فصل بہار ہے

سخن فہمی اور سخن شناسی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

اور شاعروں سے بھی کچھ الگ نہیں ہوتا اگر یہ فرق موجود ہے تو ہم ہمیں الفاظ اور الفاظ میں تفریق کرنا پڑے گی۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جنہیں زبان کے بنیادی الفاظ کہنا چاہیے۔ ان کے بغیر معمولی بات کرنا، سادہ اور آسان خیالات کو بیان کرنا ناممکن ہے۔ یہ حلقہ بھی بولنے والے کی ضرورت اور ماحول کے مطابق ہوتا ہے۔ دیہات کے رہنے والوں کی نسبتاً سادہ اور آسان زندگی میں نسبتاً کم الفاظ سے کام چل جاتا ہے شہروں کی مہذب، متہذبن اور نسبتاً وسیع تر زندگی میں اس دائرہ کو بہت کچھ پھیلا نا پڑتا ہے۔ پھر شہروں میں بھی شخص کے لئے یہ حلقہ کیسا وسعت کا محتاج نہیں ہوتا۔ طبقاتی تفریق، تعلیم، پیشہ اور کاروبار کی نسبت سے یہ وسیع تر اور محدود تر ہو سکتا ہے۔ زبان میں یہ وسعت اکتساب اور کوشش سے حاصل ہوتی ہے، پھر اس میں اجتماعی اور انفرادی حلقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ فرد جماعت سے سیکھتا ہے لیکن وہ جماعت کو سکھاتا بھی ہے۔ وہ صرف زبان کا ورثہ ہی نہیں پاتا، اس ورثہ میں اپنا حصہ شامل کر کے آئندہ نسلوں کے لئے ایک زیادہ ترقی یافتہ ایک وسیع تر اور مکمل تر زبان چھوڑ جاتا ہے۔ الفاظ کی پیدائش کی حقیقت، ان کی اصل و نسل کا سروغ لگانا، ان کے تلفظ اور معنی کی تبدیلیوں کا مطالعہ کرنا ماہرین لسانیات کا کام ہے لیکن ادب کا طالب علم اور نقاد بھی اس سے بیگانہ نہیں رہ سکتے۔ ادب کی تاریخ اور الفاظ سے بنتی ہے اور الفاظ کے معنی یا ان کی معنویت کی تفہیم جو تنقید سے پہلے ضروری اور لازمی ہے اتنی آسان بات نہیں جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔ الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ جاندار اجسام کی طرح ان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ وہ بڑھتے ہیں، پھلتے پھوٹتے ہیں ان میں معنی کے رنگ رنگ پھول کھلتے ہیں اور پھر ان میں سے بعض مرجح ہیں بعض مرکز زندہ ہوتے ہیں بعض کمزور ہوتے ہیں بعض جانپ

تنقید کلام کی بنیاد تفہیم کلام پر ہے چاہے یہ تفہیم سرسری اور سطحی ہو یا گہرے مطالعہ اور غور و خوض کا نتیجہ ہو دونوں صورتوں میں اسے تنقید کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے ایک حد تک بلکہ بعض کے نزدیک بڑی حد تک تنقید کا سطحی ہونا یا اس کا قبیح و باوقار ہونا اس پر منحصر ہے کہ نقاد کلام کے معنی کی پوری طرح سمجھ گیا یا نہیں۔ شاعر یا شاعر نگار، ناول نویس یا داستان گو یا خود نقاد جو کچھ کہنا چاہتا ہے، جن خیالات کا اظہار اسے مقصود ہوتا ہے، جن جذبات احساسات اور کیفیات کو وہ ظاہر کرنا یا دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے یا جس مقصد یا نصب العین یا مشق کی وہ تبلیغ کرنا چاہتا ہے جو پیغام وہ دینا چاہتا ہے اسے ہر صورت میں اپنی ترجمانی کے لئے ایک ذریعہ یا وسیلہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ ذریعہ الفاظ ہیں۔ فنون لطیفہ کی تفریق اور تقسیم ایک حد تک اسی ذریعے کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ مصور رنگ اور خطوط کا سہارا لیتا ہے، زخا صحریات و سکناات کا محتاج ہوتا ہے، بیت تراش پتھر اور چھپائی کی مدد سے صنم تراشتا ہے لیکن مقصد سب کا ایک ہوتا ہے اپنی ذات کا اظہار، اپنی کیفیات اور اپنے احساسات کا انعکاس، اپنے جذبات کی ترجمانی، اپنے پیغام کا ابلاغ، موضوع، خیال، مضامین، جذبہ، کیفیت، احساس یا حالت اگر روح ہے تو اس روح کو جسم الفاظ سے ملتا ہے۔ الفاظ محض خیال کا لباس یا پرہیز نہیں ہر ایک پیکر میں اور جس طرح روٹ اور پیکر کے تعلق کا نام زندگی ہے اسی طرح خیال اور لفظ کا رشتہ کلام کی اصل بنیاد ہے۔

الفاظ ہم روزمرہ ہر وقت اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ہم الفاظ کے معنی جانتے ہیں لیکن کتنے الفاظ کے معنی؟ کیا ہم میں سے ہر شخص کا ذخیرہ الفاظ برابر ہے؟ کیا ایک ان پڑھ انسان کا ذخیرہ الفاظ ایک عالم دماغی، ایک شاعر اورادیب کے ذخیرہ کے برابر ہے ہوتا ہے؟ کیا سائنسدانوں کا ذخیرہ الفاظ عام لوگوں بلکہ ادیبوں

وہ اس کے لغوی معنی ہیں۔ عام طور پر ایک لفظ کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں اور اسی طرح ایک معنی یا تصور کے انبہار کے لئے ایک ہی لفظ موزوں، مناسب اور صحیح ہو سکتا ہے لیکن اکثر الفاظ میں ایک سے زیادہ معنی بھی ہوتے ہیں اور ایک ہی معنی کے لئے کئی لفظ بھی ہوتے ہیں۔ اگر ایک لفظ کے کئی معنی ہوں تو دراصل معنی خاص کا تعین محل وقوع اور سیاق و سباق سے ہی ہو سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص "سونہ" کہے تو معلوم نہیں "سونہ" سے مراد نیند آنا، یا سونہ سے مراد وہ قیمتی اور چمکدار دھات ہے جو خدا نہیں لیکن خدا نہ ہوتے ہوئے بھی ستارہ عیوب اور قاضی الحاجات ہے۔ اچھے، شے تو سیاق و سباق کے بغیر نہیں کہہ سکتے کہ یہ وہی لگاٹے ہے جس کا ذکر مولوی اسماعیل مرغی نے کیا ہے:

رب کا شکر عطا کر بھائی

جس نے ہمارا بھائی بنا دیا

یا یہ کسی معنی کو حکم یا اجازت ہے کہ وہ گانا شروع کرے۔

بہر حال لفظ مفرد معنی رکھتا ہو یا متعدد پہلی صورت لغوی معنی کی ہے۔ یہ عام فہم، مراد، فہم، کثیر الفہم، متفق، البس، واضح، غیر مشکوک اور مستقل معنی ہوتے ہیں۔ ان کو سن کر سوسیں خائفہ صورتوں میں مطلب واضح ہو جاتا ہے اور شک و شبہ یا اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ عام گفتگو میں روزمرہ بولے جانے والے الفاظ اکثر و بیشتر یہی صورت رکھتے ہیں یعنی اپنے عام لغوی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہی الفاظ زبان کا سرمایہ ہیں اور ان پر عبور حاصل ہوئے بغیر کلام کی تفہیم ممکن نہیں۔ اہل زبان یہ سرتا و رشتہ میں ہاتھ ملیں۔ آنکھ کھولتے ہیں تو ماں باپ بہن بھائی، عزیز رشتہ داران کا تحفہ اسے پیش کرتے ہیں۔ بچہ ان کو نہیں سمجھتا، آہستہ آہستہ وہ ان الفاظ (آوازوں) اور ان کے معانی میں رشتہ قائم کر لیتا ہے اگرچہ خود ایک عرصہ تک وہ ان کو ادھنیں کر سکتا۔ وہ ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نقل کرتا ہے اپنی تلی زبان سے ان کی نامکمل اور ناقص نقل سے وہی مطالب ادا کرتا ہے۔ زبان صاف ہوتی ہے تو نقل آہستہ آہستہ اصل کے مطابق ہوتی جاتی ہے۔ جیسے سنتا ہے ویسے ہی بولتا ہے۔ یہی اس کے لئے تلفظ کی سند ہے۔ جیسے زندگی میں آگے بڑھتا ہے گھر کی چار دیواری آغوشِ داد بہن بھائیوں کے حلقے سے نکل کر بہولیوں، سہیلیوں اور دوستوں

اور توانا۔ قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک الفاظ اور ان کے معنی کی ان تبدیلیوں سے واقفیت نہ ہو۔ اس ناواقفیت کی بناء پر کبھی کبھی لسانی عصبیت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو ادب کے مطالعہ اس کی تفہیم اور تنقید کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اردو کے قدیم نفاذ یعنی تذکرہ گو ذہنی اردو کے محاورہ سے واقف نہ ہونے کے باعث ذہنی ادب کو "ایک پوراٹ" کہہ کر گزر دیا۔ کی کوشش کرتے ہیں۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ رنجیت گوئی کا آغاز دکن سے ہوا لیکن وہاں کا کوئی شاعر نہیں مربوط نظر نہیں آتا۔ معلوم نہیں مربوط سے میر کی مراد کیا تھی۔ اگر قلی قطب شاہ کا کلام مربوط نہیں، وجہ کی مشنوی، نثر کی کھنکھن، عشق، ولس کے قصائد، بن ناشلی کی پھول بن، خوب محمد چاقی کی خوب ترنگ، زخمی کا خاور نامہ، خانہ کا قصہ، رضوان شاہ و روضہ افزاء یہ اوریشا اردو ذہنی منظومات مربوط نہیں تو پھر شمالی ہند کے شعرا کا کلام کیوں کر مربوط کہلا سکتا ہے۔

بہر حال اس باب میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کہ تنقید کلام میں پہلا مرحلہ تفہیم کلام ہے جسے معنی یابی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس تفہیم یا معنی یابی کا دار و مدار سب سے پہلے الفاظ کی معنی شناسی اور معنی فہمی پر ہے۔ الفاظ صرف اصوات یا حروف کا مجموعہ نہیں۔ یہ علامت اور اشارات ہیں، مرتب اور مکمل، یا معنی اور مستقل۔ ہر لفظ کسی شے، فعل، تصور یا حالت کی علامت ہے۔ گفتگو میں یہ علامت صوتی اور تحریر میں لفظی ہے لیکن صوتی ہو یا لفظی مقصد دونوں کا ایک ہے۔ مخصوص علامت کو خاص معنی دینا اسے ہم اصطلاحاً لفظ یا لفظ کہتے ہیں جو ایک مکمل تصور کی خواہ وہ کوئی شے ہو یا فعل یا حالت یا کیفیت الجھوٹی سے چھوٹی مکمل اکائی ہوتی ہے۔ ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ آخر مخصوص آوازوں اور ان کے مجموعوں میں معنویت کس طرح پیدا ہوتی ہے یا سادہ زبان میں یوں کہتے کہ الفاظ کی صفیہ ہیں اور ان کے معنی کا تعین کس طرح ہوتا ہے۔ یہ اہم اور دلچسپ بحث لسانیات کا موضوع ہے۔ نقاد کالسانی مسائل سے دامن بچ کر نکل جانا مشکل ہے لیکن اس مسئلہ میں ہم آگے بڑھ جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ الفاظ کے سب سے سادہ اداسان معنی جن سے ہم سب شاکو

ہیں، وہ ان کے بغیر اپنا کام چلا سکتا ہے لیکن نقاد کو اس سے منفی نہیں
وہ قدما کا کلام پڑھتا ہے جس سے اسے ادبی روایت کا سلسلہ ملتا ہے،
وہ ادب کا تاریخی مطالعہ کرتا ہے، اس کی تدریجی ترقی اور عہد بہ عہد
ارتقا کا مطالعہ کرتا ہے، وہ اس مطالعے میں اسے قدم قدم پر ان متروکات کا سامنا
کرن پڑتا ہے۔ وہ ان کو نہیں، جانتا پہچانتا تو یہ سارا ذخیرہ اس کے لئے
کالعدم ہے۔ اردو کا جو نقاد دہائی زبان سے واقف نہیں، ولی کی زبان
سے آشنا نہیں، میر و سودا پر انشا اور مصحفی کے عہد کی زبان
کے ان عناصر سے واقف نہیں وہ اردو کے ادبی سرمائے کے ایک
بڑے اور اہم حصے کی تنہیم سے محروم ہے، ہماری زبان کی موجودہ
اور جدید صورت ایک بڑی حد تک تاریخ کے عہد میں آکر متعین ہوئی
لیکن ناسخ سے پہلے اردو شاعری اور نثر دونوں کے بہت سے
اعلیٰ درجے کے نمونے تخلیق ہو چکے تھے۔

قدیم زبان کا یہ مطالعہ نہایت دلچسپ بھی ہے۔ میر تقی
کی "باغ و بہار" میں "رندی" عورت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
اس وقت دونوں لفظ استعمال ہوتے تھے پھر رندی کا لفظ ان معنوں
میں ترک ہو گیا، بلوائف کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور آج کل
بلوچستان میں ایک اور ہی دلچسپ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وہاں
"لانڈ" یا بیوہ کو "رندی" کہتے ہیں، یہ بلوچی نہیں، بلوچستان میں
اردو بولنے والے استعمال کرتے ہیں اردو والے بیوہ کہتے ہیں یا لانڈ
کہتے ہیں۔ مرد کو جس کی بیوی مر جائے "رند" کہتے ہیں۔ ہندی والے
"دودھوا" کہتے ہیں جو بیوہ کی ہی قدیمی ہندی شکل ہے۔ اسی خاندان
ڈھیا، اردو بیوا، اور اس کے مشتقات، بیوا، بیوی وغیرہ ملتے ہیں
متروکات کی مثالیں تلاش کرنے کے لئے بہت قدیم زمانے کی
طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ میر حسن کی مثنوی اور نظیر
اکبر آبادی کا کلام ایسا پڑانا نہیں کہ ہم انہیں قدما میں شمار کریں۔
آج کا عام اردو بولنے اور پڑھنے والا ان کے کلام کو سمجھتا اور
پڑھتا ہے لیکن دونوں میں بکثرت ایسے الفاظ ہیں جو اب استعمال نہیں
ہوتے۔ ان کے معنی لغات میں تلاش کرنا پڑتے ہیں اور اکثر وہاں
بھی نہیں ملتے۔

کے دائرے وسیع ہوتے ہیں۔ مکتب اور مدرسے میں جاتا ہے، پڑھتا
لکھتا ہے اس ذخیرہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

الفاظ کا یہ ذخیرہ اور سرمایہ شخص کا برابر ادب کیسا نہیں ہوتا
کسی کا کم کسی کا زیادہ، اس کا انحصار ذاتی اور انفرادی ماحول، تعلیم اور
اکتساب پر ہے۔ انفرادی خصوصیات کے علاوہ اس میں علاقائی اور
جماعتی اثرات بھی اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔ یہ اثرات صرف لب و لہجہ میں ہی
نہیں الفاظ کے معانی میں دلچسپ فرق پیدا کرتے ہیں، یہ انفرادیت
ذہنی سطح اور علم کی بلندی اور وسعت کے ساتھ ساتھ زیادہ نمایاں
ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس سطح سے جس قدر نیچے اترتے چلے آئیں انفرادیت
کم اور مشترک سرمایہ زیادہ ہوتا ہے یہ مشترک سرمایہ امتا محمد و داؤد
مختص ہو سکتا ہے کہ صرف چند سو الفاظ روزمرہ کے معمولی کاروبار کے
کافی ہو سکتے ہیں اسے زبان کا بنیادی عنصر قرار دے سکتے ہیں۔

یہ عنصر خود جامدا و مستقل نہیں ہوتا۔ زمانہ کے ساتھ
ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ نئی چیزیں دریافت یا ایجاد ہوتی ہیں یہ
اپنے ساتھ اپنے نام لاتی ہیں۔ بہت سی چیزیں ترک ہو جاتی ہیں ان کے
ساتھ ان کے نام بھی ترک ہو جاتے ہیں۔ انہیں اصطلاحاً متروکات کہتے
ہیں۔ یہ وہ لفظ ہیں جو کبھی زندہ تھے اور مر گئے کہ ان کی ضرورت
باقی نہیں رہی، بعض ان میں سے مرکز زندہ ہوئے لیکن نئے جنم میں
ان کی صورت اور ان کا روپ رنگ بدل گیا۔ اب یہ جن معنوں میں
استعمال ہوتے ہیں وہ ان کے پہلے اور اصلی معنی نہیں۔

متروکات کا ایک بڑا حصہ جو کسی تحریر میں محفوظ نہ رہا اب
اس کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ ہاں جہاں سے تحریر ملے پڑتی زبان کو
محفوظ کر لیا ہے وہاں ان آثار قدیمہ کا سراغ مل جاتا ہے اور
ان کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ ان متروکات
کا مطالعہ شاعر اور ادیب کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ بہت سے
لفظ جو مر گئے اس قابل تھے کہ نہ مرنے تو اچھا تھا کہ ان کے مفہوم کو
ادا کرنے کے لئے اتنے موزوں دوسرے الفاظ پیدا نہ ہوئے۔ ان کو
دوبارہ زندہ کرنا چاہیے اور یہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ بعض مردہ
الفاظ نئے معنوں کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں لیکن شاعر ادیب،
انشا پرداز یا عام گفتگو کرنے والا ان کے مطالعے اور تلاش پر مجبور

میر کی عشقیہ مثنویاں

ڈاکٹر حکیمان چند

”اے سرایہ تنہا! میں چہ آئے است کہ دردت نہاں است“
یہ دس سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وفات کی بعد ان کے سوتیلے بھائی، حافظ محمد حسن نے بڑی بے رخی دکھائی جس کے باعث یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ دلی کے پہلے سفر کے لیے آنے پر یہ ایک پری تمثال کو دل دے بیٹھے جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تذکرہ بہار بے خزاں میں ہے:

”بہر خوشی بہ پری تمثالے کرا ز عزیزانش بود در پردہ تغشقا
طبع و میل خاطر داشت آخر عشق ادخا صیت مشک پیدا کردہ۔“

افشائے راز پروردہ دوبارہ ترک وطن کیسے دلی چلے گئے اور اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے پاس ٹھہرے۔ ان کے بھائی، محمد حسن نے خان آرزو کو لکھ بھیجا کہ میر تقی فتح دوزگار ہے۔ اس پر خان آرزو نے میر کے ساتھ بدسلوکی کو شیعہ بنالیا۔ عجز و زور کی ستم رانی اور ہجر محبوب کی سینہ کاوی دونوں نے مل کر ان کی طبیعت میں جنون کی کیفیت پیدا کر دی جس کی تفصیل مثنوی ”خواب و خیال“ اور ”ذکر میر“ دونوں میں ہے۔ ”معاظت عشق“ اور ”جوش عشق“ بھی اسی داستان کی فصلیں ہیں:

”تذکرہ خوش معرکہ زیبا“ سے بھی میر کے قیام لکھنؤ کے ایک معاشرے کا انکشاف ہوتا ہے لکھا ہے:

”آخر میر صاحب کو ولولہ عشق پیدا ہوا اور صورت کی کینہ خورشید میں معاند ہوتی تھی۔ پیر جوں بہت ایسوں کو کہتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ پیرانہ سالی میں کھنڈائی ہونے کا کیا باعث ہوا۔ فرمایا اس لئے سسرال والے کہیں۔“ لڑکا آیا۔“

یہ بیان کے زرخیز تخیل کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے۔ صاحب تذکرہ نے ”آئینہ ماہ کی جگہ“ ”آئینہ نور شہید“ میں صورت پیدا کر دی

میر نے مثنوی نگاری میں ایک طرح نو ڈالی۔ وہ شمالی ہند کے پہلے بڑے مثنوی نگار ہیں۔ یوں تو انہوں نے کل ملا کر ۳۰ مثنویاں لکھیں لیکن ادبی حیثیت سے عشقیہ مثنویاں زیادہ جاذب توجہ ہیں جن کی تعداد نو ہے:

(۱) مثنوی جوان و عروس (۲) معاظت عشق (۳) جوش عشق (۴) خواب و خیال (۵) دریائے عشق (۶) اجماع عشق (۷) شعلہ شوق (۸) مثنوی عشقیہ عرف عشق افغان پسر (۹) مورتا۔

پہلی اور آخری مثنوی نو نگاشی کلیات میں شامل نہیں۔ انہیں راقم الحروف نے دریافت کر کے بالترتیب ”مکملہ جوا“ ۱۹۵۵ء اور ”ادب“ جون ۱۹۵۷ء میں شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کو اپنے مرتبہ کلیات میر میں شامل کر لیا ہے پہلی مثنوی کے خطوط میں اس کا کوئی نام نہیں۔ مگر سہولت کے لئے ہم اسے ”جوان و عروس“ کا نام دے سکتے ہیں۔

میر کی مثنویوں کا مطالعہ ان کی ابتدا و طبع، ان کے سوانح حیات، ان کے عہد کے سیاسی و معاشی خلفشار کے پس منظر میں ہی کرنا چاہئے۔ میر ایک درویش کے بیٹے تھے اور بچپن سے سیدامان اللہ اور یارنہ جیسے درویشوں کے زیر اثر تربیت پائی۔ مثنوی باپ میر کو ہمیشہ ہی سبق پڑھاتا تھا:

”اے پسر عشق روز عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است۔ اگر عشق نہی بود نظم کل صورت نمی بست عشق بازو۔ عشق لبزد۔ دعا بہر بہت ظہور عشق است۔“

میر کے مزاج میں ابتدا ہی سے خشکی و برہنگی بسی ہوئی تھی۔ لڑکپن کے بے فکر زمانے میں بھی یہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ ان کے والد دریافت کرتے تھے:

لیکن یہ دسوچا کہ آئینہ خورشید پر نظر ڈالنے کی تاب کس کو ہے کسی دوسرے
ذبیحے سے میر کی مندرجہ بالا کھدائی کی تصدیق نہیں ہوتی۔

عشق میں ناکامی، فاقہ کشی، اہل دنیا سے مایوسی، توکل و استغنا
اور آئے دن کی آفات نے انہیں بددیماغ بنا دیا تھا۔ ساتھ ہی انہیں
اپنے کمال کا شدید احساس اور ناقدری کا شکوہ بھی تھا جس کی وجہ سے
وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ آصف الدولہ کے حضور میں مثنوی
”شکار نامہ“ پیش کی تو اس کے خاتمہ میں بر ملا اعلان کیا۔

بہت کچھ کہا ہے کرو میسر بس
کہ اندر بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا
خسر پدار لیکن نہ پایا گیا
مستاع ہنر پچھیسرے کر چلو
بہت نکھنؤ میں رہے گھر چلو

میر کی عشقیہ مثنویاں ان کے مزاج و سیرت سے کلیتاً ہم آہنگ
ہیں۔ فارسی اور اردو کی رومانی مثنویاں دو گروہوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔
(۱) طویل مافوق العظمت منظوم (استائیں ۲۱)، خالص واردات عشق کو
پیش کرنے والی مختصر مثنویاں۔ ان میں قصہ کا پہلو کمزور رہتا ہے لیکن
دل کی کیفیات اور واردات ایمان کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ فارسی
میں ان کی مثال ”یلبی جمنوں“ اور شیروں خسرو ہیں لیکن میر نے اس نوع
کو ترقی دے کر ایک مخصوص رنگ روپ دیا۔ میر کی مثنویاں دراصل
ایک طویل غزل ہیں۔ ان کا تقویر عشق غزل سے مستعار لیا گیا ہے۔ ان
مثنویوں کا منشا عشق کی عالمگیری اور جہاں سوزی کا بیان کرنا ہے،

یہ ہے میر وہ عشق خانہ خسراب
کہ جی جتنے مائے ہیں یاں بے حساب

غزل کا عاشق میر کی مثنوی کا ہیرو بن گیا ہے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں،
جان اپنا جو ہم نے ہمارا تھا
کچھ ہمارا اسی میں وار تھا
ہم تو تھے محو دوستی اس کے
گو کہ دشمن جہاں ہمارا تھا
عشق بازی میں کیا مونے ہیں میر
آگے ہی جی انہوں نے ہمارا تھا

کیا یہ ان کی مثنویوں کے ہیرو کی سرگزشت نہیں؟
اب معاملات عشق کی تمہید کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں
آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
خستہ عشق کچھ نہ میر ہوئے
بادشہ عشق میں فقیر ہوئے

ان میں سے ہر شعر کسی غزل کا مطلع ہو سکتا ہے۔ ان اشعار میں
اس قسم کا رابطہ نہیں کہ اگر درمیان سے ایک دو شعر نکال لئے جائیں
تو معنی میں خلل پڑ جائے۔ ان میں مسلسل غزل کی سی وحدت خیال
ہے۔ گویا مثنویاں تیسرے میں افسانہ ایک ایسا قالب ہے جس پر عاشق
مہجور کی آشفہ داغی کا بادل ڈال دیا گیا ہو۔ قدیم مثنوی نگاروں
مثلاً افضل۔ فضائل علی خاں۔ جعفر علی زکی کے یہاں عشق کا بیانیہ
حقیقت سے قرین تھا۔ میر نے اسے ایک ناقابل حصول آرزو
کا روپ دے دیا۔

میر کا تقویر عشق مشالیت کے طائر اعلیٰ کا ہے۔ انہوں نے
جذبہ عشق کی تاثیر دکھانے کے لئے ایک غیر مناعانہ ہمت کندھے
سے کام لیا یعنی انجام کو غیر فطری بنا دیا۔ عاشق کی موت پر مجبور
بھی جان دینے کو مجبور ہو جاتا ہے اور لاشیں اس طرح واصل
ہو جاتی ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود جدا نہیں ہوتیں۔ یہ انوکھا
خیال میر سے پہلے مقبلی کی دکنی مثنوی ”چندر بدن و میار“ اور
اس کے بعد والدہ کی مثنوی ”طالب و مومن“ میں پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے
کہ میر مقبلی یا والدہ سے واقفیت نہ رکھتے تھے۔ جہد عالم گیر کی بعض فارسی
مثنویوں میں بھی وصل پس از مرگ کا بیانیہ ہے، میر نے وہیں سے یہ
مضمون اڑایا ہو گا۔ گو یا میر کے نزدیک عشق ایسا روگ ہے جو موت
کے بعد بھی بچھا نہیں چھوڑتا۔ دوسرے یہ کہ اگر فریقین ایک دوسرے
پر صدقہ دل سے فدا ہیں تو کبھی نہ کبھی مل ہی جاتے ہیں۔ اس دنیا
میں نہیں تو اس دنیا میں ظاہر ہے کہ یہ غیر فطری انجام آج قانون

جوں جوں میر صاحب کی عمر بڑھتی گئی ان کی مثنویوں میں غیر فطری عناصر زیادہ ہوتے گئے۔ شعلہ شوق میں انہوں نے فریقین کے جسم کو شعلہ میں تبدیل کر دیا۔ "عشق افغان پسر کھاتے ہیں ایک زندہ انسان موت کے دروازے سے گزرے بغیر ایک روح لطیف سے مل گیا۔" "موزنامہ" میں ایک طاؤس اور رانی کا عاشقہ ہے۔ اس سادہ لوح راجہ اور شاعر کو یہ موٹی سی بات نہ سوجھی کہ ایک عورت اور مور میں جنسی تعلقات ممکن نہیں۔

بظاہر تو میر کے ہیرو اور ہیروئن طبقہ عوام سے ہیں۔ یعنی حقیقت نگاری کے تقاضوں کو داستانوں سے بہتر طریقے پر آسودہ کرتے ہیں لیکن تہ میں جا کر دیکھا جائے تو یہ حضرات اس زمین کے باشندے نہیں معلوم ہوتے۔ ان کا عشق اس بلندی پر ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں یعنی یہ لوگ کسی اور سیارے کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے ارد گرد نہ اس طرح کے "ستیا گرو" عاشق دکھائی دیتے ہیں نہ اس طرح جاں باز عاشق یا وفا شعار محبوب کی فرمائش پر موت فوراً آموچھ جاتی ہے۔ ادھر ہر صدیوں میں وصل بعدِ وفات کی تو رسم ہی اٹھ گئی۔ مختصر آبیوں سمجھے کہ میر کے عشقیہ افسانے شروع سے آخر تک خلافِ حقیقت ہیں۔

میر کی عشقیہ مثنویوں میں افسانوی دلچسپی بھی نہیں اور نہ کردار نگاری کے شاہکار ہی ہیں۔ ان کی واحد کائنات رودادِ عشق ہے اور اگر یہ بھی تشفی بخش نہیں تو پھر ان مثنویوں میں کیا ہے جس کی وجہ سے آج بھی یہ شاداب و تازہ ہیں۔

بظاہر یہ مثنویاں عشاق کی سرگزشت ہیں لیکن اس تخلیقی سرگزشت کی کوئی اہمیت نہیں۔ انی نظموں میں جو چیستر جاذبِ توجہ ہے وہ عشاق کا ماجرا نہیں بلکہ مجرد مطلق عشق کا تصور ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کائنات کو رواں دواں رکھنے والی قوت ہے۔ میر کے عشق کا تصور بھی کچھ اسی طرح ہمہ گیر ہے۔ غزل میں کہہ ہی چکے ہیں ع

اک عشق بھر رہا ہے زمین آسمان میں

درویش باپ بھی واضح کر چکا تھا۔ "عشق است کہ درین کارخانہ متفر است۔۔۔ در عالم ہر جہ ہست ظہورِ عشق است۔"

میر عشق مجازی کو وہ مرتبہ بلند دیتے ہیں جو اب تک

کو نہ متاثر کرتا ہے نہ قائل۔ پھر بار بار ہر مثنوی میں اسی خیال کو دہراتا آہٹ کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا ہے۔

میر کی مثنوی کا ہیرو عشقیہ مثنویوں کی دوسری شق یعنی داستانِ مثنویوں کے میر افسانہ کی بالکل ضد ہے۔ "سحر البیان" نگار لیم اور اسی قبیل کے قصوں کا ہیرو ہمیشہ دودمانِ شاہی کا چشم و چراغ ہوتا تھا۔ لیکن مثنویاتِ میر کا ہیرو ہمیشہ طبقہ عوام میں سے ہوتا ہے۔ میر کبھی نوابوں اور بادشاہوں کے گرد بیٹھتا تھا۔ ۶۔ پر مری گفتگو عوام سے ان کا مسلک تھا۔ ان کا عوامی ہیرو مجنون صفت۔ فنا فی العشق کا رویا سے نابلا اور بے نیاز ہوتا ہے۔ داستانِ مثنویوں کے ہیرو میں طبقہ بالا کے تمام کمالات و اکتسابات جمع کر دیئے جاتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ ساتھ دنیا دار اور مصلحت میں ہوتا ہے۔ فقرہ بازی اور ضلع جگت کے محروکوں میں کبھی بند نہیں ہوتا۔ ضرورت پڑنے پر کسی دیو یا ساحرہ کو زک بھی دے سکتا ہے اور کسی پری کو فریب بھی لکھ مثنویاتِ میر کا ہیرو بڑا مسکین، وفادار، مغموم، بے چارہ جہاں ناز عاشق ہو تا ہے جس کی زندگی پر رحم آتا ہے اور جس کی موت پر فریاد۔ داستانِ مثنوی کا ہیرو مخالف قوتوں کو روندنا کچھ لٹا کا مرانی کی جانب بڑھا چلا جاتا ہے۔ لیکن خالص و ارنات عشق کی مثنویوں کا ہیرو مخالف قوتوں کا شکار ہو کر جان سے گزر جاتا ہے۔

اگر داستانوں کا ہیرو ہر فن مولا تھا تو میر کا ہیرو "ایک فنا" ہے۔ اس میں بس ایک کمال ہے کہ وہ شدت کے ساتھ عشق کرتا ہے۔ اور دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ سربراہِ یالپ باں کہیں جن کی جھلک دیکھ لیتا ہے تو وہیں ڈٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بھی کیا زمانے تھے! شاید اس ہیرو سے بھی زیادہ قابلِ رحم محبوبہ کا والد ہے جس کے در پر ایک ہفتہ سے اس کی قرۃ العین کا قدر دان ستیا گرو کئے بیٹھا ہے!

میر کی کئی مثنویوں میں ہیرو کسی مشکوہ عورت سے عشق کرتا ہے مثلاً "جان و عروس"۔ "عشق افغان پسر اوڑ موزنامہ" میں۔ نازین بھی ہیرو کی چاہ میں مبتلا ہو جاتی ہے اور وفا کے ثبوت میں جان قربان کر دیتی ہے۔ گویا میر کے نزدیک یہ مستحسن ہے کہ ایک کتھا عورت شوہر سے خیانت کر کے ایک نامحرم سے عشق بازی کرے۔ سراج کی تنظیم خانہ خانگی بنا ہی گئی ہے۔ میر نے اپنی مثنویوں میں لہجہ و لہجہ ہمدردی کے سہمی نہیں اخلاقی نظام کو بھی درہم برہم کیا!

عشق حقیقی کا اجمارہ تھا۔ تیر ہر مثنوی کی ابتدا میں اور کبھی کبھار خاتمہ پر بھی
عشق کی طویل توصیف رقم کرتے ہیں۔

نہ ہو عشق تو افس باہم نہ ہو
نہ ہو درمیاں یہ تو عالم نہ ہو

(نہوان و عروس)

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

(”شعلہ شوق“)

نظم کل کا ڈول ڈالا عشق نے
انس سے انساں نکالا عشق نے
وہ حقیقت سب میں یاں ساری ہوئی
ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
چار سو ہنگامہ آرا عشق ہے
عشق کیا کہنے کہ کیا کیا عشق ہے

(”مورنامہ“)

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر گھڑی اس کی اک نئی ہے چال

(”دربائے عشق“)

مثنویات تیر کا یہی حصہ سب سے زیادہ دل نشیں ہوتا
ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیر کا مثالی عشق ہمہ گیر ہی نہیں
ہمہ سوز بھی ہے۔ اس کا انجام ہمیشہ امید ہوتا ہے اور یہ وہ سائنہ
ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ متعدد مثنویوں میں اس کی جہاں ہوئی
کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
عشق سے کیا تیر اتنی محفتگو
خاک اڑادی عشق نے ہر جا پر

(”مورنامہ“)

عجب عشق ہے مرد کار آمد
جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ (”شعلہ شوق“)

عشق کی اسی برہم زنی کو تین کی تفصیل کے طور پر تیر کوئی حکایت
پیش کرتے ہیں اور اسے اسی پہنچ پر ترتیب دیتے ہیں۔ چنانچہ ہر پہنچ
اور ہر قدم پر پر عشق کی دل سوزی و جاں سوزی نمایاں رہتی ہے۔
مثنوی نکتے وقت تیر کا واحد مقصد عشق کی جہاں سوزی کا بیان
ہے۔ ان کی تمام توجہ اسی نقطے پر مرکوز رہتی ہے وہ وحدت اثر
کے قائل ہیں اس لئے باستثنائے اعجاز عشق مثنوی کی رسی تھید سے
گریز کرتے ہیں۔ ہڈیوں کو سلگا دینے والے اور روح کو گھلا دینے
والے عشق کا بیان حمد و لغت و مناجات وغیرہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔
تیر پہلے مہر سے جو فضا قائم کرتے ہیں وہ آخر تک برقرار رہتی ہے۔
عاشق کا کردار و گفتار ہو کہ ہجر کا عالم ہو کہ بیگانہ کا بیان ہو کہ عزیز و
کی تمام رائیوں کی شرح بہر ایک سے اسی مقصد کو تقویت پہنچتی ہے۔
تفصیلات میں جانے کا یہ عمل نہیں۔

جذبہ عشق کی شرح کے لئے تیر نے جامہ حرف بھی اسی کے
مطابق ہی چنا ہے۔ ان مثنویوں کی زبان میں بھی نرمی اور گھلاؤنا
خستگی و برہنگی رسی بسی ہوئی ہے۔ موضوع کے ساتھ ساتھ بوجہ بھی
یاس و محرومی سے بھرا ہوا ہے:

آہ جو ہم دنی سی کرتی ہے
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں
لیکن ایسے کوئی نہکتے ہیں
عشق نے آہ کھودیا اس کو
آخر آخر ڈبو دیا اس کو

(”دربائے عشق“)

جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا
رکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا

(”شعلہ شوق“)

تیر کی طرز مثنوی گوئی اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی
تقلید میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ راسخ عظیم آبادی کی مثنویاں
تو بالکل تیر کا چربہ ہیں۔ ان کے علاوہ ذیل کی مثنویاں بھی
کم و بیش تیر سے ہی متاثر نظر آتی ہیں: (باقی صفحہ ۱۱۱ پر)

”میں نے لاہور جانا ہے“

(ایک سانی تحقیق)

سیتا قدرت نقوی

ایک تک عہدِ قدیم میں کھڑی بولی کا رواج تھا اور جب اس بولی پر بیرونی حملہ آوروں کا اثر ہوا تو زبان کے تغیری اصول کے ماتحت کہیں دس، بیس بیس کو س کے فاصلہ پر زبان بدلتی جاتی ہے متاثرہ بولی کے فوراً روپ ہو گئے۔ ایک اُردو اور ایک پنجابی۔ قدیم اُردو کھنی میں جو اسماء و افعال پنجابی سے متعلق بتائے جاتے ہیں ان کا تعلق کھڑی بولی سے ہے وہ قدیم اُردو میں رائج تھے، تہذیبی مراحل میں متروک ہو گئے۔ مگر پنجابی میں تہذیبی عمل نہیں ہوا۔ اس لئے اس زبان میں تاحال وہی قدیم الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مرحوم حافظ محمود شیرانی ”پنجاب میں اُردو“ کو بھی یہی القبا س ہوا۔ میری رائے میں وہ اس حقیقت کو نہ پاسکے کہ پنجابی اور اُردو کی مماثلت سے پنجابی اصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کا منبع ایک ہے۔

یہ بات میں نے جملہ معترضہ کے طور پر اس لئے کہی کہ میرے نزدیک اُردو اور پنجابی دو لگی بہنیں ہیں۔ اُردو بولنے والے پنجابی کی باتیں، اور پنجابی بولنے والے اُردو کی باتیں، ساتھ سے اسی فی صد تک سمجھ جاتے ہیں وراثتِ شاہ کا یہ شعر ہے۔

علیٰ دانگ نہ سخی دلیر کوئی، پہلوان نہ مرد شہو جیہا
نیکو کار نہ دانگ حسین کوئی، بیکار نہ شمر لنگور جیہا

اس شعر میں ”دانگ“ اور ”جیہا“ کے علاوہ تمام لفظ اُردو میں جوں کے قوں استعمال ہوتے ہیں۔ پنجابی، خالہ کو ”ماسی“ کہتے ہیں، یعنی ماں کی مانند“ اور حقیقتاً اہل پنجاب نے اُردو کی خدمت میں جو کی تمتہ کی ہے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اُردو، دو آہ سے دکن اور لکھنؤ اہل زبان کے ساتھ ساتھ گئی، جہاں بہت سی روایات دہلی کی برقرار رہیں اور تھوڑا بہت اثر علاقائی زبانوں کا بھی پڑا۔ یہ نقل مکانی ارتقاء کے ماتحت تھی کیونکہ خواہ اہل زبان پیچھے

”جزیرہ مسخوڑاں“ کی مجلسِ کیرمیل نے زبان کی غلطی کو ایک جرمِ عظیم قرار دیا۔ وہاں کے باسیوں نے اس جرمِ عظیم کی کیا سزا مقرر کر رکھی تھی؟ اس کا علم تو غلام عباس صاحب ہی کو ہو سکتا ہے۔ البتہ ان کی ”جنتِ الشور“ کی مصداق سرزمینِ لکھنؤ ہے جس کے رہنے والے اپنی زبان کو کوثرِ نسیم سے محلی ہوئی سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک زبان کی غلطی کو لکھنؤ میں سرفہرست ”تندہ دلاں پنجاب“ ہی رہے ہیں، حالانکہ زبان کے دونوں مرکزوں (دہلی و لکھنؤ) کی باہمی آویزش میں بھی اسی جرم کی بازگشت کا پرت ہے۔ غلطی تذکرہ و تائید کی ہو یا کسی لفظ کے غلط استعمال کرنے کی یا کسی حرف کے بجا پر تنے کی غلطی بہر حال غلطی ہے۔ اسی لئے میں نے سوچا کہ آج دہلی سے چل کر، دکن کی پریچ گھاٹیوں پر نظر ڈالتا ہوں دہلی آؤں اور پھر لکھنؤ پہنچ کر وہاں کے حسین بازار، باغات کو چھ اور خصوصاً عمارات کو دیکھوں، وہاں کے نازک مزاجوں سے گفتگو کر دوں، اس کے بعد تو یقیناً دہلی ہو کر ”میں نے لاہور ہی جانا ہے“ کراچی نہیں۔

اُردو زبان نے دیہانے سندھ کی وادی اور پانچ دریاؤں کی سرزمین سے ایک ہیولانی حیثیت میں، ایرانی، تورانی اور افغانی سپاہیوں کے ساتھ وادیِ گنگ دھن کے سبزہ فادوں میں پہنچ کر ڈیرے ڈالے اور اس کھڑی بولی پر اپنا قبضہ جمایا جو برج، مانگتی اور پائی کی بہن تھی جس کا دس کو روپا نڈو کی راجدھانی ہنستنا پور کے علاقہ میں تھا یہی علاقہ میرٹھ اور مضافات دہلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہی کھڑی بولی معمولی اختلاف کے ساتھ شمالی ہند سے ایک تک بولی جاتی تھی۔ چنانچہ اُردو اور پنجابی میں یک گونہ مماثلت اسی بنا پر ہے۔ اسی لئے پنجابی بولی میں مستعمل بعض مصداق کے افعال اور بعض اسماء کو کھنی اُردو کے قدیم آثار میں دیکھ کر یہ قیاس کر لیا گیا کہ اُردو پنجابی ہی کی جہتِ صورت ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وادیِ گنگ و جرج سے

تھے۔ اگر انہوں نے مقامی اثر قبول کیا تو اس کو گوارا کر لیا گیا چنانچہ جب دلی کے زمانہ میں اُردو کو دہلی والوں نے شاعری کا مرتبہ دیا تو انہوں نے بھی کئی تصریحات کو ایک زمانہ تک جانز رکھا۔ اس بارے میں قائم کا یہ کہنا ہے کہ ریختہ گویان دہلی کے کلام میں جو چند غیر انوس الفاظ اور محاورے مستعمل ہیں وہ اہل دہلی کو اس لئے گوارا ہو گئے ہیں کہ دکن کی زبان کے مطابق درست ہیں (معزین نکات ۱۳) حالانکہ وہ مدعی ہیں ۵

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ

اک بات پھر سی زبان دکنی تھی

جس طرح دکنی اُردو، گجراتی اور مرہٹی وغیرہ سے متاثر ہوئی، اسی طرح لکھنوی اُردو، پوربی (راوڑی) سے متاثر ہوئی ہے بعض امور میں دہلی والوں سے اہل لکھنؤ کا اختلاف اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ میں نے جھوٹ بولا (دہلی) وہ جھوٹ بولا (لکھنؤ) مولوی عبدالحی مرحوم نے رواداری سے کام لیا اور دونوں کو صحیح کہہ گئے۔ (قواعد اردو ص ۱۸۱ طبع دکن)۔ حالانکہ ”میں جھوٹ بولا“ اور ”میں نے لاہور جانا ہے“ ایک ہی طرح کی غلطیاں ہیں۔ ایک میں ”نے“ کا ترک خلاف قاعدہ تو دوسرے میں ”نے“ کا استعمال خلاف اصول ہے۔ لکھنوی اُردو پر راوڑی کا اثر ہے اور راوڑی میں ”نے“ کا استعمال پایا نہیں جاتا۔ اسی لئے اہل لکھنؤ بعض معوی مصاد کے فعل ہی میں ”نے“ کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ خوب پڑھا“ اہل لکھنؤ کے نزدیک صحیح ہے اور یہ پوربی اثر ہے۔ اُردو کا اس سے کیا واسطہ؟ اہل دہلی کہیں گے اس نے خوب پڑھا“ لہذا ”نے“ کے سلسلہ میں سفر سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر یہ طے کر لیا جائے کہ ”میں صحیح محل استعمال کیا ہے؟“ ”نے“ اُردو میں علامتِ فاعل ہے اس کو صرف مصدر متعدی کی ماضی مطلق، قریب، بعید، خشکیہ اور تمنائی کی دو صورتوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً، میں نے پڑھا، اس نے پڑھا، ہم نے پڑھا تھا، تم نے پڑھا ہوگا، کاش اس نے پڑھا ہو، اگر تو نے پڑھا ہوتا۔ اشعار ذیل سے بالترتیب یہی احتمال ثابت ہوتا ہے ۵

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیہر کی

وہ اک منگ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

بھونکے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا

افسونِ اشتہار تمنا کہیں جسے

میں نے جھوٹ پر لکھیں میں اسدہ سنگ اٹھایا تھا کہ سر لاد آیا

یوں کرتے تھے کب وہ دلی نادان کی شکایت
کی ہوگی فلک نے مرے افغان کی شکایت
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ بلانہ دیا ہو شراب میں
جول پر گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح

کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

”نے“ کا یہ استعمال اصول کے ماتحت ہے اس کے علاوہ کچھ متشبیہ بھی قرار دے لئے گئے ہیں۔ یہاں ایک اصول پیش نظر رہنا چاہیے کہ ”نے“ کا اثر فعل پر یہ ہوتا ہے کہ اس کا رشتہ فاعل سے منقطع ہو جاتا ہے اور مفعول سے قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی فعل میں تبدیلی مفعول کے لحاظ سے ہوتی ہے فاعل کے لحاظ سے نہیں۔ جیسے لڑکے نے کتاب پڑھی لڑکے نے سبق پڑھا، کتاب اور سبق کی وجہ سے فعل بدلے۔ یہ اسلئے بیان کیا گیا کہ ”نے“ کے استعمال کی دینی اور ترک وغیرہ کا پتہ چلانے میں آسانی ہو۔

دہلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب درحقیقت بہت سی خرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ زبان کے لحاظ سے یہاں دو آب کا اثر ہے۔ اُردو کا مولد و منشا ہونے کا فخر بھی اسی سرزمین کو حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر شریک سبزواری کوئی سورت اس کے کلام میں ”نے“ بکثرت استعمال ہوا ہے جس کی مثال ”لیک پرش نے آج میری سپنا نرودس دینوں“ (آج مجھے ایک شخص نے خواب میں جلو دکھایا) دی ہے (”سور ساگر پد“ ۲۹ ص ۲۹) اُردو زبان کا ارتقا ۱۲۸۵) اور پرتھوی راج کے عہد میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔ اسی زمانہ سے اردو کی ابتدا کا تعلق ہے۔ امیر خسرو دہلی میں جو اردو کے پہلے شاعر تسلیم کئے گئے ہیں ان سے منسوب ایک شعر دو پہیلیاں اور ایک کہہ مکنی ملاحظہ فرمائیے جن میں ”نے“ استعمال ہوا ہے:

میرا جو من تم نے لیا، تم نے اٹھا غم کو دیا

غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر

ایک کنیہ نے بالک جایا

مارا مرے نہ کاٹا کٹے

واپاک نے جگت ستیا

واپاک کو نای کھائے

ترد سے لیک تریا تری اس نے بہت رھایا

اپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارے بوجھ پہیلی موری

امیر خسرو یوں کہیں لپٹنے نام نبولی
(نمل)

تو من دمن کا ہے وہ مالک والے دیا میرے گود میں بالک
دل سے محنت جی کے کام کیوں سکھی ساجن؟ ناسکھی رام
(کہہ بولی)

امیر خسرو ۷۲۵ء میں وفات پاتے ہیں۔ "نے" کا استعمال ان کے یہاں باقاعدہ اور بالآخر اس ہے۔ ان کے بعد شمالی ہند میں سکھاری زبان فارسی رہتی ہے مگر عوام کی زبان دہلی کھڑی بولی فارسی و دہلی آئینہ ہو پورب میں اودھی راج تھا۔ اودھی میں "نے" نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کیر اور تسی داس کے کلام میں اس کا وجود نہیں لیکن اس زبان کے ریختہ میں اس کا استعمال موجود ہے جس کی ابتدا امیر خسرو سے ہوتی ہے۔ ان کے بعد بھی مثالیں ملتی ہیں:-

تب سب نے ہا جو کر کے تاپی مری بجائی
جنس جنس کے پھیل موسو کرے لگو ٹھٹولی
اکھیاں نے جھڑنگایا، کرسوا کرین گی آخر

دردا کہ راز پنہاں خواہ شد آشکارا
مولانا محمد افضل، جمنہانہ، ضلع میرٹھ، کے رہنے والے تھے جو عبداللہ قطب شاہ یا محمد قطب شاہ کے ہم عصر ہیں۔ یہ زمانہ دکن کی شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے۔ شمالی ہند میں مولانا کی "بکٹ کہانی" بہت مشہور ہے۔ اس میں "نے" کا استعمال استعمال ہوا ہے:-

جنوں در ملک جاں جھنڈا اگدایا

سمجھ اربوجھ کا تھا نا اوتھا یا

جنوں کے بعد "نے" مقدر ہے کہ مذکورہ نہیں، لیکن اکثر جگہ اس کا استعمال قاعدہ کے مطابق ہے۔ مرن دوشور مثلاً پیش ہیں سے

مسافر سے جنہوں نے دل لگایا انہوں نے سب جنم روئے گنویا
دہلی رحلت کا بھادوں لے بجایا اچھوں لک سادرا پرویں چھایا
شمالی ہند میں اردو شاعری کے آثار دلی کی آمد تک برابر پائے جاتے ہیں مولانا افضل کے بعد گیارہویں صدی میں شیخ جیون کا کلام پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں بھی "نے" کا استعمال موجود ہے مگر ترک ہے تو

مقد ہے:

کیا جن مجتہد حنی پاک سے پڑا عاقبت خاک پر تاک سے (دکن مقدم)
مجتہد خودی کی تھی غرور نہیں براہیم نبی سے جو مرد نہیں
غرض شمالی ہند میں محمد شاہ کے عہد تک اردو کے جھانک رہے ہیں، ان میں "نے" کا استعمال باقاعدہ ملتا ہے حتیٰ کہ میر تقی میر کے کلام میں بھی موجود ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد نے "آجیات" میں لکھ دیا "زل کا اعتبار کیا؟" مگر اس سلسلہ میں ان کا کلام "نے" کے استعمال کی گواہ ضرور ہے۔

بابادشہ تیں برکی، سرکی خدائے خیر کی

تاحال ہم داری حذر، کہہ جعفر اب کیسی بنی
اس شعر میں ترک، مقدم اور استعمال موجود ہیں برکی یعنی
تو نے برکی ہے۔ اب واضح استعمال دیکھتے:-

لذت کا کھاوتے کھانا، پیرتے ریشی بانا

انہوں کو موت نے بھاناکر آخر خاک ہو جانا

اب وہ زمانہ آتا ہے جب دلی دکن سے دلی آتے ہیں اور یہاں دکن کی طرز پر شاعری کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس لئے پہلے دکن پر لیک نظر ڈال لی جائے مسلمان فاتحین جب دلی سے آگے بڑھے، اس زبان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دکن میں یہ زبان مقبول ہوئی۔ دیاروں میں سانی پانی، ادبی زبان بنی، نظم و نثر نے ترقی پائی، لیکن مرہٹی اور گجراتی کا اس پر بھی اثر پڑا، جس کی وجہ سے دلی کی زبان سے ذرا مختلف ہو گئی۔ اسی لئے "نے" کے استعمال میں بے قاعدگی ملتی ہے۔ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی گیسو داز کی "معراج العاشقین" کی اس عبارت میں "نے" استعمال نہیں ہوا:-

"حضرت دودھ پئے ہو عرض کئے، لے مرے خدا میں دودھ کو قبول کیا"

اس میں دوجگہ "نے" استعمال ہونا چاہیے تھا۔ مگر نہیں کیا گیا۔ یہ زبان کی ابتدائی حالت ہے مگر ان سے جو شاعرانہ سبب ہیں اس میں "نے" موجود ہے:-

خواجہ نصیر الدین جئے ساتیاں پیو بنائی

جیو کاہوں کہ کھول کر پاک آپ کھائی

"جئے" یعنی جی نے ہے۔ غرض دلی کے عہد تک استعمال اور بے قاعدگی

مودتگیر مجھے یا علیؑ ولی اللہ

کہ اس فلک نے کیا جکال بھکڑوں تنگ
ولی کے عہد سے اہل دہلی آمد کی طرف متوجہ ہوئے۔ دہلی میں باقاعدہ اردو
شاعری کا یہ ابتدائی عہد ہے۔ اب ہم دہلی چل کر جائزہ لیتے ہیں۔ ولی دکن
سے دہلی آئے ہیں، اہل سخن کی محافل میں اپنا مقام بناتے ہیں لوگ سنتے ہیں، مطلق
اٹھاتے ہیں۔ ولی سعد اللہ گلشن سے بیعت کر کے مرید ہو جاتے ہیں، شا
صاحب نے اپنے مرید کو راہ بھائی (آبجیات ص ۹)۔

”ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اندر در ریختہ خود
بکار بر آرزو کہ محاسبہ خواہ گرفت؟“ (”نکات الشعراء ص ۹۱“
”شعر الہند“ جلد اول ص ۱۲)

اور اصلاح زبان کے سلسلہ میں ہدایت فرمائی :-

”شما زبان دکنی را گزاشتہ، ریختہ را موافق آردوئے معطاف
آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب
طبعان عالی مزاج گردو“ (تذکرہ قدرت بحوالہ شعر الہند جلد اول ص ۱۲)
مرید نے مرشد کی بات کو بچے باندھا اور عمل کیا، دوبارہ دہلی
آئے تو زبان کافی بدلی ہوئی تھی۔ دہلی حضرات نے دیکھا انہیں بھی شوق
ہوا، دیکھا دیکھی فارسی چھوڑ ریختہ کو ہموار کیا، ابتدا میں ولی کے کلام
کو نمونہ بنایا اور کچھ دن تک دکنی زبان کو اپنا لے رکھا۔ اگرچہ خود ولی نے
دکن میں اصلاح زبان کی ہم شروع کر دی تھی اور اردو نے مکمل کام پ
دینے لگے تھے، ان کا یہ شعرو۔

اس کی تعظیم ہوئی، اہل چمن پروا جب

بلبل باغ نے جب مصحف گل یاد کیا

بالکل آج کل کی زبان میں ہے، مگر دہلی والوں نے شاعری کے شوق میں اس
طرف توجہ نہ کی۔ شاہ حاتم نے اصلاح زبان پر خاص توجہ دی۔ ویساچہ
دیوان زادہ میں لکھتے ہیں :-

”دریں ولا از وہ دوازده سال اکثر الفاظ از نظر انداختہ

والفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند و روزمرہ دہلی
کہ مرزا ایمان و ضیاحان اند و محلوہ آزد، منظور دار و آبجیات ص ۱۱۱

شاہ حاتم اصلاح زبان کے سلسلہ میں اتنے فراخ حوصلہ واقع

ہوئے تھے کہ اگر ضرورت شوری کی وجہ سے محلوہ کی کوئی خلاف مذہبی

ہو جاتی اور ان کا کوئی شاگرد اس سے باخبر کر دیتا تو بہت خوش ہوتے

اور ترک ملت ہے اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ دکن میں کوئی اصول نہیں تھا۔
ہر دود کے ہر شاعر کے کلام میں یہ تینوں باتیں ملتی ہیں۔ نثر میں سب سے
(مکلاوی) کی عبارت سے استعمال دے قاعدگی کی مثالیں پیش ہیں۔
گیان دھیان کے کام تمام محمد نے لیا یا، جو کچھ پایا تھا محمد
نے پایا، جو کچھ محمد نے پایا علیؑ کو سمجھا یا۔

”جوں مرتضیٰ فرماتے ہیں جنوں کی بات دائم معرفت ربی
بفسخ العزائم یعنی جیوں منگتا تھا تیوں نہیں ہوا تو میں خدا
کو پہچانیا، میرے بات میں نہیں ہے کام، ہر ایک بات میں ہے تحقیق
کر جانیا۔“

”میں پہچانیا“ اور ”تحقیق کر جانیا“ کے لئے ”نہ“ استعمال
ہونا چاہیے تھا۔ یہی حال نظم کا بھی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ اور عبد اللہ
قطب شاہ سے لیکر ولی تک ترک و استعمال پایا جاتا ہے۔ دیکھئے محمد قلی
قطب شاہ کے ہاں ترک اور عبد اللہ قطب شاہ کے ہاں استعمال موجود
ہے :-

یک پوت کو دیتے زہر ایک پوت پہ کھینچے خنجر

کافر کے کیسے قہر، روز خرم کاری ہائے ہائے

حسین کا وقت جب دانا یا، شمر نے آکلا کا تیا

حرم کا ایک سنیا پایا، بتا دینا اور اپکاری کی

غرض دکن کے ہر شاعر کا کلام اسی بیج پر ہے۔ ولی اور اس کے بعد بھی
یہی حال ہے۔ ولی کے کلام سے مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے ”نہ“ پہلے
شعر میں استعمال دوسرے میں مقدر ہے :-

اہل گلشن پہ ترے قد نے جب ادا کیا

اولا سر کو غلامی سے آزاد کیا

سعدی بجا دتری چشم سوں لے نور نظر

حسن کے فرو پہ دیوان ازل صا کیا

ولی کے اس قصیدہ میں بے قاعدگی پائی جاتی ہے مگر اسی میں

استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ آخری شعر استعمال کی مثال ہے :-

ہر ایک رنگ میں دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ

ہوا ہے غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

سوائے داغ کے پایا نہیں ہوں باغ میں گل

درائے خون جگر میں دسا بھجے گل رنگ

مشہور واقعہ ہے کہ شاہ حاتم کی نشست شاہ قسیم کے کچھ میں ہوا کرتی تھی۔ ایک روز صاحبِ محل شاگردوں کا مجمع تھا، سعادت خاں رنگیں بھی ایشا کی خدمت میں پہنچے، باتوں باتوں میں شاہ حاتم نے فرمایا کہ رات ایک مطلع ہوا ہے۔

سر کو پٹکا ہے کھو، سینہ کھو کوٹا ہے

رات ہم جھکی دولت سے مزا اٹا

میاں رنگیں نے دست بستہ کہا، استاد اگر یوں ہو جاتے تو بہتر ہے:

سر کو پٹکا ہے کھو، سینہ کھو کوٹا ہے

ہم نے شب جھکی دولت سے مزا اٹا

شاہ صاحب سن کر بہت خوش ہوئے اور آدھیں فرمائی۔ ایک صاحب نے کہا کہ استاد کے سامنے یہ گستاخی مناسب نہیں مگر شاہ صاحب نے فرمایا کہ کوئی مضائقہ نہیں میں ویدان میں اسی طرح کھوں گا۔ (آبجیات مثلاً) شاہ صاحب کے شعر میں نے ”مقدمہ ہے، کیونکہ اگر خلافتِ قادریہ متحمل ہوتا تو لوٹے میں نہ لگتے۔ یہ ترکِ رمزہ کے خلاف تھا میاں رنگیں نے رمزہ کے مطابق کر دیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شعر میں زیادہ جنت نہ کی جاتی تھی سہل انگاری سے ترک کر دیتے تھے۔ مقرر جان جانوں، قائم، سودا میر اور انشاء نے اصلاحِ زبان میں کوششیں کیں اور زبان نے بہت جلد اصلاحی منازل طے کر لیں۔ انشاء تک ترک کی مثالیں ملتی ہیں۔ حاتم کے یہاں بے قاعدگی بھی ہے۔ آخر سے انشاء تک ناسندہ شعرا کے کلام سے ترک کو استعمال کی ایشا ملاحظہ فرمائیے۔

آرمہ۔ ہر یک نگہ میں ہم سے کرنے لگے ہر نوک

بکھر پوزی آنکھوں کے پر طے طور بکھا

حاتم۔ میں پایا ہوں ولے تجھ چشم کا بید

نہاگوں کا کبھی ان کا اشارہ

(بے قاعدہ ترک)

قائم۔ غنچہ کے گس کے دوسرے کو یہ لہکے ہیں جمع

گل کیوں بننا ہے بارغ میں صورت کنار کی

سودا۔ ناک سے تیرے صید نہ چھوڑا نے میں

ترپے ہے مرغ قبلہ سنا آشیانے میں

۰۔ پلا ہر ایک بات میں اپنے، تیس یوں تجھ

معنی کو جس طرح سے سخن عاشقانے میں (ترک، مقدم)

میر تقی میر۔ ہلکے آگے تر اجب کسی نے نام لیا

دل تم زندہ کو ہم نے تمام تمام لیا

۰۔ ایسی جوشی کہاں ہیں لمے خواباں

میر کو تم جھٹ ادا اس کیا ترک مقدم

مضیٰ۔ میں نے بازار حسن خواباں سے

مول اک حشرت نظری ہے

۰۔ شب ہجر صحرائے ظلمت سے نکلی

میں جب آنکھ کھولی بہت رات نکلی ترک۔ مقدم

جرات۔ دم وصل اس نے رخ سے جڑ ملک نقاب اٹا

ہمیں لگ گیا دم اس دم بعد اضطراب اٹا

۰۔ شب وصل یہ قلع تھا پے وہ سو گیا تو منہ سے

نہ ذرا بھی تیس دوپہ زرہ حجاب اٹا (ترک، مقدم)

آبجیات ص ۲۴۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے ”دیکھو یہاں بھی علامتِ فعل

(نے) محذوف ہے اور یہ پُرانا جو ہے۔“

میر حسن۔ منزل بے غری میں آپ کو بھی

ہم نے اپنا نہ ہم سفر دیکھا

۰۔ ہر ایک دل و جان کے مرغوب نظر آئے

میں خوب تہیں دیکھا، تم خوب نظر آئے (ترک، مقدم)

انشاء۔ مجھ چھڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اٹا

تو کیا بہک کے میں نے اسے اک سلام اٹا

یہ تمام اساتذہ دہلی کے تھے، مگر ستم ہائے روزگار کے مارے

ہوئے۔ نوابین اودھ قدردانِ اہل فن تھے۔ یہ سب اودھ پہنچے اور اودھ

والوں کو انہوں نے سبق پڑھایا۔ انشاء کے بعد کوئی اہل کمال لکھنؤ نہ گیا

اس لئے اب لکھنؤ چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خود اہل لکھنؤ نے ”لے معلق

کیا روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جائزہ سے پہلے لکھنؤ کے ماضی پر ایک

نظر ڈال لی جائے تاکہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ دہلی پر تباہی آرہی

تھی اور لکھنؤ ترقی پا رہا تھا۔ لکھنؤ دہلی سے قریب تھا، اس لئے صاحبانِ

علم و فن کلام کرنا۔ نوابین مرتبہ شناس اور قدردان تھے مگر جب دکن بھی

ایسی ہی ریاست تھی وہاں بھی قدر و منزلت ہوتی تھی لیکن دہلی سے دور

راستہ کٹھن، اس لئے اہل کمال وہاں کم گئے۔ اس کے علاوہ دہلی دہلی

سے جب کوئی ایمر کسی طرف کا حکم مقرر ہو کر جاتا تو اپنے ساتھ کاروبار

کے لوگوں کو بھی لے جاتا۔ یہی حال حاکمان اوروں کا ہے کہ ان کے ساتھ دہلی سے کاروباری عملہ بھی آیا اور قدردانی و قدر شناسی کی وجہ سے صاحب کمال نے ادھر کا رخ کیا۔ دہلی کے باکمال شعراء لکھنؤ پہنچے جو اپنی زبان اور محاورے کی حفاظت و دواج پر بندھتے رہے۔ چنانچہ میرائیں ہمیشہ کہا کرتے تھے یہ میرے مگر کی زبان ہے حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے اور اب تک اس خاندان میں یہ خصوصیت برقرار ہے۔ غرض انشائیک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مومن، ذوق اور غالب کا نواز آیا تو اہل کمال نے لکھنؤ جانا چھوڑ دیا۔ دہلی والوں میں سے بعض نے لکھنؤ کو وطن بنالیا اور انہوں نے اور ان کی اطاعت و محاورے دہلی کو ملحوظ رکھا مگر لکھنؤ کے قدیم باشندوں کی زبان پر دہلی اثر بھی رہا۔ اگرچہ انہوں نے اردو زبان اہل دہلی سے سیکھی تھی۔ یہی دور میں دہلی والوں کا نزول لکھنؤ والوں نے بھی زبان کی مرکزیت کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا۔ گویا اہل دہلی کے ہم مرتبہ دم پہلے ٹھٹھے میں فخر محسوس کرنے لگے، شیخ امام بخش ناسخ نے جہاں اصلاً لاہوری تھے مگر تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ میر و میرزا کی اصلاحات زبان پر سختی سے عمل شروع کر دیا اور کچھ اصلاحات کا اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ اس زمانے میں ”نئے“ کا ترک کلیتہً ناجائز قرار دیا گیا۔ لیکن مقصی کے شاگردوں میں سے بعض کے یہاں ترک کی مثال ملتی ہے مثلاً سرور:-

دوچار گھڑی دن سے جو رخصت میں طلب کی

تو جیل کے کہا جلیے بس دیر نہ کیجیے

اہل لکھنؤ بعض اوروں میں محاورے دہلی کی خلاف دہنی اس لئے کہتے ہیں کہ ان کی زبان پر دہلی کا اثر ہے۔ تذکر و تانیث میں دہلی کی مخالفت اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ غالب لکھتے ہیں:-

”پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے“ (خطوط غالب ص ۵۵) پورب یعنی ضلع شرقی ہندوستان اور لکھنؤ خصوصاً تیر صاحب نے کہا تھا:-

کیا بدو باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

ہم کو غریب جان کے ہنس نہیں پکار کے

یہی حال بعض مصنف کے استعمال کا ہے۔ اہل دہلی جن کو متعدد استعمال کرتے ہیں، اہل لکھنؤ ان کو لازم سمجھتے ہیں۔ غالب ہی نے لکھا ہے:-

”کھور ہا ہوں، متعدی ہے۔ پورب یعنی اس کو لازمی جانتے ہیں۔

(پورب یعنی باشندہ پورب مشرقی اضلاع کا رہنے والا) لازمی کھو یا گیا ہوں۔ ہم کہیں گے جاگتے ہیں۔ اہل پورب کہیں گے جگتے ہیں، خطوط غالب ص ۵۵) گویا اہل لکھنؤ ”کھونا“ کو لازم سمجھتے ہیں یعنی علامت فعل ملنے اور اس کے لئے مفعول نہیں لاتے، اہل دہلی استعمال کریں گے۔

میں جان کھور ہا ہوں ترے ہجر میں صنم (متعدی)

کھوتے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے (لازم)

اسی طرح اس نے کتاب کھوئی (متعدی) کتاب کھوئی گئی یا لڑکا کھو یا گیا (لازم) مگر اہل لکھنؤ اس کے خلاف استعمال کریں گے یعنی وہ کتاب کھو یا یا صرف کہیں گے وہ کھو یا۔ غرض اسی طرح دیگر مصنف کے اشتقاق میں بھی اہل لکھنؤ پوربی محاورے کی پیروی کرتے ہیں اور محاورے دہلی کی مخالفت مثلاً سوچنا اور پڑھنا متعدی ہیں مگر اہل لکھنؤ بطور لازم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً گلزار نسیم کے یہ شعر ہیں:-

سوچا وہ کہ اب تو ہم میں آگاہ

جیتے ہیں تو حیت لبس گئے ناگاہ

(زندہ)

سوچی دلاشت تاب ہے کیا

پھر تجھیں گے خطر اب ہو کیا

(مثلاً گلزار نسیم، طبع لاہور ص ۲۳)

”فضائے آزاد“ کے یہ دو اقتباسات اسی کے مؤند ہیں:-

(۱) ”میاں آزاد..... سوچے کہ چل کے محرم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔“

(۲) ”ہم بھی سوچے کہ کہاں کی بھیجٹ“ (فضائے آزاد) بحوالہ ”کاروان ادب“ ص ۲۵۵ و ص ۲۶۱ مطبوعہ لاہور۔

دور جدید کے ممتاز شعراء میں سے عزیز لکھنؤی کا شعرا اور نواب جعفر علی خاں آؤ کی نثر میں بھی استعمال پایا جاتا ہے:-

سوچے نہ یہ بتوں سے محبت ہے لے عزیز

رکھتی تھی ایک آہ اثر میں بھری ہوئی

(”مکملہ“ مطبوعہ نول کشور بحوالہ ”کیفیت“ ص ۱۳۸)

”فراق صاحب نے ان سب کا قلع قمع کر دیا اور نہ سوچے۔“ (اثر کے تنقیدی مضامین ص ۱۳۱)

اہل لکھنؤ کے ہاں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ دہلی میں غالب کے ابتدائی دور تک لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا رہا ہے مگر

جاسکتا۔ یا کسی ہے کہ حدود کو مؤثر نظم کیا ہوا اور پڑھی لکھا ہوں کہ
”پڑھے پڑھا لیا گیا ہو۔“ باری النظر میں یہ دونوں باتیں بڑی دقیق نظر آتی
ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ”حدود“ بطور جمع استعمال نہیں
ہوتا کیونکہ حدود یعنی اصلوات ہر جگہ واحد استعمال ہوتا ہے اس کی جمع نہیں
آتی بشرط اس سلام کے بالمقابل ہے۔ سلام واحد ہے یہ بھی واحد ہی ہے
مؤثر نہیں مذکور ہے۔ انیس

سوتے میں شغل طاعت رب وودو تھا

دل میں خدا کی یاد تھی لب پر دودو تھا

غرض بھرنے لکھنؤ کے روزمرہ کے مطابق پڑھنا بطور لازم نظم کیا ہے اس
میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اہل دہلی متعدی استعمال کرتے ہیں، دفعہ

دیکھو تم کا لکھا اس نے پڑھا خط سوار

دھیان پر میرا مطلب کسی عنوان چڑھا

لکھے پانی چولے منہ میں آنسو

پڑھی لکھی سرانے بیکسی نے

”یہ باب ابھی میں نے تم کو پڑھا یا نہیں“ (خطوط غالب ص ۱۳)

”بولنا“ بطور لازم متعدی استعمال کیا جاتا ہے۔ اہل دہلی جب

مفعول مذکور ہو تو ”نے“ استعمال کرتے ہیں جیسے اس نے جھوٹ بولا وغیرہ۔

مگر اہل لکھنؤ ایسے مواقع پر بھی ”نے“ استعمال نہیں کرتے اور بولتے ہیں وہ

جھوٹ بولا“ وغیرہ البتہ بطور لازم لکھنؤ اور دہلی میں کوئی اختلاف نہیں

یعنی جب بولنا کے مشتقات بطور لازم استعمال ہوتے ہیں تو ان کے بعد ایک

اور جملہ آیا کرتا ہے اس کو مفعول کہتے ہیں۔ غالب، انیس اور اکبر الہ آبادی

کے یہ شعور مثال میں ہیں:-

سراٹھنے کے جو دمہ کو کر چاہا

ہنس کے بولے کرتے سر کا تم جو چاہا

تین وپر کو بھینک کے بولا وہ ناور

کہہ دیجئے اے اسے کاٹ کے لیجا میں میرا

چھوٹیں جو گلے آنا حشر سے اُونٹ بولے

انہوں! شیخ نبی نے ہم کو پستانہ سمجھا

اہل لکھنؤ کے ہاں اب تک ”نے“ ترک کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ بھونک کے سنا

ملاست فاعل ”نے“ بالاتفاق استعمال ہوتی ہے۔ میں نے تم کو۔ اس پر اگر

دنیا نے تم کو“ وغیرہ مگر علامہ آزاد لکھنوی اس کے ساتھ ”نے“ ترک کرتے ہیں

پھر بالاتفاق متعدی استعمال کیا جانے لگا۔ مصحفی لازم نظم کرتے ہیں:-

جب زہن آئی اور کچھ تدبیر

یہی سوچے کہ اب بلا تاخیر

غالب کے خطوط میں دونوں استعمال ملتے ہیں:-

۱۹۱۱ء میں نے سوچا کہ کچھ کیا زاریات غالب ص ۱۳۱ میں نے سوچا کہ اگر اس

انتظار میں رہوں گا۔ (خطوط غالب ص ۱۳۱)، ”اُردو کے معنی“ کا پور

۱۹۱۱ء لاہور ص ۱۲۱ میں ”نے“ نہیں ہے مگر ”عود ہندی“ ص ۹۱ میں

”نے“ موجود ہے اور چونکہ ”عود ہندی“ کو اولیت حاصل ہے اس لئے

یہی صحیح ہے (۳) ”حضرت چالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے اس سے

ہوں گے“ (خطوط غالب ص ۱۲۱) ”اُردو کے معنی“ کا پور ص ۱۵۱، لاہور ص ۱۳۱

استاذ وفق متعدی نظم کرتے ہیں:-

ہم نے ان سے کوئی کی وہ ہیں کوئے دشمنی

دیکھو کیا سوچا تھا ہم نے اور مل گیا ہر گنا

جدید شعراء کلیتہً متعدی استعمال کرتے ہیں میں نے لکھا تھا:-

میں نے سوچا تھا کہ باندازِ نظم جہاں

دورِ حاضر کے تقاضوں پر کرونگا قائم

میں نے سوچا کہ ہر کیوں غیر کی پیدا جھک

چاہیے رائقِ مطلق پہ بھروسہ مجھ کو

(علی حیدر ندیدی ”شعر الہند“ جلد دوم ص ۲۹)

سرمجہ کی طرح ”اہل لکھنؤ پڑھنا کو بھی لازم جانتے اور استعمال

کرتے ہیں۔ مولانا آزاد نے اس حیات میں اہل لکھنؤ کا یہ قول نقل کیا ہے:

”جب کوئی (میر خلیق سے) اگر بیان کرتا کہ آج (انیس) فلاں

مجلس میں خوب پڑھے ہیں“ (”آب حیات“ لاہور ص ۱۳۱)۔

چنانچہ اہل لکھنؤ کا ردِ مروہا ہے۔ آپ خوب رہا ہی پڑھے،

وہ مشاعرے میں غزل پڑھے۔ ہم دود پڑھے۔ وغیرہ۔ بھونک ہی لکھتے ہیں

کیا سلام جو ساقی سے ہم نے جام لیا

پڑھے دود جو پیرِ میخان کا نام لیا

(”کھاوت حق“ ص ۱۲۱)

اس شعر کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ”دود“ بطور جمع استعمال

کیا گیا ہے جن کلام ہم ”پہلے مصرع میں موجود ہے اور اس کے ساتھ

ملاست فاعل ”نے“ بھی ہے۔ لہذا یہ شعر بے فائدگی کی مثال پیش نہیں کیا

اردو بھی پڑھنا شروع ہے :

ہم سے کی یہ کنیاں ہیں کہ اٹھتے ہوئے آنسو

پلی جلتے پہ دو توند، لمبیروں میں تھوکا

(سرلی بانسری)

قصہ کرتا ہوں "کے ترک اور بے قاعدگی کی مثالیں اہل کھنڈ کے

ہاں بخت ملتی ہیں جی کو ہم نے گوارا کر لیا ہے حتیٰ کہ مولوی عبدالحق بھی

رہاداری رہتے ہوئے وہ جھوٹ بولا کو بھی صحیح لکھ گئے۔ (قواعد اردو ۱۵۵)

طبع و کن۔

انشاء کے بعد، توہن، ذوق اور غالب کا عہد ہے ہمیں اس

دور میں دل کی زبان میں کوئی اہم تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ذوق اور غالب

سرخی شعلہ دہلی تھے۔ لکھنؤ کے سلسلہ میں ذوق و غالب کے کلام سے

اساد بھی گزرتے ہیں، دل کی سیر کرنے سے پہلے دکن پر ایک نظر اور ڈال

لیں مگر دکن جانے سے پہلے چند اصلی باتیں اور بیان کی ذیلی ضروری

سیکھتے ہیں۔

اردو میں بعض مصادر ایسے ہیں جو متعدی ہیں لیکن ان کے ساتھ

ہونے استعمال نہیں کرتے۔ لانا، بھولنا، شرانا اور بھگنا وغیرہ جیسے وہ

کتاب لایا، میں تمہاری بات نہیں بھولا۔ وہ نم سے شرایا۔ (اگرچہ اسی لیے

مواقع پر محض حضرات "بھول جانا" اور "شرایا" کے مشتقات استعمال

کرتے ہیں جیسے : تم میں بھول گئے ہو صاحب ! وہ ہم سے شرایا گیا)

خالد اس معاملہ میں خوب بحثا وغیرہ بعض مصادر لازم و متعدی دونوں

طرح مستعمل ہیں۔ بولنا کی بحث گزرتی، جیتنا، اڑنا، پکانا، بھڑنا،

پلٹنا اور بدلنا جیسے وہ جیتا، اس نے بازی جیتی، وہ ہارا اس نے ریخت

ہارا۔

قمار محبت میں بازی صدا

وہ جیتا کیا اور میں ہار گیا (میر حسن)

تازہ جھک تھی شب کو تاروں میں آسمان کی

اس آسیا کو شاید پھر ہے کہوں نے ہارا

(میر تقی میر)

پاسے کی بدی ہے آشکارا

راجہ نلی سلطنت ہے ہارا (دیباچہ نسیم)

پکانا بھی بولنا کی طرح مستعمل ہے۔ اکبر الہ آبادی کے یہ شعر ہیں :

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

(یہاں مجھے "ضمیر مفعولی محذوف ہے" یعنی "مذہب نے مجھے پکارا")

جو دیکھا سانس کا یہ چکر، دھرم پکارا کہ اے برادر!

ہمارے دو ہیں پن گن تھے تو ہائے دور میں پاپ خوشی

بھڑنا، پلٹنا، بدلنا جیسے تمہارا پیٹ نہیں بھڑا، تم نے بندوق بھری۔ اس نے

کتاب پٹی۔ میں یہ سمجھا مری تقدیر سراسر ٹوٹی۔ وہ کتنی جلدی بدلا۔ اس نے

گاڑی بدلی میں نے کپڑے بدلے وغیرہ۔ رونا، ہنسنا، جھپٹنا کے ساتھ ہونے

استعمال نہیں کرتے جیسے وہ میرے حال پر ہویا۔ وہ بھول کر بھٹا۔

باز کو ترپ جھپٹا۔ کتاب پڑھنے سے لڑا لیکن رونا محاورہ میں آئے تو "نے"

استعمال کرتے ہیں، اس نے اپنا دیکھنا روایا جھپٹنا اور لڑنے کے ساتھ اگر

مفعول نہ کر رہو تو "نے" لاتے ہیں جیسے اس نے قلم جھپٹا۔ اس نے کٹی لڑی۔

سمجھنا لازم و متعدی دونوں طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ذوق

اور غالب کے ان شعروں میں :۔

دل شکستہ گر اس یار نے بھجا ہم کو

خط بھی جو خط شکستہ ہی سے لکھا ہم کو

وہ میری چین چین سے غم پہناں بھجا

راز کہتو یا میری عنوان بھجا

سیکھنا متعدی ہے اس کے ساتھ ہونے استعمال کرتے ہیں میر، ذوق اور

چکبست کے یہ شعر :۔

کھنا کم کل نے سیکھا ہے

اس کی آنکھوں کی نیم خواب سے

تری چشم منوں گرے کہاں سیکھا تھا یہ جادو

کیا ہے اک نگہ میں لے پری سحر دل جیسا

سبق سیکھا نہ تحافت لے تیری خود نمائی کا

لب خاموش کو دعویٰ نہ تھا رنگیں نوائی کا

مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب قواعد اردو میں سیکھنا کو لازم بھی

لکھا ہے اور مثال میں غالب کا یہ شعر دیا ہے : (قواعد اردو ۱۵۵)

طبع و کن۔

سیکھ میں درخوں کے لئے ہم متعدی

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

کیا جاتا ہے۔ اسی زمانہ میں دکن میں بھی خسرو و محسن کا خوب چرچا تھا۔ لکھنؤ پرندوال کے آثار سنایا ایچو ترنگے تھے۔ اہل کمال دکن کا رخ کرتے تھے۔ شاہ نصیر کی درووزت چھٹی تھی۔ استاذ وفق کو بھی بلایا آیا، مگر انہوں نے جلا پسند نہ کیا اور رکھ دیا :-

گرچہ ہے ملک و کن میں ان دلوں قدر سخن
کون جائے فق پر ملی کی گھٹیاں چھوڑ کر
دکن میں غالب کے شاگرد بھی موجود تھے۔ بذریعہ خطوط اصلاح لیتے
تھے۔ داغ اور امیر بھی دکن پہنچے، ان کے فیض سے زبان اور زیادہ صفا
ہو گئی۔ جزوی اختلاف جس کو علاقائی تصرف کہا جاسکتا ہے باقی رہا،
مگر "نے" کا استعمال باقاعدہ ہو گیا۔ نواب مجرب علی خاں آصف اور
آحمد کے پیشتر۔

یہ جو آصف نے کہا غریبے اس کو سمجھو
علم وہ شے ہے کہ اللہ کا ہے نام علیم

تاریکی میں دریائے اک اندھیر چھایا
 ”سیلاب فنا“ بن کے کیا سب کا صفایا

نواب عثمان علی خاں کے ناندر میں ہندوستان کے ہاں حضرات
دکن میں جمع ہو گئے تھے۔ ادب کی زبان وہی تھی جو دہلی کی زبان تھی مگر بول چال
میں محاورہ دکن کا چلن تھا اور اب تک باقی ہے۔ اب بھی اہل دکن بولتے ہیں
”میں کتاب میز پر دھرا ہوں، میں کھانا کھایا ہوں“ وغیرہ۔ اگرچہ شہزاد شاہ
کا پیشہ صریح استعمال کی سند نہ کافی ہے۔

تجھے الفت نہیں مجھ سے، یہ تم نے کیا کہا مجھ سے

گلد مچھلی کو ہے تم سے میں ملے ہو بے وفا مجھ سے

دہلی میں مومن، ذوق اور غالب کے سبب نہ بان ترقی پا چکی تھو۔

اپنی بیرونی اثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔ بہادر شاہ ظفر جن کے

مذہبِ معلیٰ کی شان باقی رہی اگرچہ ان کی زبان اردو کے معلیٰ تھی لیکن

حق نے قیاسیلم کیا ہے کہ ان کی زبان پر بخاری کا اثر تھا۔ چنانچہ ان شہر کی

علامت فاعل کا استعمال اسم مفعول کے ساتھ خلاف قاعدہ ہے

روزِ قمر نہیں ہے۔

ہم سنے ہے خوب اس کی طرناں پہچانی ہوئی

چال پچانی ہوئی آواز پچانی ہوئی

میں نے کہا کہ دل کو جان تو چھوڑے مجھ کو امر کا کیا

خوبی ہم کے حق میں دستاویز ہو گا۔

”ہم سیکھے ہیں“ کوہلوی صاحب نے ماضی قریب خیال کیا ہے۔

لیکن اس کے یہ دو پہلو بھی غور طلب ہیں (۱) "سیکھے ہیں" فعل حال بھی
برسکتا ہے یعنی سیکھ رہے ہیں یا سیکھتے ہیں۔ کیونکہ غالب کے زمانہ میں
مضارع کے بعد "ہے" لگا کر فعل حال بنا لیتے تھے۔ آئے ہیں، کھڑے ہیں وغیرہ
آئے ہیں، مکیں، سختی پر رہنا غالب

کس کے ٹھہرائیگا سیلاب بلا میں بعد

علاوہ ازیں ”سیکھے“ اہم مفعول یعنی ”سیکھے ہوئے“ کا اختصار بھی قرار دیا جاتا ہے لیکن اس کے متعدی استعمال ہونے کا یقین ثبوت یہ ہے کہ ”مصور“ مفعول مذکور ہے نیز مضمون کی معنویت بھی اہم مفعول یا فعل حال کی طرف دلالت کرتی ہے۔ تیسرا و ذوق کے استعمال کی موجودگی میں اس کو متعدی ہی تسلیم کرنا چاہیئے۔ غالب کا شعر بھی متعدی ہی کی مثال ہے۔ میرے نزدیک اس کے ساتھ ”نے“ کا استعمال ضروری ہے۔

اب ہم دکن چلتے ہیں۔ ولی کے بعد دکن میں اردو کی ترقی و اصلاح

بیش از پیش ہوئی۔ اہل دکن نے کھلیتہ اہل دہلی کا تتبع کیا۔ دورِ آصفیہ

میں تدبیر کنی الفاظ و محاورات ترک کئے جانے لگے اور محاورہ دہلی کی

پیر دی ہوئے لگی۔ دلی اور اس کے ہم عصر شعرا کی زبان متقدمین سے

بہت مختلف ہو گئی تھی۔ دلی کے بعد سراج کے زمانہ میں زبان بہت صاف

ہر کوئی گمراہی کے سلسلہ میں ترک اور بے قاعدگی پائی جاتی ہے:

سراج : شہر بخودی نے عطا کیا مجھے وہ لباس برہنگی

نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دہی رہی

دنگاہ : بغیر اس کے کہو کن شاہ مرداں ہے

خدا نے سیف دیا اور رسول نے فخر

قصی : دو بھواں دیکھ کر کہا میں یوں

دو گھنٹی رات دن میں آتی کہیں؟ (ترک۔ مقدس)

محمود : سن بائو سوچھ آرپر پوٹھام

کہا ہوں جو اس وقت پایا نظام (ترجمہ بقاعدہ)

اس وقت کے بعد شاہ نصیر دہلوی کو کن پچھ۔ نبال میں مزید

شادانہ : جو غمخوار نہ ہو اور اناگاہ : بے پروا

سکون! جب چنے سے اپنا کریباں سے نکلا
 ہمارے لئے یہ ہے جگہ! اس سے ہم

انما : مر اس کا ذوق ہے کہ اس سال میری آمد ہوگی۔

یہاں : یہاں پہلے کیا سوال ہو گا اور اس کے جواب میں کیا ہو گا ؟

طريقه جلاله در امور احوال و معاش

لیکن شاہ قاضی پر دئی کسی نے نہیں کی بلکہ ذوق و غالب کی پیروی کی گئی اور اب تو پاک و ہند میں غالب ہی کا رنگ غالب ہے۔

”ہر یافوئی“ مشرقی پنجاب کے راجپوتانے سے ملحق اضلاع کی زبان ہے جو اردو، پنجابی، راجستھانی، اروڑی کا متزاہ ہے۔ روٹا ہوا ہے اگرچہ بعض نے اس کو اردو ہی کا ایک روپ بتایا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ پانی پت کرناں اور گڑکانوے کے دہلی سے ملحق علاقہ کی زبان اردو کا ایک روپ نہ صرف باقی علاقہ کی زبان ہے بلکہ یونوی ہے۔ ہر یافوئی میں ”نے“ فاعل و مفعول دونوں کی علامت ہے۔ اس علاقہ کے رہنے والے بولتے ہیں ”بابوئی ڈاکٹر نے“ کی بجائے ”ہے“، ”تیندیس نے“، ”تھوڑا دودھ تو دے“، ”ہیر کی طرف تیر نے بلاو“، ”آئے تھو“ وغیرہ یہ استعمال راجستھانی مارواڑی کے اثر سے ہے۔

شمالی ہند، دہلی، دکن، بنگلہ اور ہریانہ کی سیر کے بعد اب ہم پانچ دریاؤں سے سیراب ہونے والی وادی کی طرف رخ کرتے ہیں اور یہاں اردو کی نشوونما عروج و ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ہم مذکورہ علاقوں میں ”نے“ کے استعمال، ترک اور بے قاعدگی پر اچھی طرح روشنی ڈال چکے ہیں پنجاب کے بانیوں کی زندہ دلی مشہور ہے اور یہاں ادب سے لگاؤ مسلم، انشائیہ کہا تھا تو اہل درو کو پنجابیوں نے ٹوٹ لیا ”اس میں کلام نہیں کہ ان کا کلام ہر زمانہ میں وقیع رہا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے یہاں کی سیر کی تو ہمیں اردو کے آثار اسی ابتدائی زمانہ سے ملے جس زمانہ سے وادی گنگ و جمن اور دکن میں پائے جاتے ہیں۔ زبان وادی گنگ و جمن کی زبان کے مطابق ہے۔ دکن کی زبان کی مانند گنگ و جمن اور خلافت محاورہ نہیں بلکہ بہت صاف ہے۔ ان آثار کا سلسلہ بافرید گنج شکر سے شروع ہوتا ہے لیکن عہد شاہجہاں تک جو آثار ملتے ہیں وہ صحیح معنی میں ریختہ ہیں یعنی فارسی کا غلبہ ہے۔ البتہ عہد عالمگیر سے جو آثار دستیاب ہوئے ہیں وہ اردو روزمرہ میں ہیں۔ ”نے“ کے سلسلہ میں صرف نامندہ شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

عبدالی، علم شریعت نال کے بھیجا پاک رسول
جو کچھ بھیجا آپ میں (نے) سب کچھ کیا قبول

(استعمال، ترک، مقدم)

نامرہلی رہندی، سچ کے حسن کا قرآن پڑھیا ہے میں نظر کر
نہیں پائی غلط اس میں دیکھ نہیرونہ کر

(ترک، مقدم)

شاہ کا مراد، وہ نور سجن کون جس نے دیا، یہ جانچو جس کا حق نے دیا

یہ سورج ہے آپ بیبا، پر نور ہو یا مشہور ہو یا

تیرے کھڑے پر اک خال سپاہیں دیکھا گھریا مال کیا

یہ نقطہ ہے سہم اللہ کا، جو مصحف پر مسطور ہو یا (ترک، مقدم)

شاہ مراد کے زمانہ تک پنجاب و شمالی ہند میں شری سرما بہت کم

پایا جاتا ہے۔ دلی کی آمد کے بعد مستقلاً اردو کی طرف توجہ کی جاتی ہے پنجاب

میں ہر زبان استعمال ہوئی وہ دکن کی زبان سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہی

ہے کہ گوشالی ہند میں اردو کے ادبی آثار فارسی کے غلبہ کی وجہ سے نہیں ملتے

مگر عام بول چال میں اردو کا چلن تھا جو کئی اردو سے مختلف تھی اور وہی زبان

اہل پنجاب میں رائج تھی۔ اگرچہ اہل دہلی ابتدا میں محاورہ دکن کے بھیجے دوڑ

مگر بہت جلد اس کو ترک کر دیا۔ اہل پنجاب اس دکنی اثر سے بچے رہے کیونکہ

ان کا تعلق براہ راست دہلی کی زبان سے نہ تھا۔ تعجب ہے کہ اس دور میں ”نے“

کا استعمال بالآخر عام اور باقاعدہ ملتا ہے۔ چند مقدم شعرا کے کلام سے

مثالیں پیش ہیں۔

محمد جان، بسل ہو تپتہ ہے، سچائے کون کیا کہنے؟

کیا کام کیا دل تے دیوانے کون کیا کہنے؟

میر صاحب، صابریہ بات جس کے گہی آفریں اسے

چہاں مند سے بات کسی بلانی ہو جاوے گی

نامندہ صاحب، فرصت ندی قضاے عیلا چل میں ایک پل

آیا اجل کا شہر ہر ن کے شکار پر

محمد خوش بٹالوی، بری ساعت اندر کیا اس نے جنگ

ہو یا قانیہ زندگانی کا تنگ

شاہ آملداد، فیض شاہ مراد سے امداد

ہم نے باندھے ہیں تختوں کی کلی

فقیر اللہ، سر کمون کا جس نے جانا

اپنے آپ کو آپ بچھانا

پنجاب سے ذرا آگے بڑھ کر بھی دور میں سرحد کی سیر بھی کی گئی تھی

سرحد کے قنوند، لشکر کی خدات انجام دیتے ہوئے، دہلی اور شمالی ہند

پہنچے، شمالی ہند اور پورب میں پٹانوں کی بستیوں سے ظاہر ہے کہ بہت

سے پٹان قبیلے ہیں آباد ہو گئے۔ مگر واپس جانے والے اپنے ساتھ اردو

لے گئے۔ شعرا کا کلام بھی انہی کی وساطت سے سرحد میں پہنچا۔ یہاں کے

یہ الفاظ اب تک میرے حافظ میں موجود ہیں۔ جلد اب بھٹتی بجائے کو لگا اور اس کو بمبئی کی بارود کے نام سے یاد کیا گیا تھا۔ ان کی زبان سے ہنس مکی اردو دہری بھلی لگتی تھی۔ بمبئی اور اس کے ملحقہ علاقہ میں اگرچہ گجراتی اور دہری کا چلن ہے مگر اردو کا بھی سنگ چلتا ہے جو علاقائی اثر لئے ہوئے ہے۔ مگر نے کا استعمال عام بول چال تک میں ہے۔ جیسے پن نے یکام نہیں کیا؟

۱۸۵۰ء کی جنگ آزادی کے بعد جبکہ دہلی کی سرزمین مسلمانوں کے لئے تنگ ہو گئی تھی۔ اہل علم نے پنجاب کا رخ کیا مولانا محمد حسین آزاد مولانا حالی لاہور کے۔ ان کی کوششوں سے یہاں اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ شعر و سخن کی بساط بچھائی گئی۔ مشاعرے ہوئے۔ ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ لاہور رشک دہلی و لکھنؤ بنا۔ یہاں کے رہنے والوں نے شعرا و ادب کے میدان میں نمایاں ترقی کی۔ کیا بلحاظ فن اور کیا بلحاظ موضوع۔ چنانچہ خیال و موضوع کی قدرت میں ان کا مد مقابل کوئی نہیں۔ جدید شعری و حقیقت زندہ دلاں پنجاب ہی کی شاعری سے عبارت ہے۔ اسی قدرت کا روی کے رشک نے اہل لکھنؤ کو ان کا لطف بنادیا۔ اہل دہلی اس لئے بغیر جانب دار سے ہے کہ جب دہلی کو حکومت کلکتہ قرار دیا گیا تو سرکاری ملازمین کی بھاری کھپ پنجاب ہی سے گئی اور انہوں نے زبان دہلی کا تہن کیا۔ مگر ان حضرات کی زبان میں کچھ علاقائی اثر بھی باقی رہا۔ جولا زمرہ نظر تھا۔ اہل لکھنؤ نے جغرافیہ شاعری کے دلدادہ اہل ہام، ضلع جلگت کے متعلق تھے، اہل پنجاب کی بلندی خیالی اور موضوع کی نہ رت پر رشک کیا اور زبان کی خامیاں کمال تر تہذیب شروع کر دی۔ سیما، اکبر آبادی بھی اسی رشک کا شکار تھے اور علامہ اقبال کی زبان پر اعتراضات کئے۔ لیکن بہت جلد تمام اہل ہند کو اپنی شاعری کی طرز بدینی پڑی۔ لکھنؤ والوں نے بھی لکھنؤ، چوٹی اور انجیا وغیرہ سے ہمت اٹھایا۔ خارجی امور اور ضلع جلگت کو ترک کیا۔ اب تمام ہندوستان بیان و زبان کے لحاظ سے ایک ہو گیا۔ مگر اہل لکھنؤ خیال و بیان کی اس بلندی کو نہ چھو سکے جو اہل پنجاب و شمالی ہند کا حصہ تھی۔ رشک کی اسی چھٹک نے ترقی کی اور اہل پنجاب کی زبان کو مور و تنقید بنا یا گیا اور اب تک وہی جذبہ کار فرما ہے۔ جوش ملیح آبادی نے قویہ روش اختیار کی کہ انہیں اپنے کلام میں جو امور قابل گرفت نظر آئے صاف لکھ دیا۔ میرے نزدیک یہ جائز ہے، میں اس کو جائز سمجھتا ہوں۔ ان کا جلدیچھا چھوٹ گیا کیونکہ ان کا شمار بھی زمرہ اہل زبان میں ہوتا ہے۔ اس لئے پیشانیوں پر ہلی پڑ کر رہ گئے اور محافل میں کچھ نہ کر سکے۔

اس منزل پر پہنچ کر ہم بڑے سکون و اطمینان سے ایک امر کا جائزہ

باشندے پشتو کے علاوہ اردو میں بھی اظہار خیال کرنے لگے۔ ابتدائی دور کے چند شعرا کا کلام دستیاب ہو چکا ہے۔ نے کے ترک استعمال کی مثالیں ملنا ضرور ہوں۔

آؤ دیدی: میں یا رکنے قاصد بھیجا تو ہے پر شاید
بے نامہ اگر آیا، پیار ہے اور میں ہوں (ترک، مقدم)
دل کو دروں سے جیگی راہ ہم نے نہ تھا وہادہ
کچھ بھی تو کیجئے نگاہ، پیش کمر، جو ہو سو ہو
جید سی: جب طور پہ پولی لے انوار محسوس کو
دیکھا تو کہا حاشا، جو تو ہے دی میں ہوں
ریاض: لکھا ہے وصف میں کے کسی بے نیاز کا
موقع ملا ہے خوب استم کو نماز کا
دلی والوں کے بھی اشعار سنیں گے
پر ریاضی قرا، انداز سخن کیسا کہنے

میر کے بعد سندھ کے ریگزار کی بھی کیوں نہ سیر کی جائے؟
ہیں وادی ہیران میں صرف ایک شاعر کا سراغ مل سکا اور وہ ہیں سچل میرٹ۔
ان کے کلام پر تصوف کا گہرا اثر ہے۔ نے کا ترک استعمال ان کے کلام میں بھی موجود ہے۔

یہ درد مجھ کو جانان اب بے خبر کیا ہے
مجرد میرے دل کو اس اک فکر کیا ہے (ترک، مقدم)
اتنی بیسے نیاز و دلبر نہ کر سچل سے
اس کی گلچ میں تم نے اکثر زور کیا ہے

پاک و ہند کے علاقہ میں ذرائع آمد و رفت و نشر و اشاعت میں آسانیاں ہو گئیں، اردو ہر جگہ بولی اور سمجھی جانے لگی۔ غالب کے خطوط سے ان کے شاگردوں کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بنگال، کاٹھیاواڑ، بمبئی، ملتان وغیرہ کا ذکر ان میں پایا جاتا ہے۔ گویا اسی زمانہ سے ادبی زبان دہلی جو دہلی کی تھی۔ سیما، سرحدی، کشمیری، اسی کا موڑ ہے۔ لیکن عام بول چال کی زبان بھی اردو ہی کا ایک روپ تھی۔ سرحد، بنگال، بمبئی، مدراس وغیرہ کے علاقوں میں جلیے توار دو کا سک جلتا نظر آتا تھا۔ مگر اس میں اور ادبی زبان میں کافی فرق ہے۔ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد جب قائد اعظم صد منتخب ہوئے اور انہوں نے ہندوستان کے شہروں کا دورہ فرمایا تو انگریزی کے علاوہ کلمہ گاہے اردو میں بھی تقریر فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تقریر کے

لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے دکن، لکھنؤ، دہلی، پنجاب، سرحد اور سندھ میں گھوم پھر کر ”نے“ کے استعمال کا جائزہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی ہند میں ”نے“ کا ترک قولند ہے مگر بے قاعدگی نہیں۔ دکن میں بے قاعدگی در ترک قدیم زبان میں ہے موجودہ ادب میں نہیں۔ لکھنؤ میں ترک و بے قاعدگی کی مثالیں اب تک ملتی ہیں جس کو ہم گوارا کر لیتے ہیں لیکن جب اسی طرح کی کوئی بے قاعدگی اہل پنجاب سے سرزد ہوتی ہے تو اہل زبان کو سخت ناگوار معلوم آتی ہے۔ آخر کیوں؟ حالانکہ اہل پنجاب کی غلطیاں زیادہ تر بول چال تک محدود ہیں، لکھنے پڑھنے میں بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے جب لکھا، ”تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے“

ایک قیامت آگئی، ادھر سے ادھر تک ایک آگ لگ گئی، بحث شروع ہوئی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اہل پنجاب کی غلطی عام ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے جب سے اس علاقہ میں اردو کا رواج ہوا، اسی وقت سے غلطی بھی ہے۔ بڑی فتح محمد خالد دھری نے اپنی کتاب منہاج القواعد میں اس غلطی کے متعلق لکھا ہے۔ (منہاج القواعد ص ۲۵۷ وغیرہ) ڈاکٹر تاثیر نے مولانا سائلک سے غلطی کو صحیح ثابت کرنے کی تدبیر بھی پختی۔ وہ لکھتے ہیں:

”تاثیر کی شاعری میں جدید و قدیم کا نہایت لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ ابتدائی غزلوں میں ان کا مخصوص رنگ تو موجود ہے لیکن بعض مقامات پر زبان خلاف محاورہ ہو گئی ہے اور کہیں کہیں فن کے تمام محاسن بھی پائے جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ انہیں ان باتوں پر توجہ کرتا تھا۔ لیکن وہ ہنس کر مثال دیا کرتے تھے۔ کیونکہ آجکل کے ادیبوں اور شاعروں کی خوددانی کا کچھ اثر ان میں بھی تھا۔ یعنی غلطی کرتے تھے جان بوجھ کر کرتے تھے، اور پھر اس کی صحت پر اصرار کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، مجھ سے کہنے لگے: ”سائلک صاحب! کیا ہم نے جانا ہے، ہم نے کرنا ہے، لکھنے درست ہے، ہم نے کہا، خلاف محاورہ اہل زبان ہے۔ مجھ کو جانا ہے اور مجھ کو کرنا ہے درست ہے۔ کہنے لگے: میں نے اپنی تکریروں میں متعدد بار اس قسم کے فقرے لکھے ہیں۔ اگر کوئی اہل زبان اعتراض کرے تو اس کا کیا جواب دوں؟ میں نے کہا، غلطی کا جواب کیا ہوگا؟ صاف

کہئے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ہنس کر کہنے لگے: نہیں میں صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ایسا جواب دے سکوں جو بظاہر معقول ہو۔ میں نے کہا بھائی غلطی کو حق نہ ثابت کرنے کے لئے جو جواب دیا جائے گا وہ محض سخن طرازی اور سبکدوشی ہوگی۔ کہنے لگے: کچھ بھی ہو آپ اس کا جواب مجھے بنا دیجئے۔ میں نے کہا آپ یہ کہئے کہ ”نے“ علامت فاعلی ہے اور ”کو“ علامت مفعولی۔ اگر جاننا ہے، کا فاعل ”میں“ ہے تو اس کے بعد ”نے“ ہی درست ہے ”کو“ کیونکہ اگر درست ہو سکتا ہے۔ ”سُن کر اچھل پڑے اور کہا، بس ٹھیک ہے اب میں جواب دے دیا کروں گا۔ میں نے کہا، شوق سے دیجئے، لیکن محاورے کا اعتراض قواعد سے اور قواعد کے جزئیات کا جواب محاورے سے دینا اصولی سائنات سے درست نہ ہوگا“ (ڈاکٹر تاثیر، ص ۲۶۳)

اہل پنجاب کی اردو خدمات سے انکار کرنے کی جرأت کسی میں نہیں۔ نشر و اشاعت، شعروادب میں ان کا مقابلہ مشکل ہے۔ اردو پر ان کا بھی حق ہے اور تقسیم ملک کے بعد تو ان کا بیچن اور بیچن فائن ہو جاتا ہے پس جس طرح ہم نے اہل لکھنؤ کی غلطیوں کو صحیح قرار دے لیا اور گوارا کر لیا اسی طرح اہل پنجاب کی غلطیوں کو مولانا سائلک کے بیان کی روشنی میں مستثیات کے ذیل میں بیان کر دینے میں کوئی قبحاحت نہیں۔ لیکن اس کے استعمال کا بھی ایک اصول مقرر کر لیا جائے۔ میرے خیال میں یہ قاعدہ بنالیا جائے کہ جب مصدر را دہ فعل کے اظہار کے لئے استعمال کیا جائے، اس کا تعلق خواہ ماضی سے ہو یا حال سے یا استقبال سے تو علامت فاعل ”نے“ استعمال کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں جیسے۔ میں نے لاہور جانا تھا، میں نے لاہور جانا ہے۔ تم نے لاہور جانا ہوگا۔ ہماری مندرجہ بالا تجویز سے یہ نہ خیال کر لیا جائے کہ ”میں نے لاہور جانا ہے“ ہمارے نزدیک صحیح ہے یا ہم اس کی صحت کے لئے وجہ پوچھ کر رہے ہیں۔ ایسا ہو کر نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے نزدیک کلیتہً غلط ہے، ہم نے صرف رواداری اور دلبری کی خاطر یہ تجویز پیش کی ہے۔ مولانا سائلک نے اس محاورہ کی غلطی بتایا ہے مگر یہ اہل زبان کے روزمرہ بول چال ہی کے خلاف نہیں بلکہ لحاظ قواعد بھی غلط ہے۔ اسی طرح پنڈت برج بھون دتا نے تہمتی نے بھی اس غلطی کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ ”مجھ لکھا جانا ہے“ کو کجالات

اہل پنجاب اس غلطی کا شکار کیوں ہیں؟ جب اس کا مریض لگایا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پنجابی میں ”نے“ علامت فاعل اور ”نوں“ علامت مفعول ہے کہیں کہیں ”نے“ بھی بطور علامت مفعول استعمال کر لیتے ہیں۔ ہیر واریش کے ان اشعار میں ”نے“ کا استعمال غور طلب ہے۔

ایس نیند نے شاہ فقیر کیجئے، روٹی چنے وقت دہانیاں نوں
نیند حسن مہین کیجئے، کٹھے کر بلا وچ شہانیاں نوں
بچہ دہلے نے رب نوں یا کرنا، انہیں عشق نوں بہت لالوٹا
ایس عشق دا وچ بپا بپا، جی جان تے سیس گواڈا نہیں
دس لڈکا لیا کڈھناوے، سائے پٹنگ نوں کس خراب کیتا
سائی بچے لے کون سوالیو، میرا کچھ نہ ادب آداب کیتا
کچھ بے کم دے کا نہ سلائے، آبا کھی کر تو ت دکھائے نوں
دلالت بندگی واسطے گھیا نہیں آ بیٹھا عیش اڈاؤنے نوں

شعروں کے مصرع اول میں ”نے“ علامت فاعل اور ”نوں“ بمعنی ہیں ”سے“ مصرع ثانی میں ”حسن“ جیسی نے نیند کیجی“ ہونا چاہئے، ترک میں بے قاعدگی ہے شعر صلا میں بطور علامت مفعول ہے اور استعمال بھی مصدر کے ساتھ ہے۔ شعر تیس میں ”نے“ ”مقدر ہے یعنی“ کس نے خراب کیتا“ ہے شعر چار میں بطور علامت مفعول بمعنی کے لئے ہے۔ ”نوں“ ہر جگہ علامت مفعول ہے پس اہل پنجاب جب اس قسم کے جملے بولتے ہیں تو ان کے تحت اشعار میں پنجابی روزمرہ ہوتا ہے اور لا شعوری طور پر میساختہ پنجابی روزمرہ کی پیروی میں ”اس نے“ لاہور جانا ہے“ بول جاتے ہیں۔ یعنی ”ایں نوں یس نے لاہور جانا ہے“ تحت اشعار سے ابھر کر لا شعوری حالت میں ”اس نے لاہور جانا ہے“ بن جاتا ہے پس یہ نہ پنجابی روزمرہ کے مطابق ہے اور نہ اردو روزمرہ کی پیروی ہے اس لئے اس سے احتراز واجب و لازم ہے۔

اہل زبان اس غلطی سے بیزاری کے اظہار میں شدت اختیار کرتے ہیں۔ شدت اظہار کے تدوین میں اہل پنجاب غلطی کا ازالہ کرنے کے بجائے اس غلطی کی صحت پر لڑ جاتے ہیں۔ یہ افراط و تفریط، احساس بہتری اور شعور کسری کے نتائج ہیں اس لئے اہل زبان کو چاہئے کہ اس غلطی کو گوارا کریں اور اسے دور کرنے کی مناسب تدبیریں کریں۔ زنگہ دلائی پنجاب کو اپنی زندہ دلی کا ثبوت اس طرح دینا چاہئے کہ اس قسم کے جملے بولتے وقت اصول اور روزمرہ کو پیش نظر رکھیں، تحت اشعار لا شعور کی حرکات کا شکار نہ ہوں شعور کو بیدار کریں اور غلطی سے احتراز فرمائیں ۵

مجھ پر اور میں نے لاہور جانا ہے“ کو بجا استغناء اختیار کی درست خیال کرتے ہیں، دو جواز میں حالت جبر کو مفعولیت سے اور حالت اختیار کو فاعلیت سے متعلق جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مستقبل کی حیثیت عموماً خبر پر ہو ا کرتی ہے۔ اس لئے انہوں نے جبر و قدر کی قید لگانے کے استعمال کو جائز قرار دیا۔
”کیفیت“ ۱۶۶، ۱۶۷

لیکن وہ فعل کو کیسے نظر انداز کر گئے ہیں ”نے“ علامت فاعل ہے اور فاعل فعل کو چاہتا ہے۔ فعل ثابت ہونے پر استعمال درست ہو سکتا ہے۔ نیز میں سلاہور جانا تھا کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس کے لئے کیا وجہ؟ قراردی جاسکتا ہے؟ اس پر پوری کتنی صاحب نے غور نہیں کیا پس جہاں میں کڈ بچوڑ کہ ارادہ فعل کے اظہار کا موقع ہو تو اس قسم کے جملے استعمال کر لینے کو مستحق میں شمار کرنا چاہئے، ہر پہلو سے مناسب ہے۔ اس مولانا ساکب اور پندت کتنی کے بیانات کے مقابل میں غلطی کے وجہ ملاحظہ فرمائیے۔

جانا، لکھنا، پڑھنا مکرنا وغیرہ فعل نہیں ہیں بلکہ مصدر بھی اور مصدر ام ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا استعمال اسم کے مطابق ہونا چاہئے۔ اسم جملہ فعلیہ میں فاعل اور مفعول ہوتا ہے اور جملہ اسمیہ میں مبتدا اور خبر۔ جملہ فعلیہ میں مصدر الیہ اسم اور مصدر فعل ہوتا ہے جیسے احمد آیا، رشید خط لکھتا ہے۔ جملہ اسمیہ میں مصدر اور مصدر الیہ دونوں اسم ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ فعل ناقص مل کر جملہ کی تکمیل کرتا ہے۔ جیسے رشید وہیں ہے۔ احمد کو بخار ہے وغیرہ۔ میں نے لاہور جانا ہے“ جملہ فعلیہ اس لئے نہیں کہ جانا ہے“ جو مصدر ہے فعل نہیں ہے بلکہ ”جانا“ مصدر (اسم) اور ”ہے“ فعل ناقص۔ پس ”نے“ علامت فاعل کو بغیر فعل کے استعمال کرنا غلط ہے۔ لہذا یہ جملہ فعلیہ نہیں بلکہ جملہ اسمیہ ہے۔ جملہ اسمیہ کے لئے اصول مسلمہ ہے کہ علامت فاعل ”نے“ استعمال نہیں ہوتی بلکہ علامت مفعول ”کو“ استعمال ہوتی ہے۔ جیسے رشید کو کھانسی ہے ضمیر فاعلی تھا تو استعمال کر لیتے ہیں جیسے میں خوش ہوں“ تو غلط ہے، تم کا میل ہو“ وغیرہ ”گرنے“ کے ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ البتہ ضمیر مفعولی ہوتی ہے۔ جیسے مجھے کتاب کی ضرورت ہے۔ تجھے دو اپنی ہے وغیرہ۔ پس میں نے لاہور جانا ہے“ اصول مذکورہ کی روشنی میں غلط ہوا۔ اس کی جگہ مجھے لاہور جانا ہے“ درست ہے۔ اساتذہ اسی طرح غلطی کو کرتے آئے ہیں، مومن اور غالب کے یہاں شاعری

کوئے دشمن میں جا پڑتا کیوں کیا مجھے شرمسار ہوتا تھا؛
جملہ بے خودی سے ہے مومن توڑنا ہم کو شیشہ مثل کا
دائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو آپ جانا اور ادب ہی حیراں ہونا

علمی اصطلاحات کے اردو ترجمے

(لسانی اصطلاحات کی روشنی میں)

ڈاکٹر شکیلہ سبزواری

اصطلاح ہے۔ تحلیل زبان کا عام لفظ ہے۔ تلفظ، کلمہ، مجموعہ، مجموعہ، اصطلاحیں ہیں۔ ان کے لفظی معانی ان کے اصطلاحی معنوں سے مختلف ہیں۔ تقسیم یا معنی، انحراف، ترمیم، تحریر، ترسیل، اولی، ثانوی، جز، عمل عام استعمال ہونے والے الفاظ ہیں۔

مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں میں فرق کرنا ازیں ضروری ہے۔ تاکہ ایک فن کی اصطلاحیں دوسرے فن کی اصطلاحوں میں گڈمڈ ہونے نہ پائیں۔ مثلاً تمثیل (ALLEGORY) منطق کی اصطلاح ہے۔ قوس (SEGMENT) اساس یا قاعدہ (BASE) ریاضیات کی اور استعارہ (METAPHOR) علم بیان کی۔ انہیں لسانیات کی اصطلاحات میں شامل ہونا نہ چاہئے۔ صوتیات، اشتقاقیات، معنویات، صرف و نحو لسانیات کے اہم بنیادی شعبے ہیں۔ تحریر یا رسم خط کا بھی کچھ تعلق لسانیات سے ہے۔ ان علوم و فنون کی اصطلاحات کو فرہنگ اصطلاحات لسانیات میں جگہ دی جاسکتی ہے۔

اصطلاح کی تشریح و تعیین کے بعد ترجمہ کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ترجمے میں کس زبان سے مدد لی جائے؟ کراچی پونی درستی کے شعبہ ترجمہ کے فاضل ارکان کی رائے ہے:

”اصطلاح سازی میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور ان تمام زبانوں سے مدد لی جائے جو ہماری زبان کا جز ہیں۔“

علمی اور فنی اصطلاحوں کا اردو میں ترجمہ کرنے سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہئے کہ اصطلاح کسے کہتے ہیں اور اس کے کیا معنی ہیں۔ تاکہ سب (ALL) بعض (SOME) اور دلچسپی (INTEREST) جیسے زبان کے عام الفاظ اور وزانہ بات چیت میں ہر تہ جائے، قہر کی تحریر تصنیف میں جگہ پالتے اور ہر مقام پر ان کے وہی ایک معنی مراد لئے جاتے ہیں، فرہنگ اصطلاحات میں شامل ہونے نہ پائیں۔ اصطلاح کے لفظی معنی ہیں اتفاق لیکن عرف عام میں وہ مصطلح یعنی متفق علیہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ہم اصطلاح اس لفظ کو کہتے ہیں جس کے کسی خاص علم فن میں لغوی معنی سے الگ کوئی مناسب معنی، یا عام اور متعدد معانی میں سے کوئی ایک معنی متعین کر لئے جائیں، اور اس علم و فن کی متداول کتابوں میں وہ لفظ اپنے اس مخصوص معنی میں عام طور سے مستعمل ہو۔ مثلاً ”حرف“ کے معنی ہیں ”کنارہ“۔ گرامر میں حرف ایک کلمہ ہے جس کے معنی مستقل نہ ہوں۔ ”تہ“ کے معنی ہیں ”جائنا اور سمجھنا۔“ دینیات میں فقہ دین یا شریعت کا جائزہ ہے۔ لغت میں یہ لفظ عام تھا۔ اصطلاح میں خاص کر لیا گیا۔

ہونٹ، دانت، تالو، مسوڑھا، حلق، حنجرہ وغیرہ الفاظ کو لسانیاتی اصطلاحات میں شامل نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ یہ زبان کے عام الفاظ ہیں۔ دل چاہ میں ان کے وہی معنی ہیں جو علم الاعضاء و تشویش اجسام میں ہیں۔ ”لہوی“ ایک آواز ہے جو ”لہا“ یعنی گتے کی مدد سے ادا ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح ہے۔ ”خود لہا“ کوئی اصطلاح نہیں۔ اسی طرح تحلیل

لے ملاحظہ فرمائیں زبان و علم زبان کا شعبہ اصطلاحات اس مقالے میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ تمام فرہنگ اصطلاحات فلسفہ اور جمہور اصطلاحات سے ماخوذ ہیں۔

لے ملاحظہ فرمائیں فرہنگ اصطلاحات فلسفہ شائع کردہ شعبہ تالیف و ترجمہ کراچی پونی درستی۔

اور پیچھے نہ پائیں گے۔ جیسے،

اجنسیائی (۱ + جنس + یا ئی) باز و صرائی (باز + دھراؤئی)
چکرا اصوات (چکرا + اصوات) بصوت نامت (صوت + تانت)
مورت نگاری (مورت + نگار + ی) "اھکاری (۱ + اھکار + ی)
کراچی یونیورسٹی کے ارکان شعبہ ترجمہ و تالیف نے ایک طرف
یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اصطلاح زبان اور فن کے لحاظ سے موزوں ہو۔
دوسری طرف یہ فرماتے ہیں:

فصاحت ہو تو ہندی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی کا جو راور
سابقہ لاحقہ لگائے جائیں۔

سوال یہ ہے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی جوڑنے کے بعد
کیا کوئی اصطلاح زبان کے لحاظ سے موزوں ہو سکتی ہے؟

انسان کی طرح زبان کا بھی مزاج ہوتا ہے جس کا وضع اصطلاحات
کے وقت بہر حال خیال رکھنا چاہئے۔ عام لول چال کے الفاظ پر
تو کسی کا اجارہ نہیں۔ جو لفظ عوام کی نگہ سال سے چل نکادہ رائج آؤ
سکہ ہے۔ اصطلاح سازی البتہ اہل علم کا کام ہے۔ یہ ان کے اختیار
میں ہے کہ وہ زبان کے مزاج و مہاج کی مناسبت سے اصطلاحیں
وضع کریں۔ اصطلاح میں جو عظمت اور ایک طرح کی گمبیرا ہوتی ہے
اس کا تقاضا ہے کہ اصطلاحی الفاظ صحتی لحاظ سے موزوں، قواعد زبان
کے مطابق، بناوٹ میں بھاری بھر کم اور دلالت معنی کی رو سے مناسب
ہوں۔ بہر چند فارسی الفاظ کے آخر میں نسبت کی "ی" لاحق کر کے تھوڑی
بزاری جیسے الفاظ عام طور سے اردو میں وضع کئے جاتے رہے ہیں لیکن
مستند علمی زبان میں فارسی الفاظ پر ایسے نسبت کا اضافہ ثقافت
کے خلاف ہے۔ جیسے خدی (خود + ی)، پہلوی (پہلو + ی)، لہی (لہ + ی)

دوبلی (دو + لب + ی) وغیرہ۔ اور ان وضع کردہ الفاظ پر عربی کی
"ہ" داخل کرنا یا حدیث ہندی الفاظ پر "ی" بڑھانا ایسا ہے جیسے کرنا
اور نیم چڑھا مثلاً جوڑا جوڑی رجڑا + جوڑ + ی) تالوی (تالو + ی) دانت
بیٹھکی (دانت + میٹھک + ی) تالویہ (تالو + ی + ہ) خرمیت (خرم + ی + ہ)
عربی سے لی جاتے یا فارسی سے اصطلاح کو کم سے کم زبان کے
صرفی عمومی قاعدوں کے مطابق ہونا چاہئے۔ لہا (= کو) (ہلڑی)
معنی (= مفہوم) عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ عربی گرامر کے مطابق لہا
سے اسم منسوب "لہوی" بنتا ہے۔ لہا "ی" غلط ہے۔ حق سے حقیقت

سنسکرت سے مدد لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سنسکرت
ہماری علمی زبان نہیں۔ ہم سنسکرت نہیں بلتے۔ ہماری زبان سنسکرت
کے تہذیبی مزاج اور اداس کی سرشت سے نا آشنا ہے۔ سنسکرت کے ترجمے
ہمارے یہاں دس دس دس کیے گئے بغیر منقسم ہندوستان میں اردو کی
گزشتہ سات سو سال کی تاریخ میں سنسکرت کے علمی و تہذیبی الفاظ اردو
کو سازگار نہ ہوئے تو پاکستان میں سنسکرت زبان کی علمی اصطلاحیں
کس طرح اردو میں جڑ پکڑ سکیں گی۔ فارسی سے البتہ مدد لی جاسکتی ہے
لیکن فارسی برصغیر کے مسلمان کی تہذیبی زبان رہی ہے علمی اصطلاحات
کے بار کی شاید ہی وہ مشتمل ہو۔ علمی زبان کے لئے محسن نوع کی ثقافت،
سنجیدگی، متانت اور بھاری بھر کم پر درکار ہے وہ صرف عربی میں ہے۔
عربی دنیا نے اسلام کی علمی زبان ہے۔ ہر خطے کے مسلمان نے اس سے
استفادہ کیا اور اس کے علمی ذخیروں سے فیض اٹھایا۔ اردو کے لئے
عربی کی وہی حیثیت ہے جو انگریزی کے لئے لاطینی کی ہے۔ اردو میں عربی
کے سوا کسی اور زبان کے اصطلاحی الفاظ کے رچنے بچنے اور گھل مل جانے
کی گنجائش مجھے نظر نہیں آتی۔ دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں۔

"LANGUAGE" کا ترجمہ زبان خاصا بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن
"LINGUISTIC" کا ترجمہ زبانی (بجائے لسانی) شاید ہی پسند
کیا جائے۔ "DENTAL" کا ترجمہ "سنائی" دندان سے زیادہ ثقہ اور
"LATERAL" کا ترجمہ "مخوف" (= حرف یعنی پہلو کی طرف مائل) پہلوئی
سے زیادہ یا معنی اور پر وقار ہے۔

گردان، بولی، وغیرہ فارسی ہندی ترجمے اردو میں رائج ہو چکے
ہیں۔ یہ باقی رکھے جاسکتے ہیں۔ فارسی اردو کے رائج ترجموں کو چھوڑ کر باقی
تمام اصطلاحات کے ترجمے عربی کی مدد سے ہونے چاہئیں۔

اس سلسلے کا ایک اور رجحان جسے غیر منقسم ہندوستان میں
ہمگ دبار لانے کا زیادہ موقع ملا ہے یہ ہے کہ عربی ہندی یا فارسی ہندی
کے میل ملاپ سے اصطلاحیں وضع کر کے الفاظ و اصطلاحات کی گویا
مستند قومیت کا ڈول ڈالا جائے۔ یہ رجحان علمی اور ادبی نقطہ نگاہ سے
مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لفظوں کو جوڑنے اور دو مختلف زبانوں
کے الفاظ میں پیوند لگانے کے لئے ان میں صوتی مناسبت اور ایک طرح
فرمانی ہم آہنگی ہونی چاہئے تاکہ مرکب الفاظ گھل مل کر ایک ہو جائیں
اور زبان پر بار اور کانون کو ناگوار نہ ہوں۔ انمل جڑے جوڑ ہوں گے،

DEDUCTION اور METAPHYSICS اپنی اپنی جگہ واضح ہوں تو اس کی ضرورت نہیں کہ METAPHYSICAL DEDUCTION کا ترجمہ بتایا جائے یا DEDUCTION اور CATEGORY کے ترجمے کے بعد DEDUCTION OF CATEGORY کا ترجمہ کر کے ہندی کی چندی کی جائے۔ یہ طویل لاطالی ہی نہیں تحصیل حاصل بھی ہے۔

فرسنگ اصطلاحات میں درز کا قانون، گوم کا قانون، گراس میں قانون، قانون ہار، جالینوس کی شکل جیسی ترکیبیں نظر آتی ہیں تو حیرت دلزا دامن کو کھینچتی ہے کہ خدا یا ایہ کس قسم کے ترجمے میں اور ان کا اصطلاح سا سے کیا تعلق ہے! قانون اور شکل کا ترجمہ کرنے کے بعد یہ کیا ضرورت تھا کہ درز، گوم، گراس میں، ہار اور جالینوس وغیرہ علمائے فن کے ناموں کا طرف اضافت کہے بتایا جائے کہ اس طرح مرکبات بناؤ۔

غیر ضروری مرکبات کے ترجموں کی کچھ اور مثالیں فرہنگ اصطلاح فلسفہ و لسانیات سے انتخاب کر کے لکھی جا رہی ہیں،

فلسفہ لغت، فلسفہ قانون، لغت سائنس، منطقی تجربیت، معروضی اخلاقیات، آلائی قدر، ادراکی تصویریت، ادراکی فلسفہ، ادراکی ثبوت، منطقی نحو، ترکیبی حکم، تجربی صورتیات، صوتی جدول، کلام کا مہاؤ گولایا ہوا مصوتہ، بند مصوتہ، کھلا مصوتہ، مصوتہ کی تدریج، مصوتہ کی ہم آہنگی، وسطی مصوتہ، ہم جملی مرکب، جوڑا جوڑی مرکب، تاریخی لسانیات، تقابلی لسانیات، توضیحی لسانیات، موسیقانہ (موسیقینانہ) الجہ۔

یہ درست ہے کہ فن کی جو اصطلاحیں قدیم سے رائج چلی آ رہی ہیں انہیں برقرار رکھا جائے۔ لیکن ان میں موزوں و ناموزوں اور مفید غیر مفید کی تفریق مناسب نہیں۔ قدیم سے جو اصطلاحیں چلی آ رہی ہیں فن کا تبادلہ میں عموماً برتی جاتی ہیں، اور زبان میں اچھی طرح رس بس گئی ہیں وہ عموماً ہی نہیں مفید بھی ہیں، زبان میں گھل مل گئی ہیں اس لئے موزوں ہیں ہر شخص آسانی کے ساتھ ان کا مطلب سمجھ لیتا ہے اس لئے مفید ہیں، موزونیت و افادیت کا معیار یہ ہے کہ اصطلاح زبان میں گھل مل کر اس جز میں جلتے اور اس کا مفہوم سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت پیش نہ آئے مثلاً NASAL کا ترجمہ غنہ اردو میں عام ہے ہر شخص اسے جانتا ہے۔ "الغنی" مقابلے میں یہ موزوں بھی ہے۔ اور مفید بھی NASALISCAL کو غنہ کہیں گے۔ "الغنی" ناماؤس ہے۔ LATERAL طوطیوں کا ترجمہ دہائی صفحہ ۱۴۰ پر

(حق + ی + ہ) تو ہو سکتا ہے "حققت" درست نہیں۔ معنی کی طرف نسبت کی جائے تو معنوی بنے گا اور اس پر "ات" بڑھا کر معنویات (SEMANTIC) کہیں گے۔ معنیات (معنی + ات) بھی بہت سے معنی بے محل بھی ہیں اور بے معنی بھی۔ "حد کبریٰ" اور "حد صغریٰ" قواعد نحو کے اعتبار سے غلط ہے۔ حد کبر اور حد اصغر چاہئے۔ فنون صغیر کی جگہ "فنون صغیر" صحیح ہے۔

اصطلاحات عموماً مفرد ہوتی ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو مفرد اصطلاح کا ترجمہ مفرد لفظ سے کیا جائے۔ مرکب اصطلاحیں بھی ہیں لیکن کم۔ یہ دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جنہیں آسانی کے ساتھ ایک لفظ میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ انہیں ایک سے زیادہ لفظوں میں منتقل کرنا درست نہیں خصوصیت سے اس صورت میں کہ ان کے ہم معنی مفرد اصطلاحیں پہلے سے رائج ہوں جیسے: MINOR PREMISE، MAJOR PREMISE یا

MAJOR TERM اور MINOR TERM پہلی دو اصطلاحوں کا ترجمہ مقدمہ کبریٰ اور مقدمہ صغریٰ کی جگہ صرف کبریٰ، صغریٰ اور بعد کی اصطلاحوں کا کبر (دیکھائے) حد کبر (اصغر) دیکھائے حد اصغر (بڑھائے) حد اصغر ہونا چاہئے۔ جن اصحاب نے عربی زبان میں منطق پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ منطق کی متداول کتابوں میں صغریٰ، کبریٰ، اصغر، اکبر وغیرہ اصطلاحیں عام طور سے استعمال ہوتی ہیں۔ حد وسط کو اہلیت تھا اور وسط نہیں کہتے اس لئے MIDDLE TERM کا ترجمہ حد وسط ہو سکتا ہے۔ کچھ مرکب اصطلاحیں ایسی بھی ہیں جنہیں ایک لفظ میں آسانی منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے: PHONETIC، VOCAL، DECAY وغیرہ۔ انہیں مناسب مرکبات کی شکل میں منتقل کیا جائے۔

ان کے علاوہ جن مرکبات کو اصطلاح کی حیثیت حاصل نہیں ان کے اجزا کا اولاً الگ الگ ترجمہ کرنا اور پھر جوڑ کر بصورت ترکیب اردو میں منتقل کرنا طویل لاطالی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مفردات یعنی اجزا کا ترجمہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد فارسی کی ذہانت پر اعتماد ہو جب اس کے سامنے دو لفظوں کا کوئی جوڑ آئے تو حسب ضرورت زبان کے مقررہ قاعدوں کے مطابق اسی قسم کا ایک مرکب و حال لے مثلاً LAW اور POLARITY کا ترجمہ اگر فارسی کو معلوم ہے تو LAW OF PLANTY کے ترجمے کی ضرورت نہیں PHONETIC کے معنی بتا دئے جائیں تو PHONETIC CHANGE کا مطلب نکالا جاسکتا ہے۔

نوائے دوش

(رے باہل معنی ہمنشین ہامش)

جمیل نقوی

خوشتر کوں باشندہ مژدلیوں - گفتہ آید دوحیث دگرال - یہ مژدلیوں - نوائے دوش - کہ چاہی میں ارم محمد علی قطب شاہ کے مکتب پر عید گیلانی
یعنی میں شام ہریکا راستہ کھنکھائی لڑائی میں پیش کیا گیا تھا۔

سلام اے ترکاں، بھاگیہ نگر کے خسرو بانی
ترے سر تاج زرتھا، بہت میں انگشت سلیمانی
محمد قطب شہ، قطب معانی، ظل سبحانی
او شعراں کوں ٹرس بھی چلیکیاں ہو محمد نڈاں سو
ان اشعار کو چوتھیں شعر جو ہمیں کچھ محض داز سے
ہوا تھا سب کشف تہنا کتا باں بوجھتے حق تھے
معین ہو رہو دود مشک و زعفران بچ رویت پایا تھا
اچھوں دن دن مبارک عید تل تل جشن سب راتاں
محمد کا غلامی بچ خطاب سر بندی تھا
وے جیون دھرت پٹھانے ہیں لیا کے قدیاں مرگ سو
نقارہ بچے زبیر پٹھانے ہیں لیا کے قدیاں مرگ سو
چمک تھے تیری مجلس کی سورج، چند اختران حیران
ملائک نور در سن کے، محلاں باند درپن کے
ننمی، لالں، پیاری، ساوئی، کنوئی، سجن حیدر
چرن سرخوش، چلن سرخوش، ہلن سرخوش، ڈلن سرخوش
پندم سرخوش، چلن سرخوش، ہلن سرخوش، ڈلن سرخوش
دیسے خانوس کے درمیان تھے جوں جوت دلہے کا
تھرائے

کہ بچ دربار کے نقشاں میں حیران تھا مانی
ترے قدر پر بہا تا تھا شہا جلا عروسانی
ازل تھے بچ کوں بخش تھا خدا لے شعر سلطانی
تمارے وصف کہنے تھے ہوا بچ منکر نورانی
سبق لینے کو آداں تا سنگل ملاں دبستانی
اسی تھے باس تیرا جگ میں کرتا تھا گلستانی
خدا تاج بخت دولت کا دیا تھا بخت شامانی
ترے سر پر دے بچ کوں چھلا جھل تلج سلطانی
بلندی تیرے محلاں کی انہر کی لوح پیشانی
چلن پگ پگ بھولیا، خوشیاں دیکھت گردن گردانی
دیکھت تال فرش رتن کئے کئے کھن گواہ افشانی
عجب پایا تھا سکیمیاں چند رکھ، نس کیس، لاشانی
پنکھی جیواں کے مرغولیں دیکھت چل بل اوستانی
دکھن کی سندریاں کے نیچ کیا جب جلوہ ارزانی

مزاکت شعر کے فن میں خدا بخشا تھا توں تاج کون

معانی شعر تیرے کہ یا ہے شعر خاقانی

بدستِ جبا

”نصیحتِ کثرت، یادگیر و در عمل آرزو“
(مہدِ پاکستان کا اسبابِ قلم کو پیغام)

میں گلڈ کے چوتھے سالانہ اجلاس کے لئے، جو لاہور میں منعقد ہو رہا ہے، اپنے دلی جذباتِ تبریک پیش کرتا ہوں۔

گلڈ کے نام میرے سابقہ بیخامات اور اُس کی عملی اعانت اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ مجھے آپ حضرات کی فکری و فنی سرگرمیوں اور پروگراموں سے کس قدر گہری ذاتی دلچسپی ہے، بالخصوص اس امر سے کہ آپ کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل رہے۔ اس لئے میں یہاں اب اُن امور کو دہرانا نہیں چاہتا۔

نظریۂ پاکستان کو بنیاد ٹھہرائے ہوئے ہم کس طرح آپس میں پوری پوری یکجہتی پیدا کریں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہم بدستور دوچار ہیں۔ خبر نہیں وہ لوگ جن کا اس معاملہ سے سروکار ہے، اس مقصد کو جلد از جلد حاصل کرنے کے لئے واقعی پوری پوری کوشش عمل میں لارہے ہیں یا نہیں۔ بہرِ نوع، اس باب میں اہل قلم پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آج ہم گونا گوں معاشری خرابیوں سے بھی دوچار ہیں، جن کو محض قانون کے زور سے دور کرنا ممکن نہیں۔ ان کی وسیع پیمانہ پر بیکینی کی ذمہ داری بھی آپ لوگوں ہی پر عائد ہوتی ہے۔

ہمیں آئندہ نسلوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہئے کہ ایک آزاد اور عظیم قوم کو تعمیر و ترقی کا کیسا عمدہ موقع ہاتھ آیا اور اس نے اُسے کھو دیا۔ آپ لوگوں کے ہاتھ میں تاریخ کو مونوں سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک زبردست آلہ موجود ہے۔ آپ کا قلم — اسے سب سے پہلے اپنے وطنِ عزیز کی خاطر کام میں لائیے۔

کیسے؟ یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

آپ حضرات کو ہمیشہ میرا کامل تعاون حاصل رہے گا۔

ہدیہ گرامی : وزیر اعظم لبنان، ہذا کیلنسی رسید کرا
کی طرف سے صدر پاکستان کی خدمت
قرآن مجید کے ایک نادر نسخہ کی پیشکش



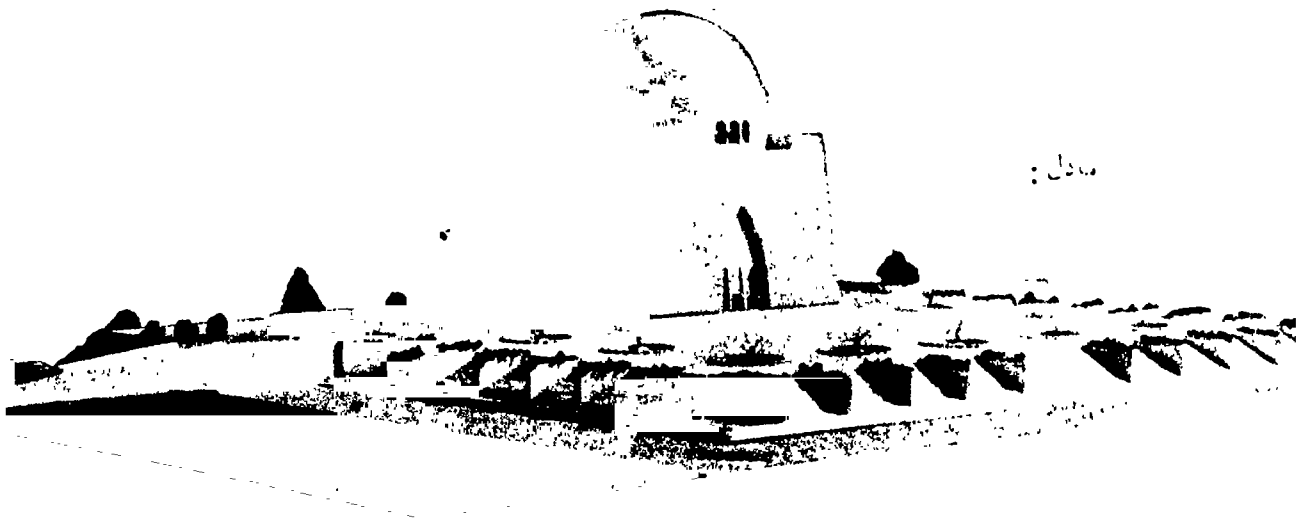
ترقی تعلیم : جامعہ تعلیم ملی (ملیر، کراچی) کے
دسویں سالانہ اجلاس سے خطاب



! نالستانی فضائیہ کے کالج (رسالہ بور)
میں تکمیل تربیت کی بریل

ترقیات : سیدو شریف (سوات) میں ترقیاتی منصوبوں کا جائزہ



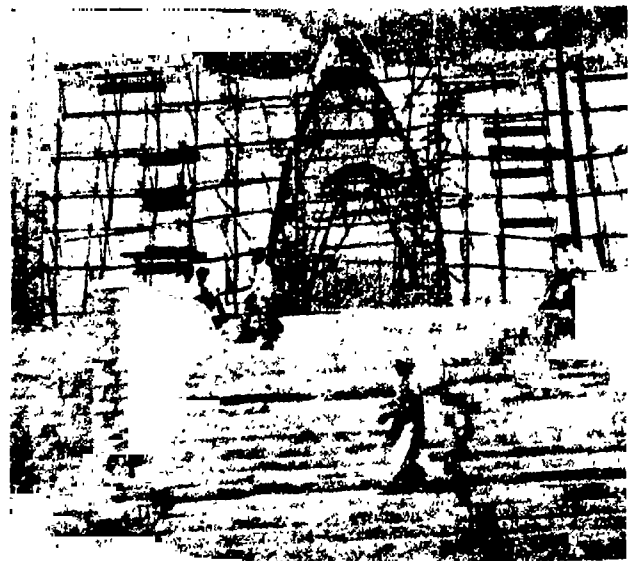
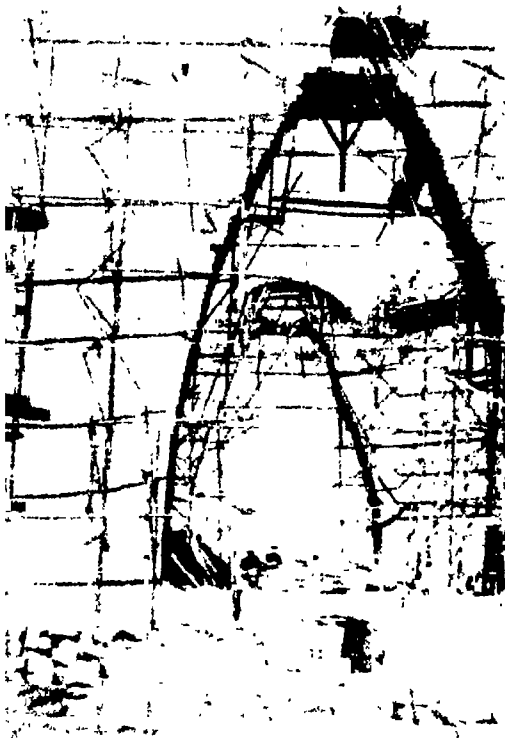
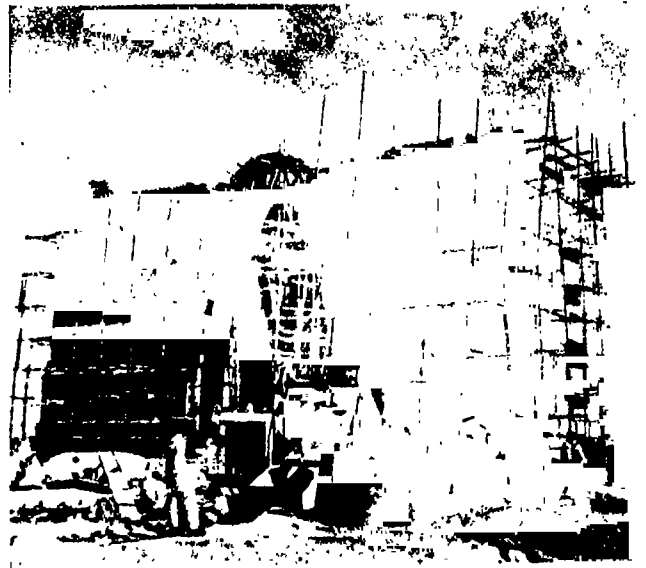


مساجد :

قائد اعظم رح کا مقبرہ

رفتار تعمیر : چند پہلو

قائد اعظم رح ۵ منبرہ جدید اسلامی عمارت اور
جدید فنی تقاضوں کے مطابق تعمیر ہو رہا ہے
اور غنیمت نا ٹیکہ ملی کیو بہتج جائے گا۔



بہارتازہ

(انجمن مصنفین پاکستان، چوتھا اجلاس : لاہور)

صدر اجلاس دوم : جسٹس سجاد احمد خان

پیغام خصوصی : صدر پاکستان، فیڈرل مارشل محمد ایوب خان

اہم نکات : صدر پاکستان :

— ادیب کی ذمہ داریاں اہم ہیں۔

— ادیب تاریخ گر ہیں۔

— ادیبوں کو اپنا قلم ملک کی شیرازہ بندی، اصلاح مٹا سولہویہ وقت کے کاموں کے لئے نہیں چاہئے۔

— صدر اجلاس : ادیب ایسی چیزیں لکھیں جنہیں پڑھ کر دل میں حب الوطنی کا احساس اور اپنی ثقافت سے لگاؤ پیدا ہو۔

— اہل ثروت کو چاہئے کہ وہ آگے بڑھ کر ادب کی سرپرستی کریں۔

— قلت اللہ شہاب : گلڈ کی ترقی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اختلافات کو نظر انداز کر کے ہر لوگوں پر اتحاد عین ممکن ہے۔

— گلڈ نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان فکری و جذباتی اتحاد و یکجہالت پیدا کر دی ہے۔

— ملک میں عنقریب کاپی رائٹ ایکٹ نافذ کر دیا جائے گا جو ہمارے اہل قلم کے تمام جائز حقوق کی بوجہ احسن اور ٹیسٹوں پر حفاظت کرے گا۔

آدم جی ادبی العالم : اردو : جعفر طاہر (نظم) "ہفت کشور" خدیجہ مستور (ناول) "آگن"

بنگالی : قاضی عبدالمنان : "بنگلا ادب کا تنقیدی جائزہ اور مسلمان"۔

شوکت عثمان : (ناول) "کرناد اسرہاسی"

علاقائی زبانیں : (پنجابی) سائیں فیروز دین

محمد آصف خان

افضل احسن

جج : احمد ندیم قاسمی

رضا ہمدانی

منو بھائی

ایک اور ادبی افہام : عطیہ : جناب احمد داؤد (صدر داؤد صنعتی گروپ)

۱۹۶۳ء : (پچیس ہزار روپے سالانہ برائے ادب، مشرقی و مغربی پاکستان)

جس سے وہ نسبتاً حقیقت روشن، وہ سنجوگ

موئے قلم، عکاس؟ —

مومے قلم اک سنبلیں جادہ
 ریشے ہزاروں کائی کائی
 کرفوں سے باریک، ہمائی
 نارنجی فانوس فضائی
 لمبے اشراقی، سینائی

یہ بال کشنہرے پن کی لگن
کیا بھگتی بھگتی یوگ آسن
کیا چلے، نڈ چالیس ہرس
جیون پاسے شمع ہرودش
جیوتی ہی جیوتی من در پن
سب جگ گیا جگیا تن کیا من

بہوں برسوں بیت وصال
 یہی دھیان، ہو گیاں اور گن کا دھن
 یونہی پشت میں اک اوندھا مہرا
 بنا، مورتے ہوتے دیب کنول

ہر اک پتی ہوئے ہوئے
ززل ززل، سنگی سنگی

ہر ایک کنول گد را گد را

لٹ چنچل چنچل جرتی سی

اک لال بیھوکا روپ کنول
تیکھی مخروطی دھکتی لوہیں
ایسی شدھ رنگ ہر اک پتی

اک شعیبہ سنہرے پن میں رچی

رشت خور، کرومی، کچناری

سب بانگی سنہری مدھ ماتی

پتی پتی مدر مدر

آن بہ آن اور حکام بہ حکام

برق چمکا ہیں ان فیاض کار

پھیلائی ہوئی دامن پہ دامن!

نزدی دیتی ، دھوپ سرپ

فل کی بالو، سنہری روپ

کندن کی گنتا و ہک

پت جھڑکے سولائے پتے

رہنے سنہری تار لفظ

سنگاپور کی بید کے نیلے شفق سنہری لہریں دکھائی دیتی ہیں۔

سحر کھڑیاں مہربانی، چھل چھل ڈوریاں نغمیاں لہروں کی

ذری کرسمے تانتا تانتا

چکنی تلے ہال برابر کندھک میں سو شوب دے

جاپانی در تمار سیدیہوں کی زرکاری کرن کرن

درد و دوزی چھے روغن کے

موم سفیدہ نارنجی

مانند تریج پرویزی

پیلہ ریشم، پروالے۔ کھل سنہرا محل محل

دریغ جوہر لخواہی

عَلَيْهِ ذَاكَ مَا رَأَيْتَنِي

اب سٹہری، ماب سٹیلی

ریت پر ریتی ریتی جوتی بل کھانی پڑھتی ہے

ایسی پالی میرے اسی

میں نے کہا کہ میں اس کے لئے تیار ہوں۔

[illegible]

لکھن چاند۔ سہری سی لی باریک ہلا میں مومیں
تو لکھن چاند کے لکھن چاند کے لکھن چاند کے

یونی ہیرو، کاسپسائی اس کی ہوا سیال: جو مہری راہ

کے سٹا میں اسٹوری، ماب بہ ماب

مسجد جامع کهنه کهنه

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عقل جبرجے لانا ہی، جس میں رنگ ملاس

وہ پورے روپ کے رنگ سے ال ایسا مٹا رہا

نہ سے روسی کے قہقہے اسی برس سے ملے یا میری

مرغولہ، آتش رنگ ابھرا
آن انگ برنجی انگارہ
ہر انگ نرت مدرا مدرا
نورانی پنچھی پر کھولے
کرنیں ہی کرئیں پر تولے
اور جھاڑ ہی جھاڑ ہمسکڑا سا
چندھیانا کاٹن سینائی
وہ آن اک آن اک پوپر پوپر
پھٹتی — جوتی ٹہنی ٹہنی
ہراتی، تلتی، جسکتی ہوئی
بل کھائے، پھرے اہلی گہلی
مہاجال طلسمی پھیلاتی !

اب ٹکڑ ہوا ہے کیسا سے کیسا
اب نور ہی نور ہے، نور ہی نور
یہ ہاتھ، یہ ہاتھ، یہ فن ہی فن
استاد جگت استادوں کے
فن کار ہیں جو فن کاروں کے
”کھل سم سم“ جن کی پوروں کی
اک عام فوائے سحرنا

ان ہاتھوں کے پاس یہ — نور ہی نور — اب آنکھوں میں
اور — دور ہی دور، اب دور ہی دور! — اب آنکھوں سے

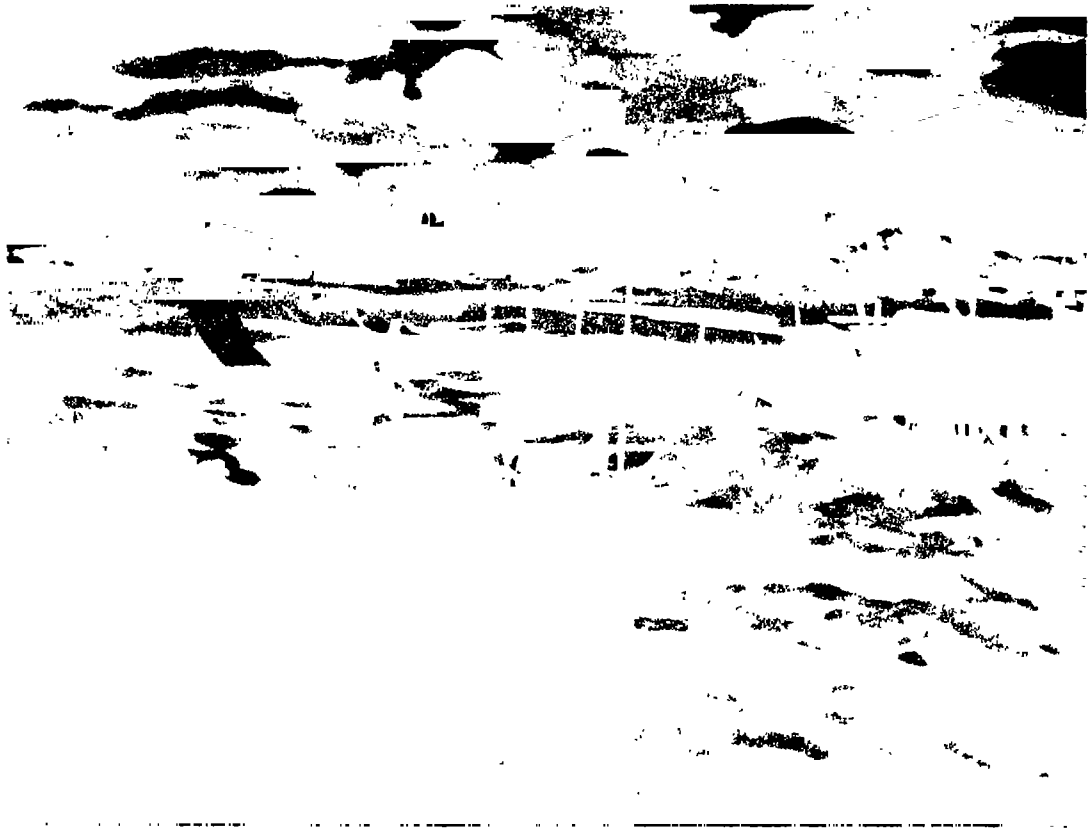
جو بال سنہری پن کی لگن
دہی بال رو پہلے پن کی لگن
اب ہاتھ نہیں سپنے تو ہیں
اب آنکھیں نہیں ہیں دل تو ہے
اے ذوقِ نظر، اے ذوقِ طلب
اے ذوقِ نور، اے جذبہ فن !

★

ہر کنول کٹورا روپ بہرا
لو، اور کٹوڑے، اور کنول !
ہر لمحہ ہر ہر آن سپھل
کھلی پتی پتی کھاڈ زباں
فانوسوں کی شمع ہی شمع دویں
ہراوندھا مہرا، شبہ تارا
یوں سلسلہ دار اوپر نیچے
سب برفت آلود چنار کھڑے
جھیلوں میں روپ دکھاتے ہوئے
چندن کے گلوڑا چاندنی میں
تاوں میں دوالی سی چسایا۔
یونہی کلا دھیان میں جگ پر جگ
تب کلا کا جاکر درس ملا
تب کلا کا پورا روپ کھلا
جاگ اٹھا جسا دو سپنے کا
برسوں میں ریاض کے گلشن میں
نکل تاب سنہری پھول کھلا
دیکھ کا الاؤ طور نما

وہ بال سنہرے پن کی لگن
دن دی بڑھتی چمن چمن پڑھتی
دہی بال رو پہلے پن کی دھن
ہر آن بھڑکتی اور لگن

اب آخر کار — اب آخر کار
وہ رنگ بستا، وہ روپ کھلا
سانچے میں ڈھلا پستلا دل کا
سیارہ بجلی کی صورت
وہ جس کا روپ سنا بڑتی
سیمائے افق پر کوند گیا



نقاش : شعیب احمد

” نو ۵ ” (مشرقی پاکستان)

مسجد نبوی

(تعمیر و مساجد کی مقدس ابتدا)

ٹھاکر محمد عبد اللہ چغتائی

بیہ فرض، لوگوں کی نظروں سے بچ کر ادا کرتے تھے حضور اکرم کے اہل بیت اور خاندانِ نبویؑ
ابن عباسؓ متوفی ۲۱۳ھ سے منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا
تو اسلام کی قوت اور جلالت میں اضافہ ہوا۔ پھر جماعت نماز
خانہ کعبہ کے نزدیک ادا کرنی شروع کر دی۔

جب مکہ کے کفار کا ظلم مسلمانوں پر زیادہ بڑھ گیا تو حضورؐ نے
اللہ کے دین کی بقا و تبلیغ حق کے لئے مدینہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا۔ یہ
کی ہجرت سے قبل حضور اکرمؐ نے یثرب کے لوگوں سے ایک معاہدہ بھی
کیا تھا۔ بعد میں یہی یثرب مدینۃ النبیؐ یا صرف مدینہ مشہور ہوا۔

جب ہاجرین اسلام کا پہلا قائد انہوں پر سوار مکہ سے نکل کر
مدینہ کی جانب روانہ ہوا تو مدینے سے باہر قبائک کے مقام پر اس کا پڑا ہوا۔
یہ قیام بنو عمرو بن عوف (قبیلہ) کے ہاں ہوا اور پھر سے جمعرات تک جا کر
رہا۔ اس مختصر قیام کے دوران حضورؐ نے اسلام کی سب سے پہلی مسجد
اسی جگہ بنائی حضورؐ نے ہی اپنے مقدس ہاتھوں سے اس مسجد کا سنگ بنیاد
رکھا اور سمت قبلہ، بیت المقدس کی طرف قائم کی، حضرت نے یہاں
جمعرات تک چار دن قیام فرمایا اور یہیں نمازیں ادا کیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا حضور کا یہ قیام قبیلہ بنو عمروؓ میں ہوا تھا یعنی
کلثومؓ (بہنہ ہرم) کے گھر پر اور مجلس سعد بن خثیمہ کے گھر پر ملتے تھے۔

جمعہ کے روز صبح آنحضرتؐ نے دو پہر سے قبل قبا سے مدینہ کی
طرف روانہ کی شروع کی اور عین نماز ظہر کے وقت وادی راؤن پہنچ گئے جہاں
”بنی سالم بن عوف“ کی مسجد میں نماز جمعہ ادا فرمائی۔ یہ مسجد اس قبیلہ کے
مسجد قبلہ کے نمونہ پر پہلے ہی ان دنوں میں تیار کر لی تھی۔ اسلام میں یہ پہلی
نماز جمعہ تھی جو حضورؐ نے حدود مدینہ میں ادا فرمائی اور غالباً غیر کسی
خطبے کے آنحضرتؐ نے جب اس وادی سے خاص مدینہ کی طرف رخ
کیا تو وہ اپنی ادنیٰ ”القصوری“ پر سوار تھے جو نبی مدینہ میں داخل ہوئے
انصار و ہاجرین کا گروہ جو شائق دید تھا، پروانہ وار آگے بڑھا اور حضورؐ
کو چاروں طرف سے حلقے میں لے لیا۔ ہر شخص ادب و دنیا کی تصویر

مشہور، جائے مسجد، اسلام میں ایک ایسا مقام عبادت ہے جو
اپنے مضمرات میں مندرجہ کلیسا، کنشٹ یا کسی اور معبد سے قطعی جدا ہے۔
”مسجد کی بابت آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی یہ ہے :
جعلت لی الاسلام مسجداً“

”اللہ تعالیٰ نے میرے لئے پوری زمین مسجد بنادی“

تدعا یہ ہے کہ کسی بھی جگہ یا طرز تعمیر و شکل بنا کی قید نہیں۔
بلکہ ہر مقام جو پاک ہو اور اداۓ فرض کے لئے موزوں ہو مسجد بنی جائے۔
مسجد، کا کام دے سکتا ہے۔ قبل اسلام انبیائے کرام کے لئے کسی کسی
معبد یا جائے عبادت میں پہنچ کر عبادت کرنا اور اظہارِ عبادت کے فرض سے
سبکدوش ہونا لازمی تھا، اس کے علاوہ کسی جگہ نہیں۔ مگر اسلام نے اس
صورت حال کو بدل دیا جو رکھے مصر، یونان اور رومی تہذیبوں میں جو
معبد بنائے جاتے تھے وہ کسی کسی ”معبد“ کے نام پر معنون، موسوم، یا
وقف و منسوب ہوتے تھے، دوسری کسی جگہ عبادت نہیں ہو سکتی تھی۔

اگر تاریخ کو اترے نظر ڈالی جائے تو اسلام میں مسجد کی بنیاد
نظر آتی ہے جب حضورؐ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اس بات
کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عینین کی حفاظت اور رہائش کی دنیا سے عازمی
انقطاع کیسوی کا مقام معین کیا جائے۔ اس بات کی کوئی واضح خبر نہیں
ملتی کہ حضورؐ فوراً نے مکہ میں رہتے ہوئے کسی عام کھلی جگہ پر اپنے صحابہ کے
ہمراہ صلوٰۃ ادا کی ہو۔ صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ اداۓ صلوٰۃ کے
لئے مکہ کی تنگ و تنگ گلیوں میں یا اپنے اقلین صحابہ کے گھروں پر

لے قرآن کریم میں ”مسجد“ لفظ اس کی جگہ مساجد ذکر اٹھاوا اور پانچ مرتبہ بلیغ ترتیب آیا ہے۔

حضورؐ اور سے قبل کی عبادت گاہ کے مفہوم میں ہے۔ خاص کر سوانحی سرکاری

کتابوں میں مسجد لفظ ”مکہ“ کے معنی میں (بیت المقدس) کا لفظ استعمال کیا گیا۔

مسجد کا مفہوم ہر گز اس لئے نہیں کیا حضورؐ نے مکہ کی مسجد میں تھیں کہ ہر جگہ پر یہ لفظ

نہ مسجد لفظ کی مسجد ہی لفظ استعمال کیا جس سے مسجد کا مفہوم اداۓ فرض سے منقول ہوتا ہے۔

بنا کھڑا تھا۔ ہر ایک ملتی تھی تھا کہ وہ اس کے گھر پر تشریف لے چکیں۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ میری ادنیٰ کو چھوڑ دو، اسے حکم مل چکا ہے۔ ادنیٰ نے اپنے گریز ان مقام پر چھوڑ دیا جسے قرینہ یعنی مجھ سے کھانے کی جگہ کہا جاتا ہے۔ یہ زمین دینیوں، سہل و سہیل بن عمر کی ملکیت تھی مگر ادنیٰ پھر آئے بھی اور اس جگہ ٹھہر گئی یہاں سے حضرت ابوالیوب، خالد بن زید انصاریؓ کا مکان بہت ہی نزدیک تھا۔ حضرت ابوالیوب انصاریؓ نے آگے بڑھ کر حضورؐ کا سامان اتروانے کی برکت حاصل کی اور اسے لے کر اپنے گھر میں رکھا۔ حضورؐ نے انہی کے ہاں قیام فرمایا۔ ان دونوں بیویوں سے اس میں یہ کو خرید لیا گیا جس کی خاطر خواہ قیمت حضرت ابوبکرؓ کی معرفت ادا کر دی گئی۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہاں ایک جگہ ایسی بنانی چاہئے جو رہائش اور مسجد دونوں کا کام دے سکے۔ جب تک یہ تعمیر مکمل ہوئی آنحضرتؐ نے حضرت ابوالیوب انصاریؓ کے مکان پر ہی قیام فرمایا۔

مسلمانوں نے اس مسجد کی تعمیر میں پورے ذوق اور دلولہ سے حصہ لیا۔ ان کی ہمت افزائی اور مساوات کے خیال سے خود حضورؐ صلعم نے بھی آگے بڑھ کر ہر ایک کام میں حصہ لیا۔ مہاجرین اور انصار دونوں ہی اس کام میں برابر شریک رہے۔ ذوق و مسرت کی ایک دالہانہ فضا طاری تھی اور عالم کیفیت میں ساتھ ساتھ یہ ترنم الفاظ بھی دل و زبان رہتے تھے:

نحن المسلمون بنی المسجد

لا عیش الاھین الاخوۃ

اللھم ارحم الانصار والمھاجر

رحم مسلمان ہیں۔ ہم مسجد بناتے ہیں۔ ہمارے لئے

سوائے آخرت کے اور کوئی زندگی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ

ہجرت کے جہاد نے پہلے ایک جو کام

تعمیر مسجد و محاورہ خدا کے نام تھا

اک قطعہ زمیں تھا اسی کام کے لئے

واقع میں ہر لحاظ سے سوزوں مقام تھا

وہ قطعہ زمیں تھا تیروں کی ملک خاص

ہر چند قبر گاہ و گدڑی و محاسن تھا

چاہا حضورؐ نے کہ یہ قیمت خرید لیں

ان کے مریوں سے کہ جس جو پیغام تھا

مکمل

انصار اور مہاجرین پر اپنا رحم فرمائے

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے مکان و مسجد کے لئے کس نوع کی تعمیر کا فیصلہ کیا تھا؟ ایک بات تو حواصط ظاہر ہے اس تعمیر میں اور اس وقت کے دیگر عرب مکانات میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ آج بھی حجاز و مشرق وسطیٰ کی دودست آبادیوں میں عرب مکانات اسی وضع کے نظر آتے ہیں۔ مسجد کا پلین، یا نقشہ اس طرح کا بنایا گیا تھا جو حضورؐ کی ضرورتوں کے مطابق ہو، یہ ضرورتیں اسی تھیں جو قبل ازین موجود تھیں۔ یہ عمارت ۸۰x۷۰ ذراع تھی، شکل میں قریب قریب مربع۔ تین طرف تین دروازے لگائے گئے تھے۔ عمارت میں کئی حجرے تھے جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے صحن کے درمیانی حصہ میں مسجد تھی جس سے عام کمرے ملتی تھے۔

یہ عمارت ہجرت کے دوسرے سال صفر کے مہینے میں بن کر تیار ہوئی۔ اگرچہ سمت قبلہ حضورؐ انورؐ کے قیام مدینہ کے ۱۶ویں مہینے میں ہوا تھا کوئی الہی کے مطابق تبدیل کر دی گئی تھی مگر اس سے قبل سمت قبلہ بیت المقدس کی جانب تھی۔ اس تبدیلی کا حکم الہی عین حالت نماز میں آیا اور حضورؐ نے اسی وقت سمت بدل لی تھی۔ ابن عساکر کے قول کے مطابق آنحضرتؐ نے اپنی مسجد کی تعمیر دوم تہہ کرانی۔ پہلی بار اس وقت جب حضورؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، دوسری بار جب خبیثہ فح ہوا۔ اس وقت بھی صحن میں اضافہ کیا گیا تھا۔ عمارت کی تعمیر میں چوالیس سالہ لگایا گیا تھا وہ بالکل سادہ تھا۔ کھجور کے تنے، دھوپ میں نکھائی ہوئی اینٹیں، عام ملنے والا پتھر وغیرہ۔ یہ سب سامان مدینہ کے ہاتھوں میں عام بکنا تھا۔ یہی اطلاع ہے کہ دھوپ کی تیزی سے بچنے کے لئے دیواروں قبلہ کی طرف ایک مغلہ دھبہ بھی کھجور کے تنوں اور تیلوں کی مدد سے بنادیا گیا تھا۔ اس بات کا دوسرا مطلب یہ نکلا کہ کھراب کے نزدیک ایک ایوان بھی وجود میں آچکا تھا۔

حضرتؐ کی وفات گیا ربیع سن ہجری میں ۱۲ ربیع الاول کو حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں واقع ہوئی اور حضورؐ کو وہیں دفن کیا گیا۔ اگلے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند خلافت پر چلے اور فرزند ہوئے اوسان کا انتقال تیرہویں سن ہجری میں ہوا۔ لیکن مسجد کے نقشے اور عمارت میں خلیفہ اولؓ حضرت ابوبکرؓ کے عہد تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور انہیں بعد وفات آنحضرتؐ کے ہی پہلو میں دفن کیا گیا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمانوں کو حق و باطل کا دائرہ اسلام میں

المسجد الاقصیٰ (میت المقدس) اور مسجد نبویؐ۔

حضرت عثمانؓ کے بعد مدینہ مرکز خلافت نہ رہا اور مسجد نبویؐ میں بھی کوئی اور تبدیلی یا توسیع ۶۱ ہجری ۶۰ء تک رونما نہ ہوئی تھی کہ اس سال حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے جو اس وقت مدینہ کے عامل (گورنر) تھے، مسجد نبویؐ اور نبوی تعمیر کرنے کا اہتمام کیا۔ حضرت امام بخاریؒ (۲۵۴ھ/۶۶۶ء) نے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک کی مسجد نبویؐ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:-

حضرت رسول خداؐ کے زمانہ میں یہ مسجد دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنی تھی اور اس کی چھت پر درختوں کی شاخیں رکھی گئی تھیں۔ اس کے ستون کھجور کے تنوں کے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی توسیع کی۔ اس تعمیر میں بھی دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹیں رکائی گئی تھیں اور درختوں کے تنے بھی استعمال کئے گئے تھے۔ انہوں نے لکڑی کے ستونوں کو بھی دوبارہ بنوایا تھا۔ بعد میں حضرت عثمانؓ نے بھی اس میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ انہوں نے ہی اس کی دیواریں تراشیدہ پتھروں اور چرنے کی بنوائیں۔ نیز تراشیدہ پتھر کے کمرے بھی گڑھوائے۔ چھت میں ”سگین“ لکڑی لگوائی گئی تھی۔“

بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جو تعمیر کرائی تھی اس میں پتھر استعمال نہیں کئے گئے تھے بلکہ لکڑی ہوئی اینٹیں لگائی گئی تھیں۔ مگر یہ بات محقق ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ ہی تھے جنہوں نے خلیفۃ المسلمین کی حقانیت کے خیال سے عوام سے طمانیتوں کا ایک مقصود بنوایا۔ اس مقصود کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کو جس طرح مسجد میں شہید کیا گیا تھا اور اس طاعنہ مسجد نبویؐ اسی طرح کے کسی اور قورمہ کا مقام نہ بن جائے۔ اس مقصود میں ایک راہ بھی کھلی رکھی گئی تھی تاکہ مقتدی حضرات امام جماعت کو غولی دیکھ سکیں۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے اموی خلیفہ، حضرت یزید بن عبد الملکؓ کے حکم سے مسجد نبویؐ کی اور نبوی تعمیر کرائی تو اس مقصود کی تعمیر لکڑی کی کردی گئی (۹۱ھ/۶۰۹ء) (وقام الوفا باخبارنا والمصطفیٰ سہموری مطبوعہ مصر ص ۱۱ جلد ۱)۔

داخل ہو رہے تھے۔ دنیا کے ہر ملک سے لوگوں کی مدینہ میں آمد و رفت جاری تھی اس لئے مسجد نبویؐ اولے نماز کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی تھی، اس لئے انہوں نے مسجد میں توسیع کا اہتمام اپنے ذمہ لے لیا۔ ان کے حکم سے مسجد کا طول ۱۴۰ اور عرض ۱۲۰ ذراع تک وسیع کر دیا گیا۔ پشت کی دیوار دو یا تین ذراع تک پیچھے ہٹائی گئی، دروازے بھی چھ کمرے گئے ان میں سے دو قبلہ کی دائیں طرف رکھے گئے تھے اور دو بائیں جانب۔ باقی دو دروازے شمال کی دیواریں تھے۔ انہوں نے ہی عین مسجد میں نیکوں کی چٹانیاں پھرائیں جو اسی عقیق میں تیار ہوئی تھیں۔ حضرت عمرؓ کو بھی ان کے انتقال کے بعد (۲۳ھ/۶۴۴ء) حضرت ابو بکرؓ اور حضورؐ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ مسند خلافت پر جلوہ گر ہوئے۔ اسلام اس وقت چار دانگ عالم میں پھیل چکا تھا اور اسے بڑی قوت و شوکت حاصل ہو چکی تھی۔ اس لئے بڑی ضرورت تھی کہ مرکز خلافت کو شایان شان طریق پر بنایا جائے جس سے اسلام کی ہر بلندی اور شوکت عظمت کا اظہار بھی ہوتا کہ اگر وہ اضطرار پر اسلام نے جو پیغام حق پہنچایا ہے اور کشور دین متین کو جو سطوت و جلالت نصیب ہوئی ہے اس کا بدیہی مظہر بھی عوام و خواص کے سامنے آتا رہے تاکہ جہتیں بلند ہوں اور جذبہ ایمانی تازہ ہو۔ دوستداران عثمانؓ خاص کر بنی امیہ۔ اس بات کے پچھ خدوہاں تھے کہ مرکز و مسند خلافت کو جاہ و جلالت کا مظہر بنایا جائے۔ ان حضرات کبار کا حضرت عثمانؓ پر بڑا اثر تھا۔ غرض اس قسم کے ہی تقاضے تھے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت کے چوتھے سال مسجد نبویؐ کے صحن کی دیواریں ٹھنڈی کر کے اطراف مسجد کو اور بھی وسیع کرایا یعنی ۱۶۰×۵۰ ذراع تک۔ مگر حضرت عمرؓ کے زمانے کے چھ دروازے بدستور موجود رہے۔ حضرت عثمانؓ کا دور خلافت (۳۵ھ/۶۵۵ء) میں ختم ہو جاتا ہے اور ان کے بعد حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ مسند خلافت کو زینت بخشے ہیں۔ سیاسی مصلح کا تقاضہ تھا کہ انہوں نے مرکز خلافت مدینہ سے کونہ میں منتقل کر دیا (۳۶ھ/۶۵۶ء)۔ لیکن میری اپنی رائے یہ ہے کہ اس طرح مدینہ النبیؐ کو جو سرکاری اہمیت حاصل تھی اس کی ایک تبدیلی رونما ہو گئی، اس واقعہ سے قطع نظر آنحضرتؐ کا روضہ مبارک اور مسجد عبادت و زیارت کا محبوب مقام بھی کمی نہ اور تاقیامت مدہم گا۔ کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ تین مقامات کا حرم سفر کرنا۔ مسجد الحرام مکہ،

میں نہ دیا مناد کا، آنحضرتؐ نے خود جو سہ تہمیر کر لئی تھی اس کا کوئی میٹھ نہ یعنی اذان کی جگہ تعمیر نہیں کر لئی تھی جہاں سے کھڑے ہو کر اذان کے ذریعے مومنوں کو نماز کے لئے آئے کہ عام اطلاع (باوازی بلند) دی جا سکے شروع دوران اسلام میں پہلے وہی جہاں سے اذان کے یہ فریضہ صلوٰۃ ادا کرتے تھے مگر جب اذان کا حکم آیا تو حضورؐ نے حضرت بلالؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا: بلال! اٹھو! درمومنوں کو صلوٰۃ کی طرف بلاؤ! یعنی بخارجہ (قید) کی ایک عورت کے بیان پر ابن اسحاقؒ سے مروی ہے:-

”مدینہ میں جتنے گھر مسجد نبویؐ کے آس پاس بنے ہوئے تھے میرا گھر ان سب میں اونچا تھا اور بلالؓ نماز فجر کے لئے اسی گھر کے ادرچڑھ کر لوگوں کو صلوٰۃ کی طرف بلاتے تھے۔ یہاں سے سب کو آسانی کے ساتھ اطلاع ہو جاتی تھی۔“

جب آنحضرتؐ ہجرت کے ساتویں سال مکہ تشریف لائے تو انہوں نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تھا کہ کسی اونچی جگہ سے اذان دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں یہ ماجرا اس لئے بیان کیا گیا ہے میٹھ نہ کے بنانے کا تصور حضرت بلالؓ کے وقت سے ہی پیدا ہو چکا تھا، جو بعد میں تعمیر مسجد کا بصورت یتناہ، ایک اہم جزو بن گیا۔

تلمیح کے یہ واقعات بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی مرتبہ میٹھ نہ کا اہتمام اموی عہد میں مسلم بن مخلد، گورنر فسطاط (مصر) نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی مسجد میں کیا یعنی چار میٹھ نہ یا میناروں کا احاطہ کیا جو اس کے چاروں طرف ۵۵ (۶۷) میں بنائے گئے تھے۔ اسی دور میں کوفہ اور بصرہ کی مسجد میں بھی میٹھ نہ تیا کئے گئے مگر مسجد نبویؐ میں چار میناروں کی تعمیر ۷۰۹ء میں خلیفہ حضرت ولید بن عبدالملک کے حکم سے کرانی گئی۔ مگر یہ میٹھ نہ علم طور پر اپنی مستطیل شکل اور اسلامی تعمیرات میں بالکل نئے اضافے کے باعث میٹھ نہ کی بجائے ”مینار“ کے نام سے ہی مشہور ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ سے ایسی جگہ پر روضہ کی جاتی تھی اور سب سے پہلے یہ نام پڑا۔ میٹھ نہ کو بھی اسی ہیئت کی بنا پر عوام نے مناد ہی کہا جو بعد میں بزرگ عورت عام میں ”مینار“ بن گیا۔

یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ میٹھ نہ تعمیر و بنائے مسجد کا ایک مخصوص حصہ اسی طرح بنا۔ مگر مسلمانوں نے میناروں کا استعمال مسجد کے علاوہ دوسری تعمیرات پر بھی کیا، جیسے مقابر اور دروہنے وغیرہ۔

ان کے بنانے سے عمارت میں حسن و رعنائی، نیز موندنیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا نقشہ عجیب رفعت و جلالت کا حامل ہو جاتا ہے۔

متنبر مسجد، اب یہاں کچھ بیان متبر کا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ اپنا خطبہ ارشاد فرماتے وقت مسجد میں کچھ کے ایک تنے سے سہارا لے لیا کرتے تھے حضورؐ کے ایک صحابی نے جب یہ دیکھا تو حضورؐ سے عرض کی کہ اگر اجازت ہو تو میں آپ کی خدمت میں ایک متنبر بنا کر پیش کروں۔ حضرتؐ نے دریافت فرمایا ”متبر کیا ہے؟“ صحابی نے عرض کیا کہ میں یہ چیز بنا کر پیش کروں گا۔ چنانچہ اس نے اہل نامی کھڑی کا متنبر بنا کر دکھایا جس میں دو بیڑھیاں تھیں اور اونپر نشست کی جگہ رکھی گئی تھی۔ آنحضرتؐ نے اسے شرف قبلہ بخشا جس پر جیٹھ نے یہ متنبر حضورؐ کے لئے بنایا تھا اس کا نام تمیم الداری یا باقوم یا باقول بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال مسجد نبویؐ میں متنبر کا استعمال جزو حضورؐ کی موجودگی میں ثابت ہے۔ یہ متنبر آنحضرتؐ کے وصال کے بعد بھی استعمال ہوتا رہا، جس کا وجود خلفائے عباسیہ کے عہد تک مذکور ہے بعض کا قول ہے کہ تمیم الداری نے ایسے متنبر دمشق کی جگہ لایا جو میں دیکھے تھے۔

محوراب، منار و متبر کے ساتھ محراب کی گفتگو بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اوپر کی تفصیلات میں گند چکا ہے کہ اسلام میں پہلی مسجد خود آنحضرتؐ کی مساعی مبارک کے طفیل وجود میں آئی تھی۔ یہ جو کورعات ہی سادہ وضع، تعمیر کی گئی تھی کہ جب سورہہ بعدہ سمت قبلہ شمال سے جنوب کی طرف پھیر دی گئی یعنی خانہ کعبہ کی طرف، تو اس مسجد میں تبدیلی کے لئے آنحضرتؐ کو کوئی وقت پیش نہ آئی۔ اس کے بعد تو مسجد کا قبلہ رخ رکھنا امر لازم قرار پایا جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

تمازت آفتاب سے نمازیوں کو بلے آرامی محسوس ہوتی تھی حضورؐ نے اس ضرورت کے پیش نظر ایک مظہر یا سائبان بنوانے کا حکم دیا۔ گویا نماز کے لئے اس طرح مرکزی ایوان یا دالان، کی پناہ پڑی۔

یہ مظہر بھی سادگی کا نمونہ تھا۔ عام لکڑیوں کے چند ستونوں پر چٹائی کی چھت یا چھتر بچھا دیا گیا تھا۔ مسجد کے صحن میں جانب قبلہ یہ پہلا اضافہ تھا جب خاص خاص اجتماع ہوتے، جیسے عیدین، اور عجم کثیر ہو جاتا تو آنحضرتؐ شہر کے باہر ادا نے صلوٰۃ کے لئے تشریف لے جاتے اور کسی کھلی جگہ پر یہ فریضہ باجماعت ادا ہوتا۔ حضورؐ کے مؤذن، حضرت بلالؓ جبکہ کی سمت ظاہر کرنے کے لئے اپنا بڑا ساتیر، جو وہ حضورؐ کے گئے

ہے کہ یہاں اگر مسلمان فرض سے ہمدوش ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اور مقامی حالات کے مطابق مسجد ہر جگہ اور ہر وضع کی بنتی ہے۔ زمین، آب و ہوا، شکل اور قبضہ زمین وغیرہ حالات جو بھی اجازت دیں گے مطابق وضع وضع کی مسجدیں وجود میں آتی ہیں اور آتی رہیں گی۔ اکثر ملکوں کی مساجد میں وہاں کی مقامی ثقافت کا پر تو بھی نظر آتا ہے، مگر زیادہ نہیں مسجد کے بنانے میں احکام صلوٰۃ کے آداب و اصول بنیادی طور پر ہر جگہ یکساں پائے جائیں گے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ کسی بھی ادنیٰ دین نے عبادت گھر یا معبد کا نقشہ بطور نمونہ بنا کر اپنے پیروؤں کو نہیں دیا تھا، یہ صرف حضور اکرم کی ذات بابرکات ہی تھی جس نے ہمارے لئے ایک مقدس نمونہ اس جہت میں بھی ہم کو عطا کر دیا تاکہ اصل الاصول میں تاقیامت ہماری رہنمائی ہوتی رہے، اور جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا حضور کا ارشاد ہے کہ پوری دنیا میرے لئے مسجد بنا دی گئی ہے یعنی فریقہ ساز ہر پاک جگہ پر ادا کیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے کسی عمارت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یوں مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں مسلمانوں کو آزادی ہے کہ وضع ہیئت اور دست کے اعتبار سے جس طرح چاہیں مسجد تعمیر کریں۔ سادگی کے ساتھ بھی مسجد تعمیر ہو سکتی ہے اور پرکاری کے ساتھ بھی، مگر مسلمانوں نے اپنے دینی جوش اور عقیدت کے تحت اور اسے اپنے لئے نوشتہ آخرت منظور کرتے ہوئے دنیا میں ایسی ایسی خوبصورت مساجد تعمیر کی ہیں کہ دنیائے فن میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ فن تعمیر کے باب میں مسلمانوں کی خوش ذوقی، تعمیری اہلچل اور جدت و سلیقہ نے ان کا ہر جگہ ساتھ دیا ہے۔ اگر دنیا کی خوبصورت و عظیم مساجد کا ذکر کیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر و کار ہو گا۔ تاہم اتنا ضرور کہ جاسکتا ہے کہ سامرو (بغداد) میں خلیفہ متوکل باللہ کے عہد میں سب سے بڑی مسجد تعمیر ہوئی جس کے ضلع ۸ فٹ اور ۵۱۲ فٹ ہیں۔ اس کا رقبہ ۵۰۰ ۵۰۴ مربع گز ہے۔ اس کے ایک رشتہ نام نام ملو یہ کہا جاتا ہے۔ مگر بالکل یہ مسجد آباد نہیں ہے۔ اس کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد کاخمر مرز میں پاکستان کو حاصل ہے یہی مراد لاہور کی بادشاہی مسجد سے ہے جسے اورنگ زیب نے ۱۰۸۴ھ میں تعمیر کیا تھا۔ اس کے اضلاع ۵۶۰ فٹ اور ۵۷۵ فٹ ہیں اور چوبی تعالیٰ آج بھی آباد ہے حسن و زیبائی کے اعتبار سے مسجد قرطبہ کی شان نزلی ہے اور اسے بھی تعمیری عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مسجد الرحمن علی

آگے اٹھا کر چلتے تھے۔ زمین میں اس جگہ کا ڈیرا کرتے تھے جہاں حضور کو مسجد کرنا ہوتا تھا۔ اس تیر کو سترۃ المصلیٰ یعنی نمازی کی ڈھال حفاظت یا پردہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے نصب ہونے کے بعد اسی کے سامنے آنحضرتؐ نماز ادا فرماتے تھے۔ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ امام صلوٰۃ جماعت کے سامنے وسط میں کھڑا ہوتا اور اپنا رخ جانب قبلہ رکھتا تھا۔ ۹۱ء (۶۰۹ء) میں حضورؐ کی مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی تھی اور اس وقت سوائے مزار مبارک کے، ان کی ملامت کی سب جگہیں معدوم ہو چکی تھیں۔ جب مسجد وسیع کی گئی تو مزار پر انوار اس کے احاطہ میں لے لیا گیا۔ غرض اس طرح سترۃ المصلیٰ کی اہمیت بنائے مسجد میں قائم ہو گئی۔ جسے آخر میں ہم محراب مسجد کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

اب آپ غور فرمائیں کہ مسجد کے اندرونی حصوں کی ساری شوکت و جلالت اس محراب سے کس قدر بڑھ جاتی ہے، بلکہ یوں کہئے کہ محراب مسجد کے نقشے کی روح ہے۔

ان تمام تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کا کوئی مخصوص نقشہ وضع یا طرز حضورؐ نے اختیار نہیں کیا تھی، کیونکہ اس سے قبل کا کوئی نمونہ ہی موجود نہ تھا جسے حضورؐ نے اختیار کیا ہوتا۔ جو مسجد حضورؐ نے اپنے حکم سے بنوائی وہ اصول و آداب اور ضروریات احکام صلوٰۃ کے میں مطابقت تھی، پھر سادگی کا نمونہ بھی تھی جو ایک مثال ہے کہ مسلمانوں کی غریب سے غریب لہجہ بھی اپنی ضرورت کے مطابق ایسی سادہ وضع مسجد بنا کر اداۓ فرض کر سکتی تھی مسجد نبویؐ کی بڑی خوبی تعمیر اس کی سادہ وضع و نقشہ ہے جو آنحضرتؐ کے ذہن و سادگی کا ایک نفیس اور پاکیزہ ہیکل ہے۔ میری ناقص رائے میں اگر حضورؐ کے پیش نظر کوئی نقشہ ہو بھی سکتا تھا تو وہ خانہ کعبہ مسجد الحرام ہی ہو سکتا تھا جو آج بھی مسلمانان عالم کا قبلہ اور مقام رجب ہے، یہی وجہ ہے کہ خود جرم کعبہ میں نازی سمت نہیں، نمازی مسجد الحرام میں ایک دائرہ کی شکل میں خانہ کعبہ کے گوشے قائم کیے گئے ہیں۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کا قبلہ یہی مقام ہے، مگر ان تمام امور کے باوجود مسجد نبویؐ کی اہمیت ایک جلا کا نہ حیثیت کی حامل رہی ہے۔ اس کی پاکیزگی، جلالت اور شوکت و برکت کو دنیا نے اسلام میں جو بلقا و جگہ حاصل ہے وہ ہم سب ہمدوش ہے اور اس اہمیت کی طرف خدا و رشاوندی میں اشارہ موجود ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

معا یہ ہے کہ اسلام میں مسجد کی تعمیر و بنائے اس جذبہ کا اثر ہوتی

نے ۱۶۹۹ء میں تعمیر کرایا تھا مگر اس کی تکمیل عبدالرحمن ثالث نے ہی کی تھی۔

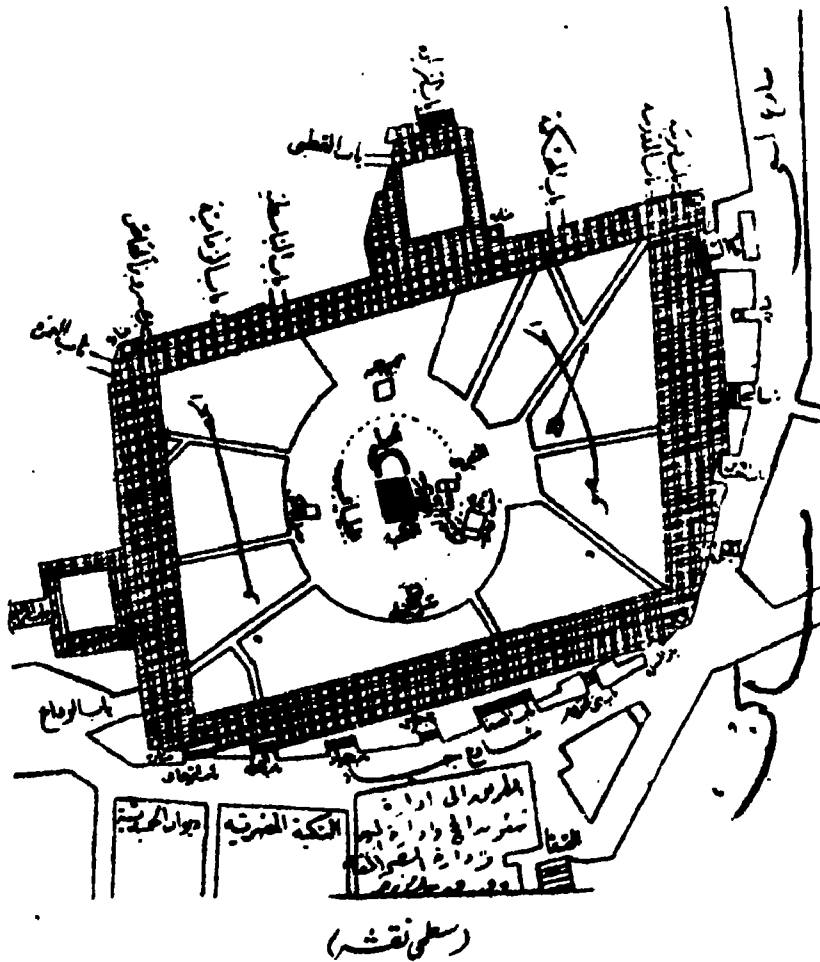
غرض دنیا کے کسی خطہ کی قدیم یا جدید مسجد کو یکمیں وہ اپنے
 امتیاز کے باعث ہر جگہ پہچانی جاسکتی ہے۔ کوئی نیا اسلامی شہر یا سٹی
 بنے تو سب سے پہلے اس میں مسجد کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اب اسلامی ممالک

میں بھی ایک نفیس و شایان شان مسجد کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مسجد کی تعمیر میں خصوصیت و امتیاز اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ اسلام میں جنتوں اور جہنم نے ہمیشہ ٹھکانہ گاہ کا دارا دیا گیا ہے ۛ

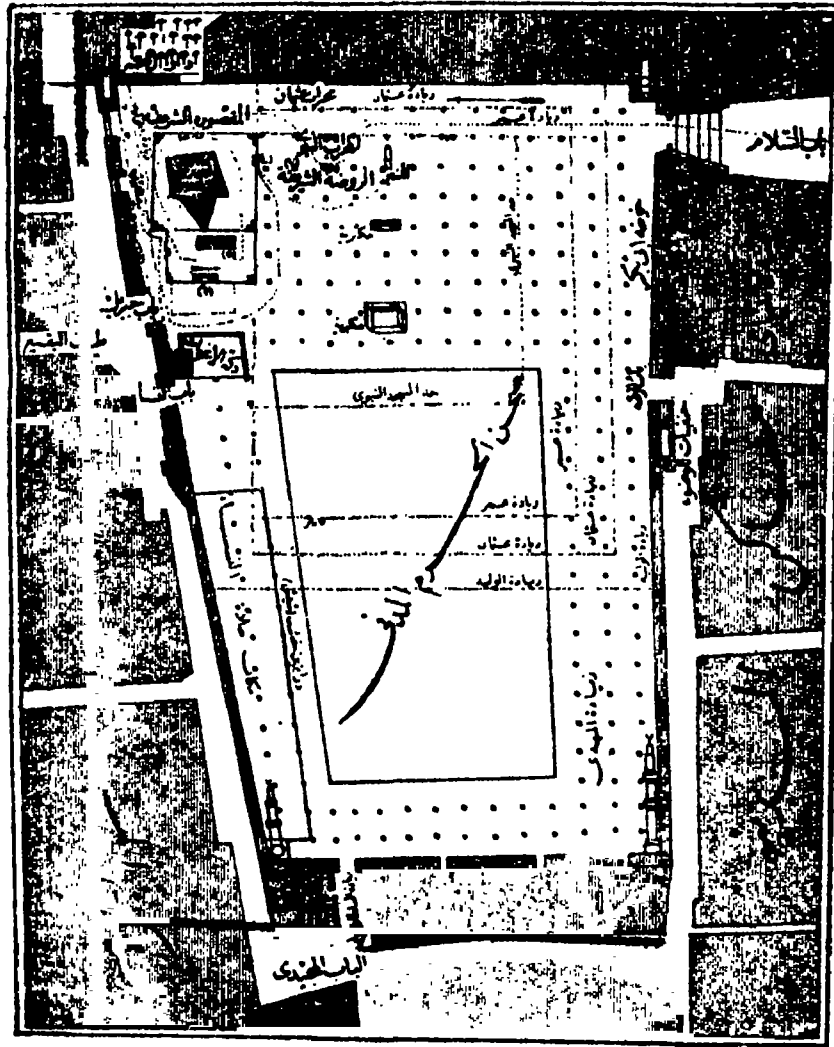


حکم کعبہ

”دنیا کے تہکوں میں پہلا وہ گھر خدا کا“



حرم نبوی (سطحی نقشہ)



مسجد نبوی کا یہ سطحی نقشہ (پلین) گو قدر ہے پر انا ہے مگر حمارت کی بہت سی قدیم جزئیات کو دکھاتا ہے۔ جلالت الملک سلطان ابن سعود کے عہد میں باپاں گوشہ (نقشہ پر غیلا باپاں کونہ) زاویہ قائمہ کو دیا گیا ہے اور اس طرح باب مجیدی عین درمیان میں آگیا ہے چاروں گوشوں پر منارے بھی ہیں؛

نواب محسن الملک

ڈاکٹر مولوی عبدالحق (رحم)

دو در و دریاں باغ آراستہ
در و بند از ہی ہر دو برخاستہ
بیا از در باغ و ہنر تمام
زدیگر در باغ بیسروں خرام

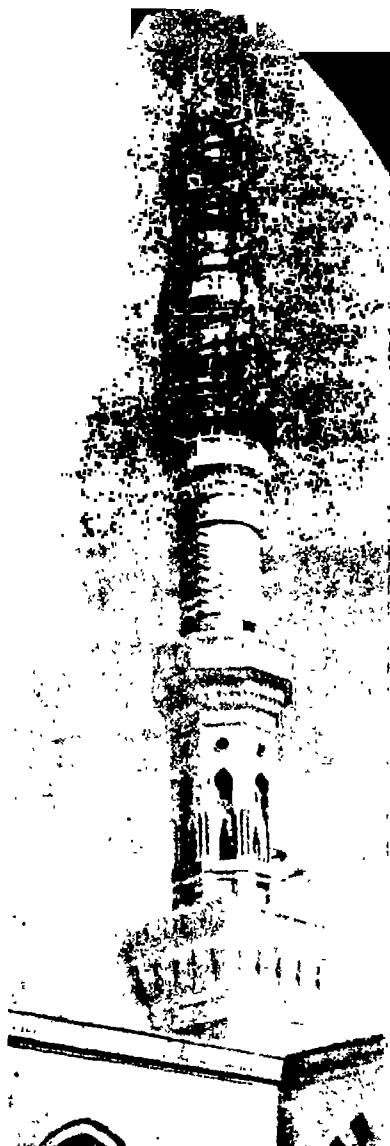
اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کا آنا اور جانا یعنی پیدا ہونا اور مرنا دونوں ایک سے فعل ہیں۔ دونوں فعل اس کے پس سے باہر ہیں۔ نہ اپنی خوشی آتا ہے نہ اپنی خوشی جاتا ہے۔ اور نہ معلوم کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے، اور شاید جہاں سے آتا ہے آخر وہیں چلا جاتا ہے۔ یہ اسماء ہیں اور اسماء رز ہیں گے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ان دو منزلوں کے درمیان جو وقفہ ہے اور جو گنتی کے چند سانس انسان کو عطا ہوئے ہیں وہی اس کی جیات ہے اور وہی اس کا سرمایہ، وہی اس کی دنیا ہے اور وہی اس کی آخرت، اسی میں اس کی زندگی ہے اور اسی میں اس کی نجات۔ اور اسی میں اس کی موت ہے اور اسی میں عذاب گویا چند دن امتحان کے ہیں اور دنیا دارم ترغیب ہے، اس میں جو پورا اترا اس نے حیات جاودانی پائی، اور جو رہ گیا سورہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون دنیا کی رونق اور ترقی انہیں نفوس کے دم سے ہے جو یہاں کی کڑی کڑی جہیل کر او بیچ در بیچ ترغیبات کے پسندوں سے نکل کر امتحان میں پورے اترتے ہیں۔ الی کی کمی سے دنیا کو زوال، اور ان کی ترقی سے دنیا کو ترقی ہے۔ اسی طرح جس قوم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوتے، اور بہت کم ہوتے ہیں، وہ معرض زوال میں ہے، اور جہاں ان کا سلسلہ جاری ہے، وہاں ترقی و اقبال شامل حال ہے۔

ہماری قوم میں ایک مدت سے قضا الرجال ہے اور جایک آدھ خدا کا بندہ اس زمانہ میں پیدا ہوا تو ایسے وقت میں داغ مفارقت دے کے چلا گیا جبکہ اس کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی، اور جبکہ اس کے افادہ کا دائرہ اور وسیع ہو گیا تھا۔ سید نے اسی برس کی عمر میں

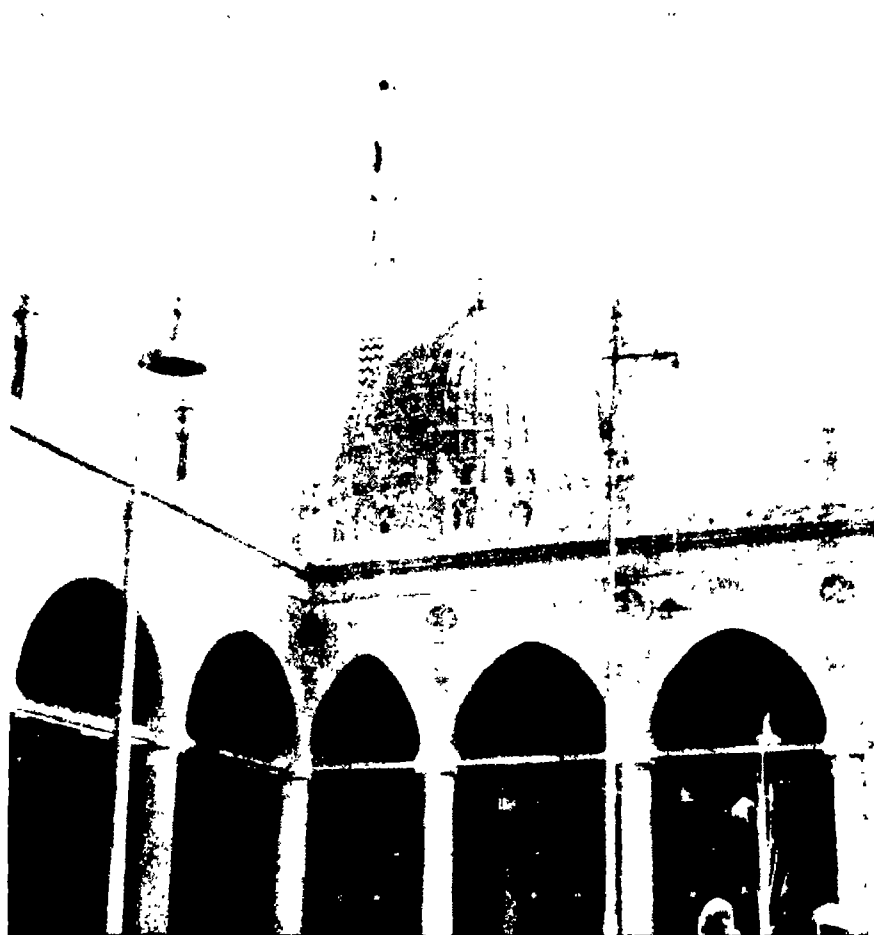
انتقال کیا لیکن ہمارے حسابوں وہ بے وقت مرے۔ اب ان کے جانشین قوم کے سردار، ملک کے محسن، محسن الملک ستر برس کی عمر میں ہمیں چھوڑ کر گئے ہیں مگر ہم یہی کہیں گے کہ یہ موت بھی ناوقت ہوئی اسلئے کہ حکام یہ بندھا کر رہا تھا وہ جوانوں سے بھی نہ ہوسکا، اس اکیلے بندھے کا کام اتنا بڑا تھا جس سے ہزار دو ہزار نہیں لاکھوں کے منہ پھر گئے۔ اور اگر سچ پوچھو تو اس نے ایسے وقت پر جبکہ خانہ قوم کی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی اور مسلمانوں کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں اور دل دھڑک رہے تھے، وہ کام کیا جو چکر و زلفوس سے نہ ہوسکا۔ اس کی مردانہ ہمت اور اس کی مصلحت اندیشی ہماری قوم میں یاد رہے گی۔ اس نے بقول حالی سید کے مشن کو اسی طرح پورا کیا جس طرح پال نے مسیح کے مشن کو۔ اس نے اپنے ہادی کے مرنے پر ضلیب کندھے پر اٹھائی اور بزرگ سید کے قدم بہ قدم چل کر اور سارے آفات سہہ کر آخر بیڑے کو کنارے پر جاکھایا جو نا خدا کے چل بسے سے بھنوریں بھنس گیا تھا۔

میرے خیال میں ایک بڑے شخص کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے اور اپنے کام پر ہے، دوسرے شخص کی ضرورت محسوس نہ ہو، اور اس کے بعد سما اس کے کسی دوسرے پر نظر نہ پڑے۔ یہی حال مرحوم کا تھا۔ جب تک اس کے دم میں دم دم، ساری قوم نے اسے بالاتفاق اپنا سردار تسلیم کیا۔ اور جس کام میں اس نے ہاتھ ڈالا اسے اس نے اس خوبی اور بہولت اور کمال سے ادا کیا کہ سب کو یقین ہو گیا کہ اس سے بہتر دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔

یہ بڑے شخص کے پہچاننے کی علامت ہے۔ لیکن بڑا شخص حقیقت ہے کون؟ بڑا شخص جسے کہیں گے جو ایشیا کو کام فرماتا ہے، جو اپنے غرض اور خواہشات پہلات مار کر دوسروں کی دستگیری کرتا ہے، جس طرح خود غری انسان کی سب سے مذموم صفت ہے، اسی طرح ایشیا اس کا اعلیٰ وصف ہے بلکہ سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑی جہاد ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ



منار



کعبه حضرت

مسجد نبوی ص



مسجد نبوی ص و اندرونی حصه

برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے مؤسس ، نقیب اور علمبردار جن کی سیاسی ، علمی کاوشوں اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں سے قوم کو ایک نئی حیات ملی ، اور اس نے ایک معین نصب العین کی جدوجہد سرور کی ، جو بالآخر تاسیس پاکستان کی شہ میں ظہور پذیر ہوئی



سیر سید احمد خان



نواب محسن الملک (مرحوم)



ڈاکٹر مونی احمد خان (مرحوم)

ہے۔ ہم جب کبھی کوئی قومی کام کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو سمجھتے ہیں، بلکہ حقیقت میں محسوس کرتے ہیں، کہ اس میں سستی کا ماتہ ہے۔ اب جہدی ملی چل بسا، لیکن وہ اب بھی محسن الملک ہے۔ ان کی زندگی سے سبق سیکھو، ان سے زندگی بسر کرنا سیکھو۔ ہزار کالجی اور یونیورسٹی سے بڑھ کر یہ علم ہیں۔ وہاں علم ہے، مگر بے فزہ ادب بے تک؛ اور یہاں عمل کا علم ہے جس میں اسرار حیات ہو یا رہا ہوتے ہیں، اور جس پر نیر اور اللہ قرآن ہیں۔ وہ بے جان ہے، اور یہ جاندار ہے۔ وہ جگ بیتی ہے، اور یہ پ بیتی ہے۔ اور اسی لئے یہ زیادہ کارآمد اور زیادہ پُراثر ہے۔ غرض زندگی ان لوگوں کی، اور مرنا ان لوگوں کا۔ اور بقول حالی ہمیں مرحوم نے اپنی زندگی و حیات سے بتا دیا کہ:

میںوں رہتے ہیں، یوں جیتے ہیں، یوں مرتے ہیں
اے کالج کی مبارک زمین مسجد دیکھ! آج قوم کا جگر گوشہ اپنی
زندگی کے مچلے طے کر کے تجھ میں پناہ لیتا ہے۔ دیکھتا ہے پاس ہماری
قوم کے دل اعلیٰ بے بہا اور بھی دفن ہیں، آج ایک تیسرا گمراہ شرب چرخ
اور آتا ہے۔ یہ اس خفتہ بخت، سراں نصیب قوم کی تین عزیمتیں ہیں
جو تجھے داد و محشر کے سلسلے پیش کرنی ہوں گی۔ یہ ہماری آنکھوں کے تار
تجھے ہر آنی تجھ میں مدفون ہیں لیکن یہ غروب ہو کر بھی اپنی روشنی چھوڑ گئے
ہیں اور شہر میں بچھ چکیں گے۔ اے روشنی جا! اے قوم کے تارے جا!
اور وہاں جا کے سو جا، جہاں قوم کے آفتاب و مہتاب پڑے سو رہے
ہیں! شاہ ظلمت آنہ بچی ہے۔ تاریکی چھا رہی ہے۔ اب اوتا تارے چمکیں گے
مگر تیری چمک کسی میں ہوگی جا اب عالم بھائیں جا! تیرا نام مبارک ہو، خدا
تیرا جانا بھی مبارک کرے! تجھ پر ہزاروں درود اور سلام ہوں اور
تجھ پر تاقیامت خدا کی رحمتیں نازل رہیں!

مرحوم میں یہ صفت نہ تھی، اور وہ بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اس کے کارنامے،
اس کی جہاں نشانیوں اور اس کی سحر کاریاں ایک عالم پر روشنی ہیں۔ اس
نے ہمیشہ انیثار و احسان سے کام لیا اور خاص کر اس کی زندگی کا آخری حصہ
ایسے نیک اور اعلیٰ کاموں سے ملوث تھا کہ اگر اس کا صرف ایک ایک کام
ایک ایک شخص کو تقسیم کر دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک بڑا شخص کہلانے
کا مستحق ہو سکتا ہے۔ وہ جامع حیثیات تھا اور اس نے ہر حیثیت کو بدرجہ
اتم نبھایا۔ وہ ملک کا دوست اور قوم کا عاشق تھا اور اس نے اپنی دوستی کا
حق ادا کر دیا۔ اس کی زندگی اپنی نہیں رہی تھی بلکہ قوم کی زندگی ہو گئی تھی۔
اس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی، ایک ایک لمحہ، دوسروں کے لئے وقف
تھا۔ وہ جب تک جیا اسی دھن میں جیا، اور جب مرا تو اسی دھن میں مرا
اور تیرے شہادت پایا۔ یہ لوگ بڑے لوگ ہیں۔ ان کے رتبے بہت اونچے
ہیں۔ یہ شاہ راؤ عالم کے پھر ہیں۔ جب تک زندہ تھے لوگوں کی رہبری
کرتے رہے، اب مرنے کے بعد بھی دوسروں کی رہنمائی کریں گے۔ وہ سحر
نہیں جیتے ہیں۔ مگر اس طرح انہیں جیسے ہم جیتے ہیں بلکہ ان کی حیات
جیات ابدی ادا ان کی زندگی کا دیر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بولتی چالتی تصویر ہماری آنکھوں سے
نہاں ہو گئی۔ وہ ہاتھ جس کے اٹھنے سے ہماری امیدیں اٹھتی تھیں۔ اٹھنے
کے قابل نہیں رہا۔ وہ دماغ جو اڑے وقت پر ہماری مشکلات کی گھنٹیوں
آٹاٹاٹا سلجھا دیتا تھا کام سے رہ گیا ہے۔ اور وہ زبانی جس کی جادو جگر
تقریریں سے مجمع کے مجمع دم بخود رہ جاتے تھے خاموش ہو گئی ہے۔ لیکن
اس کے کام ہمارے ساتھ ہیں، اس کے نقش قدم ابھرے ہوئے ہیں،
اور نقش فی المحجر ہیں۔ سستی مگر گیا، مگر وہ اب تک ہمارے ساتھ ہے۔
اس کا نام اس سے زیادہ روشن اور اس کا کام اس سے زیادہ اجاگر

مآلات کی ترقی اشاعت میں حصہ لیکر پاکستانی ادب ثقافت کی اپنی عملی دلچسپی کا ثبوت دے چکے

”... باز بہ تعمیر جہاں خیر“

جناب اے کے۔ ایم فضل القادر چودھری

جناب اے کے۔ ایم فضل القادر چودھری: وزیر تعلیم و اطلاعات، وزیرک و زراعت محنت و معاشری سپرد نے پچھلے دنوں موقر عالم اسلامی کے تذکرہ (اسلام اور دور جدید کے تعلقات) منعقدہ کراچی میں جاقظاً حق تقریر فرمائی اس کے اہم نکات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

رہے ہیں وہ کامیابی سے جھکتا رہتی ہیں مگر ابھی عروج کی بہت سی منزلیں ہمارے سامنے ہیں جن تک پہنچنے کے لئے بڑی کوشاں رہے اور ہمیں والہانہ سرگرمی و عمل کی دعوت دے رہی ہیں۔

زندگی ایک شے واحد ہے اور اسے دین و دنیا کے دو الگ الگ خالوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات روح اسلام کے منافی ہے۔ یہ دنیا سرچند کہ مشینوں میں گھری ہوئی ہے مگر پھر بھی ہم مسلمان ایک ایسا معاشرہ ضرور تعمیر کر سکتے ہیں جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ کیونکہ قرآن علم و بصیرت، تدبیر فی الدین، سائنس، ٹیکنالوجی کے ہرگز خلاف نہیں بلکہ بصیرت والوں کو برابر دعوت فکر و نظر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ مسلمان اس دنیا میں کیا کروا کر رہے۔ سائنس اپنی جگہ بے پناہ قوت رکھتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس سے تحریجی کام لیتے ہیں یا فلاح انسانیت کا۔ اصل چیز مثبت اخلاقی اقدار میں جن کی ہمیں ہمت افزائی کرنا چاہیے۔

اسلام کسی ایسے تصور کو اختیار نہیں کر سکتا جو عدلی نہ ہو۔ اسلام نے ہی دنیا کو امن و راستی کی صحیح راہ دکھائی اور توحیدات سے انسان کو باہر نکالا ہے۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ عدم مساوات، معاشری فتنہ، نا انصافی، باہمی شکوک اور فساد ہی اسلام کی دوزخ میں استعمالی امدادوں کی اس دنیا میں اسلام آج بھی اپنی فروع انسان کی فحلت کا واحد وسیلہ جو مساوات و اخوت کے خدایے صحت مند لہذا اثرات قریب کر سکتا ہے۔ اس وقت کی دنیا کو دو بڑے خطرے لاحق ہیں: نسل پرستی اور شراب۔ اعلان دوزخوں بڑائیوں سے پیدا ہونے والے تمام مفاسد اور

یہ اسلام ہی کا فیضان ہے کہ اس نے مسلم معاشرہ کو صد سال کی آزمائشوں کے باوجود برقرار و سلامت رکھا ہے اور آئندہ بھی ملتِ ہلالیہ کا استقلال و استحکام ہماری مشترک نعمتی و روحانی اقدار پر ہی مبنی رہے گا۔ فروع انسان کے لئے اسلام کی دعوت ابدی اور لازوال ہے اور امتدادیونانہ اس سے متعزز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسلام میں اجتہاد کا مقام ہے یعنی زمانہ خود قدیر۔ اسلام کے ادبی اصول غیر متبدل ہیں مگر ان کا عملی اطلاق اصل چیز ہے۔ قرآن ہم کو ایک معین ضابطہ حیات عطا کرتا ہے اور اسوۂ رسول کی روشنی ہمارے لئے رشد و ہدایت کا دوسرا بڑا سرچشمہ ہے۔ ان تعلیمات کا تقاضا ہے کہ مسلمان جو اس دنیا میں حیات انسانی کی تعمیر نو کا تاریخی کردار ادا کر سکتا ہے اسے اس منصب کی ذمہ داریاں ادا کرنا چاہئیں۔ تو ان ہی ہمیں بتاتا ہے کہ خالق اور مخلوق کا صحیح رشتہ کیا ہے۔ یہ رشتہ راستی و نیکو کاری کے سوا اور کچھ نہیں بجا شایہ میں عدل و صالحیت ہی انسانی کردار کی اصل کسوٹی ہے۔ توحید اسلام کا اصل اور بنیادی تصور ہے جس سے مساوات و اخوت کے اصول اخذ ہوتے ہیں۔

ماہی میں مسلمانوں کی ہر شے زندگی میں عظیم الشان ترقیوں اور ان کے عروج و غلے دنیا کو ایک نئی تہذیب سے آشنا کیا تھا مگر ہماری یہ ترقی اٹھارہویں صدی تک پہنچنے پہنچنے رک گئی اور بڑا شدید انحطاط آگیا۔ اس کی بڑی وجہ ہمارا فوجی و سیاسی زوال ہے۔ اُدھر تہذیب مغرب نے بھی ترقی شروع کر دی تھی۔ لیکن باوجود ان باتوں کے مسلمانان ایشیا و افریقہ ان پچھلے سو سالوں میں اپنی ترقی و آزادی کے لئے جو جدوجہد کر سکتے

اس مرحلہ پر اوردی بڑی بنیادی اہمیت حاصل کر جاتا ہے۔ اس پر شک نہیں کہ عہد حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر اسلام کی تعمیر نو ایک عظیم مہم ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے بیسویں صدی کے وسط میں ایک نئی حیات کی تعمیر۔ مگر اسلام نے خاصی میں جو ترقی کی ہے وہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اسلام ہر عہد کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ ایک زندہ و متحرک مذہب ہے۔

حکومت پاکستان نے ان مقاصد کے حصول کے لئے ایک مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی قائم کیا ہے جس نے اپنے سامنے ایک بڑا مہتم ہائشان لائحہ عمل رکھا ہے۔ امید ہے کہ جن دیگر اسلامی ملکوں میں تحقیقی کام ہو رہا ہے وہ بھی ان اصولوں کے اطلاق کے باب میں غور و فکر کی بیج واضح کر سکیں گے۔ نیز ایسے اداروں کے درمیان تحقیقات اور تحقیقی کام کرنے والوں کا تبادلہ بھی کیا جائے گا۔

انشاء اللہ ہم اسلام کی نشاۃ الثانیہ اپنی زندگیوں ہی میں دیکھ سکیں گے۔ مگر ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں کا شیخ خود اسلام کی توانائی پر موقوف ہے، اسلام جو خالص اور تخلیقی ہو۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کی ترقی اور روحانی فلاح ایک مضبوط توانا اسلام ہی میں مضمر ہے: (تخصیص)

اخلاقی گراؤ میں۔ اسلام نے ان دونوں چیزوں کی بیج کنی کی ہے اور ایک بار پھر نوز انسان کو ان سے نجات دلوا سکتا ہے، چنانچہ دنیا کے اکثر مفکرین، جیسے ٹائن بی، اسلام کی ان خدایات کے معترف اور اس خیال سے متفق ہیں۔

بیسویں صدی میں تہذیب کی ایک اور خدمت جو مسلمان کر سکتے ہیں۔ وہ آمدنیوں کی منصفانہ تقسیم ہے۔ اسلام نے قوم معاشری ناچھوڑی اور زور دے کر لئے یہاں تک زور دیا ہے کہ نماز بھی اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک معاشری اقتصاد کی انصاف قائم نہ ہو۔ مختصر یہ کہ اسلام ہر قسم کے استحصال اور طبقاتی کشاکش کے خلاف ہے اور ان مفاسد کو دور کرنے کی تدبیریں بتا سکتا ہے۔

میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اسلام موجودہ عہد کی تمام معاشری برائیوں کا حل بتا سکتا ہے۔ اسلام کے اصول، جیسا کہ میں نے کئی عرض کیا، ابدی ہیں مگر ان کا جدید اطلاق حل مسئلہ ہے۔ جو چیز تفسیر پذیر ہے وہ اصول نہیں بلکہ ان کا اطلاق و استعمال ہے۔ مرحلہ اجتہاد کام لینا۔ اس ضمن میں اجراع پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اجراع نام ہے "اجتماعی اتفاق" کا۔ اجتماع اسلامی عقائد، قانون اور نظم سیاست کے ہر شعبے میں عام باتوں پر مبنی ہے۔ اس لئے اجتماع کا وسیلہ یعنی اصول اسلام کے استعمال پر مگر غور و خوض، ہماری تاریخ کے

پاکستان کے فضاء حکام اور خود عوام تک میں اسلامی اقدار کے قیام و استحکام کا شوق ہے، پایاں رکھتے ہیں، جسے دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی۔

دعوت اسلام کی روح ہے عالمگیر امن و سلامتی اور اخوت و مساوات۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے یہاں لوگوں میں بڑا محنت جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ ان مقاصد کے حصول پر ہی دنیا میں ایک ارفع اور بہتر معاشرہ کی تشکیل مندر ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو نئی روح سے سرشار ہو اور اس کی اخلاقی سطح بلند ہو۔

تعلیم کے باب میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایسی تعلیم جو دینی تعلیم پر مبنی نہ ہو انسان کو سہا مسکن نہیں جاسکتی۔ مادہ سے ٹھری ہوئی اس دنیا میں مسلمان کا مناسب ایک ارفع و صلح معاشرہ کی تعمیر ہے۔

اس وقت ہر اسلامی ملک میں مسلمانوں کو کئی خطرات درپیش ہیں اور ان میں سب سے بڑا خطرہ اس حملہ سے ہے جسے ثقافتی حملہ کہا جاسکتا ہے۔ افسوس کہ ہر اسلامی ملک میں مغرب کی بہت سی مادی و ذہنی فتوحات نظر آ رہی ہیں اور اس وجہ سے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر جگہ اس فتنے کے استحصال کے لئے کام کریں۔

حکومت پاکستان نے ملک میں "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے قیام سے اس فتنے پر صبح قدم اٹھایا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب، مفتی اعظم پاکستان،

داستانِ قفس

(بہادر شاہ ظفر اور حضرت شاہ زمانی بیگم کے دو خطوط)

شہزادِ نعیم آرزو

کی سختیاں بڑھنے اور دیگر پریشانیوں کے باعث وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ مگر پھر بھی بعض خطوط جو دستیاب ہوئے ہیں ان کے ایام اسیری پر بڑی اچھی روشنی ڈالتے اور ان کی ذہنی کیفیت کی ایک جھلک دکھاتے ہیں ذیل میں ان کا ایک خط اور ان کی بہو، حضرت شاہ زمانی کا ایک خط پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں ہم میرے علم میں ہے دونوں خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلا خط شہنشاہِ ہند کا ہے جو انہوں نے اپنی ایک صاحبزادی، حضرت کلثوم زمانی بیگم کو رنگون سے بھیجا تھا۔ دوسرا خط ان کی بہو، یعنی شہزادہ خواجہ کی بیگم صاحبہ کا ہے۔ یہ خط انہوں نے ایک بزرگ، سائیں بیکل شاہ کی معرفت دہلی اپنی والدہ صاحبہ کو بھیجوا یا تھا ان خطوط کی اصل اس وقت کہاں ہے، یہ کہنا مشکل ہے۔ بہر کیف، مجھے ان کی نقل خود اپنے ہی خاندانی کتب خانہ سے دستیاب ہوئی ہیں۔ میرے پسر دادا، مجاہد الملک مولانا جعفر خاں صاحب بریلوی کے ذاتی کتب خانہ میں جہاں اور ملی نادر کا ذخیرہ ہے وہاں بعض مشاہیر کے خطوط بھی ہیں۔ مجاہد الملک مرحوم نے یہ نقول دیوبند کے ایک علم دوست سے حاصل کی تھیں اور انہوں نے یہ دہلی سے بطور خاص کسی ذریعہ سے منگائی تھیں:

(۱)

”قید خانہ رنگون۔ ۱۸ مئی ۱۸۶۰ء

تم نے اپنے قیدی: پ کو خط بھیجنا خط کیا تھا میری جان آنسوؤں تھا۔ جوں بخت بہادر شاہ کے چیتے بیٹے نے چڑھ کر سنا یا ایک دفعہ نہ جانا بھلا کہا بیٹھ کر سنا۔ پھر نہ وہ بھی رہا۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے میگیں۔ میں نے کہا۔ یا ایک دفعہ اور پھر صبر کیا کھوٹا دلی بیٹی۔ کہ تمہارا رستہ خد کا مجھ پہنچا اشرمِ حیاتین دفعہ خنکے کے بعد بھی دل کو قرار نہ آیا۔

آخری شہنشاہ ہند، بہادر شاہ ظفر اور ان کی بہو، حضرت شاہ زمانی بیگم صاحبہ کے یہ خطوط ایک یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ آخری بد نصیب شہنشاہ ہند کو دہلی سے رنگون جاتے وقت ہزینتا سخت فوری پہرہ میں لکھا گیا تھا اور رنگون پہنچے پر بھی یہ پہرہ برقرار رہا، بلکہ سخت کر دیا گیا۔ یہاں وہ لکڑی کے ایک بنگلہ میں قید کئے گئے تھے۔ ایام اسیری کے دوران وہ اس بنگلہ سے کبھی باہر نہ نکلے۔ بستر پر بٹھے حق سے شغل کرتے رہتے یا کبھی کبھی اپنے شعر گنگا یا کرتے۔ پھلی ہاتوں کی یاد آتی تو زخموں پر ٹھک کا کام دیتی۔ ایسے عالم میں وہ اپنے چیتے بیٹے جوں بخت کو بلا کر اس سنگدل دنیا کی بے وفائی اور سخت کی نادرسانی کا دکھڑا روتے۔ جب مکر و ہات دنیا سے دل بہت بڑا ہو جاتا تو اللہ سے کوڑھتے۔ دلی سے روانگی ہونے والی تھی کہ ایک غزل ہوئی جو اداسی، بھاری گی اور اوس کی منہ بولتی تصویر تھی۔ چند شعر ہیں:

جلا یا رنے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس آنجن سے چلے
نہ باخباں نے اجانت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے، روتے ہیں ہم سے چلے
موت پہ دامن مھولنے پر وہ پوشی کی
برہنہ آئے تھے، لپٹے ہوئے کفن سے چلے

قید کے ان پرآلام دلوں کو انہوں نے بڑے صبر و ضبط اور کامل شکیبائی کے ساتھ گزرا۔ وطن کی تباہی، دلی کی بربادی اور یادوں کے بھڑکنے پر خاص طور سے دیگر دلوں رجتے تھے۔ کبھی کبھی انہوں نے کچھ خطوط بھی کھوئے اور دلی بھیجے۔ مگر ظاہر ہے کہ نقل کربات نہیں کر سکتے تھے۔ خطوط کے پکڑے جانے، امیر

تو سب کچھ سہنا پڑے گا۔

ایک دفعہ عید کے دن چند مسلمان کچھ محتائف لیکر آئے۔
مخبر ساتھ آئے۔ میں نے ان کے خیال سے کہا بھائی میں نہیں لے سکتا۔
انہوں نے اصرار کیا میں نے مجبوراً لے لے اور اس کے بدلے ملک کا ایک
داران کو دے دیا۔

دوسرے دن حکم آیا ان کے پاس جاہرات بہت زیادہ تھیں
جو خرچ دیا جائے وہ بہت زیادہ ہے آج سے آدھا خرچ کر کے دیکھو۔
بشی ایک بات ہو تو لکھو آؤں۔ لفظ ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔
اب تو میرا کچھ بچہ کرنا ہو گیا ہے۔ پہلے بہت اثر ہوتا تھا کئی کئی وقت رنج
اور صدمہ کے سبب کھانا نہیں کھاتا تھا۔ مگر اب مساوات سی ہو گئی ہے۔
بھوک تو دہلی ہی میں کم ہو گئی تھی۔ یہاں کی ہوا ایسی ہے کہ کئی کئی دن کچھ
نہیں کھاتا۔

شاعری میں اشک غم بہنا، سخت دل کھانا سنا تھا، یہاں یہ
روز مرو ہے۔ اچھا بچی اب زیادہ لکھوایا نہیں جاتا۔ خلاصہ کو یہاں
لایا اور تم میری زندگی تک یہاں آگئیں تو دل کی باتیں کہیں گا اور دل کی
میں جہاں جہاں نہ ختم ہیں دکھاؤں گا۔

کیا خبر ہے یہ خط تم کو ملے گا بھی یا نہیں۔ سنتا ہوں وہ آدمی
معتبر ہیں جن کے ہاتھ یہ خط بھیجا جائے گا لیکن کتنے ہی معتبر آدمی میں نے
اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ جو آخر کو دغا باز اور دوسروں کے غم و غنا
ہوئے اور اس خط میں ایسا لکھا ہی ہے جس کی مجھے فکر جو ایک باپ نے
ایک بیٹی کو ایک پرزہ لکھوایا ہے نہ اس میں اپنے ملک کی کوئی بات ہے
نہ غیر ملک کا کوئی ذکر ہے۔ بس بیٹی اللہ بس باقی ہوں۔

تمہارے قیدی باپ لکھوایا۔
دیکھا آپ نے بے بسی اور بے کسی کا مرقع، انگریزوں کے ظلم و ستم۔
لیجے اب اس ملک کی نہان سے سنئے جس کی شادی میں غالب اور
ذوق سہرے کھ کر آپس میں اچھ پڑے تھے، جو دہلی کے آخری بادشاہ
ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی بہو تھی، جس کے سرتاج کو ہندوستان
کا دلی عہد بہادر بنانے کے لئے زمین و آسمان ایک کر دئے گئے تھے۔
ملک برما

دلی کے قیدی بادشاہ کا گھر

اماں حضرت کو آداب!

میں آپ کی بیٹی کا لے پانی میں ہوں اپنے وطن دلی سے

نکاہتی ہو میری جان! دلی والے مجھ کو روکنے ہوں گے تو کیا
وہ نہیں جانتے کہ میں بھی ان کو روکتا ہوں۔ میں تو زندہ بیٹھا ہوں وہ تو
بن آئی مر گئے۔ کتنوں کے باپ۔ کتنوں کے بیٹے۔ کتنوں کے بھائی
بھائیوں پر چڑھ گئے، کتنے بچے یتیم ہو گئے کتنی عورتیں لاش ہو گئیں۔
گھر لٹ گئے نہیں بلکہ کھ گئے اور گدھوں کے بل چل گئے۔

دہلی میں جب میل مقدسہ ہو رہا تھا اسی زمانہ میں تباہی و
برہادی کے سینکڑوں قصبے تھے۔ میرے یہاں آجائے کے بعد خبر نہیں
اؤ لکھا کیا ہوتا تیس شہر والوں پر پڑی ہوں گی۔

میری جان، یہ سب میرے اعمال کی شوقی تھی سچا ہیوں نے
بھی تو غضب کیا تھا بھلا عورتوں اور بچوں کو مارنا کس مذہب میں آیا
ہے؟ مگر کیا کسی نے بھروسہ کسی نے بغیرا شہر تھی۔ جو کس دہلی والوں
یا نہیں کچھ فائدہ نہیں۔

تم نے یہاں آئے کو لکھا ہے۔ تم آسکو تو میرے قید خانے میں
عید ہوگی۔ مگر خبر نہیں فیکہ کرنے والے تم کو فیکہ یا روک دیں گے۔ اپنا زبان
سے تو کسی سے کہو نہ گناہیں کیوں کہ شروع شروع جرات میں نے کئی
دہلی اٹھی میرے منہ ہمارے گئی اس کے بعد میں نے خند کرنا کہا کہ اب
کبھی کچھ نہ کہوں گا۔ ان کو ہر بات سے شک ہوتا ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ
میرا یہاں کون ہے اور جہاں تھے وہاں انہوں نے میری کیا کر دی۔

ایک دفعہ میں نے کہا یہاں مینہ بہت برستا ہے اور جو
مکان رہنے کو ملا ہے۔ وہ برسات کے لئے اچھا نہیں ہے۔ پکیتا ہے
بوجھال آتی ہے۔ کوئی اور اچھا مکان ہونا چاہیے۔ جواب ملا کیا
تمہارے لئے لال قلعہ منگوا دیا جائے! یہاں تو ایسے ہی کھڑکی کے
مکان بنتے ہیں اس لئے اچھا کوئی مکان نہیں ہے۔

جواب سنکر ہنسنا سامنے لیکر رہ گیا۔ ملک نے کہا بھی کہ جواب
دینا چاہیے کہ کھڑکی کے مکان بھی یہاں اس مکان سے دس درجہ
اچھے اپنے موجود ہیں مگر میرا دل پھوٹا ہو رہا ہے ٹھیس لگی ہے۔
آئندہ آئے اور چپ ہو گیا۔

ایک دفعہ بنگال کے کوئی زمیندار ملنے آئے۔ میرا چاکلہ ہنگام
یرمے ایک غزل جہاں بخت سے لکھو کر دے دی۔ ہا ہر گئے تو ان کی
کاشی ہوئی اور مجھ پر خطاب نازل کیا گیا کہ غزل دینے کا کیا مقصد بنگال
قیدیوں کو کوئی تحریر ہا ہر دینے کی اجازت نہیں۔ ملک کو
پر غصہ آیا۔ مگر میں نے کہا باقی خفا ہوتی۔ ہو خدا نے قیدی بنایا

جو خط لکھا تھا اس میں ان کا بھی دخل تھا۔ اور بنارس اسی غرض سے گئے تھے کہ بت چھپانے کا ایک بہانہ ہو جسے میں نے آکا بھائی کا محل متنا کر انہیں بڑی بیداری سے پھانسی دی تھی اور آپ خود پھانسی کے وقت موجود نہیں تو مجھے مانے غم کے خش آنے لگا۔ ہم جب دلی سے جلاوطن ہو کر چلے ہیں اس وقت تک تو وہ بنارس سے آئے نہیں تھے ان کی چھوٹی لڑکی کا بیان کر کر کے رونا سائیں صاحبہ سے سنا تو کلیجہ منہ کو کاٹنے لگا۔ اس کی عمر بھی چار برس کی ہوئی۔ غریب کو کھانا خرک باپ کہاں چلا گیا اور جب میں نے سیدہ کی یہ بات سنی کہ آکا بھائی کی لاش گھر میں آئی تو اس نے آپ سے کہا:

”ابا حضرت ہم سے خفا ہو گئے ہیں۔ بولتے نہیں۔ آنکھ بند کئے لیٹے ہیں۔“ تو میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سیدہ مجھے بہت یاد آتی ہے اور جب سے آکا بھائی کے مانے جانے کا محل سنا ہے سیدہ کا خیال رونا سنا ہے۔ موتی مٹی کی نشانی ہے۔ میں اس کو دیکھتی تو دل کے زخم پر مریم لگ جاتا۔ مگر میں کہاں اور سیدہ کہاں اور میرے ماں باپ کہاں اور دلی شہر کہاں۔ اب تو کوئی امید دہلی آسکنے کی نہیں ہے۔

ہمارے بزرگوں پر بہت ہی برے وقت آنے لگے ہیں حضرت باہر ہم سے زیادہ مصیبتوں میں پڑ چکے ہیں۔ مگر وہ اتنے مایوس نہیں تھے جتنے مایوس ہم ہیں۔ کیونکہ ان کی ہمت کے آگے ساری دنیا کے درد مانے کھلے ہوئے تھے۔ ان کی تلوار میں زور تھا۔ وہ جب چاہتے تھے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ان کی حمایت کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کی مصیبت دور ہو جاتی تھی۔ مگر چارہ یہ حالت ہے کہ اس شہر کا ایک آدمی بھی

ہزاروں کوں دور، یکے سے جدا اور ایسی جدا کہ اب جیتے جی کبھی کسی جیکے والے سے ملنے کی آس نہیں ہے۔ آپ کا خط سائیں سبیل شاہ صاحب لے کر آئے تھے۔ جب وہ حضور سے باتیں کر رہے تھے تو میں نے چمن میں سے دیکھا وہ نازدار اور رہے تھے اور حضور کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ باتیں کر کے سائیں صاحبہ ان کے ساتھ میرے کمرے میں آئے اور خط دیا خط دیتے ہی رونے لگے۔ مجھے بھی وہ وقت یاد آ گیا جب میری شادی ہوئی اور غالب و ذوق کے ہر رنگا چرچا ہوا اور میں نے آپ کے ذریعہ وہ دونوں سہرے منگوائے تو یہی سائیں سبیل شاہ لیکر آئے تھے۔ اس وقت میں ولی عہد ہند کی ملک تھی۔ سائیں سبیل شاہ سات ڈیڑھ بیسویں اور سہرے داروں کو عبور کر کے مجھ تک آئے تھے آج میں ایک جلاوطن قیدی ہوں اور ایک قیدی کی جیوی ہوں۔ قیدی ساس سسر کی بہو ہوں۔

اب نہ یہاں وہ لال قلعہ ہے، نہ سات ڈیڑھ رھیاں ہیں، نہ پہرے دار۔ بس لکڑی کا بنا ہوا ایک مکان ہے جو برسات میں ٹپکتا ہے اور جس میں دو چانکروں کے سوا زیادہ گنجائش نہیں ہے ایک کمرے میں حضور ملک عالم کی خواب گاہ ہے۔ دوسرے میں میرا اور ان کا بستر ہے۔ تیسرے میں تو کمر ہیں۔ چونے میں کھانے، ملنے جلنے کا انتظام ہے۔ مجھے یہاں کی ہوا اس نہیں آتی۔ بارش بہت ہوتی ہے۔ مجھ پر بہت ہیں مکان بھی پرانا اور بوسیدہ ہے۔ اکثر بخار ہو جاتا ہے حضور اور ملک عالم بھی بیمار ہوتے ہیں خدا کے فضل سے یہ بس ایسے ہیں کہ جن کو یہاں کی ہوا سے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

آپ نے دلی کی تباہی کا جو حال لکھا ہے وہ تو جب ہم دلی میں تھے انہی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے ہاں آکا بھائی کی پھانسی کا حال اس خط سے معلوم ہو گا تو خدا کے دونوں ہاتھ اس لئے تھے ان کو کس خط پر پھانسی دی گئی یہ بات آپ نے نہیں لکھی۔ سائیں صاحبہ سے میں نے پوچھا کہ تھکے حضرت سید حسن عسکری قبلہ کو پھانسی دی گئی تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ بھی ان کی سازش میں شریک تھے اور شاہ ایران کو

تہ شاہ تاجہ رقبہ از غدا بنظر سراج الدین محمد بابر شاہ اور شاہ ایران میں خط و کتابت ہوئی تھی اور شاہ کا کام سید حسن عسکری نے انجام دیا تھا۔ سید حسن عسکری ایک بڑے خدادید بزرگ تھے دلی میں ان کی بزرگی کے بڑے چرچے تھے۔ اس خط و کتابت کا بعد کو زکھل گیا اور سید حسن عسکری کو خدا کے بد پھانسی دے دی گئی اسی دوران میں کئی شخص نے یہ کہہ دیا کہ اس سازش میں آکا بھی شریک تھے اس نے ان کو بھی پھانسی دے دی گئی۔

شاہ آکا اور شاہ زمانی بیگم کی والدہ

سیدہ سلطانہ، آکا کی چھوٹی بیٹی

شاہ زمانی بیگم کے بھائی آکا کی چھوٹی بیٹی سیدہ سلطانہ

شاہ بنظر سراج الدین محمد بابر شاہ

شاہ زمانہ جو ان بخت

شاہ زمانی بیگم کے بڑے بھائی۔

اس ملک کی زبان اور ہے۔ مذہب اور ہے۔ رہنما سہناہ
کھانا پینا سب ہم سے اجنبی ہے۔ یہ جانتے بھی نہیں کہ ہم کون ہیں اور
یہاں ہم کو کیوں قید کیا گیا ہے۔ اماں بی ہمارا یہ قید ایسا قید ہے کہ
نہ ہم قید ہیں نہ آزاد، نہ زندہ نہ مردہ۔ اپنے گھر میں اپنے شہر میں اپنے
ملک میں جا نہیں سکتے اس لئے قید ہیں۔ طوق و زنجیر لگے اور پاؤں لکڑی
ہیں ہے اس لئے آزاد ہیں۔ سب دوستوں قربت داروں سے جدا
اس لئے مردہ ہیں۔ بولتے چلتے کھاتے پیتے ہیں اس لئے زندہ ہیں۔
کہاں تک لکھوں ساتیں سبیل شاہ کی زبانی سب حالات معلوم
ہو جائیں گے۔ سیدہ سلطانہ کو گود میں لینا۔ سینے سے لگا کر منہ چونا
اور کہنا کہ بھوپا کا پیار لو۔ ابا حضرت کو یاد نہ کرو۔ یہیں بھی بھولی ہاؤ
نہ وہ ملیں گے نہ ہم ملیں گے۔ وہ بھی قبر میں ہیں اور ہم بھی قبر میں ہیں۔
ان کی قبر وطن میں ہے اور ہماری قبر پردیس میں ہے۔ جب تک ہم زندہ
ہیں قبر میں ہیں جب مر جائیں گے تب بھی قبر میں ہوں گے۔

آداب اماں جانی۔ تسلیم
خالی گود والی۔ آپ کی بیٹی شاہ زبانی بیگم۔

ہمارا ہمدرد نہیں معلوم ہوتا۔ دنیا میں ہمدردی جب ہی ہوتی ہے جب
ہمدردی کرنے والے کو کسی سے کچھ امید ہو۔ ہم سے بھلا کسی کو کیا
امید ہوگی؟ سب جانتے ہیں کہ ہماری حکومت ختم ہو گئی ہمارے
افہاں کا چرخ گل ہو چکا ہمارے سب حمایتی مر چکے۔ اب جو ہادی
مدد کا اللہ کرے گا یا ہم سے ہمدردی رکھے گا اسے قید ہوگی یا پھانسی،
اور کوئی انعام و اکرام ہم اسے نہ دے سکیں گے۔ حضرت امام حسین
کے قاتلوں کو زندہ رکھے دربار سے بہت کم گزرا ملتا تھا یعنی فی کس
ڈیڑھ سیر جو دئے جاتے تھے اور قاتلوں نے محض ڈیڑھ سیر جو کئے تھے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کو قتل کر دیا۔ اگر حضرت امام حسین
ڈیڑھ سیر جو شاہی فورٹ کے ہر آدمی کو دے سکتے تو وہ قاتل ان ہی کے
ساتھ ہو جاتے۔ ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے کہ آج ہم اپنے ہمدردوں
اور حمایتیوں کو ڈیڑھ سیر جو بھی نہیں دے سکتے پھر ہم سے کوئی کیوں
ہمدردی کرے؟ اور ہماری حمایت کا خیال اس کے دل میں کیوں آ
یہ دنیا تو امید پر قائم ہے جب ہم کسی کی کوئی امید پوری نہیں کر سکتے تو
وہ ہماری مدد کیوں کرے؟

کشمیر: ادب و ثقافت

(زیر طبع)

کشمیر پر اس وقت سامری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں

جواں سال ادیب، سلیم خاں گتی

نے اس سرزمین لالہ گل کے ادب و ثقافت پر ایک عظیم دستاویزی تصنیف پیش کی ہے، جو اس جنتِ نئی کے نام
ادبی و تہذیبی گوشوں پر بڑی بیحد روشنی ڈالتی ہے۔

اشاعت کا انتظار کیجئے

ادب و مطبوعات پبلیکیشنز، پوسٹ بکس ۱۸۳، طراچی

شعلہ جوالہ

عارف حجازی

کنج کے آجاتے ہیں دامن میں مرے ماہ و نجوم
گیسوئے نور پریشاں کئے شانہ شانہ
دبدم اور ابھرتا ہوا چہرہ لے کر
وادئی دل میں اتر آتا ہے ابرہی نور
جلتی ہر سو نگہ شوق کی لاکھوں شمعیں
پھر کوئی مطربہ شوخ و ثمریر
تازہ افکار کا شعلہ ناہید
چھڑ دیتی ہے رگ جاں کا باب زلتار
پیکر شعلہ بدایا مان سرود
جو تختیل کے سبک سیر پروں پر مجھ کو
لئے جاتا ہے خلاؤں سے پرے دو کہیں
ایک بازی گرا و ہام کہ الہام کا اعجازِ بلام!

★

ایک فن کا زمرے فکر کی تصویر حسین
یہ جہاں تاب مناظر، مہ و انجم، یہ زمیں
میرے افکار سے تابندہ جہان رنگیں
فن کی عظمت کا امیں شعلہ جوالہ ہوں
صبحِ افروز کہ تارا کی زلفِ شب رنگ
نفسِ غم ہوں، لبِ نغمہ پر سوز ہوں میں
قصہ درو کہیں، خلد کا افسانہ کہیں
نقشِ فریاد کہ تصویرِ نیشا طِ گل کار
جھوٹے خونِ ناب سر کوئے ندامت کا جوار
رفعت و عظمت کہسا رنگوں ہے مجھ سے
دشت کی روح، خلاؤں کا ضمیر
ماوراءِ دید سے تاریک خلاؤں میں گزر
جب بکھر جاتا ہے افلاک پہ خوابوں کا فوس

غزل

شیر افضل جعفری

محشر بکلائیونی

اپنی سی تہنائی دے
خلوت اور پہنائی دے
وہ بندہ آرائی دے
جس پر جان خدائی دے
زگس ہوں، بینائی دے
گل کی طرح دکھائی دے
دل کے چھلکتے راوی کو
ڈونگھا کر، گہرائی دے
صامت کو نعمات سکھا
گونگے کو شہنائی دے
جھولے عرشیں معالیٰ پر
روح کو وہ انگڑائی دے
تیری بے آواز صدا
مجھ کو روز سنائی دے
سُن کر یہ گبھی غزل
کیوں نہ داد بھنائی دے

گھر کے طاقتوں کی کھیس گے ہم آبرو شیشہ و جام لاکر تمام ایک دن
میکدے کی نگاہوں میں گستاخ ہیں میکدے کو کیلے سلام ایک دن
اس گراں قید نہ بخیر و بدیل سے پاؤں کھٹنے تو دوسرا ٹھکانے تو دے
دیکھنا تم کہ مدوارہ عقل پر نقش ہوگا ہمارا بھی نام ایک دن
کام آنکھوں کا جاری ہو جاری ہے زخم کاری یونہی زخم کاری ہے
دیکے دیپ اگر یوں ہی جلتا رہا صبح بخائیگی گھر کی شام ایک دن
ایک اک تار و موج نظر ہے کاب جتنوں کی شعاعوں کے زنجیر ہے
خط رنگ نگہ بن گیا تھا اندازہ خجڑوں بارے بام ایک دن
انہی قسمت کا بھی ابراٹھے کا کسی یہ بھی ہونگے صفائے بالیدگی
یہ بے سبزہ خس یہ سوکھے شجر رک دیئے صبا کا خرام ایک دن
فرض کا جبر کو چہ بہ کو چہ لئے جا رہا ہے ہمیں پا بجلاں کئے
اتنی مہلت نہیں ہے کاب ہم کہیں زیر دیا رکھیں تمام ایک دن

غزل

شاہد عشق

مشتاق بہادر

بچینے دیا نہ کچھ تو غم روزگار سے
کچھ کاروانِ زلیبت کے گرد و غبار سے
ہا ہوا ہوا پھر بھی نہ اٹھنے دے قدم
منزلِ رسی کے جذبہ بے اختیار سے
دل کو نشاطِ غم کا بھی محرم بنا دیا
حیرت بدوشِ عشرتِ ناپائیدار سے
کیا کیا دے فریبِ عروج و کمال کے
نوعِ بشر کو منزلتِ مستعار سے
ہونے دیا نہ باخبرِ کیفِ زندگی
مجھ کو مرے مزاجِ حوادثِ شمار سے
اس رقصِ رنگ و بو کا بھی اجماع ہو بخیر
صبحِ چمن میں آگ لگا دی ہوا سے
شایانِ تخت و تاجِ نیابت بنا دیا
انساں کو دانشِ مہ و انجمِ شکا سے
شیرازہٗ حیات کو یک جان کر دیا
اس زلفِ مشکبوی کے حسین انتشار سے
اس نو بہارِ ناز سے وابستگی کے بعد
رکھنا نہ پھر کہیں کا دل بے قرار سے
حاصل ہوا نہ مل کے بھی ان سے تھا عمر
وہ لطف جو دیا غمشِ انتظار سے
ہم اپنے دل کی بات کو ہرگز نہ مانتے
مجبور کر دیا نگہِ شرما سے
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ دوچند کر دیا
رودادِ دردِ دل کا مزا اختصار سے

دل میں عشق کی آگ ہے سرمیں سودا پری جالوں کا

اپنی سمجھ میں آج آیا ہے بن بن پھر ناغز الوں کا

خضر سار بہر شہر بتاں میں کس کے کام آسکتا ہے

عہدِ جوانی میں مرجانا شیوہ ہے دل والوں کا

جب بھی کسی کی یاد آتی ہے شوق سوا ہو جاتا ہے

جیسے سحر کے ہوتے ہوتے پھیلے رنگِ جالوں کا

لے شبِ فرقت بھی کاٹ آئے بازیِ دل بھی ہار چکے

آج حساب چکاتے ہیں ہم سارے گزشتہ سالوں کا

یہ بے خواب نگاہیں تیری یہ ویراں ویراں چہرہ

کس کے پاس جوابِ عشقی ان خاموش سوالوں کا

یہ دن، یہ راتیں

انور

وہ اپنی جگہ پر موجود ہیں، تو پھر ثقافتی سرگرمیاں بھی یہیں کہیں ہوتی ہیں۔ ثقافت تو ایک ورثہ ہے۔ اس ورثہ کو کون روک سکتا ہے۔ اس کو تھپڑوں اور ہاتھوں کے دروازوں میں بند نہیں رکھا جاسکتا۔ ثقافت تو ہماری سرکوں پر، ہماری مسجدوں میں، ہمارے لباسوں میں، ہماری باتوں میں، ہمارے سحری اور افطاری کے ساز و سامان میں، ہر جگہ، ہر مقام پر موجود ہے۔ اور عید ہماری ثقافت کا ایک عظیم الشان مظاہرہ ہے۔

بندہ وڈا انسانوں کا ایک بہت بڑا دریا بن گیا ہے، اور صدر انسانوں کا ٹھکانہ بن گیا ہے۔ یہاں سمندر یہ بے پناہ ہجوم عید کے استقبال کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ عقیدہ مند لوگ ایک جہیز میں اپنا سب کچھ خرچ کر کے گیا رہ جہیز اپنا قرضہ امارتے رہیں گے۔ پہلے زمانے کے لوگ کیا رہ جہیز لیا کر ایک جہیز میں خرچ کرتے تھے۔ لیکن اب پہلا زمانہ کہاں ہے؟ پہلے اتنی منہنگی کہاں تھی؟ اب عید کا چاند نظر آگیا ہے، ہولڈوں نے عید کا اعلان کر دیا ہے۔

عید کی خرید و فروخت رمضان کے آغاز سے ہی جاری تھی لیکن عید گاہ میں میں نے دیکھا کہ جناح کیپ صرف چند ایک کے سروں پر تھی، باقی سب اپنے سروں پر دو مال باندھے ہوئے ناز بڑھ رہے تھے۔ شاہک سکس کی شیردانی کسی کسی نے پہنی ہوئی تھی۔ زیادہ تر نازی صاف ستھرے معمولی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ہاں جھنگائی ناقابل برداشت ہے۔

عید کی ناز کے اختتام پر میرے ایک دوست نے مجھ سے ہنسی بھری ہونے کے بعد مجھے اپنا پان کی ڈبہ کھول کر ہان پیش کیا، اور ایک قرمری رنگ خنجر کے ٹوے میں جس پر گولے لگے گولیاں

کراچی کے دن رات کے بارے میں سب سے بڑی حقیقت جو دنیا کے ہر جغرافیہ دان کو جاننی چاہیے یہ ہے کہ کراچی میں دن رات نہیں ہوتے۔ خط استوا پر دن رات برابر ہوتے ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی میں دن رات چھ جہیز کے ہوتے ہیں اور کراچی میں دن رات ہل نہیں ہوتے۔ کراچی میں صرف کراچی ہوتی ہے، صدر ہوتا ہے، نالو کھیت ہوتا ہے، کلفٹن ہوتی ہے، لیاری کا لونی ہوتی ہے۔ اور اگر جغرافیہ کی زبان میں بات کرنا بہت ضروری ہے۔ تو یہ کہنا چاہیے کہ کراچی میں صرف دن ہوتا ہے یا صرف رات۔

لیکن مجھے بتا دیا گیا کہ اپنی اس ریڈیائی تقریر میں مجھے کراچی کا نیا جغرافیہ بیان نہیں کرنا، بلکہ کراچی کی ان ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی ذکر کرنا ہے جو پچھلے دو ہفتوں میں دن کے وقت اور رات کے وقت کراچی میں وقوع پذیر ہوئیں، یعنی ریڈیو جغرافیائی زبان میں مجھے کراچی کے ادبی اور ثقافتی موسم کا حال بیان کرنا ہے۔

اب میں کراچی کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں کہیں نظر نہیں آتیں اور مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔ لوگوں کو ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی فرصت نہیں، وہ سب عید کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ کلرک اپنے ٹکے کے افسروں سے تنخواہوں کے ایڈوانس مانگ رہے ہیں، ان کی بیگمات بندہ روٹو پر بڑا زون کی دکاؤں سے ساڑھی خرید رہی ہیں، ان کے بچے صدر میں ٹیڈی بیلرز، گھڑ پٹاپٹوئیں اور گین گین کے فراک سلوانے کے لئے اصول کر رہے ہیں، اور ان کے ماں باپ خفا ہو کر کہہ رہے ہیں، یہ بے شرمی ہے، یہ عوامی ہے، یہ لباس ہماری تہذیب اور ہماری ثقافت کے خلاف ہے۔ گویا غیر ثقافتی سرگرمیاں جاری ہیں۔ وہ غائب نہیں ہوئیں

کے سمجھے اس کے خاندان کی پوری تاریخ، پوری تہذیب اور پوری ثقافت ہے۔

میرے دوست نے کہا:

”اچھا ہم اس کے دہی بڑے چکھیں گے۔“

اور اس نے اپنا پان دہی بڑے کی دکان کے سامنے آکر دیا اور ہم دہی بڑے کھانے میں مشغول ہو گئے۔ دہی بڑے کھاتے ہوئے میں نے کہا:

”مجھے پان کی ثقافت، اہمیت سے انکار نہیں لیکن میں صرف

یہ چاہتا ہوں کہ لوگ پان کی دہی اور چھالیہ کے بڑے کے ساتھ پیک دان بھی اٹھائے پھر میں۔ اب تنہا اسے پاس پان کی دہی ہے، چھالیہ کا بڑا ہے، لیکن پیک دان نہیں ہے۔ اس نے تم میرے دفتر کو پیک کے طور پر استعمال کرتے ہو۔ تم میرے دفتر کو پیک دان کے طور پر استعمال کر سکتے ہو کیونکہ میرا دفتر پیک دان کے سائز کا ہے، لیکن اگر کوئی تو اس آرٹ میں بہت ترقی کر لی ہے اور وہ حبیب سکوتر کو پیک دان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر ترقی کی رفتار یہی رہی تو کوئی ایک دن ایک بڑا سا پیک دان بن جائے گی۔“

دیکھئے ثقافتی پروگراموں کے فقدان کے باوجود کراچی کے پیچھے دو مہنتوں میں ثقافت کتنی سرگرم کا تھی۔

ادبی آب ہوا بڑی خشک رہی۔ صرف ”حلقہ ارباب ذوق“ باوجود صریح گجرات کے درخت کی طرح اپنی زندگی کا ثبوت دیتا رہا، لیکن ”حلقہ ارباب ذوق“ ”قصر چار درویش“ بنا ہوا ہے۔ چار درویش جید نسیم، ضیاء اللہ صری، صہبا اختر اور سید آہوجہ۔ دو اتوار ان کے ساتھ گزارے۔ ان کے ساتھ ان کے تین چار حلقہ بوش بھی تھے۔ پیچھے اتوار کو مجھے اجلاس کا صدر بنانے کے بھادیا گیا کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔ امین الرحمن نے ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان مصوری میں کلاسیکیت تھا۔ محنت سے لکھی ہوئی ریسرچ کی چیز تھی جس کے بارے میں فیصلہ دینا پڑا تھا کہ یہ مصوری کی تاریخ ہے کلاسیکیت نہیں۔ اور تسلیم کرنے کے بعد: جہاں تک اس مقالے میں مصوری کے یونانی جیسے کا تعلق ہے تو تین سو میں قبل مسیح میں جب سکندراعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، پانچویں صدی کی حکومت قائم ہوئی، ابھی حال ہی میں حکمران آغا بہادر نے کھدائی کے ذریعے

کی ہوئی تھیں، چھالیہ اور تبا کو میری طرف بڑھائے۔

میں نے کہا: ”شکریہ میں پان نہیں کھانا“

میرے دوست نے جواب دیا: ”میں جانتا ہوں، تم پان نہیں کھاتے لیکن میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ چاندی کی ڈبیہ اور یہ نعل کا بڑا مجھے میری بہن نے تجھے کے طور پر دئے ہیں۔“

بلبلان تحفوں کی بہت تعریف کی لیکن اس کے بعد کہا:

”یہ بڑے خطرناک تحفے ہیں۔ اب تم پہلے بھی لیا وہ پان کھاؤ گے اور عالم حیوانات کے ایک معزز رکن بن کر سارا سارا دن جھگالی کر دو گے۔“

میرے دوست نے کسی قدر ناراض ہو کر کہا:

”یہ تنہا ہی بڑی بد اخلاقی ہے جو تم میری بہن کے تحفوں پر

اس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے ہو۔ میں نے کہا:

”مجھے تحفوں پر کوئی اعتراض نہیں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تنہا ہی بہن ان تحفوں کے ساتھ تمہیں ایک پیک دان بھی تحفے میں دیتی۔ پیک دان بھی میں نے اخلاقا کہا ہے، ورنہ میں آگالہ دان کہتا۔“

اس پرچہ کو میرے دوست نے پان کے موضوع پر ایک مکمل تقریر عنایت کر دی جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پان کے پیچھے ہمارا ایک مکمل معاشرہ، ایک مکمل تہذیب اور ایک مکمل ثقافت پنہاں ہے۔ پان ہمارے معاشرے کے نچلے سے نچلے طبقے سے لے کر اونچے سے اونچے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ میرے دوست نے پان کی قسوں اور پانڈالوں اور پان کی طشتریوں اور پان پیش کرنے کے انداز اور معنوں اور پانوں کے متعلق تمام محاذوں پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا، ختم ہو کر پانڈالوں سے چلتے چلتے آگاہی پہنچ گئے اور میں نے اپنے دوست کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

”آؤ دہی بڑے کھائیں۔“

میرے دوست نے جواب دیا:

”نہیں، شکریہ، میں پان کھا رہا ہوں۔ اور اب نہیں یہ بھی

معلوم ہو گیا ہو گا کہ پان ہم کو دوسری گندی چیزیں کھانے سے بھی بچاتا ہے۔ میں نے کہا:

”یہ دہی بڑے گندے نہیں ہیں، یہ دہی بڑے دھابلی کا ہے۔“

اس کا خاندان سات پشتوں سے دہی بڑے بنا رہا ہے۔ ان دہی بڑے

اگرچہ اس نمائش کا تعلق براہ راست ہمارے ادب سے نہیں تھا لیکن پاک امریکن بچوں سنٹر نے اس نمائش کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اردو میں مذاکروں کا اہتمام کیا تھا جس میں اردو اور پنجابی میں بچوں کا ادب پیدا کرنے والے ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس طرح یہ نمائش ہمارے لئے ایک مخصوص دلچسپی کی حامل ہو گئی تھی۔

مذاکرے دہ دہاؤں میں تھے، انگریزی میں اردو اردو میں انگریزی کا مذاکرہ ۱۶ فروری کو تھا اور اس کی صدارت کے لئے ڈعا گودرنٹ کالج کے پروفیسر اشرف صدیقی کو بلا گیا تھا۔ پروفیسر اشرف صدیقی نے بچوں کے بنگالہ اور انگریزی میں متعدد دعویٰ کہانیاں لکھی ہیں۔ اس مذاکرے میں دوسرے حصہ لینے والے مشہور جاندھری تھے۔ اور مسٹر غلام عباس جنہوں نے FOLK TALES OF PAKISTAN لکھی ہے۔ مسٹر بینکر پاکستان بچوں سنٹر کی ڈائریکٹر بھی موجود تھیں۔

مذاکرے کا آغاز پروفیسر اشرف صدیقی نے کیا۔ انہوں نے عوامی کہانیوں کی تاریخ اور فلسفے پر روشنی ڈالی اور جب مسٹر بینکر نے ان کی تقریر کے دوران میں ان کو یاد دلایا کہ انہیں یہ بھی بتانا چاہیے کہ عوامی کہانیاں بچوں کے لئے دوبارہ کس طرح لکھی جاسکتی ہیں تو ان کا موضوع بچوں کے ادب پر آ گیا۔ ضیا جاندھری اس دوران میں مذاکرے کے کنوینر کے فرائض انجام دے رہے تھے، اور بنگالی اور انگریزی ادب کے مقررہوں میں اردو ادب کے نمائندگی کی حیثیت رکھتے تھے۔

پروفیسر اشرف صدیقی کے بعد مسٹر غلام عباس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور پھر ایک عام بحث چھڑ گئی جس میں ایڈوکیٹ حیات علی اور انور نے بھی حصہ لیا۔

اس بحث میں یہ بات سامنے آئی کہ جس طرح انگریزی میں بچوں کے لئے اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں اسی طرح اردو اور بنگالی میں بھی بچوں کے لئے کتابیں لکھی جانی چاہئیں۔

دوسرا مذاکرہ ۱۸ فروری کو اردو میں شاپا احمد دہلوی کی صدارت میں ہوا۔ اس میں ابو الاثر حفیظ جاندھری، ڈاکٹر منظور انسا صدیقی اور ابن انشا نے حصہ لیا۔

اس مذاکرے میں بھی بڑی بڑی ایسی چوڑی بحثوں کے بعد

باختری شہرہوں کے کنڈلٹ بلم کے تھے۔ ان کنڈلٹات سے جو چھراور کتبہ حاصل کئے گئے ہیں ان کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یونانیوں کے گھوڑے بڑے قد اور تھے اور ان کے سسم بڑے بڑے تھے لیکن ان سے یونانی مصوری کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ یونانی مصوری کا سر سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس تنقید پر صدر نے بحث کو ختم کر دیا اور چونکہ اس کے بعد پروگرام کے مطابق سلیم احمد کو غزل پڑھنی تھی اور وہ غیر حاضر تھے، اس لئے اجلاس برخواست کر دیا گیا۔

حلقہ ارباب ذوق کے دوسرے انوار کا اجلاس بھی نصف چار درویش تھا۔ صدارت منظور ضیائی کی تھی۔ پروگرام کے مطابق حمید نسیم کو مقالہ پڑھنا تھا۔ انہوں نے معذرت کا اظہار کیا، ان کو معذرت سمجھ لیا گیا۔ غزل گو صاحب تشریف نہیں لائے تھے۔ افسر ذرے ایک لمبا افسانہ دخیال رہے کہ میں نے لمبا افسانہ کہا ہے، طویل افسانہ نہیں) پڑھا۔ تنقید کے وقفے میں صہب اختر نے اس کو اور بھی لمبا کر دیا۔ اور حمید نسیم نے اس کو کھینچ مان کے اس سے بھی زیادہ لمبا کر دیا اور جب میں نے اس کے بارے میں کچھ کہا تو کوئی بھی نہ سمجھا کہ میں تنقید کر رہا ہوں یا تنگ آ رہا ہوں۔ اس لئے اجلاس برخواست کر دیا گیا۔

حلقہ ارباب ذوق اور ارباب حلقہ ارباب ذوق مبارکباد کے قابل ہیں کہنا سادہ حالات کے باوجود وہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں سرمورق نہیں آتے دیتے۔ ان کی تاریخ میں ایسے دنوں کی کمی نہیں جب حلقہ ارباب ذوق کا سیکرٹری خالی کرسیوں کے درمیان بیٹھا جلے کی کارروائی نہ رہے، جب وہ خود ہی جلے کا صدر خود ہی سیکرٹری اور خود ہی سامعین چوتھے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کی ادارت میں ایک ادبی رسالہ بھی جاری ہونے والا ہے۔ یہ حلقے کی ادبی خدمات اور ادوار العزیز کا واضح ثبوت ہے۔

ان ہی دنوں میں ادب کے ایک غیر مالوس گوشے سے ایک انوکھی آواز اٹھی، بچوں کا ادب۔ یہ امریکہ کے ایک اخبار واشنگٹن پوسٹ کی طرف سے تنظیم دی ہوئی بچوں کے لئے لکھی ہوئی انگریزی کتابوں کی نمائش تھی۔ جو ۱۸ فروری سے ۲۰ فروری تک آرٹ کونسل میں منعقد ہوئی۔

یہ طے ہوا کہ ہمیں بھی انگریزی کی طرح اردو میں بچوں کا ادب پیدا کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر منظور انسا صدیقی نے بچوں کے ادب کے بارے میں بڑی سیر حاصل تقریر کی۔ تقریر جب ڈرائنگ ہو گئی تو حفیظ جالندھری، طفیل جالبی، ریحان الحسن اور انور ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر بچوں کے ادب کے ان نکات کے بارے میں باتیں کرنے لگے جو ڈاکٹر منظور انسا صدیقی چھوڑ گئی تھیں یا جو بحث طلب تھے۔ اس پر ایک صاحب بگڑ گئے اور کھڑے ہو کر بولے: ”صاحب صدر، بڑی اہم تقریر چورہا ہے۔ لیکن کچھ صاحب تقریر کو خاموشی سے سننے کی بجائے آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور جلسے میں خلل ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ یا تو ان کو خاموش رہنے کے لئے کہا جائے یا پھر ان کو جلسے سے باہر نکال دیا جائے۔“ شاہد احمد دہلوی نے ہمارے طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا: آپ سے درخواست ہے کہ آپ خاموشی سے تقریر سنیں۔ اس پر حفیظ جالندھری ہم میں سے اٹھ کر مکر و فون پہلے گئے اور منظور انسا صدیقی سے بولے: ”بیٹی، میں بات کروں گا۔ اور سامعین

سے مخاطب ہو کر بولے ”پیارے، کتنا میں چھاپنے کے لئے روپیہ چاہیے۔ روپیہ کہاں سے آئے گا؟“ اس پر ایک صاحب خفتناک ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: ”صاحب صدر، یہ کون ہے جو ہم میں سے اٹھ کر آپ کی اجازت کے بغیر مکر و فون پر بولنے لگے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کو کہا جائے کہ وہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جائے اور مکر و فون ڈاکٹر صدیقی کو دے دے۔ صاحب صدر نے جواب دیا: ”مجھے حیرت ہے آپ ان کو نہیں جانتے۔“

ان صاحب نے کہا: ”جی ہاں۔ میں انہیں نہیں جانتا، یہ کون ہیں۔“

صاحب صدر نے کہا: ”یہ ابوالاثر حفیظ جالندھری ہیں، ان کو اس مذاکرے میں حصہ لینے کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔“ بعد میں جب جلسہ برخواست ہو گیا تو شاہد احمد دہلوی نے حفیظ جالندھری سے کہا:

”حفیظ صاحب، یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ ایسے بھی ہیں جو آپ کو نہیں جانتے۔“ (دہشکر یہ ریڈیو پاکستان کراچی)

”ماہ نو“ میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

- ۱۔ ”ماہ نو“ میں شائع شدہ مضامین کا معقول معاوضہ دیا جائے گا جس کے بعد وہ ادارہ کی ملکیت ہوں گے اور وہ انہیں حسب منشا ہر طور سے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔
- ۲۔ مضامین بھیجے وقت مضمون نگار حضرات ”ماہ نو“ کے میعار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطلوب ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
- ۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
- ۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
- ۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
- ۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم و تفسیح کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
- ۷۔ مضامین صاف اور خوش خط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔ مہتمم بہت صاف اور مکمل درجہ کیجیے۔
- ۸۔ اپنے مضامین نظر و نشر کی نقول اپنے پاس بھی رکھئے۔ غیر طلبیدہ اور ناقابل اشاعت مضامین کی واپس کے لئے ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کیجئے۔

بڈل

ابو سعید قریشی

ہاے تو سرکار کی طرف سے بخش۔ برابر ہے تو حوصلہ افزائی اور مال
بھر کے لئے چارکے زمین الگ۔

لوگ بڈل سے اسی طرح آشنا تھے جس طرح دریا کی بازو سے،
جوان کمر ہر سال نئی مٹی دے جاتی تھی۔ رمضان اسے کالام کے جھگڑوں سے
پکڑ کر لایا تھا لیکن اس کا بچپن کسی کو یاد نہیں تھا۔ کجوروں کے جھنڈ اور
جھنڈ کی چھاؤں میں نیلی محرابوں والے مقبرے کی طرح جس کے بارے میں
کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہاں کون دن ہے، لیکن اس کے باوجود وہ
وہاں موجود تھا۔ بڈل بھی علاقہ کی زندگی کا ایک ضروری جزو تھا۔
اس سے آگے سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا ڈولتا ہوا سایہ۔ جیسے
پہاڑ ڈول رہا ہو۔ نوگزتے پر کے عرس، کوڑی شاہ کے میلے اور بھوک
جھوک میں دیکھا گیا تھا۔

اس کی تھوٹی پرچڑے کا پٹا چڑھا ہوا ہوتا۔ وہ طرح طرح کے
تاشے دکھاتا سنی بادشاہوں کو سلام کرتا، بچے اس کی سوار کی کرتے
اور قلندر کی بھوٹی پیسوں سے جھنجھٹا لگتی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ
قلندر سے ضرور افیم کھلاتا ہے، اور اس کی ڈال میں نہیں ہیں۔ لیکن
ان لوگوں نے اس کو اکھاٹے میں نہیں دیکھا تھا۔

اس کے پاؤں بڑے بڑے تھے۔ تاخیر سلامت تھے۔ اور
ان پر بھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ بھریاں اس کی عمر کا پتہ دیتی تھیں۔
لیکن وہ کتنے سال کا تھا یہ بھید قلندر ہی جانتا تھا۔ اس بارے میں
زیادہ کریدنے پر وہ ہمیشہ ہنس دیتا۔ بھریوں کا کیا ہے، حاصل
ہات تو یہ ہے کہ جان کتنی ہے کسی میں؟

بڈل کے بال کالے اور لمبے تھے اور اس کی جلد کو تارے میرے
کے تیل کی مالش نے صحت مند رکھا تھا۔ لیکن اس کے بدن کی
بو سے بھر مچاں نوروں میں کھلبلی مچ جاتی۔ کھونٹوں سے بندھے ہوئے
ڈھونڈا نگر سنی سے زمین کھودنے لگتے۔ بھڑوں کے ریوڑ مچا

پتن اوٹوں کی بلبلاتوں اور جانگھیلوں کے قہقروں
سے گونجنے لگا تھا

بیرول کی بجائے بیلی کی جھاریوں میں چھپ چھپ گھنگرو
جھوم رہے تھے کجوروں کے جھنڈوں میں گھوڑوں کی
ہنہنا، ٹہنیں جاگ اٹھیں۔ پیرنگ رہا تھا جیسے
میلہ لگا ہو۔

جب فصیل کٹ چکتی تھیں۔ کوٹھے بھر جاتے اور فاضل اناج
منڈیوں میں پہنچ جاسا زمینداروں، کسانوں، مزدوروں اور کینوں کو
آئندہ فصل کی تیاری تک کوئی کام نہ ہوتا، دن دریا کے پاٹ کی طرح
پھیل جلتے اور وقت کاٹے نہ کتنا تو ہر سال یہی ہوا کرتا۔ مجرے،
عشق، اغواؤں، ڈاکے، ٹھکڑوں، نیزہ بازی۔ مینڈھوں کی لڑائی،
بیلوں کی دوڑ..... اور بڈل دبا دل اور زچگی کا دھجل۔

دیگوں کے منہ کھل جاتے اور کل کی، کارندے مزدور
اور چھوٹے موٹے زمیندار وہ دو تین تین دن سیدوں کے مہان ہوتے۔
بڈل نے بجلی دکاشی..... بجلی اور بادل کا دھجل.....
ٹراچی سوار کی گئی دن پہلے مربعوں میں گھوم جاتا۔ سیدوں کی رعایا
کے لئے گویا یہ حاضری کا حکم ہوتا۔ جھوک جھوک کے لوگ گھروں سے
نکل کھڑے ہوتے اور کشتی کے دن ایک ایک کے بارے میں پوچھا جاتا
کہ کون کہاں ہے۔ سید فضل شاہ کے بجلی اور رمضان قلندر کے بڈل کا
جوڑو سو کام کا ایک کام تھا۔

بڈل کے بارے میں مشہور تھا کہ جب وہ اکھاٹے میں اترتا
تو افق آنکھ سے اگل چوٹا ہے جیسے شاہ کی آندھی ہو جیسے، کالا گولا.....
رمضان کو سال بھر اس دن کا انتظار رہتا۔ اس کو معلوم
تھا کہ بڈل جیتے یا ہاے میرے پانچ سو کھرے ہیں۔ جیتے تو بڈل کا حق۔

سے پوچھا۔

”دھرتے کاٹی شے ہی تھیں۔ شینہ نال سائیں :-۔۔۔ ریکھ تو کوئی شے ہی نہیں تھا۔ بجلی شیر سے بھی لڑ سکتا تھا لیکن جب زمیندار نے بجلی کے عوض چاسی گز زمین کی پیشکش کی تو سنے کے ہکھکے یہ کہہ کر قبول کر کے لے سے انکار کر دیا کہ کتنا اور ہار تو شوق کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ کو پسند آیا ہم نے دے دیا۔ یہی زمین تو بگبولوں نے بھی کہیں گھر بنایا ہے۔ ہوا بھی کہیں بندھی ہے۔

اور آج لوگ دور دور سے پھر بجلی اور بادل جوڑ دیکھنے آرہے تھے۔ بے کار وقت کاٹنے کا ایک اور بہانہ۔ کبڈی اور چمچہ آزمائی کی طرح۔

میدان کا سورج سوائیز پر آگیا۔ اکھاڑے میں ریت کے ذرے چمکنے لگے۔ تماشائیوں کی ٹوپیاں بٹ گئیں۔ ڈھول کی آواز قریب آگئی اور تلندار کے پیچھے پیچوں بوڑھوں اور نوجوانوں کا جلوس ریکھ کو لئے اکھاڑے کی طرف بڑھا۔

تماشائی پیچھے پیچھے ہٹ گئے۔ رمضان تلندار کا تول تھا کہ انسان سمیت کسی جانور کا بھروسہ نہیں کون چالے کس وقت کیا کرے۔

ڈھول کی آواز پھر گونجی اور زمیندار لال اور فیروز کی رنگ کالاچہ۔ زری کا کھوسہ اور سونے کے بٹنوں والا زشی کرتہ

پہنے اپنے خاص کارندوں کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی پگڑی کا طرہ بجلی کے کالوں کی طرح کھڑا تھا۔ اس نے اچھے آستینیں

اٹ رکھی تھیں اور اس کی فیروزہ جڑی انگوٹھی کے گرد گندمی ہوئی چرمی زسی لٹھی ہوئی تھی۔ جس کے آگے آگے بجلی یوں نظر آ رہا تھا جیسے

کمان کی باہوں سے نکلا ہوا تیر۔ گرنے سے بچنے کے لئے زمیندار پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کے قدم یوں زمین پر پڑ رہے تھے جیسے آدمی اور جانوروں میں رسہ کشی ہو رہی تھی۔

ہجوم چپ ہو گیا۔ گردنیں جھک گئیں اور سینکڑوں ہاتھ سائیں کی سلامی کو اٹھے۔ زمیندار نے اپنی رعیت پر ایک پگڑی پھینکی

مجھا ڈالی۔ اکھاڑے کی دوسری طرف رمضان تلندار نے زمین کو چھوا اور ہلکے کود دیا۔

”کیوں ادھے تلندار چھ تیار دای.....“ زمیندار نے صلیوں میں گندھا ہوا سوالی رمضان کی طرف پھینکا۔

اور بڑے بڑے آجڑی دریلوں کے رکھوالے شکاری اور پٹکے کتے دم دبائے کان سٹملے غرغھر کانپنے لگے۔ ان کے کتے ہوئے کان پھوٹی ہوئی آنکھیں اور بدن پر ناخون کے نشان اس بات کا ثبوت تھے کہ بدل سے لہجنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بجلی کے علاوہ کوئی اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

بجلی کو زمیندار نے اس دن دریافت کیا تھا جب وہ اپنی بیٹھا وہ اپنے شکاری کتوں کو ہرن کے پیچھے لپکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

اسے رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ کم ہونے کی بجائے ہرن اور کتوں کا فاصلہ ہرن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ ہرن جھگی میں غائب ہو جاتا۔ اتنے میں ہانکے کی آوازوں کو دباتی ہوئی ایک اور آواز

آئی۔ ”شابی بجلی!۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک سفید سی لہر کتوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ہرن کی طرف پکی اور کند کی طرح اس کے گرد

لپٹ گئی۔ ہرن لڑکھڑایا، گرا، پھراٹھا لیکن بجلی اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے فضل شاہ کے شکاری کتے تھے اور ادھر ادھر

ڈاھی سوار اور ہانکا دینے والے تھے میں ایک۔ کند لہرائی اور وحشی یوں بندھا چلا آیا جیسے آزادی سے آٹاشی نہیں تھا۔ بجلی ایک نازم

ساتھی کا کتا نکلا جو تماشہ دیکھنے کے لئے شکاریوں کے ساتھ چلا آیا تھا اور شابی بجلی کی آواز جو دوسری آوازوں پر چھا گئی تھی، اسی خانہ بد

کی آواز تھی۔ اور کدھی! کیوں اوئے جوان۔ کتا بکا ڈای؟ سٹکی سے اتنے بڑے زمیندار کو حمد و جبر کتوں اور سوتا دیوں کے ساتھ

ہرن کا شکار کر رہا تھا، پہلی بار اتنا قریب سے دیکھا تھا۔ وہ گھر گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے بات نہیں سمجھ سکا۔ لیکن جب اسے

معلوم ہوا کہ سائیں (آقا) یہ پوچھ رہا ہے کہ کتا بکا ڈیے؟ تو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ حضور آپ ہی کا ہے۔ بجلی بکا قد عام

کتوں سے قدرے چھوٹا تھا۔ کھال سفید جس میں کہیں کہیں ایک سنہری گیر جھلک کر غائب ہو جاتی۔ خانہ بدوش نے بتایا کہ وہ حیر

کی گرن تھی۔ بجلی اپنے مالک کو دوڑ پیلے کی جھاڑیوں میں ملا تھا جہاں کبھی کبھی دن کے وقت بھی بیٹھ رہے دکھائی دے جاتے تھے۔ اس لئے

یہ قرین قیاس تھا کہ اس کا باپ بھیڑ یا ہسی تھا۔ اور بجلی کا منہ تو بالکل بھیڑیے کا منہ تھا۔

”یہ ریکھ کے ساتھ لڑے گا؟ فضل شاہ نے کتے کے مالک

”تہا سہ سائیں۔ نوکر کس کا ہے۔ رمضان بھی اور ریچھ بھی
کہنے کس کا ہیں موتیوں والی سرکار“

”پرندے کے چھتے کا آپ ہی تو نہیں کھا گیا زمیندار سے کہا:
”بھا جھاسائیں جو تھا ہناؤ قلندر نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا
”کوئی کیا بکیندا ہے... خدائی ملاجستہ لسا ہیا وسداے کزود
نمی میا نے۔“

رمضان نے بتا کر اگر ریچھ نہادہ موٹا ہر جلسہ توڑنے کے
قابل نہیں رہتا۔ اس کی ساری پھرتی ختم ہو جاتی ہے۔
زمیندار نے انہی مونچھوں کو تاقو دیا اور مسکرایا اسے معلوم
کہ جنگل سے پہلے سدھے ہوئے جانوروں کی تندی کو خاص خاص ترکیب
سے اچالا جاتا ہے۔

ڈھول کی کھال پر تمچیاں پھرنا انھیں تماشائیوں کا حلقہ
پھیل گیا۔ قلندر نے بدل کے منہ سے چڑے کا فیہت کھول دیا۔ ریچھ نے
جاہلی اور جیسے دود کہیں بادل سا گرہ اٹھا۔ اس کی ٹانگیں اور
دانت کیلون کی طرح چمک رہے تھے۔ ”سلام کر سرکار کو قلندر نے کیلی
فلانکا دیتے ہوئے کہا۔ بادل کچھ پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے
ماتھے کی طرف اٹھا۔ زمیندار کی باجیس کھل اٹھیں۔ دستور تھا کہ ریچھ
زمین میں کھوٹا کر کر لہی رستی سے باندھ دیا جاتا تھا لیکن جب سے
بہل اور بڑل کے جوڑ شروع ہوئے یہ رواج ترک کر دیا گیا تھا لیکن
فضل شاہ نے کہا تھا کہ بدل کو اپنا جملہ مل گیا ہے۔

ڈھول کی کھال پر تھڑکی۔ قلندر نے آواز لگائی پیچھے
ہٹ جاؤ سٹیو سٹا دے کہا ہے کہ آدم نادا اور جنادرد دونوں کا
کوئی بھروسہ نہیں۔“

بہت سارے ڈھول ایک ساتھ گرے بدل اور کبلی بے
ہو گئے اور پھر ادھر قلندر اور ادھر فضل شاہ کی جانب سے
دونعرے بلند ہوئے۔ بے معنی وحیانہ، لڑوہ خینا ورا ایک سفید
شعلہ کالے بادل کی طرف لپکا جوا کھڑے کے اندر کوئی سات فٹ
ادھر کو اٹھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آسمان کو جا چھو گیا
اور بارش ہونے لگے گی لیکن ہانی کے چھینٹوں کی بجائے ریت اڑی
کٹا اور ریچھ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔ دائرہ باندھے۔
لیکھتے ہوئے۔ آگ اور دھوئیں کا چکر ہر جیسے۔ اور سارے میں

ریت کی جنگا ریاں اڑ رہی ہوں۔ کتے کی کوشش تھی کہ ریچھ کو
کمرے پکڑے اور ریچھ کی کوشش تھی کہ کتا اس کے تھپڑ کی زد
جڑے کی گرفت میں یا بازو کے نیچے آ جائے۔ ان کے دانت چمک
رہے تھے اور ایک دوسرے کے گوشت میں گرٹنے کے لئے
مہتاب تھے۔ کبھی وہ الگ ہو جاتے اور کبھی پھر تھک جاتے۔ لوٹتے۔
لیکتے۔ اچکتے۔ وار خالی دیتے۔ وہ خزا رہے تھے۔
دھاڑ رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ ہونک رہے تھے اور دونوں
کی آوازیں مل کر عجیب رگڑ رگڑا ہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ تماشائیوں
کی ہلاشیری اور نعروں نے اس میں بالکل جنگل کی فضا پیدا
کر دی تھی۔

پھرتے پھرتے پھرتے پھرتے پھرتے پھرتے پھرتے۔
لڑکھڑاتے۔ سنہلے۔ گر جتے۔ روتے ریچھ اور کتا دونوں اور
ان کے ساتھ تاشائی بھی ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو دکھائی
دیتے تھے ساری فضا۔ سارا ہنگامہ۔ ساری حرکت!

ہر ایک ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ ایک کالی ایک
سفید۔ ریت میں بھنور پڑ رہے تھے۔ زمین کھول رہی تھی۔ بادل
کے کناروں پر۔ بادل کے اندر کبلی چمک رہی تھی۔ کونڈا لپک رہا تھا۔
گریج تھی۔ چمکناڑیں تھیں۔ چھین تھیں.....

ایسے میں عام طور پر برابر چھڑا دیا جاتا۔ کئی سال سے
یہی ہو رہا تھا لیکن کسی نے کہا سرکار آج تو فیصلہ ہونا چاہیے۔
قلندر..... ہر سال پانچ سو لے جاتا۔“

”ہاں سائیں حواریوں نے تائید کی کہ بری میں اب کیا
رکھا ہے۔ اور کیا ناخن تک تو ترخ گئے ہیں سائیں اور دھا
ہل چکے ہیں۔ رب تمہارا بھلا کرے۔“

”اوسے قلندر..... زمیندار کی کالی جانوروں کی
آواز کو دباتی ہوئی سائی دی۔“

”اج فیصلہ..... اچ رچھ نین یا کتا نین۔“
”جو حکم بادشاہ ہو“ رمضان قلندر نے ہاتھ باندھ کر
عرض کیا کبلی بھی لٹا ڈالے بدل وی لٹا ڈا پراسان فی سمہ وج
نین اور ندا کہ اک دے بغیر دو جانہ بدل جس نہ جگلی۔ اس کو اپنے
پانچ سوا دھار کے زمین کی پٹری سے سائیں۔ سرکار کی خوشی

خون کے پیاسے

حمید کاظمی

سے جود ملا۔ فوراً اس کا ماتھا ٹھکرا۔ زینہ کے آگے ایک بہت بڑی الماری رکھ کر بخشو نے فقلو کی آمد رفت کا راستہ بند کر دیا تھا۔ فقلو تڑپ کے رہ گیا، اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے وہ ایک نئے سمٹ کر زینہ پر ڈھیر ہو جائے گا۔ اس نے زور زور سے الماری کے دروازے پر ہاتھ مارے بلکہ کوشش کی کہ وہ کسی طرح اسے اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے لیکن الماری اتنی مضبوط تھی کہ اسے ہرگز ہٹانے کی جیسے کسی نے کی طرح زمین میں گڑی ہوئی ہو۔ وہ لگتا تھا الماری کو دھکیلتا اور دھک دیتا رہا لیکن بخشو اس سے نہ ہوا۔ گزشتہ رات فقلو اور بخشو میں کسی بات پر شدید جھگڑا ہو گیا تھا لیکن اسے تو یہ نہیں بتایا کہ بخشو دراصل عمل کے طور پر دروازہ کجا بند کر دے گا۔

فقلو دراصل صوفیوں اور پبلے کمرے کا مالک تھا اور بخشو غلہ کمرے، دکان، کلاں پبلے کمرے کا زینہ نگار دکان میں اترتا تھا اور پھر دکان سے راستہ باہر جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اوپر کے بلے کا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا اس عجیب و غریب سرحدی تقسیم کی وجہ سے فقلو اور بخشو میں ہمیشہ ٹکراؤ رہتا تھا کیونکہ کھانا گالی گلوں تک نوبت پہنچ جاتی اور کئی مرتبہ قورمہ تھا پانی تک ہوتے ہوئے رہ گئی۔

آزادی سے پہلے پورا امکان چند و حلوانی کے پاس تھا۔ نیچے دکان میں چند دھسائیاں بیچتا تھا اور اوپر والے کمرے میں اس کے بال بچے رہتے تھے۔ فسادات میں بھاگ بھاگ ہوئی تو چند دنوں رات دکان مکان چھوڑ بال بچے سمیت ملک سے چلا گیا۔ فقلو اور بخشو جو ایک ساتھ مشرقی پنجاب کے ایک ہی شہر سے آئے تھے اور چند دنوں کے مکان کی تاک میں بھی تھے، چند دنوں کے جانے ہی اس میں بڑھان ہو گئے۔ بخشو نے فقلو کے دروازے پر ہاتھ مارا مگر کچھ نہ ہوا۔

فقلو نے کسی جسامتی ضرورت کے دباؤ کے تحت بار بار پکارا ہے۔ اٹھنے کی کوشش کی لیکن جوتی وہ بیلا ہونے کے لئے پہلو بدلتا تو دیکھ کر کہہ اور دہر پڑے۔ اچھا گرفت اور زیادہ مضبوط کر لیتے اور فقلو لہجے خراٹے لیتے گنا جیسے دو دھبہ پور ہوا ہو۔ لیکن ایک بارگی اس کے خراٹے رک گئے اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم کے اعضاء اس کے اختیار سے باہر ہو رہے ہیں اور وقت برداشت جواب دے رہی ہے۔ اس کی آنکھیں پھٹنے سے کھلی گئیں اور وہ یکدم سانپ کی طرح بل کھا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور جوتی کھڑکی سے بھی روٹی کے کوئی پتہ نہ دکھائی دے رہا تھا۔ سر پلے پڑی ہوئی لائٹیں اس نے ہاتھوں سے ٹھولی کر کے مینی کے عالم میں جلدی جلدی جلائی، اور جوتی میں آئی ہوئی لائٹیں نے صرف اس قدر روشنی پیدا کی کہ کمرے کی تاریکی میں روشنی کا ایک ہلکا سا ساکاف پڑ گیا۔ وہ اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے تھام کر چار دیواری سے نیچے اتر کر چلا تو گڑبڑ کی بوسیدہ، شکستہ اور غیر ہموار چھت چار دیواری کی چھلکی کی طرح چھلکی ہوئی اور جب فقلو تیز چل کر کھڑکی سے نیچے اترنے لگا تو چھت یوں ہلنے لگی جیسے ابھی نیچے بخشو کی دکان میں گرہائے گی۔ لیکن فقلو کی اس کی خشکی اور بوسیدگی سے کوئی تشویش نہ تھی۔ وہ اس کے ہر نقص اور غامی کا عادی بن چکا تھا۔ بلکہ وہ اس بات سے ہی مطمئن اور مسرور تھا کہ ٹوٹی پھوٹی چھت اور شکستہ سی چار دیواری جیسی کچی سی اس کی اپنی ہے، وہ خود اس کا مالک ہے اور جس کے مالک کے حقوق کے خلاف اس نے مندرجہ کی چیز میں کسی انہوں ہیرے کی طرح محفوظ کر رکھا تھا۔

وہ جسامتی کرب کے عالم میں پیچ و خم کھاتا ہوا اپنے کمرے کے شکستہ درجہ ہونے والے زینے سے نیچے اترتا تو خلاف معمولی زینہ آگے

اور بخشو بھی بلے نام دودھ کا پیلا چولہے پر چڑھائے چھوٹکیں مارتا تو بلے
سارے دن میں شکل سے دو چار گاہک آجاتے تو آجاتے ورنہ دودھ
جمع کر کے دی جادیتا۔ پھر دی بھی اگر بک گیا تو بک گیا ورنہ خود کسی ہانکے
پی جاتا۔ ذمہ داریاں تھیں نہیں۔ فقط اپنا اپنا پیٹ پالنا مقصود تھا۔
اور وہ بہر طور پال رہے تھے فضلو اگر شام کو اتفاقاً کہیں باہر چلا جاتا
تو بخشو ضد میں سرشام ہی دروازہ بند کر کے اور تکی بٹھا کے سو جاتا
اور فضلو کو ٹھٹھری ہوئی راتوں میں ٹھٹھہ کھٹھہ بھر یا ہر کھڑے ہو کر
دروازے پر دستک دیتی پرتی۔ جب کہیں بخشو اکٹ ہٹ کے ساتھ دھننا
کھولتا اور ساتھ ہی بڑ بٹلے لگتا۔

”مصیبت ہوئی میرے لئے۔ جیسے کسی کے باپ کا نوکر ہو کر
خود..... بائیسکوپ دکھیں اور میں راتوں کو اٹھ اٹھ کے دھننا
کھولوں!“

”کس..... نے بائیسکوپ دیکھا ہے.....! فضلو جواب دینا
ایک ذرنی سی گالی دیتا۔

”دیکھ مہ منبھال کے بولی فضلو۔ نہیں تو کسی دن تیرا ایل حال
ہو جائے گا“ بخشو متنبہ کرتا۔

”ارے کر کے دیکھ ناں۔ کب دیکھا تھا تو نے مجھے بائیسکوپ
دیکھتے ہوئے؟“

”نہیں دیکھا تھا تو جا جہنم میں۔، پرسن لے میں کل سے دھننا
نہیں کھولوں گا۔ عزت پیاری ہے تو شام سے پہلے اوپر چڑھ کے
سو جا کر“

”سب جانتا ہوں۔“ فضلو معنی خیز انداز میں جواب دیتا۔
”میں شام سے پہلے اوپر چڑھ کے سو جاؤں اور تو چھپے چھپے کے
چھو کر دل کو تہج کر کے بیٹھ جائے!“

”دیکھ بک بک نہ کر۔ بخشو تڑپ کر بولتا۔

”اب کیوں برا لگا تجھے۔ فضلو تنک پاشی کرتا۔ اور دے تدریج
شکستہ چہچہاتا ہوا زمین طے کر کے اندر اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ کمرے
میں گلی۔ پانی غسل خانا یا اسی قسم کی ضروریات کی دوسری چیزوں میں
سے کوئی چیز بھی نہیں تھی اور نہ کسی فضلو نے ان اشیاء کی کسی کو محسوس
ہی کیا تھا۔ لیکن چھکڑے والی رات کو خلاف معمول جسمانی مجبوری کی وجہ
سے وہ زینے سے نیچے جواتا تو زینہ آگے سے بند ملا۔ تھلا کر رہ گیا۔

فضلو نے اوپر والا کمرہ منبھال کیا۔ چونکہ دونوں کا ناٹھا تر قبضہ تھا
بہذا شروع شروع میں دونوں میں بڑا ایکساں اور آپس میں بڑے
غیر و شکر تھے اور ہر بات پر متفق رہتے تھے۔ اور کسٹوڈین کا خطرہ لگنے
والی تلوار کی طرح انہیں ہر وقت اپنے سروں پر محسوس ہوتا تھا جسے
ٹٹانے کے لئے وہ ہر ہر سر جوڑ کر بھیجتا اور منصوبے بناتے رہتے اور
اس گٹھ جوڑ میں وہ ایک دوسرے کے اور لگہرے رفیق اور ہم درد بن گئے
تھے لیکن آخر کار ایک دن کسٹوڈین کے عملے نے ان کے مکان کو
دریافت کر لیا اور اس پر اپنی چھری لگا دی، اور دونوں پر پانچ روپیہ
ہدینہ کر لیا بھی ٹھونک دیا۔ اور جب جیب سے کرایہ بھٹنے لگا تو دونوں
اپنے جائز کرایہ وار جوئے کا احساس بھی ہوئے لگا اور کچھ بھی بھکاری کسی
بات پر تنکرا بھی ہو جاتی۔ فضلو اپنے شکستہ فرش پر آکر سہانی کا ایک گلاس
بھی کر دیتا تو وہ قطرہ قطرہ بھوٹ کر نیچے بخشو کے سر پر یا پتلیوں پر
گرتا۔ یا وہ کوئی چیز زور سے فرش پر پھینک دیتا تو مٹی بارش کی طرح
بخشو پر برسے لگتی۔ یا بخشو اگر پتلیوں اور چوہوں کی زد سے محفوظ
رکھنے کے لئے کوئی چیز چھت میں ٹانگنے کی خاطر ایک کیل بھی چڑھاتا تو وہ
سیدھی اوپر فضلو کے فرش میں ٹھل آتی۔ یہ تمام باتیں دونوں کے درمیان
اختلافات کا باعث بنتی گئیں اور انہیں، دوستی اور محبت کے دروازے
آہستہ آہستہ بند ہو کر دونوں کے درمیان نفرت کی دیوار اٹھنے لگی۔
یہ کشمکش جاری تھی کہ کچھ عرصہ بعد متر و کراملاک کا نیلام شروع ہوا۔
لوگوں نے دھڑا دھڑا انداز میں خریدیں لیکن اس عمارت کو خودوش
سمجھ کر کسی نے بھی کوئی دھبی نہیں لی۔ فضلو اور بخشو کے پاس اپنے
لے چلے دو تین ہزار کے کلیم تھے۔ اب انہی کلیموں پر بولی بولی کر دو لو
نے اپنا اپنا حصہ بچا خرید لیا۔ مگر مالکانہ حقوق حاصل کرنے کے بعد
اختلافات اس قدر بڑھے کہ دونوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کی
ایک مستقل خلیج قائم ہو گئی۔ اب تو بات بات پر جھگڑا، گالی گھوج اور
ہاتھ پائی ہونے لگتی۔ بخشو نیچے دھوئیں والی لکڑیاں جلاتا تو اوپر
فضلو کی آنکھیں جلنے لگتیں۔ اور فضلو کا دکان میں سے گزر کر آنا جانا
بخشو کو ناگوار ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ اپنے مالکانہ حقوق میں مداخلت
اور غاصبانہ سلوک کے مترادف نظر آتا۔

دلے تو دونوں بہت ہی کم باہر نکلتے تھے۔ فضلو نے بھی کام
دھندلا چھوڑ رکھا تھا بس سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھا بیٹھ کر کتاب پڑھتا

اس نے بہت سے زور مارے لیکن الہی آتی مضبوطی سے اپنی جگہ پر قائم تھی کہ ایک الجھ آگے کی طرف نہ سرسکائی۔ پھر فضل کو اپنے عصا نے بھی جیسے جواب دے دیا اور اسے اپنی ٹانگوں کے سہارے کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے تڑپتی کرتے ہوئے اس کی گرفت سے رسہ آزاد ہو گیا ہو۔ وہ سمٹ سمٹ کے وہیں آخری زینے پر لٹا رہا کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ نہایت سیدھے سجھاؤ طریقے سے اوپر چڑھ کے اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر گھبراہٹ مٹھری لات کا ایک نظریں جائزہ لیا۔ اور ٹھٹھائی ہوئی تہی بجھا کر پھر چارپائی پر دراز نہ ہو گیا۔ نیچے بخشو کو اس کی حرکت کا پتہ چل چکا تھا اور اب وہ گویوں کی طرح تا ٹر توڑ گالیاں اوپر برسسا رہا تھا اور ہر ایک ایک گالنی فضل کو سمجھ میں آ رہی تھی لیکن وہ ان پر کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اس وقت اسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اگر بخشو نے زینہ نہ کھولا تو وہ نیچے کیسے اترے گا۔ روزمرہ کے جھگڑوں کا تو وہ عادی ہو چکا تھا لیکن یہ اچانک پیدا ہونے والا مسئلہ اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ صبح اٹھ کر قانونی کارروائی کرے لیکن سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ قانون بھی دوسرے کی دکان اسے راستے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ بصورت دیگر اسے یہ بھی خدشہ پیدا ہو رہا تھا کہ معاملے کی پیچیدگی کے پیش نظر کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور دونوں میں سے کسی ایک کو مکان سے دستبردار ہی نہ ہونا پڑ جائے اور وہ شخص خود ہی نہ ہو۔ لہذا مصلحتاً اس نے قانونی کارروائی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور صورت حال سے خود ہی نکلنے کا فیصلہ کر لیا اور اس توڑ جڑ میں الجھے الجھے اس کی پھر آنکھ گگ گئی اور وہ دوبارہ دودھ بولنے کے سے انداز میں خنٹے لینے لگا۔

صبح حسب معمول اس کی آنکھ تو بہت جلد کھل گئی تھی لیکن وہ بہت دیر تک پڑے پڑے یونہی کر وٹیں بدلتا رہا اور دن چڑھے اس وقت اٹھا جب جتنی کھڑکی سے سورج کی شعائیں اندر داخل ہونے لگیں نیچے بخشو کی دکان اور محل میں زندگی کے آثار معلوم

ہو رہے تھے لیکن فضل کو کوئی چہرہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ پھلپھل کر کی ایک گندے تالے کی طرف کھلتی تھی اور سامنے کی طرف کسی قسم کی کھڑکی یا دروازہ وغیرہ کچھ نہ تھا، سوائے ایک زینے کے جو بخشو کی دکان میں اترتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر جھانک کر زینے سے نیچے دیکھا۔ وہ ہنونا گھسے بند تھا۔ فضل کو کشمکش کے عالم میں ایک دوسرے زینے سے نیچے اترتا اور بندھے کے قریب پہنچ کر اوپر واپس چڑھ گیا۔ کوئی بھی حل اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اس نے اشتعال میں آ کر زینے کی طرف منہ کیا اور ربا واز بند نیچے بخشو کو دغش گالیاں دیں۔ نیچے سے بخشو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”تو ہے۔ تیرا باپ ہے“

اس نے سوچا کہ وہ جواب میں اس کے دادا اور پردادا کا نام نہ گوا دے۔ لیکن آیا کرنے سے اس کی مشکل تو حل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سٹپا کے رہ گیا اور بخشو کو زنج کرنے کے لئے دو تین مرتبہ کچے فرش پر بندر کی طرح زور زد سے قلابازیاں لگا کر فرش پر زلزلہ سا طاری کر دیا جس کی وجہ سے مٹی کی ایک بو جھال نیچے گر گئی اور اس کے تبادلے میں چند صلواتیں اوپر آئیں اور فضل کو ٹھٹھا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا بیٹھے بیٹھے سوچنے لگا اور سوچتے سوچتے پھر چارپائی پر دراز نہ ہو گیا۔ لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ نیچے کیسے اترے۔ اس نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اور چائے کی طلب تو خاص طور سے اسے بہت پریشان کر رہی تھی۔ وہ ہوٹل والے کو آواز دے کر چائے کا کپ اوپر بھی منگوایا کرتا تھا لیکن آج تو کوئی آواز دینے کی جگہ تھی اور نہ چائے والا ہی کسی طرف سے اوپر آ سکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے بخشو نے اس کے آنے جانے کا راستہ ہی نہیں بلکہ کھانے پینے اور فراغت پالنے کے تمام راستے بھی بند کر دیے ہوں۔ نفرت اور حقارت کے جذبے سے اس کے سینے میں ایک بھٹی سی دکنے لگی اور انتقام کے شعلے اس کی آنکھوں میں بھڑکنے لگے۔ وہ جست لگا کے چارپائی سے اٹھا اور نیچے زینے کی طرف منہ کر کے گر جدار آواز میں دودھ پکا لا۔

”زیرید!۔ زیرید!“

”شہیدا۔ شہیدا“ غشو نے ترکی بہ ترکی قافیہ ملایا۔

فضل و انتقامیتا ہوا واپس آیا اور وہ خالی الامن ہو کر چارپائی پر

جو اس نے نالے کی طرف جھکی کھڑکی کے ساتھ لگا دی۔ اور پھر اس کے
فدیے اور چڑھ گیا۔

کچھ عرصہ تک نورہ یونہی کسی کوہ ہیا کی طرح نالے کی طرف
کھڑی بیٹھی رہی۔ چڑھتا اترتا رہا۔ لیکن یہ عارضی سیڑھی اتنی غیر محفوظ تھی
کہ اسے ہر وقت اپنی جان کے خطرے سے پہنچے کہ ڈرا پاؤں پھسلے تو وہ
ایک لمحے کے اندر دو نشیب کی طرف نالے میں پڑا ہوگا اور ایک دن
تو صین اس کے پاؤں کے نیچے سے سیڑھی نکل ہی گئی تھی لیکن غرض قسمی
سے اس وقت وہ اوپر والی کھڑکی میں ہاتھ ڈال چکا تھا اور اس طرح
موت کے منہ میں گرے سے ہال ہل چکا گیا۔ اس دن تو اس کی روح فنا
ہو گئی تھی۔ وہ ایسا خوفزدہ ہوا کہ دوسرے دن کمرے سے باہر ہی نہیں
نکلا۔ اور تمام دن یوں بے مقصد بیٹھا رہا جیسے قید تنہائی جگت رہا ہو۔
پہلے سا دن اس نے بند کمرے میں سو بچ کی صاف روشنی اور دھوپ
دیکھی بغیر گزار دیا۔ پھر سبیت ناک رات سر پر آگئی اور اسے اگلے
دن کی فکر ستانے لگی۔ اب وہ جسمانی اعتبار سے بھی اس قابل نہیں
رہا تھا کہ دوسرا دن بھی بند کمرے میں گزار دے۔ لہذا اگلے دن کے
فکر سے رات اسے سخت بے چینی رہی اور نیند اس کی آنکھوں کے
قریب نہ پہنچی۔ وہ اپنے ذہن میں براہ کوئی کھڑکی بچا تا رہا۔ پھر جب
دور کسی گھر والے نے رات کے ایک بجے کی گھنٹی بجائی تو وہ چپکے سے
اٹھا اور تبا جلائے بغیر اندھیرے ہی میں راستہ ٹھونڈا دے قدموں پر
سے نیچے اتر آیا۔ اور راستہ روکنے والی الماری کا جائزہ لینے لگا۔
اندھیرے میں بختو کے خزانے لینے کی آواز سے صاف سنائی دے
رہی تھی۔ اور اس کی گہری نیند سے مطمئن ہو کر فضلہ نے آہستہ آہستہ
الماری کو کھلے دھکیلتا شروع کیا۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں
پچھے زینے میں جمائے اور کندھا لگا کے پوری الماری کو زور
جو دیا تو الماری آگے مرک گئی۔ اور اسے محسوس ہوا کہ آدمی کے
نکلنے کا راستہ بن گیا ہے۔ تجربے کے طور پر وہ الماری کے پچھے سے
گذر کر بختو کے کمرے میں اتر آیا۔ صین اسی وقت بختو نے "چور۔
چور!" کی آوازیں لگاتے ہوئے لائٹیں روشن کی اور مٹی پھٹی
آنکھوں سے فضلہ کی طرف دیکھنے لگا جواب اور بھاگنے کی فکر
میں تھا۔ لیکن بختو نے اسے موقع ہی نہیں دیا اور نہایت بھرتی سے
چھلانگ لگا کر اس کی گردن پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لی۔

بیٹھے بیٹھے اسے ادراحت کی گہری سیچھنے لگی تو اچانک اسے ایسا
خیال آگیا۔ وہ فوراً اٹھا اور اس کھولنی شروع کر دی۔ اسے خاص میل
اور مضبوطی مل آئی۔ اس نے ایک سوکس کے جھکی کھڑکی کے ساتھ ہاتھ
دیا۔ اور دوسرا سر نیچے نالے کی طرف بھینک دیا۔ اگرچہ اس کا جسم بھاری
تھا لیکن ڈونکا کا پتلا ٹک کر وہ محفوظ طریقے سے نیچے اتر گیا۔ نیچے پہنچ کر
اس کی جان میں جان آئی۔ وہ نالے کا ایک طویل چکر کاٹ کے دکان کے
سانے کی طرف گئی میں آگیا بختو بیٹھا دو دھڑکی کھڑکی میں کڑھی چلا رہا
فضلہ پر نظر پڑی تو ہاتھ اچانک رک گئے اور کچھ حیرت زدہ سا ہو گیا۔
— فضلہ کے چہرے پر نفرت، حقارت اور انتقام کی سلوٹیں گہری تھیں۔
اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک نفر لگایا اور تہی کی طرح کو در بختو کی
گردن دبوچ لی۔ بختو نے بھی جواب میں ایک چھپے اس کے سر پر جڑ دیا
لیکن پیشتر اس کے کہ جھکنا بڑھتا کچھ لوگوں نے بچ بچاؤ کر کے چھڑ دیا۔
فضلہ کو دو آدمی پکڑ کر دکان سے باہر لے آئے۔ اور بختو دکان کے
اندھیرے بچے کتاب کھاتا رہا دو تین آدمیوں نے اسے اپنی گرفت میں
لے رکھا تھا اور وہ اپنے آپ کو پھڑپھڑانے کی بھرپور کوشش کرتے
ہوئے پیچھے چھ کر رہا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ میں آج اس کا
خون پی کے رہوں گا! اور جب لوگوں نے خدا کے نام پر بختو کو
چھوڑ دیا تو وہ چپکے سے دو دھڑکے پتیلے کے پاس بیٹھ کر اس میں چھپ
چلائے لگا۔ یوں وقتی طور پر جھکنا تو مل گیا لیکن فضلہ کے لئے ایک
مستقل مسئلہ پیدا ہو چکا تھا۔

وہ اپنے نصف مکان کا مالک ہونے کے باوجود
اس میں داخل ہونے کے راستے سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے گلی کے
چند پڑوسیوں سے شکایت کی۔ پڑوسیوں نے سمجھایا بھیا لیکن بختو
نے ایک نہیں سنی۔ صاف کہنے لگا: "میں اپنی دکان سے راستہ نہیں
دونگا۔ فضلہ اوپر والے حصہ کا مالک ہے، نیچے والے کا نہیں۔ نہ میں اس کے
کمرے میں جاؤں نہ وہ میری دکان میں آئے۔"

فضلہ جواب سن کے آگ بگول ہو گیا۔ لیکن پھر مصلحتاً خاموشی
اعتبار کی کہ شاید دیرینہ تعلقات کے پیش نظر بختو اپنے فیصلے پر نظر ثانی
کر ڈالے۔ اس کا سارا دن ادھر ادھر لوٹتا رہا مقصد گھومتے گزر گیا۔
اور شام کو جب واپس آیا تو اس کے پاس ہانس کی ایک کچی سیڑھی تھی۔

اس دوران میں وہ دونوں کئی دفعہ باری باری جوت ہو چکے تھے لیکن وہ لڑائی تھی جس کا کوئی دیکھنے والا، فیصلہ کرنے والا اور چھڑانے والا ہی نہ تھا۔

جب گھڑیاں نے رات کے تین بجائے تو اس وقت دونوں کے جسم بے جان ہو چکے تھے۔ اور انک ایک در دکر نے لگا تھا۔ تاہم دونوں گتھم گتھا تھے لیکن بے حس و حرکت کھڑے دروازے سے ٹیک لگائے ایک دوسرے کے گریبان میں جاتے پناہ تلاش کر رہے تھے۔ جیسے مرغ پروں میں منہ چھپا رہے ہوں۔ وہ کتنی ہی دیر تک اسی طرح ایک دوسرے سے پٹپٹے دے کے مریضوں کی طرح لمبی لمبی سانس لیتے رہے، جیسے فرط محبت میں بغل گیر ہونے پر ہلا۔ اچانک گلی سے کسی راگبیر کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فضلونے سوچا کہ اگر دروازہ کھلا جوتا اور راگبیر کی نظر پڑ جاتی تو وہ ضرور نہیں چھڑا دیتا اور اس طرح اس اذیت ناک کشمکش سے وہ باعزت طوع پر نجات حاصل کر لیتا۔ اس خیال سے کہ شاید پھر کوئی ماہ گیر ادھر سے گذرے فضلونے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ آہستہ آہستہ اڑپ کنڈی کی طرف بڑھایا۔ اور چہرہ بخشوکے گریبان میں برابر چھپا رکھا۔ لیکن ایک تو اس پر نقاہت غالب تھی اور دوسرے کنڈی بھی سخت تھی لہذا کافی زور دے زامانی کے بعد ہی فضلونے نہ کھل سکا۔ غالباً اسی وقت اسی قسم کا مصالحہ نہ خیال بخشوکے ذہن میں بھی پیدا ہوا تھا اور اس نے ازراہ تعاون اپنا ہاتھ بھی اڑپ کنڈی کی طرف بڑھایا پھر دونوں نے مل کر بچا کھچا زور کنڈی پر صرف کیا اور دروازہ کشاکش سے باہر کی طرف کھل گیا جس کے کھلنے پر دونوں مردہ لاشوں کی طرح دم سے دلہیز ہواوندھے اٹھ پڑے۔ اور پھر صبح ہونے تک دنیا و مافیہا سے بے خبر بے سدھ پڑے رہے۔ صبح اچانک ہلکی پھواری پڑنی شروع ہو گئی اور چند لمحوں میں فضلوکے باہر کی طرف نکلے حصے چہرے پر بھی پڑیں۔ اس نے بیکہ آنکھ کھولی۔ ہلٹ کر دیکھا تو بخشوکا بھی تک اس کے برابر پڑا بے خود سو رہا تھا۔ اور زینے کا راستہ اس نے رات جس حالت میں چھوڑا تھا اب تک ویسے ہی کھلا ہوا تھا۔ وہ بخشوکے ساتھ چھوڑے بہت لمحوں کے بعد اس نے بے سے چڑھ کر اوپر اٹھنے کمرے میں گیا۔ اور جب وہ اوپر پہنچا تو اتنی سی دیر میں پھواری تیز بارش میں تبدیل

”اے چھوڑ مجھے! میں ہوں! چور نہیں ہے؟“ فضلونے گردن اس کے ہاتھوں سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن بخشوکے اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر دی اور دانت کھٹکتے ہوئے بولا چور نہیں تو پھر کیا لینے آیا تھا آدمی رات کو؟ کے۔ بچے؟ ”گالی نہ دے..... میری گردن چھوڑ دے۔ میں راستہ کھولنے آیا تھا۔“ فضلونے ملجیا نہ بچے میں کہا۔ ”تیری گردن تو آج توڑ کے ہی چھوڑ دوں گا۔ بخشوکے ہاتھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ فضلوکے گردن کی سسپس پھول گئیں اور اسے اچھی سانس چھٹی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ وہ شتعل ہو گیا اور ہاتھ پیچھے کی طرف گھما کر انکھیاں بخشوکے کھوپڑی میں پھنسا لیں اور تیزی سے ایک زوردار جھٹکا جو دیا تو بخشوکے ہاتھ سوڈے کی بوتل کے کارک کی طرح فضلوکے گردن سے الگ ہو گئے۔ فضلوناؤں آچکا تھا اس نے گردن چھڑاتے ہی بخشوکے سینے کا موقع ہی نہ دیا اور نوجوانی کے زمانے کا یاد کیا ہوا ایک داؤ گھما کے جو مارا تو بخشوکے چادروں شانے جوت زمین پر آگ گرا۔ انتقام کی آگ فضلوکے اندر اب پوری طرح بھڑک اٹھی۔ اور وہ بہت جلدی معاف کرنے پر قادر نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے پھر کر ایک بھر پور جھٹکا جوت پڑے بخشوکے سینے پر لگائی۔ لیکن ماضی میں دونوں پہلوانی کے میدان میں دم مارنے سے تھے۔ لہذا بخشوکے اب مکمل طوع پر تیار ہو چکا تھا۔ ایک مار کھانے ہی جیسے اسے تاروں کی جگہ ماضی کے کئی داؤ نظر آئے۔ اس نے پڑے پڑے فضلوکے ٹانگوں کو سینے پر آنے سے پہلے ہی خلا میں چالیا۔ اور بائیل کے ہینڈل کی طرح جو گھمایا تو فضلوکے گردن ورنہ کے بل جاگرا۔ اور بے اختیار ایک آواز نکل گئی۔ لیکن وہ ساتھ ہی اچک کر کھڑا ہو گیا۔ اور بخشوکے اس سے پیشتر ہی تیار ہو چکا تھا۔ داؤ لگانے کے لئے دونوں کے ہاتھ نصف دائروں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ اور درمیان میں فاصلہ کچھ اس طرح قائم تھا جیسے دو لڑکا مرغ ایک دوسرے پر جھپٹنے کے لئے پر تول رہے ہوں۔ پھر ایک دم دونوں متعاطی سے انداز سے ایک دوسرے کی طرف بیکہ اڑ گتھم گتھا ہو گئے۔

دوسری گھڑیاں نے جب رات کے دو بجائے تو فضلوناؤں بخشوکے ساتھ ایک دوسرے سے دست و گریبان تھے۔ لگاتار ایک گھنٹے کی کشمکش نے انہیں تھک کے چور کر دیا تھا لیکن کسی نے شکست تسلیم نہیں کی۔

اور والی منزل کی افادیت کا احساس ہو رہا تھا اس نے اللہ سے دعا کی کہ بارش کا سلسلہ ہفتے بھر تک تو جاری رہے تاکہ انتقام کے دیکھے ہوئے لاکھوں سے ایک ایک چمکا رہی باہر بھل سکے۔

غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی دعا قبول ہوئی تھی اور سادق کی بھر پوری کا سلسلہ ہفتے بھر تک تھمے میں نہ آیا اور وہ اپنے کمرے سے ایک لمحے کے لئے بھی باہر نہ نکل سکا۔ اس دوران میں وہ کھانے پینے کی چیزیں اندر ہی سے جیسا کرتا رہا۔ کچھ تلچے اندر پڑے تھے وہ اس نے کھائے۔ ڈبے میں چنے رکھے ہوئے تھے وہ ختم کئے۔ گڑا دھننی چٹ کر ڈالی اور کچھ بھی سوکھی روٹیوں تک کا صفایا کر ڈالا۔ اندر کبھی سے لیشی نالے کو بھی استعمال میں لاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خود دینا نہ ہو گیا۔ اور انتقام کا شائبہ تک اس کے سینے میں باقی نہ رہا۔ اگرچہ اسے بخشنے کی صحیح حالت کا اندازہ نہیں تھا۔ تاہم اسے ہمدردی ہو چکی تھی اور وہ اپنے کئے پر ندامت بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اور اس کی اپنی حالت بھی قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ اس کے گھر کی کوئی چیز پانی کی زد سے محفوظ نہیں رہی تھی اور کمرہ ایک مستقل دلیل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سیڑھی سے چڑھ کر چھت کا سوراخ اندر کی طرف سے بند کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کوشش کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ پانی کا نالہ بدستور بہتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ بخشنے پس ہو کر آمد و رفت کا راستہ کھول دے گا اور ضرور اوپر چڑھ آئے گا۔ لیکن اس کا یہ خیال بھی غلط نکلا اور

شکست خوردگی اور ندامت کے احساس نے جیسے اسے فضا میں معلق کر دیا۔ پھر اسے اچانک محسوس ہوا کہ مکان کے فرش میں کچھ اسی جنبش ہو رہی ہے جو کبھی پہلے پیدا نہیں ہوئی تھی اسے اپنے پاؤں کے نیچے سے فرش کھسکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پھر یکایک ایک خوفناک گرگڑاہٹ سے ساتھ شہتیرے ٹوٹنے کی آواز آئی اور بوسیدہ فرش فضلو کو اپنی لپیٹ میں لئے گرگڑاتا ہوا ریزہ ریزہ ہو کر نیچے گر گیا۔ پہلے تو فغا تو خون اور دہشت سے بے ہوش ہو گیا۔ اس خیال سے کہ وہ بلے کے نیچے دب گیا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اسے خود ہی احساس ہوا کہ وہ تو بالکل محفوظ ہے۔ اور بلے کے نیچے نہیں بلکہ ملہ اس کے نیچے آ گیا ہے۔

ہو چکی تھی۔ اور چھت پر پٹاخ پٹاخ۔ جیسے پٹاخوں کی لڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ چاروں طرف سے سیاہ کالے بادل اٹھا مڈ کر گئے تھے اور بارش لفظ بہ لفظ تیز ہو رہی تھی۔ وہ چپکے سے اپنی جھولنا چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے نیچے کی طرف کچھ دھماکے سے محسوس ہوئے اور سارا مکان تھر تھرنے لگا۔ اس نے لپک کر نیچے سے نیچے دیکھا تو بخشنے پھر الماری رکھ کر زینہ بند کر دیا تھا۔ اور مضبوط کرنے کے لئے اب دبا دبا کیلیں ٹھوک رہا تھا۔ فضلو سٹپا کے رہ گیا اور ٹہرنا ہوا واپس آ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ بارش کی رفتار دہم تیز تر ہو رہی تھی۔ اور زمین کی بوسیدہ چھت نے ہاجا بھگنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے بستر کو پانی سے محفوظ رکھنے کے لئے کبھی پائنتی اور کبھی سرانے کی طرف کھینچ دیتا۔ اور جب پانی کے چھت سے ٹپکنے کی رفتار بھی تیز ہو گئی تو اچانک اسے ایک تھوڑی اور انتہائی کارروائی کا خیال آ گیا اور اسے فوری طور پر بروئے کار لانے کے لئے عقیق کھر کی طرف سے ہانس کی سیڑھی اس نے اندر کمرے میں کھینچ لی۔ اور دیوار کے ساتھ لگا کر اوپر چڑھ گیا اور لوہے کی ایک سلاخ کی مدد سے چھت میں اندر کی طرف سے بہت بڑا سوراخ کر دیا۔ سوراخ کا ہونا تھا کہ پانی کا پر نالہ اندر کی طرف بہنے لگا۔ پھر اس نے زینے کے قریب اپنے فرش میں بھی اسی قسم کا ایک سوراخ کر دیا۔ پھر کیا تھا پانی دھان کے کھیت کی طرح کمرے میں پھیل کر آبشار کی طرح سوراخ سے نیچے بخشنے کے کمرے میں بہنے لگا۔ چند لمحوں میں گندے تھے کہ بخشنے نے نیچے کھلبلی عمارت بھی معلوم ہوتا تھا جیسے سیلاب آ گیا ہو۔ اس کی دکان ویسے ہی سطح زمین سے نیچی تھی اور پانی کی کھاسی کا کوئی بندوبست نہ تھا اور بخشنے کے برتنوں سے پانی نکال پھینکنے کی آواز بادلوں کی گرج میں شامل ہو کر اوپر فضلو کو اس وقت ٹرا مزہ دے رہی تھی۔ وہ پانی سے محفوظ جگہ منتخب کر کے بیٹھا تھا ٹھوسے ٹری کے کش لگا رہا تھا۔ اور سہانے کے پرانے کو عجیب نظروں سے دیکھ جا رہا تھا۔ نیچے بخشنے کی دکان میں بھی ہوئی افزائش سے اسے بڑا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ اس کا اپنا کمرہ بھی زیرِ آب آ چکا تھا تاہم پانی کا بہاؤ نیچے کی طرف ہی تو تھا اور وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ بخشنے اس سے کئی گنی زیادہ شکل میں مبتلا ہو چکا ہے اسے پہلی دفعہ

اس نے آنکھیں کھول کر اس درست کرنے کی کوشش کی اور پھبت کی طرف اس طرح دیکھا جیسے ایک طویل خواب سے بیدار ہوا ہو۔ پھر ٹپٹی پٹٹی آنکھوں سے دیکھتا ہی رہا۔ اس کے کمرے والی منزل ہی غائب ہو چکی تھی۔ اور پانی کا پستال کافی بلندی سے بہتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر اگرچہ کوئی ضرب نہیں آئی تھی لیکن وہ سر سے پاؤں تک کچھڑ میں لت پت ہو گیا تھا۔ اور اعضا بے جان معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے بلا بریں پٹری ہوئی کسی چیز کا سہارا لے کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی تو اچانک اس کے کان میں ایک دبی دبی گٹھلی گٹھلی دردناک آواز پڑی۔ وہ چیخ اٹھا۔

”بخشوا! بخشوا! اس نے دیوانہ وار آوازیں دینی شروع کیں۔ پھر اسے بخشوا ایک جگہ نظر آگیا۔ اس کا سر باہر تھا اور باقی تمام دھڑلے کے نیچے دیا ہوا تھا۔ اور سر پر بھی بے شمار خراشیں نظر آ رہی تھیں۔

فضلو کو جیسے کوئی بجلی کی لہر چھو گئی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اور مشین کی سی تیزی کے ساتھ ملبہ اٹھا اٹھا کے پھینکنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ کٹ کر ہوا ہان ہو چکے تھے مگر آخر کار اس نے بخشوا کا سارا جسم ملبے کے باہر نکال لیا۔ لیکن اس کی ایک ٹانگ اب بھی ٹوٹے ہوئے شہتیر کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ وہ بالکل بے ہوش سوچکا تھا اور خون کے لوتھڑے اس کی ٹانگ کے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ اور کچھ اس طرح سرخ ہو چکی تھی جیسے خون میں گوندھی گئی ہو۔ فضلو نے جھک کر غور سے دیکھا تو اس کی ران تقریباً نصف کٹ گئی تھی۔ بڑی شکل سے اس نے شہتیر مٹا کر اس کی ٹانگ باہر نکالی۔ اور پھر اس پر دقت طاری ہو گئی۔ وہ اس سے لپٹ کر زندگی ہوئی آواز میں بکا رہنے لگا۔ بخشوا! محمد بخش میرے بار۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں فضلو لول رہا ہوں۔ میرا مکان تو گر چکا ہے۔ اب سب تیرا ہی ہو گیا ہے۔ دیکھو

سہی۔ اور پھبت کی طرف دیکھو۔ تم جو بڑی آنکھیں کھولو گے میں چلا جاؤں گا۔ لیکن تم یہ کیا کر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ مجھے یہاں تمہارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور تم بھی..... اور بخشوا..... بخشوا! اس کی آواز زرد ہو گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر مدد کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد ایک پیمونس نے بخشوا کو بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال پہنچا دیا۔ اور فضلو ہسپتال کے بزمے میں مرغ کی طرح سو کر ایک بچی پر بیٹھ گیا۔ اور وہ اندر سے آنے والے ہر آدمی کی طرف یوں بے تاب نظروں سے دیکھتا جیسے کوئی مسیحا آ رہا ہو۔ پھر اس کی نظر آپریشن کرنے والے ڈاکٹر پر پڑی جو غالباً ابھی بخشوا کے پاس سے ہو کر آ رہا تھا۔ وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا اور سہمے ہوئے انداز سے ڈاکٹر کے قریب پہنچ کر سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم ہو اس کے حادثے؟“ ڈاکٹر نے فضلو سے پوچھا۔

”جی، جی، ڈاکٹر صاحب“ فضلو نے دھڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا۔

”اس کا خون بہت ضائع ہو گیا ہے۔ اسے کافی خون کی ضرورت ہے۔ کون کون دے گا خون اس کے لئے؟“ اور تو کوئی نہیں پر میں دونوں کا اکیلا ڈاکٹر صاحب۔ میرا تمام خون بچہ بچہ اسے دے دوں وہ بکا جائے! فضلو تجس آمیز لہجے میں بولا۔

”اچھا تم میرے ساتھ اندر آؤ“ ڈاکٹر نے اسے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فضلو کے سینے میں تناؤ پیدا ہو گیا اور وہ خون کا ابلتا ہوا چشمہ بن کر ڈاکٹر کے ساتھ اندر کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

”دکھی شاہ زادی“

(بنگلہ لوک کہانی)

یونس احمد

مگھو ذیلی ڈویژن کے رہنے والے ایک صاحب ہیں، مولوی ابوالکلام انہوں نے مجھے اس کے چند بند ضرور سنائے جو انہیں یاد تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مگھو میں، جس کا جدید نام ہوٹنگ ہے،۔ شہزادہ کے نام پر ایک مسجد اور تالاب اب بھی بنا ہوا ہے اور تاریخِ آغا خاں متعلق ہے کہ شہزادہ ادھر ضرور آیا تھا اور یہیں عالم جلاوطنی میں وہ اس دنیا سے سدھار رہے۔“

بہر حال اصل تاریخی واقعہ کچھ بھی ہوا تھی بات ضرور ہے کہ شہزادہ کو اراکان میں حادثات ضرور پیش آئے تھے۔ پری بانو کے علاوہ ”شاہ زادی کا ماتم“ کے عنوان سے ایک اور منظوم کہانی بھی یہاں چاکھٹام کے اندرونی علاقوں میں بڑے شوق سے پڑھی اور سنائی جاتی ہے۔ اس کے واقعات بھی کم و بیش اسی طرح کے ہیں۔

”پری بانو“ کی منظوم کہانی کس نے لکھی اور کب لکھی گئی اور اس کی اصل تاریخ کیا ہے، اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے اس کہانی کو محض حوامی قصہ گوئی کا نمونہ ہی سمجھنا چاہئے۔ اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی فضا — اور ماحول ہے جو خالص مقامی ہے۔ اصل زبان بھی بڑی رسیلی اور دل پر فوری اثر کرنے والی استعمال کی گئی ہے۔ اب میں اس کہانی کو پیش کرتا ہوں:

قسمت بھی کیا کیا لیل و نہار دکھاتی ہے۔ پری بانو کو دریا کی غضبناک لہروں نے نکل لیا! میں یہ المیہ کیسے بیان کروں۔ الفاظ نہیں ملتے کہ اُس کے آخری سانسوں کا حال بیان کر سکوں، کیا درد بھری کہانی ہے!

اس دنیا میں سکر، فریب، چھل اور کپٹ کے سوا کچھ نہیں

مشرقی پاکستان کی لوک کہانیوں میں ”پری بانو“ کی کہانی بڑی ہی دل گداز ہے اور درد سوز سے لبریز۔ اس میں ایک مغل شہزادے اور اس کی لڑکی، پری بانو کی بے بسی و بیکسی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ کہاں تک قابلِ قبول ہے اور تاریخی اعتبار سے کہاں تک درست، اس کے بارے میں کئی رائے ہو سکتی ہیں۔ مگر لوک کہانیاں یونہی مشہور ہوتی ہیں اور جرح و نقد کی محفل نہیں ہو سکتیں۔ یوں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ شہزادہ بنگال دہلی سے ہو کر آتھائی بے بسی کے عالم میں اراکان ضرور پہنچا تھا۔ پور بونگو گیتیکا (مشرقی بنگال کے گیت) کے فاضل مصنف ڈاکٹر ویشیش چندر رین نے بھی اس سلسلہ میں کچھ لکھا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

”پری بانو کی کہانی چاکھٹام کے علاقوں میں بچہ مقبول ہے۔ یہ کہانی منظوم ہے اور اتنی پُر تاثیر کہ تاثر میں اضافہ کے لئے سارنگی، خنجری، یا دوسرے کسی ساز کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ ہوا آسو تو شچو دہری نے چاکھٹام سے ’پری بانو‘ سے متعلق مجھے حسب ذیل تحریر روانہ کی تھی:

”آزاد آباد کے ایک صاحب، خلیل الرحمن کی زبانی پری بانو کی منظوم کہانی کا مختصر حصہ میں سن چکا ہوں۔ یہ کہانی میرے دل کو بہت بھائی اور میں اس کی تفصیل جاننے کے لئے بڑا بیتاب رہا۔ کچھ دن کے بعد ”مہیش کمالی دیپ“ میں دھن جے بروا کے ساتھ میں نے اس موضوع پر تبادلہ خیال بھی کیا۔ انہوں نے مجھے ”گورستان“ نامی ایک مقام میں جانے کی ہدایت کی کیونکہ ان کے قول کے مطابق انہوں نے یہ منظوم کہانی وہیں پڑی تھی۔ چنانچہ میں وہاں گیا لیکن تلاش و جستجو کے باوجود اس کہانی کی تاریخی اصلیت اور حقیقت کے جاننے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ اراکانی کے اندرونی علاقے

بدھ دیکھو قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، خریدیں
نیام سے باہر نکل رہی ہیں اور کشتوں کے پستے لگے جا رہے ہیں۔
یہ تختہ و تاج، یہ دھن دولت، یہ جہان بانی و جہان گیری
کچھ بھی تو نہیں!

شہزادہ کی داستان آج بھی خون کے آنسو رلاتی ہے۔
تخت و تاج سے محرومی، بھائیوں سے نزاع، جلاوطنی
کی زندگی — اُس کی زندگی بالکل بے کیف اور بے رس تھی، ہر جہت
سے محروم، یہ جاہ و جلال اور مال و متاع کس کام کے جب بھائی بھائی
میں کشن جائے! ایسی شاہی سے تو بھکاری بننا بہتر جو دوسروں کے
محتاج تو ہیں پر سوتے ہیں سکھ کی نیند۔

یہ تخت و تاج، یہ دھن دولت، یہ جہان بانی و جہان گیری کچھ
بھی تو نہیں!

روز بروز کے جنگ و جدال سے تنگ آکر آخر ایک دن شہزادہ
نے رخت سفر باندھا — مایوس، بے مراد شہزادہ — پرستی بانواس کے
ساتھ تھی۔ زاد راہ کے لئے خزانہ شاہی سے کچھ اشرافیاں اور سونا چاندی
اس نے ساتھ لے لیا تھا۔ دونوں سفر کی سختیاں، صعوبتیں برداشت
کرتے غنیمتوں سے بچتے چاہتا تھا۔

جلاوطنی نے آخر کار دونوں کو نڈھال اور بے سدھ کر دیا تھا۔
دونوں کی آنکھوں سے نہ جانے آنسوؤں کے کتنے دریا بہہ گئے تھے۔
چاروں طرف محرومی و نامرادی تھی۔ تاریکیوں کی چادریں دبیز سے
دبیز تر ہوتی چلی گئیں۔ ایک گہرا سناٹا تھا جو ان کی ہنگامہ آفریں
زندگی میں داخل ہو چکا تھا۔

چانگام کے قیام کے دوران جب ان کی قسمت کا اندیزہ
دور نہ ہوا تو وہاں سے بھی ان کے قدم اکڑ گئے اور دونوں ہاتھی پر
سوار ہو کر جنوب کی اُور روانہ ہوئے۔ پرستی بانو کا حسن چوہو میں
رات کے چاند سے بھی زیادہ روشن تھا — لیکن حسن کی چمک
وقت کے بیرحم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ دھندلاتی جا رہی تھی۔

دونوں چپ چاپ آگے بڑھتے گئے۔ منزل سے بے پروا!
انہیں منزل تک پہنچنے کی کوئی لگن بھی نہ تھی۔

ہواؤں کا تیز جھونکا آتا تو پرستی بانو کے دل میں طبعی طور پر
آنچل پرچم کی طرح لہرانے لگتا — اور چند لمحے کے لئے اُس کے لوہاں
رخساروں پر سرخ سیب کا سا رنگ دھڑکتا تھا۔

پرستی بانو کے جسم پر جو گھنے تھے وہ سورج کی روشنی میں یوں
دھمک رہے تھے جیسے روشنی کا فوارہ پھوٹ رہا ہو جس نے بھی ان کو
دیکھا ان کی تکلیفیں دیکھ کر کلچر منہ کو آتا اور اُس کی آنکھیں بھرتھیں۔
کون تھا جو ان کی بے بسی پر نہ رویا ہو۔ عورتیں ان کی مصیبت دیکھ کر آہ و گہا
کرتے نکلتیں۔ جوان لڑکیاں دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کرتیں۔
ہائے سی قسمت کی ستم ظریفی! گاؤں کی ناریوں میں باتیں ہوتیں۔
"یہ کون بہشتی حور ہے جو یوں جنگل جنگل بھنگ رہی ہے؟"

یہ بے مثال حسن، یہ پُر وقار چہرہ،
یہ طلائی زیوروں کی نور افشانی،
زندگی کا یہ المیہ کتنا سبق آموز ہے!

گاؤں کی اُن ناریوں کو شہزادہ اور پرستی بانو کے حالِ زار پر
رحم آگیا۔ کسی نے آگے جانے سے منع کیا۔ کسی نے دوسری اُور جانے
کا اشارہ کیا۔ کسی نے اپنے گھر میں جہان بنانے کی دعوت دی۔
کسی نے کہا۔

"شہزادی تم میرے گھر جاؤ۔ میں تمہیں تلسی جیسا خوشبودار
چاول کھلاؤں گی۔ میں تمہیں پان کی ایسی نکلوری بنا کر دوں گی جسے
کھا کر تمہارے خشک لب تازہ اور سرخ ہو جائیں گے!"

کسی نے کہا:
"دکھن اُور نہ جاؤ۔ پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ اور جنگل تمہاری
راہ میں حائل ہوں گے جہاں خونخوار شیر رہتے ہیں۔"

ادھر نہ جاؤ خدا کے لئے ورنہ شیر تمہیں اپنا لقمہ بنائیں گے۔
کچھ اور آگے بڑے بڑے دریا ملیں گے جن کی سرکش موجوں
سے کسی کو مفر نہیں۔ ان موجوں کے نیچے گھریاں بھی تاک رہتے
ہیں۔ نہ جاؤ اُدھر نہ جاؤ اُدھر!

کوئی کہتی رہی:
آگے گھنے جنگل ملیں گے جہاں نہریلے سانپ رہتے ہیں،

آنکلا۔ وہ ہاتھی پر سوار تھا اور شاہی جاہ و جلال سے پوری نفسا ساکت و خاموش تھی۔ یکایک اس کی نگاہوں نے پرستی بانو کو دیکھ لیا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ ہاتھی کے قدم بھی رک گئے۔

پیلے کو پانی اور بھوکے کو روکھے کے سوا اور کیا چاہئے۔ کہتے ہیں راجہ پرستی بانو کے تصور میں کھو گیا۔ وہ سچ سچ دیوانہ ہو گیا۔

اراکان کے راجہ کی داستان عشق جب شہزادے کو معلوم ہوئی تو اس کی آنکھوں سے سادون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ اس کی کائنات زندگی میں اور رہ گیا تھا۔ — نہ تخت و تاج کی تمنا تھی، نہ دھن دولت کی آرزو۔ اس کے لئے پرستی بانو ہی دنیا کی سب سے بڑی دولت تھی۔ اس نے گلوگراواز میں پرستی بانو سے کہنا شروع کیا:

"تخت و تاج ہاتھ نہ آیا، ملک چھوٹا، اپنے پرانے ہوئے، احباب نے منہ موڑ لیا۔ تمہارے علاوہ دنیا میں میرا اب ہے کون؟ تمہاری ہی وجہ سے میری بے کیف زندگی میں تھوڑی سی رفق باقی رہ گئی ہے۔ اگر تم کو بھی کسی نے مجھ سے چھین لیا تو میں کیا کروں گا۔ میرے دل کی دنیا سوتی ہو چلے گی۔"

شہزادے کی اشک آلود آنکھیں دیکھ کر اور یہ غم انگیز باتیں سن کر پرستی بانو کا دل بھی بھر آیا۔ سوچنے لگی۔ — مصائبِ عالم کے اتنے سارے پہاڑ ایک دم سے یکایک کیوں لوٹ پوٹ پڑے۔ اب راجہ ہمارا دشمن ہو جائے گا۔

آخر کار دونوں نے ملک کو چھوڑ دینے کا منصوبہ بنایا۔ آخر شب کو دونوں چپ چاپ، چھپتے چھپاتے نکل گئے اور انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے پاؤں اتنی تیزی سے اُٹھ رہے تھے جیسے اُن میں بجلی ساگئی ہو۔

چلتے چلتے دونوں ایک دریا کے کنارے پہنچے۔ — سخت حال اور بے جانی۔ ڈر خوف اور پریشانی سے دونوں مضطرب ہو چکے تھے۔ بارے ایک ماہی گیر کی ناؤ نظر آئی۔ جان میں جان آئی۔ شہزادے نے ماہی گیری منت کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہمیں اپنی ناؤ دے دو۔ اس کے بدلے میں تم کو لالہ مال (بقیہ صفحہ ۱۰۰ پر)

جن کے کانٹے کا کوئی علاج نہیں

ایسی موت سے بھلا کیا حاصل!

پرستی بانو، خدا کے لئے ان جنگلوں میں نہ جاؤ۔ کہتے وہاں آدم خور

بھی ہوتے ہیں! —

کسی نے نصیحت کی:

اندھ دریائی ڈاکو ہیں جو مسافروں کو پل بھر میں لوٹ لیتے ہیں۔

میری بات مانو تو اندھ کارن نہ کرو!

لیکن دونوں ہاتھی کی پشت پر بیٹھے چلتے رہے۔ — انجام

سے بے پروا۔

یہاں تک کہ تیرہ دن کی صعوبتیں بھیلنے کے بعد ان کے سامنے نہانٹھیں مارتا ہوا دریا پھیل ہو گیا۔ موجیں ساحل سے یوں سرپٹ رہی تھیں جیسے دریا بھیانک آندھی سے لڑ رہا ہو۔ شہزادے کی ہمت جواب دے گئی۔ پرستی بانو کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ — اتنا بڑا دریا کیسے پار کیا جائے سمجھا۔

اسی پریشانی کے عالم میں تین دن بیت گئے۔ چوتھے روز ایک اراکانی اندھ آ نکلا۔ اس نے شہزادہ کی دلگذازدستان سنی تو اس کا بھی جی بھر آیا۔ اس نے شہزادہ اور پرستی بانو کو اراکان چلنے کی دعوت دی۔ دونوں تیار ہو گئے اور اس طرح وہ اراکان پہنچ گئے۔ یہاں کا حکمران شہزادہ کی آمد کی خبر سن کر گنبد اُٹھ گیا۔ اس کو گمان ہوا کہ شہزادہ چڑھائی کی غرض سے اس کے ملک میں داخل ہوا ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً فوجیں جمع کیں، لیکن بعد میں جب اسے اصل حالات کا علم ہوا کہ شہزادہ بالکل نہتہا ہے اور اس کی حالت بڑی زبوں ہے تو اس نے شہزادہ کو اپنے یہاں پناہ دے دی۔

آگے کی بہ روح فرسا داستان بانیے کیسے بیان کروں! — طبع اور لالچ کا بندہ انسان خود غرضی اور ہوس دنیا کے معاملہ میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتا۔ — یہ دودن کی مختصر اور بے ثبات زندگی ہمیں کیسے کچھ نہیں دکھاتی۔

ایک دن کا واقعہ سنو!

پرستی بانو عمل کے باہر ورتک پھیلے ہوئے فطری مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ اراکان کا حکمران ہوا خوری کرتے کرتے اندھ

”ناشنا“

اصغر بیٹ

سے داخل ہوتا ہے۔ شریب، حساس اور ذہین چیز
جو خوبصورت تو نہیں لیکن پرکشش ضرور ہے۔ وہ
ذرا تجسس سے چاروں طرف مکرے کو دیکھتا ہے۔
باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز۔

★

نور وارو۔ (ہلٹ کر آواز دیتا ہے): تو رگل! بھئی میرا بچہ لیٹے آنا۔
(بچہ دروازے سے ایک ٹھکان شور مچانے لگتا ہے)
دروہ پھنسا ہوا ہے، داخل ہوتا ہے)
تو رگل۔ یہ تو میں نے خود ہی بھال لیا تھا، صاحب۔
نور وارو۔ ہاں کچھ بدل گیا ہے۔ جب میں بچہ دیکھ رہا تھا
آتا تھا.....

تو رگل۔ جی ہاں، بیگم صاحب نے سب چیز بدل دی ہے۔
آپ کا کمرہ تو اور پر ہی ہو گا نا!
دیکھو میوں کی جانب چلتا ہے۔

نور وارو۔ ڈیلی فون کو دیکھ کر حیرت سے: اور یہ ٹیلی فون!
یہ کب لگا؟

تو رگل۔ (رک کر کوئی ایک ہدینہ ہوا صاحب۔

نور وارو۔ اچھا، خان نے مجھے نہیں بتایا۔

تو رگل۔ بڑا رقم خرچ ہو گیا صاحب۔ ریلوے اسٹیشن سے
لاٹن کھینچ کر لائے ہیں۔

نور وارو۔ یعنی پانچ میل سے!

تو رگل۔ سارا اپنے خرچہ پر کیا صاحب، ٹیلی فون والا کہتا تھا
غیر ملاتے میں ہم ٹیلی فون نہیں لگا کر دے گا۔

نور وارو۔ پھر؟

وقت: صبح۔ ایک امیر گھر میں ملاقات کا وسیع کمرہ۔
بچہ دیا میں ایک بڑا آجوسی دروازہ جو ڈیوڑھی خاں بڑا
میں کھلتا ہے۔ بڑے سے پرے پورچ اور اس سے
پرے باغ۔ آجوسی دروازے کے سامنے چونکہ دبیز
خمل کے پردے لگے ہیں اس لئے سونے پچھلے پردے
کے آوازوں کے حاضرین تک اور کوئی آواز نہیں
پہنچ سکتی۔ کمرے کے بائیں کونے میں سیڑھیاں جو
گھوم کر دائیں جانب اور پورے کونے میں۔ چمکا رہی
نکڑی کا کٹہر کمرے میں سیل کی طرح لہرا کر نکل گیا ہے۔
سیڑھیوں کے نیچے بچہ دیا رے دگا ہوا ایک
معر آدھی کا جسم۔ بائیں جانب سامنے تین گڈے دار
آرام کرسیاں۔ ان کے سامنے ایک تپائی وائیں جانب
سامنے ایک خوبصورت بڑی سیاہ تپائی پر سفید
رنگ کا ٹیلی فون۔ دائیں جانب کچھ کونے میں ایک
صوفہ اور اس کے ساتھ صوفے کی دو کرسیاں۔
دو چھوٹی تپائیوں پر چاندی کے گلدان اور لکھوان۔
پورے کمرے میں بڑا ایرانی قالین۔ دائیں دیوار میں
بھی ایک دروازہ نظر آتا ہے جس پر دیوڑھی دبیز خمل
پر دے پڑے ہوئے ہیں بچہ دیا اور پر ایک چھوٹا سا
نیستی قالین لگا رہا ہے جس پر کوئی طعرا بنا ہوا ہے۔
کمرے کا فرنیچر جدید اور سج دگ جدید و قدیم امیرانہ
ذوق کے اختراع کا نمونہ مجموعی تاثر ہے جدا چھا۔
پردہ اٹھانے تو تقریباً پینتیس برس کا ایک مرد
جس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا ہے پچھلے دروازے میں

انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ گاڑی انہیں لینے کے لئے اسٹیشن آئے گی۔
تورگل :- صاحب یہ تاہم آیا ہے۔ آپ یہ لیں۔ میں بات کرتا ہوں
(تار دیکر نوید کے ہاتھ سے ٹیلیفون لے لیتا ہے)۔
صاحب میں خان کا ڈرائیور بول رہا ہوں۔ ہم خود اسٹیشن پر خان کے جہان کو لانے کے لئے گیا تھا۔ نوید جو کچھ سوچ میں ہے۔ تار کو الٹ پلٹ کر کھول لیتا ہے اور جلدی سے ٹرمہ کر تورگل کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے ا جی..... بیگم صاحب نے سرف یہ بولا تھا کہ ہمارا جہان آ رہا ہے۔ ان کو لے آؤ۔ جب ہم اسٹیشن پر پہنچا تو نوید صاحب ہمیں نظر آیا۔ اگر وہ بولتا کہ کوئی اور بھی جہان ہے..... ایک منٹ صاحب.....
تورگل نے نوید کی پریشانی دیکھ لی ہے اور وہ ٹیلیفون پر ہاتھ رکھتا ہے۔

نوید :- (جلدی سے) یہ میرے آنے کی اطلاع کا تاہم۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خان کو میرے آنے کی خبری نہیں ہوئی۔ تم ٹیلیفون مجھے دواؤ اور فوراً گاڑی لے کر ڈاکٹر صاحب کو اسٹیشن سے لے آؤ۔

تورگل :- ٹیلیفون نوید کے حوالے کر کے بہت بہتر رہا تھا
ہوا پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔

نوید :- (میسے لہجے میں) معاف فرمائیے ڈاکٹر صاحب، آپ کو زحمت ہوئی۔ میں نے ڈرائیور کو بھیج دیا ہے۔ وہ ابھی پانچ منٹ میں پہنچ جائے گا۔ ادھر سے پہاڑ کی اتارائی ہے، اس لئے گاڑی جلدی پہنچ جائے گی۔

جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ یہاں سواری نہیں ملتی اور غیر حالتے میں گزر کر آنا بھی آسان نہیں..... نہیں نہیں گھبرائیے نہیں آپ اسٹیشن پر ہی رہئے۔ یہاں سب کو معلوم ہے کہ آپ خان کے جہان ہیں۔ کوئی آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔ جی ہاں مجھے معلوم ہے

اسٹیشن ماسٹر ٹپا اچھا آدمی ہے۔..... اصل میں گڑبڑ یہ ہوئی کہ میں نے اپنے آنے کا جوتا رکھ دیا تھا

تورگل :- پھر بیگم صاحب نے خان سے بولا لاٹ صاحب کو چھی لکھو اور کہو کہ جب ہم سارا خرچہ خود دے گا تو ٹیلیفون والا کیوں گنگا کر نہیں دیتا۔

نو و ارد :- ہاں لاٹ صاحب، خان کی بڑی عزت کرتا ہے۔
تورگل :- خان بولتا تھا چھوڑو۔ لیکن بیگم صاحب نہیں مانتا تھا۔ دو جینے ہوئے جب لاٹ صاحب ادھر دور سے پر آیا تو بیگم صاحب نے خود ان سے بولا۔

نو و ارد :- (پچھ کرے کو چاروں طرف دیکھ کر) بیگم صاحب نے واقعی نقشہ بدل دیا ہے۔ تورگل سے جو سیڑھیوں کی طرف جا رہا ہے، تو کیا بیگم صاحب نے کہا تھا کہ ہمارا کمرہ اوپر ہو گا؟

تورگل :- نہیں صاحب۔ لیکن آپ جب بھی کبھی آتا ہے تو اوپر ٹھہرتا ہے۔

نو و ارد :- وہ بیگم صاحب کی حکومت سے پہلے کی بات ہے۔ خان کی شادی کے بعد میں پہلی دفعہ آیا ہوں۔ ممکن ہے میرا انتظام ایک جہان خانے میں ہو۔

(پچھلا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)
تورگل :- اچھی سیڑھیوں کے پاس رکھ کر پلٹتا ہے (میں دیکھتا ہوں صاحب، کون ہے۔

پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے،

نو و ارد :- (ٹیلیفون اٹھا کر) ہیلو! میں شاہ ماں خاں کے گھر سے بولی رہا ہوں..... جی نہیں میسرانام شاہ زمان خاں نہیں ہے۔ میں ان کا ایک دوست ہوں جی مجھے معلوم نہیں۔ ابھی آیا ہوں..... میرا خیال ہے آپ مجھے نہیں جانتے..... جی میرا نام نوید ہے... جی میرا نوید..... بڑی خوشی کی بات ہے آپ مجھے جانتے ہیں.....

تورگل ہاتھ میں لفافہ لئے داخل ہوتا ہے،
ایک منٹ ٹھہریے۔ میں پوچھتا ہوں ٹیلیفون پر ہاتھ رکھ کر تورگل سے یہ ڈاکٹر قاسمی بول رہے ہیں۔ کچھ نہیں

سے آگاہ کر دوں جن سے ان کے علاج میں بڑی مدد ملے گی۔
 دسیر صیوں پر سلسلے پڑی ہوئی تین کرسیوں میں سے دریا
 کرسی پر بیٹھ جاتی ہے نوید بایں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے
 نوید: دیکھئے ہوا یہ کہ میں مصروفیت کی وجہ سے اپنے کئے کی
 اطلاع بروقت نہ بھیجوا سکا.....

بیگم زماں: (پھر بات کاٹ کر) نہیں آپ کے آنے کی اطلاع تو بروقت
 مل گئی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر سارے واقعات
 لکھ کر بھیجا مناسبت نہیں سمجھا۔ مجھے معلوم ہے آپ
 بہت مسرور ہیں۔ لیکن چونکہ آپ کو واپسی کی گاڑی
 پانچ گھنٹے سے پہلے نہیں ملے گی اس لئے میں نے سوچا
 زبانی بتا دوں گی۔ یہ اور بھی اچھا ہو کہ خان کو دیکھنے
 سے پہلے ہی ہماری بات ہو گئی۔

نوید: مسکراتے ہوئے، بیگم زماں، میرا خیال ہے آپ کو
 اپنے میاں سے الگ کوئی بات مجھے نہیں بتانی چاہیے۔
 خصوصاً جب میں آپ کے میاں کو پہلے سے بھی جانتا ہوں
 مجھے مرض یکسر نہ تھا.....

بیگم زماں: (ذرا ہمان کرنا اور پھر بات کاٹ کر) ظاہر ہے آپ میرے
 میاں کو جانتے ہوں گے۔ وہ کوئی ایسے گنہگار تو نہیں ہیں۔
 لیکن ڈاکٹر ولس ہر طرح کی بات کی جاسکتی ہے۔
 اور آپ پر تو مجھے یوں بھی حق ہے۔ آپ کو شاید معلوم
 نہیں۔ آپ میرے بڑے بھائی زقار کے معالج بھی رہے ہیں۔

نوید: (سوچتے ہوئے) زقار؟

بیگم زماں: زقار جیسا جھل کشنر ہیں۔ انہوں نے ہی تو آپ کا نام
 تجویز کیا تھا۔

نوید: جی ہاں میں زقار صاحب کو جانتا ہوں۔ لیکن بحیثیت
 ڈاکٹر کے نہیں۔ میں انہیں.....

بیگم زماں: بیشک۔ انہوں نے کہا تھا آپ ڈاکٹر کے علاوہ انکے
 بہت اچھے دوست بھی ہیں۔

نوید: (مسکراتے ہوئے) میں زماں صاحب کا بہت اچھا دوست
 ہوں اور میرا.....

بیگم زماں: ظاہر ہے ڈاکٹر کو مرض کا بے حد اچھا دوست

وہ آج میرے یہاں پہنچنے کے بعد آیا ہے۔ اس لئے بیگم
 شاہ زماں کو صرف آپ کے آنے کی اطلاع تھی اور انہوں
 ڈرائیو سے بھی ایک ہی دھماکا ذکر کیا۔ ڈرائیو ر مجھے
 جانتا ہے اس لئے اس نے پلٹ کے دیکھا ہی نہیں کہ کوئی
 اور بھی ہے..... (دھنس کر) جی ہاں اچھا خاصا لطیفہ
 ہو گیا۔ بہر صورت معذرت چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے
 آپ کو زحمت ہوئی..... جی ہاں، ابھی ملاقات ہو گئی آپ۔
 انشاء اللہ! ٹیلیفون بند کر دیتا ہے۔

دوائیں جانب پردہ ہٹا کر تقریباً پچیس برس کی ایک
 خوبصورت عورت داخل ہوتی ہے۔ اس نے قیمتی
 نسلوار اور دوپٹہ پہن رکھا ہے۔ آنکھوں میں
 تیزی حرکات میں بھرپور جوانی کی خود اعتمادی۔

بیگم زماں: السلام علیکم! (اکثر صاحب، میں نے سارگی آواز سنی
 تو آگئی۔ ابھی خان کو آپ کے آنے کا پتہ نہیں چلا۔
 مجھے بے حد خوشی ہے کہ آپ توقع سے دس منٹ پہلے ہی
 پہنچ گئے۔

نوید: (علیکم السلام) (ذرا تذبذب کے ساتھ) اگر ڈاکٹر ولس
 بعد پہنچ جاتا تو کیا فرق پڑتا۔

بیگم زماں: پھر وہ مجھے آپ سے بات نہ کرنے دیتے۔
 نوید: (جو ابھی تک تذبذب میں ہے) تو کیا کوئی ایسی بھی بات ہے
 جناب خان سے چھپا کے کہنا چاہتی ہیں؟

بیگم زماں: ڈاکٹر صاحب آپ میرے میاں کو نہیں جانتے۔ وہ
 بڑے ضدی آدمی ہیں۔ انہوں نے سوچ لیا ہے کہ میں
 آپ کو واقعات ٹھیک طور سے نہیں بتاؤں گی۔

نوید: جی۔

بیگم زماں: اور اب آپ سے کیا پردہ۔ وہ دراصل آپ کو بلولنے
 کے سہ سے خلاف تھے۔

نوید: بیگم زماں میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں دراصل.....
 بیگم زماں: (ڈٹو کر) نہیں نہیں، آپ خواہ مخواہ برامان گئے۔
 یہ ان کا ڈاکٹر ولس سے بچا بذات خود غور طلب ہے۔

آپ نشر لای رکھئے نا۔ میں جلدی جلدی آپ کو ان حالات

ہونا چاہیے اور بیشتر اس کے کہ وہ آجائیں اور ہمیں بات کرنے کا موقع نہ ملے، میں جلدی جلدی عرض کر دوں نہیں ایک سید مخلص اور اچھے دوست کی ضرورت ہے۔ ابھی انہوں نے صرف ایک شخص سے دوستی کی ہے اور میرے خیال میں وہ خاصا غلط آدمی ہے۔

نورید :- (تجسس سے) وہ کون ہے؟

بیگم زماں :- لاہور کا ایک بیرسٹر، نورید

نورید :- (دھچک کر) جی!

بیگم زماں :- آپ کی حیرت بالکل بجا ہے۔ یہ بیرسٹر لوگ خاصے غلط دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔

نورید :- مگر مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ مجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہوئی ہو۔

بیگم زماں :- آپ سے نہیں۔ تو یہ آپ غالباً میری بات نہیں سن رہے ہیں۔ میں نورید بیرسٹر کا ذکر کر رہی ہوں۔ اگر اس نے ان کو غلط راستے پر نہ لگایا ہوتا تو آج آپ کو زحمت اٹھا کر یہاں آنا نہ پڑتا۔

نورید :- (نگلاصاف کرتا ہے) بیگم زماں حاشا وکلاء، مجھے زماں صاحب کی غلط حرکتوں کا علم نہیں تھا اور نہ...

بیگم زماں :- (جلدی سے بات کاٹ کر) نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ سرجن ہیں اور آپ کو ایسے امراض سے واسطہ نہیں اور خدا نہ کرے میرے میاں کو کوئی ایسی بیماری ہو۔ میں نے آپ کو کھد دیا تھا ہمیں ان کے گھٹنوں کے بارے میں مشورہ کرنا ہے۔ میں بیرسٹر نورید کا جو ذکر کر رہی تھی تو اس کے ان کو اس حالت تک پہنچانے میں ان حضرات کا بڑا ہاتھ ہے۔

نورید :- جی؟

بیگم زماں :- جی ہاں۔ وہ اصل میں کوئی بڑے ”ڈان جوان“ قسم کے فوجوان تھے اپنے وقتوں میں!

نورید :- (دھچپ کر) میرا خیال ہے آپ کی اطلاع اس سلسلے میں صحیح نہیں ہے میں خود.....

بیگم زماں :- اطلاع صحیح نہیں ہے آپ خود خیال فرمائیے میرے میاں اچھے بھلے کپتان تھے۔ جیسا اچھے افسر سمجھ جاتے تھے، لوگوں کا خیال تھا کہ اگر وہ اسی عہدے پر فائز رہتے تو جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ ان صاحب نے مشورہ دیا چلو رائڈنگ کلب کے ممبر بننے ہیں۔ چلے یہاں تک بھی ٹھیک ہے۔ میرے میاں بڑے اچھے سوار تھے۔ سب ٹھیک رہنا۔ لیکن اس نے مشورہ دیا پو لو کلب کے ممبر بنو۔ انہیں جو حادثہ پیش آیا وہ اس ہی کے سبب تھا۔ گھوڑے سے گرے اور دونوں گھٹنے ٹوٹ گئے۔

نورید :- لیکن یہ تو محض حادثہ ہے، اس میں اس بچا رے کا کیا قصور؟

بیگم زماں :- اس کا یہ تصور ہے کہ خود تو رائڈنگ کلب کے ممبر ہے اور پو لو کھیلنے کے لئے میرے میاں کو آگے کر دیا! نورید :- تو کیا آپ کا خیال ہے وہ پو لو کلب کا ممبر نہ جاتا تو یہ حادثہ پیش نہ آتا؟

بیگم زماں :- ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ حادثہ اسے پیش آ جاتا۔ نورید :- بے چینی سے گردن بدلی کرنا بیگم زماں تقدیر میں جو کچھ ہوتا ہے ہو کے رہتا ہے۔

بیگم زماں :- خیر یہ بات تو یونہی چلی نکلی۔ مجھے دراصل آپ سے کہنا یہ تھا کہ آپ کو اس کے علاج میں جو سب سے بڑی وقت پیش آئے گی وہ جراحی کی نہیں نفسیات کی ہوگی۔ نورید :- نفسیات؟

بیگم زماں :- جی ہاں نفسیات۔ اس انوسٹاک حادثے نے انہیں جسمانی طور پر ہی نہیں، روحانی طور پر بھی ناکارہ بنا دیا۔

نورید :- (پریشانی میں) مگر مجھے ابھی تک جو اطلاع ملی ہے اس سے مطابق تو ان کی ذہنی حالت بالکل ٹھیک ہے۔

بیگم زماں :- جی ہاں یوں تو وہ بالکل ٹھیک ہیں لیکن ان میں زندگی سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ ختم ہو چکا ہے۔ ان کے سامنے ایک دیران مستقبل ہے اور اسے

تھی، میری نظر میں بہار۔ میں نے سوچا اتنی اچھی شخصیت اس گوشہ نشینی اور تنہائی میں تلف ہو جائے گی۔ اسے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔

نوید ۱۔ شادی؟

بیگم زماں۔ جی ہاں، لیکن ایسی شادی جس میں عورت اپنا تمام خوشیوں کو ان کی خاطر قربان کرے کہ وہ تیار ہو جائے، ان کے ساتھ گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے میں اسے حذر نہ ہو۔

نوید ۲۔ رکھناش کس یعنی محض خدمتِ خلق کا جذبہ تھا؟

بیگم زماں۔ دھیر چھینپ کر ہکوئی عورت محبت کے بغیر ایسی قربانی دینے کو تیار نہیں ہوتی۔

نوید ۳۔ اور چونکہ آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے اس لئے اب آپ کی نظر میں بھی زندگی خزاں ہو گئی ہے۔

بیگم زماں۔ (بیکار ہو رہی تھی) اگر ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا! نوید ۴۔ (دیکھی سے) کیا مطلب؟

بیگم زماں۔ میں اس کشمکش میں تو نہ ہوتی جس میں کہ ہوں۔ نوید ۵۔ (آہستہ سے) یعنی کیا آپ نے شادی کر کے غلطی کی؟

بیگم زماں۔ جو دائیں جانب دیکھ رہی ہے فوراً ہونٹوں پر اٹھتی رہتی ہے،

بیگم زماں۔ میرا خیال ہے خان آدھے ہیں (دکڑی سے) اٹھ کر دائیں جانب چلتی ہے، دائیں جانب مریضوں کی

پہٹیوں والی کرسی کو دھکیلتا ہوا ایک باوردی اردلی داخل ہوتا ہے کرسی میں تقریباً نوید کی

عمر کا ایک خوبصورت مرد ہے۔ بھورے گھونٹھوٹے بال، بھوری بھری بھری سی موٹھیں، بڑی بڑی روشن

اور سنجیدہ نیلی آنکھیں ایک دم متوجہ کر لیتی ہیں۔ مضبوط بازو اور فراخ خالے۔ ٹانگوں پر سرخ

خاتون والا کبیل؟

بیگم زماں۔ ان سے ملے، یہ ڈاکٹر قاسمی ہیں۔

شاہ زماں۔ (حیرت سے) ڈاکٹر قاسمی؟

نوید ۶۔ ہیلو پیارے میں معذرت چاہتا ہوں میرے

بساتے کو وہ بالکل تیار نہیں۔

نوید ۷۔ (مسکرا کر) ہمیں تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ انہوں نے بسایا بیگم زماں۔ (دجلہ میں طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے) تو کیا آپ کے خیال میں انہیں شادی نہیں کرنی چاہئے تھی؟

نوید ۸۔ (جلدی سے) جی نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں نے تو یہ عرض کیا کہ جب انہوں نے شادی کا فیصلہ کیا تو ظاہر ہے وہ اپنے مستقبل کو ویران نہیں دیکھ رہے ہوں گے۔

بیگم زماں۔ یہی تو بات ہے۔ انہوں نے شادی کا فیصلہ نہیں کیا۔ نوید ۹۔ جی۔؟ میں سمجھا نہیں۔

بیگم زماں۔ شادی کا فیصلہ میں نے کیا۔ نوید ۱۰۔ یعنی آپ نے ان کی طرف سے بھی خود ہی فیصلہ کر دیا؟

بیگم زماں۔ جی ہاں۔ نوید ۱۱۔ خوب! وہ آپ نے جو ان کی ذہنی کیفیت والی بات کہی تھی وہ کیا تھی؟

بیگم زماں۔ (بیکار ہو رہی تھی) آپ سمجھ نہیں۔ ہوا یہ کہ میں پچھلے سال کالج کی لڑکیوں کو لیکر یہاں کا تاریخی قلعہ دکھانے آئی تھی.....

جاوید ۱۔ جی؟

بیگم زماں۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں لاہور کالج میں تواریخ کی لکچرار تھی اور ہٹلر ریکل سوسائٹی کی صدر۔

پچھلے سال ہم نے قلعہ دیکھنے کی اجازت طلب کی۔

نگار میرے بھائی کے ماتحت کام کر چکے ہیں۔ انہوں نے صرف سادے انتظامات کر دیے بلکہ میرے ٹہرنے کا

انتظام بھی زماں صاحب کے ہاں کر دیا۔ ایک روز کیلئے

ہم آئے تھے لیکن اتفاقاً دس روز ٹھہرنا پڑا۔

نوید ۱۲۔ اتفاقاً یا عمدہ؟

بیگم زماں۔ جی نہیں اتفاقاً، ایک لڑکی بیمار ہو گئی تھی۔ نوید ۱۳۔ (شرارت سے) تو تاریخی قلعے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی واقعہ بھی پیش آیا۔

بیگم زماں۔ چھینپ کر، جی ہاں۔ کم از کم ان سے جو چارگی پ چلتی رہی وہ بڑا تاریخی تھی۔ ان کی نظر میں زندگی خزاں

نوید :- (دیر صیوں کے سامنے ٹہری ہوئی دائیں کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں نے تو تمہیں لندن سے لکھ دیا تھا کہ شادی کی تاریخ چار مہینے بعد رکھو۔ مجھے یو ایپ میں کئی جگہ دکنا ہے۔

خان :- مہینے تیرے کی! تم ان فرنگوں کے چکر میں رہو اور ہم یہاں اپنی شادی ملتوی کرتے چلے جائیں۔ تمہارا ہے۔ نوکر تیرا!

نوید :- دیکھو یا لڑکی بیگم کے سامنے لڑکیوں اور لڑکیوں کا ذکر نہ کرو دیتا۔ وہ پہلے ہی مجھ سے بہت خفا ہیں۔ سبھیوں کی جانے کیسا آزارہ آدمی ہے۔

خان :- تو نہیں ہو کیا؟

نوید :- باطل نہیں۔ وہ لارڈ ٹام ڈی کی بیٹی کو چلنے پوانے کبھی بھی جوئے جایا کرتا تھا اور اس کا یہ مطلب تھا کہ اس کا میں —

خان :- اچھا یہ بتاؤ تم اپنی بیوی سے لارڈ ٹام ڈی کی بیٹی کا ذکر کر دیا کرتے تھے؟

نوید :- ذکر کرنے کو تو کر دیتا لیکن بیوی کی ذات ہی اللہ میاں کچھ بڑی سنگی بنا دی ہے۔ وہ بیٹی بان کے چوسرے نکالتی رہتی، جیسا حرام کر دیتی۔

خان :- اچھا یہ بتاؤ بیوی کو علاقے کے لے لئے تھے۔ اس کا کچھ علاقہ بھی کر یا تم نے لندن میں یا اپنے ہی درددل کا علاقہ کراتے رہے؟

نوید :- کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔ کرسی سے اٹھ کر اس ان ادھر ادھر دیکھتا ہے، لیکن ہوا کچھ نہیں۔

خان :- یعنی تمہارا مطلب ہے تجھے نہیں ہوا؟

نوید :- بچہ تو بعد کی بات ہے، پہلے تو وہ خود ٹھیک ہو جاتی۔

خان :- کھڑے کیوں ہو گئے ہو۔ بیٹھ جاؤ (نوید بیٹھ جاتا ہے) میں تمہارا یہ غم اور تمہاری اداسی سب فرادے۔

میں خوب جانتا ہوں نہیں۔

نوید :- واللہ اب تو تنگ آ گیا ہوں۔

خان :- کس سے بیوی ہے؟

آنے کی اطلاع تمہیں بروقت نہ مل سکی۔

خان :- (تپاک سے ہیلو) تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے ناراض ہوں۔

دیکھو زماں حیرت سے کبھی اپنے شوہر بھی نوید کی طرف دیکھتی ہے)

خان :- (بیگم سے) نصرت بھی یہ نوید ہیں (بیگم زماں بھونچکا ہو کر نوید کو دیکھتی ہے)

نوید :- (آداب عرض) (خان سے) دراصل ان کا قصور نہیں، میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ (وہ یہ مجھے ڈاکٹر قاسمی سمجھ بیٹھیں۔)

خان :- (مسکرا کر) اچھا تو انہوں نے اپنا تعارف کر دیا، تم بھی ان کو کوئی اور سمجھے۔

نوید :- انہوں نے تو اپنا تعارف نہیں کروایا لیکن میں سمجھ گیا تھا تمہارے جیسے بدم کے پاس اور کون رہ سکتا ہے۔

دیکھو زماں ایک دم غصے میں پلٹ کر دائیں جانب سے باہر چلی جاتی ہیں)

خان :- جگہ سے! سب لوگ تمہاری طرح نہیں ہیں! (نوید کوک کر) میرا خیال ہے آپ کی بیگم ناراض ہو گئی۔

خان :- جس نے پہلی دفعہ بیگم کی عدم موجودگی پر دھیان دیا ہے، اچھا کہاں گئیں وہ؟

(آواز دے کر) نصرت.... نصرت....

(پھر نوید سے) واقعی وہ تو غائب ہو گئیں۔ دراصل تم بد تمیزی سے باز نہیں آتے۔ (اردلی سے) تم جاؤ، ہم ابھی آتے ہیں۔

(اردلی پچھلے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے)

نوید :- (یاد واقعی غلطی ہو گئی۔ فقرہ آگیا زبان پر اور روک نہ سکا۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ برامان جائیں گی۔)

خان :- ہاں وہ میری معذوری کے معاملے میں بہت حساس واقع ہوئی ہیں۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہ تینا ڈمیری شادی پر کیوں نہیں آئے؟

شادی پر کیوں نہیں آئے؟

جھگڑ رہی تھیں تو وہ بولا اگر دونوں اکٹھے لے لو تو
دوسرے سیٹ کی قیمت آدمی لوٹکا۔ بیگم نماں اور
چھوڑ کر چلی آئیں۔ میں نے بعد میں جا کر چپکے سے دو
سیٹ لے لئے۔

خان :- تو جب تم نے وہ سیٹ لاکر بیگم کو دکھائے تو وہ
جگڑیں نہیں؟

نویید :- میں نے دکھائے ہی کب؟ ایک لادوڑی کی بیٹی
کو دیدیا دوسرے بھائی کے لئے لے آیا۔

خان :- بہت خوب! بچاری بھائی!
نویید :- انہی بیگم کے بارے میں کہہ رہے ہو یا ہماری بیگم
کے بارے میں!

خان :- رسوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اور سیٹ نوید
کو لوٹاتے ہوئے، تم خود ہی انہیں دے دینا۔
نویید :- نہیں بھائی تم دیدینا، مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔

خان :- پاگل ہو گئے ہو! خفہ لائے ہو تو دو اپنے ہاتھ سے
(نویید سیٹ لے کر بیٹی میں رکھ لیتا ہے) ہاں، اور
وہ ڈاکٹر قاسمی کیا ہوا؟

نویید :- تو رگل نے اسے دیکھا نہیں، بس مجھے لے کر چلا آیا۔
اب اسے لینے گیا ہے۔ ہاں یہ پتا اوپر لٹین کرانے کا
ارادہ ہے کیا؟

خان :- دچرے پر بیک ایک قنوطیت برسنے لگتی ہے، خدا
جائے بیکار کا قصہ ہے سارا۔ نصرت کا خیال ہے
شاید میں پھر چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں۔

نویید :- تو نہیں چلنے پھرنے پر کیا اعتراض ہے؟

خان :- اول تو اپریشن ہو نہیں سکتا۔ اور اگر ہو بھی جائے
اور میں چلنے پھرنے بھی لگوں تو کیا فرق پڑتا ہے،
مجھے جھگڑاؤں میں اب کوئی دیکھی نہیں۔

نویید :- تم تو روز بروز زیادہ قنوطی ہوتے جا رہے ہو۔

خان :- جانتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جب سے میری ٹانگیں بیکار
ہوئی ہیں، میرا ذہن زیادہ صاف ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں
جسم کا ایک عضو کمزور ہو جائے تو کوئی دوسرا مضبوط

نویید :- بیوی کی بیماری سے۔

خان :- ایک ہی بات ہے۔

نویید :- نہیں بھائی میں مذاق نہیں کر رہا۔ والٹر ٹنگ، گیٹ
اب تو پانچ برس ہو گئے اس بیماری کو۔

خان :- دیکھا ایک سنجیدہ ہو کر، تو بھائی کیا ہستی ہے؟

نویید :- وہ بھی تنگ آگئی ہے کہتی ہے دوسری شادی کر لو۔

خان :- پھر؟

نویید :- دوسری شادی کہہ دینا آسان ہے، برداشت کرنا
مشکل ہے۔ وہ اس قدر چاہتی ہے مجھے کہ اگر میں نے کبھی
دوسری شادی کر لی تو وہ یا اسے مار دے گی یا خود
مر جائے گی۔

خان :- دسجیدگی اب اداسی میں بدل جاتی ہے، مجھے بھی تو
چار سال ہو گئے اسی کڑی کے ساتھ۔

نویید :- (چونک کر اپنا اٹیچی اٹھاتا ہے اور اسے دکھاتا ہے)
تمہاری شادی کا تحفہ تو میں دینا ہی بھول گیا
(اٹیچی میں سے سنہری نوٹیں پن کی ڈبیہ نکالتا ہے)
یہ لندن سے پارکر کا جوڑا لیتا آیا تھا۔

خان :- (کس ٹھینک پو۔ یہ ہماری بیگم کو دے دو تو
زیادہ خوش ہوں گی۔

نویید :- نہیں بھئی یہ تمہارا ہے۔ ان کے لئے اور چیزیں لگئی
اتفاق سے۔

خان :- اتفاق سے؟

نویید :- ڈائمنڈ ٹیکس کا ایک سیٹ (اٹیچی سے دے دیتا ہے)
بنڈیکس کا سیٹ نکالتا ہے)

خان :- بیوقوف! اتنا پیسہ کیوں برباد کیا؟ ہیرے سے
کم کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی کیا؟

نویید :- ذرا سٹائل کیا۔ دیکھو کیسا ہے۔

خان :- بے حد خوبصورت آخر کتنا سستا ہوگا (ہاتھ لیا
لے کر دیکھتا ہے)

نویید :- اصل میں جوہری کے پاس ملتے جلتے تقریباً ایک
دام کے دو سیٹ تھے ہماری بیگم ایک کی قیمت پر

خان : ہمارے طرف سے تم وکالت چھوڑ کر گھسیارے ہو جاؤ۔
ہمیں تمہاری وکالت سے کیا فائدہ۔ ہمیں اکون سے لڑ
تمہارے پاس رکھنا نہیں۔ ایک دہلا ہو میں ہمارے
جاننا کہ مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے، وہ تو تم نے
جیت کے دیا نہیں۔

نوید : بھئی وہ تو دیوانی مقدمہ ہے۔ اس میں تو وقت
لگے گا ظہراؤ نہیں زمین کا جتنے پیسوں میں سودا ہوتا
اتنے ہی میں دلوؤں کا۔ زمیندار عہد شکنی نہیں کر سکتا۔
دبیر جانک بات بدل کر ہاں بیگم زماں! میں آپ کی
شادی پر حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس موقع پر جو تحفہ
پیش کرنا تھا وہ اب حاضر کرتا ہوں۔ راجھی سے
ڈبیہ نکال کر بیگم زماں کو دیتا ہے

بیگم زماں : (لیتے ہوئے) شکریہ! اچھا اب چلے اندر چلیں میں
کچھ کافی بنوائی ہے۔
خان : ذرا ڈبیہ کھول کر لودیکھو۔ اس احمق نے ڈائمنڈ
نکس خرید مارا ہے۔

بیگم زماں : (دکھول کر دیکھتی ہے) واقعی بے حد خوبصورت ہے
یہ انہوں نے زحمت کیوں کی؟

(خان محسوس کرتا ہے کہ اس کی بیوی کو
اس تحفہ سے کوئی خوشی نہیں ہوئی اور
وہ حیرت اور پریشانی کے مل جلے جذبات
سے اسے دیکھتا ہے)

نوید : معلوم ہوتا ہے آپ کو تحفہ پسند نہیں آیا۔
بیگم زماں : (دکھولنے کی کوشش کرتے ہوئے) وہ کیوں؟ اتنی
اچھی چیز کیسے پسند نہیں آئے گی۔

دباہر کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز
بیگم زماں : میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب آگئے۔

پچھلے دروازے میں تو رنجل نمودار ہوتا ہے
اور ایک ہاتھ سے دروازے کے سانے سے
پردہ اٹھاتا ہے۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر قاسمی
ہاتھ میں ڈاکٹر والا سیاہ رنگ کا بیگ لئے داخل

ہو جاتا ہے۔

نوید : تمہاری باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ تمہارا ذہن پہلے سے ہی
کمزور ہو گیا ہے۔

خان : اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے، بین کی ڈبیہ
اٹھا کر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تمہارا یہ تحفہ بہت
مناسب ہے۔ کتنا میں پٹھنے پٹھنے تنگ آ گیا ہوں۔
اب کچھ کمنا شروع کر دوں گا۔

نوید : دیکھو پیارے، مان لیا اب تم فلا سفر ہوتے جا رہے ہو۔
لیکن اس ڈاکٹر کے معاملے میں تمہیں چاہئے کہ بھابی سے
پورا پورا تعاون کرو۔

دائیں جانب سے بیگم زماں داخل ہوتی ہے۔

وہ اپنے غصے پر قابو پا کر چہرہ پر سکرابٹ لگاتی ہے

ہو گئی ہے

نصرت : (نوید سے) معاف کیجئے اس وقت میں آپ کو خوش آمدید کہنے
چلی گئی۔ دراصل میں کچھ یکایک پریشان سی ہو گئی۔ نصرت کا
انداز مخاطب رسمی طرز پر خوشگوار ہے لیکن اس میں ذرا برابر
بھی گرمجوشی نہیں)

نوید : غلطی میری تھی۔ ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کو یونہی چھیڑتے
رہے ہیں۔ لیکن آپ کی موجودگی میں ایسی چھیڑ خالی بدتمیزی
نہی۔

نصرت : نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ مجھے خان کے دوست بہت
عزیز ہیں۔ ان کی بے تکلفی قابل معافی ہے۔

نوید : (دیکھا کہ سنجیدہ ہو کر) خان کے دوست بہت کم ہیں۔
خان : دوست کم ہوں تو اچھا ہے۔ وہ زیادہ مخلص ہوتے ہیں۔
نصرت : اور اگر کوئی دوست وکیل، یا ڈاکٹر ہو تو اچھا ہے
دوسروں کے دانچے دلیں رکھنا ان کی تربیت کا حصہ ہوتا ہے۔
انہیں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ کسی ایک کی
بات دوسرے کو نہیں بتاتے (معنی خیز نظروں سے نوید کو
دیکھتی ہے)۔

نوید : بچا فرمایا آپ نے۔ وکیل کے لئے رازداری بڑی اہم ہے۔
اس کے پاس ہر طرح کے راز محفوظ رہتے ہیں۔

ہوتے ہیں کوئی بچا جس پر کبھی ہٹش ہٹاش آدمی ہیں۔
سر کے بال کچڑی، ڈاڑھی موچھ عقابٹ۔ آنکھوں کی
جینک اور چہرے پر مسکراہٹ)

خان: ایسے ڈاکٹر صاحب، معاف فرمائیے آپ کو اسٹیشن پر انتظار
کرنا پڑا۔ میرا نام شاہ زمانہ ہے۔
ڈاکٹر قاسمی: (ہاتھ ملا تے ہوئے) سلام سلیم۔ جی نہیں کوئی بات
نہیں آپ کے دوست نوید صاحب نے وجہ بتا دی تھی۔
خان: (نوید کی طرف اشارہ کر کے) اور ان۔ سہیلے یہ ہیں
وہ نوید صاحب۔

(ڈاکٹر قاسمی اور نوید مسکراتے ہوئے مصافحہ کرتے ہیں)

خان: یہ ہیں ہماری بیگم (ڈاکٹر قاسمی آداب بجالاتا ہے)
ڈاکٹر: جی ہاں اگرچہ ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔
لیکن زوارہ صاحب میرے بڑے کرم فرما ہیں اور دوست
بھی۔ اس نسبت سے یہ میری بیٹی ہیں۔

بیگم زماں: (مسکراتے ہوئے) بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔
ڈاکٹر: اگر آپ اجازت دیں تو معائنہ شروع کر دیا جائے۔
پھر کچھ دیر بیٹھ کر باتیں بھی کرنا ہیں۔

بیگم زماں: جی ہاں (دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے) ایسے اس برابر
دلے کمرے میں چلتے ہیں۔ (خان کی کرسی کی طرف بڑھتی ہے)

خان: نہیں نصرت تم نہیں بیٹھو۔ نوید اکیلے ہوں گے۔
ڈاکٹر: (نصرت سے) آپ زحمت نہ کیجیے، میں انہیں خود ہی لے جاؤں
اپنی رائے قائم کروں، اس کے بعد آپ سے تباہ ڈیخیل
کروں گا (کرسی کو دائیں جانب دھکیلتے ہوئے) ادھر جا
کو جانے نا؟

خان: جی ہاں۔

ڈاکٹر کرسی کو دھکیلتا ہوا دائیں جانب نکل
جاتا ہے۔ کمرے میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ نوید
بیگم زماں کی طرف دیکھتا ہے لیکن وہ نظریں
جھکا کر دائیں جانب چلی دیتی ہیں اور سیلفیون کے
قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں۔ نوید
سیڑھیوں کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے

ایک پر بیٹھ جاتا ہے۔

نصرت: (شکریہ آپ نے خان سے ہماری گفتگو کا ذکر نہیں کیا۔
نوید: آپ نے خود ہی فرمایا تھا نا کہ ہم وکیلوں کو تو بلا داری
کی عادت ہوتی ہے۔

نصرت: چونکہ آپ سے یہ بات برحیثیت وکیل کے نہیں ہو رہی تھی
نوید: برحیثیت ڈاکٹر کے تو ہو رہی تھی۔ چلئے ہٹائیے اس
قصے کو آپ نے یوں بھی میرے بارے میں اب رائے
بدلی ہوئی۔

نصرت: (طنز پر) بدلتی تو چلے گئی۔ ایک تو آپ نے راز کو راز
رکھا اور دوسرے اتنا بڑھیا تحفہ لا کر دیا۔

نوید: (جھینپ کس جی نہیں اس خیال سے نہیں۔ بلکہ یوں
کہ جب تک کسی کو ذاتی طور پر آدمی نہ جانتا ہو ممکن ہے
اس کے بارے میں اچھی رائے نہ ہو۔ دوستی اور خیر گلی
کی ملاقات کے بعد رائے بدل سکتی ہے۔

نصرت: جی ہاں، اگرچہ بدلنے میں وقت لگتا ہے۔

نوید: (سوچتے ہوئے) اور وقت نہیں ہے۔

نصرت: کیوں آپ بھی شام کی گاڑی سے واپس جائیں گے؟
نوید: جی ہاں۔ چند کاغذات پر دستخط کرانے کی غرض سے
آیا تھا، اس زمین کے مقدمے کے سلسلے میں۔ اس کے بعد
مجھے فوراً لوٹنا ہوگا۔ پرسوں عدالت میں حاضری ہے۔
نصرت: (بے تعین سے) لیکن یہ کاغذات تو آپ ڈاک کے ذریعے
بھی بھیج سکتے تھے؟

نوید: اس کے علاوہ زمان سے مدت ہوئی ملا بھی تو نہیں تھا۔
اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں آپ سے بھی ملنے کو
جی چاہتا تھا۔

نصرت: (ذرا جھینپ کس شکریہ ادا کر کے) افسوس ہے آپ کو
اس ملاقات سے ناامید ہوئی۔

نوید: جی نہیں، میں آسانی سے ناامید ہونے والوں میں سے
نہیں ہوں۔

نصرت: امید قائم رکھنے کے لئے بھی تو وقت چاہیے۔ اور وقت
ہے نہیں!

سوچتی۔

نوید :- میگم نماں، دنیا کا ہر شخص ایسی قربانی کر کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ زندگی کی تلخ حقیقت آہستہ آہستہ اسے تصور کی بلندی سے نیچے اتار لاتی ہے۔ میں نے سال بھر بیوی کے بے حد خدمت کی، دنیا بھر کے ڈاکٹروں کو دکھایا، انہیں چکروں میں اپنی پریکٹس کو بھی نقصان پہنچایا۔ لیکن آخر مجھے بھی زندہ رہنا ہے۔ آپ بہ سناس لے سکتی ہیں کیونکہ آپ کے لئے زندگی کی دوا ہم نہیں ہے۔ میں تو اس دوا میں شریک ہوں اور شریک رہوں گا۔

نصرت :- مگر بیوی بہر حال آپ کی ذمہ داری ہے۔

نوید :- دمسکر کس جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا۔ اس ذمہ داری کی وجہ سے ہی آج شام واپس جا رہا ہوں۔

نصرت :- جی نہیں، آپ اس لئے لوٹ رہے ہیں کہ آپ کو ہلکا گھر گوشہ عافیت نظر نہیں آیا۔ بہت ممکن ہے آپ گھر لوٹنے کے بجائے کسی اور گوشہ عافیت کا رخ کریں۔

نوید :- سوچتے ہوئے یہ آپ نے واقعی اچھی بات سمجھائی:

.....

مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں!

نصرت :- مجھے واقعی آپ کی بیوی سے ہمدردی ہوتی جا رہی ہے۔ میں انہیں جب جا کر یہ بتاؤں گا تو انہیں بڑی خوشی ہوگی۔

نصرت :- (الحمد للہ) آپ طرز فرما رہے ہیں۔

نوید :- جی نہیں۔ میں نہایت دیانت سے عرض کر رہا ہوں۔

نصرت :- مجھے آپ کی دیانت پر شبہ ہے۔

نوید :- (یکایک چونک کر) اس بات کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں (رک کر ذرا شرارت سے) معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کس قسم کی بددیانتی ہے۔

نصرت :- اب کے نصرت چونکتی ہے جی نہیں یہ بددیانتی

نوید :- دذرا کس کس جی ہاں یہ مجبوری تو ہے۔ لیکن انشاء اللہ پھر ملاقات ہوں گی۔ ابھی تو پوری زندگی بڑی ہے۔

نصرت :- (اچانک) آپ کچھ بتائیے کہ آپ کا اصل میں ارادہ تو چند روز قیام کا تھا نا۔ یہ آج ہی شام نوٹے کا فیصلہ آپ نے ابھی ابھی کیا ہے؟

نوید :- (چونک کر) میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا، میرا ارادہ واقعی چند روز ٹھہرنے کا تھا۔

نصرت :- اور عدالت میں پرسوں حاضری؟

نوید :- ظاہر ہے وہ بات میں نے کھڑی تھی۔

نصرت :- دمسکر کس لیکن آپ کا جھوٹ بڑی جلدی پکڑا گیا۔ بہر حال آپ اپنا ارادہ بدل لے رہے ہیں آپ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔

نوید :- شکریہ! مجھے معلوم ہے کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن جس بات کے لئے آیا ہوں وہ منتشر نہ آئی تو میرا ٹھہرنا بیکا رہے۔

نصرت :- تو آپ کس غرض سے آئے ہیں؟

نوید :- کچھ دنوں کام کی بہتات سے میرے اعصاب ذرا جھنجھٹائے تھے میں نے سوچا یہاں پر مجھے ذہنی سکون مل جائے گا لیکن اب یہ مشکل نظر آتا ہے۔

نصرت :- (دو روایت بدلتے ہوئے) خان کہہ رہے تھے آپ کی بیوی مستقل بیمار رہتی ہیں

نوید :- جی ہاں۔

نصرت :- تو اب وہ گھر میں اکیلی ہیں کیا؟

نوید :- جی نہیں ان کے پاس خادماں ہیں۔

نصرت :- نہیں میرا مطلب ہے ان کا کوئی عزیز ان کے پاس نہیں؟

نوید :- (ذرا بچکے جی نہیں۔)

نصرت :- میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ اپنے آرام کی خاطر خان کو تنہا چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں۔

نوید :- آپ کی شادی ہوئے چند ہی مہینے ہوئے ہیں۔

نصرت :- اگر چند سال بھی ہو چکے ہوتے تو میں پھر بھی یہی

نصرت :- بہر صولت یہ بحث بیکار ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

نوید :- زبان یا دین ترکی دین ترکی نمی دایم۔

نصرت :- مگر جواب تو آپ ترکی بہ ترکی دیتے ہیں۔

نوید :- اگر گستاخی نہ ہو تو میں بھی کچھ پوچھنے کی جرأت کروں؟

نصرت :- فرمائیے؟

نوید :- آپ کی شادی کی بنیاد کیا ہے؟

نصرت :- (اطمینان سے) محبت۔

نوید :- منہں کس ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کا اگر عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانون پر نہیں!

مرزا غالب :- یعنی ہماری ہی طرف سے یہ عند

دوستی ناقابل قبول تھا۔ آپ کی طرف سے

یہ بنیاد نہایت معقول ٹھہری۔

نصرت :- (ذرا طنز سے) تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے زمانے سے پیسے کے لئے شادی کی ہے؟

نوید :- جی نہیں، مجھے معلوم ہے آپ کے یہاں پیسوں کی کمی نہیں تھی۔

(ڈاکٹر قاسمی دائیں جانب سے داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر قاسمی :- غان کہہ رہے ہیں آپ سب لوگ ڈرائنگ روم آجائیے، کافی تیار ہے۔

نصرت :- آپ نے معائنہ کر لیا؟

ڈاکٹر قاسمی :- ابتدائی اور سرسری معائنہ تو کر لیا ہے، تفصیلی معائنہ

آپ سے گفتگو کرنے کے بعد کروں گا۔

نوید :- اگر اجازت ہو تو میں لپک کر پہلے پہنچ جاؤں۔ کافی کی

طلب ہو رہی ہے اور پھر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ لوٹا بھی

ڈاکٹر قاسمی :- اچھا تو آپ بھی آج ہی جائیں گے؟

نوید :- دو دنوں کے بعد آئیے گا، آپ کی محبت، واللہ،

از بس کہ خوش آئی ہے۔

ڈاکٹر قاسمی :- خوش ہو کر، شکریہ (نوید دائیں جانب نکل جاتا ہے۔

نصرت کی طرف توجہ ہو کر یہ دیکھیں کہ شاعر؟

میرے ذہن میں ہیں آپ کے ذہن میں ہے۔

نوید :- مسئلہ کس اچھا وکیل وہ ہے جو سخت سے سخت جرح

سن کر بھی مسکراتا رہے۔

نصرت :- (ذرا تشریح سے) اگر آپ کے ذہن میں بد دیانتی نہ ہو تو

تو اپنا تعارف کرانے میں اتنی تاخیر نہ کرتے۔

نوید :- (سجیدگی سے) آپ دیانت کی بات پوچھتی ہیں؟

نصرت :- جی ہاں سچ بٹائیے۔

نوید :- میرا ارادہ تھا اپنا تعارف کر دوں لیکن آپ کی گفتگو

اتنی — (ذرا رک کر) اتنی یعنی دلچسپ ہوتی چلی

کہ اگر میں زبردستی بول پڑتا تو سارا مزہ کر کر لیا ہو جاتا۔

نصرت :- خیر، اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ آپ کے بارے میں

میری رائے — (دھڑک کر) اچھا آپ یہ بتائیے کہ

آپ کی اور خان کی دوستی کس بات پر قائم ہے؟

نوید :- محبت پر۔

نصرت :- (ذرا ہنستا ہے) جی نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ محبت آپ کو کوئی اور اسی قسم کی چیز ہو

میں پوچھنا یہ چاہ رہی تھی آپ کی دوستی کی بنیاد کیا ہے۔

نوید :- یعنی یہ کہ زمانے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔

نصرت :- جی ہاں، یوں بھی کہا جاسکتا ہے۔

نوید :- زمانے میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اکثر ایسی جنہیں محسوس

کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔

نصرت :- مثلاً؟

نوید :- (ذرا طنز سے) آپ کو شاید وہ نظر نہ آئیں۔

نصرت :- (بھڑک کر) نوید صاحب میں ان کی بیوی ہوں

اور بیوی سے زیادہ — (رک کر نرم لہجہ میں)

اصل میں میں انہیں شوہر کی حیثیت سے جانتی ہوں،

دوست کی حیثیت سے نہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی شخصیت

کا وہ رخ جو دوست دیکھ سکتے ہیں — میں نہ دیکھ سکی

ہوں۔

نوید :- (نصرت کی نرمی سے متاثر ہو جاتا ہے) میرا مقصد آپ کے

جنوبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

نصرت :- (طنز سے) معلوم ہوتا ہے دونوں کی خرابیاں آپ میں ہیں۔

ڈاکٹر قاسمی :- جی؟ خیر۔ لیکن آدمی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ چلے سفر اچھا کٹ جائے گا۔

نصرت :- (موضوع بدل کر) تو اس ابتدائی معائنے کے بعد آپ کی رائے کیا ہے؟

ڈاکٹر قاسمی :- ہاں، فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی عام مریض ایک چوبیس گھنٹہ بستر پر لیٹا رہے تو اس کی ٹانگیوں کے نیچے بہت کمزور ہو جاتے ہیں۔

ان کا علاج الگ کرنا پڑتا ہے۔ اور انہوں نے تو اپنی ٹانگوں کو چار برس سے حرکت ہی نہیں دی۔

نصرت :- یعنی امید زیادہ نہیں۔

ڈاکٹر قاسمی :- زیادہ تو یقیناً نہیں۔ انل میں سب سے پہلے انہیں اس ذہنی منزل پر لانا ضروری ہے جہاں وہ بہت سی تکلیف اور محنت برداشت کر سکیں۔

جرا انہیں صحت یاب ہونے کے لئے بہر حال کرنی پڑے گی کیا آپ کے خیال میں آپ انہیں اس منزل پر لاسکتی ہیں؟

نصرت :- (سوچ کر) اداسی سے مشکل ہی نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر قاسمی :- تو کیا ان کا کوئی دوست ایسا نہیں جسے دیکھ کر انہیں زندگی کی اچھی باتیں یاد آئیں جو انہیں

ڈونے سے بچا سکے، انہیں ہاتھ پاؤں مارنے کو کہے اور آہستہ آہستہ ابھرنے کے لئے اکسا سکے؟

نصرت :- (اداسی سے) نہیں کوئی نہیں..... (پھر یکایک چونک کر) ہاں شاید نوید۔

ڈاکٹر قاسمی :- لیکن نوید تو آج شام واپس جا رہے ہیں اور اس کام کے لئے وقت درکار ہے۔

نصرت :- تو آپ کیا خیال ہے اگر انہیں روک لیا جائے تو خان کے صحت یاب ہونے کی کچھ امید ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر قاسمی :- میں قطعی طور پر ناامید بھی نہیں ہوں۔

نصرت :- اگر ایک فی صد بھی امید ہو تو میں انہیں روکنے کی کوشش کروں گی۔

ڈاکٹر قاسمی :- (مسکرا کر) فائدہ ہو یا نہ ہو، انہیں روکنے میں کوئی نقصان تو نہیں ہے۔

(اندروں سے زمان کی آواز)

زمان :- بھائی آپ لوگ ابھی چکو۔

نصرت :- آ رہے ہیں۔ (ڈاکٹر قاسمی سے) اچھا ڈاکٹر صاحب! میں کوشش کرتی ہوں۔

(دونوں دائیں جانب چلے جاتے ہیں)

(پروہ گرتا ہے)

★

مسلم بنگالی ادب

بنگلہ سے ترجمہ

ڈاکٹر انعام الحق، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ، ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ اور جلد سے، سرورقی دیدہ زیب اور نگین ضخامت۔ ۱۰۰ صفحات قیمت چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۵۳۳ کراچی

بدل: ————— بقیہ صفحہ ۷۷

طرح چپ چاپ پڑا تھا۔

ان کی ہنگامی باتوں کے اندر لوٹ آئیں۔ آواز ایک بار پھر ابھری۔ پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور پھر کیا ایک خاموشی چھائی اور اس کے ساتھ ہی ریت، اور ٹی کا کھوٹا ہوا کڑھاڑ سا جہاں رہ چکا اور کتا لڑ رہے تھے اٹھ اٹھ ہو گیا۔ گھولابند گیا۔ ہر انگریز۔ طوفان تھم گیا۔

تلندرا اور زمیندار دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اکٹھے کے مرکز کی طرف پلٹے پیٹھے ہوئی ریت میں کچھ مردہ پڑا تھا اور اس کے سائے میں نٹنل شاہ کا کتا چپے ستا رہا تھا۔ اور فضا مبارک بادوں سے گونج اٹھی۔ لیکن سید فضل کچھ اور ہی سوچ رہا تھا بدل دی تباہی، وی تباہی۔ پرکے لیے بغیر دوا آسان دی سمجھ دیجئے کوئی نین آندا۔ اوسے؟

دکھی شاہزادی: ————— بقیہ صفحہ ۷۸

بنالیا تو —————! بے بسی کے اس عالم میں اُس نے خدا سے دعا مانگی شروت کیں۔

کچھ دیر بعد شاہزادے نے مایوس ہو کر برسی بانو سے کہا۔
"باتو آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ شاید اب ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائیں گے۔ پھر ہی ہوئی موجیں ہماری تباہی کی نشاندہی کر رہی ہیں؟"

رات بیت چکی تھی!

یورپ اور سے سورج نے آہستہ آہستہ سر نکالا شاہزادے نے آخری بار برسی بانو کے اُداس اور مضمحل چہرے کو دیکھا اور پل بھر میں ناؤ کو موجیں نکل گئیں!
قیمت بھی کیا کیا لیل و نہار دکھاتی ہے؟

تھوٹری منظور ہے..... کو۔

"کیوں اوسے" زمیندار کی آواز میں غصہ تھا۔ رمضان فی نے اپنی پکڑی گئے میں ڈال لی اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ تو پھر ڈرتا کیڑا ہے۔ ہونے دے فیصلہ۔

اور زمیندار کے اشارے پر ایک مرتبہ پھر بلاشیر کا شور بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی اکٹھے کے مرکز سے ایک گھولابند تھا جس میں دو سائے۔ ایک سیاہ ایک سفید حرکت کرتے ہوئے نظر آئے اور پھر کیا ایک ایک خوفناک آواز ابھری جیسے زلزلے۔ طوفان اور آندھی کی سی آواز۔

تماشا یوں کے دل دھل گئے اور ان کی ہنگامی اس آواز سے منع ڈھونڈنے کے لئے سارے میں گھوم گئیں لیکن آسمان فیروز کی طرح صاف۔ زمین اپنی جگہ پر قائم تھی اور انہیں ہر حال طغیانی کی مٹی اور قاتلہ فیصلیں دے جانے والا دریا تین کے پر سے ریت کی

کردول گا۔ ہم تمہارا یہ احسان کہیں نہ بھولیں گے۔"

ماکھی رضا مند ہو گیا تو برسی بانو نے اپنا طلائی ہار اس کی طرف پھینک دیا۔

اس وقت دریا کی لہریں غضبناک ہو رہی تھیں۔ دونوں ناؤ پر بیٹھ گئے۔ شاہزادے نے پتوار سنبھال لیا اور ناؤ آگے بڑھنی شروع ہوئی۔ سرکش موجوں کے ٹکرائے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اتنا لبا چوڑا دریا، طوفان بدوش لہریں اور چھوٹی سی ناؤ زندگی جیسے بھنور میں گھر گئی ہو۔

برسی بانو دم بخود صرف شاہزادے کی اور دیکھتی رہی —
زندگی میں پہلی بار اُس نے پتوار ہاتھ میں لیا تھا۔ ناخبرہ کار ملو جا اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اگر ناؤ کو غضبناک لہروں نے اپنا لقمہ

”جہاں رنگینیاں گنتی ہیں“

(افسادہ و افسوس کی سرزمین، ہنتوہ و گٹر)

اللہ بخش راجپوت

اس علاقہ کے اُدھر وسط ایشیا کا مشہور سلسلہ گورہ پابہر کو چمکے تو اُدھر پاکستان کا اپنا کوہستانی رقبہ۔ مگر ہزاروں سال سے یہ سرزمین سوداگروں، سیاحوں، کوہ پیماؤں، مبلغوں یا تریوں، ہم پسندوں اور جہاں گروں کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ یہاں کے پہاڑ بڑے ٹیکے بہت ہیبتناک اور نہایت بلند ہیں، راہیں پر تھکی اور دسے بڑے بھیانک مگر انسان کی ہمت بلند کرنے والے۔ مشکلوں کو سر کر تی اور عزم و ارادہ، ہر دشواری کو فتح کر لیتا ہے۔ جب سفر کی اتنی آسانیاں نہ تھیں، سفر تو اس وقت بھی ہوتا تھا، اور اب بھی ہو رہا ہے، مگر دو حادثہ، الگ تھلک، اور دشوار گزار راہوں نے اسے محصور اور محدود و ضرور رکھا ہے۔ یوں چودھویں صدی میں یورپی سیاح، مارکو پولو بھی اُدھر سے گذرنا چاہا وہ چین کے حاکم قیلائی خان سے ملنے جا رہا تھا اور اب اس عہد میں فرنگی اور چین شہر جیسے شہر دیدہ و سراہا جہاں نور دہی یہاں پہنچتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے جو حالات سفر کئے ہیں انہیں پڑھ کر کریں چوٹیاں اسی چلنے لگتی ہیں اور ہول سے رو جھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ مقام ہمارے ہی ملک کا ایک حصہ ہے۔ ہاں کل شمال میں۔ اسے انتظامی اصطلاح میں ”مملکت ایجنسی“ کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی سرحد سے شروع ہو کر مغرب کی جانب چترال و افغانستان تک پھیلا ہوا ہے اور اس طرف شمال میں چین کا سرحدی صوبہ سنکیانگ لگتا ہے۔ اور جنوب میں ہزارہ اور ایبٹ آباد کے اضلاع آن ملتے ہیں۔ اس علاقہ میں آج کل حقارت اور گٹر کی ریاستیں ہیں۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمال کی جانب ”دنیا کی چوٹ“ سے شانہ ملائے

نہ یہاں کوئی طلسم بند ہے نہ یہاں پر یاں رہتی ہیں اور نہ یہاں کوئی جادو اور سمیہا کے شعبے ہی دکھائے جاتے ہیں، مگر پھر بھی اس خطہ کو سیاحوں کی داستان طرازیوں نے ایک طلسمی صفت ضرور عطا کر دی ہے اور فطرت کی قیاسیوں نے اسے جس طرح مالا مال کیا ہے اس کو کہا نیوں میں کچھ اس طرح بن دیا گیا ہے کہ حیرت و استعجاب کے سوا اور کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔ بظاہر اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت کم لوگ اس علاقے تک پہنچتے ہیں اور بیرونی دنیا سے اس کا ربط اتنا محدود رہا ہے کہ باہر والے اسے الف لیلوٰی سرزمین سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ پاکستان ہی کا ایک حصہ ہے، اپنے ہی شمالی کوہستان کا جگر گوشہ۔

اسے داستانی شہرت یوں حاصل رہی ہے کہ اس کے چاروں طرف ناقابل عبور پہاڑوں کا حصار کھنچا ہوا ہے۔ ان پہاڑوں کو عبور کر کے یہاں تک پہنچنا جسے شیر لانے سے کم نہیں۔ مگر جو حصار اور ذوقِ نظارہ کے شیدا ہیں اُدھر آتے ہی رہے ہیں۔ صدیوں سے یہ مقام انسانی قدموں کی چاپ مٹا رہا ہے، مگر کبھی کبھار۔ یہاں قدیم پہاڑی راستے ہیں جو مصیبتیں بھییلے بغیر عبور نہیں کئے جاسکتے۔ صرف مصیبتیں اور سفر کی صعوبتیں ہی نہیں، جان جو کھوں میں ڈالنی پڑتی ہے۔ اب فضائی سفر نے ان ہولناک سفروں کی کہانیاں دہرانے کا موقع کھو دیا ہے مگر جو لوگ اب بھی قدیم طریقہ سفر سے کام لیتے ہیں طرح طرح کے دکھ جھیل کر ہی یہاں تک پہنچتے ہیں۔ اور ان ملک بوس پہاڑوں پر سے گذرتے ہوئے ان چوٹی جہازوں کو بھی ہر وقت خطرے سے ہی واسطہ رہتا ہے۔

کھڑے آج کل کے فہم جویوں کے لئے اس داستانی سرزمین تک پہنچنا ایسا ہی رومانی تجربہ ہے جیسے کسی وقت میں خیال "بحر ظلمات" تک پہنچنا تھا۔ ہم پسند جہاں نور دوں کے لئے تو ایسے ہی دشوار گزار خوفناک، نامہوار اور پہلے صراطِ قطعاتِ ارض ہی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ یہ سرزمین اپنے کو ہستانی حصار کے سبب بیرونی دنیا سے بہت کم واسطہ رکھتی ہے اور صفر کے حکمران کو تو لوگوں شاہِ یوتوپیا کہتے ہیں۔ یوتوپیا، وہ خیالی سرزمین جسے یونانیوں کے نقشے دنیا میں اتنا مشہور کر چکے ہیں۔

صفر کی سڑک کا حال کیا بیان کیا جائے۔ بس ایک قدیم الایام راستہ پہاڑوں پہاڑوں چلا گیا ہے جس پر خچر اور پاک ہی آ جاسکتے ہیں اور وسطِ ایشیا کے کاشغریے پاکستان کے سنگت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام علاقہ کی شہرت اس کے پراسرار اور تپہ پوری اس راستہ کی وجہ سے ہی ہے۔ آدمی وہاں صرف قدرتی نظارے دیکھنے نہیں جاتا بلکہ اطراف کی دنیا سے رابطہ پیدا کرنے کا واحد زمینی راستہ یہی ہے اور دنیا کا کوئی بھی خطہ کبھی بھی ایسا نہ رہا کہ باہر کی دنیا کے لئے سر بہر کتاب کی مانند ہو۔ انسان ہر گز گنجائش اور ہر مقام کی حقیقت ایک نہ ایک دن اسے ذاتی تجربوں سے معلوم ہو گئی ہے۔ صفر اور سنگت کے علاقے میں اس سڑک کی لرزہ خیز داستانیں اس قدر دود و دھول پھیل چکی ہیں کہ شاید لوگوں کا حوصلہ اسی وجہ سے پست ہوا ہے اور یوں یہ مقام اپنے "گوشہ عافیت" میں اپنے الگ تھلگ وجود کو لئے صدیوں سے ایک پراسرار زندگی بسر کرتا چلا آ رہا ہے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ زمینی سفر کی بھی آسانیاں ہیں اور اس تک پہنچنے کے لئے۔ "اٹرن کھٹولا" بھی موجود ہے جو ذرا سی دیر میں ہمیں اس سرزمین پر پہنچا دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تاریخ کے ہر عہد میں دنیا کے بعید ترین گوشوں سے لوگ یہاں پہنچتے رہے یہ مباحوں اور سوداگروں کا تانا نہیں بندھا تو آمد و رفت ایسی کم بھی نہیں رہی ہے ہم سب جانتے ہیں کہ چین اور وسطِ ایشیا کے مال سے لدے ہوئے کارواں اسی تاریخی سڑک سے گزرتے تھے۔ چین کا ریشم، تبت کا مشک، وسطِ ایشیا کی کالیہیں، سمورا اور نوادادھر آتے رہے ہیں۔ پھر

یہاں سے پاک و ہند کی تجارتی منڈیوں تک پہنچتے تھے اور سوداگر منہ لگتے دام ہالتے تھے۔ اس مال کا تبادلہ طرح طرح کی چیزوں سے ہوتا جیسے گرم مصالحے، کپڑا، جوتا، جواہر۔ اگر ایک دفعہ بھی کوئی سوداگر اپنا مال لیکر ادھر آ گیا تو ساری عمر کی کمائی ہو گئی۔ مگر کارواں کے کارواں غائب بھی ہو جاتے تھے۔ سوداگروں کو پہاڑ کے پہاڑ ٹپ کر جاتے اور یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ وہ اور ان کا مال کیا ہوا اس کی وجہ یہاں کی آفاتِ ارضی و ساوی ہیں۔ ہر وقت پہاڑوں کا ٹوٹ پھوٹ، تو دوں کا گرنا، راستوں کا مسدود ہو جانا ایک عام حادثہ ہے۔ دریاؤں کے کٹاڑے پھسل جاتے ہیں، چٹانیں آنسو گئی ہیں۔ آندھیاں، جھکڑ، بجلی۔ رعد۔ طوفان، اولے، برف، الامان و الحفیظ! کونسی قیامت ہے جو یہاں نہیں ٹوٹی۔ اور نہ اس کا کوئی مقرر وقت ہے نہ جگہ۔ فطرت انہی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے تو یہاں اس کی زبردست سفاکی اور فیض بھی اسی شدت کے ساتھ اپنا روپ دکھاتا ہے۔

ہزاروں سال سے سیاحوں کے قدم یہاں پہنچتے رہے ہیں۔ ان کے کلمے ہوئے سنسنی خیز حالات پڑھنے سے کچھ معلومات تو حاصل ہوتی ہیں مگر اس فلسفی سرزمین کی اصل کیفیت آنکھوں دیکھے حال سے بھی معلوم نہیں ہوتی۔ بس وہی بات کہتی ہے کہ ایک بار دیکھا ہے، بار بار دیکھنے کی ہوس ہے!

سفر کی صعوبتیں، پرہوں راستے اور خطرے ضرور لاحق ہوتے ہیں مگر اس سفر میں جو تھر تھری ہے اسے انگیز کر لینے کے بعد پھر انسان کو یہ گلبوش وادیاں مسحور بھی اتنا ہی کرتی ہیں۔ اسے جنتِ ارضی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ چاروں طرف برف پوش چوٹیاں، پہلوں سے لدے ہوئے اشجار، خوب فادان، بھی انسان کو طلسم و جحرِ دنیا میں لے جاتے ہیں۔

ہم پسند، کوہِ پیمیا، شکاری، — مناظر قدرت کے شیدا کسلے یہ مقام عجیب ہے۔ آپ کو پچھلی کے شکار کا شوق ہو، پولو کے دلدادہ ہوں، عکس کشی سے دلچسپی ہو تو یہاں بڑے خوبصورت مواقع موجود ہیں۔

آج سے بیس سال پہلے یہ کوہستانی خطہ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہونے کے سبب دنیا سے بہت ہی الگ تھلگ تھا۔ اب

کر رہے تھے جو ہمیں محنت لے جانے والا تھا۔ جوں جوں منزل قریب آتی جا رہی تھی شوق دیدن میں تر ہوتا جا رہا تھا لیکن یہ چند لمحات فرصت کچھ بے مصرف ہی نظر آ رہے تھے اور اس وقت ہماری طبیعت میں یہ بے لطفی قدرتی بات تھی۔ مگر یہ حالت بہت جلد تبدیل ہو گئی کیونکہ قافلہ سفر میں ایک عجیب اضافہ ہوا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک غیر ملکی جوڑا چلا آ رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سویڈن کے رہنے والے ہیں۔ دونوں کے لبوں پر دو رنگ پھیلی ہوئی مسکراہٹا ہر ایک کو خوش انداز کہتی چلی آ رہی تھی۔ معلوم ہوا دونوں شاگ ہو مے سے سیدھے چلے آ رہے ہیں اور لازماً سفر سے ہر طرح لیس ہیں۔ نمبندی کا سامان، صدا بندی کے آلے۔ کوہ پیمائی کے جسد ساز و سامان۔ اللہ اللہ ایہ ذوق سفر بھی کیا چیز ہے جو وقت اور فاصلے کی طنائیں کھینچ کر انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ یہ دیکھ کر عجب مستر ہوئی کہ آج کا مصروف انسان بھی اگر چاہے تو اپنی ہم جوئی کی سپرٹ زندہ رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ وقت بحال ہی لیتا ہے۔ اصل چیز ذوقِ نظارہ ہے یا فطرت کے چیلنج کو قبول کرنے کی لگن۔

صبح کا وقت اور ستمبر کا مہینہ تھا۔ دھوپ غیب کھلی ہوئی تھی۔ ہوائی سفر مختصر تھا، یہی کوئی گھنٹہ بھر میں ہم پڑی سے گلگت پہنچ جائیں گے۔ راہ میں وہ گلیبوش وادی پڑتی تھی جسے عالمی نقشہ سیاحت پر اب ایک ممتاز جگہ حاصل ہو چکی ہے، — وادی کا خان۔

ایبٹ آباد پر سے گزرے تو چوٹیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اُدھر بادلوں کا ہجوم سیل تاتار کی طرح اٹھا چلا آتا تھا۔ پائیلٹ ان کی زد سے بچنے کے لئے کبھی بلندیوں کو چھوٹے گھٹا بھی نیچے غوطہ لگا تا یہاں تک کہ ہم کوئی پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے۔ فضا اچلی اچلی، جہاں سیکڑا نہ کے معنی کچھ ابھی سمجھ میں آئے۔

اور پھر دیکھا کہ ہمارا طیارہ بیکلک بل کھاتا وادی سندھ کی تنگ راہوں پر سے گزر رہا ہے۔ بل صراط سے زیادہ باریک راہیں یوں لگتا تھا جیسے طیارہ تلوار کی دھار پر چسل رہا ہو۔ کبھی یوں لگتا کہ اس پہاڑ سے ٹکرایا کبھی اُس چوٹی سے بل بل

ان حصاروں کو عبور کرنا ایسا دشوار نہیں رہا۔ اس کے ایک طرف ٹھک بوس ہمالیہ کی چوٹیاں ہیں تو دوسری طرف قراقرم کا ترنگھو سلسلہ کوہ۔ ان پہاڑوں تک پہنچنے کے لئے اب پاکستان بچنے کے بعد سے بڑی سہولتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ہمارے موجودہ دارالحکومت، راولپنڈی، سے گلگت تک ایسی سڑک بن چکی ہے جس پر جیپ خرے سے چلتی ہے۔ راستہ میں وادی کا خان کی ایک دوسری انجری بہشت پڑتی ہے۔ باجو سر کا ۱۳۰۰۰ فٹ بلند درہ بھی یہیں ہے۔ مزید آسانی کے لئے گلگت اور ملتان کے صدر مقام سکر و سکے ساتھ فضا کی سرروس قائم ہو چکی ہے۔ راستہ یہی کوئی دو سو میل کا ہوگا۔ جب ہوائی جہاز سے آدمی سفر کرے تو ان بلند و بالا برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے گزرتے وقت دل ہولنے لگتا ہے۔ نیچے دیکھو تو دریائے سندھ کی وادی شروع ہے۔ غرض ہر نظر نظاروں کی کثرت ہے، ہر قدم پر سفر کی تھر تھری موجود ہے۔ چنانچہ جب میں نے کچھ دنوں موسم خزاں کے دوران اس سفر کا ارادہ کیا تو یہی مناسب سمجھا کہ پنڈی تک طیارہ سے پہنچنا چاہیے اور پھر وہاں سے گلگت۔ گلگت سے معززہ، ٹنکرہ اور دیگر شمالی علاقوں کی سیر بندرلیج جیپ کرنی چاہیے۔

میرے ہمسفر ایک نوجوان فلسفہ دان تھے۔ انہیں بھی اس فلسفی سرزمین کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا اور چونکہ میں پہلے ادھر کا سفر کر چکا تھا اس لئے میں نے وہاں کے حیرت افزا نقشے سنا سنا کر ان کی آتش شوق کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ یوں میری اور ان کی سرحدیں الگ الگ تھیں۔ میرا تعلق لوح و قلم کی پرورش سے ہے اور وہ سلولائیڈ کے فنکار ہیں، مگر دونوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ اس علاقہ میں جو جادو جو رعنائی و زیبائی ہے، اس کو ایک دستاویزی فلم میں سمودیا جائے، اور میں اس داستانِ سرزمین کی کہانی آپ کے سامنے اس طرح بیان کر سکوں کہ اس آنکھیں دیکھے حال کے کہنے اور سننے کا مزا آجائے اور میرے پڑھنے والے اس بات کا کچھ اندازہ کر سکیں کہ مشاطہ فطرت نے اس عروبہ ارضی کی زمینیں کن کن سدا بہار پھولوں سے سجائی ہیں۔

ہم کراچی سے بندرلیج طیارہ راولپنڈی کے ہوائی اڈہ پہنچے، پری۔ پی۔ آئی۔ اے کے کمرہ انتظار میں بیٹھے اس جہاز کا انتظار

ہوا کی تیز رفتاری کی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ٹانگیں پھیلا دیں۔ اگر ہمارے منہ سے کافر طیارہ نہ ہوا چھپائی میں ڈرا سی غلطی کی تو بس خدا ہی حافظ ہے! مگر کیا بھی کیا جائے، آسمان دور تھا اور زمین بھی دور۔ بہت دور۔ اور بہت سخت!

مگر سفر، خاص کر ہوائی سفر میں اس قسم کے خدشے تو مول لینے ہی پڑتے ہیں۔ میں ہم اندر عاشقی... بہر حال ایک عالم شکر وہ بے نیازی کا طاری تھا۔ الحمد للہ! یہ پُر خطر لمحے جلدی ہی گزر گئے۔

ملا تیلوں بھی خطرناک ہے۔ ۱۳۳ اونچی اونچی نہایت بلند چوٹیاں، چوبیس ہزار فٹ سے بھی اوپر۔ گویا آسمان کی قریبی طرف مشہور تنکا پر تہیں تو واقع ہے۔ ۶۶۰ فٹ اونچا پہاڑ اور وہ عالمی شہرت کا مالک، اے۔ ٹو۔ ۲۵۰ فٹ اونچا، جسے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کہا جاتا ہے۔ تنکا پر تہ پر دنیا کی بلند ترین پندرہ ہزار فٹ اونچی چوٹی، یہیں تو ہے بس یوں لگتا کہ ایک دیوار سنگ ہے جو فرش سے عرش تک پہنچ گئی ہے۔ انعطفت اللہ! مگر ان بلند یوں کی پستی بھی دیدنی تھی۔ پہاڑی ڈھلانیں، ہر طرف سبزہ، جہر نظر جاتی تھی فرش زمردیں بچھا دکھائی دیتا تھا۔ ایسی ہریا دل کہ آنکھیں تر و تاز سے ٹھنڈی ہو جاتیں۔ اور تصور دہم میں آجائے۔ تیز وندیاں۔ وہ ہکشان ارضی، الگ جلوہ فروش تھیں۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کے دامن میں گلیشیروں سے نکل کر بل کھاتی، اٹھاتی اور گنگناٹی نیچے اتری چلی آ رہی تھیں۔ طیارہ ایسے ہی ماحول سے گذر رہا تھا۔ نیچے واڈی مندھ کی شروعات تھی۔ بال سے باریک بچہ دھم۔ یہ ننھا سا طیارہ فطرت کے ان عظیم مظاہر کے بیچ میں ایک ذرہ بے مقدار سے زیادہ نہ تھا۔ مگر پائیڈ کی چابکدستی اور سہرندی کا قائل ہونا پڑا کہ وہ تمام مقامات خطر سے ہمیں صاف بچا کر لے گیا۔ مگر یہ لمحہ میری زندگی کے کبھی نہ بھولنے والے واقعات کی ایک کڑی ضرورت بن گیا۔

طیارہ تھج کے نزدیک پہنچا تو یوں لگا جیسے پہاڑوں نے ہمیں راہ دیدی ہو۔ اب سامنے ایک کشادہ وادی تھی.....

معلوم ہوا کہ ہم مگھت کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں طیارہ مگھت کی ہوائی جی کے اوپر چکر لگا رہا تھا۔ آہن واحد میں جہاز کے پہیوں نے اس طاسی سرزمین کے دامن کو بوسہ دیا کہ متواضعی چلا گیا تھا پہلی بار بوسہ دیا۔

سب سے پہلے سوڈی جی جی طیارہ سے باہر نکلا۔ اس جنت ارضی کی سرحد میں پہلی بار داخل ہونے پر کچھ مسترت، کچھ حیرت کے لمحے جلے جذبات چہروں پر لئے ہوئے۔

مگھت کا یہ ننھا سا ہوائی اڈہ بھی بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ جیسے ہی جہاز رکنا جانے سے کدھر سے بہت سے مگھتی مزدور ہماری طرف دوڑ پڑے۔ سامان اتارنے چڑھانے کا شور و غوغا بلند ہونے لگا۔ ان لوگوں کی بھرتی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ جلد سے جلد مال اتارنا اور چڑھانا چاہتے تھے۔ کیونکہ جہاز واپس پنڈی جا رہا تھا۔ جلد سے جلد واپس کی ہر ممکن تدبیر کی جا رہی تھی۔ جہاز بہت سال لے کر آیا تھا۔ چھڑکٹیاں مین جہاز کے پاس آن گئیں۔ یہ مال لے کر سیدھی شہر کا رخ کر بیگی۔ جہازی علم بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ یہ ساری عجلت یوں تھی کہ موسم کا کوئی اعتبار نہیں۔ تجربہ کار سے تجربہ کار ماہر موسمیات بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذرا سی دیر میں فضا کیسی ہو جائے گی۔ یہاں ذرا سی دیر میں موسم کا مزاج برہم ہو جائے گا۔ جبیں انفریجمنیں پڑنے سے پہلے پہلے جہاز کو خطرہ کی حد سے نکل جانا ضروری تھا کچھ دیر جب میں چند لوگوں کے لئے مگھت گیا تھا تو واپس میں کئی دن کے لئے لکنا پڑا کہ کیونکہ ہاڈوں بلکہ دل ہاڈوں، لے پوری واڈی کو گھیر رکھا تھا اور یہ سا علاقہ باقی دنیلے منقطع ہو چکا تھا۔

ہوائی اڈے پر ہمارا استقبال یہاں کے ایک افسر و حباس صاحب نے کیا۔ یہ صاحب شمالی اضلاع کے پولیسکال ایجنٹ کے نائندے تھے۔ انہوں نے ہمیں مگھت ریسٹ ہاؤس کے ایک انگارہ کمرہ میں ٹھہرایا۔ ستیاحوں اور ہانڈی کو جو سہولتیں اس دوست مقام پر پیش کی جاسکتی ہیں وہ سب بڑے اخلاق و محبت کے ساتھ ہمیں یہاں دینا کر دی گئی تھیں۔

مگھت کا چھوٹا سا شہر نے تعمیر شدہ ہوائی اڈے کو ٹی میل بھر دوڑ ہوگا۔ آجکل یہ جگہ مگھت ایکسپریس اور "شمالی اضلاع"

۱۹۷۳ء

میں

ایکٹ

دوب روام

ساتھ

سادری سترہ

معتک

تنگ سے

جی راتے

جائے گئے

ہے مگر

اہیں

تھے کہ

کا ایک

لئے

رک

ہنزہ و ڈیر

کٹ

(چند مناظر سے)

بھجے

راندیسی کہ ایک

تھے۔

ہیں

مد سے

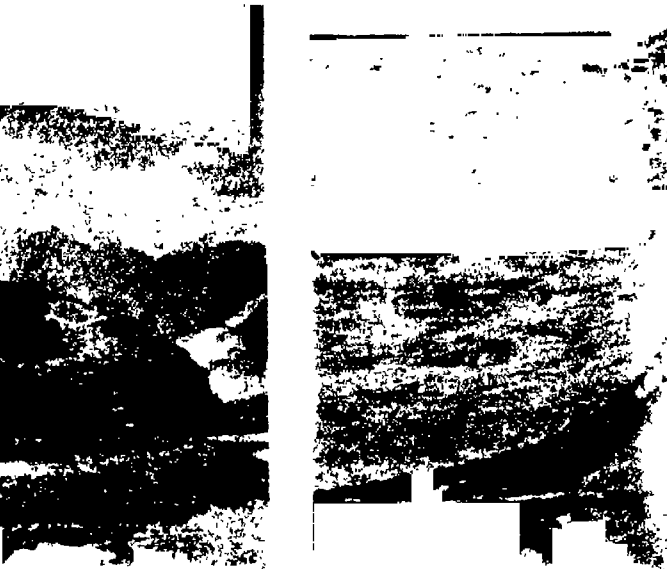
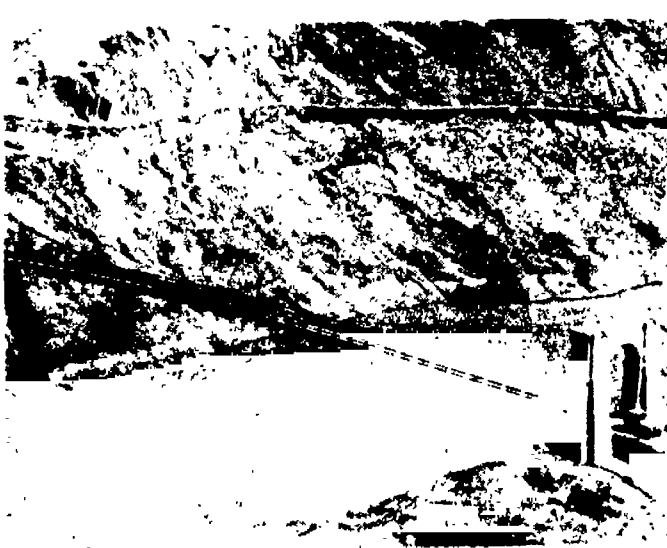
سرف

پراؤتھا

درتھا

خیر ہوا

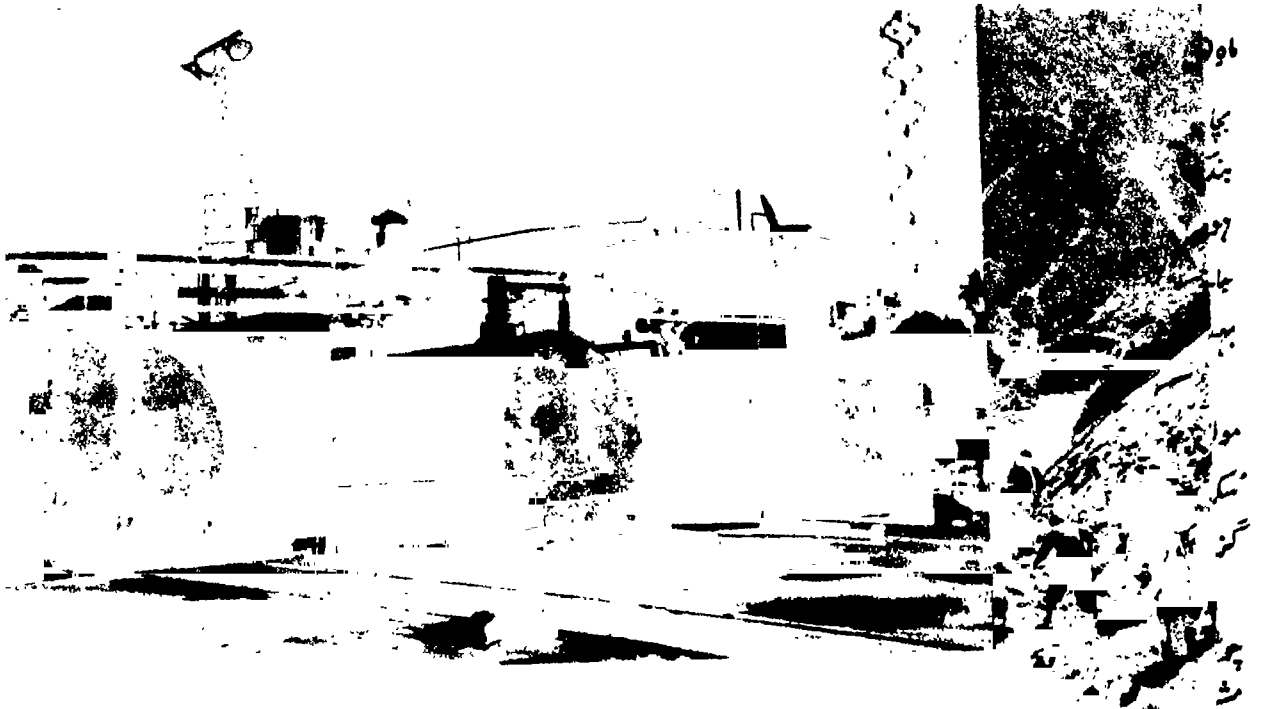
نومل



نہارہ کے ذریعے دریائے ہنزہ ڈالٹ عبور کرنے کا طریقہ

ہنزہ رود پر لٹکوان ہل

ہل کا ہل (سوزوہ دریا کے کنارے)



مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی کی رفتار دو تیز سے تیز تر کرنے کی مساعی پورا زور دیا جا رہا ہے تاکہ ہمارا یہ بازو بھی، جو دیگر وسائل سے مالا مال ہے، اپنی صلاحیتوں کو بحوبی بروئے لا سکے۔

مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے کاغذ، کھاد بنائے اور دریاؤں کی تسخیر کے منصوبوں کا میابی کے ساتھ عمل لیا جا چکا ہے۔



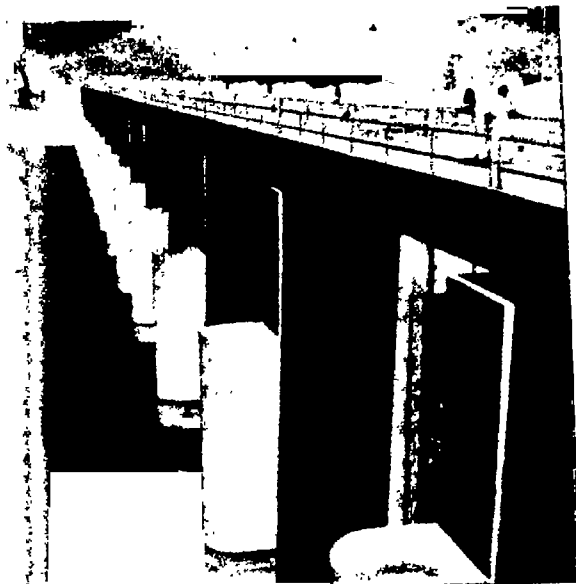
آئرن پمپ ہوجائی



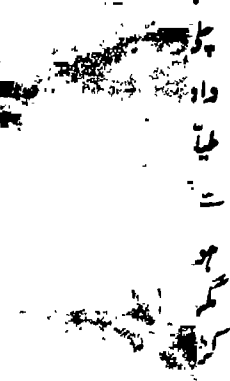
مشرقی پاکستان

رخانہ (ٹوننا) :

خود کھل ہو چکے ہیں
(ٹن)



تسخیر سے تعمیر : شہابی پر بند کی تعمیر



تسخیر سے تعمیر : شہابی پر بند کی تعمیر

جاڑے اور یہ عجوبہ روزگار پل تباہی سے بچ گیا۔ ان بھوں میں گھسے ہوئے پروں کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اور آجکل پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کے قبضے پر بطور یادگار رکھ دئے گئے ہیں۔

دریا کے مشرقی کنارے کو عبور کر کے ہم جانب جنوب روانہ ہوئے۔ سڑک پر بڑی خاک تھی جو ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ کوئی تین میل تک چلی گئی تھی۔ یہ سفر کرتے ہوئے ہم وادی منترہ میں داخل ہو گئے جو کافی چوڑی مگر بے برگ و گیاہ ہے۔ معدنی کوئی سیرگاہ بھی نظر نہ آتا۔ دونوں طرف تو دہریک کے رنگ سے ملتی جلتی پہاڑیاں، یا سرمئی پہاڑ تھے جن میں سے تنگ پہاڑ بچ رہے تھے۔ یہ راستے کیسی کیسی صنایع کے ساتھ بنائے گئے تھے، اس کا اندازہ صرف دیکھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہم لوگ ان پر خطر راہوں کے ایسے عادی ہو چکے تھے کہ انہیں دیکھ کر کسی قسم کا اعصابی تناؤ محسوس نہ ہوتا تھا۔

مگھت سے ہم کوئی بارہ میل ادھر آئے ہوئے تھے کہ ایک نئی آفت کا سامنا کرنا پڑا۔ راستہ میں کسی پہاڑی کا ایک تودہ گر کر سڑک کو مسدود کر چکا تھا۔ مزدور سیلے لئے صاف کرنے میں مشغول تھے مگر انہوں نے بتایا کہ سڑک کھلنے میں کوئی چار گھنٹے لگ جائیں گے!

پہلے سوچا اب کون اتنا انتظار کرے اور مگھت واپس چلیں، مگر پھر خیال آیا کہ وادی شوق میں قدم رکھنے کے بعد آگے ہی بڑھنا چاہیے۔ اسی اثنا میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اور جیب چلی آرہی ہے۔ لیجئے وہی اپنے پرانے دوست تھے۔ سوئڈن کے رہرو۔ ان کے ساتھ ایک مقامی افسر بھی بطور گائیڈ آئے تھے۔

ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی اپنی جیبیں تو یہیں چھوڑیں اور خود آگے بڑھیں۔ چند مزدوروں کی مدد سے اس تودہ سنگ کے اس طرف پہنچیں اور ٹوٹل کی طرف پیدل چل پڑیں، جو ہماری اگلی منزل تھی۔ یہ ہالا پہلا ٹپاؤ تھا۔ یہاں ریلوے اسٹیشن ہاؤس بنا ہوا ہے اور کوئی پانچ میل دور تھا۔ وہاں ہم کھلنے کے وقت پر پہنچ سکتے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ پہلے دی گئی کہ جیسے ہی راستہ کھلے وہ سامان اور جیبیں لیکر فوٹل

کا انتظامی مرکز ہے یعنی صدر مقام اس کی آبادی پندرہ ہزار ہے اور ایک تنگ وادی میں واقع ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ۴۵۰۰ فٹ بلند۔ چاروں طرف سرسبز رنگ و نباتات بلند پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور دریائے مگھت پر سے علاقے کو محیط۔ غرض یہ مقام اپنی قدرتی خوبصورتی اور نفیس و ہر سکون ماحول کے اعتبار سے بڑا ہی راحت فرا اور قابل دید مقام سیاحت ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا بازار بھی ہے جو اب ایئر پورٹ تک پھیلتا جا رہا ہے۔ اس بازار میں شمالی اضلاع کے ہر مقام کے لوگ چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔

تاریخی عہد سے لیکر اب تک مگھت اطراف و اکناف کا تجارتی مرکز رہا ہے۔ کسی زمانہ میں وسط ایشیا کے کارواں یہیں آکر دم لیتے تھے۔ سنکیا گ سے اس علاقہ تک جو اب پاکستان کہلاتا ہے جو رشتہ موافق قائم تھا، مگھت اس کا مرکزی نقطہ تھا۔ کارواری لوگ ادھر سے ادھر کرتے جاتے رہتے تھے۔ چین اور وسط ایشیا کا مال تجارت، اوداڑا اور سو خاتیں یہیں پہنچتی تھیں۔ پھر یہاں سے بہت سا مال و اسباب لکر سرحد چلا جاتا تھا۔ پہاڑی سفر کی خطرناک ہمیں، پریچ ڈراؤنے راستے جیسے پہلے تھے اب بھی ہیں مگر حوصلہ مند جاہلوں اور رہ نوردان شوق ان سب مشکلوں کو حل کر لیا کرتے تھے۔ آج کل مگھت کے کارواری تعلقات اپنے ہی ملک کے دوسرے حصوں سے قائم ہیں۔ یعنی مگھت سے ہندوستان کے درمیان ہر وقت کارواری سلسلے چلتے رہتے ہیں۔ سڑک کے راستے سے بھی اور ہوائی جہاز سے بھی۔

ہاں، تو میں ذکر کر رہا تھا کہ ہم لوگ بحیرہ مگھت پہنچ گئے، اور دوسرے روز صبح جیب میں سوار ہو کر مگھت سے آگے چل پڑے۔ ہماری منزل مقصود نگر اور منترہ تھی۔ مگھت تو سمجھنے ایک ابتدائی مستقر تھا، یعنی، وہاں آگے چلیں گے دم لے کر؟

عظیم دریائے مگھت پر برف کی چادر جم چکی تھی۔ اسے عبور کرنے کے لئے ہمیں اس جھولے ناہل پر سے گذرنا پڑا جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ایشیا میں سب سے لمبا پل ہے۔ یہیں یہ بھی بتایا گیا کہ ۱۹۴۸ء میں جب ہندوستانی فوج کے طیاروں نے مگھت پر حملہ کیا تھا تو اس کو بھی تباہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر خوش قسمتی سے کوئی بھی بم اس پر نہ گرا، یعنی ہم ادھر ادھر دیا میں

پہنچ جائیں۔ مسٹر اور مسز آلسینز نے بھی تدبیر اختیار کی۔

پیدل کا راستہ کوئی گھنٹہ بھر میں طے ہو گیا۔ راہ میں ہمیں کئی پہاڑیوں کے اوپر تک پہنچنا پڑا اور جب نیچے اترے تو ہری بھری وادی ٹول میں داخل ہو چکے تھے۔ دو پہر کے کھانے کا وقت بھی آن پہنچا تھا۔ ریٹ ہاؤس بڑی پر فضا جگہ بنا ہوا ہے۔ چاروں طرف پھلوں کے باغات ہیں۔ کھانا بڑا نفیس تھا اور کوئی تین گھنٹے تک ہم لوگ خوب سستائے۔ چار بجے کے قریب ہمارے ڈرائیور اپنی اپنی جیبیں لیکر آگئے تھے۔ اب ہماری اگلی منزل صفحہ تھی جس کے لئے ہم تیار تھے۔ سوئیڈی جوڑا بھی روانگی کے لئے تیار تھا۔ اس کے ساتھ ایک مقامی صحافی میڈا دربارہ بھی بھی تھا۔

ٹول سے آگے بڑھے تو عجیب عالم تھا۔ جس طرف نگاہ جاتی تھی پہاڑوں کا ہیڈناک سلسلہ، تنے ہوئے سنتریوں کی طرح سینہ تالے راستہ روکے ہمارے آگے کھڑا تھا۔

گواچ کے مقام تک ہماری جیب ابھی پہنچی ہی تھی کہ ایک دم کسی پہاڑ کے نیچے اترتی شروع ہو گئی اور اچانک ایک گہری ندی میں داخل! الامان! اخیر! اس تجربہ سے ابھی حواس قائم ہوئے ہی تھے کہ ایک اور پہاڑ ہول مقام آگیا۔ یہاں گاڑی ہو یا کوئی حیوان بہتے پانی سے گندے بغیر دوسرے آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ ایک گہری کھدی ہوئی آبی راہ کے گرد چکر کاٹتے ہوئے ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ سر چکر دینے والی چڑھاٹیاں تو ابھی آگے آنے والی تھیں اور ہم ذہنی طور پر ان کے لئے تیار تھے۔ گاڑی انتہائی سستی کے ساتھ چل رہی تھی۔ ہر موڑنا خطرناک تھا کہ زندگی کا موڑ معلوم ہوتا تھا۔ ہر خم پر جیب جوں کی چال چلتی تھی اور یہ تو بہت ہو کہ اس کے چاروں پہیے سنگریزوں میں پڑے پوری رفتار سے گھم گھر کر رہے ہیں مگر گاڑی یکدم ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی! لیجئے آگے ایک "لا" کی شکل کی گولائی آگئی۔ اب اس پر چکر کاٹیں تو آگے بڑھیں! غرض سفر کا یہی عالم رہا۔ سوچا ایسے خطرناک راستوں کو عکس کی قید میں لایا جائے مگر ہم نے سوچا اگر عکاسی کے

چکر میں پڑے اور ڈرائیور کو ذرا بھی گڑبڑ یا تو پوری پارٹی کی جانیں خطرہ کے منہ میں پہنچ جائیں گی! لیجئے ایک ایسا سخت مقام بھی آ ہی گیا۔

آلسینز کی جیب ایک تیکے سے خم پر پہنچی ہی تھی کہ ایک دم اٹلی چڑھنے لگی! معلوم ہوا کہ ڈرائیور صاحب نے الٹا گیز لگا دیا حالانکہ اس سیدھی تنی چڑھاٹی پر ایکسیلیٹر دباننا چاہیے تھا! اودنیہ قطعی معجزہ ہوا کہ جیب اترائی کے پاس پہنچتے ہی زبردست جھٹکے کے ساتھ خود ہی رگ لگی، ورنہ حشر معلوم تھا!

اس خوفناک واقعہ نے ہمارے بھی اوسان خطا کر دیے تھے۔ کم از کم ہندو منٹ تک ہم اپنے اعصاب پر قابو نہ پاسکے۔ خیر یہ لمحات بھی گزر گئے اور ہم نے پھر سفر شروع کر دیا۔ جب آلسینز کی جیب اٹلی چڑھنے لگی تھی تو مسز آلسینز اپنی سیٹ سے اچھل پڑی تھیں اور دوبارہ اس پر بیٹھنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھیں۔ ہم سب دیکھ رہے تھے کہ خوف کے مارے ان کا چہرہ زرد تھا، بری طرح بدحواس تھیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ ایک حسن تدبیر سے کیا گیا۔

طے ہوا کہ ہم ان کی جیب پر پیچھے پیچھے چلیں۔ اگر اتفاق ایسا ہی کوئی حادثہ رونما ہو جائے تو ہم فوراً مدد کو دوڑیں، ویسے حوصلہ مارنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس طرح کی باتیں کر کے ہم نے آلسینز کو پھر روانہ کر دیا۔ انتان دینیاں ہم بھی چھاٹ تک پہنچ گئے۔ یہ جگہ ٹول سے ۱۵ میل سے زیادہ نہ تھی، مگر پہنچتے پہنچتے کوئی تین گھنٹے لگ گئے! شکر ہے ہمارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔

ہم لوگ رات بھر یہاں کے ریٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ جہاں ہمیں دو نہایت آرام دہ کمرے مل گئے تھے۔ کچھلے تجربات کی یادیں کچھ ایسی وٹھوس کن بھی نہ تھیں مگر یہاں اگر ایسا معلوم ہوا کہ آغوش راحت نے ہمیں اپنے بیچ میں لے لیا ہے اور ساری کوفت اب دودھ ہو جائے گی۔ چاروں طرف اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کے سنتری چپ چاپ ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور ان کے سلسلے یہ بھی سی خوبصورت بستی تھی، اس کا یہ ہمارا خانہ تھا جس کے سبزہ ناز پر ہم لوگ بیٹھے تھے، تاروں بھرا آسمان اوتار

شاو اب ہے بلکہ اطراف و جوانب کے علاقوں کی خشک اور مٹی لریٹ اڑاتے سرخی رنگ پہاڑوں کے مقابلے پر تو یہاں کے پہاڑ بڑے ہی شاو اب تھے، ہر طرف خضرا ہی خضرا پھیلا ہوا تھا۔ تحریثِ نعت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مناچن میں دوپہر کے کھانے پر ہمیں وہ وہ انواع و اقسام کے کھانے کا اتفاق ہوا کہ طبیعت سیر ہو گئی۔ روٹ چکن، آلو، تازہ پھل، اور آخریں، بڑی نفیس گرم گرم چائے۔ یہ سب ضیافت یوں اور بھی مفید ثابت ہوئی کہ ہمیں ابھی ۱۹ میل کا سفر ادا کرنا تھا۔ نگر کے صدر مقام تک۔

یہاں جس راستے سے واسطہ پڑا اس کی بابت مشہور ہے کہ بڑا ہی پرخطر ہے۔ پر خطر ان معنوں میں کہ دونوں جانب نرم مٹی کے بنے ہوئے اونچے اونچے ٹوڈے ہیں اور وہ پھسل پھسل کر نیچے گرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے وادی میں اکثر راستے مسدود ہو جاتے ہیں جنہیں بڑی مشکل سے صاف کیا جاتا ہے۔ یہاں بڑی تند ہوائیں چلتی ہیں یا بارش ہو جاتی ہے، نتیجہ یہ کہ مسافر جہاں کے تہاں رسے رہتے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ راستے صاف ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا۔

ہر میل کے بعد نئے نئے گاؤں پڑتے تھے۔ چاروں طرف ہلکول یا کہیں کہیں آبپاشی کی نمود دکھائی دی۔ غرض جو کچھ نظر آیا نظروں کی آسودگی کا سامان تھا جس نے سفر کی صعوبتوں کو کم کرنے میں بڑی مدد دی تقریباً پانچ بجے شام ہم نگر کے قریب پہنچ گئے۔

نگر کے آس پاس کا علاقہ حقیقت میں بہت ہی سرسبز ہے۔ ایک بہار بدایاں وادی۔ نرم روئیلوں کا جال، پھلدار درختوں کی کثرت سے پورا علاقہ مالا مال۔ شکر ایک تنگ میدان میں سے مٹکتی ہوئی آگے چلی جاتی ہے۔ اس میدان کو میر صاحب حقہ پور ٹوٹل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ شکر ریٹ ہاؤس ملک پہنچتی ہے اور میر صاحب کا محل بالکل لمٹتی ہے۔

میر صاحب کے مستعد و تمیز دار ملازمین نے ریٹ ہاؤس میں ہمیں خوش آمدید کہا اور بڑے آرام سے ٹھہرا کر یہ لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے خوالوں میں طرح طرح کے فواکھات اور لوازمات خورد و نوش لئے چلے

تھا۔ فضا میں سکون تھا اور یہ سب اعصاب کو راحت پہنچا رہے تھے۔

صبح اٹھے تو تازہ دم تھے صحت افزا مقام کی تازگی بخش ہوا ہمارے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ ذہنی کوفت، جسمانی محکمان اور اعصابی کھچاؤ کی تمام کیفیتیں اب دور ہو چکی تھیں اور راج کے سنسنی خیز سفر کے لئے ہم بالکل تیار تھے۔

پھلت سے، جو نگر اسٹیٹ کا ایک گاؤں ہی ہے، ہم نے میر صاحبہ والی حقہ کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع بھیجی کہ ہم لوگ کب کہاں پہنچ رہے ہیں۔ ہمارا لادو یہ تھا کہ میر صاحب نگر کے صدر مقام پر پہلے پہنچیں اور وہاں سے ہو کر پھر بارہ میل دسپا اگر حقہ کی طرف رخ کریں۔ میر صاحب کے علاقے تک پہنچنے کیلئے ہمیں ایک دریا عبور کرنا تھا جس کے لئے چرخی نا ایک کل لگی ہوئی تھی۔ یہ کل ایک کھٹولے کو تاروں کے رستے پر چلاتی تھی۔

پھلت سے ہم مناچن کی طرف روانہ ہوئے۔ بڑی لمبی لہکاری چڑھاؤ تھی جو تقریباً اٹھارہ میل تک چلی گئی تھی۔ جہر دیکھو بھوتوں جیسے پہاڑ منہ اٹھائے کھڑے تھے یا دیو داؤں کے دامن تھے۔ بہت سی جگہیں تو ایسی آئیں کہ انجن نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور اس ڈر سے کہ کہیں گاڑی پھر الٹی نہ چل پڑے، فوراً بریک لگائے پڑتے تھے بعض دفعہ پھرتی سے اتر کر بڑے بڑے پتھر پھیلے پیوں کے نیچے روک کے لئے لگائے پڑتے۔ پھر یہ تو بہت ہوا کہ جیب نے چڑھاؤ کے آگے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور ہمیں دھکا لگا لگا کر تنگی چڑھاؤ پر اسے پہنچا نا پڑا۔ وہی مثل ہوئی کبھی ناؤ پانی میں، کبھی پانی ناؤ میں!

اکثر جگہ ہم اتر کر پیدل نہ چلتے، تو کیا کرتے۔ اٹھنے سے تو یہی بہتر تھا کہ اپنے کس بل کے جوہر دکھانے کے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جاتا۔

اسی قصہ میں دوپہر ہو گئی اور ہم لنگ کے وقت مناچن پہنچ گئے۔ یہاں کا ریٹ ہاؤس بھی خوب ہے۔ بڑی پر فضا جگہ بنا ہوا ہے۔ چاروں طرف ہریا دل ہی ہریا دل اور پھلوں نے نفیس باغیچے۔ یوں مناچن کا سارا علاقہ نہایت سرسبز اور بڑا

آرہے ہیں۔ یہ سب مختلف شاید اس وجہ سے بھی تھا کہ ہم لوگ خود میر صاحب حنزہ کے ہمارے ہمارے گرامی کے مزاج ناساز تھے اور وہ ہمارے ساتھ چائے میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، مگر اطلاع یہ تھی کہ صبح ناشتہ پران کے محل میں ضرور ملاقات ہو سکے گی۔

شب کو کھانے کا اہتمام اور بھی پر تکلف تھا جسے لگانے اور کھلانے کے لئے کوئی نصف درجن ملازمین تعینات تھے۔ کھانے کے شانہ التزام کے ساتھ ساتھ قیام شب کا بندوبست بھی ایسا ہی پر تکلف تھا۔

پوری دادی نگر کو پانی رکا پوشی نامی پہاڑ کے کلیشیرے فراہم ہوتا ہے۔ سارے جاڑے سورج کی شکل نظر نہیں آتی۔ اس کے مقابلہ پر دادی حنزہ میں سارے سال سورج خوب چمکتا ہے، جس نے اسے بڑا سرسبز اور ہر اہم بنا دیا ہے۔

نگر کی بستی بلقیت کے عین مقابل واقع ہے۔ جو دریا کے اس پار حنزہ کا صدر مقام ہے۔ ان دونوں نواح کو ملائے کے لئے تاروں کا بنا ہوا کوئی بارہ میل لمبا پل ہے جو دریا کے حنزہ کی ۵ فٹ چوڑائی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پر سے گزرتے وقت اچھے اچھے منجھے ہوئے سیاہوں کے بدن میں بھی سنسی سی دوڑنے لگتی ہے!

صبح کو جب ہم لوگ اس مقام پر پہنچے تو پھر آئینہ چھپے چھپے انہی جیب میں آتے دکھائی دیئے۔ یہاں ایک اور تماشا دکھایا دیا جو روک کرنے کے لئے دو گہواروں کو کام میں لایا جاتا ہے۔ ایک تو اتنا ٹہلے کہ اس میں بس ایک جیب سما سکتی ہے، مگر دوسرا ایک چھوٹی سی چوٹی پر سے زیادہ بڑا تھا۔ بس کوئی دو آدمی کھڑے رہ سکتے تھے۔ یہ دونوں گہوارے تاروں کے رستے کے ساتھ ٹک رہے تھے جو اس کنارے سے اُس کنارہ تک تنا ہوا تھا۔ گہواروں کو چلانے کے لئے وہی چرخ سی تھی جو ایک چٹان پر نصب کر دی گئی تھی۔ چھوٹا گہوارہ سن کے رستوں سے ٹک رہا تھا اور دونوں کناروں پر سے ہاتھ کے ذریعے چلتا تھا۔ مگر اس وقت خروند موجود نہ تھے اس لئے جیبوں کو دریا پار کرنا بجائے خود ایک مسئلہ بن گیا۔

دونوں پارٹیوں نے مل کر یہ طے کیا کہ امداد بھی کے حصول سے کام کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ سوچا گیا کہ سب مل کر ایک جیب کو مع ڈرائیوڈ بڑے گہوارے میں داخل کر دیں اور دھڑکنے سے چرخ کی چلا یا جائے۔ اس عمل میں ہمارے بھی چولیس ہل گئیں اور جڑ ثقیل کے اس کارنامے کو مکمل کرنے میں تین گھنٹے لگ گئے۔ مگر شکریہ کہ کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور ہم لوگ مع اسباب حنزہ کی طرف پہنچ گئے۔ واپسی میں یہ جانکاہ محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ مقامی مزدوروں کا انتظام ہو چکا تھا۔ انہوں نے ایک جیب اسی طرح کھینچ کھینچ کر دریا پار کرادی مگر دوسری جیب پار کرنے کے موقع پر عجیب ماجرا ہوا۔

چاروں طرف نہایت بلند و بالا پہاڑوں کا عجیب سلسلہ ہے۔ جب دوسری جیب پار کرانی جا رہی تھی ان بلند پہاڑوں میں زور کے جھکڑ چلنے لگے۔ جو نہی گہوارہ کنارے کے بالکل قریب پہنچا سن کے وہ رستے جو گہوارہ کے نچلے حصے میں گئے ہوئے تھے چٹان سے ٹوٹ گئے! ادھر ڈرائیوڈ، جیب کو باہر نکالنے کے لئے انہیں اشارت کر چکا تھا۔ جیب بجائے زمین پر آنے کے پھر اپنے گہوارے کے ساتھ تار کے رستے پر زور سے واپس ہونے لگی! کیا قیامت تھی!

ہم سب لوگ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لب دریا پہنچے اور گہوارے کو پکڑا جو بڑا جان جو کھوں کا کام تھا۔ یہ محض ایک معجزہ تھا کہ گہوارہ رک گیا ورنہ جیب اور ڈرائیوڈ کی خبر نہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شمالی اضلاع کی مقامی پلیٹن کے کچھ جوان جو گشت واپس جا رہے تھے عین موقع پر آگئے ان دوستوں نے بڑے بڑے ہتھکڑاٹھا کر گہوارہ کے نچلے حصے میں رکھ کر اسے قابو میں کیا۔ وہ جگہ جہاں سے ہم نے تار کے رستوں کے ذریعے دریا عبور کیا تھا ہندی کہلاتی ہے۔ یہاں سے بلقیت کے مقام پر پہنچنے کے لئے ہمیں اس قدیم راستہ پر بھی چلنے کا اتفاق ہوا جو ۱۴ میل لمبا ہے اور جس پر سے کبھی مشہور بودھی سیاح مارکو پولو گزرتا تھا۔ یہ بڑی تنگ راہ ہے، بس جیب کے چار پہیے بھٹکی جم سکتے ہیں بلاستہ کبھی سیدھی چڑھاٹی، کبھی اتراٹی، کبھی ندی ماکن اور تھروں کی سلوں پر سے گزرتا۔ ہولے ہولے چلتے رہے کہ ناگاہ ایک بڑا

محترم ہمالا انتظار چائے کی میز پر کمرے ہیں۔ خدام نے بتایا کہ ہم لوگ کپڑے بدلنے کے تکلف میں نہ پڑیں۔ میر صاحب خود بہت بے تکلف انسان ہیں اور تکلف و رسوم ملاقات کی اتنی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم سفری لباسوں ہی میں جو گروہ آئے ہوئے تھے، روانہ ہو گئے اور محل کی سیڑھیاں چڑھ کر شاہی میز پر پہنچ گئے۔

یہ جگہ محل کا ایک سجا ہوا پائیں کمرہ تھا جہاں سے وادی حنزہ کا دور دور تک نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ جس مرہوجہ نے دلی گر محوشی کے ساتھ ہمارے ساتھ مصافحہ کیا اور ہمیں خوش آمدید کہا وہ خود میر صاحب حنزہ ہی تھے۔ جمیل، شکیل، وقار و نمکنت کی تصویر، نیوں پر قسم۔ ہر ادا سے اخلاق و شائستگی شکستہ ہوئی۔

چند ہی منٹ بعد حضور آتی صاحبہ بھی تشریف لے آئیں۔ ہمراہ ایک چھوٹی سی بچی تھی، ان کی دختر نیک اختر دولوں نے بڑا نفیس خالص پاکستانی لباس پہن رکھا تھا۔ لمبی سی رنگین پھولدار نفیس قمیص، بڑے گھیر کی سلی خنوار اور اوپر سے ایک باریک لٹھی چادر اوڑھی ہوئی تھی ان دولوں کا ہم سے تعارف کرایا گیا۔

تپاک اور گر محوشی کی فضا میں چائے نوشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم لوگ اپنے مسافرت کے لباس کو دیکھتے تو بری طرح کٹھنہ عجب چلیے بنے ہوئے تھے۔ مگر ایک والٹی ریاست اور ان کی عالیہ رانی صاحبہ نے ہم ہمالوں کا جس طرح استقبال کیا وہ رسوم و قیود سے بلند تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب بڑے چھوٹے کا خیال کئے بغیر ہر ایک کو اس خندہ پیشانی سے اور اپنی روایتی جہان نوازی کے ساتھ ہشرف ملاقات بخشنے ہیں۔

یہ مقام دنیا کے آس سرے پر واقع ہے۔ چاروں طرف بلند ترین پہاڑوں نے اسے باقی متمدن دنیا سے الگ تھلگ کر رکھا ہے مگر ان قدر قوی مشکلات کے باوجود میر صاحب کے محل شاہی میں ہم ہمالوں کے لئے وہ سب آسائشیں مہیا کر دی گئی تھیں جن کی شاید اس دور افتادہ

پہاڑی ورہ آگیا۔ پھر غمک کر اس جگہ ان پہنچے جہے مرقع آبا دیکھتے ہیں۔ ایک خوبصورت گاؤں۔ اس کے آگے میں بھرے کم ہریا دلی کا ٹکڑا آبا۔ یہاں ایک اور گاؤں ملحق آبا و پڑیسو۔ آگے وادی چوٹی ہوتی چلی گئی ہے۔ جا بجا پہاڑی ڈھلانوں پر بنے ہوئے کھیتوں کے تختے چلے گئے ہیں جو بلند ہوتے ہوئے قلعہ کوہ کو چھوتے معلوم ہوتے ہیں یہیں قلی آباد ہے جو بہت خوش منظر جگہ ہے۔ خوبصورت صاف ستھرے بچے، شائستہ لباس میں طبوس یہاں کی عورتیں، سروں پر لال فال کرٹھی ہوئی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے۔ جو تھا ہرے بھرے کھیتوں میں کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا تھا۔ کھیت تھے کہ یہاں سے دیاں یکساں بھرے پڑے تھے۔ آگے بڑے تو حیدر آباد آگیا۔ یہ سستی بھی بڑی سرسبز نظر آئی۔ نہر طرف بلند افشار کھڑے جمجوم رہے تھے۔ کھیت کھلیان کی بہار الگ تھی۔ گاؤں کوئی دو میل کے احاطے میں تھا اور دوسو کے قریب مکاچا ہوں گے۔ یہ جگہ بلقیت جانے والی سڑک پر واقع ہے۔

پھلوں کے باغات اور ہرے بھرے کھیتوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے ہم کوئی دو میل آگے گئے ہوں گے کہ بلقیت کی بستی آگئی۔ یہ ریاست حنزہ کا صدر مقام ہے۔ سڑک پر یہاں کے باشندے بھی نظر آئے جن کی مڑے کنارے والی مڑے کی ٹوپیاں الگ پہچانی جا سکتی تھیں۔ بدن پر لمبے لمبے چنے ہر ایک نے پیٹھ پر کوئی بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ تازہ کٹی ہوئی فصل معلوم ہوتی تھی۔ میر صاحب حنزہ کی سرکاری رہائش گاہ دلا آگے کہ قیام آباد ہے۔ جو سڑک یہاں تک پہنچتی ہے اس پر بالوہی بالوہی اور دنگ سے دھنسن جاتی ہے۔ دونوں طرف بلند قامت اشجار سنترلیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ بائیں جانب ایک نہر چلی گئی ہے جس میں پہاڑوں کی پھلی ہوئی برف کا پانی دوڑتا رہتا ہے کوئی چار بجے سہ پہر کو ہم شاہی محل کے دروازے پر پہنچ گئے جہاں میر صاحب کے خدام نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا اور کہا کہ ہم اپنی میپیں سیدھی جہان غلے تک لے جائیں جہاں ہمارے قیام کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔

یہاں ہمیں اپنے اپنے کمروں پر سرسری سی نظر ڈالنے میں ابھی ایک دو منٹ ہی گزرے تھے کہ پرچہ لگا، میر صاحب

کے ہمراہیوں سے ملتی ہے۔ ان کی اپنی ہی ایک زبان ہے جس کو "شکی" کہتے ہیں۔ اس کی اصل کا بھی سراغ نہیں لگایا جاسکا۔ مردوں کا بہت ستموڑے پاکیزہ پھولدار لباس استعمال کرتے ہیں۔ ہنزہ کا موجودہ شاہی خاندان کوئی چھ سو سال پہلا ہے اور اس خاندان سے قریب قریب سب ہی اسماعیلی دآغا خانی ہیں۔

اونچے اونچے پہاڑوں کے بچ میں جو پتلے پتلے زمینیں قطعے پائے جاتے ہیں بڑی محنت سے تیار کئے جاتے ہیں اور انہیں دلچسپ دار کھیتوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے، آب رسانی کے لئے عجیب عجیب کمالات دکھائے گئے ہیں۔ برف پوش پہاڑوں سے اترنے والے پانی کو بڑی کائیگری کے ساتھ کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ آب دھوا بڑی عمدہ ہے۔ پھلوں کی انواع اور بہتات کا نوکچہ نہ پوچھو۔ پیداوار میں گندم، مکئی اور جو بہت ہوتا ہے۔ کچھ چاول بھی بڑا جاتا ہے۔

باشندوں کی اپنی مخصوص روایات ہیں۔ ان کے ہتھوڑے الگ ہیں۔ جون کے آخری مہینے میں یہاں ایک میلہ ہوتا ہے جو فصل کا جشن سمجھا جاتا ہے۔ اس موقع پر میر صاحب ہر گاؤں کے نمائندے اور چودھریوں کو شرفِ ملاقات بخشتے ہیں۔ ہر ایک اپنی فصل کا نمونہ شعی میں لے کر آتا اور میر صاحب کی برکت حاصل کرتا ہے۔ اس کے قص و سرود کی محفل جمنی ہے۔ ہر طرف خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ مگر کے علاقہ میں سب سے بڑا ہتھوڑا عید الفصحی مانا جاتا ہے۔ گاؤں کا چودھری اچھے اچھے لباس پہن کر میر صاحب کے پاس عید کے سلام کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور وہ بھی ان سے مل کر عید کی مبارکباد دیتے ہیں۔ ساری رعیت خوش ہے۔ ان تقریروں میں مرد و عورت بچے، جوان بوڑھے سب ہی شوق سے شریک ہوتے غرض اسلامی مسافات کا نمونہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔

ہر سال دسمبر کے اواخر میں شادیوں کا رواج ہے۔ یہ وقت فصلوں کے پکنے کا ہوتا ہے اور اگلی فصل کے دالے بونڈیے جاتے ہیں۔ بچن بھی بڑا خاندان ہوتا ہے۔ چودھری بھی دیکھو دیکھو! لئے دھن کے گھر جانا نظر آتا ہے۔ آگے آگے ہمارے دالے ہوتے ہیں ہر طرف خوشی کا دودھ دودھ ہوتا ہے۔ ضیافت کے لئے "پاک" کی قربانی کی جاتی ہے کیونکہ اس موسم میں بھیڑ مکرے ملنے مشکل

جگہ پر توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ اب مثلاً چائے ہی پر ایسی عمدہ پیشکش ایسے خوش ذائقہ کیک۔ سینڈویچ اور شکلیں چنے چنے کئے کسی اعلیٰ درجہ کے رستورینٹ ہی میں ملنے ممکن ہیں۔ میزبانی کا یہ اہتمام بلینچ، اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، ایسے دور دست مقام پر ہمارے لئے ایک حیرت انگیز بات تھی۔

جب تک ہم بیت میں رہے تھے اور ڈنر شاہی محل میں ہی کھاتے رہے۔ ہر موقع پر میر صاحب اور علیہ رانی صاحبہ نفسِ نفیس موجود ہوتے کھاؤں میں خالص پاکستانی کھانے بھی ہوتے اور انواع و اقسام کے آئینہ کاری کھانے بھی۔ یہ سب اس قدر نفیس اور خوش ذائقہ ہوتے کہ دنیا کے جدید شہروں ہی میں میسر آسکتے ہیں۔ بعض دفعہ ہماروں کی خاطر وسط ایشیائی اور چینی کھاؤں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ یہ سب کھانے شاہی محل میں ان کے اپنے باورچی اور بکالوں تیار کرتے ہیں۔ آئینہ کاریاں ہمارا ڈیڑے کے بہت ہی گہرے دیدہ ہو گئے اور کچھ گھمبے ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم سو بڈن میں بیٹھے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ہمارا ڈیڑے اور اسلامی ہمارا ڈیڑے کا انہیں یہ پہلا تجربہ ہوا تھا۔ ان غیر ملکی مسیحوں کو میر صاحب کے کھانے بھی بچے بڑے پیار سے لگے اور بہت جلد ان سے مانوس ہو گئے۔ پھر ایک شام کو عجیب حیرت کی بات ہوئی۔

کیا دیکھتے ہیں کہ ڈنر کی میز پر مسٹر لسنر ہنزہ خواتین کے لباس میں بھی چوٹی ملی آئی ہیں۔ ہنزہ خواتین کا ریشمی ملبوس اور اس ہنزہ کی رانی ٹوپی، اوپر سے ریشمی چادر لگتی ہوئی!

ہم لوگ میر صاحب اور علیہ رانی صاحبہ کے تین دن پہلے رہے اور اس جنتِ ارضی تک پہنچنے میں ہمیں جو جو خطرے اور خوشیاں پیش آئی تھیں انہیں اس اثنا میں ذہن سے محو کر چکے تھے۔ اتفاقاً شاہا اور میزبان کے ان لوازمات نے ہمیں ہر چیز بھلا دی۔

اس میں شک نہیں کہ وادی ہنزہ اپنے فطری جمال و عنایت کے باعث ایک بے مثل جگہ ہے۔ اسے اگر لوگ جنتِ ارضی کہتے ہیں تو بجا نہیں۔ چاروں طرف اونچے اونچے قلعہ ہائے کوہ نے اسے گھیر رکھا ہے۔ یہ پہاڑاں سلاک سے بائیں کرتے ہیں۔ یہاں جو لوگ بے ہوش ہیں وہ پاکستان کے باقی ماندہ علاقوں کے مقابلے پر دوسری نسل سے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا تو یہ ہے کہ ہماری اصل سکندراعظم

ہوتے ہیں۔

ضیافت کے بعد چوگان کا مقابلہ ہوتا ہے۔ پولو چوگان (ہاں کا قومی کھیل ہے اور ہر جوان اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ شادی کے موقع پر دو پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ ایک دولہا والوں کی، دوسری دلہن والوں کی۔ پولو یہاں کا محبوب مشغلہ ہے، بلکہ پوری دنیا کا سب سے دلچسپ ہے کیونکہ یہ ان کی مردانہ نمونندی اور برسرِ شہسواروں کا پولو سامانِ دنیا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پامیر وسط ایشیا کے پہاڑوں پر لے ہوئے ہیں اور وہاں انسانی ذخائر بدوشی کے عہد میں سب سے پہلے گھوڑے کو ہی سدھایا۔ اس لئے یہ کھیل آدھر سے یہاں تک پہنچا ہے۔

ہر گاؤں میں ایک قطعہ زمین پولو گراؤنڈ کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے گرد چھوٹی سی ایک دیوار بنادی جاتی ہے۔ کوئی موقع ہو چوگان کا مقابلہ ضرور ہوگا، باجے والے پہلے سے جمع ہو جاتے ہیں۔ جب مقابلہ کا جوش و ولولہ عروج پر پہنچتا ہے، ان کی دھما دھم بھی اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔ آلات موسیقی میں ارج طرح کے ڈھول ہاتھ، نفیریاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ جوں جوں کھیل کا جوش بڑھتا ہے اور ایک سو اور دوسرے سو پر چڑھ کر دوڑ کے لئے آگے بڑھتا یا گھوڑے کو اڑنے لگاتا ہے، باجے بھی زور زور سے بجنے لگتے ہیں۔ غرض عجب سماں ہوتا ہے۔ یہاں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کوئی کھلاڑی مقابل کے گھوڑے کو مارے یا اس کی پولو اشک لڑوڑے لے لے تو بھی فاول نہیں مانا جاتا۔ جیتنے کے لئے پانینٹ حاصل کرنے ہوتے ہیں، ان شاملی اضلاع کے لوگ اپنی صحت و توانائی اور ناک نفعی کی خوبی کے لئے دور دور مشہور ہیں۔ مگر سب سے زیادہ شہرت یہاں کے لوگوں کی درازی عمر ہے۔ نسبتاً بڑے ماہروں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس خطے کے لوگوں کی چھلکتی ہوئی جوانی، تنومندی اور حیرت انگیز طویل العمری کا عمل باعث کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یا راز کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ یہ لوگ اپنی عادتوں میں سادہ ہیں۔ غذا بڑی سادہ کھاتے ہیں اور اپنی بڑا صحت بخش ہے۔ ان باتوں نے ملک ہاں کے لوگوں کی صحت و عمر دونوں میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ یہاں کا آدمی ۹۰ برس کی عمر میں بھی کچھ ایسا بوڑھا نہیں لگتا۔ جسے دیکھو

چہرہ سے خون چمکتا ہوا ملے گا۔ سو سال کی عمر بالینا یہاں عام بات ہے۔ پھر غوی یہ کہ ان کی استعدادی ویسی ہی رہتی ہے۔ یہاں لوگ کہتے ہیں کہ حنزہ کا آدمی ویسے تو مرتا نہیں بس کسی پہاڑ سے گر پڑے تو در بات ہے ا طویل العمری کے سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ گلشیر پولو سے کھیل کر آنے والا پانی اپنے ساتھ پہاڑوں کے دوسرے جوہر بھی بہا لاتا ہے جن میں سناہے سونے تک کے ذرات موجود ہوتے ہیں۔ ویسے پانی میں ابرق کا جز غالب نظر آتا ہے۔ جب قدرت نے ہر چھوٹے بڑے کو اپنے خزانے کی یہ لازوال دولتیں اس طرح عام دے دی ہیں تو وہاں کے لوگوں کی عمریں لمبی نہ ہوں گی تو پھر کن کی ہوں گی؟ میر صاحب، والئی حنزہ کی اپنی ریاست میں ٹبرے جہوری طریقے پر حکومت کرتے ہیں۔ انہیں ہر علاقہ سے روزانہ ذرا ذرا سی پولو رٹ ملتی رہتی ہے۔ اس کام کے لئے پرانی وضع کا "کلبش" ٹیلیفون استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا سلسلہ سارے علاقے سے ملا ہوا ہے۔ وہ بلتیت میں اپنے محل کے سامنے ایک کھلا یعنی عام دربار بھی کرتے ہیں جس میں عوام کے نمائندے اگر جمع ہوتے ہیں۔ اسے مقامی اسمبلی سمجھنا چاہیے۔ باہمی گفت و شنید سے آپس کے سب مسئلے جلد از جلد طے کر دئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر جھگڑے ہنری پانی کے مسئلے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی اس دیہاتی نے اُس دیہاتی کا پانی کاٹ لیا۔ چوری، تھل اور اغوا کے واقعات دنیا کے اس حصے میں خاندانی ہوتے ہیں۔

ہنزہ کے اُدھر جو علاقہ ہے وہ بڑے شکار کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہاں ایک قسم کی جنگلی بھیڑ ہوتی ہے جسے مشہور سیاح مارکو پولو کے نام پر شہرت ملی ہے۔ مارکو پولو چودھویں صدی میں پامیر کی سطح مرقع کو عبور کر کے اس نواح سے گزرا تھا اور اسے یہ عجیب بھیڑیں نظر آئی تھیں۔ ان بلند و بالا پہاڑوں پر آج بھی مارکو پولو بھیڑ خمیدہ سینگوں والا بکرا اور مارخور ملتے ہیں بعض دفعہ کوئی تیرو ہزار فٹ کی بلندی پر۔ فکا رکی سنسنی کے رشتہ یہاں کم سمجھ کر ایسے شکار مار لیتے ہیں تو ان کے خور کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ یہ حیوانات شاید اسی حصہ ارض میں ملتے ہیں اور جانبات حیوانی میں شمار ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اس رقبے میں وقت اپنا ساری اہمیت سے دستبردار ہو چکا ہے۔ زندگی ایک طویل سفرِ راحت و کمینہ، عالم سرخوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا تجربہ آگیا جا سکتا ہے مگر قیدِ بیان میں لانا محال ہے۔ یہاں کی زندگی ماحول اور کیفیت کا عالم دیکھنے سے جو صدیوں پہلے تھا۔ سیاح و مسافروں اور جہانگردوں کو یہاں جو دنیا اس وقت نظر آتی ہے اب بھی شاید ویسی ہی ہے یعنی جدید تمدن کی مشینی باتیں اور ہرگز نہیں۔ اس لئے طلسمی ماحول جوں کا توں مل جائے گا۔

یہاں کی رومانی فضا کو منتشر کرنے والی یا تو جیب کی آواز ہے یا سر پہ سے گزرتے ہوئے کسی جوانی جہان کی غولہ اور یہ جیب بھی عجب سواری ہے۔ نئی سواریوں میں شاید ہی کوئی سواری ایسے دشوار گزار راستے طے کر سکے۔ یہ بڑی عمدہ خدمت گزار ہے۔ میرے سفر میں بڑے بڑے بچے و خیم آئے۔ کیا کیا لشیب کیسے کیسے فراز، پھر ہول دلاستے، کھنڈر کھائیاں ہر جگہ ہمت کا امتحان تھا، ہر جگہ حوصلہ کی بات تھی مگر میرا یہ رفیق سفر بڑا ہی مستعد ملا تھا اور ہر موقع پر آگے بڑھنے میں مدد دیتا تھا۔ یہاں کے لوگ اپنی ہر سکون دنیا میں بسے ہوئے اور اُسی میں کھوئے ہوئے ہیں کہیں کھینکھلیاں ہے، کہیں فصلیں کٹ رہی ہیں، کہیں پھل توڑے جا رہے ہیں۔ کوئی شکار کو نکل گیا ہے کسی نے پھل پکڑنے کے لئے ندی کا رخ کیا ہے اور ہاں میں بھولا جا رہا تھا۔ پولو سے کون دل نہیں بہلاتا اور باہر والے کے لئے بہت کچھ ہے۔ نلتر کی برف بستہ ڈھلوانوں پر سے پھسلنے کا کھیل بھی ایک عجیب تحریر ہے جس نے لطف یہاں پہنچ کر اٹھایا جا سکتا ہے۔ میرا احساس ہے کہ جس نے یہ خط اٹھایا، راحت و دنیا کا ایک بڑا حصہ اسے مل گیا!

غرض اس وادی میں ایک عجیب سکون ہے۔ سکون مطلق۔ یہ ایک ابدی راحت کا گہوارہ ہے جس کے طلسم کو دنیا کی کوئی بھی پہلی نہیں توڑ سکتی۔

ہنترہ اور ہنگر کے علاقوں کے علاوہ مملکت و بلتستان کی کینسی میں اور بھی کئی مقامات اپنے قدرتی حسن و رعنائی کے باعث مشہور ہیں۔ مثلاً سکر دو کے ارد گرد کا ہی علاقہ چاروں طرف گلشیر سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ایک پیالہ کی طرح مدور چلے گئے ہیں۔ بچہ میں جا بجا سبز رنگ جھیلیں اگلیں ہیں گلیں کی طرح جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جھیل سن پڑ کے وسط میں تو واقعی ایک پرستانی جزیرہ بھی موجود ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے بھی خاصی خوبصورت کشتیوں سے کام لیا جاتا ہے جن کی سجادٹ اور سطح آب پر ان کی آہستہ روی انسان کو واقعی پریوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ اس جھیل میں ٹراؤٹ مچھلی بھی بہت ہے اور مچھلی کے شکاری خاص طور پر اس جگہ کو پسند کرتے ہیں۔ مملکت کے اطراف و جوانب اور چترال کی راہ پر ہمیں جو بھی جگہ بڑی پاکیزہ، خوبصورت اور سری بھری تھی۔ جدھر نظر اٹھتی تھی تنہا و درختوں کی قطاریں، پھلوں سے لدے ہوئے پیر اور شاداب وادیوں کے قطعے چلے گئے ہیں۔ خاص کر پٹیاں، گوہر اور پھنڈر جھیل کے اطراف میں۔ جو ندی راہ میں بڑی بلور کی مانند صاف، موتی کی جھلک والے پانی سے چمکتی ہوئی۔ انسان حیران رہا کہ ان دو اکھوں سے کیا کیا دیکھے!

مملکت میں ہر طرف کا آدمی نظر آتا ہے۔ خاص کر گرمیوں میں دنیا کے ہر خطے کے لوگ ادھر اکٹھے ہیں۔ کوئی سیاح ہے۔ کوئی کوہ پیما، کوئی کاروبار کے ارادہ سے آیا ہے۔ غرض فرصت کے اوقات گزارنے ہوں یا تجارت کرنا جو یہاں آکر وقت اچھی طرح کٹتا ہے۔ اور راستے کی صعوبتیں جھیلنے کی باتیں تو ہمیشہ ہی یاد آتی ہیں۔

مملکت سے واپسی پر عام طور پر وہ راستہ اختیار کیا جاتا ہے جو وادی کا خان کے نام سے اب ہر جگہ مشہور ہے۔ راستہ اچھا ہے، جیب بہ آسانی گزر سکتی ہے۔ یہاں پہنچ کر ۱۴ ہزار فٹ بلند باؤنٹر پاس ہے۔ وہاں سے پیچ چلیں تو جھیل "سیف الملوک" کا مقام آتا ہے۔ ہر اچھا زمرہ علاقہ۔ اسی طرح نالان، بالا کوٹ، ایبٹ آباد اور پھر پاکستان کے میدانی علاقے آ جاتے ہیں۔

سنہرے بالوں والی شہزادی

(پنجابی لوگ جھانی)

شفیع عقیل

آدمی ملا۔ اس آدمی کے پاس بہت سے طوطے تھے۔ سوداگر کے بیٹے نے اس سے پوچھا: کیا تم طوطے بیچو گے؟
اس نے جواب دیا: بچوں کا۔ مگر ایک طوطے کی قیمت سودا پرے ہوگی؟۔

سوداگر کے بیٹے نے اسی وقت جیب سے سودا پرے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دئے اور اس سے ایک طوطا خرید کر آگے چل دیا۔ ابھی اس نے چند منزلیں اور طے کی تھیں کہ راستے میں اسے ایک آدمی ملا، اس آدمی کے پاس بلیاں تھیں سوداگر کے بیٹے نے اس سے دریافت کیا: کیا تم بلیاں بیچو گے؟
اس آدمی نے جواب دیا: ہاں، میں بیچوں گا لیکن ایک بلی کی قیمت ایک سودا پرے ہوگی؟

سوداگر کے بیٹے نے اسی وقت سودا پرے دے دئے اور اس سے ایک بلی لے لی۔ اب اس کے پاس ایک سانپ، ایک طوطا اور ایک بلی تھی اور ان کے دئے ہوئے تین سودا پرے ختم ہو چکے تھے۔ اسلئے وہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس اپنے شہر کی طرف چل پڑا۔

جب وہ واپس گھر پہنچا تو اس کی ماں نے اسے خوشی کے اس سے پوچھا: "بتاؤ بیٹا، کیا سوداگری کر کے لائے ہو؟۔ مجھے بھی تو دکھاؤ؟"

اور جب اس کی ماں نے یہ دیکھا کہ اس کا بیٹا تین سودا پرے میں صرف ایک سانپ، ایک طوطا اور ایک بلی خرید کر لایا ہے تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ لیکن پھر اس خیال سے غامض ہوئی کہ ابھی انجان سے خدا اور شہا ہو گا تو خود بخود سمجھ جائے گا۔ اب سوداگر کے بیٹے کو بھی احساس ہوا کہ وہ بڑا نادان ہے اور اس نے تین سودا پرے کو بیہوش کرنا شروع کر دئے۔ مچھلا یہ فعلی سی چیز ہے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ وہ اس بیٹا اپنے دل میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ سانپ اسے دیکھ کر بولا: تم اداس نہ ہو۔ میں تمہیں اپنی قیمت دلوا دوں گا؟
اس پر طوطا بولا: میری طرف سے بھی بے فکر ہو میں بھی ایک نہ لیکھ

کہتے ہیں کسی شہر میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ دوسرے شہروں میں جاننا اور وہاں سے طرح طرح کا مال اسباب خرید کر لاتا، اسے بیچتا اور خوب نفع کما تا۔ اس طرح وہ انداس کی بیوی ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے کچھ دنوں بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے ان کی سونی سونی زندگی میں خوشیاں برسوں لیکن ابھی بڑا چھوٹا سا ہی تھا کہ سوداگر فوت ہو گیا۔ اس نے تجارت اور سوداگری سے خاصا روپیہ کما یا تھا اس لئے اس کی بیوی گھر کی چھ پونجی پر گزار بسر کرنے لگی۔

اب اس کی امیدوں کا تارا اور زندگی کا سہارا صرف اس کا بیٹا تھا۔ دن رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے گزرتے گئے اور سوداگر کا بیٹا جوان ہوتا گیا۔ اس کی ماں نے اسے پڑھایا لکھایا اور جب وہ جوان ہو گیا تو اس نے اپنی ماں سے پوچھا: ماں میرے والد کیا کام کرتے تھے؟

ماں نے اسے بتایا کہ وہ سوداگری کرتے تھے اور اس طرح دوسرے شہروں سے سامان خرید کر لاتے تھے۔ اسے اپنے شہر میں لاکھ بیچتے تھے اور نفع کما تے تھے۔ یہ سن کر لڑکا کہنے لگا: ماں، میں بھی سوداگری کروں گا؟

اس کی ماں نے پہلے تو اسے سمجھایا کہ وہ کسی دوسرے دیس نہ جائے لیکن جب اس نے بیٹے کی ضد دیکھی اور یہ سوچا کہ آخر اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے تو اسے اجازت دیدی۔ اس نے اسے تین سودا پرے دئے اور سوداگر کا بیٹا ماں سے رخصت ہو کر سوداگری کے لئے روانہ ہو گیا۔

وہ اپنے شہر سے نکل کر کچھ کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ اپنے شہر سے بہت دور نکل گیا۔ جب وہ ایک جنگل میں سے گذر رہا تھا تو اسے راستہ میں ایک عورت ملی۔ اس عورت کے پاس قسم قسم کے سانپ تھے۔ سوداگر کے بیٹے نے اس سے پوچھا: کیا تم سانپ بیچو گے؟

عورت بولا: ہاں بیچوں گا مگر ایک سانپ کی قیمت ایک سودا پرے ہوگا سوداگر کے بیٹے نے فوراً اسے سودا پرے بھال کر دے دئے اور اس کا ایک سانپ لے کر آگے چل دیا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اسے ایک اور

تہیں دلوادوں گا؟

لی نے سانپ اڑھٹے کو یہ کہتے ہوئے سنا تو کہنے لگی، "میں تو یہی کہتی ہوں کہ ایک نہ ایک روز تمہیں تہاری قیمت فرد دلوادوں گی؟" ان تینوں کی باتیں سن کر سوداگر کے بیٹے کی کچھ بہت ہنسی۔ اسے امید کی کرن دکھائی دی اور وہ سانپ، طوطے اور بقی کی دل و جان سے پرورش کرنے لگا۔

کچھ عرصہ بیت جانے کے بعد ایک روز سانپ سوداگر کے بیٹے سے کہنے لگا، "چلو آج میں تمہیں اپنی قیمت دلاؤں؟"

اتنا کہنے کے بعد اس نے سوداگر کے بیٹے کو ایک جگل کا آتہ بتا کر یہ کہا، "اس جگل میں سانپوں کا بادشاہ رہتا ہے۔ تم مجھے اس جگل میں لے چلو۔ راستہ میں تمہیں بے شمار چھوٹے بڑے سانپ اور بچھو دکھائی دیں گے۔ وہ تمہاری ٹکر بڑھیں گے کرتے ان سے ڈرنا نہیں۔ وہ تمہیں کاٹیں گے نہیں اور نہ کوئی نقصان پہنچائیں گے۔ تم سیدھے چلے جانا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ تم کو وہاں بہت سے چھوٹے بڑے سانپ بیٹھے نظر آئیں گے۔ ان آگنت سانپوں کے درمیان ایک بڑا سا ایسا سانپ بیٹھا ہوگا جس کے سر پر کھٹی ہوئی اور اس کے ماتھے پر ایک خوبصورت موتی بھی چمک رہا ہوگا۔ تم مجھے اس سانپ کے آگے رکھ دینا۔ یہ سانپ جگل کے تمام سانپوں کا بادشاہ اور میرا باپ ہے جب وہ مجھے دیکھے گا تو بہت خوش ہوگا۔ وہ تم سے کہے گا، مانگو جو کچھ مانگتے ہو۔ تم جواب میں کہنا۔ خدا کا دیا آپکا دیا سب کچھ ہے۔ وہ دو سو بری بار کہے گا، تم پھر یہی جواب دینا اور جب وہ تیسری بار تم سے پوچھے تو کہنا، پہلے مجھے قول دیں۔ وہ قول دیدے تو پھر کہنا، آپ کے ماتھے پر جو موتی چمک رہا ہے، یہ مجھے دیدیں۔ اس موتی میں یہ خاصیت ہے کہ تم اس سے جو مانگو گے وہ پلک جھپکتے تھا را کہسا کر دے گا؟"

سوداگر کے بیٹے نے سانپ کو اٹھا لیا اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر اس جگل کی طرف چل دیا جہاں سانپوں کا بادشاہ رہتا تھا۔ وہ کئی دن اور کئی راتیں چلتا رہا۔ آخر کار اس جگل میں پہنچ گیا جو اس کی منزل مقصود تھی۔ اس نے دیکھا راستے میں ہر طرف چھوٹے بڑے سانپ ادھر ادھر بیٹھ رہے تھے۔ کہیں خوفناک اژدھے لیٹے ہوئے تھے اور کہیں بچھو بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا، لیکن سانپ کے کہنے کے مطابق اس نے بہت نہاری اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ اس نے دیکھا کہ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے، راستے میں بیٹھے

ہوئے سانپ اور بچھو اسے راستہ دیتے چلتے ہیں۔ اسی طرح آگے بڑھتا ہوا وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس نے دیکھا کہ وہاں بہت سے چھوٹے بڑے سانپ جمع تھے اور ان کے درمیان ایک بڑا سا سانپ بھی بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر کھٹی تھی اور ماتھے پر چمکتا ہوا موتی بھی دکھائی دے رہا تھا۔ سوداگر کے بیٹے نے آگے بڑھ کر اس سانپ کو سانپوں کے بادشاہ کے آگے رکھ دیا اور کہنے لگا، "اس سانپ کی زندگی میں نے بچائی ہے۔ اسے ہالہ ہے اور اب یہ آپ کی امانت ہے اور آپ کے پاس لایا ہوں؟"

جونی سانپوں کے بادشاہ نے اپنے ماتھے پر دیکھا تو وہ خوشی سے ناچ اٹھا، اور خوش ہو کر سوداگر کے بیٹے سے بولا، "میں تم سے بہت خوش ہوا ہوں۔ تم نے میرا بیٹا بچھو ملا دیا؟ اتنا کہنے کے بعد اس نے سوداگر کے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا،

"مانگو جو کچھ مانگتے ہو۔" اس پر سوداگر کے بیٹے نے سانپ کے بتانے کے مطابق جواب، "خدا کا دیا آپ کا دیا سب کچھ ہے؟" سانپوں کے بادشاہ نے دواں کہا، "مانگ لو جو کچھ تمہاری مرضی ہے؟"

سوداگر کے بیٹے نے پھر وہی جواب دیا، "خدا کا دیا، آپ کا دیا سب کچھ ہے؟"

یہ سن کر سانپوں کا بادشاہ بہت خوش ہوا اور اصرار کرنے لگا، "یہ تیسری اور آخری بار ہے۔ مانگ لو جو کچھ مانگتے ہو؟"

جواب میں سوداگر کا بیٹا کہنے لگا، "پہلے مجھے اپنا قول دیں! سانپوں کا بادشاہ خوش تو تھا ہی۔ برسوں کے بعد اسے اس کا پیارا بیٹا ملا تھا۔ اس نے فوراً قول دے دیا۔ سوداگر کے بیٹے نے جب قول لے لیا تو وہ اس کے ماتھے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا، "اگر آپ کو مجھے کچھ دینا ہی ہے تو وہ موتی دیدیں جو آپ کے ماتھے پر چمک رہا ہے؟"

اتنا سننا تھا کہ یکایک سانپوں کا بادشاہ غصہ میں آ گیا، لیکن وہ اسے اپنا قول دے چکا تھا۔ اس نے سوچا، مجھے اپنا جھوٹا راکرنا پڑا۔ اور یہ سوچ کر اس نے اپنے ماتھے سے وہ موتی اتار کر اسے دے دیا اور سانپ کا بیٹا موتی لے کر خوشی خوشی گھر لوٹ آیا۔

گھر آ کر سوداگر کے بیٹے نے سوچا، ذرا میں موتی کو آڑاؤں تو رہی۔ دیکھوں، سانپ کی بات صحیح بھی ہے یا نہیں، چنانچہ اس نے موتی کو ہاتھ میں لے کر کہا، "اے موتی! میرے سونے کے محل میں جاؤ؟"

اس نے اپنے دل ہی دل میں سوچا، جس عورت کے متعلق خوبصورت بال ہیں خدا جلنے وہ خود کتنی حسین و جمیل ہوگی۔ وہ اس سونے کے بالوں والی آن دیکھی شہزادی پر عاشق ہو گیا۔ وہ اداس اداس گھرا یا اور اسی ٹنگری میں دن رات کھو یا کھو یا سارہنے لگا۔ وہ نہ کسی بات میں دلچسپی لیتا اور نہ کہیں آتا جاتا۔ اس کے باپ یعنی بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ہوئی، تو اس نے شہزادے کو پاس بلا کر اس کی اداسی کی وجہ پوچھی۔ جواب میں شہزادے نے سہرے بالوں کا وہ گچھا پیش کر دیا اور کہا، ”محبوب تک مجھے یہ سونے کے بالوں والی شہزادی نہیں ملے گی، میری زلیست ممکن نہیں!“

بادشاہ نے اسے بھلیا؟ خدا جانے یہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ تم اپنی ضد سے باز آ جاؤ؟

لیکن شہزادے نے کہا: اگر مجھے یہ شہزادی نہ ملے تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گا؟

بادشاہ کا اکیلا بیٹا تھا، وہ اس کی خواہش رو نہ کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس کی خواہش کیسے پوری کرے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ادھر بیٹے کی اداسی بھی اس سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ وہ بڑا پویشان تھا اس نے اپنے دانا دیر کو بلا کر اس سے مشورہ کیا اور اس کی رائے مان لی تو وزیر کہنے لگا: ”جہاں پناہ! یہ کام تو کشتیوں کے ذریعہ ہو سکے گا۔ اور کسی کے بس کا نہیں!“

بادشاہ نے حکم دیا، اسی وقت شہر بھر کی کشتیاں ہمارے سامنے پیش کی جائیں۔ حکم کا ہونا تھا کہ تمام کشتیوں کو طلب کر لیا گیا۔ جب تمام کشتیاں حاضر ہو گئیں تو بادشاہ باری باری ان کی ذہانت اور چالاکائی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ ہر کشتی ایک دوسری سے بڑھ کر اپنی مسکاری اور رہارت کے قصے بیان کرنے لگی۔ ایک نے کہا: ”بادشاہ سلامت! میں آسمان پر جا سکتی ہوں مگر واپس نہیں آ سکتی؟“

دوسری بولی: ”جہاں پناہ میں آسمان پر جا سکتی ہوں اور پھر واپس بھی آ سکتی ہوں!“

اس پر تیسری نے کہا: ”حضور! میں آسمان پر جا کر واپس بھی آ سکتی ہوں اور آسمان کی تھلی بھی لا سکتی ہوں، مگر اسے دوبارہ اس جگہ لگانا نہیں سکتی!“

جب ان تینوں کشتیوں نے اپنے اپنے کمالات اور مسکاری کے قصے بیان کر مئے تو ایک اور بڑی کشتی آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھ بائیں ہاتھ سے عرض کی: ”بادشاہ سلامت! میں آسمان پر جا کر واپس بھی آ سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں آسمان کی تھلی بھی لا سکتی ہوں اور اسے دوبارہ اس کی جگہ لگا بھی سکتی ہوں۔“

اس کا ایسا کہنا تھا کہ آٹا ٹٹا اس کا گھر سونے کے محل میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف جگمگ جگمگ کرتی دیواریں اور چمکتے دکتے دروازے بنے ہوئے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے آنکھ کے پلکارے میں وہ کسی خواب کی دنیا میں پہنچ گیا ہو۔ پھر اس نے فوجی کو ہاتھ میں لے کر کہا: ”اے فوجی! میں اس ملک کا بادشاہ بن جاؤں؟“

یہ کہتا تھا کہ وہ اس ملک کا بادشاہ بن گیا۔ اس کے ارد گرد ذکر چاکر، اور کینز میں حاضر تھیں، ہا ادب درباری بھی موجود تھے اور وہ بڑی شان و جلال سے تخت پر بیٹھا تھا۔

اس نے ایک بار فوجی سے کہا: ”اے فوجی! میری ملکہ سونے کے بالوں والی شہزادی ہو؟“

انفاظ اس کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ اس کے سامنے ایک حسین و جمیل فوجان شہزادی پیش ہوئی تھی جس کے بال سونے کے تھے۔ یہ دیکھ کر سوداگر کا بیٹا بہت خوش ہوا۔ اس نے اس خوبصورت سہرے بالوں والی شہزادی کو اپنی ملکہ بنا لیا اور ملک میں راج کرنے لگا۔ اس نے اپنے طوطے اور بٹی کی حفاظت کے لئے نوکر مقرر کر دیئے تھے اور اپنی ماں کی خدمت کے لئے کینز میں بھی تعینات تھیں۔ اور اس طرح اب وہ سوداگر کے بیٹے سے بادشاہ بن چکا تھا۔

دن بیت رہے تھے۔ ایک روز شہزادی نڈی پر نہانے گئی۔ اس کے ساتھ اس کی کینز میں بھی تھیں۔ جب وہ نہانے کی تو اس نے وہیں پر اپنے گیلے بال گندھوائے۔ بالوں میں کنگھی کرتے وقت کنگھی کے دانٹوں میں جو چند بال ٹوٹ کر رہ گئے تھے کینز نے نڈی میں پھینک دیئے اور شہزادی کینزوں کے ساتھ واپس محلوں میں چلی آئی۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ کینز نے شہزادی کے سہرے بالوں کا جو گچھا نڈی میں پھینکا تھا وہ بہتا ہوا کسی دوسرے ملک میں جا پہنچا۔ اس ملک کے ایک شہر کے قریب ہی سے یہ نڈی گندھاتی تھی اور اس وقت وہاں اس ملک کا فوجان شہزادہ اپنے دوستوں کے ساتھ نہانے تھا۔ سہرے بالوں کا وہ بہتا ہوا گچھا اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے اپنے قریب سے کوئی سہری چن کر پھینک دیا۔ دیکھی تو ہاتھ پر چھا کر اسے پکڑ لیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ یہ کسی عورت کے بال ہیں تو وہ چند لمحوں کے لئے حیران رہ گیا۔ اس نے آج تک کسی عورت کے اس قدر خوبصورت اور حسین بال نہیں دیکھے تھے۔

یہ بوڑھی کشتی اسی سب سے زیادہ جوش مارا درجہ بندی تھی۔ خدیجہ نے بادشاہ سے کہا: "جہاں پتاہ! اس غلام کی باتوں میں تو یہ کشتی ہی ٹھیک رہے گی۔ یہ کام اسی کے سپرد کیا جائے گا؟"

بادشاہ کو بھی اس رائے سے اتفاق تھا۔ اس نے اس کشتی کو ساری بات بتائی اور سونے کے بالوں والی شہزادی کا پتہ لگانے والے سے لائے کا کام اسی کے سپرد کر دیا۔ اسے بہت سا زور و دولت دینے کے بعد بادشاہ نے کہا: "اگر تم نے یہ کام کر دیا تو تمہیں مالدار کر دیا جائے گا؟"

اس کشتی پھر بولی! حضور والا! اس سلسلہ میں مجھے چند ادبی اور ایک کشتی دیدی جانے۔ اس کے علاوہ اتنا خرچہ بھی دے دیا جائے کہ ہم کئی ماہ تک باہر رہ کر گزر رہے کر سکیں؟

بادشاہ کے حکم کی دیر تھی۔ اسی وقت وہ سب کچھ کشتی کو پیش کر دیا گیا جو جس نے طلب کیا تھا کشتی نے ان آدمیوں کو ساتھ لیا اور ضروری سامان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر ندی کے کنارے کھارے پانی کے بہاؤ کے خلاف روانہ ہو گئی۔

وہ کئی دن اور کئی راتیں کشتی میں سفر کرتے رہے۔ جب تھک جاتے تو کچھ دیر کے لئے سستا لیتا اور سچا نہ دم ہو کر آگے چل پڑتے۔ جہاں کوئی شہر آتا وہاں کشتی روک لیتے۔ کشتی شہر میں گھر گھر جاتی، شہزادی کا آنا پتا معلوم کرنے کی کوشش کرتی اور جب اسے شہزادی کے بارے میں کچھ معلوم نہ جوتا تو وہ دوبارہ کشتی میں بیٹھ کر سفر کرنے کی نکل پڑتی۔ اس طرح وہ کئی شہروں کے پاس رُکے۔ کشتی نے گھر گھر جہاں مارا مگر اسے شہزادی کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ لیکن اب یہ لوگ واپس ہی نہیں جاسکتے تھے۔ کشتی کو معلوم تھا کہ سونے کے بالوں والی شہزادی کے بغیر وہاں جاناموت کو دعوت دینا ہے۔ بادشاہ اس کا جی بچہ کو کھوپڑا دے گا۔ اور یہی سوچ کر انہوں نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ ایک عرصہ کی کوشش اور تلاش کے بعد آخر کار وہ اسی شہر کے پاس پہنچ گئے، جہاں سونے کے بالوں والی شہزادی رہتی تھی۔ کشتی نے اپنے آدمیوں کو کشتی میں چھوڑا اور انہیں وہاں رہنے کی ہدایت کر کے خود لوگوں سے پوچھتا پچھاتی شہزادی کے محلوں میں جا پہنچی۔

محلوں میں پہنچ کر اس نے جو بھی شہزادی کو دیکھا ہلک کر اس کو گھلے لگالیا اور ڈھوسے بہاتے ہوئے بولی: "بیٹی! میں تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھا گل ہو گئی۔ تو نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا؟"

شہزادی ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر حیران تھی کہ یہ کون ہے جو اس سے

اس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔ اس نے قہر سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مکالمہ کشتی نے شہزادی کو اس طرح حیران دیکھا تو بڑے سہارے بولی: "تو نے پہچانا نہیں بیٹی! میں تو تیری خالہ ہوں۔ بچپن میں مجھے دیکھا تھا۔ پھر قہر نہ کچھ ایسا ہوا کہ ہم دوسرے میں چلے گئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ۔" تجھے ملا دیا۔ در نہ میں تو یہ سوچ بیٹھی تھی کہ بیٹی کو دیکھے بغیر ہی انکھیں بند شہزادی اب بھی تک حیران و پریشان تھی۔ اس نے تو کبھی اپنا خالہ کے بارے نہ سنا تھا اور نہ اسے خود دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر کشتی بھرے بھرمیں بولی: "میں نے دل میں سوچا اگر بیٹی نے پہچان لیا تو در نہ اسے دیکھ کر اپنا دل ٹھنڈا کر لوں گی؟"

شہزادی بولی: "خالہ! تو تھی ہی۔ اوپر سے کشتی نے یہ باتیں کچھ کہی تھیں کہ اس کا دل پیچ گیا۔ وہ اس کی کشتی چڑی باتوں میں آگئی۔ سوچا، جو سکتا ہے یہ یہی خالہ ہی ہوا اور میں اسے پہچان نہ سکی ہوں۔" وہ کہنے لگی: "خالہ! خدا کا شکر ہے کہ اس نے تجھے بھلے ملا دیا۔ میں تو دیکھنے کے لئے ترس گئی تھی۔ بڑی تمنا تھی تم سے ملنے کی؟"

کشتی نے اپنا حادہ چلتا دیکھا تو ادھر ادھر سے دسوں باتیں بڑا کرتے لگیں۔ اور اس طرح شہزادی نے اسے اپنی خالہ سمجھ کر اپنا جہان رکھا اس کی بڑی عزت کرتی اور جہاں نوازی میں کسی قسم کی کسر نہ اٹھا سکتی۔ اور کے بھیس میں ہر طرح سے چوکتی تھی۔ وہ بات بات کی خبر رکھتی، محل کے ہر بارے میں جاننے کی کوشش کرتی اور ذرا انداز میں چہرے متعلق پوچھ گچھ کرتی۔ کابینا جواب بادشاہ تھا اور سونے کے بالوں والی شہزادی اس کی حکایتیں پاس جو سنا نہیں کے بادشاہ کا دیا ہوا موتی تھا، وہ اسے اپنی جان سے رکھتا تھا۔ اس نے اسے ایک پتلی کی انگشتری میں جڑا کر انگلی میں پہن رکھا ایک ہل کے لئے بھی اپنے سے جدا نہیں کرتا تھا۔ کشتی بھی جب سے یہاں دیکھ رہی تھی کہ بادشاہ کے ہاتھ میں سونے کی بھلے پتلی کی انگشتری ہے، اس میں ضرور کوئی ماز ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ بادشاہ اسے اپنے کبھی نہ اتارتا تھا اور نہ اس کے لئے کسی پہچوسہ ہی کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک روز شہزادی سے کہا: "بیٹی! بادشاہ نے ہاتھ میں نہیں کی انگشتری رکھی ہے، یہ بادشاہ کی شان کے خلاف ہے۔ ان سے کہو کہ وہ سونے جڑی انگشتری پہنا کریں؟"

اس پر شہزادی نے جواب دیا: "خالہ! تمہیں نہیں معلوم کی انگشتری کی وجہ یہ ہے تو ہم بادشاہ ہوتے ہیں۔ یہ سونے کے محل، یہ با



”نمود“ (ایک تجریدی مطالعه)

نقاش: امیر

کہنے لگی: خالہ! کیشتی ہے۔ اس میں بیٹے کی سیر کر رہے ہیں۔
اس پر کشتی نے کہا: بیٹی! میں نے تمہیں اس میں بیٹے کی سیر کرنے کی
چند منٹ کے لئے مجھے بھی ندی کی سیر کرا دو؟

شہزادی نے دل میں خیال کیا، چند منٹ میں بھلا کیا دیر بچ جائے گی،
چلو اسے ندی کی سیر کرا ہی دوں۔ اس نے کشتی والوں کو اشارہ کیا تو وہ فوراً کشتی
قریب لے آئے اور وہ دونوں کشتی میں بیٹھ گئیں۔ جتنی شہزادی اور کشتی کشتی میں
بیٹھے کشتی نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کشتی شہزادی
کو لے کر ندی کے درمیان پہنچ گئی اور پانی کے بہاؤ پر چلنے لگی۔ شہزادی بڑی
پریشان ہوئی۔ یہ سب کچھ اس قدر جلد ہی ہوا تھا کہ وہ کچھ سوچ بھی نہ سکی۔
کشتی۔ اس نے شور کرنے کی کوشش کی تو کشتی کے آدمیوں نے آگے بڑھ کر اس کا
منہ باندھ دیا۔ کشتی نے اسے بے بس دیکھا تو بحث سے اس کے ہاتھ سے
وہ موتی والی انگشتری اتار لی اور وہ شہزادی کو لے کر اپنے شہر کی طرف چل پڑے۔
مہینوں کا سفر دونوں میں اور دونوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر کے پہنچے
وہ اپنے شہر پہنچ گئے۔ کشتی نے سونے والی شہزادی کو ساتھ لیا اور بادشاہ کے
سامنے لے جا کر پیش کر دیا۔ بادشاہ شہزادی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے
کشتی کو انعام و اکرام سےالا مال کر دیا اور اس سے وہ انگشتری بھی لے لی
جس میں سانپوں کے بادشاہ کا موتی چڑا ہوا تھا۔ شہزادے کو جب تہہ چلا کہ
سونے کے بالوں والی شہزادی آگئی ہے تو اس میں جیسے سحر سے زندگی آگئی ہو،
بھول میں ہر طرف خوشیاں منائی جانے لگیں، شہزادی کی شہزادے سے مثال
کر دی گئی اور اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے وہ انگشتری شہزادے کو لے کر لکھا،
”یہ انگشتری اپنے پاس بڑی حفاظت سے رکھنا۔ مجھے کشتی نے بتایا ہے کہ اگر یہ
انگشتری چلی گئی تو سونے کے بالوں والی شہزادی بھی چلی جائے گی۔“

شہزادے نے باپ کی نصیحت کے مطابق وہ انگشتری ہاتھ میں
پہنی اور اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنے لگا۔

دوسری طرف جب سوداگر بادشاہ کو لکھا تو اس نے دیکھا وہاں
سونے کے محل تھے۔ نہ سونے کے بالوں والی شہزادی، نہ کینٹین اور نہ زار باری۔
وہ پہلے کی طرح ایک سوداگر بن چکا تھا۔ سانپوں کے بادشاہ والا موتی جانے کے
ساتھ ہی ہر چیز غائب ہو چکی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک موطا تھا اور ایک تیلی ہوا
پھوس کی بوتلیں ماں جو اس کے ہر دم کے ساتھ تھیں۔ سوداگر بڑا پریشان ہوا
لیکن اب کیا کر سکتا تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اس نے شہزادی کو انگشتری
کیوں دیدی تھی۔ مگر وہ سوچ کر بچتا تھا، بچتا تھا، بادشاہ اس کا داس بنے

سب اس کی وجہ سے ہے؟

کشتی کا قیاس ٹھیک تھا۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ اسے
کامیابی کی امید نظر آ رہی تھی۔ وہ شہزادی سے بڑے پیار سے کہنے لگی۔

”بیٹی! اگر ایسی ہی بات ہے تو میرا اس قسم کی چیز تو نہیں اپنے پاس رکھنی
چاہئے۔ مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کسی وقت عورت سے بد دل ہو جائیں۔
یا ان پر کوئی مصیبت ہی آجائے۔ میری تو رائے یہ ہے کہ آج رات جب
بادشاہ محلوں میں آئے تو تم اس سے یہ انگشتری لے لینا؟“

مردوں کی بے وفائی کے قصے شہزادی نے بھی سُن رکھے تھے۔ وہ کشتی
سے اور بھی مانوس ہو گئی۔ اس نے موطا خالہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ مردوں کا
کیا بھروسہ۔ چنانچہ اس رات جب بادشاہ محل میں آئے تو اس نے اس سے وہ
انگشتری مانگی۔ بادشاہ نے بہتیرا اسے سمجھا لیا کہ اس کا میرے پاس ہی رہنا
ٹھیک ہے مگر شہزادی ضد کرنے لگی۔ بادشاہ شہزادی کو دل سے جاتا تھا۔
وہ اسے ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ اسلئے اس نے انگشتری اتار کر اسے دیدی اور
کہا: ”مگر وہ حفاظت سے رکھنا!“

اور اب وہ انگشتری بادشاہ کی بجائے شہزادی کی ہو چکی تھی۔

کئی دن گزر گئے۔ کشتی یہ تو سمجھتی تھی کہ وہ انگشتری جس کی وجہ سے
محل سونے کے تھے، اب بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر شہزادی کے پاس آئی اور
اس سے اس کا حاصل کرنا کوئی مشکل چیز نہ تھی لیکن وہ اس بات سے قطعی
معاذت تھی کہ آخر ایک انگشتری کی وجہ سے بادشاہت کیسے مل سکتی ہے؟
محل سونے کے کیونکر ہو سکتے ہیں۔ مگر اسے یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت
بھی نہیں تھی۔ وہ تو سونے کے بالوں والی شہزادی کو لینے آئی تھی اور بس۔
اور یہی سوچ کر ایک روز جب بادشاہ سو رہا تھا اس نے شہزادی سے کہا۔

”آؤ بیٹی! آج فرا ندی کی سیر کرائیں؟“

بھلا شہزادی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ
اپنی خالہ کے ساتھ سیر کرنے جا رہی ہے لیکن جب وہ دونوں ندی پہنچیں
تو کشتی بالوں باتوں میں ملے وہاں لے آئی جہاں اس کے آدمی کشتی میں بیٹھے
اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کشتی کو دیکھا تو اس طرح ہو گئے جیسے
وہ اسے جانتے ہی نہ ہوں۔ اور کشتی جب ندی کے کنارے کشتی کے قریب
پہنچی تو اس نے اٹھائی بیٹھے ہوئے شہزادی سے پوچھا: ”بیٹی! یہ کیا ہے
پانی میں؟“

شہزادی کا اس کی بیوقوفی پر بڑی ہنسی آئی، اور سمجھاتے ہوئے

خواب گاہ بتادی اور بلی اور طوطا دونوں شہزادے کی خواب گاہ میں چھپ کر رات بھرنے کا انتظار کرنے لگے۔

جب رات ہو گئی تو انہوں نے دیکھا کہ شہزادہ سونے کے لئے اپنی خواب گاہ میں آیا ہے۔ اس نے اپنا لباس تبدیل کیا اور انگشتی اناکر منہ میں رکھ لی اور پھر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ بلی اور طوطا ایک کونے میں چھپے ہوئے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شہزادہ سوچا ہے تو وہ آہستہ سے آگے بڑھے۔ بلی دبے پاؤں، ہولے ہولے شہزادے کے پیٹ پر چڑھ گئی۔ پلنگ پر چڑھنے کے بعد اس نے اپنی دم کے چند بال شہزادے کی ناک میں ڈال دیئے جس کی وجہ سے شہزادے کو زور کی ایک چھینک آگئی۔ اس کا چھینکنا تھا کہ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ میں رکھی ہوئی سانپوں کے ہادشاہ کے موتی والی انگشتی پھل کر دوڑ جا گری۔ یہ دیکھ کر طوطا پھل کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے انگشتی اپنی چوخی میں پکڑ لی اور دونوں فوراً وہاں سے بھاگ کر شہزادی کے پاس پہنچ گئے۔ اور کہا:

”شہزادی ابے فکر مہ جاؤ۔ ہم نے انگشتی حاصل کر لی ہے اور اب ہم واپس جا رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند دن کے اندر سوداگر کے بیٹے کے پاس تو پہنچ جائے گی۔“

اتنا کہنے کے بعد طوطا اور بلی جس طرح آئے تھے اسی طرح ندی کے کنارے کنارے واپس چل دیئے، بلی نیچے نیچے چلتی اور طوطا اس کے اوپر اوپر اڑتا چلا جاتا۔ اس طرح وہ دونوں کا سفر ٹھنڈوں میں طے کرتے ہوئے آخر کار سوداگر کے بیٹے کے پاس پہنچ گئے۔ سوداگر کا بیٹا ان کے اس طرح اچانک گم ہو جانے پر پہلے ہی سخت پریشان تھا۔ وہ اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ بادشاہی گئی۔ سونے کے محل گئے۔ سونے کے بالوں والی شہزادی گئی۔ سب کچھ چلا گیا اور اب طوطا اور بلی بھی چلے گئے۔ یہی سب کچھ سوچ سوچ کر وہ بہت زیادہ پریشان ہوتا۔ لیکن جب طوطا اور بلی اس کے پاس پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے دیکھا سانپوں کے بادشاہ کے موتی والی انگشتی طوطے نے اپنی چوخی میں پکڑی ہوئی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں کو گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے طوطے سے انگشتی لے کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور بولا: اے موتی! میرے سونے کے محل واپس مل جائیں؟

اس نے دیکھا وہ سونے کے عیاشان محلوں میں کھڑا تھا۔

(باقی صفحہ ۱۳۴)

لگا۔ نہ کچھ کھانا نہ پیلہ۔ ہر وقت کھو یا کھو یا سارہتا۔ طوطے اور بلی نے جب اسے اس طرح اداس دیکھا تو آپس میں مشورہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: ”سانپ تو اپنی قیمت چکا چکا ہے۔ اب ہماری بانی ہے۔ ہمیں ہی سوداگر کے بیٹے کو اپنی قیمت دلانی چاہئے؟“

پھر وہ دونوں کچھ طے کرتے ہوئے بولے: چلو، ہم شہزادی کو ڈھونڈ کر لے آئیں۔“

یہ طے کر کے طوطا اور بلی خاموشی سے چل دیئے، وہ دونوں بھی ندی کے کنارے کنارے پانی کے بہاؤ کی طرف چل دیئے۔ بلی نیچے نیچے چلتی چلتی جاتی اور طوطا اس کے اوپر اڑتا جاتا۔ اور اس طرح وہ دونوں اپنی شہزادی کی تلاش میں دن رات سفر کرتے گئے۔ راستہ میں جو شہر آتا وہ وہاں جاتے۔ طوطا اڑ کر اور بلی گھوم کر گھر گھر شہزادی کو تلاش کرتے اور جب سارا شہر دیکھنے کے بعد واپس ہو جاتے تو دوبارہ ندی کے کنارے کنارے چل دیتے۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ یہ دونوں بھی چلتے چلتے کسی دوسرے ملک کے اسی شہر میں پہنچ گئے جہاں سونے کے بالوں والی شہزادی مجبوری اور بے بسی کی زندگی گزار رہی تھی۔ طوطا اور بلی دونوں گھومتے گھومتے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے بادشاہ کے محلوں میں چلے گئے۔ اور پھر شہزادی کے محل میں جا پہنچے۔ جو بہی شہزادی نے انہیں دیکھا، دیکھتے ہی پہچان گئی کہ یہ طوطا اور بلی اسی کے اپنے ہیں اور اس کی تلاش میں آئے ہیں۔ اس نے انہیں گلے لگایا، پیار کیا اور سوداگر کے بیٹے کا حال دریافت کرنے کے بعد بتایا کہ مجھے اس طرح ایک کشتی دھوکے سے یہاں لے آئی ہے۔ میں جیسے خالد سمجھتی تھی وہ تو اصل میں کشتی تھی اور یہ مجھے یہاں لے آئی۔ بلی نے شہزادی سے پوچھا: وہ موتی والی انگشتی کہاں ہے؟

شہزادی نے انہیں بتایا: وہ شہزادے کے پاس ہے اور وہ اپنی جان سے زیادہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ ہر وقت انگشتی ہاتھ میں پیٹے رکھتا ہے۔ اور جب رات کو سونے لگتا ہے تو انارکراپنے منہ میں رکھ لیتا ہے تاکہ اس کے کھو جانے کا خطرہ ہی نہ رہے؟

یہ سنی کر بلی بولی: شہزادی! اوقت نہ کر، ہم انگشتی ضرور حاصل کر لیں گے۔ تو ہمیں صرف اتنا بتاؤ کہ شہزادہ سوتا کہاں ہے؟ شہزادی طوطا اور بلی کے آنے سے بہت خوش تھی۔ اس کی امیدیں پھر سے زندہ ہو رہی تھیں۔ اس نے بلی اور طوطے کو شہزادے کی

ایک تصویر، دورِ رخ

ایک رخ : "خون جگر ہونے تک" : فضل احمد کریم فضلی

دوسرا رخ : "دی جمدار" : رفیق حیات اور

ناشر : (اردو، انگریزی) : کیسٹلر لٹریچر - (لندن)

سلیم خان گنتی

پیش کرنے والا کسے اس انداز سے پیش کرے گویا وہ پہلی بار خود ہی اس کی حکایت کر رہا ہے اور درمیان میں دلدلار کوئی عجاب نہ ہے۔ اسی تمام پیشکشوں میں کامیابی کا دار و مدار اس ہی بات پر جتنا ہے۔ انگریزی دورِ رخ کا نقاش اس حقیقت کو خوب جانتا تھا۔ اس نے اس لئے سارا زندگی پہلے رخ کو بھول جانے پر مرنے کیلئے تاکہ وہ پورے رخ کے دوسرے رخ پر مہذب دل کر سکے۔ اس طرح مذکورہ بالا دیو دیوی جو کچھ کہا گیا ہے۔ اسے اس دوسرے رخ ہی کے بارے میں تصور کرنا چاہیئے۔

پہلا رخ، دوسرا رخ — اس کا احساس میرے دل میں بول کاؤں باقی ہے۔ انگریزی دورِ رخ دیکھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے اس کی طرح آفتابی ہے۔ اس کا لب و لہجہ، اس کی اٹھن ایسی ہی گنتی ہے جیسے تھامس ارڈی نے بنگال پر قلم اٹھایا ہو، اور یہ کہانی میں اس کے صاف و شستہ، تردانہ، مسکراتے انداز میں ہو۔ بخیرہ ہونے کے باوجود کیفیت آفریں اور باوقار۔

وہ جوش و خروش کی بات تھی، اب بھی ہے۔ میں یہ باور نہیں کر سکا کہ پہلا رخ پہلا ہی ہے اور دوسرا رخ دوسرا۔ اور یہ یونہی نہیں ہے۔ دونوں کے تیر ہی ایسے ہیں۔ مثلاً ناول کا پہلا ہی پر اگر افران لیتے:

"It was an exhilarating July morning in 1939; The entire land of Bengal seemed to be bathed in green. The rippling sea of paddy fields was fringed by tall, delicate betel-nut trees here and there rose groves of coconut and palm trees, and thick, dark clumps of bamboo."

دونوں رخ میرے سامنے تھے۔ پہلے رخ کا تو مجھے سان گھٹا بھی نہ تھا میں نے تو دوسرے رخ ہی کو دیکھا تھا سمجھا تھا اور غالباً اب بھی سمجھتا ہوں۔ پہلا رخ گویا میرے لئے ہے، ہی نہیں اور مجھ ہی تو دوسرے نے اس کو نظروں سے محو کر دیا ہے۔ کم از کم میری حد تک تو ایسا ہی ہے۔

ہزاروں کے پچھلے سال لاہور سے راولپنڈی تک سفر کر رہا تھا۔ بڑا لمبا چڑا سفر، وقت کٹے تو کیسے؟ مجھے یوں بھی رسالے پڑھنے کا جنون ہے۔ اس لئے ہر ایشال پر جائے نکلا۔ تازہ "الشٹریٹ" ویکلی آف انڈیا" نظر پڑا۔ غالباً یہ مارچ، اپریل یا ان کے لگ بھگ کوئی مہینہ تھا۔ اور رسالوں کی طرح اسے بھی خرید لیا۔ سرورق الٹتے الٹتے نظر ایک عنوان پر جا پڑی: "دی جمدار"۔ چہ خوب! ساتھ ہی لکھا تھا: "ایک پُر لطف کردار"۔ اس سے دلچسپی اور بھی بڑھی۔

کہاں جہاں یہ یہاں کے حوالدار اور جمدار اور کہاں ولایت۔ لیکن روایت کیلنگ تو مدتیں گزریں اس معاملہ میں پہل کر چکا ہے۔ اس لئے اس نام میں تو کوئی اچھے کی بات تھی۔ اور اہل اچھلتان کے لئے تو "خون جگر ہونے تک" سے زیادہ، جو تصویر کا پہلا رخ ہے، بہر حال جمدار ہی زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ دو عالمی جنگوں کے بعد مغربیوں کے ان جاننا زوں کو ایک عالم سے روشناس کر دیا ہے۔ مگر میرے لئے تو پہلے دوسرے رخ کے علاوہ، جس کے اول دوم ہونے کا فیصلہ میں ابھی نہیں کر سکا، زیادہ اچھے کی بات یہ تھی کہ جس بات کا ذکر پہلے کرنا چاہیئے تھا وہ بالکل آخر میں بیان کی گئی تھی یعنی انگریزی دورِ رخ جناب رفیق خاور کام ہونے منت ہے کیونکہ میرے سامنے تو تصویر کا ایک اور ایک ہی رخ ہے اور میری ہٹ دھرم طبیعت کچھ ایسا ہی تصور کرنے پر مجبور ہے۔ یوں یہ بات خود تبصرہ سے بھی صاف جھلکتی ہے۔ کیونکہ تصویر، پوری طرح پوری ہوئی تصویر جس میں بن سکتی تھی اور جمدار کو جمدار یعنی دلچسپ نہ کہ تھوڑا، نظر دیا، آقا، زہرے اور تمام تر حمل بن جائے۔

*Islam, Praised of Two Laws,
Glory of God.*

ایسی آئے سامنے کی باتوں کا تقابل لطف سے خالی نہیں۔
ایک جگہ ایک بزرگ آتے ہیں پیر اسلام۔ بڑا اٹوٹھا نام ہے
ہم لوگ جو پیر کھاتے ہیں سنتے ہی پیر کا رخ بھی لینے لگے ہیں، اور میں نے
ترکیب کا بھی۔ یقین ہے انگریز بھی *the chase of Islam*
سے اتنے ہی محظوظ ہوتے ہوں گے۔

آپ پوچھیں گے کہ اگر ایسی ہی بات تھی اور سارا ناول بنگال
ہی کی خطا میں رسایا ہوا تھا۔ نام، جیس، اجناس۔ سب کے
سب بنگال ہی بنگلاتھے۔ یہاں تک کہ یہاں کے مشہور عالم رس گلے
جی تھے اور جلیبیاں بھی جن کا ایک دو جگہ ذکر آیا ہے تو اس رخ کی
دوسرے رخ میں کایا پلٹ ممکن ہی کیسے تھی؟ یہ بڑا پتہ کا سوال ہے۔
اس میں تو کہیں نہ کہیں دوسرا رخ بنانے والے کو اراستانی ہی پڑے گی لیکن
جراتی ہی ہے کہ کہیں ویٹا نہیں ہوا۔ جی جھے پھر وہی پرانی بات دہرائی پڑتی ہے۔
یہ شش و پنج کہ کس رخ کو اصل رخ کہا جائے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں دن رات پھلی، سبوت، دال کا استعمال
عام ہے جی تو دال گلنا نہ گلنا جیسا عموماً محاورہ بن چکا ہے۔ یہ دال اپنے
یہاں تو خیر کسی نہ کسی طرح گل ہی جاتی ہے، لیکن کہیں اور کیسے گلے
بڑا پیر سامعہ ہے۔ اگر ہم پنج ولایت جا کر دال گلانے لگیں تو کیا ہوگا۔
لکھنے والے نے تو یہ بات بڑے مزے سے لکھ دی تھی کہ:

”دال گلتی نظر آرہی تھی۔ اجنبی مناسب معلوم ہوا کہ وہ دو
ایک آپ بچ جگہ کے خود دے آئیں تاکہ جو کچھ کر گئے ہیں وہ لگی ہووے
بھی پوری ہو جائے“

اب یہاں سارا سلسلہ ہی دال۔ آپ بچ۔ کسر اور گنے کا ہے نہ
انگریز دال پکائیں نہ کلائیں۔ ان کے یہاں اس عمل کا کیا جواب ہے؟
دیکھئے:-

*He felt that the achievement of
his cherished object was at hand,
and he deemed it proper to push
the advantage home. A little
more steam and his stew would
be ready.*

اسے دیکھتے ہی گمان ہوتا ہے کہ یہ رخ دوسرا رخ نہیں ہو سکتا۔
اور چراغ سے چراغ جلانے والے نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔ اس نے
اپنے رخ پر دوسرے کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ قلم اس کا اپنا ہی قلم رہا ہے
اور تیرہویں اس کے اپنے ہی تیرہ رہے ہیں۔ بالخصوص خط کشیدہ جملہ
کتنا عمدہ ہے۔ بیان میں وہ چیزیں جسے انشا پر دازی کہتے ہیں۔
حسب معمول کوئی بات بڑھا کر ٹھکر یا شاعری کا رنگ دیکر نہیں پیش کی گئی۔
دوسرا رخ ہونے کی بات جب بنتی کہ عبارت میں کوئی جھول
ہوتا۔ کوئی عبارت تشریح کے لئے اضافہ کی جاتی۔ خطوط عدلی بکثرت
برستے جاتے اور جا بجا حاشیے ہوتے۔ ایسی سب باتیں تو بیان ہی میں
سمجھ گئی ہیں جس سے اور بھی کسی اور رخ کا شائبہ نہیں رہتا۔ مثلاً
ایک چھٹی ہی بات لیجئے۔ ہمارے یہاں روزہ، نماز، تہجد کون نہیں
چانتا مگر اہل مغرب انہیں کیا جانتیں؟ ان کے لئے تو کوئی ایسی ترکیب
کرتی ہوگی کہ وہ ان کا مطلب سمجھ جائیں۔ اگر کہیں ذرا بھی مشتبہ پیدا
ہوگا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کافی نہیں تو بات بگڑ جائے گی۔ شرط یہی ہے کہ
ایک رخ کے پس پردہ کوئی دوسرا رخ نہ دکھائی دے۔ چنانچہ احمد کے
کے سلسلہ میں کہیں *pre-dawn prayer* اور کہیں
کسی تشریح کی گنجائش نہیں رہنے دی گئی۔ بات ہر جگہ پوری ہے اور اس
پر وہی چھاپ ہے جو اصل پر پہلی چھاپ ہے۔

ایک اور منہ لیجئے، بہت گراں پایہ، عزیزہ الیہ۔ ہر شوہر اپنی
نصف بہتر کو اس ہی نام سے یاد کرتا ہے۔ مگر انگریز لوگ اسے کس طرح پچھتے
ہیں، انہیں یہ نازک رشتہ کیونکر سمجھلا جائے، یہ بات اچھے اچھول کو چکولنے
دینے کے لئے کافی ہے۔ پھر اس کے لئے کیا حکمت برتی جائے کہ سب عزیزہ
الیہ کو جانا جائیں؟ انگریزی میں اس کو *dear spouse* کہا گیا
ہے۔ اور اس میں ایسی چیز کے اس علاقے میں دوپٹ سے محفوظ رہنے کی ضرورت نہیں رہ سکتی۔

لیجئے ہی خبر نہیں کہتے نام اور میں۔ مثلاً محمد صاحب کے صاحبزادے
شان یا چھانو کو لے لیجئے۔ شاہی کے جو معنی ہیں وہ تو ہم جانتے ہیں۔ مگر انگریزی
کو اس شان یا اسکی شان نزول کا کیا علم اور وہ ان انوکھے خطابات و الفاظ کو
کیا جانیں جن سے ہم اپنے یہاں خود کو یاد میں رکھنا کوہنہ کرتے ہیں۔ پورنام
یہ ہے ”ابو البرکات تاج الاسلام محمد بن ابی القریب شان خدا“۔ انگریزی
میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ترجمہ جواب ہے:

Father of blessings, crown of

the black-market, and the rich sucking the blood of the poor, people hailed him; but when, like a pedigree cock, the gamador, replied with a deadlier thrust, they started saying: "Go on! Go on!"

ایک روز اور متعہ دیجیے:-

(۱) وقت گزرتا گیا، لڑائی زور پکڑتی گئی قیمتیں ایک کی دس پہنچ گئیں، بازار میں چیزیں دس کی جگہ ایک نظر آئے گئیں۔ جیسے بھرنے لگیں پیٹ خالی پونے لگے۔

(۲) جمعدار صاحب کی مالی حالت یوں بھی تیلی ہو رہی تھی۔ اب ایک نہ شدہ و شدہ مفلسی میں آگیا۔

ان سے زیادہ خطرناک دھڑے شاید ہی چنے جاسکیں اور باری خانہ سے فی صدر پٹ نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان پہ درپے چالوں کا جواب تقریباً بحال ہے۔ مگر جو ایک فیصد امکاں باقی رہ گیا تھا اس نے لایا ہی پٹ دی ہے:-

1. During the following months, the war spread and its effects became worse. Prices shot up tenfold and the quantity of goods on the market shrank by nine-tenths. As some pockets swelled other stomachs became empty.

2. The gamador's financial position was already precarious. The involvement in a criminal case came as another bolt from the blue.

اسی طرح بساط پر ہروں کی نشست اتنی مضبوط ہے کہ کسی بھی دھڑے کو اوپر اٹھانا اور اٹھانا بعد از امکان نظر آتا ہے۔ بہت سے مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اُمید کی دیوی کی آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس کی نگاہ غلط انداز ہر طرف پڑتی

ہم سے اس کا ہلا ہوا زب کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ یہ تو بالکل الگ چیز ہے۔ روپ رنخ کی بات تو ملنے نہیں بن پڑتی۔ غیر یہ جانے دیجیے۔

ٹینی مرغا، ہیل مرغا، ان کی بالیاں اور نوک بھونک کا ہمارے تو ہم آئندہ دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ خبر نہیں مغربی ملکوں میں بھی مرغوں بیروں، مینڈروں وغیرہ کی کشتیاں دھکل ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہوتے ہیں تو اس فن کے ہر پروانہ کی اصطلاحیں ہی ہوں گی۔ اور جو کوئی ایسا سین دکھانا چاہے وہ اس کو بخوبی پیش کر سکتا ہوگا۔ مگر یہاں کے آدمی کتنے دہان کی ان پیشہ ورانہ باتوں کا علم اور ان کو اکرنا کافی طبیعتی کھیر ہے۔ اب دیکھتے دو مرغوں کی ہموک آواز لڑائی کا جو نقشہ نیچے پیش کیا گیا ہے۔ وہ کیا دشواریاں پیدا نہیں کرے گا۔ اور سات سمندر پار رہنے والوں کے سامنے اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ پیش کیا جاسکے گا تو کیسے۔

مجلو دھڑے ٹینی مرغ کی طرح جب امیر غریب، بلیک مارکیٹ گرائی، خون چوسنے وغیرہ کی چورچامی تو جمع اسے شاہاشی دے رہا تھا مگر جب جمعدار صاحب نے ہیل مرغ کی طرح پیرمیاں کو غلامی کی ضرب کاری لگائی تو ان کی واہ وا ہونے لگی۔

ہم واقعی کٹھن ہے۔ اور بظاہر میدان چھوڑے بغیر چارہ نظر نہیں آتا یعنی یا تو سارے معاملے ہی کو گول کر دیا جائے یا کوئی راہ فرار اختیار کر لی جائے۔ انگریزی رنخ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ تو کڑی سے کڑی صورت حال سے گریز کیا گیا ہے اور نہ لکیر کا فقیر بنکر ہرچہ استاد اذل گفت ہماں می گویم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے بلکہ ہر ادب و نچ کا پورا پورا سامنا کیا گیا ہے اور اسی راہ اختیار کی گئی ہے جو بالکل اپنی ہوس

آئی ہے شہ تو اپنی جگہ سے ٹپٹے نہیں

ایرا ہی ہے کہ ہم نے بچا ہے کشت کو

مگر کشت اور ایرا کی بات تو حجب پیدا ہوتی ہے کہ واقعی شہ آئی ہو اور بچا گیا ہو۔ یہاں بچنے بچانے کا سوال ہی نہیں۔ شاطر کو صرف اپنی چالوں سے سروکار ہے۔ اس لئے بازی سراسر اس کی اپنی ہے۔ وہ اپنے حریف کے ہشکندے کو ایک نظر دیکھ کر آنکھیں میچ لیتا ہے اور پھر اسی چال چلتا ہے کہ وہ دیکھتا ہی رہ جائے امد یہ کہیں لاکھیں کل چلتے۔

When Galadha, like a common cock, struck a blow against

were coming from every direction. As far as the eye could see, the river was like a rainbow of red, blue and yellow sails, pennons and flags. On the bank temporary shops made of bamboos and tin sheets had been set up. There were all kinds from restaurants to trinket shops. Some boats were loaded with coloured bundles. When they came near, the bundles suddenly became alive. In their laps other smaller bundles in the form of children sprang up. Every big bundle had three or four smaller ones with it. The male passengers began to alight from other boats, all adorned with beards in various styles and waist-bands of different hues. Some beards had an aura of saintliness, some were well-shaped....."

قد، آتی طور پر حال چلتے وقت ہاتھ اسی کا اونچا ہوتا ہے جو پہل کرے۔ مذہب والے کا ہاتھ جی اونچا ہوتا ہے کہ وہ چال کا توڑ کرے۔ مثلاً کھیل کے اس روپ میں ہار نہیں تو آدمی کیس نہیں گئی ہوتی:-

یکایک زمین و آسمان جنبش میں آئے، زمین پر ہول کے گونے دوڑنے لگے، آسمان پر بجلی کے نیرے چمکنے لگے، کچھ دیر بعد ان پر اگلے ہتھیاروں کی جگہ نئے سامان حرب استعمال کے جانے لگے، ہوائی جہاز اڑنے لگے، توپیں گرجنے لگیں، بم پھٹنے لگے۔ جملہ صاحب نے بیچے الودیعہ کہتے ہوئے کان میں اٹھ لی۔ انکا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا گرج کی آواز سے جلد و مرد بھول محمد چونک کر اٹھ بیٹھے، ہوا زور پکڑتی

تھی۔ ہر ایک ہی محسوس کر رہا تھا کہ کبھی پر پڑ ہی ہے اور شبید ہو جا رہا تھا پھر میریاں قدرتا ایسے شبیدوں کی صف اول میں تھے۔
مگر ایک ہی ہاتھ میں جہاں جہاں کالے ہرے تھے وہاں سفید ہی سفید ہرے دکھائی دیتے ہیں:-

Many dead hearts started pulsating with new life. The goddess of Hope was all smiles. Her glances fell meaningfully on all sides. Everyone felt that they were focussed on him and was thrilled accordingly. Panir Miyan was naturally in the forefront.

کھیل کی خوبی وہاں دکھائی دیتی ہے جہاں ایسی ہی اٹھی سے اٹھی چالوں کے ساتھ بسا بھی بری طرح دُور دُور پھیل جاتی ہے۔ اور فیملی فرزین دُور لے کے لئے میدان بہت ہی وسیع ہے۔ یہیں شاطر کے جوہر سب سے زیادہ نکلتے ہیں اور دیکھنے والا اس کی چابکدستی کی داد دے سکتا ہے۔ جتنی شئی گم کر دینے والی چالیں پڑتی ہیں اتنی ہی اس کے ذہن کی تیزی برقی جاتی ہے۔ اور اپنا رنگ دکھائی ہے۔ اسی سے کھیل کی سطح بہر حال اُسی، اور اُنہی ہوتی۔ ایک مقام پر یہ نقشہ دکھائی دیتا ہے۔
"کالی گینچ میں بڑی دھوم دھام نظر آرہی تھی۔ سینکڑوں کشتیاں چلی آرہی تھیں۔ تاحد نظر سرخ پیلے پیلے بادلوں، جھنڈیوں اور جھنڈوں کی بدولت ساری فضا تو س قرح بنی ہوئی تھی۔ کنارے پر بانس اور مین کی عارضی کانیں لگائی جا رہی تھیں۔ ہر طرح کی دکانیں تھیں، کھانے پینے سے لے کر بازار سے تک، کچھ کشتیاں رنگین گھٹریوں سے لدی ہوئی تھیں، قریب آئیں تو گھٹریاں بولتی چلتی جاندار نظر آئیں، ان کی آغوش میں چھوٹی چھوٹی گھٹریاں بچوں کی صورت میں اچھلیں، ہر بڑی گھٹری کے ساتھ تین تین چار چار چھوٹی گھٹریاں تھیں۔ مرد و عورتی کشتیوں سے آترے طرح طرح کی ڈائریوں اور رنگ رنگ کے تہندوں سے بنے سنورے کچھ ڈانسیاں نراتی تھیں، کچھ شہلے۔"

اور بساط اللہ تھے ہی صورت حال یوں اگر گوں ہو جاتی ہے:-

There was great activity at Kaliganj. Gaily coloured boats

”رم جھم یہ پھوار“

خواجہ غلام فریدؒ
مترجم: حشمت فضلی

۳

برسوری اگھینویر سجا کے

جیسے گھٹائیں برسیں جھاکے

ساوین آیا بن سجنائے کے بدے ہوئے طوفان ہلا کے

وعدے کر کے بھی نہ آئے بھولے دل پر چوٹ لگا کے

دل چھینا راول جو گئی نے بانسریا کی تان اڑا کے

اتنا ظلم مناسب ناپیں سجنائے سے پرت لگا کے

مجھ کو اکیلی چھوڑ کے تھل میں جا بیٹھے پردیس میں جا کے

روٹھ نہ جانا راجہ مجھ سے میرے اجڑے من کو سب کے

ڈھونڈھوئی تھک کو جو گن بن کر اپنے بدن پر رکھ رکھا کے

پاپی سپینہ خم نہ چھیرا ب پھونکن کوئل کوک منا کے

ہجرت کی آگ پہ لوٹ رہی ہو بے بسی میں پرت لگا کے

تم بن مجھ کو چین نہیں ہے شاد کرو دل چوب کھلا کے

بادل گر میں بجلی چمکے رجم جھم بارش نور گھٹا کے

مشکل بار اٹھا کے فرید اب

جینا ہے دو بھرن بھنا کے

پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے
برسات آئی، خوشیاں لائی
ہر شے پر ہے مستی چائی

چوگ بننے لگی
کھپ (۱) کھلنے لگی
سبزہ جو ہے اٹھلائے

پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے
بادل گر ہے، بجلی کو ندی
منی سے اٹھی خوشبو سوندھی

گرمائے جگر
قلب اور نظر
مستی میں من لہرائے
پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے
جب تک ہے یہاں بیکارانی
تلا بوں میں ہے جب تک پائی

ٹھہریں مجھے ہیں
جائیں نہ کہیں
کیوں کوئی یہاں سے جائے
پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے
شاداں ہے فرید اس موسم سے

جوسے ہر سو میں رم جھم کے
میٹھا میٹھا
اک نشہ سا
جذبات میں گھٹتا جائے
پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے

جسیم الدین

(شخصیت اور شاعری)

وفاراشدی

ابتدائی تعلیم مقامی مدرسوں میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کلکتہ پہنچے۔ یہاں کی یونیورسٹی سے ہنگلا ادب میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ انہیں ہنگلا ادب کی وہ شلخ جو مسلمان مائجیوں سے مخصوص ہے اور اس عوامی ادب سے جسے پوتھی ادب کہا جاتا ہے، خصوصی لگاؤ تھا۔ انہوں نے گاؤں گاؤں پھر کر پوتھی ادب کے وہ پارے جمع کئے جو تلف ہوتے جا رہے تھے اور لوگوں کو صرف زبانی یاد تھے اور جن کی طرف غیر مسلم ادیبوں نے کبھی نگاہ التفات بھی نہ ڈالی تھی۔ مسلم لوگ گیتوں اور مسلم عوامی ادب کے یہ جواہر ریزے بڑی حد تک جسیم الدین کی انتھک مساعی کی بدولت ہی مستقر عام پر آکر محفوظ ہوئے۔

پاکستان جنم کے بعد جسیم الدین ڈھاکہ یونیورسٹی میں آگئے اور ہنگالی ادب و زبان کی تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آج کل وہ مشرقی پاکستان کے شعبہ اطلاعات سے متعلق ہیں۔

تالاب کے کنارے ناریل اور کیلے کی حسین قطاریں، جھالیہ کے اونچے اونچے شرمیلے پیڑ، حد نظر تک دھان کے ہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ، ہر طرف بل کھاتی ندیاں، ندیوں پر ریگتی ہوئی طح طرح کی خوبصورت ریگین، کومل کومل کشتیاں، آسمان پر رنگ برنگے چوہ کی طرح لہرتے بل کھاتے بادل — یہ ہیں وہ حسین مناظر، وہ دلنظر خوبگوں نظارے جن سے مشرقی پاکستان کے حوام کے دلوں میں مدھان کی لہریں اٹھتی اور ذہنوں میں گمازا اور نغمہ شعریات کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں غزل و نغمہ و موسیقی لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہے۔

مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان کی آبادی کا بھی

ہنگور کی زندگی کا آخری دور تھا کہ ہنگلا ادب میں جدید بھانپ پیدا ہوئے۔ میری مراد جنگ عظیم اول (۱۹۱۴-۱۹۱۸) سے ہے۔ اس جنگ کا اثر بڑے منیر کے معاشری حالات اور سیاست دونوں پر پڑا۔ قدرتی بات تھی کہ ہنگال کے مسلم اہل قلم بھی اس طوفانی جہد کے تقاضوں سے روشناس ہوئے۔ اور ان میں بھی اپنی انفرادیت کا جذبہ جاگا۔ چنانچہ قاضی نذرا لاسلام نے مسلم ہنگالی ادب میں اپنے نئے گہوار آہنگ اور اسلامی تعلیمات سے ایک نئی جوت ہنگالی شروع کی۔ پھر تو ایک باقاعدہ تحریک کے طور پر مسلم ہنگالی ادب کی ایک تحریک سی چلی پڑی اور مسلم تاریخ و ثقافت اور اسلامی رجحانات و احساسات نے ہمارے ہنگالی ادب پر اپنا اثر مرتب کرنا شروع کر دیا۔

جب تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو مسلمانوں میں ہندی فکری بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی جس سے ادب بھی متاثر ہوا۔ ادیب قلم سے ہی نہیں عمل سے بھی اس ملی جہاد میں شریک ہوئے اور حصول پاکستان کی جہد و جہد میں انہوں نے مصعوبتیں اٹھائیں اور مسلمانوں میں اپنی خودی کا احساس پیدا کیا۔

جن مسلم فنکاروں نے آزادی ملک و ملت کے لئے اپنے قلم سے بیداری کی روح پھونچی اور مسلم ثقافت کی روح کو پانے کی کوشش کی ان میں جہاں اور ممتاز اہل قلم کے نام لئے جاسکتے ہیں وہاں ہنگلا کے مشہور شاعر جسیم الدین کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

جسیم الدین کی شخصیت سے تعارف حاصل کرنے کے سلسلے میں ان کی ابتدائی زندگی کا کچھ احوال بیان کر دینا بجا نہ ہو گا۔ موصوف مشرقی پاکستان کی دھرتی کے لال ہیں۔ ان کا گھر فریر پور کے مقام قبول خانہ میں ہے۔ وہ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔

بے حال ہوں میں روتے روتے
اس پار تو ہے میری کنیا
اور ندی کے اُس پار ہے تو
(جو لوٹ گیا)
اُس پار سے کیسے آئے گا تو
اب ملنے کی امید نہیں
میں گھول رہی ہوں کالی لٹیں
کالی راتوں کے سایوں نے
سارے سنسار کو گھیر لیا
آکاش پہ جتنے تارے ہیں
ہر ایک کوٹھ کر بیٹھی ہوں
ہر آس ملاپ کی لوٹ چکی
ہر آن بہار کی بیت چکی

یہ جیم الدین کی بنگلہ کتاب ”دیگلا ناما زما بھی“ (دیگلی ناما کا مطلع)
سے براہ راست ترجمہ ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ”پدا پار“
(پدا - ندی کے اُس پاد) بھی شائع ہو چکی ہے۔ جو ایسے ہی
نفیس بھائیالی گیتوں کا مجموعہ ہے۔
ان کے لکھے ہوئے لوگ گیتوں کی طرح ان کی لوگ کہانیاں
اور لوگ ڈرلے بھی بڑے اچھوتے، نفیس اور مقبول عوام
ہیں اور ان کہانیوں اور ڈراموں کو بنگلہ ادب کے انمول رتن
سمجھا جاتا ہے۔

ہر بچہ کہانیاں سنتا ہے۔ جیم نے بھی اپنے بچپن
میں بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ جن کو وہ بھلا نہ سکے۔
اور جب بڑے ہوئے تو لا شعور سے یہ کہانیاں پھر ابھر آئیں اور
انہوں نے ان کہانوں کے تانے بانے جوڑ کر اپنے مخصوص البیلے
انداز میں پھر مرتب کر دیا۔ دو کہانیوں ”آسمان سنگھ“ اور ”دھومالا“
نے ناموں کی شکل اختیار کی جنہیں بے پناہ مقبولیت حاصل
ہوئی۔ آسمان سنگھ کی تحریر و ترتیب کی بابت خود جیم الدین
نے اپنی بنگلہ تالیف ”دھومالا“ (مٹلا) میں کیفیت اس طرح
بیان کی ہے:-

”میں نے یہ نامک آسمان سنگھ، آج سے

بڑا حصہ دیہات میں ہی بسا ہوا ہے۔ یہاں کے بامیوں کی زخروں
زندگی پر یہاں کی نرم نرم مٹی اور سب رو ندیوں کا بڑا اثر ہے اور
آپ حد ہر جائیں فضا لوگ گیتوں کی جھنکار سے ملو اور عوامی کہانیاں
اپنی دھرتی کے رنگ آہنگ سے مرتب پائیں گے جن کے ہر لول اور ہر
روپ میں یہاں کے عوام کے دل کی دھڑکنیں اور ان کی زندگی کے
سوز و گداز کی گونج نظر آئے گی۔ جیم الدین کی شاعری میں جو لوح
تاثر اور نما ہٹ آئی ہے وہ اسی ماحول کی دی ہوئی ہے۔

جیم الدین نے یوں تو بہت سے موضوعات پر لکھا ہے
مگر لوگ گیت لوگ کہانیاں اور لوگ ڈرلے ان کے مخصوص موضوعات
ہیں۔ ان کی شاعری کا سب سے زیادہ حصہ عوامی گیتوں پر مشتمل
ہے۔ اس باب میں پروفیسر سید علی حسن نے بالکل صحیح کہا ہے کہ
ان کے کلام کا محور ”میں سنگھ گیتیکا“ یا ”میں سنگھ (منزل)
کے گیت ہیں یا وہاں کی حیات پر دروہانی کہانیاں اور وہاں
کے مقبول عوام رقص۔ انہوں نے ہی ہمیں دیہاتی نعروں سے
بھر پور طریقہ پر روشناس کرایا ہے۔ ان کے مستعمل الفاظ خصوصاً
ام اور صفتیں، تلمیحات اور تشبیہیں، سب میں عوام کی اصل
زندگی جھلکتی ہے۔ دوسرے شعراء نے بھی اس میدان میں قدم رکھا
ہے مگر جیم الدین نے عوام میں رہ بس کر اور ان کی روح میں
جھانک کر جس طرح عوام کے دل کی دھڑکنیں سنی ہیں، کوئی نہ
سن سکا۔

شرقی پاکستان کے لوگ گیتوں کی کئی قسمیں ہیں جیسے معرفتی،
مرشدی، بادل، زاری، گم بھیر اور بھائیالی وغیرہ۔ جیم الدین
نے ان تمام اقسام کی چھائی بین کی ہے اور ان گیتوں کو جمع کیا ہے۔
شرقی پاکستان کے گیتوں میں سب سے زیادہ دلنواز و دلنشیں گیت
بھائیالی گیت کہلاتے ہیں۔ جب کسی دیہاتی لڑکی کے لبوں سے
اس قسم کے گیتوں کا سرچشمہ پھوٹتا ہے تو فضا نغمہ ہی نغمہ بن جاتی
ہے۔ جیم الدین نے ایک گیت لکھا ہے۔ جس میں بیان ہوتا ہے
کہ محبوبہ اپنے پریمی کے انتظار میں ہے اور سوز و غم نے اسے چھوٹک
رکھا ہے۔ اس نغمہ و لمحہ کی یاد اس طرح دہرائی گئی ہے:-

گنگا کا کنارہ لوٹ گیا

لے دوست جدائی میں تیری

کوئی پچیس سال قبل لکھا تھا، مگر اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔

روپ دے کر یہاں پیش کیا ہے، کاش! میرے یہاں جو بیٹا تھا اس وقت موجود ہوتے۔ وہ اسے سن کر کتنا خوش ہوتے۔

جنیم الدین نے دیہی زندگی پر ایک اور ڈرامہ لکھا ہے۔ ”جنیم الدین“ (۱۹۵۵ء) میں ”نور زکستان“ ڈھاکہ نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ڈرامے منظر عام پر آچکے ہیں اور ان کی ادبی و فنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں شعرو لغہ کا ایک عجیب امتزاج اس ڈرامہ میں بھی پایا جاتا ہے جسے ”بیدیرے“ (پنیرے کی لڑکی) کا نام دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا قدیم بنگالی ادب پر ہندو تہذیب و ثقافت اور ہندو تاسخ و روایات کا اثر غالب تھا اور نیگور کے عہد تک یہی رجحانات بنگالی ادب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے مگر مسلم نشاۃ الثانیہ کا جب ایک دور شروع ہوا تو مسلم فنکاروں نے اسلامی نظریات، تاریخ اور ثقافت کا عنصر اپنے ادب میں داخل کرنا شروع کیا۔ اس کی ابتدا کلکتہ میں مسلم انشوروی ادیبوں اور شعرائے اہتمام سے ہوئی۔ ان مسلمان اہل قلم کے ناموں میں جو اس تحریک میں نمایاں حصہ لے رہے تھے مولانا اکرم خان، سید امجد علی، قاضی نذیر الاسلام اور کوئی غلام مصطفیٰ کے ناموں کا خاص طو پر ذکر کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنی سیاسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ادبی محاذ پر بھی مسلم فکر و فن کے احیاء کی عملی کوششیں کیں جو بالآخر تشکیل پاکستان کی صورت میں منتج ہوئیں۔ ان انشوروی کی کوششوں سے ہی بنگالی ادب ایک نیا لہر اختیار کرتا ہے۔ ان لوگوں کی سہلی یہ تھی کہ ادب کے ذریعہ ہم اپنی تاریخ کو دہرائیں، اپنے بھوکے ہیبت سے مسلم عوام کو بیدار کریں۔

تحریک قیام پاکستان (لاہور، ۱۹۴۰ء) کے فوراً بعد، یعنی ۱۹۴۱ء میں کلکتہ کی ایک ادبی مجلس، ”پوریو پاکستان... سوسائٹی“ نے اس کام کو آگے بڑھایا اور پھر ۱۹۴۲ء میں ڈھاکہ کی مجلس ”پوریو پاکستان“ شابتہ شنگدھ ”قائم ہوئی جس نے پہلی انجمن کے ساتھ اشتراک عمل کیا اور مسلم بنگالی ادب کو اسلامی ہدایات اور اسلامی مزاج سے مالا مال کرنے کے لئے ادیبوں کو ترغیب دی۔ چنانچہ مسلم پویتی ادب کی دریافت اور تحفظ کا بڑا کام اس دور میں ہوا۔ زبان کی اصلاح کے سلسلے میں عربی، فارسی اور اردو کے عام فہم مروج الفاظ کو نہایت

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جنیم الدین کتنے طویل عرصہ سے عوامی ادب پر کام کر رہے ہیں اور ان کے قلم نے کیا کیا جوت جگائے ہیں۔

”آسان سنگھ“ حقیقی معنوں میں عوامی ڈرامہ ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دیہات کی ٹھیک زبان کے بجائے کلکتہ کی آسان اور عام فہم بنگلا استعمال کی گئی ہے تاکہ شہری اور دیہاتی سب ہی اس ڈرامہ کو سمجھ لیں اور اسٹیج کی عوامی ضروریات بھی پوری ہو سکیں۔

”مدھومالا“ بھی ڈرامہ ہے اور بڑا ہی دلکش۔ اس کی کہانی کو ایک حسین و رنگین خواب کہا جاسکتا ہے جس میں حیات و کائنات کی تمام رنگینیاں، رعنائیاں اور دلچسپیاں سمٹ کر آگئی ہیں۔ اس ڈرامہ کی زبان میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ دیہات کی پوری فضا کو برقرار رکھا جائے۔ وہاں کے عوامی محاورے، سادگی اور کیف پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ جگہ جگہ ایسے گیت بھی آتے ہیں جن سے فضا نغمگی سے مملو ہو جاتی اور ذہن ایک عجیب کیفیت محسوس کرتا ہے۔ ”مدھومالا“ بہت مقبول ڈرامہ ہے اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کے دیباچہ میں خود جنیم الدین نے اس کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:-

”میں نے یہ ناول اپنے ایک دادا سے سنا تھا یہ میرے والد کے چچا تھے اور اس کہانی کے گیتوں کو اپنی مخصوص لہجہ اور مخصوص نغموں میں سنایا کرتے تھے۔ یہ بول سن کر میری روح جبر کرنے لگتی تھی اور میرا وجود کیفیت، سرور اور رقص و اسرار کی دنیا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا اور یہ ڈرامہ سننے سننے میں اپنے دادا کی گود میں سو جاتا تھا۔ اور اکثر سہنوں میں مجھے کہانی کی ہیروئن ”مدھومالا“ اور اس کا ہیرو مدین کما نظر آنے لگتے تھے کہ پیار کے جھولے میں جھول رہے ہیں اور بس یہ لگتا تھا کہ ساری کائنات و فورالفٹ سے ہمہ نغمہ ہر رقص بنی ہوئی ہے۔ آج میں نے اس کہانی کو ایک نیا

کے بھی کئی مجموعے ہمارے سامنے آچکے ہیں جیسے "رکھائی"۔
 "بالوچرہ" (ریٹیل میڈان)۔ "ہاٹ کھیت ماٹیر کینا" (نور افروز)۔
 ان کے منظوم افسانوں میں "نقشی کا ترماٹھ" (منقش کپڑوں کا لیدر)۔
 اوسویان ما دیا گھاٹ، کو تو بین الاقوامی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔
 اول الذکر کا انگریزی میں منظوم ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ (منظر
 لے۔ ایم طفور ڈا۔ THE FIELD OF EMBROIDERED QUILT)
 ان نظموں میں بھی وہی زندگی کی عکاسی بڑے ماہر اور فنکارانہ
 طریق پر کی گئی ہے۔ کتاب مشرقی پاکستان میں پہلے ہی بہت مقبول
 تھی مگر انگریزی ترجمہ اور پھر اس کے اردو ترجمہ کی وجہ سے اس کی
 شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور دو دوں طبقہ جی اس عظیم منظوم فنانے
 سے روشناس ہو گیا۔

جسیم الدین مشرقی پاکستان کے ان عظیم فنکاروں میں سے
 ہیں جو شعر و ادب اور ثقافت کی ہم آہنگی کے دل سے قائل، بوجد
 محبت وطن اور ملک کے دونوں بازوؤں کی یکا نگت کے دلدادہ ہیں
 اور اپنی تحریروں اور عملی اقدامات کے ذریعے آپس کی محنت اور
 افہام و تفہیم کے راستہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نرے خلوص کو مشعوں
 میں بڑے کامیاب ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ہم مشرقی پاکستان کے
 ادب سے اور بھی زیادہ قریب آ گئے ہیں۔ اقبال پرمان کی شہد نظم۔
 "پوتھ بھولا کو بی" ان کی اردو سے محبت اور شاعر مشرق سے ان کی
 والہانہ عقیدت کی عکاس ہے۔ ان کی اور بھی کئی نظمیں حب وطن
 قومیت اور ملکی شیرازہ بندی کے موضوع پر موجود ہیں۔

"ادارہ مطبوعات پاکستان" (کراچی) نے اپنی وقیع تالیف
 "خیابان پاک" میں جسیم الدین کی ایک نظم "چرچاے کادل" شامل کی
 ہے، (صفحہ ۳)، جو ان کے مخصوص عوامی رنگ، اسلوب اور فنی
 میلان کی بڑی اچھی مثال ہے اور میں اسے آخر میں قارئین کے مطالعہ
 کے لئے پیش کرتا ہوں جس سے ہمیں مشرقی پاکستان کے اس عظیم
 فنکار کے فکر و نظر کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے،

"چرچاے کادل کا درد کسے معلوم؟
 ہم اپنی خوشیوں میں، اپنے درد کے اندر
 اُس کے دل کے سجد کو ناحق ڈھونڈ رہے ہیں
 ہم نے اپنے درد کتابوں میں، نظموں میں
 (باقی صفحہ ۱۳ پر)

سادگی و صفائی کے ساتھ اپنی تحریروں میں شامل کیا۔ یہ ایسے
 الفاظ تھے جو یہاں کے مسلمان ہر وقت اپنی روزمرہ زندگی میں
 استعمال کرتے تھے مگر غریبوں کی روش نے انہیں ادبی اہمیت
 کے حق سے محروم کر رکھا تھا۔

اس تحریک کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ مسلم اخوت کا جذبہ
 پیدا ہوا اور تراجم کے ذریعہ اسلامی ملکوں اور عالمی اسلامی ادب
 کے ساتھ رشتے استوار کئے گئے۔ دھاکہ یونیورسٹی کی شائع کردہ
 تاریخ ادب بنگالہ (۱۹۵۷ء) کے حوالہ سے یہ بات بلا خوف تردید کہی
 جاسکتی ہے کہ مسلم دانشوروں اور اہل قلم میں، جو اس تحریک میں
 نمایاں حصہ لے رہے تھے، جسیم الدین کا نام ایک ممتاز جگہ پر
 نظر آتا ہے۔

جسیم الدین نے اپنی نظموں میں ہدیت اور آہنگ کا
 تجربہ بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے انسان کی برتری، اعلیٰ انسانی
 اخلاق و اقدار کی فتح، ان کے خاص موضوعات سخن ہیں۔ ان کی
 معرکہ الاثر نظم "قبر" میں یہ خصوصیات خاص طور پر نظر آتی ہیں۔
 ہر چند کہ یہ نظم موصوف کے ابتدائی کلام کا نمونہ ہے مگر وہ ان کے
 آنے والے ادبی دور کی جھلک بھی رکھتی ہے۔ طبیعت میں جو
 جدت اور خیال میں جو ندرت و روحنائی ہے اس کا سرور اس نظم
 میں ملتا ہے۔ پرانے خیالوں کو نئے اسلوب و پیغام کے ساتھ فروغ
 سخن بنانے کی یہ بڑی اچھی مثال ہے۔ مثلاً اس نظم میں ایک
 رسی رسیدہ دیہاتی بزرگ ہیں جو اپنی چپیتی پوتی کو اپنی زندگی۔
 ایک درد بھری زندگی — کی کہانی سناتے جاتے ہیں۔ بوڑھے
 بزرگ اس بچے کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اپنی بیوی کی قبر
 دکھاتے ہیں، پھر دوسرے عزیزوں کی قبروں پر بے جا کہہ کر ایک
 کی خوبیاں گناتے ہیں اور نغمہ جی کو اعلیٰ انسانی اقدار کی اہمیت
 ذہنی نشین کراتے ہیں۔ بوڑھے کی باتوں میں بڑی صفائی، سچائی
 اور گہرائی و خلوص ہے۔ انسانی زندگی اور موت کا تاثر ایک بھرپور
 وار کرتا ہے اور میرا خیال ہے کہ بنگالہ ادب میں شاید ہی کوئی نظم
 ایسی ہو جو دل پر اتنا گہرا اور اتنا دیر پا اثر چھوڑتی ہو۔ شاید یہی
 سب سے کہ جسیم الدین کی نظموں میں سب سے زیادہ
 شہرت "قبر" کو حاصل ہوئی۔ یوں ان کی نظموں

ایوانِ زرین

(اباسین آرٹ سینٹر، پشاور کی نمائش تھائی)

محققہ اعلیٰ

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ادھر کے مشہور فن کا شہنشاہ سلطان حمید کی مساعی سے یہ مرکز برابر ترقی کر رہا ہے اور یہاں کے زمین نوجوان طبقہ میں نقاشی سے لگاؤ پیدا ہو رہا ہے۔ نمائش میں جو تصاویر پیش ہوئیں وہ آب رنگی بھی تھیں اور روغنی بھی۔ مجھے اس نمائش میں بطور فنکار اور بطور مبصر دونوں طرح شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔

میں اولاً خواتین فنکاروں کا ذکر کروں گا۔ آنسہ فرزانہ حنیف کی کئی نقشاویں اس نمائش میں موجود تھیں۔ اس سے قبل ایڈورڈ کالج (پشاور) میں جو نمائش فن تریب دی گئی تھی اس میں بھی ان کے کئی نقوش منظر عام پر آئے تھے۔ یوں تو فرزانہ کو ڈیزائن یا مہیت نگاری سے لگاؤ ہے مگر عہد جدید کے فنی میلان کا تقاضہ یہ کہ اب ان کے کام میں تحریریت کی جھلک بھی آئی شروع ہو گئی ہے۔ شلائن کی ایک تصویر ”مچلی“ جسے یہاں بہت سراہا گیا اور فنی انعام کی مستحق قرار پائی۔ اسی طرح ”آہوان صحرا“ کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ وہ ان تجریدی نقوش میں سکون کی مدد سے اپنے خیال کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے نقش ”انتظار“ میں بھی گہرے احساس کی جھلک نظر آتی ہے جس کے لئے انہوں نے پینکریٹریسی انکمکوں میں نظر آنے والی ایک کیفیت سے کام لیا ہے۔ فرزانہ کے علاوہ آنسہ ایس بخش نے بھی حصہ لیا تھا وہ کافی عرصہ سے پروفیشنل فن میں مصروف ہیں۔ ان کی ایک تصویر ہے ”مجد جابت خاں کا مینار“ یہ مسجد پشاور کی عظیم و قدامت بلدیہ عات

تاریخ اپنے آپ کو دہرائی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا رہتا ہے۔ خاص کر تہذیبی و ثقافتی حوالے کے لوگ ہر شعبے کی داستان کو ہمیں ہر وقت ہی اس مشہور مقولہ کی صحت کا یقین دلاتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی سابق صوبہ سرحد کی ثقافتی زندگی، بالخصوص فنی دنیا میں ایک نئی تحریک اور نیا جذبہ شوق کا رفرما نظر آتا ہے، بالخصوص نوجوان فن کاروں میں اپنی ثقافتی میراث کے تحفظ اور اسے ترقی دینے کا احساس قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ شاید اکی ٹری و جہ یہ ہے کہ یہ خطہ گندھارا آرٹ کا گہوارہ رہا ہے اور گندھارا تہذیب کا مسکن ہونے کے باعث اسے فن کی دنیا میں ہمیشہ ہی ایک ممتاز جگہ دی گئی ہے۔ آجکل گندھارا آرٹ کے نمونوں کی نشان دہی پرانے شاہکاروں کی حضری دریافت اور تاریخی آثار کی برآمدگی کے باعث یہ حصہ ملک عالمی شہرت کا مالک بن گیا ہے اسی وجہ سے یہاں کے نوجوانوں میں فنونِ جمیل کی طرف زیادہ رجحان پیدا ہو رہا ہے اور فرزندان کوہ بھی قلم و مو قلم سے نئے نئے احسانِ خیالی اور نئے نئے پیکر ان جمیل و گہیں سطحِ قلم پر منتقل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں کے نوجوانوں میں فن سے دلچسپی برابر بڑھ رہی ہے اور یہاں کی مشہور فنی درسگاہ ”اباسین آرٹ سینٹر“ نے جس کا قیام اب سے کوئی آٹھ سال قبل ہوا تھا، بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مرکز فن نے ہی پچھلے دنوں اپنی سالانہ نمائش فن کا اہتمام کیا جس میں کوئی پندرہ مصوروں نے حصہ لیا اور تقریباً اسی نمونہ فن اس نمائش میں پیش کئے گئے جن کا ذکر میں یہاں کرنا چاہتا ہوں۔

ملتان، کراچی، شاہہ خصوصی پبلش ۱۹۶۳ء

غامی میڈیکل کالج کا طالب علم ہے
ضخ کو پہچانتے پریمی گفتگو کرتا نہیں
سرس چاہتا ہے۔ اس سیلاب و طغیانی
مگر ناگوں مظاہر سے بڑی دلچسپی ہے۔
ایز تیز اور شوخ آبی رنگ استعمال
ج کو مسخر کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔
بھی بڑا عمدہ مطالعہ ہے۔



علی اعزاز: سید جعفر طاہر
ادبی انعام (۱۹۶۲ء) — طویل نظم:
”ہفت کشور“
دوسرا انعام: خدیجہ مستور:
(ناول ”آنکھ“)

رکشی میں مصروف ہے اور اس کے
انجمن مصنفین پاکستان کا
سکریٹری جنرل، انجمن مصنفین پاکستان، اُچی ہے۔ خاص کر غروب آفتاب
پاکستان پر لکھتے ہوئے باولوں کے
ست کے ساتھ اپنی آخری آب و تاب
عطا کرتا ہے۔

عام کی بابت کچھ عرض کرنے کی اجازت
اپنے چند نقوش کا ذکر کرتا ہوں —
ساح پر پیش سے گئے تھے۔ مجھے یوں تو
اب معروضی نقش بنانے کی طرف تھا
استعمال کرتا ہوں اور وہ بھی
انہوں کی کیفیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔
ثروں کی مدد لیتا ہوں۔ میرا ایک
شی کے نمونوں سے بھی بہار تعلق برقرار



یا ”اور الف لیلہ“ کچھ ایسی ہی سوچ
ہمصنفیران چمن: احلاس کے موقع پر
برقی درس گاہ ابا سین آرٹ سینٹر کی
پہلی کیلئے، مگر نکتہ وروں نے یہ کہہ کر
بڑی اداسی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ خوب
نصیب العین کے مطابق جو کچھ بھی
سانے آچکا ہے، اب یہ ان دیر و
مال کریں؟



★

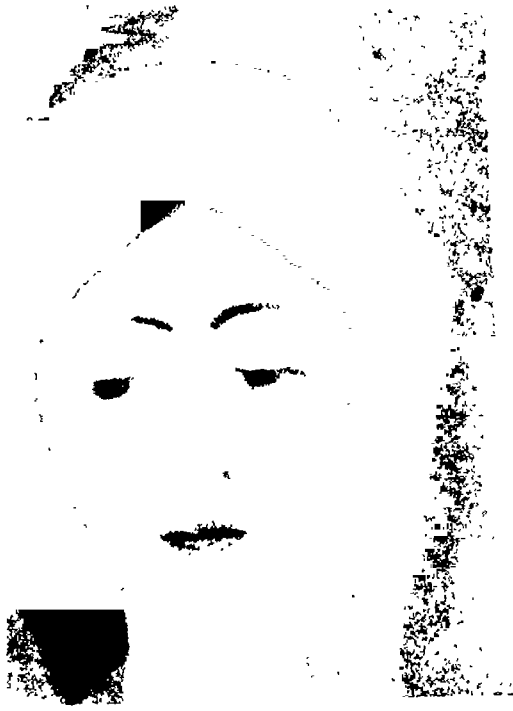
سید وفا

رفیق خاور



سید قدرت نقوی





معصومیت : (روحانی نقش) : بیگم رسیدہ



لڑا : (آب و ہوا) : شمس : محمد صادق



نہ سوسائیتی (سودا)
جامہ ہونے والی اس
فن کے حامی تھیں

خوشک ناچ : (روحانی نقش) : محمد عادل

آہوان صحرا : (روحانی نقش) : عزیز احمد



ہے اور اس کے مینار کا یہ نقش مسجد کی عظمت و رفعت کا بڑا اچھا پہلو پیش کرتا ہے۔

بسیک رشیدہ کو آواز نے اس نمائش میں پانچ نقوش پیش کئے تھے۔ وہ بھی اسی مرکز کی پرانی طالبہ ہیں اور گو مصوری کے لئے انہیں وقت کم ملتا ہے مگر پھر بھی جو نقش مکمل کر لیتی ہیں وہ خیال جذبا و در تر تیب و تکمیل کے اعتبار سے بہت نفیس چیز ہوتا ہے۔ ان کی تصویر "معصوم" جو اس نمائش میں رکھی گئی تھی، بہت پسند کی گئی۔ یہ روحی تصویر اپنے موضوع کا بڑا اچھا اظہار ہے۔

ایک نئی سی فنکار تھی، زاہدہ سلیمی۔ یہاں کے فن حلقے کی سب سے کم عمر فنکار۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس نے فن سے اپنی لچک اور اپنے فنی مستقبل کا بڑا اچھا ثبوت دیا ہے۔ نمائش میں اس کی پانچ تصویریں آئی تھیں، زیادہ تر رنگین پینلوں کا عمل تھا اور ہر نقش خوش ذوقی کی جھلک تھا اور انہیں دیکھ کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ صبح نہ مٹائی میں وہ ایک دن ضرور ایک اچھی فنکار ثابت ہوگی۔ اب میں کچھ ذکر نہ کر سکا، طلبہ کا بھی کرنا چاہتا ہوں جن کے فنی ذوق کی جھلکیاں اس نمائش میں دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ فرزانہ حفیظ کے بعد سلیم اصغر مرکز کے سب سے پرانے طالب علم ہیں اور اس اثنا میں ان کے فن میں کافی ترقی پیدا ہوئی ہے۔ وہ زیادہ تر منظر کشی کی طرف راجع ہیں۔ منظر ہر فطرت اور مناظر قدرت سے انہیں طبعی لگاؤ ہے۔ انہوں نے اٹھارہ آب رنگی و روغنی نقوش اس نمائش میں پیش کئے تھے۔ ان نقوش میں اس نے ہر حد کی قدرتی کیفیتوں اور یہاں کے باشندوں کے چہروں کو دکھایا۔ سلیم جہاں گرو بھی تو ہے اور اسی وجہ سے وہ مناظر قدرت کو بڑی مددگی کے ساتھ اپنے کینواں پر منتقل کرتا رہتا ہے۔ ترتیب کی خوبی و در رنگوں کے ستھرے استعمال کا اسے خاص خیال رہتا ہے۔ سے ناؤخی رنگ مرغوب ہے اور وہ اس کی ذہنی افتاد کا خوب سا ثبوت دیتا ہے۔ "غروب" "مخزن" اور "آید سرا" تو ناظر کو اندازہ دیتے ہیں۔

محمد صادق یوں تو مقامی میڈیکل کالج کا طالب علم ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبض کو پہچاننے پر ہی گفتگو کرتا نہیں چاہتا بلکہ نبض حیات پر بھی دسترس چاہتا ہے۔ اس سیلاب و طغیانی جو حیات انسانی کے گونا گوں مظاہر سے بڑی دلچسپی ہے۔ "فودٹ روڈ" میں اس نے جوتیز تیز اور شوخ آبی رنگ استعمال کئے ہیں اس نے ماحول کی روح کو مسخر کر کے میں بڑی مدد دی ہے۔ اس کا ایک نقش "پٹھان" لڑکا بھی بڑا عمدہ مطالعہ ہے۔

دارت خان بھی منظر کشی میں مصروف ہے اور اس کے نقوش میں بڑی جاذبیت نظر آتی ہے۔ خاص کر غروب آفتاب میں دریا کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان پر کھمبے ہوئے بادلوں کے پیچھے ڈوبتا ہوا سورج بہت نفاست کے ساتھ اپنی آخری آب و تاب دکھاتا اور منظر کو ایک عجیب کیف عطا کرتا ہے۔

اگر ایک فنکار کو اپنے کام کی بابت کچھ عرض کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے تو آخر میں میں بھی اپنے چند نقوش کا ذکر کرتا ہوں۔ میرے کوئی چودہ نقوش اس موقع پر پیش کئے گئے تھے۔ مجھے یوں تو چہرہ نگاری سے دلچسپی ہے مگر اب معروضی نقش بنانے کی طرف رجحان ہو رہا ہے۔ زیادہ تر آبی رنگ استعمال کرتا ہوں اور وہ بھی بڑے جگے جگے جن سے ایک خوابوں کیفیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

تجربہ دیت میں قوسوں اور دائروں کی مدد لیتا ہوں۔ میرا ایک تصور یہ بھی ہے کہ اسلامی نقاشی کے نمونوں سے بھی ہمارا تعلق برقرار رہنا چاہیے۔ چنانچہ "محرابیں" اور "الف لیلہ" کچھ ایسی ہی سوچ کے نمونے ہیں۔ میں نے اپنی فنی درسگاہ ابا سبیں آرٹ سینٹر کی عمارت کو بھی کینواں پر منتقل کیا ہے، مگر نکتہ وروں نے یہ کہہ کر مجھے چوکا دیا کہ اس نقش میں بڑی اداسی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ غلط ہے یا خا؟ بہر کیف میں اپنے نصب العین کے مطابق جو کچھ بھی بنا سکا ہوں وہ اہل نظر کے سامنے آچکا ہے، اب یہ ان دیدہ و نظر کا کام ہے کہ وہ میری جگہ نہ نالی کریں؟

”کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟“

امام حسن سنیاں

کی زیادہ سے زیادہ صرفہ مالی کی فیل ہوں۔ عوام کی ذاتی طور پر حصول معاش اور مال و زر کو بڑھانے کی کوششیں بجا و درست۔ انہیں اسکاں بھرا اپنی ثروت کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے لیکن حکومت کی حقیقی غرض مصلحت اور فربہ نہیں ہے۔ کہ وہ ان کی اوقات کو بہتر بنانے کی تدبیریں سوچے، انہیں عمل میں لائے اور آمدنی بڑھانے میں سب کی مدد کرے۔

سوال یہ نہیں کہ زبردیا کیا جائے بلکہ اس کو بڑھایا کیسے جائے۔ تاکہ ہر انسان کی آمدنی بڑھے اور جہاں چھوٹے بڑے شہری آمدنی میں اضافہ سے زیادہ خوش حال ہوں وہاں ساری قوم میں بھی اس خوش حالی کا گیس دکھائی دے۔ دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اور لوگ بھی لوگ باگ چاہتے ہیں کہ دولت چلتی پھرتی ہی رہے! مگر بعض خدا کے بندے تو ایسے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ چلنا پھرنا تو کجا وہاڑنے لگتی ہے۔ وہی حالی کی بات۔ انہیں کرتے خست لٹانے میں اس کے!

کون نہیں چاہتا کہ مدد پر ایسے کاموں پر لگایا جائے جی سے وہ بڑچڑھ کر ان کے ہاتھ واپس آئے تاکہ وہ بھی خوش و خرم ہوں اور ان کے عزیز اقارب بھی۔ اور وہ خوش حال تو ساری دنیا خوش حال۔ بعد یہ ٹھیک خرچ کرنا، بچانا اور اس کو بڑھانا، یہ سب اپنی اپنی جگہ ہیں۔ اور ہمیں ہر وقت اس تاک میں رہنا چاہئے کہ کس طرح وہ بڑے کیلئے کاموں پر لگائیں کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔

روپیہ بڑھانے کا ایک طریقہ تو رقم آئے وہ سیرا زار دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی ماری یا پتہ باز راستے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور پاک چھپکنے میں ایک کے دو تین چلند پے بنا دیتا ہے۔ یا کوئی پیرقہ بیک چاندی کے زیور کو سونے کا زیور بنانا پھر تک ہے اور اس طرح سادہ لوح لوگوں کو تھک کر نوادگیارہ ہو جاتا ہے۔

شعبہ بازی سے قطع نظر ایک طبعی طریقہ بھی ہے۔ یعنی ”کھل سم سم“ کہلاؤ خزانوں کے دھواڑے آپ ہی آپ کھل گئے۔ یا

”ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا“ غالب نے یہ کہا ہی تو کہا تھا۔ قیولہ انفع ہی کے بارے میں بھی۔ مگر غریبان کے ساتھ ساتھ غم و غداں بھی تو ہے۔ اس سے نہ کبھی مفروضہ نہ ہوگا۔ ہمارے اہل الا با! حضرت آدم سے بھی تو خوشنہ گنہم ہی نے باغ بہشت چھڑایا تھا۔ اور اب کون ہے جو حاجتمند نہیں؟ امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہوں یا فقیر، سب کے سب کسی نہ کسی طرح ضرورت حاجت مند ہیں۔

مگر کس کی حاجت مدد کرے کوئی؟ ہم یہ نہیں مانتے تھے۔ آپ نے سنا ہی ہوگا۔ کار ساز باہر فکر کا رہا۔ شیخ سعدی نے صدمہ سال پہلے غالب کا بہت جبرستہ جواب دے دیا تھا۔

اے کریمے کہ از خزانہ غریب
گبر و ترسا و غلیفہ خود داری
دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ بادشہاں نظر داری

اور یہ کہ :

ہر ناداں آں چنان روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بساند

اور صرف کار ساز حقیقی ہی نہیں، اُس کے زیر سایہ ہزاروں دنیاوی کار ساز بھی تو ہیں جو شب و روز و ماہ و سال خلق خدا کی حاجت مدد کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ خدا بقول شخصے، قاضی الحاجات ہے جس سے اسوگی و خوش حالی میسر آتی ہے لیکن اس کا سر و سامان کرنے والے بھی تو موجود ہیں۔ دنیا کی اکثر ملکیتیں کیا ہیں؟۔ رفاہی ادارے جو کم مقصد اپنے شہریوں کے لئے زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور راحتیں مہیا کرتے ہیں۔ وہ اپنے سینکڑوں کارکنوں کی آنکھوں سے دیکھتے، اپنی زیر نگرانی بندگان خدا کی حاجتوں کا سرور لگاتے اور پھر صدمہ بیدار مغز را بہ فکر و نظر کے ذریعہ اسی تدابیر اختیار کرتے ہیں جو ان کے وابستگان و

درحقیقت ہماری قومی کامیابی ہے۔ اور قومی خوشحالی کا ایک بہت ہی اہم ذریعہ۔ ایسے ادارے بھی، ظاہر ہے، روپے پیسے ہی سے چل سکتے ہیں جسے عام طور پر سرمایہ کہا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ جس شخص کی ذرخست سے حاصل ہوتا ہے۔ قطرہ قطرہ بہم شورو دریا۔ چھوٹے ٹرکے شہری اپنی اپنی استطاعت کے مطابق جتنے خریدتے ہیں اور ان سے جو سرمایہ ملتا ہے اس سے ہر قسم کے کاروباری ادارے چلتے رہتے ہیں۔ مگر ان تصویق کی قدرت کیساں نہیں رہتی۔ اگر وہ پیش کے حالات ان پر برابر ڈالتے رہتے ہیں۔ اور انہی سے مارکیٹ کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ وہ چیز ہے جسے اچھے اچھے ماہرین اقتصادیات بھی مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ چہ جائیکہ عام لوگ، خاص کر ان پڑھ لوگ انہیں سمجھ سکیں۔ اگر وہ کسی کاروبار میں روپیہ لگائیں یا جتنے خریدیں تو خبر نہیں ان کا کیا حشر ہو۔ کیا معلوم بہتر ہونے کی ہر کوشش ہی انہیں نے فوجے اور جو تھوڑا بہت سرمایہ یا بچہ بچہ ان کے پاس ہے وہ اسے بھی کھو بیٹھیں۔ کون نہیں جانتا کہ سب کھیلنے سے کتنے لوگ تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ایک طرح کا جوا ہے۔ سوچ سمجھ کر جتنے خریدنے میں کوئی ہدایت نہیں لیکن عام ناواقف انسانوں کے لئے یہ اندیشہ خالی نہیں مگر اندازہ کس کا لطف کسے یاد نہیں کسی شخص کے پاس ایک ہی اشرفی تھی۔ اس نے کسی طرزا کے یہاں اشرفیوں کا اتنا بڑا انبار لگا دیکھا۔ اس نے کہا اس سے بہتر قسمت آزمائی کا موقع اور کیا ہوگا۔ آؤ دیکھا تاؤ، جھٹ اپنی اکلوتی اشرفی اس ڈھیر پر پھینک دی اور لگا پڑ پڑ دیکھنے کو کب جا دو کے زور سے وہ دھیک دھیک ڈکڑا کر اس کی طرف آتا ہے۔ مگر یہ اس خیال است و محال است وجہوں " نہ وہ ڈھیر ہی آیا، نہ وہ اشرفی ہی ہو سکر آئی۔ اور وہ حضرت خالی ہاتھ ملے رہ گئے۔ پھر کسی نے سمجھایا۔ نہ اس طرح زکوٰۃ نہیں کھینچا کرتا۔ اس کے ادھی عقل مند نہ طریقے ہوتے ہیں۔

یہی کیفیت سرمایہ لگانے کی بھی ہے۔ کہیں وناکس کو نہ بازار کے حالات کا علم ہوتا ہے، نہ سرمایہ کاری کے اندیشہ کی خبر۔ یہ دیکھتے ہوئے حکومت نے ایک بہت ہی عمدہ قدم اٹھایا ہے۔ یہ کہ جس طرح دوسرے ترقی یافتہ ملکوں — امریکہ، جرمنی، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ — میں اس مقصد کے لئے ماہرین کے ادارے موجود ہیں، اسی طرح ہمارے یہاں بھی سرمایہ لگانے کا ادارہ قائم کیا جائے، جس کا کام یہ ہوگا کہ سرمایہ لگانے والوں کی خاصی ہی تعداد کو، خصوصاً وہ جو اپنی جیب میں ایک ہی اشرفی

الدرین نے جا دوئی چراغ کو گرگڑا اور حضرت جن نے دنیا جہاں کی دولت اور اصل وجہاں ہر لاکھ قدروں میں ڈھیر کر دئے۔

یہ طریقے بھی شیخ جلی کی تدبیروں سے زیادہ نہیں ہیں۔ ایسے طریقوں سے کیا فائدہ؟ ہمیں تو ایسے طریقے آزمائے چاہئیں جو محفوظ بھی ہوں اور فائدہ مند بھی۔ اگر کم سوچیں اور اپنے گرد و پیش نظر ڈالیں تو ایسے طریقے دستیاب ہونا مشکل نہیں۔ ہم خدا ایسے طریقے نہ سوچ سکیں تو جیسا کہ کچھ بیان کیا گیا ہے، دوسرے کارسان تو موجود ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر خود حکومت موجود ہے جو عوام کو برابر ایسے طریقے سمجھاتی رہتی ہے۔ سیدنگ مرثیہ گلوں کا تو آپ کو غالباً پہلے ہی علم ہوگا۔ انعامی بانڈوں کو دیکھئے۔ یہ کتنے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی بدولت ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی لوگ مالدار ہو گئے۔ اور مزایا کہ اصل رقم حوں کی توں سلامت رہی۔ ایسی ہی ایکس ہیں جن سے ہم آج ڈھیروں زر مبادلہ کماتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ اس میں دوسروں یا حکومت ہی کا فائدہ ہے۔ دوسروں کی بھلائی اور حکومت کی اچھائی بالآخر ہماری اپنی ہی بھلائی اور اچھائی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہم خوش قسمت ہیں کہ آج حکومت ہماری اپنی حکومت ہے۔ عوام کی حکومت، ایک خیر خواہ حکومت جو عوام کی حالت کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے میں برابر کوشاں ہے جس کا واضح ثبوت وہ بے شمار منصوبے اور تدبیریں ہیں جو اس نے رفا و عامہ کی خاطر اب تک اختیار کی ہیں ظاہر ہے کہ اقتصاد کا مسئلہ بنانے میں بہت ہی اہم بنیادی مسئلہ ملتا ہے۔ اور آج کل کے مشینی اور سائنسی زمانے میں تو یہ قوموں کی خوشحالی اور بھلائی ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کے جینے مرنے کا سوال ہے کسی نے نہ کہ کوئی تو قاضی احماجات نہیں کہا۔ اسی لئے ہماری حکومت نے ملکی معیشت ہی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ایک اقتصادی کونسل قائم کر رکھی ہے۔ اور اس کے مشورہ، نیز دیگر مشیران کار کی صلاح کے مطابق وقتاً فوقتاً نئی نئی تدبیر اختیار کرتی رہتی ہے۔ انعامی بانڈوں کا شمار ایسی ہی نفع بخش تدبیر میں ہے۔

اور اب حال ہی میں ایک اور بہت اچھی تدبیر بھی کی گئی ہے جس کی بڑی ضرورت تھی اور جس سے بہت ہی عمدہ نتائج رونما ہونے لازم ہیں۔

مشرقی پاکستان ہوا مغربی پاکستان۔ ان میں بے شمار صنعتی، تجارتی اور کاروباری ادارے ہیں، جو اپنے اپنے طور پر ملکی ضروریات کو پورا کرتے اور ملکی معیشت کو بہتر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی کامیابی

یعنی بہت تھوڑا سا سرمایہ رکھتے ہیں، جنہیں اترے چڑھے بھاؤ شیر مارکیٹ فائدے نقصان کے امکان وغیرہ کا کوئی علم نہیں ہوتا، انہیں حصص اور امانیت یعنی سیکیورٹیوں کی خرید میں حصہ لینے کے مواقع سے بہرہ ور کیا جائے۔ وہ خود ان کی خرید و فروخت کرنے کی بجائے اس ادارہ میں جس کا پورا نام "نیشنل انورسٹمنٹ ڈیپازٹ ٹرسٹ" ہے، اپنی اپنی رقم جمع کر دے۔ اس طرح سرمایہ کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہو جائے گا۔ یہ سرمایہ ان لوگوں کی تحویل میں ہوگا جو حصص و امانیات میں بھی سرمایہ کاری کے مواقع سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اس نوعیت کے کاروبار کے ماہرین خصوصی ہیں۔

اس مشترکہ فنڈ کے عملاً استعمال کی صورت یہ ہے کہ سرمایہ تفریق قسم کی حالت میں لگایا جاتا ہے تاکہ چھوٹے درجے کے سرمایہ کار کا دوسرا ایک ہی آدمی نہ لگے جس سے اس کو نقصان کا احتمال ہو۔ تھوڑی بڑی دکانوں کے لئے تو معمولی نقصان بھی بہت ہے۔ اسلئے یہی بہتر ہے کہ سرمایہ کسی ایک جگہ نہ لگا جائے۔ اس طرح سرمایہ کار کو یہ سہولت ملتی ہے کہ وہ پونٹ ٹرسٹ کے ذریعہ گونا گوں سلسلوں میں سرمایہ لگائے۔

یہ بلاشبہ ایک بڑا سنہری موقع ہے اور آپ کو یہ جاننے میں یقیناً دلچسپی ہوگی کہ اس اسکیم کی پوری تفصیلات کیا ہیں۔ آئیے ہم اس پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

کسی پونٹ ٹرسٹ میں دو فریق ہوتے ہیں۔ ایک بندوبست اور دوسرا کارکنانہ دلی کا فیصلہ۔ انتظامی فریق حقیقت ایک انتظامی کمپنی ہوتا ہے۔ اور دوسرا ٹرسٹ بینک۔

یہ دونوں فریق مل کر ایک دستاویز مرتب کرتے ہیں جس میں دونوں کے اختیارات اور وظائف دیے جاتے ہیں۔ موٹی بات یہ ہے کہ انتظامی کمپنی ٹرسٹ کی سرمایہ کاری کا انتظام کرتی ہے۔ اور ڈویڈنڈ یا پونٹ سرٹیفکیٹوں کی واپسی کے بارے میں لائحہ عمل طے کرتی ہے۔ اس کے برعکس بینک، ٹرسٹ کے فنڈ اور دیگر املاک کا متکفل ہوتا ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں اور سرمایہ کاروں کے لئے بڑی حوصلہ افزا بھی ہے کہ میں جس ملک میں اس طرح کے ٹرسٹ قائم کئے گئے ہیں وہ بہت کامیاب اور چھوٹے سرمایہ کاروں کے لئے نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوئے ہیں بعض ممالک میں تو وہ ایسے مالیاتی ادارے ثابت ہوئے ہیں جو اور سب اداروں سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہوان چڑھے اور دنوں میں کہیں کہیں پہنچ گئے۔

یہاں تک کہ ان میں دلچسپی لینے والے سرمایہ کاروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچے۔ اس سلسلہ میں اکثر پونٹ ٹرسٹوں کا ریکارڈ حیرت انگیز ہے چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے دس سال ہی کے عرصہ میں بعض پونٹوں کے اثاثے ۵۰ فیصد کی حد سے بھی اس یا مکمل گئے ہیں۔

ایسے پونٹوں کی کارکردگی کے لئے بے انتہا مطالعہ قسم کی نگرانی لازم ہے۔ بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں سرمایہ کی مارکیٹ پوری طرح ترقی یافتہ نہیں ہے۔ اور غیر مستند عناصر کے استحصال سے بچنا ضروری ہے۔ دوسرے ملکوں میں پونٹ ٹرسٹ بھی ادارے ہیں لیکن ہمارے ملک کی بات اور ہے۔ اس میں سرمایہ کاری کی مارکیٹ ابھی ابتدائی نشوونما کی حالت میں ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کی عنایت کا حکومت ہی کے ہاتھ میں رہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا بھی گیا ہے۔ آگلاس کو حکومت کے ہاتھوں میں نہ رکھا جاتا تو اور کئی باتوں کی طرح جن کا ہم سب کو تجربہ ہے فق خودی اور دوسرے بد قماش لوگوں کی بن آتی۔ ہر طرح انہیں کی چاٹنی ہوتی۔ تنگ کینٹی جو بڑے بڑے صنعت کاروں اور ملک کے اہم مالی اداروں پر مشتمل ہے قطعاً ایک خدائی ادارہ ہے نہ کہ منفعت کو ش ادارہ۔ مدعا یہ ہے کہ ہمارے ملک کے جو لوگ مال و دولت سے بہرہ ور ہیں وہ اپنے کم حاشیت بھائیوں کو زیادہ خوش حال بننے میں مدد دیں۔ اور اپنی دولت کا کچھ حصہ اس کا بیڑہ میں لگائیں۔

ظاہر ہے کہ اس اسکیم میں بھی زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں گے۔ اور دوسری اسکیموں کی طرح اس سے بھی روپیہ گردش میں آئے گا یعنی ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں جائے گا، گھومے پھوٹے گا۔ اور ایک ہی جگہ جم سمٹ یا بند ہو کر رہے گا نہیں ہو جائے گا۔ یہ کاروبار، تجارت اور صنعتوں وغیرہ میں لگ کر اور بھی دولت پیدا کرے گا۔

اس طرح اس لوگوں کی دولت بھی ان کے پاس بند نہیں رہے گی بلکہ باہر اچھے اچھے دھندوں میں کام آئے گی۔ اس سے سب کو فائدہ ہوگا۔ اور اہل ثروت بھی اپنے دھن دولت میں ایسے لوگوں کو حصہ دار بنائیں گے جو زیادہ نہیں کما رہے ہیں۔ اس طرح ہر لحاظ سے توازن ہی قائم پیدا ہوگا۔ اور یہ سب آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ آپ چاہیں تو اپنی طاقت بھی سنوار سکتے ہیں اور دوسروں کی اوقات بھی بہتر جاسکتے ہیں۔ ویسے کام کے لئے تو ہم اپنے ہاتھ روک کر کچھ بچا بھی لیں اور اس بچٹ کی رقم ہاتھوں کو کوانٹمنٹ سرٹیفکیٹوں پر لگا دیں تو دونوں میں کہیں کہیں پہنچ جائیں گے۔

کے مطابق، معینہ میعاد پر تقسیم کر دی جائے گی۔
۷۔ حکومت پاکستان نے ان رقوم کو ٹیکس معاف قرار دیا ہے جو یونٹ سٹرنگٹوں پر لگائی گئی ہوں۔
۸۔ صوبائی حکومتوں نے یونٹ سٹرنگٹوں کی فروخت و انتقال کو اسٹامپ فیس سے مبرا قرار دیا ہے۔

۸۔ حکومت نے یہ بھی منظور کیا ہے کہ ہرنے اجرائے سرمایہ پر یہ شرط نافذ کی جائے کہ اس میں نیشنل انویسٹمنٹ کمیشن کے لئے معقول رقم شامل ہو۔ اس سے یونٹ ہولڈروں کی ایک بڑی تعداد کو یہ موقع ملے گا کہ وہ نئے سرمایوں کے اجراء سے سرمایہ میں جو اضافہ ہو اس سے فائدہ اٹھائیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے عمدہ منصوبے کا جلد از جلد جاری کر دینا ہی مناسب تھا تا کہ عوام اس سے فی الفور فائدہ اٹھا سکیں۔ لہذا ہمارے وزیر خزانہ جناب محمد شعیب نے بڑی مستعدی اور ذرا دلچسپی سے کام لیتے ہوئے گزشتہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی ۲۶ دسمبر کو اس نہایت اہم اور منفعت بخش اور داد کا افتتاح کروایا۔ اور اب مختلف دیکڑوں میں فروخت کا سلسلہ بڑی تیزی سے شروع ہو گیا ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ اقدام کا بروقت آغاز ہے اور یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا ہر شہری یہ سنتے ہی کہ اس قسم کا ٹریڈ قائم ہو چکا ہے، اس سے گہری دلچسپی محسوس کرے گا۔ اور چند افراد ہی نہیں بلکہ ساری قوم اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گی۔ بلاشبہ اس کے نتائج نہایت معرنا راں ثابت ہوں گے۔ ہمارے ملی خواہوں کی ایک اور شاندار تعبیر:

غالب کی تصویر آفرینی : بقیہ صفحہ ۲

میں دیدہ و زہوں، ابتداً خوف بھائی، وقت پیچیدہ بیانی اور فکر فتن
ان کا خاص رجحان بن گیا ہے۔ یہ ان کی تصویر سازانہ میں بھی ظاہر ہو رہے
اور جو صرف الحال میں ہی۔

مجھے چھوٹا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کی ان ذہنی خصوصیات
نے ان کی تصویر سازی کو بہاں انفرادیت اور ندرت بخشی ہے وہ ان کے
”عالم تصویر کی جلوہ گری پر کچھ پہرے بھی بٹھا دئے ہیں۔ مقابلہ و موازنہ
کچھ اچھی عادت نہیں مگر تیر کی تصاویر میں جو وسعت ہے، اس سے
ان کے حق میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مشاہدات کے وسیع تر رقبے
کے ناظر اور مبصر تھے جو اگرچہ غالب کی دسترس سے باہر تھا مگر
غالب نے اپنے ذہنی رجحان کی وجہ سے اس کو اپنے لئے قابل
اعتناء بنا لیا۔

انویسٹمنٹ یونٹ کی ایکم اسٹورج کے لوگوں کے لئے تو بہت ہی
مغیہ ہے۔ ورنہ نہیں جانتا کہ متوسط طبقہ ہی دراصل ہماری قوم اور ملک کی
کی بڑی ہے۔ یہ مضبوط تو وہ مضبوط، یہ کمزور تو وہ کمزور۔ اور جب اس
طبقہ کو طرح طرح کی اسکیموں سے فائدہ پہنچے گا اور یہ زیادہ آسودہ و خوش
حال ہوگا، تو بالآخر ساری قوم ہی مضبوط ہو جائے گی۔

ہمارے یہاں اس منصوبے نے جو مدت اختیار کی ہے۔ اس کے
مطابق انتظامی کمپنی کا نام ہے ”نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ“ جس کی شرکت
محمد وہ ہے۔ اس کے تمام شرکاء نے کمپنی کے ایک ایک لاکھ روپے کے
حصے خریدے ہیں۔ اس منصوبے کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہوں گی:
(۱) ٹرسٹ کے یونٹ سٹرنگٹ بنک دولت پاکستان اور اس کے
ایجنٹ۔ حبیب بینک لمیٹڈ، مسلم کرشل بینک لمیٹڈ اور یونائیٹڈ بینک
لمیٹڈ۔ فروخت کریں گے چنانچہ یہ سٹرنگٹ ان بینکوں سے حاصل کئے
جاسکتے ہیں۔ اس اسکیم کو مشرقی پاکستان میں وسیع طور پر پھیلانے کے لئے
ایسٹرن مرکٹنل بینک لمیٹڈ کو بھی ایجنٹ مقرر کیا جا رہا ہے۔ سٹرنگٹ
ابتدائی مرحلوں میں چیدہ چیدہ مرکزوں سے فروخت کئے جائیں گے۔ اگر
ضرورت محسوس ہوئی تو بعد میں اس مقصد کے لئے اور مرکز بھی قائم کئے
جائیں گے۔

(۲) سٹرنگٹ ۵، ۱۰، ۱۰۰، ۱۰۰۰ اور ۱۰۰۰۰ روپے کے
یونٹوں پر مشتمل ہوں گے کسی یونٹ کی قیمت فروخت ابتدائی مرحلے میں
۱۰ روپے ہوگی۔
ابتدائی دور کے بعد قیمت، ٹرسٹ کے اثاثے کے مطابق، کرٹ
میں قیمت کے مطابق بدلتی رہے گی۔

(۳) انتظامی کمپنی نے خصوصی رعایت کے طور پر ابتدائی دو برس
سٹرنگٹوں کی فروخت پر ابتدائی مجرا کی وصولی معاف کر دی ہے۔ اس ابتدائی
مجرہ میں سے فروخت کرنے والوں کو کمیشن واجب الادا تھا۔ اس امر کے
پیش نظر فروخت کرنے والے بینکوں نے یہ منظور کیا ہے کہ وہ یہ کام بلا معاوضہ
کریں گے۔

(۴) جب بھی کوئی چاہے ٹرسٹ کے یونٹ سٹرنگٹ ٹرسٹ
کے منظور کردہ ایجنٹوں کو واپس کر کے نقد قیمت وصول کر سکتا ہے۔ اگر اس
دورانی میں یونٹوں کی قیمت بڑھ گئی ہو تو فروخت کرنے والے کو بڑھی ہوئی شرح
کے مطابق رقم دی جائے گی۔

(۵) انتظامی کمپنی وقتاً فوقتاً یونٹوں کی فروخت اور دوبارہ قیمت
خرید کا اعلان کرتی رہے گی جو ٹرسٹ کی سرمایہ کاری کی قیمت پر موقوف ہوں گی۔
مذکورہ بالا تمام شرائط و ضوابط ۱۰ مارچ ۱۹۹۳ء کو نافذ

جسیم الدین ————— بقیہ صفحہ ۱۲۷

لکھ ڈالے، دنیائے پڑھے، دنیائے جلنے
لیکن اٹھ چڑھا ہے کے دکھ کی باتیں
کس کو خبر کے معلوم ا
اُن کو ہنسی کی تان بتا سکتی ہے
چرواہے کے اٹھ رول کی لوح کے اوپر
صدیوں کا اک درد دکھا ہے
اس کو ہمارے شاعر نے کب شعر کے اندر نظم کیا ہے۔
میں اس درد کی — چرواہے کے دل کی تڑپ کا
کھوج نکاؤں

جب دھرتی پر کالی دھروں میں
دھرتی کی آواز، زمین کے دل کی دھڑکن
مجھ سے بات کیا کرتی ہے۔

شاعر گیت لکھا کرتے ہیں بر ندان کے
دیوتاؤں کی عجیب کرامتوں کی باتیں
بادشاہوں اور شہنشاہوں کے دکھ سکھ کی
لیکن کھیت کے بیٹوں کے دل کا بھید کسے معلوم!

جسیم الدین نے ملک کے نو بہاؤں کو بھی اپنے کلام کے انمول
خزانوں سے محروم نہیں رکھا ہے اور بچوں کے ادب کو مالا مال کرنے
کے لئے کئی اہم کتابیں ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلے
میں بھی ان کی ذہانت اور تحریر کی دل آویزی نمایاں ہے۔ ہر کتاب
بچوں کی نفسیات، مزاج اور افتاد طبیعت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔
میں ”بجاشو“ اور ”پیشیر بانسی“ (ایک پیسہ کی بانسی) بچوں میں بڑے
شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

جسیم الدین بڑے لطیف ذہن ہیں جس میں مکھڑ اور دل موہ لینے والی
شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کے مزاج میں گھنگنی اور باتوں میں رس ہوتا ہے۔
جنگل ادب طرز و مزاج کے سد بہار رنگوں سے بھی خالی نہیں اور جسیم الدین نے
اپنی باغ و بہار طبیعت کے جوہر اس میدان میں بھی دکھائے ہیں۔ ان کے
فکا ہی افسانوں کا ایک مجموعہ ”جنگلیرا نشیر گلہو“ (ہنسی کی برنگلہ کہانیاں)
بھی شائع ہو چکا ہے اور ان کی طبیعت کی گھنگنی، لطافت اور البیلا پن ان کہانیوں
میں جا بجا جھلکتا ہے بلکہ بقیل قافی تھیں یہ تحریریں ”ہمارے مزاجیہ ادب کے
سرایہ میں ایک بیش قدر اضافہ ہیں“۔

سنہری بالوں والی شہزادی: ————— بقیہ صفحہ ۱۲۸

اس نے کہا: ”اے موتی! میری بادشاہت واپس مل جائے؟“
اس نے دیکھا، وہ شاہی لباس میں گھڑا تھا اور درباریوں
سائے میں مرجھانے کھڑے تھے۔ اس نے کہا: ”اے موتی! میری سونے کے
بالوں والی شہزادی واپس مل جائے؟“

اس نے دیکھا، سونے کے بالوں والی شہزادی اس کے سامنے
کھڑی تھی۔ اس نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اور جب یہ سب کچھ
ہو چکا۔ سو داگر کے بیٹے کو اس کی بادشاہی مل گئی، اس کے سونے کے
محل واپس مل گئے، اس کی سونے کے بالوں والی شہزادی اس کے
پاس آگئی تو طوطا ادب نے اس سے کہنے لگے: ”اے بادشاہ! اب ہمیں
رضعت کر دے!“ اس نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے:
”ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہیں اپنی قیمت دلائیں گے۔
ہم نے وہ وعدہ پورا کر دیا۔ اب ہمیں جانے کی اجازت دے!“
اس نے انہیں بہت روکا مگر طوطا اور بتی نہ مانے اور وہاں سے
چل دئے۔

اس واقعہ کو بیتی ہوئے صدیاں گزرتی ہیں مگر سنا ہے لوگ
اب بھی بتائیں اور طوطے اس لئے پالتے ہیں کہ شاید کہیں وہی طوطا بتی
مل جائے جو سانپوں کے بادشاہ کے دئے ہوئے موتی والی انگشتری کے
بارے میں جانتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سو داگر کے بیٹے کے
مرنے کے بعد وہ موتی پھرا پئے آپ سانپوں کے بادشاہ کے پاس
واپس پہنچ گیا تھا۔ اسی لئے سپرے سانپ کھڑے ہیں کہ شاید
وہ سانپ پھرا پئے باپ سے ناراض ہو کر چلا آیا ہو!

ادارہ کو تمام پاکستانی اہل قلم کے حالات
درکار ہیں۔

التماس ہے کہ وہ اپنے حالات جلد ارسال
ہمیں ہتیا فرمادیں۔

(ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس کراچی)

”راہ سخن واکرے کوئی“

د-خ

ہے۔ اور تاروں اور دریا کی روانی کی وہ تصویر بھی جو اس کے بعد پیش کی گئی ہے۔ اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ افسانہ کی لے نہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کا سلسلہ کچھ اور آگے بڑھتا ہے۔ ”اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا“ تو ضرور کہتا۔ یہاں بھی مقررہ کے راوی کا روپ چانے میں تنازع ہی کی کرشمہ آرائی ہے۔ اسکے بعد سرورق کے ان اشعار کی صداقت میں کوئی شک نہیں رہتا کہ:

خوش شید کو کچھ حاجت زیور نہیں زہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو بے بیکار
اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجت اظہار
خود مشک ہو خوشبو نہ کہ خوشبو کہے عطار
ٹائپ میں طبع شدہ یہ رسالہ جو عطار کی خدمات سے بے نیاز
ہے مصنف سے ۱۳/۱۱/۱۳۷۱ء جماد الثانیہ روڈ کلکتہ سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

دور جدید کے عنوان — حالی، کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اپنے پیر مغال، سر سید علیہ الرحمۃ کی طرح وہ بھی ہماری اچانے ثنائیہ کا نفس نا طبق تھے — تنقید میں ایک نئے تصور اور دستور العمل کے بانی مبنی۔ نثر میں ایک خالص نثری اسلوب کے حامل۔ اور شاعری میں اولین شخص جس نے وہاں زخم سے راہ سخن واکرے — زندگی ہو، یا تنقید یا ادب، وہ بدستور زندہ ہیں اور ان کا اثر کار فرما۔ انہوں نے تنبیہ کی تھی کہ..... حالی نہ چیرنا تھا۔ دور خزاں کا قصہ فصل گل و سمن میں۔ آج جب بہار ہی بہار ہے۔ حالی شیوا بیابان کو یقیناً دور خزاں کی شکایت نہ ہوئی۔ اور اگر بعد کے حریفانی بچہ فگن کی اکھاڑ کچھاڑ کے باوجود وہ زندہ ہیں تو ان کے ساتھ ان کی صف کے دوسرے لوگ بھی زندہ ہیں۔ ان کی پورے برابر تانہ ہے سب سے پہلے سر سید رح۔ اور پھر درجہ بدرجہ وہ اشخاص جنہوں نے ان کے جہد میں یا ان کے بعد ان کا سلسلہ جاری رکھا۔

وہاں زخم ہونہ ہو، راہ سخن تو کسی نہ کسی طرح وا ہو ہی جاتی ہے۔ جیسی کہ پروفیسر میرزا حسن غازی کی ایک حالیہ مطبوعہ تقریر پر جنرل ”اقبال“ (شائع شدہ کلکتہ) سے وا ہوئی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:۔ ”ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ باوجود کوشش کے اقبال شعر نہ کہہ سکے۔ خیال ہوا کہ شاید شعر کہنے کی قوت و توفیق قدرت نے سلب کر لی ہے۔ مہجوراً اردو نثر لکھنے کی طرف توجہ کی اور تقریباً ایک سال تک بس اردو نثر ہی لکھتے رہے۔ ایک رات ہاتھ سر پر لگائے آسمان کی طرف تاروں کو دیکھ رہے تھے کہ دفعتاً دل میں ایک دلولہ اٹھا اور جوش میں آکر شعر گوئی کی طرف خود بخود مائل ہو گئے۔ پھر کیا تھا شعر دریا کی مدائی کی طرح زبان سے نکلنے لگے۔ اور شعر گوئی کی یہ روحانی آخر وقت تک جاری رہی اور کمی نہ ہوئی۔“

بڑی مشکل سے ہوتا ہے جن میں دیدہ وریدا۔ اور جدید وہ ہیں وہ اصل حقیقت کو بھانپ بن گئے ہوں گے کہ اس حکایت یا روایت کا سرچشمہ سر عبد القادر مرحوم ہیں۔ جنہوں نے اس کو ”بلبل را“ کے دیباچہ میں نقل کیا ہے۔ مگر جیسا کہ افواہوں کے سلسلے میں اکثر ہوتا ہی ہے بات پہلے راوی سے دوسرے راوی تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔ بانی روایت نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ جب حکیم ملت ولایت تشریف لے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ کس طرح شب و روز سرگرم کار رہتے ہیں۔ اور جس نذر دشواری سے ہمارے یہاں کے لوگ شعر و شاعری میں غرق بلکہ غافی الشعر رہتے ہیں، اس کا لہرپ میں شائبہ تک نہیں۔ اس لئے وہ ترک شعر گوئی پر آمادہ ہو گئے تھے ادا انہوں نے مرید غفران کو یہ حکم دیا تھا کہ۔ جو کام کچھ کر رہی ہیں تو میں انہیں بذریعہ سخن نہیں ہے۔

دوسرے راوی نے اس کی جو تفسیر کی ہے وہ اس ہی کا حصہ

چونکہ تحریک پاکستان کی جڑیں درحقیقت اسی دور کے ارباب فکر و عمل کی سرگرمیوں میں پیوست ہیں۔ اس لئے دور آزادی میں ہجرا طور پر ان کو خصوصاً مرکز توجہ بنایا گیا۔

اس قافلہ کے سالار اعظم سرسید تھے۔ جو اسلامی نشاۃ الثانیہ کی روح رواں ہوتے ہوئے دو قومی نظریہ اور بالآخر تحریک پاکستان کے حقیقی بانی مبنائی بھی تھے۔ یہ حقیقت قبل ازیں نظروں سے اوجھل رہی۔ لیکن قیام پاکستان پر اسباب و علل کی تلاش نے اسے واضح و آشکار طور پر ظاہر کر دیا۔ چنانچہ ”ماہ دو“ ہی میں بعض مضامین شائع ہوئے جن میں سرسیدؒ کے اس مرکزی کردار کی توضیح کی گئی تھی۔ وہ کردار جو انہوں نے تحریک پاکستان کے محرک ادلی کی حیثیت سے ادا کیا تھا۔ اور جس کا سلسلہ بعد میں اقبالؒ اور قائد اعظمؒ تک جاری رہا۔ اس سے قطع نظر بعض اور امور بھی ہیں۔ سرسیدؒ اور

ان کا دور درحقیقت اُن گونا گوں مسائل کا آئینہ دار ہے جو دور جدید کے طلوع ہونے پر نمودار ہوئے تھے۔ ان میں سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مسائل کے علاوہ زبان، ادب اور تعلیم کے مسائل بھی تھے۔ چونکہ سرسید اور ان کے رفقاء کے کار کی حیثیت مقیاس حیات کی تھی، اس لئے انہیں ان سب معاملات کی طرف اعتنا کرتے ہوئے منارہ ایقانات کرنے پڑے۔ آج کم و بیش ایک صدی کے بعد حالات کہاں کہاں کے کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اور ہمارے واقف ہونا تو کیا ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ خصوصاً سرسیدؒ نے جو کچھ لکھا یا کیا تھا۔ یاد دہانی کے بارے میں بیان اور تحریر کیا تھا، وہ بڑی حد تک ہماری نظروں سے پرے ہٹ چکا ہے۔ اور ہم اس سے مطالعہ و تحقیق ہی کے ذریعہ روشناس ہو سکتے ہیں بلکہ حالات میں یہ ضروری تھا کہ اس اہم دور اور اس کی قائدین شخصیت کو پھر ہمارے قریب لایا جائے اور موجودہ حالات و ظروف کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان دونوں پر نئے سرے سے روشنی ڈالی جائے۔

مولوی محمد آجین زبیری مرحوم کی تصنیف ”تذکرہ سرسید“ میں، جسے یونائیٹڈ پبلشرز لاہور نے شائع کیا ہے، ان امور کا بوجہ احسن اہتمام کیا گیا ہے۔ سوانح نگاری میں ذہنی کاوش سے زیادہ یہ سلیقہ درکار ہوتا ہے کہ کسی فرد کے حالات، کوائف اور اس کی شخصیت کے اہم پہلو اچھی طرح سامنے آجائیں۔ اور یہ بھی حتی الوسع معروضی پیرایہ میں۔

اس لحاظ سے یہ کوشش خاصی کامیاب ہے۔ اس سے اس دور اور سرسیدؒ کی واضح تصویر نظروں میں پھر جاتی ہے۔ عام طور پر معلوم و معروف امور کے علاوہ ایک مستقل باب دو قومی نظریہ اور زبان و تہذیب کے مسائل کے لئے وقف ہے۔ جو بالوقوع و بالفعل تحریک پاکستان کے محرکات ہیں۔ سوانح اور شخصی اوصاف بجائے خود دلچسپ ہیں جن میں سرسیدؒ کی فکر سلیم، معادہ فہمی اور علمی صلاحیت خاص طور پر نمایاں ہیں۔ جدید ناظران کے فیہر علی ادراک و فہم، تجربہ علمی، ذوق تحقیق، روشن خیالی، شوق و شغف، نمونہ پختہ صحیح نباض اور حالات کے مطابق تبدیلی، روش سے متاثر ہوتا ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے اکثر فکری، دینی، تعلیمی، تہذیبی، تعمیری اور اصلاحی معاملات کا سنگ بنیاد سرسیدؒ ہی نے رکھا۔ اولیات کی ہمیں انہیں نے سرکیں۔ پیش قدمی ان کی اور پیشرفت دوسروں کی۔ چنانچہ سرسیدؒ نے اور اقبالؒ نے بعد میں انہی کے روشن خیال مشرب حیات کی بنا پر علامات تعمیر کیں۔ یہ سرسیدؒ ہی تھے جنہوں نے نئی تصورات، معتقدات اور رسم و رواج کو بدلائل و شواہد حقیقی اسلام سے دور ثابت کر کے ایک زندہ مذہب کو قابل اختیار قرار دیا۔ اور یہی روش ہے جس پر فکری و عملی حیثیت سے آج صدر پاکستان بھی گامزن ہیں۔

مرتب خود اسی دنیا کا فرد تھا جسے سرسیدؒ نے پیدا کیا تھا۔ اور جس میں کم و بیش اسی وضع کے بے شمار انسان پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے گو اس کی اٹھان وہ نہیں پھر بھی وہ اسے پیش کرنے میں کافی کامیاب رہا ہے۔ بالخصوص ایسے دور کے لئے جو نہ اُس کا دور رہا ہے نہ سرسیدؒ کا۔ یہ کہ ہم اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، کتاب کے لئے بھی اعتبار افزا ہے اور مرتب کے لئے بھی۔

تحریر میں سبک سرسیدؒ کی سلاست بھی جھلکتی ہے اور قدیم بھی۔ پیشکش — طاعت، کتابت، صحت اور کاغذ — کا اہتمام حسب وخواہ نہیں۔

سرسیدؒ ہی کی ادبی کف کے دو اور فرد ہیں؛ محمد عزیز مرزا اور سید وحید الدین سلیم جن کے ”مجموعہ تصنیفات“ کو انجن ترقی اردو پاکستان نے ”خیالات عزیز“ اور ”مضامین سلیم“ کے نام سے پیش کیا ہے۔ حال میں انجن نے اس قسم کی بہت سی کتابیں شائع

بابر کی آواز سنی (گذا) نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر ٹھانڈوں کی خانہ جنگیوں کی بدولت ہندوستان میں پالوں رکھنے کی جگہ پائی تھی کہ عام روایت کے بموجب جنت پداری کے جوش میں اپنی جان بیٹے کی صحت پر قربان کی اور اس کا لاڈلا بیٹا ابھی عروس سلطنت سے ہم آغوش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پٹھانوں کی متفرق قوت شیر خاں کی حوصلہ مندی کی شکل میں نمودار ہوئی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی استعارہ آمیز انشا پر داری لوٹ بچہ آج کل کے سنجیدہ ذوق کے منافی ہے جسے صاف سیدھی، سلیجی ہوئی، تیرہ بات ہی پسند ہے۔ مذکورہ مضمون سارے کا سارا "قصص ہند" کے پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ اور جدید قاری کے لئے اس کی چند سطروں عبور کرنا بھی دشوار ہے۔ اس لئے کہ انداز بیان بالکل تھکری ہے اور جو اسلوب تاریخ یا سوانح نگاری کا ہونا چاہئے، وہ یکسر مفقود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں تاریخ کا سچا تلاء، تینیں اسلوب ابھی تک کم ہی پیدا ہوا ہے۔ بد قسمتی سے انشا پر داری کے پرانے تصورات اب بھی ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور تنقید کی ایک بہت بڑی ہم یہ ہے کہ ادب و فکر کے راستے سے اس سنگ میل کو پرے ہٹایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خود تازہ فکر کی ضرورت ہے جس میں جدید عالمی انداز نظر اور بصیرت کو زیادہ سے زیادہ سمویا گیا ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو جس چیز کو فی زمانہ ادب و فکر کا اصطلاحی یا جمود قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے۔ کیا ہمارا شعور اس اہم تقاضے سے عہدہ برآ ہو سکے گا یا نہیں۔ ہماری آنکھ ترقی کا دار و مدار تین م تر اسی بات پر ہے۔

کہتے ہیں تلخ عمل کو دیکھ کر ایک فرنگی خاتون نے بے اختیار یہ کہا تھا کہ اگر اسے یقین ہو کہ وفات پانے پر اسے بھی ایسا ہی شاندار مقبرہ نصیب ہو گا تو وہ بھی مرنے کو تیار ہے۔ محشر بدالوئی کے "شاعر نامہ" کو دیکھ کر جس کے جنت جنتہ او، اق دوش ہوا اور اس سے بڑھ کر دوں خنہ ہار اڑتے ہوئے چھوٹوں بڑوں سب تک پہنچتے ہی رہے ہیں۔ اور اس کے خنہ پارے ہیں بھی چھوٹوں بڑوں سب کے لئے۔ اگر کسی شاعر کے دل میں یہی تمنا پیدا ہو تو عجب نہیں "محشر نامہ" کہے شاعر نامہ کو "حقیقہ ہوشیار پوری" کے ان الفاظ نے اس کو تاریخ بنا دیا ہے۔ گو وہ خود اس محشر نامہ عرف شاعر نامہ میں شامل نہیں ہیں کیونکہ ہماری طرح ان کے لئے بھی۔ روز محشر کہ جاگداز بود۔ ابھی دور ہے جن نگار

کی ہیں جو خالقاً حسن کار کردگی کی ایک پُر زور ہم کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کے مسودات بابائے اردو کے فراہم کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جواب کافی عرصہ کے بعد منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اور بھی کئی اداروں نے ماضی کی ایسی ہی کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جو اپنی جگہ خوب ہے بشرطیکہ ان کا صرف یہی مصلح نظر بن کر نہ رہ جائے۔ اور جس قسم کی تازہ بہ تازہ فوہو اعلیٰ تخلیقی تصنیفات بروئے کار آتی چاہئیں، ان کی تعداد برائے نام ہو۔ موجودہ صورت حال کچھ اس کا کے لگ بھگ ہے۔

کہنگی کو تشریف نوری پہننے کا اتنا فائدہ ضرور ہے کہ جن مصنفین کو کسی زمانے میں شہرت حاصل رہی ہے ہم ان کے افادات سے پھر روشناس ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں ان کی شہرت اور افادیت کئی مرحلوں سے گزر چکتی ہے۔ اور اس کا چال بسا اوقات اچھے سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً "خیالات عزیز" کو نواب وقار الملک مرحوم نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"اب اس دیباچہ کے ہیرو مولوی عزیز مرزا صاحب کے اس مجموعہ تصنیفات کو امید ہے کہ تمام پبلک بلا لحاظ قوم و ملت یکساں دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرے گی اور مصنف کو دعائے خیر سے یاد کرے گی۔"

دعائے خیر تو بہر حال لازم ہے لیکن یکساں دلچسپی کے امکانات بعید نظر آتے ہیں۔ ہم دیباچہ میں بڑے شوق سے "ادبی و لٹری فریڈم" "لٹری مشاغل" "لٹری قابلیت" کا تذکرہ ان الفاظ میں پاتے ہیں کہ "آج ان کا شمار ملک کے مشہور و معروف جادو نگاروں میں ہے اور۔ سر سید مرحوم کے لکھے ہوئے علمی جہن کے پہلے موسم گل کا لیک خوبصورت و شاداب پھول ثابت ہوئے۔" مگر دیباچہ کے ہیرو میں کوئی ایسے تیور نظر نہیں آتے۔ اسے بہن و اسفندوار کا حریف بنادیں اس کے طرز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پر مولانا محمد حسین آزاد کا سایہ ہے۔ جن کی کہتے ہی ادیبوں نے ریس کی ہے اور بہک گئے ہیں۔ بلکہ اب تو یہ بات بھی غوطہ ہے کہ وہ خود اپنی ہی سے کس قدر بہکے ہوئے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ کا پہلا ہی مضمون "اکبر اعظم" بری طرح اس حقیقت کا غماز ہے۔

"نام کو اللہ اکبر کیا ترے توفیر ہے داخل ہر باغک ہے شامل بہر تکبیر ہے

جگہ پیدا کر لی ہے۔ ”چاقو“۔ آپ اسے روشنی کہہ لیں۔ شیشہ اور خوب بولتا ہوا پنجابی لفظ۔ پنجابی میں مضامین کے اس اولین مجموعہ کی برعکس حکایت کرتا ہے۔ زبان، لیکچر، شہباز ملک، کی اپنی ہی زبان تھی۔ اس نے اس کا بھی بھر کر جا دو جگا یا ہے موشگاف عام پاکستانی دلچسپی کے موضوعات ہیں۔

سال نو کی تشریف آوری کے باعث آج کل ہمارے رسائل و جرائد کے خصوصی شماروں کا دور معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت خود شہباز ہے۔ اس کے علاوہ کراچی ہی کے دو ماہناموں ”نگار“ اور ”جام نو“ کے خاص شمارے بھی ہیں جنہیں خاص خاص کہنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اسی اہتمام ہی سے پیش کئے گئے ہیں۔ دونوں خاصے وزن دار۔ یوں بھی اور یوں بھی۔ یعنی ظاہری اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی۔ انھوں نے دونوں افسانہ نگار ہیں۔ اس لئے کہ پہلے کی طرح اب بھی لوگ افسانہ نگار کہتے ہیں۔ ”نگار“ میں ”روپ روپ“ کے تحت جس طرح روپ و نٹ کا رویہ سنوارا گیا ہے۔ وہ اپنی انشا ہی کا حصہ ہے۔ یہ چہ خوار، یہ بھولپن سے بہتے ہوئے ایسی ایسی کائناتیں چالیں کہ چمکیوں پر چمکیاں لیتے جائیں اور کوئی آف ذکر سکے ”مگر“ انشا ہی کی بات ہی کیا ہے۔ وہ یکمیل برسوں سے مکمل رہے ہیں جسے کوئی دیکھتا ہی نہیں۔ کون ہے جو بھولے سے ہڈے انشا کی طرح پھوٹے انشا کے بارے میں بھی یہ کہہ دے کہ اس نے ایجاد کی تھی میں ظرافت کے پھول لگائے ہیں۔ کوئی محمد حسین آزاد ہو تو یہ بات کہے۔ اور ہم آپ آزاد نہیں ہیں۔ اسی لئے کسی نے ابھی تک انشا کو قکاہ کی سند نہیں دی۔

دونوں رسالوں کے خصوصی شماروں میں نام بھی اچھے کام بھی اچھے ہیں۔ اور شاید ان کے دام بھی اچھے ہی ہیں۔

”صدف“ کراچی پورٹ ٹرسٹ کا ماہنامہ رسالہ ہے جس میں زیادہ تر اسی ادارہ کے اراکین ہی حصہ لیتے ہیں۔ اور ”گہر میں جیب“ میں اس کی تمام بیکار نہ رہی۔ پھر بھی جو کچھ ہے خوب ہے ”صدف“ نے اپنے ہی موتیوں پر قناعت نہیں کی بلکہ دور نزدیک سے امداد کے موتی بھی سینے کی کوشش کی ہے۔ جو بہت اچھا ہے۔ اس کے ذوق و شوق کی جیسی علامت۔ اس لئے کہ — سماج کو نہیں پہناتے فطرت میں مرا سودا! ۹

سے قطع نظر پیش کش کے باب میں روایتی حسن کاری بھی اس میں ذوقِ تاملہ قدم کرشمہ کار ہے۔ اس لئے کیا اس کے محشر نامہ ہونے میں کوئی شک ہے؟ یہ جنس گراں مایہ کسی قیمت پر بھی ارزاں ہے۔

ریپلیکا ہی کی ایک اور حالیہ پیشکش اصغر ٹ کا چار بابی ڈرامہ ”امانت“ ہے۔ اردو میں ایک نادر صنف کا نادر منظر۔ پلاٹ دوہری بلکہ تہری مثلثوں یا مثلث نماؤں سے گزرتا ہے۔ ایک تہری یعنی ہیر شہزادہ ایک جنگلی یعنی جنگلاتی افسر اور ایک سید سے سادے انسان سے ہوتے ہوئے مثلثیں اور مثلث نمائیں تبدیلیاں چھٹی جاتی ہیں اور بالآخر وہی ضلع رہ جاتے ہیں۔ جن کے اولاد مل جانے کا کوئی گمان نہیں ہوتا۔ گو سجدہ قاری کا ماتھا پہلے ہی ٹھنک جاتا ہے۔ کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا یا اسے بٹھایا جائے گا۔ یوں جس واقعہ پر پلاٹ کی بنیاد ہے وہ ہونے سے زیادہ بنانے سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس بنانے اور مثلث نماؤں سے دو ضلعوں تک پہنچانے میں جس صفائی سے کلام لیا گیا ہے۔ وہ بہت خوب ہے۔ اور اس صفائی کے معنی ہیں چابکدستی۔ استادانہ ہنرمندی۔ بات اور اس کے ساتھ بات چیت کو ڈرامائی سلخے میں ڈھالنے کا سبھاؤ۔ بلکہ ان کو ڈرامائی رد میں بہا دینا۔ ایسے کہ وہ نہایت بے تکلفی سے اس میں پہننے لگ جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خاصے ہیر بھی کی ضرورت ہے۔ ایسے پلاٹ کے لئے زیادہ تر طبیاعتی اور اس سے بھی زیادہ زندہ دلی اور بذاتہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ کہنا کہ ڈرامہ نگار نے شروع سے آخر تک ایسا سلسلہ پیدا کر دیا ہے۔ ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ یہ کہ وہ ان تمام ڈرامائی صلاحیتوں سے بخوبی بہرہ ور ہے۔

بہر حال امانت مختلف باتوں سے گزرتے ہوئے بلا خیانت صبح باتوں تک پہنچ جاتی ہے۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ کو لکھنے پھاڑتی ہے۔ اور یہ وہ عین وہیں گرتا ہے جہاں گرنا چاہئے۔ بڑے ہی ڈرامائی طور پر اس کے بعد کچھ کہنا امانت میں خیانت ہے۔ اور ہم اس دست بردست سلسلہ میں چوتھی مثلث بننا پسند نہیں کرتے۔

ایک نگاہ غلط اندازہ پنجابی کی طرف بھی۔ آج کل اس زبان میں خاصی ہنگامہ آرائی دکھائی دیتی ہے۔ اور لکھنے والے کافی ذوق و شوق سے رسالے بھی شائع کر رہے اور کتابیں بھی۔ بلکہ بعض اردو اخباروں اور رسالوں نے بھی عام دلچسپی کے پیش نظر پنجابی نقوش کے لئے مستقل

فردوس جو فردوس نہیں : بقیہ صفحہ ۲

کشمیری عوام اپنی رائے کا بہترین استعمال کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کا یہ بنیادی حق اُن سے نہیں چھینا جاسکتا۔ اس لئے انہیں آزادی دلوانے کی جدوجہد برابر جاری رہے گی۔

ابھی کراچی میں جو آخری اجتماع ہوا تھا اس سے قبل گلستان کے ایک فوجی ممبر و ماہر نے جو چومکا دینے والے حقائق بیان کئے انہیں سامنے رکھا جائے تو وہ گہری سوچ بچار اور کسی فیصلہ کن نتیجہ کی اہمیت کو اور بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ دیوار پر کی تصویر تو بہر حال موجود ہی ہے۔ اور یہ تحریر کشمیر کے کہساروں کی دیوار پر بھی موجود ہے، اگر ہم اسے پڑھنے کی رحمت گوارہ کریں اور یہ تحریر بخیر زندگی نظر آئے اور تاریخی جسور حقائق کے اور کچھ نہیں۔ ماعتبر دیوالی اللہ بھاء

کچھ تجزیہ پیش کی ہیں ظاہر ہے کہ تقسیم کی تجویز تو کسی حال قابل قبول نہیں ہو سکتی سب یہ مذاکرات کلکتہ میں ہوں گے۔ اور بھارت کو سوچنے کا بڑا موقع ہے، خاص کر اس امر کے پیش نظر کہ اگر دو پیش منڈلانے والے خطرات زیادہ سنجیدہ طریق فکر کی دعوت دے رہے ہیں۔

مسئلہ کشمیر کلکتہ میں ہونے والی متوقع بات چیت کس پہنچ پر ہوگی اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اس پر جتنی رائے کا اظہار اس وقت ممکن نہیں۔ تاہم ایک بات ضرور کہی جاسکتی ہے، جس کی طرف خود صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے بھی اشارہ کیا ہے۔ آپ نے لندن کے اخبار "سٹنڈے آبزرور" کے نمائندے کو راولپنڈی میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان کا موقف شروع ہی سے یہ رہا ہے کہ اہل کشمیر کو اپنی رائے ظاہر کرنے کی آزادی ملنی چاہئے۔

علمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ : بقیہ صفحہ ۳

کرتے وقت زبان الٹ جاتی اور لپٹ کر دہری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "مغروف" وہ آواز ہے (ل) کہ بوقت تلفظ زبان کے کناروں سے ہوا سرسرا کر نکل جائے۔ voiced کا ترجمہ مصیبت (= آواز دینے والا) اور سمر (= سنا ہوا) کیا گیا ہے۔ مجبورہ ان سے بہتر ہے، اس لئے کہ ان آوازوں میں ایک طرح کی جھٹکا رہتی ہے۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے مجبور (= جہر اور جھٹکا والا) سے بہتر لفظ جاری زبان میں نہیں۔ اس کے مقابلے کی آوازیں کمزور اور دھیمی ہوتی ہیں۔ انگریزی میں انہیں (unvoiced) کہتے ہیں۔ اہل اردو نے اس کا ترجمہ غیر مصیبت (= جس کی آواز نہ ہو) کیا۔ یہ اصطلاح اور اس کا ترجمہ دونوں غیر واضح ہیں۔ ان سے آوازوں کی حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی۔ میں نے مجبورہ (= دھیمی آواز والے) تجویز کیا ہے جو ان آوازوں کی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ سنسکرت میں مجبورہ کو گوش دت (= جھٹکا والا) اور مجبورہ کو گوش دت کہتے ہیں :

ہے۔ اس کو سمجھ کر پہلوئی ایک نیا لفظ گھڑنے کی کیا ضرورت ہے جس کی افادیت اور موزونیت دونوں مشکوک ہیں۔

یہاں سے ایک اصول یہ دریافت ہوا کہ اصطلاحات کا ہمارا زبان میں کوئی قدیم ترجمہ موجود نہ ہو تو نیا لفظ وضع کیا جائے۔ وضع اصطلاح میں عموماً لغوی معنی کو سامنے رکھ کر اس کا لفظی ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے CEREAL (مغنی) LATERAL (پہلوئی)

(منفوس، نفسی) VOICED (مصیبت) وغیرہ۔ یہ درست نہیں۔ لغوی معنی کی جگہ اصطلاحی معنی کو پیش نظر رکھ کر ایسا لفظ وضع کرنا چاہئے جو اصطلاحی مفہوم کو واضح کر دے اور تناوش ہو کہ نہ بدترشح تعریف کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ترجمے کا مقصد اصطلاح کی توضیح ہے جو اصطلاح کے لغوی مفہوم کی رعایت اور اس کے پابند لفظی ترجمے سے نہیں، اصطلاحی مفہوم کو اردو میں منتقل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً مغنی (= داخلی) سے ہمیں کوئی روشنی نہیں ملتی۔ اس کے مقابلے میں لغوی (= لپٹے ہوئے) سے پتا چلتا ہے کہ یہ وہ آوازیں ہیں جن کو ادا

میر کی عشقیہ مثنویاں : بقیہ ص ۳۰

”جذب الفت“ (قاظم)، ”نیرنگ عشق“ (مرزا علی لطف)، ”سحر المحبت“، ”جذبہ عشق“، ”شعلہ عشق“ اور ”گلزار محبت“ (معنی) ”حسن و عشق“ اور ”پارسا نامہ“ (سبیل فیض آبادی)، جعفر علی خاں راعب دہلوی کی ایک مثنوی شامل دیوں، ”سراپا سوز“ (قاضی خیر) ”سوز و ساز“ (طالب علی خاں)، شیخ عبدالرؤف شعور شاگرد معنی کی مثنوی، ”آہ و زاریِ مظلوم“ (مومن)۔

لکھنؤ پر جب تک دہلوی اثرات رہے وارداتِ عشق کی مثنویوں میں میر کی تقلید فرض تھی۔ جب لکھنؤ نے دہلی سے اپنی برأت اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو مثنوی میں بھی اپنی ذرا جدا نکالی۔ ادھر زمانہ بھی بدل چکا تھا۔ لوگوں کے مزاج لڑائی اور لہو و لعب کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ذاب و زانیق نے اپنی کارستانیوں کا ڈھنڈھورا اس زور سے پیشا کر تیر کی مہذب اور نحیف آواز دب کر رہ گئی۔ لیکن وقت منصف ہے۔ آج تیر کی تصانیف کو اثر و مثنوی کی ایک گراں بہا طرز تسلیم کیا جاتا ہے اور اس طرز کے متعدد لکھنے والوں میں میرؔ رشحاتِ فکر ہی سرفہرست نظر آتے ہیں :

ایک تصویرِ دور رخ — بزمِ صفحہ ۱۱۹

گئی۔ اڑیل خاں صاحب جوش میں آ گئے۔ غصے میں بھر گئے۔ ہر موع پہلے سے زیادہ اونچی آنے لگی کشتی کسی ڈرلوک کے دل کی طرح ڈوبنے اچھلتی گئی۔..... یکایک بجلی زور سے چمکی، جلو دھڑلے کہا۔ ”ذرا کنارے کی طرف دیکھو۔ کنارے کی طرف“ سب کی نگاہیں اٹھ گئیں۔ بجلیاں چمک رہی تھیں، ان کی روشنی میں کنارے پر عجیب تماشا نظر آیا، فضا میں نرالا رقص ہو رہا تھا، طوفان اپنے مرکز پر یکایک ناچنے لگا تھا، زمین سے کئی سو فٹ اوپر مکانوں کے تین ناچ رہے تھے اور آسمان کی طرف ناچتے چلے جا رہے تھے، یہ رقص یکایک رقصِ بسل بن گیا مٹی ناچتے ہوئے آئے۔ شہر سے سرکٹ کے الگ ناچنے لگا، دھڑا لگا ناچنا رہتا۔ ایک عورت کا سر بھی بکھرے ہوئے بالوں کے لٹکے درمیان ناچنے لگا۔ ایک لٹکے کا سر بھی ناچ اٹھا۔ اور چھٹک کے آدمی کے پیٹ سے ”نچوایا۔ پیٹ میں سنگینیں گھس گئیں۔ اب فضا میں بہت سے سراور بہت سے دھڑا لگ الگ ناچ رہے تھے۔ جانوروں کے، مردوں کے

عورتوں کے، بچوں کے، آٹا ناچتا یہ ناچتی گولی فضا میں بکھر گئی۔ نلچنے والے زمین پر اس طرح گرے جس طرح بطنیں شکاری کی بندوق سے گرتی ہیں“

مگر جس زلزلے کے ساتھ غضبناک طور پر یہ طوفانی ریل گیا گیا تھا۔ اس کے سامنے وہی خون خرابہ لازم تھا جس کا نقشہ اس میں پیش کیا گیا ہے مگر شاعر نے اپنے آپ کو دوسری طرح سنبھالے رکھا ہے۔ چندا در مقابل کی چوئیں دلچسپی سے خالی نہ ہوئی۔

”بنگال کی فضا غزل تو اب بھی جی ہوئی تھی مگر اب تیر کی غزل کی جگہ حافظ کی غزل لے رہی تھی، اساقی مائل بہ کرم تھا۔ شراب و شاد کا دور دورہ تھا، گاہ اڑ رہے تھے، شراب بوتلوں سے اچھل رہی تھی، جستی کافی قہقہے لگاتی، لوگ بھی ہنس رہے تھے، گارہے تھے، تہمتے لگا رہے تھے، سیم تنوں پر گاند کی شکل میں چا۔ بی برساتی جا رہی تھی سیم تن بھی نفرتی تبسم کی بارش کر رہے تھے، دونوں طرف سخاوت کا چوٹا تھا، یہ کہنا مشکل ہوا جا رہا تھا کہ کون زیادہ سخی ہیں، پینے والے با پلنے والے، بھال کی نگین فضا کو یہ رنگ دلیاں اور بھی زیادہ رنگین بناتے دے رہی تھیں“

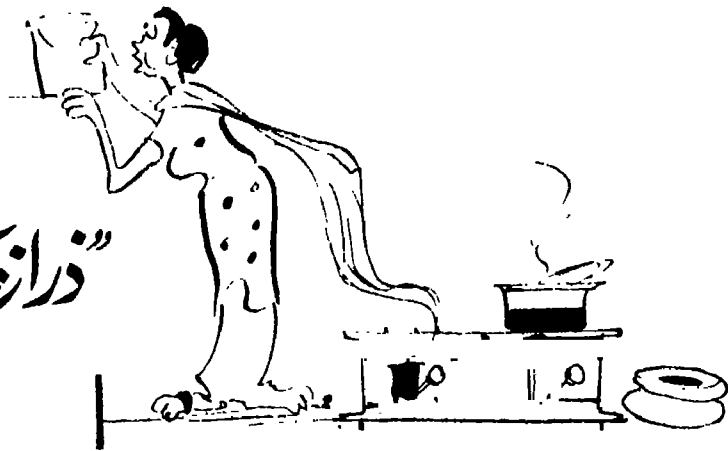
”بنگال کا جاو و شباب پر تھا، آسمان کے سر پر چڑھ کر لیل رہا تھا“ زمین کے سر پر چڑھ کر لیل رہا تھا، گھٹاؤں کے بھیس میں پریاں قطا اندر تظار آ رہی تھیں۔ رنگ برنگ کی ساٹیاں پہنے، طرح طرح کے دوپٹے اوڑھ گوتے لچکے سے آرامتہ پر ایستہ، کسی رنگین مزاج نے پوری توس قزح ہی اٹھا کے زیب تن کر لی تھی، کسی جھپٹنے لیک کے سچ چم کی تڑپتی ہوئی بجلیاں اپنے آنچل میں ٹانگ لی تھیں۔ اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرین والی آب و رنگ و نور کی پریوں کی مسکراہٹ پھوار کی صورت میں دم جھم جھم برتی، کبھی کالے کالے دیوؤں کے دل باؤل پہاڑ کے پہاڑ اینڈ تے ہوئے، اگر چتے ہوئے چھا جاتے ہیں

ان کے انگریزی رخ میں کچھ اور ہی عالم دکھائی دے گا۔ تو کیا کھیل، مقامی بازی سے فیہتت عالمی سطح پر نہیں چلا گیا۔ میں تو کچھ ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ بھی میں نے ان کی دونوں صورتوں کو برابر الگ الگ ہی رکھا ہے۔ ایک کا دوسرے سے کوئی میل نہیں۔ وہ اور یہ اور۔ اور انہیں رخ کہتے بھی نہیں جن پڑتی کیونکہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ ایک ادھر کا روپ، دوسرا ادھر کا۔

اور وہ بخش و پنج جس کا میں نے ذکر کیا تھا، پہلے بھی تھی، اب مجھ سے۔ اور آئندہ مجھ سے ہی

* ”ذرا بچ بچ کے چل!“ *

صلیبا اختر
کارٹون: برکات



اترے وقت بالکل محسوس نہ ہو سکی! اس لئے کہ ان کی آن میں، وہ کسی تکلیف کو محسوس کئے بغیر زمین پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ وقت اور محنت بچانے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ چلی خود بھی بہت بڑے منطقی واقع ہوئے تھے۔ وہ شاید سبب اور مسبب کے نظریہ کو بوری طرح سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے ”حادثہ“ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ایک ہورے پروگرام پر عمل کیا اور اسکا خود تجربہ بھی کیا۔

شیخ چلی مرحوم جسمانی طور پر نہ سہی بچوں کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ چلی تبدیلی آب و ہوا کے طور پر لاغذی دنیا سے نکل کر اب بھی انسانی برادری میں کبھی

بچپن میں بہت سے دانایان روزگار کی کہانیاں سننے تھے اور ان کہانیوں کے سب سے بڑے ہیرو، حضرت شیخ چلی آج بھی ذہن کی بھول بھلیوں میں اپنی لمبی سی ناک اور لمبی سی ڈاڑھی کے ساتھ لہراتے نظر آتے ہیں۔

ان کی دانائی کا ایک واقعہ آپ نے بھی سنا ہوگا کہ ایک دن وہ جنگل میں لکڑی کاٹنے کیلئے تشریف لے گئے۔ ایک درخت کو بڑی چھان بین کے بعد منتخب فرمایا۔ درخت پر بڑی مشکل سے چڑھے اور بطور خاص جس شاخ پر سب پہلے آ رہ چلا وہ حسن اتفاق سے وہی شاخ تھی جس پر خود تشریف فرما تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ شیخ صاحب کو درخت پر چڑھتے وقت جو زحمت برداشت کرنی پڑی تھی وہ

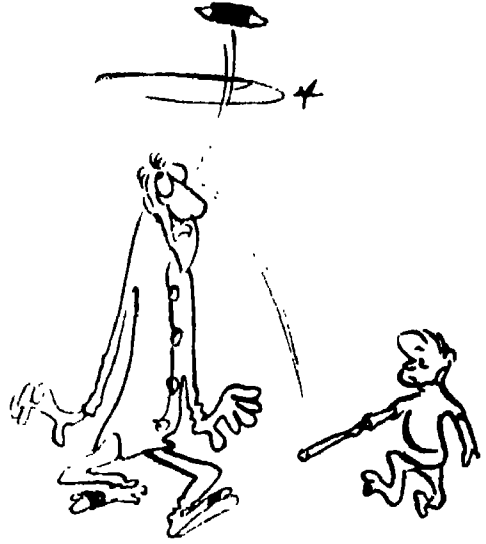
* زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل یہ سمجھ لے کوئی سینا خانہ بار دوش ہے! (”اقبال“ رح)

کی طرح مہکنا ہوا چہرہ ، سلک کی شلوار ، فائلوں کی قمیص اور شیفون کا دوپٹہ۔ ”ماتھے بندیا ہاتھ میں کنگن گلے میں چندن ہار“۔ سر سے پیر تک ریشم ہی ریشم اور اس پر عطر اور لونڈر کی بھوار۔ یہ سب کچھ ٹھیک ! بیگم کے سولہ سنگھار سر آنکھوں پر۔

ہمارا کیا جانا ہے اگر بیگم۔ بیگم کم اور حور یا ہری زیادہ نظر آتی رہیں۔ ان کے اس حسن اور اس ”حسن اہتمام“ کے والہ و شیدا چلتے ہم ہو گئے مگر یہ باورچی خانہ اس سلسلے میں انتہائی بد مذاق واقع ہوا ہے۔ لیکن بیگم نے ہمارے اس مشورے کو ہمیشہ اپنے حسن اور اپنے فیشن کے خلاف ایک قدامت پسندانہ نظریہ سمجھا۔ بیگم ہر چند کہ کبھی کبھی ہمارے دلائل اور ہمارے نصیب دشمنان قسم کے اندیشوں سے قائل بھی ہو گئیں۔ مگر اس کو کیا نیا جانے کہ باورچی خانہ میں بھی انہیں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب کوئی پڑوسن آنہکیں ، اور پڑوسن تو خیر پڑوسن ہیں اگر کوئی میکے یا سسرال سے ہی آگیا تو کیا ہوگا۔ بیگم اس قول کو اثر دھراتی رہتی ہیں کہ موت اور مہمان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اور وہ موت کی نہ سہی مگر مہمان کی ضرور متوقع رہتی ہیں۔ اسی لئے عروقت لیل کانٹے سے لیس رہتی ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد بیگم کو فیشن کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس کے لئے فوراً ریڈیو خریدنے کا ”بیگم شاہی“ حکم صادر ہوا۔ خادم نے تعمیل کردی۔ ریڈیو پہلے تو ڈرائنگ روم کی زینت بنا رہا ، پھر ڈرائنگ روم کی میز سے اٹھ کر باورچی خانے میں رکھے ہوئے نعمت خانے پر رکھ دیا گیا۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگیں ”ارے تو اور کیا کروں ، دوپہر کو کھانا پکاتی ہوں اور اسی وقت ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ بھاگ بھاگ کے ڈرائنگ روم میں جانا پڑتا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ریڈیو بھی یہیں اٹھا لاؤں۔ آخر آپکو وقت پر کھانا بھی تو دینا ہوا۔“ بیگم کی اس دلیل کے آگے ہم ہمیشہ کی طرح چپ ہو کر رہ گئے لیکن ریڈیو میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ

کبھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے سر پر ایک سلیمانی ٹوبی ہے ، اسلئے سب کو نظر نہیں آتے۔ مگر وہ جس کی ٹوبی چاہیں اتار لیتے ہیں یا جسکی چاہیں پگڑی اچھال دیتے ہیں یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے ، ممکن ہے دائیں ہاتھ کا ہو۔



نیا راکٹ ؟!

گاہ باند نہ دودک نادان از غلط ہر هدف زند بیرے !

یوں تو حضرت شیخ چلی نو گھریلو زندگی اب بھی بہت پسند ہے ، اور وہ ہر گھر میں کسی نہ کسی طرح موجود رہتے ہیں لیکن بہت کم اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہونگے کہ ان کے گھر میں بیگم کے علاوہ کسی اور کی بھی حکمرانی ہے۔ بیگم کو تو خدا نخواستہ اگر کوئی ایسا گمان ہو جائے تو سیدھی میکے میں جا کر دم لیتی ہیں۔

آپ کو اس بات سے انکار ہے تو چلتے پونہی سہی۔ مجھے آپ کی توہین اور آپ کی گھریلو آزادی میں دخل در معقولات کا مجرم بننے کا کچھ ایسا شوق بھی نہیں مگر مجھے آپ بینی ستانے کا تو حق حاصل ہے۔

لپ اسٹک سے لال بھہو کا ہونٹ۔ پاؤڈر، کریم کی آمیزش بلکہ آویزش سے آٹھ پہر سورج کی طرح چمکتا ہوا اور گلاب

کہ ریڈیو سے کوئی ریکارڈ - صوتی تائر کے ساتھ - پیش ہو رہا ہے ، کہ دوسری چیخ سنی - دوڑ کر باورچی خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ بیگم کا دوپٹہ شعلہ جوالہ بنا ہوا ہے اور قریب تھا کہ بیگم خود ایک بقعہ نور میں تبدیل ہو جائیں کہ ہم نے وہ دوپٹہ فوراً نوچ پھینکا اور جلدی سے دوپٹے پر گھڑا انڈیل دیا - بیگم جو بات بات پر آتش زیر پا رہتی تھیں آج واقعی نذر آتش ہی ہو جاتیں - پوچھا ”کیسے ہوا؟“ کہنے لگیں ”ارے ذرا ریڈیو کی سونی ٹھیک کرنے کے لئے مڑی تھی کہ دوپٹے کا پلو چولہے پر جا پڑا -“ بیگم کی جان بچنے کی حوشی میں ہم نے فوراً مٹھائی سنگائی جو فی الفور پڑوسنوں میں ، اس حادثے کی خبر کی طرح ، تقسیم ہو گئی -

خدا کا شکر ہے اس دن سے بیگم نے باورچی خانے میں ریشم اور نائلوں کے کپڑے پہن کر جانا تو چھوڑ دیا ہے اور ریڈیو بھی حسب دستور ڈرائنگ روم میں رکھ دیا گیا ہے -

ہم تو خیر شاعر ہیں ہی ہماری بیگم کو بھی یہ ناز ہے ان کے پرانا مولانا حالی کے ہم رتبہ شاعر تھے - لہذا انہیں ورثہ میں دولت سخن نہ سہی مگر فکر سخن کی دولت خداداد ضرور مل گئی تھی اور وہ اپنے بھولن کا مظاہرہ کرنے کے لئے کسی نہ کسی بھول کا مظاہرہ روز کرتی رہتی ہیں - ایک دن بیگم کی فرمائش پر ہم بہت سے کیلے لے کر پہنچے - بیگم نے یہ کیلے کچھ خود نوش فرمائے اور کچھ اپنے ”خانہ زادوں“ کو کھلانے - ایک دو کیلے از راہ کرم یا برائے تقنن ہماری طرف بھی بڑھا دیئے - اور باقی ریزرو فنڈ میں شام کے لئے رکھ دیئے گئے - یہ ریزرو فنڈ دراصل ان سہانوں کے لئے مخصوص تھا جو اگر آ بھی جائیں تب بھی کوئی ایسی شے ان تک نہیں پہنچ سکتی جو بیگم کو بذات خود اس قدر پسند ہو -

ابھی ”کیلا نوشی“ یا ”کیلا خوری“ کا دور ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ باہر کسی دوست نے آواز دی - ہم بیگم

جس دن سے ریڈیو کچن میں پہنچا ہمارے لئے کھانا تریاق سے زہر بنتا چلا گیا - ہمیں ہر لمحے پر پیاس لگنے لگی - اگر مرچوں کی شکایت کی تو بیگم نے کہا ”زبان دکھائیے“ اور صاف و شفاف زبان دیکھی تو کہنے لگیں - ”آہکے منہ میں دانے نکل آئے ہیں!“ اور اگر کسی دن کھانے کو بد مزہ کھدیا تو حکم دیا ”ڈاکٹر کو دکھا آئے - معلوم ہوتا ہے کہ کسی آنے والی بیماری نے آپ کے ذائقے کی قوت پہلے سے سلب کر لی ہے“ اور جب جلی ہوئی روٹیوں کا منہ بولتا ثبوت پیش کیا تو روٹیوں سے زیادہ جل کر کہنے لگیں : ”مٹی کے تیل کے چولہے پر روٹیاں پک ہی نہیں سکتیں -“ مگر وہ اس ناممکن کو معجزاتی طور پر ممکن بناتی رہیں - ہم نے لکڑیاں جلانے کا مشورہ دیا تو فرمائیے لگیں : ”دھواں میری آنکھوں کو خراب کر دے گا -“ کوئلے کی طرف توجہ دلائی تو کہنے لگیں - ”کوئلے کی گیس میرے لئے ناقابل برداشت ہے اور دوسرے یہ کہ بجٹ میں اس آئیٹم کی گنجائش بھی تو نہیں ہے -“

”جی ہاں اس فیشن کے بعد بجٹ میں کوئلے کی ایک بوری کی گنجائش کہاں باقی رہ سکتی ہے -“

بیگم نے پوچھا ”کیا کہا؟ ذرا زور سے کہئے -“

ہم نے جذباتی طور پر بات کھدی تھی - دھرانے کی ہمت کس میں تھی - فوراً کھدیا - ”جی کچھ نہیں ، میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کا خیال درست ہے -“ بیگم مسکرا دیں اور ایک آئی ہوئی آفت ٹل گئی - ہم نے بھی جواباً جیڑا بھارتے ہوئے پوری مسکراہٹ سے جواب دیا -

ایک دن دوپہر کو گھر پہنچے - بیگم سر سے ہر تک ”نائلوں کی گڑیا“ بنی باورچی خانے میں موجود تھیں - ریڈیو سے فلمی گانے نشر ہو رہے تھے - بیگم بھی آواز کے ساتھ آواز ملانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں - ہم انہیں مصروف دیکھ کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے - ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک چیخ سنی - ہم نے سمجھا

بیگم کا موڈ اب اس قابل ہو گیا تھا کہ وہ اپنے دوست کو اس زبان درازی کے باوصف گھر میں لے جاسکتے لہذا قریب کے ایک ہوٹل میں چائے پلا کر بالا ہی بالا رخصت کر کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ صاحبزادے آٹھ منزلہ بلڈنگ کی فلک بوس چھت کے کونے پر کھڑے سنگ اڑانے میں مصروف ہیں۔ ہر چند کہ ہم ”اقبال“ کے شاہین بچے کے بہت قائل ہیں۔ اور اس مصرعے کو بار بار گنگناتے بھی رہے ہیں کہ ”تو ماہیں ۷ بسرا“ اور پہاڑوں کی چٹانوں میں ”مگر ایسے تماہیں بچے کو اس سے پرانی سے ادنی بلندی پر دیکھ کر جان میں نکل گئی۔ ایسی ساری چوٹ بھول کر سیڑھیوں پر دروازہ دار چڑھے ہوئے جیک اس وقت پہنچے جب صاحبزادے رنگ لے بیچے ایک بلڈنگ سے دوسری بلڈنگ میں دھارنک لڑنے لے گئے اور بول چکے تھے۔



ہونہار بڑا: وہ ایک ٹم ہے ہمت کے لئے بام بلند!

معین قدرتی طور پر یہ حق حاصل نہیں تھا کہ صاحبزادے کو خود سزا دے سکیں۔ لہذا فوراً صاحبزادے کو لے کر ہانپتے کا نپتے بیگم کی عدالت عالیہ میں پہنچے۔

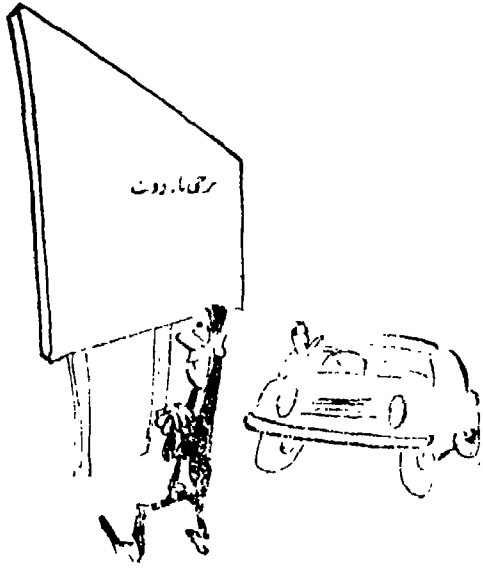
کی وجہ سے وہ سونے کو سونے میں سے برے ہوئے تھے۔ مذہب کے بعد ایک انسان کو سونے کو لے کر لے کر دروازے سے قدم



لہیل لڑکوں کا ہوا: نے ہاتھ بیک پرے نہ پاٹ...

نکالتے ہی ایسے رہے کہ دوست کی آغوش لے بجائے چاروں خانے چت قدموں میں جا پڑے۔ ابھی ہم شرمندگی اور چوٹ سے سہا ہی طرح اٹھ کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمارے دوست نے اپنے پیروں سے نیلوں کے چھلکوں اور ایک طرف دھکیلتے ہوئے اور ہمیں ہانہوں سے اٹھاتے ہوئے کہا ”ارے یہ کس ذلیل نے اس پر پروائی ہے تمہارے دروازے پر کیلے کے چھلکے پھینک دئے ہیں“۔ یہ جملہ سن کر ہماری روح ہی نکل گئی۔ فوراً دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ بچے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے مگر بیگم کی آنکھوں سے پنکھاریاں نکل رہی تھیں۔

ہم نے جھینپ مٹاتے ہوئے فوراً کہا۔ ”ارے ہمارے اس میں کیلے کے چھلکوں کا کیا قصور ہے۔ قصور تو میرا اپنا ہے“ قبل اس کے کہ ہم اپنی بات پوری کریں بیگم نے مصرع ثانی کے طور پر جملہ داغ دیا۔ ”آخر اللہ نے آنکھیں کس لئے دی ہیں ذرا دیکھ کے چلا کھینے نا۔“ قبل اس کے کہ ہم کوئی جواب دیں دروازہ ایک چٹاخ کے ساتھ بند ہو چکا تھا۔



اپنا کارنامہ سنایا اور شکایت کرتے ہوئے مناسب سزا کے اعلان کی درخواست کی۔

بینک نے تنک کر جواب دیا "اس کی نو ہڈیاں پسلیاں میں ابھی توڑ کر رکھ دوں گی۔ وہ ہے کس کا بچہ! مگر آپ پہلے یہ بتائیے کہ جناب اپنے اس زباں دراز دوست کو لے کر کہاں چل دئیے تھے۔ آخر آپ دوستوں کے ساتھ یہ 'ہوٹل بازی' کبھی ختم بھی کرینگے نہ نہیں۔" ہم نے سفائی جرم کے طور پر فوراً اپنا پرس بینک کے حوالے کرنے ہوئے سہ "نو ٹن لو، سمہارے دئیے ہوئے روپے میں سے صرف بین اے دو پیلی جانے پر خرچ کئے ہیں۔" بینک نے ہنسے ہوئے کہا۔ "جی ہاں لیکن نواپ کی نظر میں دن پانچاں ہیں۔" سزا کے طور پر بینک نے ۱۳ آے سبب کر لئے اور خالی پرس ہمیں لوٹا دیا۔ اب صاحبزادے کی ہاری بھی۔

جان جانے یا رہے : چھوڑیں گے ہم نہ اس بت زفر کو دیکھنا !

پر جا بڑے۔ سر کر دیکھا تو سوئر کی لہڑی سے ایک صاحب سر نکالے ہوئے کہہ رہے ہوئے سنائی دیتے : "میاں کیا جان سے بزار ہو۔ اگر اس تصویر کے ایسے ہی عاشق ہو تو یہ تصویر بورڈ سے اتار کر گھر لے جاؤ۔ خود زندہ نہیں رہنا چاہتے تو نہ سہی، ہمیں کیوں پھانسی کے تعے پر چڑھانے ہو۔" "ڑوں" پھر ایک آواز آئی اور سوئر ایک اڑتے ہوئے پرندے کی طرح نظر سے اوجھل ہو گئی۔ موڈ خراب ہو چکا تھا۔ ہم خان کی سلامتی پر شکر کے کلمے ادا کرتے ہوئے چپ چاپ گھر واپس آ گئے۔

بینک کے ہاتھ زیادہ بیز بھی یہ صاحبزادے کی چبھیں ہم اس کا اندازہ لگے پھر باہر نکل آئے۔ کئی کے سوئر پر سوزے میں چھپائے ہوئے ہوتے جاں کر پرس میں ڈالے اور چھل قدمی کے لئے سڑک پر آ گئے۔ خود پر فریج کا موڈ طاری کیا اور پکچر جانے کی ٹون لی تھی۔ دل سے نہ لہر آ کر دیا جراب دوڑے۔ دل کی اس بات پر ذرا قدم سہلے تو سامع سے آواز آئی۔ "میاں میرے ہوتے ہوئے دیوں کھیرائے ہو، میں آؤنی پہنا گھڑ رکھوں تم پکچر تو دیکھ لو۔" ابھی چھل قدمی کے ساتھ یہ سوال جواب کا سلسلہ جاری تھا کہ عصری نظر سڑک پر لگی ہوئی "برجی باردوت" کی تصویر پر جا پڑی۔ برجی باردوت اور پرس فراس کی یہ دو چیزیں ہمیں ہمیشہ سے محبوب رہی ہیں۔ تصویر کو دیکھتے ہی ایسے کھوئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہ رہی۔ تصویر لیا تھی ایک جادو تھا جس کے زور سے ہم خود بھی رنگوں میں تحلیل ہوئے جا رہے تھے۔ ایسی رنگ سازی کا کارخانہ ذہن میں جمنے بھی نہ پایا تھا کہ "ڑوں" کی ایک آواز آئی۔ ہم سڑک سے اچھل کر مٹا ہاتھ

شعر لکھے بہت دن ہو گئے تھے۔ ایک دن بینک کی نظر بچا کر چبھنے سے ڈرائنگ روم میں پناہ لی اور موضوع کی تلاش میں محو ہو گئے۔ کوئی موضوع نہ سوجھا تو سکرپٹ لکھنا اور حسب دستور دھوئیں کے مرغولے بنانے لگے۔ ناگہاں مصرع یاد آیا "اس گھر کو آک لک گئی گھر کے چراغ سے" اس شعر کا پہلا مصرع لیا تھا۔ حافظہ پر بہت زور دیا مگر یاد نہ آتا تھا نہ آیا۔ سوچا کہ خود ہی کوئی مصرع

دھوپیں سے بھر گیا۔ ارے غضب خدا کا۔ سارا صوفہ جل گیا اور آپ کو خبر تک نہیں۔ ”کچھ آگ کا اور کچھ بیگم کا ڈر، جلدی سے اچھل کر، آنگن میں ”پانی پانی“ کرتے دوڑے اور جب سلکتی ہوئی آگ بھڑکنے سے پہلے بچھ گئی تو دیکھا کہ صوفے کی سیٹ کسی عاشق کے سینے کی طرح داغ داغ ہو چکی تھی۔ وہ نو خدا کا شکر ہے کہ بیگم نے اس فکر سخن سے چونکا دیا ورنہ سارا گھر خاکستر ہو کر اس مصرع کی، جس پر ہم طبع آزمائی کرنے بیٹھے تھے، سچی تصویر بن جاتا۔

نو دیکھا آپ نے کیا ہم، کیا بیگم اور کیا صاحبزادے اور کیا آپ۔ معاف کیجئے گا، کیسے کیسے خطرناک حادثوں کو دعوت دیتے ہیں اور خود ہی ان کا سناں ہو کر — کبھی قسمت — کبھی حالات — اور کبھی زمانے پر الزام دھر کر اپنے آپ کو یرقصور ثابت کرنے کے کوساں رہتے ہیں۔

ہاں تو بنائیے — آپ شیخ چلی کے فائل ہونے کہ نہیں؟ کوشش کیجئے کہ آپ پر شیخ چلی حاوی نہ ہونے پائیں ناکہ یہ چھوٹے موٹے حادثے بڑے بڑے ”سائنس“ نہ بن جائیں!



گھر بھونک تماشاً: اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

موزوں کیا جائے اور اسی سوچ میں منکریٹ ہانپ سے نہ جانے کب کر گیا اور سوچ کا یہ سلسلہ ناگہاں بیگم کی صلواتوں سے ٹوٹا۔ ”ارے۔ ارے یہ کیا! سارا گھر

* * * *

صحت اور دانست



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن' جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد متل کیا گیا ہے دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو کسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش :- ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے بخونین وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ :- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار :- ہمدرد منجن کی دیرپا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔



ہمدرد منجن

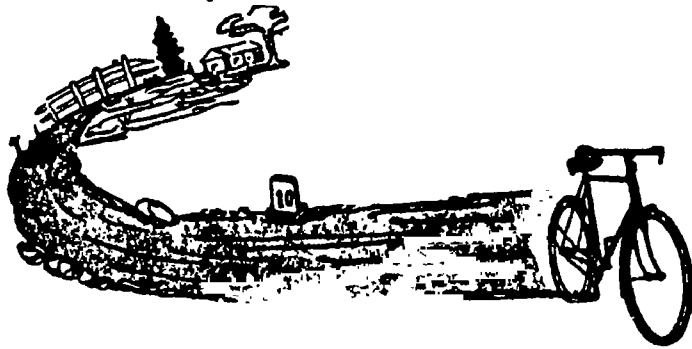
اسکراہٹ پیشکش اور دانتوں میں پتھریوں کی چمک پیدا کرتا ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور



فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر آپ کے پاس بہترین کوالٹی کی بہ :

موجود ہے !



رستم سائیکل

آپ کو غیر ملکی سائیکلوں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ مشہور و معروف ہائیدار اور تیز رفتار
"رستم سائیکل" ہر چھوٹے بڑے شہر میں کفایتی داسوں پر دستیاب ہے

چین سے دو خط



دل روز تمام لاء علاج جلدی امراض

جہنم کے پھوٹے پھنسی لاہوری پھوٹے
منفاتی پھوٹے ناسور بھگت درد بال توڑ دا دینیل خارش
گچ خیف زیر کچھالی۔ گچی۔ رولی۔ سائو و چند ہی رستہ مبارک
درد۔ ملین سو جن چوٹ۔ نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں
کے کاٹے اور ڈسے کا بیفر اور تیر بہر ف علاج ہے۔

چیر ہار اور مرہم ٹپی سے نجات دلاتی ہے

قیمت فی شیش

دو روپیہ۔ ایک روپیہ۔ آٹھ آنہ

انڈین ٹیکسی ہیزل
چنگ کنگ چین
۵۰ گرام ۲۰ روپے

..... گزشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی ارسال کردہ
دل روز کی شیشی لی۔ رشک کریمہ ایچے دی سال کے سروس سے
یہ عجیب تھی۔ ہر قسم کی ویسی و انگریزی ادویات استعمال
کیں مگر کچھ بھی آفت آتے نہ ہوا۔ دل روز کو صرف
چھ دن لگانے کے بعد تمام شکایت مانی رہی۔
کاش! ایچے پہلے ایسے تیر بہر ف علاج کا علم ہوتا۔

ن۔ ا۔ رخ
میر

انڈین ٹیکسی ہیزل
چنگ کنگ چین
۲۰ گرام ۱۰ روپے
..... ایچے کو دوسرے گزشتہ ہفتہ کی شیشی سے
علاج سے ہیں جن کی وجہ سے نماز بہت ہوتی ہے
نشانات تو رنگ دم سے ملتے جلتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آفت نہیں ہوا۔ آئینل میں آپ
کی دوائی دل روز کا اشتہار دیکھ کر خیال ہوا کہ ایسے ہی
استعمال کر کیوں کریں کہ ان شعلانی شعلانی کیا آپ
بہرانی فرما کر ایک شیشی دوائی روز مندرجہ بالا پتہ پر
بندوبست لاسل داد کر کے ہیں۔

ن۔ ا۔ رخ
میر

۱۹۰۰ سے استعمال میں ہے

حکیم طہ الدین اینڈ سنز دروازہ لاہور پور روڈ لاہور پنجاب

بر مشہور و افروغ طلب کریں

دعا مذاجب بچے کی پرورش اس سٹریملک پر ہوتی ہے، ماں اور بچے دونوں کے لئے مستحقوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس سٹریملک بچے کو تندرست و مطمئن رکھتا ہے جس کی بدولت اسے چین و کام نصیب ہوتا ہے۔ دوسری طرف ماں کی مستحقوں کی بھی کوئی حد نہیں رہتی کیونکہ وہ اپنی ادوار کو ہر طرح خوشہ خرم کرتی ہے۔

اسٹرٹملک اعلیٰ اور ماضیہ شہ کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں نوادہ ملا دیا گیا ہے، تاکہ بچوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے، اور بڑیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے ڈان من ڈی سبجی شامل کیا گیا ہے۔ اسی لئے، اپنا دودھ چھٹ جانے پر یا اس کی پوری کرنے کے لئے دانشمند مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو اسٹرٹملک دیتی ہیں۔

OSTER MILK
Pure Cream Milk

THE ONLY FOOD PRODUCT THAT GIVES CHILDREN A HEAD-START

Containing the best that the best herds in the world have to offer, Oster Milk is the purest, creamiest milk available. It is the only milk that is so pure and so rich in cream that it can be used for infants and children. It is the only milk that is so pure and so rich in cream that it can be used for infants and children. It is the only milk that is so pure and so rich in cream that it can be used for infants and children.

بچوں کی پرورش پر ایک مفید کتاب
اسٹرملنگ کی کتاب اب اردو میں دستاویز
ہوتی ہے۔ نیچے دیئے ہوئے پتہ پر ۵۰ روپوں کے
محنت سے اردو ایک کتاب محنت حاصل کیجئے۔
پی۔ او۔ بکس نمبر ۴۶۴۔ کراچی ۷

خیابان پاک

پاکستان کی علاقائی شاعری کے منظوم تراجم کا انتخاب

علاقائی شاعری کی روایات، سہانے گیت اور میٹھے بول پاکستان کی نغمہ ریز سرزمین کی خاص پہداوار ہیں - ان کے منظوم تراجم کا یہ انتخاب چھ زبانوں کے اصل نفحات کی صدائے بازگشت ہے -

ساتھ سے زیادہ مقبول شعرا کا کلام

نفیس اردو ٹائپ کی چھپائی

ضخامت تین سو صفحات - قیمت صرف چار روپے -

ادراہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳-کراچی

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ”ماہ نو“ اور ”مطبوعات پاکستان“ کراچی کی کتابیں، رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں - استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں - یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے -

پتہ :

ادارہ مطبوعات پاکستان

معرفت پاکستان ہائی کمیشن - شیرشاہ میس - نئی دہلی (ہندوستان)

منجانب : ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳-کراچی

شمارہ ۴

ماہ نو

جلد ۱۶

اپریل ۱۹۶۳ء

مدیر: ظفر قریشی

۶	شیر افضل جعفری	یزداں گیر (نظم)	تب و تاب جاودادہ :
۷	عبد الغنی شمس	شعلہ نفس (نظم)	(اقبال کی یادیں)
۸	عزیز احمد	اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ	
		قرآن السعید	
۱۱	سید قدرت نقوی	غالبہ اور اقبال : (ایک تقابلی مطالعہ)	
۱۸	سحر یوسف زئی	اقبال کا انسان کامل	
		"مطرب غزلے بیٹے از مرشد روم آور"	
۲۶	ابن علی امروہوی	(دشنوی مولانا روم رح کا ایک نادر مخطوطہ) :	
		★	
۲۹	عوفان احسان	حجاب تجلی (غلاف کیمہ)	مطلع انوار :
۳۳	عظیم سرور	آخر شب کے حشر (کہانی)	افسانے، ڈرامے، رپورٹاژ :
۳۶		تجملہ شرق (شرقی پاکستان میں چند دن، رپورٹ تاثر) عبدالعہد دتانی	
۳۹	سلیم خاں گئی	تہذیب و شن (ڈرامہ)	
۴۲	سلطان زبیری	طلوع نو (نظم)	نظیں :
۵۶	صادق مصوٰر	قصی شمر و برق (نظم)	
۴۲	انجم جاوید	رسم جہاں (نظم)	
۵۰	زہرا دار	آئے گی رت سادہ کی (نظم)	
۵۵	بشیر فاروق	محمود صدیقی	غزلیں :
۴۷	ارشاد سلمان	شگفتہ گل (دو حکمہ میں بچوں کی نمائش فن)	فن :
۵۱	سید غلام حسن شاہ خلی	"ما و قاشقا" (چتران)	تعارف :
۴۵	لطیف جلیلی	حق بہ حق دار...	تاثریہ :
۵۹	رفعت جاوید	اک بار پھر	
	حفاطت حسین	دائے راز رنگین نقش :	سرورق :

فی کاپی،
۵۰ پیسہ

شائع کردہ :
ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱ کراچی

سالانہ چندہ :
پانچ روپے ۵۰ پیسہ

”بزدل گیسر“

شیر افضل جعفری

چمن میں طرزِ فغاں کو اثر دیا تو نے
شبِ سیاہ میں گم گشتہ آدمیت کے
سخن میں سرورِ زباں کو شمر دیا تو نے
جگر کے داغ کو بہت اب کر دیا تو نے

وِغایں جھوم کے آنا سکھا دیا تو نے
عمل سے آنکھ چراتی ہوئی تو تکل کو
لہو میں تیر کے جانا سکھا دیا تو نے
عدو سے جان لڑانا سکھا دیا تو نے

بغل میں لیکھ ستارے دبوچ لیتا ہے
تری آنا کا جو پر تو ملنگ پر جھبکے
بہت ہی دُور کی لحظے میں سوچ لیتا ہے
تو عزرائیل کے شہر بھی نوچ لیتا ہے

سمجھ رہا ہے پہاڑوں کو روٹی کے کالے
تری غزل کے نشے میں فقیرِ نعرہ طراز
ہیب سلسلوں کو عنکبوت کے جلے
مکند کیوں نہ مہر و عرش پر ڈالے؟

فضا کو، برق و خلا کو شکار کرتا ہے
تری خودی کے اشاروں کی چاندنی میں دل
قلم کو، لوح و فضا کو شکار کرتا ہے
قلندر سی سے خدا کو شکار کرتا ہے



فرشتہ صیدِ مملکت شکارِ دوزخیں گیر (دردی)
بزدل بکشتا و اسے بہت مروانہ (اقبال)

بزدل نگارِ کبرِ پیشِ مردانہ
دردِ شبِ جنوں میں جبریلِ زہدِ صہرہ

شعلہ نفس

عبدالغنی شمس

پھر موج ہوائے دستک دی، یادوں کے دریچے کھلنے لگے
 شبِ نیم کی تراوش ہونے لگی، پھولوں کے چہرے دھلنے لگے
 مشرق کی شاخ کہنہ میں، اک پھول کھلا تھا، یاد آیا
 گلشن کو بہارِ تازہ کا، پیغام ملا تھا یاد آیا
 دل سوزِ یقیں سے گرمائے، تشکیک کے بندھن ٹوٹ گئے
 نو مہدی کے زندانوں سے، آخر سب قیدی چھوٹ گئے
 کچھ ایسی باہگ دراگوئی، پھر تازہ گلن ترپا پائے لگی
 بغداد و قرطبہ یاد آئے، تاریخ ورقِ الٹانے لگی
 پیدا ہوئی اک صبح روشن، تاریکی شامِ مشرق سے
 بیداری کی رو دوڑ گئی، مشرق میں، پیامِ مشرق سے
 اسرارِ غوی نے فاش کئے، کوئین کے سارے راز نہاں
 انجامِ خرد آئینہ ہوا بجنے لگے دل کے ساز نہاں
 ذہنوں کو رموزِ سنجو دی سے، سوچوں کے نئے انداز ملے
 ہر دم و پردہیں گرد ہوئے، ذروں کو پر پر وار ملے
 روحِ داؤدی بھوم اٹھی سکر نضاتِ زبورِ عجم
 تنخیرِ جہان نو کے لئے پیدا ہوا ایک نیا آدم
 آذر کے صنم خالوں میں مچی، اک ضربِ بلیسی سے ہلچل
 انجانے ڈر سے کانپ گئے تہذیب کے سارے رنگِ محفل
 انگڑائیاں لیتا برسوں کا خوابیدہ مسلمان جاگ اٹھا
 قرآن کو لگائے سینے سے پھر حاملِ قرآن جاگ اٹھا
 اک شعلہ نفس کے نغموں نے بھر دیا دی آگ سی سینوں میں
 پاکیزہ سجدے تڑپنے لگے الحاد آلودہ جبینوں میں
 وہ جس نے قلبِ مومن کو ایمان کی صفائی بخشی ہے
 چمکا کے خود دی کا آئینہ گو یا کہ خدا کی بخشی ہے
 اے پاک زمیں! اک رنگِ حقیقت ہے تیرے افسانے میں
 دھارا ہے اسی کے تخیل نے تخلیق کا روپ زمانے میں
 اے ارضِ وطن! ہر آفت سے ہم تجھ کو بچائے رکھیں گے
 اک مردِ قلندر کا حنفہ سینے سے لگائے رکھیں گے

اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ

عزیز احمد

اس میں اقبال کی مابعد الطبیعیات سے دلچسپی کو بھی دخل ہے۔ یہ دلچسپی ان کی شاعری میں بھی نہ چھپ سکی چنانچہ تصور مکان و زمان اور تصور خودی خالص مابعد الطبیعی نوعیت رکھتے ہیں۔ اور یہی ہے ہماری مشکلات شروع ہوتی ہیں۔

اس حیثیت سے اقبال کی آفاقیت تسلیم کہ ان کا بیجا عالمگیر اور ساری انسانیت کے لئے ہے اور ان کا تصور حیات وسیع ہے لیکن اس حقیقت کو بے بغیر بھی چارہ نہیں کہ فکر و علمیت کا غلبہ اتنا زیادہ ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے بڑی کدو کا ڈش اور وسعت مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے اقبال کے قارئین کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ ویسے تو ہر شاعر اور ہر ادیب کا مطالعہ ایک خاص ذخیرہ معلومات کا متقاضی ہوتا ہے مثلاً زبان اور اس کے مزاج سے واقفیت اور روایات و علامت سے آگہی۔ بہر حال لازمی ہے کہ اس کے بغیر شعر و ادب سمجھنا نہیں آسکتا۔ لیکن بحکلاف اور شعر کے اقبال کے افکار و خیالات کو سمجھنے کے لئے اس کے علاوہ اور بہت کچھ جاننے کی بھی ضرورت ہے جیسے فلسفہ و مابعد الطبیعیات، تاریخ و سیاسیات، عمرانیات و معاشیات، حدیث و علم کلام وغیرہ۔ اس علم کے بغیر اقبال کا مطالعہ کرنے سے افکار اقبال کا محض سرسری اندازہ ہی ہو سکتا ہے جو غلط فہمی پر منتج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی غلط فہمیاں اقبال کے بارے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ کوئی انہیں رجعت پسند کہتا ہے، کوئی ترقی پسند، کوئی اشتراکی، کوئی فسطائی، کوئی صوفی، کوئی تصوف دشمن، غرض ہر جتنے منہ تافا باتیں۔ یہ اختلاف کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اقبال کے اظہار میں کوئی خامی یا ابہام ہے نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اقبال کے

اقبال کے خیالات سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے مگر اقبال کو بڑا شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اعلیٰ شاعری کی کونسی خصوصیت ہے جو اقبال کے ہاں نہیں؟ فکر کی بلندی، تخیل کی وسعت اور گہرائی، جذبات کا خلوص اور پاکیزگی، حسن ادا اور موسیقی۔ مگر کونسی چیز سب سے نمایاں ہے؟ میرزا نادر توبہ ہے کہ فکر اقبال کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ اقبال کا کلام ٹپکتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے، گماں میں جذبات اور تخیل دونوں نکلے تالیق ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ سستی جذباتیت یا سطحیت اقبال کی شاعری میں کبھی نظر نہیں آتی اور نہ ہی ہمارے بے اساس تخیل و موضوعاتی ہی نظر آتی ہے۔ یہی کچنگی و بلند فکریہ جو اقبال کو دنیا کے تمام بڑے شعرا سے ممتاز کرتی ہے اور اقبال بنا لے۔ ہانگ درا کو اقبال کی نمائندہ تصنیف کیوں نہیں قرار دیا جاتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو شاعر کی حیثیت سے اقبال کی عظمت ہانگ درا میں بھی کئی مقامات پر ظاہر ہوتی ہے لیکن اس میں فکر کا وہ عنصر بہت کم ہے جو اقبال کا اصل طرہ انبیاء ہے۔ بلاشبہ اقبال کا نمائندہ ترین مجموعہ اردو میں بال جبریل ہے اور فارسی میں جادینا ہے۔

فکر کی فراوانی نے اقبال کے بارے میں یہ عام خیال پیدا کر دیا ہے کہ وہ ایک باقاعدہ فلسفی ہیں جس کا ایک مستقل نظام فلسفہ ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال کا بھی تصور حیات و کائنات تھا اور چونکہ اس تصور کو اقبال نے جزئیات کی تصریح کے ساتھ پیش کیا اس لئے انہیں اصطلاحی معنوں میں فلسفی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ویسے کچھ

لے "ادارہ" کا صاحب تحریر کے ہر خیال سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

خدا اور اس کے رسولؐ سے عشق رکھے، اسلامی تعلیمات کی حرکی روحانیت سمجھے اور اس پر عمل کرے تو وہ حقیقت میں خدا کا جانشین بن سکتا ہے اور اپنی تقدیر کا آپ مالک بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اقبال کے خصوصی اسکا کردار کے لئے مخصوص ہے، اسی لئے فہم عام کا سوال نہیں اٹھانا چاہیے۔ اقبال کی آفاقیت اسی مرکز کی بات کو شاعرانہ طور پر پیش کرنے میں پنہاں ہے نہ کہ فلسفیانہ نکتہ آفرینوں کے حجابوں میں۔

اقبالؒ کے کلام کا وہی حصہ میری رائے میں آفاقی ہے جس میں فلسفیانہ نکتہ طرازیوں نہیں ہیں۔ کیونکہ اسی کلام میں شعریت ہے۔ وہی عام فہم بھی ہے اور اسی میں عالمگیر اہل بھی ہے۔

علیت اور فکر سے انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن کا کلام بھی بوجھل ہے لیکن اقبالؒ کو ملٹنؒ اس لحاظ سے ضرور فوقیت حاصل ہے کہ جہاں ملٹنؒ کی شاعری کی بنیاد صرف تخیل پر ہے وہاں اقبالؒ کی شاعری میں سوز و خلوص نے ایک ٹرپ پیدا کر دی ہے۔ ان نکتہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت کی پسمنظر اور قوم کے درونے کی فکر کو اس کا یا لیکن جب فکر کو حرکت آتی تو ان کے سامنے ذہن پرانی کا راج ہو گیا۔ یہ ہر بات کو سوچنا سمجھنا تو لانا پر کھنا شروع ہوا اور حیات و کائنات اور اس کے مختلف مظاہر کے بارے میں خیالات معین ہونے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور اس کے مسائل تک اقبالؒ فکر کے ذریعے سے پہنچے، احساس و تجربہ کے ذریعے سے نہیں۔ مگر جن نتائج پر وہ پہنچے ان پر اس شدت سے انہیں یقین تھا کہ یہ یقین جانے خود احساس کا بدل بن گیا۔ اور اسی یقین کی وجہ سے ان کی باتوں میں ایک وزن پیدا ہو گیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ اثر پیدا نہیں ہو سکا جو ایک محسوس شدہ تجربے یا تاثر کے موثر اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ حال اور حال میں فرق تو ہوتا ہے۔ ہاں جب کبھی اقبالؒ آنحضرتؐ صلعم کا ذکر کرتے ہیں یا ملت اسلامیہ کی نروں حالی دیتی کو محسوس کرتے ہیں اور اس کی قوت کی تمنا کرتے ہیں تبھی ان کا انداز حال کا نہیں حال کا ہوتا ہے اور کلام کی تاثیر کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ حال اور حال کے اس نکتہ کی وضاحت روحی اور اقبالؒ کے تقابلی مطالعہ سے بھی بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ دونوں کا تصور عشق بڑی حد تک یکساں ہے لیکن صاف محسوس ہوتا ہے کہ

خیالات و انکا ایک کل کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور کل حیثیت سے ہی مطالعہ چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے خاصی علمیت کی ضرورت ہے۔ اس طرح وہی بات جو اقبالؒ کی عظمت کی ضامن ہے یعنی بلند پایہ وسعت فکر انہیں ایک عامی کی دسترس سے دور رکھ کر دیتی ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ کافی شاعری وہ ہے جس سے ہر زمانے میں سمجھ بوجھ والا طبقہ لطف اندوز و متاثر ہو سکے تو اقبالؒ کی شاعری میں آفاقیت کچھ ہے اور کچھ نہیں ہے عمومی نقطہ نظر سے اقبالؒ کا درس خودی جس سے انسان کی قوت ارادی و قوت عمل کے لامحدود امکانات کا تصور وابستہ ہے کسی قدر مبہم ہے۔ لیکن ایک آفاقی چیز ضرور ہے اور ہر کسی کو اپیل کر سکتی ہے۔ مگر خودی کا وہ تصور جس پر اقبالؒ کی فکر کی تمام عمارت کھڑی ہے ایک پیچیدہ اور متعلق چیز ہے جو صرف ماہرین فلسفہ مابعد الطبیعیات کی ہی سمجھ آ سکتی ہے۔ دوسروں کے بس کی نہیں۔ یہی بات تصور عشق پر صادق آتی ہے۔ اس کا عام مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے لیکن جب اس کے دائرہ برکات کے تخلیقی ارتقا و وجدان اور لفظی کے میلان اقتدار سے جاملتے ہیں تو ہم بے رحمہ دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ یہ سب کیا ہے تصور کیا تو ان سب سے پیچیدہ چیز ہے، اس کا ذکر یہاں کیا۔ اسی طرح ان کے کلام میں امامیہ نبویؐ اسلامی فلسفہ و حکمت، متکلمین و حکاک کے شہ پارے، صوفیہ وائمہ کے خیالات، اہل عرفان اور اہل کشف کے مقامات و احوال کی طرف جا بجا اشارے اور گزشتہ سطر سے تیرہ سو سال میں اسلام کے آغوش میں پلنے والی مذہبی، علمی، سیاسی اور ذہنی تحریکوں کی تاریخ، اقوام عالم کے قدیم و جدید معیانات، ملل و مذاہب کا جدید ارتقاء، خلافت، سلطنت اور ملکیت کا عروج و زوال، مغرب اور حکمائے مغرب کے فطری اور تصورات، غرض انسانی تہذیب تمدن کے تمام اہم پہلوؤں پر حکیمانہ تبصرے ملتے ہیں۔ جن سے واقفیت کلام اقبالؒ کے مقصد و تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یوں تو اقبالؒ کا نام سن کر ان کے کلام کو پڑھ کر بہت سے لوگ سردھنتے ہیں اور واہ واہ کہتے ہیں مگر ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو فحش اور ناکش کی خاطر ایسا کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کا سا کلام پڑھنے کے بعد ایک سیدھی سادی بات جو ایک عامی کی سمجھ میں بھی آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو پہچانے اور ان سے کام لے،

روحانی تجربہ و احساس کے رشتے سے اس تصور تک پہنچے ہیں اور اقبال فکر کے رشتے سے۔ اسی لئے اقبال کے ہاں وہ مستی و سرشاری، وہ فانیگی، وہ سپردگی، وہ سیلابی کیفیت نہیں پائی جاتی جو روحانی کے ہاں ملتی ہے۔ تجربہ و تاثیر کی شاعری میں جو عالمگیر اپیل ہوتی ہے وہ خیالات و افکار کی شاعری میں نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ جب اقبال بچہ و تاب رازمی کے زیر اثر شعر کہتے ہیں تو خشک و بے مزہ فلسفہ طرائف ہوتی ہے اور جب سوز و ساز روحی کے زیر اثر تو تیغ آبدار۔ اور یہی حصہ کلام آفاقی کہلاتے کا مستحق ہے کیونکہ یہ پھر لانا تاثیر ہے اور اس کی اپیل عام ہے۔ منظوم خیالات و افکار بطور ضرب المثل اور قابل حوالہ جگات QUOTABLE MAXIMS کے تو خوب ہوتے ہیں لیکن ان کا خطاب زیادہ تر پڑھنے والوں کے دماغ سے ہوتا ہے نہ کہ دل سے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ”ساقی نامہ“ پر نظر ڈالئے۔ یہ اقبال کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر انگیز اور کامیاب حصہ وہ نہیں ہے جہاں زندگی موت اور خودی کے مسائل چھیڑے گئے ہیں بلکہ یہ ہے :

شراب کہن پھر بلا ستیا	وہی جام گردش میں لانا
مجھے عشق کے پر کا کر اڑا	مری خاک جگنوین کر اڑا
خرد کو خلائی سے آنا دکر	جوانوں کی پیروں کا انا دکر
ہری شاخ ملت ترے نام سے	نفس اس بدن میں تیرے دم سے
تیرے پھر کھلنے کی توفیق دے	دل مرتضیٰ سوز صدیق دے
جگمگے وہی تیر پھر پا کر	تنہا کو سینوں میں بیدار کر
تمہے آسافوں کے تاروں کی خیر	زمینوں کی شب زندہ طلوع کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے	مرحشقی میری نظر بخش دے
مری ناؤ گر داب سے پا کر	یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بنا مجھ کو اسرار مرگ و حیات	کیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدہ ترکی بے خوابیاں	مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نازیم شب کا نیاز	مری خلوت و انجمن کا گداز
انگیں مری آرو میں مری	امیدیں مری جستجو میں مری
مری فطرت آئینہ مرگ و زگار	غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل مری زندہ نگاہ حیات	گمانوں کے لشکر عین کائنات
یہ کچھ ہے ساقی تاریخِ فخر	اسی سے فیروں میں میں ہوں کہ

مرے قافلے میں ٹانہ دے لے ٹانہ دے ٹھکانے لگا دے لے
اس حصہ نظم میں اقبال کی قلبی کیفیت اور تڑپ لے تاثیر پیدا کی ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی اسے پڑھے اور متاثر نہ ہو اب درامقابلہ کے لئے ان اشعار کو بھی دیکھیے :

یہ موج نفس کیا ہے ؟ تلوار ہے
خود کی کیا ہے ؟ تلوار کی دھار ہے
خود کی کیا ہے رازِ درون حیات
خود کی کیا ہے بیداری کائنات
خود کی جلوہ بدست و خلوت پسند
سند رہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تاب ناک
من تو سے پیدا من تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

وغیرہ، وغیرہ۔ یہ پڑھتے ہوئے ہم ہر شعر پر لک کر سوچنے اور سمجھنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں کچھ سمجھ میں آتا ہے، کچھ نہیں آتا۔ غرض دماغ کو حرکت ہوتی ہے دل کو نہیں کیونکہ ایسے مقامات پر مفکر اقبال شاعر اقبال پر مادی ہے۔

علیحدہ اور فکر کے غلبے نے اقبال کے کلام پر جو اثرات پیدا کئے ہیں ان کا سرسری سا جائزہ ہم لے چکے ہیں۔ آئیے اب اک اور نکتہ پر غور کریں۔ اقبال کی رفعت تخیلی اور بلند فکری انہیں ایسے اونچے مقام پر پہنچا دیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری اس دیکھی بھالی دنیا اور اس کی مادی جذبہ بانی زندگی سے قطع نظر کے اونچے اونچے بادلوں میں بیٹھ چکے نہ مشورے عمومی انداز میں دے رہے ہیں اور اگر کہہ جائے آپ کے مابین نہیں آتے۔ ہمارے روزمرہ کے دکھ درد اور لطف و مسرت ہمارے روزمرہ کے تجربات و مشاہدات میں شریک نہیں ہوتے۔ نہ ہمارے ساتھ چلتے ہیں نہ ہمارے ساتھ دوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی دنیا تصورات اور فکر تخیلی لطیف دنیا ہے جہاں مادی زندگی خال خال ہے۔ وہاں فرشتے خدا ربلیں اور مختلف لوگوں کی رو میں تو بہت ہیں مگر گوشت پوست کے

قرآن السعیدین

(غالب اور اقبال: ایک تقابلی مطالعہ)

سید قدس نغوی

تا حالہ سد کہ دیوار کا رخ دالائے سخن در چہ پایہ بلندست و سر رشته رکند
خیال در آں فرازستان بکد ایں ذر وہ بند
دقیقت ہمدی بغاں بگزرم ز رشک غار صبت پہلے غزیاں خلیدہ باد
اس دعا کے سجا بہم نے کا اظہار شیخ عبد القادر رحم نے اس طرح کیا،
غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ
کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی شعر کی
سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو ہم میں جا لگایا۔ چنانچہ دیکھو اور مجبور
کیا کہ وہ بکھرے جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے
اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم
لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

لیکن میرے نزدیک روح غالب کو تناسخ کے چکر میں مبتلا کرنے
کی ضرورت نہیں بلکہ ان کی آرزو ”چوں من بجزو سرا پائے گفتار گردیدہ“
باب اہایت نکت پنجمی و سجا بہم ہوئی اور محمد اقبال کا قالب اختیار کیا۔
دعایہ اتفاق ہے کہ جاوید نامہ میں بھی غالب نے اقبال کو ”چوں من“
ہی سے خطاب کیا ہے جس نے ”دیوار کا رخ دالائے سخن“ کی بلند
اور ”کند خیال غالب“ کی رسائی کے متعلق کہا ہے

فلانسان ہر تری ہستی سے یزدن ہوا ہے ہر مرغ تخیل کی رسائی تاکھا
اقبال و غالب ہیں قدر مشترک، ایک حقیقت ثابت ہونے کے
باوجود تحقیق و جستجو کی محتاج، اور اتنی طولانی جگہ ”سفینہ چاہیے اس بحر
بیکراں کے لئے“ مگر کراہیاں دراز سے دراز تر ہیں کی بدولت، مہرمت
کا دوبارہ شوق کہاں؟ ”بیان مجل ہی ہر آغا فکر نے بن پڑی، لیکن
”میرے اجمال سے کتنی ہے تراوش تفصیل“ چنانچہ جس سبک کا سلسلہ
فغانی سے شروع ہوا وہ غالب و اقبال پر اگر ختم ہوا، غالب کے خیال میں

ہر نابغہ دہر کی نگاہ ماضی پر بہت گہری ہوتی ہے۔ بادی نظر
میں جو امور غیر اہم اور جرقہ فوش بہم وغیرہ واضح ہوتے ہیں اور جن کو عوام و خوا
قابل اعتنا نہیں گروانتے، عظیم ہستی انہی سے حال کی زبونی کا اندازہ اور
مستقبل کی درخشاں کا سامان بہم پہنچاتی ہے گویا ماضی سے فیض پاتی اور
حال و مستقبل کو فیض یاب کرتی ہے۔ اس اقتساب کو تقلید سے موسوم نہیں
کیا جاسکتا۔ دئے سے دیا جلتا ہے تو روشنی میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اہل ماضی
قدر مشترک کا راز نہیں ہے۔ غالب اور اقبال دونوں عظیم شاعر ہیں۔
غالب پیشرو، اقبال دور مابعد کے نمائندہ۔ اسی لئے اقبال نے غالب
سے آگے قدم رکھا۔ غالب اپنے تجربے، ذوق، شوق، کاوش سے
کا رواں کو جس منزل پر چھوڑ گئے تھے اقبال نے اس منزل سے فائدہ کو آگے
بڑھایا۔ غالب نے جو چند بہم نقوش، ناتمام خاکے اور دھندلے تصور چھوڑے
تھے وہ ایک دور آئندہ دور ارتقا کی طرف راہنمائی کرتے تھے۔ بات یہ تھی
کہ فاش تر کہنے کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا۔ یہ فاش تر گوئی ازل سے اقبال کے
لئے مقدر ہو چکی تھی۔ غالب نے جس ساز کو چھڑا تھا، لوگوں کے کان اس
سے نا آشنا تھے۔ مگر غالب کے اس ساز کی صدائے اقبال کے تیز آہنگ
کے لئے ایک فضا ہموار کر دی۔ اس ساز کی صدا سے عوام کی نا آشنائی کا
لمحہ غالب نے متعدد بار کیا اور آئندہ مقبولیت کی پیش گوئی، ان کے
ذوق سلیم، شعور کامل، و جلال خاص اور خود اعتمادی نے کراہی دی:

گو کہم لا در عدم اوج قبولی بودہ است

شہرت شعوم بہ گیتی بعد من غا ہر شدن

اس پیش گوئی کے حق ثابت ہونے میں کسے کام؟ بالکل اسی طرح تمام
اہل ان کی آرزو بھی پوری ہو کر رہی:

”یاب ایں از من چوں من گرد سرا پائے گفتار گردید یا زنی

فارسی شاعری کے یہ ادوار تھے :

”رودکی و فردوسی سے لیکر غنائی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔ پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے۔ غنائی اور ایک شیوہ خاص کا مہذع ہوا خیال ہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و لدنی نے، سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد کے صاحبان طبع نے سلاست کا چربا دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدوسی و حکیم شغائی اس زمرے میں ہیں۔“

یہ آخری سبک غنائی کا ہوا جس کے اوصاف، خیال ہائے نازک، معانی بلند، سلاست بیان اور جدت ادا ہیں۔ جس میں بعد کو خیال بندی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی کا اضافہ ہوا۔ مولانا شبلی نے اس اضافہ کو عرفی سے متعلق قرار دیا ہے۔ غالب و اقبال کے کلام میں یہ اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ سبک جو غنائی سے شروع ہوا وہ برصغیر پاک و ہند میں اورج کمال پر پہنچا۔ کیونکہ ہندو کبریٰ میں جو شعراء ایران سے آئے اپنے ساتھ ہی طرز لائے، پاک و ہند کی آب و ہوا نے اس میں رنگ و بو دے دیکھو اور ”ورائے شاعری چیزے دگر“ بنا دیا اسی بنا پر ”سبک ہندی“ ایک الگ نام قرار پایا۔ یہ سبک غالب تک پہنچے پہنچے بڑا گھیر ہو جاتا ہے اور سلجھ بھی جاتا ہے۔ غالب نے اس کے بہترین اور نمائندہ شعراء کا ذکر کر دیا ہے۔ ناصر علی اور بیدل اہم شاعر ہوتے ہوئے بھی اس گروہ سے الگ ہو جاتے ہیں کیونکہ اس طرز میں بے اعتدالی سخت مضرتناج پیدا کرتی ہے۔ خاص طور پر بیدل بے اعتدالی کے شکار نظر آتے ہیں۔ یہ بے اعتدالی، پُر تیج تشبیہات و استعارات اور صرف خیال بندی ہے۔ بیدل کے ہاں دلی کیفیات و واردات کا فقدان ہے اور خیال بندی کی بہتات۔ مگر غالب نے مشق سخن طرز بیدل ہی کو شریع کی اور کہہ اٹھے :

طرز بیدل میں رختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہو

یہ غالب کا پہلا اجتہاد تھا کہ اردو میں ایسی طرز کی بنیاد رکھی جس کو فارسی میں نہانا کارے دارو، چہ جائیکہ اردو میں طرز بیدل میں مشق سخن کرنے سے غالب کو نقصان بھی پہنچا اور فائدہ بھی۔ نقصان یہ کہ ایک مدت تک وہ ”مضمون خیالی“ نظم کرتے رہے اور بقول خود ”بیشتر از فراخ روی ہے جاہد ناشناساں بروائے وکتری رفتار آناں را لغرض مستح

انکاشے“ اور فائدہ یہ کہ دوزار کار تشبیہات و استعارات کی جستجو میں قوت مخیلہ تیز سے تیز تر ہوتی گئی جس نے سلامت روی کے دور میں بڑا فائدہ پہنچایا۔ اقبال بیدل وغیرہ کی بے اعتدالی کے شکاں ہیں ہوئے کیونکہ ان کے سامنے غالب کا ہوا رکھا ہوا راستہ موجود تھا۔

غالب اور اقبال دونوں اردو اور فارسی کے شاعر ہیں۔ انداز سخن و علوئے تخیل میں یکساں، فلسفہ کے مذاق اور ژرف نگاہی میں ہم کمر۔ اقبال نے اسلوب بیان غالب ہی کا اختیار کیا۔ وہی نادر تشبیہات و استعارات، وہی جدت ادا، وہی نزاکت خیال، وہی معانی کی بلندی وہی دقت پسندی غالب کا طرہ امتیاز، قدر تو انائی لہجہ، اقبال کے ہاں دو آتشہ، سہ آتشہ، بلکہ چہار آتشہ بن گئی ہے دیکھئے :

مکن نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

یہی بات اقبال کے ہاں چہار آتشہ بن کر کچھ اور صورت اختیار کر لیتی ہو۔ غالب سوال دیدار یا امید جلوہ کے قابل ہیں مگر اقبال کہتے ہیں :

تا کجا طور پر در یوزہ گری مثل کلیم

اپنی مٹی سے عیاں شعلہ سینائی کر

نادر تشبیہات و ترکیب الفاظ و جدت ادا، استعارات، بیخ کی دونوں کے ہاں بہتات ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے : غالب :

دام ہر موج میں جو حلقہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا اگر مے ہو قطرے پر گہر مجھے نہنگ

ہر تو خود سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

ہم بھی ہیں ایک غنایت کی نظر بونے نہنگ

حسن در جلوہ گر بہانہ کشد منت غیر

ہر گل از خوشن مست آتش داماں زدہ

شادی و غم ہمہ سر گشتہ تراز یکد گراند

روذر روشن بود ایں شب تار آمد و رفت

اقبال کے کلام سے اردو میں ”ماہ نوہ“ اور ”گلشن سے چند شعر کافی ہیں۔ اور دو تین شعر فارسی کلام سے جت جتہ پیش کئے جاتے ہیں :—

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی عرقاب نیل

ایک مکر اتیرا پھر تلہے روئے آب نیل

چرخ نے پالی چلائی ہے عرو میں شام کی
نیل کے پانی میں یا پھل ہے سیم خام کی

جگنو کی روشنی ہے کاشا چن ہیں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

ہمہ آفاق کہ گیسرم ہنگام ہے اورا
حلقہ بہست کہ از گردش پرکارن بہست
یک لوارے سینہ تاب آورده ام
عشق را عهد شباب آورده ام
کرم شب تاب است شاعر و شبنان وجود
در پرو بالش فروغی گاہ بہست و گاہ نیست
واقبال کی غزلوں کا ہر حیثیت سے موازنہ کیا جاسکتا ہے لہٰذا
یہ قدر و شکر کی بہترین مثال ہیں:

غالب:-

سوفت جھرتا کھانج چکیدن دہم
رنگ شولے خون گرم تا بہیدن دہم
اختری خوشتر از نیم جہاں می باست
خود سپر مرا بخت جوان می باست

اقبال:-

مثل شرر ذرہ راتن بہتیدن دہم
تن بہتیدن دہم بال بہتیدن دہم
باریں عالم درینہ جوان می باست
رنگہ کاش صفت کہ و گران می باست

تمام تر شہرت ان کے پیام بیداری اور فلسفہ خودی کی وجہ
۔ غالب کے ہاں یہ دونوں باتیں منظم و مربوط یا باقاعدہ صورت
ماہیں لیکن ان دونوں کے نشانات ضرور ملتے ہیں جن سے
، نقاب کو ایک آئندہ دور لو تقا کا قوی احساس ضرور تھا۔ یا یہ
۔ زمانہ کو ایک ایسی آواز سے آشنا کرنا چاہتے تھے جس کی نے

آئندہ دور میں تیز ہونے والی تھی

بندگی میں بھی وہ آزادہ خود ہیں ہیں کہ ہم
اُٹنے پھڑکے در کعبہ اگر دانا ہوا
معنی بیگانہ خویشم تکلف بر طرف
چوں مسہ نو مصرع تاج ایجاد خودم
ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگرد نقطہ ما دور ہفت پر کار بہت
ز ما گرم ست ایں ہنگام بگر شور مچی
قیامت می دمدار پردہ خلکے کہ انسان شد

پیام بیداری کے متعلق بہت سے استعارے ہیں متعدد غزلیں ہیں پسند
غزلوں کے مطلع لکھے جاتے ہیں:

خیز بے اور دے را سرا ہے دریاب
شورش افزانگہ وصل کا ہو دریاب
سحر و میدہ و گل درد میدنت محب
ہاں جہاں گل نفلہ چیدنت محب

یہاں اقبال کی نظر ”از خواب گراں خیز“ سے اس غزل
کا مقابلہ کیجئے، خیز و محب کا انداز بھی دیکھئے

قراہ معنویان از شراب خانہ رست
فزون البلیاں فضلہ از فناء رست
مژدہ صبح دریں تیرہ مشابہم دادند
شمع کشتہ و زخویر شید نشانم دادند
بہا باغ و نقاب از رخ چین برکش
دل عددہ اگر خون شود در آذر کش
لے ذوق فاسخی بازم بخسروش آور
غوغائے شبیہوں نے بر رنگہ بوش آور
چوں کس پل پہل بندوق بلا برقص
جارا نگاہ دار دہم از خود جدا برقص
زخم کہ کہنگی ز قاتلش براقتنم
دہم رنگہ بونٹے دیکھا منتقم
بخت درخاست می خواہم کہ بیدار ش کنم
پانہ غوغائے عشر کو کہ در کار ش کنم

آہے عشق فاتح خیر کنیم طبع
درگسبد سہرگم درکنیم طبع
صبح ست خیز تافے درہم اشکم
از نالہ لرزہ در فلک عظم اشکم
ہما کہ قاعدہ آسمان بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
اگر بشرع سخن در بیان بگردانی
ز سوسے کعبہ رخ کارواں بگردانی

اردو کا مشہور قطعہ "اے تازہ طربان بساط ہولستہ دل" بھی

اسی انداز کا ہے۔

غالب اور اقبال دونوں تقلید سے متنفر تھے۔ دونوں نے
تقلید سے گریز کیا۔ دونوں کے ہاں اس کی مخالفت بھی موجود ہے۔ غالب:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی مضمون نہیں
تیش بغیر نہ سکا کوہن اسد
سرگشتہ شمار رسوم و قیود تھا
باہن میا ویز لے پیر، فرزند آفرم را نگر
ہر گشتہ صاحب نظریں بزنگان خوش نگر
انہی خیالات کو اقبال کے ہاں دیکھئے:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑے

جسہ خوش بودے اگر دیکھو پلے زبند پاکستان آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوہ خوب بیمبر ہم رہ اجداد رفتے

چاک کن پس ازین تقلید را تا بیا موزی از تو حمید را
چند متغیر خیال متفرق اشعار دونوں کے کلام سے پیش کیے جاتے
ہیں تاکہ اقدار مشترک کا صحیح طور سے اندازہ کیا جاسکے:

غالب:

صن فردغ شمع سخن دود ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

آفتہ ایم ہر سر خار سے بخون دل
قانون باغبانی صحرانوشہ ایم
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پایلا
دہر جز جلوت یکتائی مستحق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا فحش
آرائش جمال سے فارغ نہیں ہونہ
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
مذاق شرب نقر محمدی داری
مئے مشاہدہ حق خوشش ددم درکش
لرزه طبع میر خیال، وطن میں شوق کا ذال
موج محیط ہیں اسے ہر دست دیا کپول
گلت والا زنگست راتماشا
تو طاری بہارے کہ عالم نزارد
اقبال:

نقش ہیں سب تمام خون جسکے بغیر
نفس ہے سولہ تمام خون جسکے بغیر
برگ گل ریش زمخون من است
محصوع من قہر فون من است
تبی زندگی سے نہیں یہ فضا میں
یہاں سینکڑوں کارواں اٹکی ہیں
صوت گرے کہ بیکر درو شب آؤید
از نقش این و آن بہ تماشائے خود رسید
یہ کائنات ابھی ناقص ہے شاید
کہ آہی ہے فادم حدائے کن نیکیوں
مقام خویش اگر خواہی دریں دہر
بجو دل بند و راہ مصطفیٰ اد
تو نشانی ہنوز شوق میر و ز وصل
جلیست حیات دوم، سو خن تمام
لالہ این گلستاں داغ منشا داشت
ز گس طناز او چشم تماشا داشت

گھبرائے گی؟ وہی زمیں کاغذی طوبی کی ایک شاخ، چشم بدور ادھی
ایک حور۔

مثنوی: "اگر بار بار" میں یہ بات بڑے لطیف پیرایں بیان کی
ہے۔ خدا سے شکوہ کیا جا رہا ہے کہ دنیا میں مجھے مصیبتوں کے علاوہ اور کچھ
نہ ملتا، زندگی درد و غم، حسرت و یاس میں گزری۔ اگر مجھے بہشت ملی بھی
تو میرا دل ناامیدوں کو یاد کر کے وہاں بھی سکون نہ پاسکے گا۔ وہاں کی نعمت
دنیا کی نعمت کے مقابل میں بے کیف ثابت ہوں گی۔ کیونکہ شورش، ہنگامہ
خروش اور نیرنگیوں سے جنت خالی ہے۔

صبوحی خرم گزرتاب طہور کجا زہرہ صبح دھام بلور
دم شہروی ہا می مست نہ کو بہنگاہ: "خونائے مست نہ کو
دل پاک مجاہد بے فروش چنگا نش شورش نائے دوش
سیہ سنی ابرار کجا خزان چہ ناشد بہار کجا
اگر حور دل خیاں کچہ غم بجز روز وصال کچہ
چہنت نہ ناشناسانکھ چہلزدت دید وصال بے انتظار
گزیر دوم بوسہ انش کجا فریب بوسہ گند و نیش کجا
بردگم و دوش تلخ گوئی دیکام و دوش کام جوئی
نظر بازی و ذوق دیدار کو بفر دوس روزن بدیوار کو
چشم آرزو و منہ و لالہ نہ دل آشنہ ماہ پر کالہ

غالب کے انہی خیالات کو برنگ و گزاقبال کے کلام میں اس طرح دیکھئے۔
کجا این روزگارے شیشہ بازے بہشت این گنہ گروں ندارد
ندیدہ درد زنداں بوسہ او زنجانش دل نالاں ندارد
خلیل او حرف آتش نیست کلش یک شر در جان ندارد
ہر مرد نہفتہ ز درق او خطر از طمہ طوقاں ندارد
کجا آن لذت عقل غلط سیر اگر منزل رہ پیمان ندارد
مزی اندر جہانے کور زوقے کہ یزداں دار و دشیطان ندارد
پیام مشرق میں ایک نظم بعنوان "حور و شاعر" ہے، حور شاعر سے کہتی ہے
نہ با دہیل داری، نہ میں نظر کشائی

عجب این کہ تو دانی رہ درسم آشنائی
ہوئے آفریدی چہ جہان دل کشائے
کہ ارم بچشم آید چوں طلسم سیمائی!
شاعر جس نے پہلے حور و جنت کی طرف آنکھ اٹھا کر کئی نہیں دیکھا تھا

دونوں بالکمال شاعروں کے کلام میں قدر مشترک کا جلوہ فراہم
موجود ہے لیکن اس کی سب سے نمایاں مثال تصویر جنت ہے۔
غالب واقعات زندگی میں ہنگامہ، رستخیز، عمل ہیمن، حرکت مسلسل، بہر
لحظہ رنگ و گراور حیرتوں کے تمام کے قائل ہیں۔ حیات کو شوق و ذوق
دار و زو سے مضطرب مسلسل اور پہل و قصاں دیکھنے کے خواہاں ہیں جنت میں
ایک سکونی کیفیت ہوگی اور زندگی میں حرکت و نیرنگی کا فقدان اسی لئے
دونوں جنت سے بیزار ہیں۔ مگر حرکت و نیرنگی حیات کے مشاہدہ کا انداز
دونوں کے ہاں جلا کا نہ ہے۔ غالب زندگی کی حرکت، عشق کی رندی سی
اور اقبال عشق کی متانت و سنجیدگی بتاتے ہیں۔ مگر عشق دونوں کو کسی
ایک مقام پر گھمبہ نہیں دیتا۔ غالب کے خیالات و دھنوں میں بٹے
ہوئے ہیں ایک تو یہ کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش کھنے کو غالب بغیر اچھا
دو چیز جس کے لئے ہم کو بہشت عزیز سوائے بادۂ کفام و مشکو کیا
طاقت میں تار ہے نہ دھنوں کی لگا دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو
خوش است کوثر و پاک است بادۂ دروست

ازاں رچق مقدس دریں خمار چہ حظ
اور دوسرا یہ خیال کہ بہشت منزل نہیں بلکہ راہ طلب میں سستائے کامقا
ہے قیامت میں بہشت تو ایک طرف جو جان ہمیں دی جائے گی وہ بھی
نثار دوست دانش کردوں گا۔

راہیست ز عبد تا حضور اللہ خواہی تو دراز گیر، خواہی کوتاہ
این کوثر و طویئے کنشائے دارد سرچشمہ و سایہ ایست و تہمت راہ

اور است اگر ہزار چہریم بخشند اور است اگر بہشت نیزم بخشند
بر دست فدائیم بعد گونہ نشاط جانے کہ بروز رستخیزم بخشند
غالب نے بہشت کے متعلق اپنے خیالات جن میں عشق کی رندی
وہی کا اظہار شرمی کے ساتھ ہے ایک خط اور مثنوی "اگر بار بار" میں ظاہر کئے
ہیں۔

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں اگر مغفرت
ہوئی اور ایک قہر طرا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اس
نیک بخت کے ساتھ زندگی کافی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا اور کلیجہ
منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے! وہ حور جبرین ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ

حور کی بات کا جواب دیتا ہے ۔

چہ کم کہ فطرت من بہ مقام در سازد
دل نا صبور دارم چو صبا بہ لاله زارے
چوں نظر قرار گیرد بہ نگارے خور و سئے
نپداں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے ندارم کہ کمبسم از قرارے
چوں زبادہ بہارے قدحے کشیدہ خیزم
غزلے دگر سرایم بہ ہوائے نوبہارے
طلسم نہایت آن کہ نہایتے مدارد
بہ نگاہ ناشیکبے بہ دل امیدارے
دل عاشقان میرد بہیشت جاودارے
نہ فراتے روز و مندے نہ غمے نہ غمگارے

جاوید نام میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے جبکہ زندہ رود فردا سے
خصت ہونے لگتا ہے تو اس کو حوریں گھیر لیتی ہیں ۔ ایک دو دم باما
نشین ، با انشین ، کی صدائیں چاروں طرف سے بلند ہوتی ہیں ۔

زندہ رود جواب دیتا ہے ۔

راہرو کو داند اسرار سفر ترسد از منزل ز رہزن بیشتر
عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست بے حال لایزال آسودہ نیست
استدائیش بتاں افتادگی انتہا از دلبراں آزادگی
عشق بے پروا و ہر دم در حیل در مکان و لامکان ابن لیل
کیش ماما سند موج تیز گام اختیار جادہ و ترک حرام
اس مقام پر غالب کی یہ رباعی بھی قابل لحاظ ہے ۔

قانع نیم ارہشت نیزم بخشند از بخشش خاص تا بخیرم بخشند
امید کہ صرف رونمائے خوشد جانے کہ بروز رستخیزم بخشند
اقبال کا شکوہ جس نے بر صغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو
خوب گرا دیا تھا۔ اس کے آثار غالب کے کلام میں بھی ملتے ہیں کہ غالب
کے ہاں یہ احساس و شکوہ ایک فرد کا ہے اور اقبال کے ہاں ملی و
اجتماعی حیثیت لئے ہوئے ہے۔ غالب زیادہ تراہنی ذات کے گرد
گھومے۔ اور اقبال نے ملت اسلامیہ کی ترہانی کی۔ شکوہ کی طرح عقل و
دانش اور عشق کے موضوعات پر بھی یہاں روشنی ڈالی جاسکتی تھی مگر

طوالت ماننے ہے۔ بہر کیف غالب کی غزل کے شکوہ آمیز شعر لحاظ فرمائیے:
نہ مراد و است دنیا نہ مرا جرجیل نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل
باقیباں کف ساتی بجئے ناب کیم باغریباں لب لہجوں بدی آب بخیل
اقبال ۔ سمندر سے لے پیاسے کو شبنم

بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اے بے سار قضا وختہ چشم البیس بدم گرم رواں سوختہ بال جبریل
نکئی چارہ لب خشک مسمانے را اے بتر سا بچکان کدوئے نابیل
اقبال: قہ قویہ ہے کہ کافر کو لے حور و قصور

اور بچائے مسلمان کو فقط وعدہ و وعید

مثنوی اگر گہ بارہ میں یہ شکایت تیز تر ہے۔ بارگاہ احدیت
میں اپنی نامرادیوں اور ناکامیوں کا شکوہ کرتے ہوئے اپنی
حسروں کو بیان کیا ہے گویا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گز کا حساب اکلانہ انگ
کی تفصیل پیش کی ہے کہ قیامت میں حساب کتاب کے وقت میرے
جہم کے ساتھ میری حسرت کا مقابلہ بھی ہونا چاہیئے ۔

بروزی کہ مردم شوند انجن شود تازہ ہونند عین ہا بہ تن
در آن حلقہ من ہاشم دسینہ زغم ہائے ایام تنجینہ
ز بس تیر گہائے روز سیاہ نگہ خورہ آسیب دوش از نگاہ
دریں خستگی پوزش از من مجوی بود بندہ خستہ گستاخ گوی
دل از غصہ خوں شدہ بفتن چہ سود چو ناگفتہ دانی نہ گفتن چہ سود
ہمانا تو دانی کہ کانسر نیم پرستار خورشید آذر نیم
اقبال، شکوہ

محمد مجتہد اکہ رسول عربی کو چھوڑا

بت گری پیش کیا بت شکنی کو چھوڑا

حساب مے و رامش و رنگ و بو ز جمشید و بہرام و پرویز جو
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ بدلیوزہ رخ کردہ ہاشم سیاہ
نہ بستان سرائے نہ مے خانہ نہ دستا سرائے نہ جانانہ
نقص پری پیکراں بر براط نہ خوفائے رامشگراں در براط
افقہا پر از بہر بہمن ہی سفالینہ جام من انے ہی
ہاں عمر ناخوش کہ من و کشتم زجاں خار و در پیرین داشتیم
بفرمای کایں داوری چون بود کہ از جرم من حسرت افزوں بود

شوق بے حد پروہ ہمارا بردو کہنگی را از تماشای بردو
یہ دہلوں شعور غالب کے اس شعر کی تفسیر میں ہے
رقم کہ کہنگی ز تماشای بردو

دربزم رنگ و بونٹے دیگر فگنم
قرۃ العین طاہرہ کا جواب ختم ہوتے ہی زندہ رود غالب سے
اردو کے اس شعر کے معنی پوچھتا ہے :-

قری کف خاک تر و بلبل قفس رنگ
لے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

علامہ نے نشان جگر سوختہ چہیت سے ترجمہ میں مدحت پیدا
کر دی ہے۔ اس شعر کا جو مطلب علامہ کے ذہن میں تھا۔ اس کو انہوں
نے غالب کی زبانی ادا کر لیا ہے۔ ماحصل اس شعر میں آگیا ہے :-

توزدانی این مقام رنگ بوست
قیمت ہر دل بقدر لہئے ذہنت

اس کے بعد زندہ رود غالب سے مشہور مسئلہ "اعتناع النظیر
خاتم المسلمین" کے متعلق سوال کرتا ہے کہ اس نیلی فضا میں سیکرل چہا
ہیں کیا ہر دنیا کے لئے الگ الگ اولیاء و انبیاء ہوتے ہیں؟ غالب کے
جواب میں ایک شعر خود لکھا ہے اور دوسرا غالب ہی کہے:

نیک بنگر اندریں بود و نبود پے بسے آید جہاں باور وجود
ہر کجا ہنگامہ عالم بود رحمتہ للعالمین ہم بود
غالب سے "فاش ترکو" کی فرائض ہوتی ہے جواب "فاش"
گفتن خطاست" ملتا ہے۔ غالب "گفتگوئے اہل دل بے حال است؟"
کے جواب میں نکتہ برابر رسیدن مشکل است" کہہ دیتے ہیں۔ اس پر
زندہ رود کہتا ہے :-

توسرا پا آتش از سوز طلب بر سخن غالب نیابی لے عجب!
اس کے جواب میں غالب تھوڑی سی وضاحت اور کرتے ہیں
کہ خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا اور رحمتہ للعالمین انتہا ہے مگر زندہ رود
اس سے زیادہ اسرار کی نقاب کشائی کا طالب ہوتا ہے۔ غالب جواب
دیتے ہیں :-

لے چوں من بیندہ اسرار شعر این سخن افزوں ترست از اسرار شعر
شاعران بزم سخن آراستند این کلیہاں بے بدیضا مستند
آہنچہ تو از من بخواہی کافری کافری کو باور لے شاعری

باقی صفحہ ۵۷ پر

غالب کی شخصیت اقبال کے لئے بڑی پرکشش رہی ہے جس
کا اہل مختلف مواقع پر وہ کرتے رہے ہیں جو ایک طرح سے اعتراض غفلت
غالب اور اتحاد معنوی کا پہلو ہے۔ علامہ کو یہ شعر بہت پسند تھا جس کو
بہ عنوان غالب انہوں نے جبکہ دی ہے:

تباہہ تلخ تر شود و سینہ زیش تر
بگذازم ز بگینہ و در ساغر فگنم

اقبال کے نزدیک یہ شعر غالب کی زندگی کا ماحصل تھا۔ اعتراض غفلت
و اتحاد معنوی کا پہلو "جاوید نامہ" میں بہت نمایاں ہے۔ ارواح جلیہ
حلاج و طاہرہ کے ساتھ غالب کی روح بھی ہے۔ غالب کا وہی تصور
جنت کہ اس میں ہنگامہ حیات نہیں، ان کو جنت میں نہیں رہنے دیتا
اور "سیر دوام" میں مبتلا رکھتا ہے۔ اقبال کا "جاوید نامہ" ان کا ادبی
معراج نامہ ہے جس میں اپنے خیالات کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے
"جاوید نامہ" کا سلسلہ معراج ناموں سے ملتا ہے۔ دانتے کی "طرہ سیر
خداوندی" بھی اس سلسلہ میں زیر بحث آسکتی ہے۔ غالب نے بھی
اپنی مشنوی گہر یار میں "معراج" کو نظم کیا ہے۔ دونوں میں فرق ہے
غالب نے معراج نبوی کو بیان کیا ہے اور اقبال نے اپنی معراج ذہنی
نظم کی ہے۔ البتہ کہیں کہیں مراحل و منازل کے بیانات میں مماثلت
بھی پائی جاتی ہے۔ علامہ کی مشنویوں کے مقابلہ میں غالب کی مشنویوں
کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ یہ اجمال ذرا تفصیل کا محتاج ہے اس لئے کسی
آئندہ صحبت میں عرض کروں گا۔

"جاوید نامہ" میں فلک شتری پر ارواح جلیہ و حلاج و
غالب و قرۃ العین طاہرہ کو پیش کیا ہے۔ آخر میں اہلسن نمودار ہو کر
زندگی کا راز، سوز و غم و فراق دوام بتاتا ہے۔ منصرف حلاج کے
افکار علامہ نے خود ایک غزل کے ذریعہ پیش کئے ہیں۔ غالب کی مشہور
غزل "بیاد قاعدہ آسمان بگردانیم" غالب ہی کی زبان سے ادا کرائی ہے
طاہرہ کی بھی ایک غزل اسی طرح پیش ہوئی ہے۔ پیر و می زندہ رود
سے کہتے ہیں کہ ان سے سوالات کر کے اپنے دلی شکوک دور کر لے زندہ رود
اپنی مشکلات بیان کرتا ہے۔ پہلے حلاج سے سوالات ہیں وہ جواب
دیتا ہے۔ طاہرہ سے کوئی سوال نہیں کیا گیا وہ حلاج کے بعد ہی اسی
سوال سے متعلق اپنا بیان شروع کر دیتی ہے :-

لو گناہ بندہ صاحب جنوں کائنات تازہ آید بروں

اقبال کا انسان کامل

سحر یوسف زئی

آتی ہے کہ اقبال کو قوم کی زبوں حالی نے بہت بے چین کر رکھا تھا مگر درد کا دریاں کیا ہونا چاہئے، اس کی صحیح راہ بھائی نہ دیتی تھی۔ تاریخ، فلسفہ اور روایات، ان سب کو اقبال نے مولانا گلام میں جو گرمی اور روشنی بعد کو پیدا ہوئی اس کا سراغ ابتدا میں کم ہی نظر آتا ہے، گو صبح صادق کا کرن دکھائی دیتی شروع ہو گئی تھی۔ دعا یہ ہے کہ یہ دور تلاش و تجسس کے عالم میں گزرا۔

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چھپتا ہوا کا شا دل انسان میں ہے

حمزہ گیر مصلحوں کے مقابلہ پر اقبال کی سوچ مختلف تھی اور خود اپنے قول کے مطابق خودی کا تصور ان کے سفر انگلستان سے قبل ہی ذہن میں مرتب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خودی کی تلقین سے انہیں قوم کی اصلاح کی راہ نظر آتی تھی۔ چنانچہ قیام یورپ کے دوران جب ڈاکٹر بیٹ کے لئے مقالہ تحریر کرنا شروع کیا تو اس میں بھی انہوں نے اپنے اس نقش اول کو شامل کر لیا تھا مگر اس خیال کو بچگی اور بلوغ بعد کو پہنچا۔ یہ کیا عناصر تھے، اس کا ذکر آئندہ سطروں میں آئے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اقبال نے فارسی کی ابتدائی تعلیم مولانا میر حسن سے حاصل کی۔ قیاس ہے کہ رومی کی شہنوی سے ذوق بھی اسی دور میں پیدا ہوا ہوگا، چنانچہ بعد میں تو انہوں نے رومی کو اپنا پیر و مرشد معنوی قرار دے ہی لیا تھا۔ ممکن ہے ان کے ذہنی علمبان کو رنغ کرنے میں رومی نے رہنمائی کی ہو کیونکہ وہ انسانی ارتقاء وادی و روحانی دونوں کے قائل اور وقت عمل کے شیدائے تھے۔ وہ انسان کے جمادات سے نباتات تک اور پھر حوا و نباتات تک ارتقاء کو کافی نہ سمجھتے تھے بلکہ ملائکہ حتیٰ کہ سجدہ ملائکہ تک انسان کے عروج کو دیکھنا چاہتے تھے۔

لیکن اقبال کو سب سے بڑی تحریک خود فہم قرآن سے پیدا ہوئی ہوگی وہی بتاتا ہے کہ انسان کی برگزینی کا مقام کیا ہے اور وہ نیا بت الہی کا کینہ

انسان کامل کا تصور اقبال کے فلسفہ کا محور ہے اور یہی ان کی شاعری کی اساس۔ اقبال نے انسان کے کردار کو بھارنے میں اپنی شائستگی کے ہلکے اور تکیہ دونوں ہی رنگ استعمال کئے ہیں اور اپنے فلسفے کے تانے بانے میں بن کر اسلام کی اصل روح اور اس کی بلند اقدار کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ خودی، عشق اور فقر نبیوں ان کے مقامات تک ہیں مگر فلسفے کی موٹنگا فیوں اور مسائل کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ان حوال پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جنہوں نے اقبال کو اتنیان بخشا۔ اقبال کو جو عہد ملا اس میں صحت مند اور غیر صحت مند دونوں ہی عناصر پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھے۔ قومی زوال تو ابھی چکا تھا مگر اسے سحر کرنے کی تدا بہر بھی ہو رہی تھیں۔ سرسید نے قوم کے مرض کا حل سوچا تھا اور اس کے لئے بڑا کام کیا تھا۔ شبلی اور اکبر نے اس کام کو آگے بڑھایا اور ان سب اکابر نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر سوچنا شروع کیا اور اپنے اپنے فکر و فن سے قوم کی اصلاح و تعمیر کی تدابیر بتائیں مگر سوال یہی تھا کہ نئے علوم اور نئی روشنی سے مسلمانوں کا گریز ختم ہو۔ حالی نے ماضی کا افسانہ چھوڑا اور نئے عہد کا ترانہ بھی سنایا۔ مقصود یہی تھا کہ قوم کو نئے برگ و بار نصیب ہوں اور وہ پھر فاتح عالم بننے کا کردار ادا کر سکے۔ اسی طرح شبلی اور اکبر کا کام تھا۔ یہ سب کوششیں اچانے لٹی میں بڑی مدد ثابت ہوئیں۔ اقبال نے ان درو مند ان قوم کی جلالتی ہوئی مشعل کو اور زیادہ فروغ دیا۔

اقبال شروع ہی سے قوم کے درد سے آشنا اور دلگیر تھے اور مدد و اکی تلاش میں تھے۔ ابتدائی کام میں بھی اصلاح کا پیغام اور قوم کو ابھارنے کی صدا گونجتی سنائی دیتی ہے۔ کچھ اور جو اس لوگ بھی شعر کے وسیلے سے قوم کی اصلاح و ارتقاء کا کام لے رہے تھے مگر ان میں بھی اقبال متا نظر آتے ہیں۔ بانگ درا کے مطالعہ سے یہ بات تو بخوبی سمجھ

نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلمانوں کے تو اُسے بلی مضحل ہو گئے۔ مذہبی حلقہ ہی نہیں سالہ معاشرہ فراریت کا شکار ہو گیا۔ اس کے نتائج سن سٹاون کے انقلاب تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اس کے بعد بھی مسلمانوں کی رہی ہی قوت کا تعطل و مہولیت کی زد ہو گئی مسلمان ان قدروں سے دور ہو گئے جو دنیا میں خواجگی و سرہندی کا موجب بنتی ہیں۔ معاشرہ کے اس آشوب میں معاشی تار و پود بھی بکھ گیا اور مسلمان قومیت کے قبضے میں چلے گئے۔ اگر قومی یا سمیت کی تصویر کھینی ہو تو راد و شاعری پر نظر ڈالئے۔ تیسرے فانی تک ہر شاعر ہی زہر کا نشتر شعوری یا لاشعوری طور پر جسمیات میں پرست کرتا نظر آتا ہے۔ اقبال کی تمام تحریریں اس فلسفہ اور اس سے پیدا شدہ نتائج کے خلاف ایک جہاد ہیں۔ گرا نہیں نے اس کا مدد ا بھی بتایا ہے اور انسان کا دل کا تصور سہارے سامنے رکھا ہے جس کے لئے خودی کو بیدار کرنا پہلی منزل ہے۔

تصوف کی ایک غلط تاویل توکل و تقدیر بھی ہے۔ جب تو اُسے عمل مفلوج ہو جائیں تو مستقبل کی تاریکی سال میں بھی بھاگتی ہے۔ ہر طرف بیکراں اندھیل پھیل کر ترقی کی راہوں کو مسدود کر دیتا ہے اور سکون یونہی ملتا ہے کہ اپنی بے عملی کے نتیجوں کو کسی اور کے سر مقوپ دیا اور عمل کی بجائے یہ کہہ کر بیٹھ رہیں:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرا میں کیا

اقبال نے یورپ جا کر دیکھا کہ اس قسم کے حالات میسیت کو بھی پیش آئے تھے۔ ان کا مقابلہ کرنے کی بجائے وہ نیکی اور فلاح کا راستہ اس ہی میں سمجھنے لگے تھے کہ ”بھٹیس بن جاؤ“ اگر کوئی بھٹیا یا تھاری بڑیاں چباتا ہو تو چبانے دو، کان تک مست ہلاؤ ورنہ زندگی میں فرق آجائے گا۔ اس کے خلاف ڈارون کا انقلاب انگیز نظریہ نتائج لہذا ”کاسہ ہلکے“ لٹھے نے ایک احتجاجی آواز بلند کی اور اس غلامانہ اخلاق کی بجائے شاہانہ اخلاق یعنی جرأت، تہور، زور سمجھی، قوت اور پندار و اقتدار کو ہی زندگی کی اعلیٰ قدریں قرار دیا۔ وہ عیسائیت سے اس قدر نفور ہو گیا تھا کہ مذہب و مذہب سے سے خدا کے درجے سے بھی منکر ہو گیا اور تفاخر کو ہی اخلاقیات کی اساس قرار دیا۔ اس نے جذبات میں آکھٹہ

جلالی اخلاق پر ہی اپنے فوق البشری سیرت استوار کی جس میں روحانیت اور بقا کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اس کی بہترین مثالیں ملاکو، چنگیز، نوبلین،

مزد و اس ہے۔ یہ سب باتیں اقبال کے فکر میں موجود تھیں مگر لاشعوری طور پر۔ مغرب میں پہنچ کر انہیں مادہ کی سرہندی دکھائی دی، معاشی و فطری انگریزیت ہی اخلاقی بستی بھی مشاہدہ کی۔ یہاں انہیں اصلاحی تحریک اور سیرت سازی کے مواد پر بھی عبور حاصل ہوا۔ تیسرا عنصر جس نے فکر اقبال پر اثر ڈالا تھا ”ابن عربی کے خیالات تھے۔ اپنے مقالہ کی تحریر کے وقت انہیں تصوف کی تباہ کاریوں کا بھی علم ہوا۔ اور انہوں نے اسے زوال ملت اسلامیہ کا ایک سبب مانا۔ مغرب کے مشرق پر تباہ کن اثر بھی ان کی نظر میں آئے اور انہی تمام باتوں پر غور و فکر کا سلسلہ جاری رہا۔ یہی چیزیں بصیرت اقبال کی اساس بنیں۔

اقبال نے تصوف کو بھی مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب مانا ہے۔ خاص کر وحدت الوجود جس نے مسلمانوں کو بڑا فقہان پہنچایا۔ یہ مسئلہ خالصتاً علمی نثر ادب ہے۔ ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان میں فعل ہو گیا ہے شعر واد و موصیاء اس کے خاص طور پر شائق بلکہ مبلغ تھے۔

میر درد کا یہ شعر اس فلسفہ کی ایک مختصر تفسیر ہے:

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

رفتہ رفتہ یہ عوام پر چھانے لگا اور وہ عمل اور جہاد زندگی کے میدان سے دور ہونے لگے دنیا کو کارزار حیات سمجھنے کے بجائے اسے بھگ اور صرف گزشتہ شے ملنے کی دھن ہر ایک پر ہوا تھی۔ ہر ایک اسے فریب اور دام خیال ہی سمجھتا تھا:

ہستی کے مت فریب میں آجا تو اسد

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔

اس پر اقبال نے اپنے ایک خط میں یہ احساس ظاہر کیا ہے:

”ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ

فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ فلسفہ کے

زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان

اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ ہے۔ میرے

عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے

بھی زیادہ خطرناک ہے“

اس فلسفہ میں اپنی ہستی کو بھلا دینا اور یا سے دامن بچا کر نکل جانا ہی نہ تھا حیات مانا گیا ہے۔ یعنی دنیا میں سے کم سے کم حصہ لینا ایک نیکی شمار ہوتی۔

اور پہلے میں نظر آتی ہیں۔

مقصداً اول ہے۔

ان مقالات میں سے اکثر کی تشریح علوم جدیدہ کی روشنی میں کی جاسکتی ہے مگر بعض نکات ایسے ہیں کہ کھنکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر صرف ہمارے سے کام لیا جائے تو اندیشہ ہے کہ مجموعی بہتیت کو نقصان پہنچے۔ بہر کیف خودی کے باب میں خود اقبالؒ کا ارشاد یہ ہے:-

زمانہ کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کا بہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
و مادم نگاہیں بدلتی ہوئی
ازل سے یہ کھٹکشی میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خاک آدم میں صورت پذیر ہونے اور زمانے کے دریا میں بہتے رہنے سے ایک ارتقا پذیر انسان کی شکل ذہن میں ابھرتی ہے۔ یہ شکل اس انسان کی ہے جس میں ابھی خودی کا نشیمن نہ بنا تھا۔ جس میں روح پھولنے کے بعد سے ارتقا جاری تھا۔ قرآن حکیم کی روش سے انسان کے پتلے کو مٹری ہوئی کیچڑ سے بنایا گیا۔ پھولس میں نفس، جو امری تھا پھولنگا گیا۔ پھولس کے جسم سے حق کا پیدا ہونا بھی ملتا ہے۔ انسان کو خدا اپنے نائب کا مقام عطا کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اسے جب دیگر انواع اور فرشتوں پر فضیلت دینی مقصود ہوئی تو علم الاسما دیا گیا۔ یہ علم الاسما کی توحیح اور تشریح تھا۔ اس لئے ان پر فضیلت کا موجب بنا۔ علم الاسما کی توحیح اور تشریح طوالت طلب ہے۔ اگر اس سے بحث نہ بھی کی جائے تو بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان کو شعور صادق حاصل ہوا۔ یا اس میں خودی کی پہلی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد جنّت آدم اور ابلیس کا مسئلہ بھی چلے سارے سامنے آتا ہے۔ انسان نے جو پہلی حکم برداری کی اور اپنے ادا دے اور عمل کی غلطی کا اعلان کیا۔ وہ خودی کے پورے طور پر طے کی طرف اشارہ ہے بہر حال آدم کے بارے میں اقبالؒ "اہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید میں لکھتے ہیں:

"جنت میں آدم کی زندگی دراصل انسانیت کے
اس ابتدائی دور سے عبارت ہے جبکہ اس میں
احساس خود کا پیدا نہ ہوا تھا۔ اور اس لئے اپنے
ارادے اور علم کی قوت سے ماحول سے مطابقت
کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اس کا دل آرزو اور حقیق

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، انسان کامل کے بارے میں اقبال کے فکر میں کچھ مضمّن خطوط درپوش جانے سے قبل ہی پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے مگر جب خارجی تحریکات قوی ہو گئیں تو ان کی تمام تر وجہ اس سلسلہ پر مرکوز ہوئی۔ اقبال اور دیگر مفکرین کے یہاں انسان کامل کے ارتقائی صفات میں کہیں کہیں مماثلت یا تطابق پایا جھونگیا ہے۔ بعض ناقدوں نے اس کی غلط تاویل کی اور اقبال کے خالص اسلامی تصور کو مسترد کر دیا ہے۔ یہ غلطی اس لئے پیدا ہوئی کہ اسلام اور اسلامی عقیدوں کے علاوہ اقبال کے فطرتی طبع کا تقابل تو جنہیں سمجھا گیا۔ مگر اب ہم اقبال کا سلسلہ دراز تر جو تا جا ملے اور امید ہے کہ ان غلط تاویلات کی صحت ہو جائے گی۔ نقطے کا انقباض کے فوق البشر کی دو بنیادی صفات میں سے ہے، ڈاؤن مادی ارتقا کی طرف، مادی کرنا ہے اور ہمسایہ زمان و مکان کا ایک تصور پیش کرتا ہے۔ یہ تینوں اقبال کے فکر سے قریب ہو گئے ہیں۔ ادھر ابن عربی کا روحانی ارتقا، روحی کا تصور عشق اقبال سے ہم آہنگ ہیں۔ غرض یہ سب دھارے نکلنا اقبال میں اگر ملتے ہیں مگر ان کا اصل سرچشمہ قرآن ہے۔

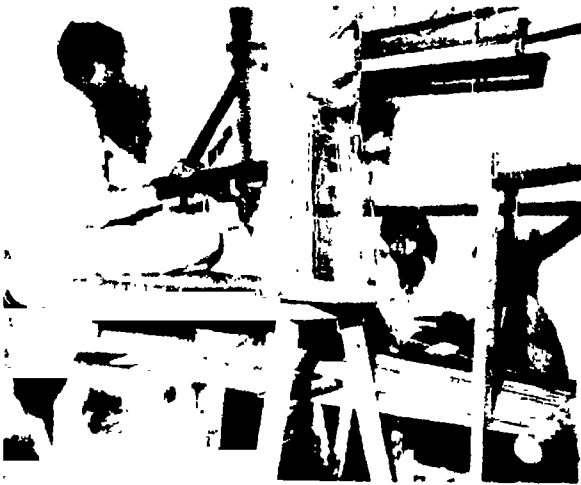
اقبال کا انسان کامل درحقیقت ایک ایسی بلند قامت شخصیت ہے جس میں مادی اور روحانی ترقی کا ارتقا مکمل ہوتا ہے اور جس میں اخلاقی اقدار کی بصیرت افزور آمیزش بھی نظر آتی ہے۔ وہ روح اور جسم کی دونوں کا قائل نہیں بلکہ ان کی تفریق کو غلط سمجھتا ہے۔ اس میں جسمانی ارتقا کے بعد شعوری اور روحانی ارتقا بتدریج ظہور میں آتا ہے۔ یعنی وہ اسلام کی بہترین اقدار کا پھول ہے۔ اس کے ارتقا کے مقامات اقبال نے کمال فنی سے متعین کئے ہیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ سنوار کر اس مقام تک پہنچایا گیا کہ بعض کی خام خیالی اس کی کم کو نہیں پاسکی اور اسے ایک مثالی کردار کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس کا وجود اس دنیا میں محال ہے۔ آپس اس پر غور کریں۔

اقبال کے کلام سے انسان کامل کا ارتقا اس طرح ذہن میں آتا ہے،
دہ آدم یا انسان کی پیدائش اور انسان کی شکل میں اس کا
تدریجی ارتقا۔

(۲) شعور یا خودی کے وسیلے سے ایون کا نمود۔

(۳) مادی اور اخلاقی رفعتوں کی تسخیر خودی کی عملی قوتوں سے

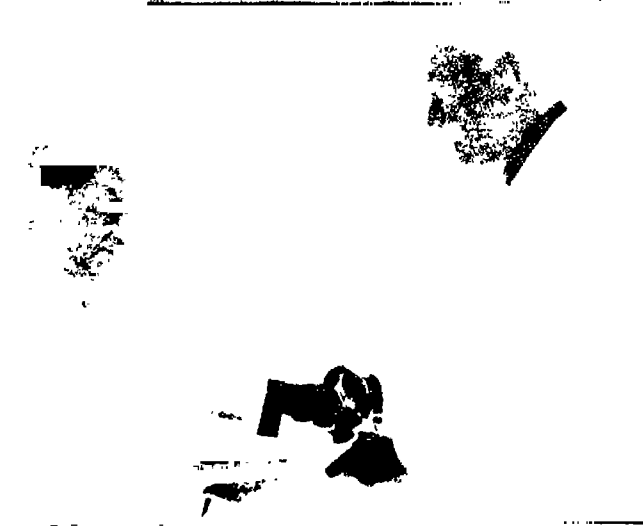
(۴) خودی کی تکمیل سے روحانی ارتقا کی رفعت کا حصول، جو



غلاف کعبہ

ہے کی سعادت اس سال پاکستان کے نصیب میں آئی۔
مرفی پاکستان میں لاکھوں انسانوں کے مجمعوں نے دلی
دت کے جذبات کے ساتھ اس کی زیارت کی۔
اھرین ”زری“ اور غلاف کعبہ کی تیاری کے محتاج مراحل





صدر پاکستان کی خدمت میں رائے دہی کمیشن کی رپورٹ



یدالفطر کے موقع پر اخوت و مساوات کا روح پرور نظارہ (راولپنڈی)



دورہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں صدر پاکستان ،
مارشل محمد ایوب خاں کی ڈھاکہ میں آمد - ہوائی اڈے
پر عوام کے ہرخلوص تباک کا جواب



مشرقی پاکستان رائیفلز کے جہاز
کی طرف سے کارڈ آف آر

لے کر موت تک اس کے ساتھ رہتی ہے (اور شاید اس سے آگے بھی)۔
چھٹیوں، جوانی اور بڑھاپے کے اکثر تضاد قسم کے واقعات ایک
انسان اپنے ہی سمجھتا ہے۔ باوصف اس کے کہ اس کی شکل میں کافی
تبدیلی ہی کیوں نہ آچکی ہو۔ اگر دو سال سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک
کی مختلف تصویریں کسی کو دکھائی جائیں تو عمل کے تسلسل کی طرح وہ
ان کو اپنی ہی کہے گا۔ اس کا جواب یہی ہوگا کہ یہ میرے عکس ہیں،
تو شکل سے زیادہ عمل کا تعلق "میں" سے ہوتا ہے۔ عمل سے "میں"
بنتی اور ارتقا کرتی رہتی ہے:

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات
پھر زندگی کے باب میں فرماتے ہیں:-

مادام رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا یم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی خود
کہ شعلہ میں پوشیدہ ہے موجِ مد
من و تو سے ہے انجنِ آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں
پھر آگے ارشاد ہے:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ تازہ ہے شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

جتنے مختلف تجربات اور کشمکشوں سے اسے گزارا
جائے گا اتنی ہی اس میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔
انسان نے بقول ڈیکارت جب سوچنا شروع کیا تھا تو
اسے اپنے وجود کا ادراک ہوا۔ خودی کے اس ادراک سے
اس نے خارج کو سمجھا۔ پرکھا اور برتا۔ اس شعور ذات سے
انسان "جلب منفعت، دفع مضرت، یقین عمل و ذوق حیات
حالیہ، یا انفعیات کی رو سے، شعور کائنات کہنے لگتا ہے۔ تو شعور

کی خوش سے بچنا نہ تھا۔ یہ واقعہ حقیقت اس حقیقت
کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جنی مدانات
کے دائرہ سے باہر قدم نکالا۔ اور ایک آزاد اور انحصار
ایضاً وہ کام کیا۔ اس میں آگہی۔ وقف۔ شک۔
اور خلاف ورزی کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔

رومی بھی جمادات سے نباتات۔ حیوانات اور آخر میں انسان
کے ارتقا کا قائل ہے۔ بلکہ وہ روحانی رفعتوں اور بلند یوں تک انسان
پہنچ تسلیم کرتا ہے۔

اگر علوم جدیدہ میں مادیات کے ارتقا کے تصور ہم دیکھیں تو
زاروں بایں اور گرمی سے کچھ پیدا ہونے اور پھر اس میں غماہ میں
بہتر ترتیب سے ایک ایمبیا کے پیدا ہوجانے کا قائل ہے۔ اگرچہ
اس میں ارادے کا کوئی دخل نہ تھا۔ پھر ہی ایمبیا پھٹ کر زواوہ
بن بٹ جاتا ہے۔ اور ارتقا کے مختلف حیوانی مدارج طے کرتا بند
سے انسان تک جمائی ارتقا کر کے پہنچ جاتا ہے۔ اس میں تنازع للبقا
بقوت ارادہ، بہر حال اسے شعور سادہ سے شعور ذات حاصل ہوا۔
انسان کہلانے کا مستحق ہوا۔ اس نظریہ میں اور قرآن کے نظریہ میں
ادویہ نگاہ کے علاوہ بہت کم فرق ہے۔ وہ کسی خاص مقصد اور رفیع مقصد
تسلیم کرنے کی بجائے ابتدا سے انتہا تک قیاسی کڑیاں ملا کر غلط کہے
ماں لے کر وہ خدا کے دھوکہ کو تسلیم کرنا پسند نہیں کرتے شعور بھی جمائی
انفعیات بقول بیچل طبعی افعال کا نتیجہ ہے۔

قرآن اور علم جدید سے ہمیں یہ پتہ لگا کہ انسان کو خودی، شعور
ت، انفعیات میں عطا ہونے ہی سے انسانیت کا درجہ ملا۔ ان سب
ظول کے معنی میں فرق نہ ہوتے ہوئے بھی فرق ہے۔ اس لئے کہ یہ
خاص خاص زلویہ نگاہ کی تراشیدہ ملائیں ہیں۔ جن سے بعض
میں منہم ہی ذہن نشین ہوتے ہیں۔ اس میں اقبال کا تصور خودی ان
ب کا مجموعہ بھی ہے۔ اور ان سے آگے بھی بعض معنی لئے ہوئے ہے۔
سب سے پہلے "میں"۔ انا۔ یا ایغو کو اپنے طور پر سمجھ لینا چاہئے تاکہ یہ
ظہر ہو سکے کہ آخر انسان کو کیا ملا جس سے جمادات یا جانوروں کی بہتر
خارج ہوا۔ یا وہ چیز ہمارے اندر کیا ہے جس کی ترقی پر اقبال اتنا
دو تیل ہے۔

پھر شخص کے اندر ایک "میں" ہوتی ہے۔ یہ میں بیدارش سے

حوال اور تحریکات انسان کے عمل کی وسعت کے ساتھ ساتھ خودی میں وسعت پیدا کرتی ہیں۔ فرد ذاتی اور روحانی لحاظ سے بلند ہونے لگتا ہے۔

خودی کی ترقی یا وسعت کے لئے اقبال تین باتوں کو بنیاد بناتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اطاعت پر زور دیتا ہے جس کا مفہوم ہے قانون فطرت یا دین فطرت کی پابندی۔ اس کا تعلق حیات سے ہے۔ یعنی معاشرے کا پاس کر کے خود اپنی قوت عمل کے لئے ترقی کے مواقع فراہم کرنا۔ اس کے بعد ضبط نفس کا مقام آتا ہے۔ اس کا مفہوم ہے خود اپنی خواہشات پر پابندی لگانا اور ان خواہشات کو بحال باہر کرنا جن سے خودی کمزور ہوتی ہے اور ان کی جگہ ان آرزوؤں اور تمناؤں کو فروغ دینا جن سے خودی کی ترقی زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ اور جب خودی ان دونوں عملی اور فکری قوتوں سے لیس ہو جاتی ہے اور ساتھ میں متحد بھی ہو تو نیا ہیت الہی کے مقام پر فائز ہونے کے قابل ہو جاتی ہے۔

خودی کی ترقی دو چیزوں سے ہوتی ہے، تطہیر فکر اور عمل۔ ان سے انسان کی قوت تسخیر صلاحیت پاکر زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ خودی کے احکام کے لئے ذرائع فراہم کرتی ہے۔ اپنے اوپر قابو رکھنے اور عمل کو صحیح راہ پر لگانے کے لئے اقبال جس جذبہ پر زور دیتا ہے۔ اب ذرا اس پر بھی غور کریں: مادّی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک مادہ اور دوسرا انرجی ENERGY۔ مگر اقبال اس کو خودی اور غیر خودی میں تقسیم کرتے ہیں۔ خودی کے مقابل غیر خودی سے اس کی مراد عالم خارجی سے ہے جس پر خودی اپنے زور عمل سے قابو پا کر ذاتی اور روحانی فیوض سے اپنا دامن بھرتی ہے۔

خودی کی تسخیری قوت کے لئے وہ جس لفظ کو استعمال کرتا ہے وہ ہے عشق۔ اس لفظ کے اندر بڑی ہی وسعت ہے۔ اقبال کے کلام کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس لفظ سے عشق مجازی اور حقیقی کے علاوہ ایک نئے معنی بھی ذہن میں آتے ہیں۔ اس مفہوم میں ایک بے کراں سمندر پنہاں ہے۔ جس طرح کہ اقبال روح اور مادے کی دونوں کافال نہیں اسی طرح وہ عشق کی زندگی میں تسخیر کائنات کو بھی نہیں بلکہ روحانی رفعتوں کو بھی پہنچاتا ہے۔

کایہ لفظ پھیل کر ذات سے نکل کر خارجہ پر چھا جاتا ہے۔ وہ سوچنے سے ہی اپنے آپ کو نہیں پاتا بلکہ عمل سے اپنا وجود ثابت کرتا ہے۔ ”ہمیشہ شعور میں ایگو کو اس طرح مختلف ادراکات کے ذریعہ سمجھانا چاہتا ہے جس کو اس اپنی ذات یا خودی کہتا ہوں جب اس کے اندر داخل ہو کر دیکھتا ہوں تو ہمیشہ سردی گرمی، روشنی تاریکی محبت نفرت، لذت و الم کسی نہ کسی خاص ادراک پر ہی پاؤں پڑتا ہے۔ بغیر کسی ادراک کے اپنی ذات کو کسی نہیں پکڑ سکتا۔ نہ اس ادراک کے سوا کسی اور شے کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ خودی اور اکات کے مجموعے کا نام ہے جو ہمیشہ بہاؤ میں رہتے ہیں۔“ (ڈاکٹر میر ولی الدین) اقبال خودی کو وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ کہتا ہے جس سے ”تمام انسانی تخلیقات۔ جذبات۔ تمنیات۔ مستنیز ہوتے ہیں۔“ یعنی شعور ذات حاصل ہو جانے سے انسان کے اندر آواز چھو اور عمل کی لگن پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہ روشنی کی وہ کرن ہے جس سے ہر چیز میں زندگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے فکر اور عمل کا توازن بھی قائم ہوتا ہے۔ اس سے انسان میں توانائی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور حصول مقصد کی راہیں بھی ہموار ہوتی ہیں۔ پھر یہ بذات خود قوت خاموش ہے۔ جو کہ انسان کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بند ہے۔ جب انسان تعین ذات کر کے عمل سے اپنی خودی کو وسعت بخشتا ہے تو وہ ارتقا کرتا رہتا ہے۔ اس کے ارتقا کی بھی وہی بے مقصد یا مقصد شکل تھی جس سے وہ عرفان ذات تک پہنچا۔ پھر اس کے بعد وہ اپنی قوتوں کو اس سے بھی بلند تر مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے لئے خودی کی کھلی کوتاہی کر کے آگے بڑھتا ہے۔ اور جتنی بھی اس کی خودی میں کٹاں زیادہ ہوگی۔ اتنی ہی یہ مستحکم ہوتی جائے گی:

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طاسم زمان و مکان توڑ کر

اور پھر:

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی مہنیں ہے یہ غیر از وجود

انسان جب تعین ذات کر کے عمل شروع کرتا ہے تو اس کے ادراکات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس وسعت میں بھی ایک وحدت ہوتی ہے۔ جس کا مرکز خودی ہوتا ہے۔ یہ تمام

مجھاتی ہے اور جس پر عمل کی قوت سے جذبہ فتح پالیتا ہے۔
 ایچ۔ سی۔ وائلن کہتا ہے کہ ”عقل اس ذہنی عمل کا نام ہے۔
 جو اپنے جذبات کو نامحسوس طریقے سے کامیابی سے آشنا
 کرے۔“ فرانڈ کہتا ہے کہ ”عقل ان عقائد کیلئے جو ہم کھنا
 چاہتے ہیں دلائل فراہم کر دیتی ہے۔“ اس بارے میں ایک
 اور مغربی مفکر کی رائے بھی بڑی نتیجہ خیز ہے: ”عقل بھی
 جذبات پر غالب نہیں آسکتی۔ ایک جذبہ کو دوسرا جذبہ ہی
 مغلوب کر سکتا ہے۔“ یونیسکو رپورٹ ۱۹۶۱ء کا یہ جملہ بھی
 قابل غور ہے کہ ”انسان کی عقل اس کی رہنمائی اور صریح کرتگی
 جو اس کے حق میں مفید ہوگا۔“

جذبات اچھے اور بُرے دونوں ہوتے ہیں۔ اور اسی
 لحاظ سے اس کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اقبال کا عشق اچھے
 اور تخلیقی جذبات کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں اچھے
 جذبات کو ایک ہی کوئی میں کسا جاسکتا ہے اور وہ ہے
 خودی اگر ایک جذبہ خودی کو طاقت۔ رفعت اور وسعت
 بخش دیتا ہو تو اچھا ہے ورنہ برا۔ پھر یہ اچھائی یا برائی
 صرف ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اقبال خودی کے ساتھ
 بخودی کا بھی مبلغ ہے۔ اس لحاظ سے اچھے اور برے جذبات
 میں انفرادی پسند یا خیر کو ہی کوئی نہیں بنایا جاسکتا اگر ذاتی
 منفعت یا استحکام کو ہی ضمیر کی آواز سمجھ لیا جائے تو اجتماعی
 شیرازہ منتشر ہونے کے علاوہ فرد کی اپنی خودی بھی خطرے
 میں آجاتی ہے۔ اس لحاظ سے رہنا کا ہونا ضروری ہے بغیر
 اس کے جذبات کسی وقت بہک کر غلط رخ اختیار کر کے
 خودی کو برباد کر سکتے ہیں۔ لہذا سیدھا سا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن
 جو خدا کا کلام ہے بہترین رہنما ہے۔ قرآن پر عمل ایک طرف
 تو خودی کو مستحکم بنیادوں پر کام کرنے کی توانائی بخشتا ہے،
 دوسری طرف اس کے دل سے خوفِ غیر اللہ کو ختم کر دیتا ہے۔
 اس لئے موحّد کا سر کسی اور کے آگے جھک ہی نہیں سکتا۔
 اور نہ غیر اللہ سے اس کے دل میں خوف ہی پیدا ہوتا
 ہے۔ جس کا منصب یہ ہو کہ ”وہ خدا سے راضی ہو۔
 اور خدا اس سے راضی ہو۔“ تو اس کے اوپر ”حزن و خوف“

مقاصد سے بچنے، تعمیر اور تخلیق میں غیر مغربی اہمک اسی سے
 پیدا ہوتا ہے۔ یہ اگر مقاصد متعین کرتا ہے تو پھر ان کو تسخیر اور
 جذب کرنے کی قوت عمل بھی بخشتا ہے۔ اقبال نے عشق اور
 عمل میں خاص امتیاز قائم کیا ہے:

”عقل اسباب و علل کی پابند ہوتی ہے۔“

کسی کو اپنے قابو میں لانے کے لئے طرح طرح
 کے جال پھیلاتی ہے پھر بھی عقلی تقصیرات
 کی بنیاد ہمیشہ شک پر ہے۔ اس کے برعکس
 عشق میدانِ عمل میں بے دھرمک کو دبٹاتا ہے۔
 مکرو فریب کی جگہ اسے اپنی قوت پر اعتماد
 ہوتا ہے اور اس کی بنیاد عزم و یقین پر
 ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عقل کے تعمیری
 کام بھی عمل سے دوچار ہوتے ہیں مگر عشق
 کی ظاہری تباہیاں بھی انجام کار آبادی و
 کامرانی سے دوچار ہوتی ہیں۔“

(ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی: اقبال کا تصور انسان کامل)

اقبال عقل بے عمل کے خلاف ہے۔ وہ تقصیرات کے گھر مندوں
 میں بسنے اور گوشہ نشینی کے بھی خلاف ہے۔ وہ اس علمیت
 اور عقلیت کو بیکار سمجھتا ہے جس میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا
 اور خیالی قلعے بنانا ہی سب کچھ ہو۔ وہ عقل کو عشق کے بغیر ایک
 بیکار شے تصور کرتا ہے۔

اگر عشق کو علوم جدیدہ کی روشنی میں سمجھا جائے تو یہ
 ماننا پڑتا ہے کہ اقبال نے اس کو بلند جذبات کے معنی میں
 استعمال کیا ہے۔ اور یہ ماننے کے لئے ہمارے پاس یہ دلیل
 ہے کہ اقبال فلسفہ اور نفسیات سے بخوبی واقف تھے اور
 اسی لئے انہوں نے مجرد عقلیت پر جذبات کو فوقیت دی ہے۔
 اگر نفسیات کے ماہروں اور فلسفیوں کی آراء کا اس باب میں
 تجزیہ کیا جائے تو اقبال کی یہ کوشش مستحسن نظر آتی ہے کہ
 انہوں نے عشق کو عقل پر فضیلت دی۔ جو فطری بات ہے۔
 اس لئے کہ ”عقل جذبات کی لونڈی ہے عقل یا علم بذاتِ خود
 کوئی عملی قوت نہیں بلکہ جذبہ کی شہ پاکر کام کرنے کی صحیح راہ

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال میں اپنے خلیج جگر کی آمیزش کرتا ہے تب ہی کائنات اور زندگی میں دیک اور حسن آنکھیں کھولتا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کا بغیر

نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال کو اپنے اس قول کی صداقت پر یقین تھا کہ ہر صحیح

مومن فوق البشر ہے۔ اور اسلام وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر

ڈھلتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے فوق البشر کے ارتقاء میں اسلامی

حقائق کو بڑی خوبصورتی سے فلسفیانہ اور نیم شاعرانہ انداز سے

واضح کیا ہے۔ وہ مسائل حاضرہ کے الجھے ہوئے مسائل کا بہترین

حل اسی کی ذات کو سمجھتے تھے کہ یہ گمنامیاں بغیر اس کے حل نہیں ہو سکتیں۔

اس لئے کہ آج نہ تو انسان کامل ہے اور نہ یہ موجودہ مسلحہ ہی اس

قابل ہیں کہ کائنات کو بلند ترین مقامات تک لے جا سکیں۔ اس لئے

کہ ان سانچوں کو خود ثبات نہیں۔ ہر لحاظ میں انقلابات رونما ہو رہے

ہیں۔ ان کا صحیح حل اسلامی عقائد سے اٹھا ہوا انسان کامل ہی ہے۔

اقبال اس بارے میں کہتے ہیں :

"مسلم وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر لے۔

یہ ایک قوت نورانیہ ہے جو جامع ہے۔ جو ہر

موسویت اور ابراہیمیت کی آگ اسے چھو جلے

تو برود سلام بن جائے۔ پانی اس کی ہیئت

سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما

نہیں سکتی کہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی

ہوئی ہیں۔ پانی آگ جذب کر لیتا ہے۔

عدم بود کو کھا جاتی ہے۔ پستی بلندی میں سما

جاتی ہے۔ مگر جو قوت جامع اعداد ہو اور

محل تمام تناقضات کی ہو اسے کون جذب

کرے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی

قوت حیات موت کو اپنے اندر جذب کر کے

حیات و مات کا تناقض منہا چکی ہے مسلم

حنیف جذبات متناقض یعنی قہر و محبت

اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے اور

اس کا دائرہ اثر اخلاقی تناقضات تک لے

کے پیدا ہونے کا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اقبال

رسول کریم کی تقلید پر بھی زور دیتا ہے۔ جو کہ قرآن کی عملی شکل ہیں۔

جن سے بہتر کوئی بھی اس عملی شکل کو پیش نہیں کر سکتا۔ جب خودی۔

عشق یا جذبہ والہانہ کی آگ میں تپ کر عمل اختیار کرتی ہے۔ اور اس

میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ تو اس سے انسان ارتقاء کر کے

مرد فقیر کے مقام تک پہنچتا ہے۔

فقیر اقبال "یہ دولتی اور رنجوری کے مفہوم میں نہیں لیتا۔

بلکہ یہ استغنا کے مترادف استعمال ہوا ہے۔ "مرد فقیر چاہے منصب۔

مال۔ عزت۔ فہرت۔ اور سوال سے بلند ہو جائے۔" اسلام فقر میں

پیدا ہوا۔ فقر کی گود میں ہلا اور فقری نے ہی اسے ہشتاد ہی بخشی جھوڑ

کا ارشاد ہے: "الفقر فخری" مومن جب اس راز سے واقف ہو جاتا

ہے تو معاشی یا مادی مسائل اس کے جذب و تسخیر کی قوت کو نہیں روکتے۔

بلکہ فقر پر بھی وہ فخر کرتا ہے۔ وہ اپنی خودی کو وسعت دینے اور معاشرہ

کی بہتری کے لئے بغیر کسی مالی لاچ کے کام کرتا ہے۔ دولت بھی اسے

ملتی ہے اور حکومت بھی۔ مگر اس کا مقصد اس سے بلند تر ہوتا ہے۔

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری

میراث مسلمان سرایہ شبیری

جب خودی میں جذبہ والہانہ اور عشق پیدا ہو جاتا ہے

تو وہ آرزو و جستجو کی تلوار سے جذب و تسخیر کرتی جاتی ہے۔ جیسے

جیسے خودی میں وسعت اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔ ویسے ویسے

انسان فقری کے مقام پر سفر کرے ہو کہ مومن کہلانے لگتا ہے۔

یہی مومن ہے بکائنات میں خالی کی حیثیت سے جلوہ گر ہو کر

روحانی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ اور خدا آخر پر خلیفہ اللہ کہلانے

لگتا ہے اور اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفرین کار کشا کار ساز

خاک و نوری نہاد بندہ مولا صفات

ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بنیاد

اور خدا کا مقصد ہی ایسے مومن پیدا کر کے کائنات کو سنوارنا ہے۔ اور

اس سے کائنات میں ترقی کی راہیں ہموار کرنا ہے :

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا محل چوہ حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

ان معمولی چیزوں کو مستروں کا منبع جان لیتے ہیں مگر جلد ہی یہ راب ٹوٹ جاتا ہے اور غم ہی غم چاروں طرف پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ انسان کامل اس تاریکی کے بے کراں سمندر میں روشنی کا منار ہے جس کی اپنی خودی کا نور چین چین کر عالم کے نقوشات اور تفکرات پر پڑے گا جس سے یہ کائنات بقعہ نور ہو جائے گی۔ اسی کے دم سے انسانیت کے رستے ناسوروں اور غم اور خوف کی بھٹی میں جلتے ہوئے دل و دماغ کو سکون حقیقی اور مسرت لازوال نصیب ہوگی۔ اقبال کا تمام کلام انسان کامل کے ارتقائی منازل کی تفسیر اور تشریح ہی ہے:

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

نیم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطہ پر کار حق مرد خدا کا یغی
اور یہ عالم تمام وہم طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

محدود نہیں بلکہ تمام طبعی تناقضات پر حاوی ہے۔ پھر مسلم جو حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت کا اور ابراہیمیت کا کیونکہ کسی میں جذب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے۔ اور اس کی قوت جاذبہ دنی اور فطری نہیں بلکہ مستعار ہے ایک کھوپا سے جس نے اس ریگستانی کے چمکتے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا:

ان باتوں میں کتنی گہرائی اور وسعت ہے۔ اس پر خود ضروری ہے وگرنہ انسان کامل کے تمام راز منکشف نہ ہوں گے۔ انسان کامل نہ صرف کائنات کو بہتہ اور بلند مقام کی طرف لے جائے گا بلکہ اس کی اپنی زندگی بڑی وقیع و رفیع ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کو خوف اور غم سے نجات ہوگی۔ اسی جہان میں ہی وہ خوش و خرم نہ رہے گا بلکہ دوسرے جہان میں بھی اس کی زندگی مستروں سے لبریز ہوگی۔ کائنات کے تمام فلسفے کا بخور سچی مسرت ہے۔ دار و فلک تنازع للبقا۔ مارکس روٹی۔ فرائد جنس، اور نطشے تغاخر کو ہی اصل حیات سمجھتے ہیں مگر یہ سب زندگی کی معمولی ضروریات ہیں۔ اگر ان سب کو اکٹھا کیا جائے تب بھی وہ مسرت جو کہ انسان کامل کو حاصل ہے طئی مشکل ہے۔ اس لئے کہ مسرت کی خواہش کہیں اور سے ہی پھوٹتی ہے۔ ہم غلطی کر کے

★

نقد

بجز بقدر آں ضعیفی رو باہج است
فقر قرآن اصل شاہنشاہی است
فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر
نکدہ واکا بل ندیدم جزیبہ کر
(اقبال)

”مطب غزلے بیتے از مرشد روم آور“

(مثنوی مولانا روم کا ایک نادر مخطوطہ)

ابن علی امرہوی

اگر تاریخ این داری تو امید
رخِ اتم. ہمیں مانند خورشید
گر ہی خواہی تو تاریخ کتاب
ہست رمز مثنوی اندر حساب
اگر تاریخ این مکتوب خواہی
فسر خوانی تو از ذوق الہی
عالمگیر کی ایک ہر دفتر اول کے خاتمہ پر ہے۔ باقی دوسرے
دفتروں پر۔ اول الذکر ہر میں صاف نہیں مگر دفتر مشتمل کے
خاتمہ پر جو مہر ہے وہ کافی روشن ہے :

عالمگیر

(اورنگ زیب محمد)

اس ضمن میں اگر مثنوی کے چند دیگر نایاب مخطوطوں کا ذکر
بھی یہاں کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ دنیا کے اہم کتب خانوں میں ان
مخطوطوں کا موجود ہونا ثابت ہے :

- ۱۔ کتب خانہ خدیویہ - مصر - مکتوبہ ۴ صفحہ ۶۷۔
صرف دفتر پنجم نامکمل۔
- ۲۔ قونیر، ترکی، عجائب خانہ آثار قدیمہ مکتوبہ
۶۵ رجب ۱۲۷۷ھ بخط محمد بن عبد اللہ القونوی۔
کامل۔
- ۳۔ کتب خانہ خاند پاشا، قسطنطنیہ، مکتوبہ۔
۱۵ ربيع الاول ۱۲۸۰ھ بخط اسماعیل بن سلیمان
القیصری۔ نامکمل۔
- ۴۔ برٹش میوزیم - لندن - مکتوبہ ۱۷۸ھ بخط
علی بن محمد الحولوی۔ کامل

مثنوی کے کئی متن اور متعدد تراجم دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں
شائع ہو چکے ہیں مگر اس کے قدیم ترین نادر نسخوں اور مخطوطوں کی تلاش
کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مجھے بھی ایک ایسے ہی قدیم نسخہ کے دیکھنے کا
کا اتفاق ہوا ہے جس کا ذکر یہاں مقصود ہے۔ یہ نسخہ دکن کے مشہور
محقق مولوی میکیم سید شمس الدین قادری کے گراں مایہ کتب خانہ میں موجود
ہے۔ یہ نسخہ رومی کی وفات کے صرف چالیس سال بعد لکھا گیا تھا۔
ترقیمہ ۷۱۲ھ اس بات پر شاہد ہے۔ یہ نامعلوم ہاتھوں سے گزرتا ہوا
شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ذاتی کتب خانہ میں داخل ہوا جس کی
سند میں خود عالمگیر کی مہریں ثبت ہیں۔

اس نسخہ میں پورے چھ کھنڈے دفاتر موجود ہیں اور ۶۵ صفحات
کو محیط۔ ہر صفحہ پر ۱۷ سطروں اور ہر سطر میں چار مصرعے لکھے گئے ہیں۔
پہلے تین دفتر اول کا خط نسخ اور آخری تین دفتر اول کا نستعلیق ہے۔ ہر عنوان
کے لئے تین تین روشنائیاں برقی گئی ہیں۔ اول سنہری، دوسری لاجوردی
اور آخر میں شکرانی۔ تیسرے دفتر کے اختتام پر تاریخ نسخ اس طرح ہے :

”تم المجلد الثالث عن کتاب المثنوی

المعنوی بعون الخالق العوی فی ثانی

عشر من شهر ربیع الثانی سنہ اثنی

عشر و سبع مائتہ

متن کے اطراف میں جوحاشیہ ہے اس کو بعض اشعار و مقامات کی توضیح
کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور اکثر جگہ محب نکات پیدا ہوتے ہیں بعض
جگہ نئے ابیات کا اضافہ بھی ہے مگر جن جگہ کی تحریر ہے ان کا کوئی تعارف
دفع نہیں البتہ کتابت کی جو تین منظوم تاریخیں پہلے تین دفاتر کے
اختتام پر درج ہیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ یہ ۸۵۳ھ
میں لکھی گئیں :

۵۔ میونخ اسٹیٹ لائبریری۔ جرمنی۔ مکتوبہ
۴، شعبان ۱۳۵۶ھ، بخط موسیٰ بن یحییٰ
المولوی۔ دفتر دوم نامکمل۔

اس لحاظ سے مذکورہ نسخہ کی قدامت پانچویں نمبر کے بعد اور
قدیم ترین مکمل ہونے کی حیثیت سے تیسرے نمبر پر آتی ہے۔
اقبال کے مرشد معنوی، مولانا جلال الدین رومیؒ
کے علم و فضل کا عظیم ترین مظہر مشنوی ہے۔ مولانا کی علمی و نگاہ
تغیر و جدید پران کی نظر، تصوف و علوم کے اسرار کی عقیدہ کشائی
جو ان کے ہاں ملتی ہے وہ اسلامی فکر و فن کی دنیا میں بے نظیر ہے
ہے۔ شرح قرآن اور بیان ارشادات نبویؐ میں انہیں جو بہرہ و خاص
عطا ہوا تھا اس کی مثال بھی کیا ہے۔ دلنشین حکایتوں، مثالوں
و مفید نصائح کا اہتمام، جسے جو امح الکلام کہا جائے تو جاسے۔
ان کے ہاں بڑی خوبصورتی سے نظر آتا ہے جو دل میں گہرا اثر
باتا ہے۔ مشنوی میں جو جوش، جولانی اور انداز گفتار ہے
سے مولوی معنوی پر بس سمجھنا چاہئے۔ ریاء و خود، خود غرضی
غسانیت اور اہل مدرسہ پران کی گرفت خاص طور پر غالب نظر
ہے۔ ان کے ظاہری الفاظ پر نثری لے دے بھی ہوتی رہی ہے
مگر ان کی نیت کے خلوص اور ولولہ ایمانی پر کسی نے شک ظاہر
ہیں کیا ہے۔ غور و لہر یا کے پتلوں، پیران سالوس کی
میسہ کاریوں اور ابلیمیت کے غونوں پر مولانا کی خاص نظر
آنانے جو کچھ کہا ہے استعارہ کے حجاب میں رہ کر کہا اور اس
ایک اثر یہ ہوا ہے کہ ان کے فرمودات کی آفاقیت مسلم ہوئی
ہے چنانچہ ہر مذہب و دین کے پیرو اپنے اصول و تعلیمات پر اسے
نطبق کر لیتے ہیں اور اس طرح اسلام کی آفاقی تعلیمات عام ہوتی
آتی ہیں۔

بعض اشعار کو الحاقی کہہ کر مشنوی سے خارج سمجھا گیا ہے۔
لانکہ قدیم نسخوں میں یہ سب موجود ہیں۔ مثلاً میں نے جس خطوط
ذکر کیا اس میں بھی وہ مشہور شعر موجود ہے جسے مطبعہ نیشنل
خارج کر دیا گیا ہے اور جس پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں۔ یعنی:

من ز قرآن مغز را برداشتم
استخوان پیش سگان انداختم

اس شعر پر اہل مدرسہ کا اعتراض ہے کہ اس سے قرآن پر
حرف آتا ہے۔ مگر میری رائے ناقص میں مولانا کا یہ مقصود نہیں
ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں نے محرمات منصوص فی القرآن
سے صرف نظر کر کے صرف محلات و مباحات پر نظر رکھی ہے۔
مثلاً یہ کہ قرآن نے خرید و فروخت کو حلال قرار دیا اور سود کو حرام۔
میں نے بیع کو قرآن سے لے لیا اور سود کو سود خوروں کے لئے
چھوڑ دیا ہے۔ خود قرآن میں بھی ارشاد ہے کہ ناپاک چیزیں
ناپاکوں کے لئے ہیں۔

منجد اور اشعار کے یہ شعر بھی الحاقی سمجھ لیا گیا ہے:

پچو سبزہ بار بار روئیدہ ام
ہفت صد ہفتاد قالب دیدم

اعتراض ہے کہ اس سے تنازع کا استدلال ہوتا ہے اور وہ غیر مسلم
جو آواگون کے قائل ہیں اس شعر سے سند لیتے ہیں اور اسی لئے
مشنوی کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ مگر مجھے یہاں بھی کوئی اشکال
نظر نہیں آتا اور شعر کو تاسخ سے متصل کرنے کا کوئی قرینہ
نہیں سوچتا۔ اصل میں یہ صوفیاء کے عقیدہ تجد و امثال کی
طرف ذہن کو رجوع کرتا ہے۔ مدعا یہ کہ انسان ہر وقت تبدیل
ہوتا رہتا ہے اور اس تغیر احوال کو ہی برزخ کہا گیا ہے۔ یہ
برزخ بھی کئی مدارج میں رہتا ہے۔ برزخ شیخ، برزخ رسول اور آخر
میں برزخ خدا۔ یہ برزخ بھی بدلتا رہتا ہے صوفیوں کے اکثر اشعار
میں یہ معنوں اسی طرح آتا رہتا اور ہمہ اوست تک منہی ہوتا
ہے۔ یہی وحدۃ الوجود کا تصور ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کسی
وقت بھی ایک حالت پر نہیں رہتا اور ہر قالب بدلتا رہتا
ہے۔ خوشی، غمی، غضب، رحم، جزا، بزدلی، غرض ہر لمحہ ایک
نیا تجربہ اور احساس ہے جس سے یہ فانی انسان دو چار رہتا
ہے۔ یہاں مولانا نے حیات بعد ممات کا کہیں ذکر نہیں کیا
بلکہ اسی دنیا میں انسان جن احوال و ظروف سے گزرتا چلا جاتا ہے
اس کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے۔ مولانا کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ
میں نے سات سو قالب بدلے ہیں، بلکہ یہ کہ اتنے قالب دیکھے ہیں۔
گویا کبھی غافل رہا، کبھی ہشیار، کبھی صحبت صالح حاصل رہی تو
کبھی صحبت طالح۔ غرض گونا گوں ماحولوں سے واسطہ پڑا۔ ایک لہ

جگہ پھر اسی طرف اشارہ ہے:

من بہر جمعیتہ نالال شدم

جفت خوشحالال و بدحالال شدم

مولانا کے ایک اور شعر پر بھی بہت قیل و قال ہوئی ہے

کور کوراند مرد و در کر بلا

تا نیفتی چوں حسین اندر بلا

اس کی شرح میں بھی عجیب عجیب موثر گافیاں کی گئی ہیں علامہ قاسم کا حلقہ کہتا ہے کہ یہ شعر منصور خلیج کی طرف راجح ہے۔ اس کا لغز انا الحق حد شرعی کا موجب بنا تھا۔ ان منصور کا پیدائشی نام حسین تھا اور باپ کا نام منصور، یعنی حسین بن منصور الخلیج مگر شہرت باپ کے نام سے ہی پائی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شعر میں "کر بلا" اصل میں "کرب لا" ہے۔ مدعا یہ ہے کہ "مصیبت" جو حسین بن منصور کو لاحق ہوئی خدائی کا دعویٰ کرنے اور اپنی بشریت کے انکار سے ہوئی۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس توضیح پر دلی شککتا نہیں۔ میری دانست میں یہاں حسین سے مراد حسین بن علیؑ کے علاوہ کسی کی ذات گرامی نہیں اور مخاطب سے "کور کوراند" کہہ کر بات صاف کر دی ہے یعنی "تو اندھوں کی طرح کر بلا میں نہ جا" کیونکہ یہ تیرے منصب و مرتبہ سے بعید ہے، کیونکہ جب تک حسینؑ کی طرح امتحان میں پورا اترنے کی صلاحیت نہ ہو اپنے آپ کو آزمائش کے میدان میں اتارنا نہیں چاہئے۔ "بلا" سے گزرتا تو معراج عاشقین ہے مگر جن میں صلاحیت نہیں انہیں اندھوں کی طرح اس

وادی پر خار میں قدم نہیں بڑھانا چاہئے۔ یہاں "بلا" سے مراد عام مصیبت نہیں بلکہ ابتلا (امتحان) ہے جو اہل باطن کے لئے آیہ رحمت ہے اور جسے وہ ہر وقت لبتیک کہتے ہیں۔ خود قرآن میں ارشاد ہے "بھیکو آزما یا خدا نے ابراہیمؑ کو چند کلمات سے"۔ تو اس کا یہ مفہوم لینا غلط ہوگا کہ خدا نے ابراہیمؑ کو مصیبت میں ڈال دیا کیونکہ خدا تو خود انبیاء علیہ السلام کا محافظ و نگہبان ہوتا اور اس کا ہاتھ انبیاء کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ یہاں بھی مدعا آزمائش و امتحان سے ہے، جس میں ابراہیمؑ پورے اترے۔

غرض مثنوی ایک ایسی تصنیف ہے جس کے پہلو دار معانی شعری آہنگ جوش بیان اور معنویت نے اسے دنیا کی امہات الکتاب میں جگہ دے دی ہے۔ قبول عام کا یہ حال ہے کہ شاید ہی کسی کتاب کو نصیب ہوئی ہو۔ علما، صوفیا، اہل ظاہر و اہل باطن سب ہی اس کے مضامین سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے پڑھنے کا ایک مخصوص آہنگ ہے اور جو لوگ اس کے غوامض پر نظر نہیں رکھتے ان پر بھی اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اور جب بطریق سند اس کا کوئی حصہ پیش کر دیا جائے تو تھوڑے میں لطف و حاذ بیت دو بالا ہو جاتی ہے۔ غرض مثنوی دنیا کی ایک عظیم کتاب ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جا رہا ہے اس کے متن کی تکمیل و تشریح اور تراجم و تفسیر کی حکایت بھی دلاڑتر ہوتی چلی جا رہی ہے:

☆

چوں شمسائے جمادی روید

معم جانی جہاد اں کے شوید

ان جہادے عالم جاں در روید

ظفل اجرائے عالم بشنوید

(دعویٰ)

حجاب تجبلی

عرفان رحمان

زیادہ بابرکت اور ہر کہلے سے زیادہ پاکیزہ، منزہ اور بصیرت افروز ہے۔ پاکستان آج اس بات پر حقیقتاً حیرت منگیز ہے کہ اس غلاف کے تیار کرنے کی سعادت اس کے مقدور میں کبھی گئی۔

ایک تاریخی روایت یہ بھی کہتی ہے کہ اب سے نو سو سال پہلے بھی ۱۰۷۴ء میں یہ سعادت سرزمین پاکستان کو حاصل ہو چکی ہے۔ پاکستان کے شہر کراچی اور لاہور جتنا بھی ناز کریں بجا ہے کہ اس سال وہاں غلاف کعبہ کے حصے تیار کئے گئے۔ غلاف کعبہ کی تیاری کے سلسلے میں حکومت سعودی عرب نے پچھلے سال اگست میں تین افراد پر مشتمل ایک وفد پاکستان اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ یہاں آکر اس کی تیاری کے امکانات کا جائزہ لے چنانچہ دس گز کپڑا بطور نمونہ تیار کر کے سعودی عرب بھیجا گیا جسے سلطان سعود کی منظوری حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد یہ کام باقاعدہ پاکستانی ہنرمندوں کو سپرد کر دیا گیا۔ حکومت سعودی عرب کے سفارتی حکام نے اس کام کی نگرانی کی۔ علامہ کرام کی سرپرستی اور ہمارے ہنرمندوں کی محنت و ذہانت سے یہ کام بہت ہی کم وقت میں مکمل ہو گیا۔ جن لوگوں کو یہ کام سونپا گیا تھا وہ وہی حضرات ہیں جنہیں ”بنارس“ کام کے ماہر کہا جاتا ہے اور جن کے ہنر کا اب دنیا کے ہر ہر گوشے میں تعارف ہو چکا ہے۔ اس طرح پاکستان کے ان صنایع کو ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔

غلاف کعبہ تیار کرنے کا کام دو شفٹوں میں ہوتا تھا۔ پہلی شفٹ سولہ گھنٹے مسلسل کام کرتی تھی پھر دوسری شفٹ کام سنبھال لیتی تھی۔ غرض اس طرح شبانہ روز محنت سے اسے مکمل کیا گیا۔ اس کے ریشمی کپڑے کا رنگ سیاہ ہے۔ اس سے قبل مصر سے جو غلاف آتا تھا اس کا رنگ گہرا نیلا ہوتا تھا۔ کپڑے کی بہت میں

گھرجی وہ جو خدا کا گھر ہے بیت الحرام اور بیت اللہ ہے جو اس گھر میں داخل ہوا ہے اللہ کی امان اور سلامتی کی ضمانت مل گئی۔ وہ گھر جو مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ وہ گھر جو ہر گھر سے زیادہ برگزیدہ ہے جو دنیا کے جکڑوں میں خدا کا پہلا گھر ہے، جسے ایک لق و قح صحرا — ایک وادی غیر زنی ندی — میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حلیل حضرت اسمعیل علیہما السلام کے ساتھ مل کر بنا باغداد جس کی دیواریں اٹھاتے وقت وہ اپنی نسل میں ایک ایسے فرزند کی ولادت کی دعا مانگتے جاتے تھے جو اللہ کے دین کی سر بلندی اور اس کے اس گھر کی عظمت کو دو بالا کرنے والی مبارک ہستی ثابت ہو۔ اللہ کے حضور میں یہ دعائے خلیل مقبول ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت نے دنیا کے ظلمت کردہ میں نور ہی نور پھیلا دیا۔ آج وہی گھر ساری دنیا کے مومنوں کا قبلہ ہے ان کے ایمان کا مرکز و محور ہے جس کی برکتوں سے مالا مال ہونا ہر متطیع مسلمان پر فرض قرار دیا گیا ہے۔

یہی پاکیزہ مقام مقام حج ہے۔ مسلمانان عالم کے لئے اپنی جمیعت و مرکزیت برقرار رکھنے اخوت کو ترقی دینے اور دین و دنیا کی برکتیں حاصل کرنے کا گہوارہ ہے۔ یہاں ہر سال دنیا کے ہر گوشے سے مسلمان حج کے لئے آتے ہیں یا عمرہ کرتے ہیں۔ راستے کی تکلیفیں اور طرح طرح کی صعوبتیں بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیتے اور رضائے الہی کے جویا ہوتے ہیں۔ جب دور سے یہ پاکیزہ بستی نظر آئے لگتی ہے تو خوشی سے پھولے نہیں ساتے۔ ہر ایک کی زبان پڑ لیک! لیک! کانرہ ہوتا ہے۔

اس گھر کی زینت وہ غلاف ہے جو دنیا کی ہر پوشش سے

یہاں آئے تھے۔

کعبہ کی اونچائی ۱۶ گز ہے۔ اس پاکیزہ غلاف کے ۱۶ گز کے مختلف حصے تیار کئے گئے ہیں جنہیں بڑے بڑے کے لئے پاکستان سے ہی کاٹ کر جڑیں گے۔

پچھلی جنگ عظیم کے دوران مصر سے غلاف کعبہ کا آہندہ ہو گیا تھا اس لئے سعودی عرب ہی میں اس کی تیاری کے انتظام کئے گئے اور اس کام کے لئے برصغیر سے "بنارس کام" کے ماہر بلوائے گئے تھے۔ اس سال غلاف کعبہ کا ایک حصہ تیار کر کے والا فرم کے مالک کے دادا کو اس موقع پر سعودی عرب بلوایا گیا تھا اب یہ سعادت پھر اسی خاندان میں منتقل ہوئی ہے۔

جب سے یہ خبریں عام ہوئی تھیں کہ اس سال غلاف کعبہ پاکستان میں بن رہا ہے اور وہ بھی کراچی والا ہو۔ کے دو بڑے شہروں میں تو لوگوں کا اشتیاق بہت بڑھ گیا تھا۔ ہر جگہ یہ اسرار کیا جا رہا تھا کہ اس متبرک شاہکار فن کو دکھانے کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ کراچی اور لاہور میں یہ غلاف حکومت سعودی عرب کے نمائندوں کو سپرد کرنے کی بڑی ہمت پر نشان تقریبات منعقد کی گئیں جن میں سفارتی نمائندے، ممتاز اراکین حکومت، ایمان شہر اور قادیان ملت نے خصوصیہ کے ساتھ شرکت کی۔ بعض اداروں کی طرف سے بھی غلاف کی زیارت کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے۔ اس کے بعد زیارت عام کے لئے غلاف جابجہ پہنچا یا گیا عدائے کرام اور قومی کارکنوں نے اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ ادھر پاک وائٹن ریلوے نے اسپیشل گاڑیوں کے ذریعے پشاور سے کراچی تک اس کی زیارت کا اہتمام کیا۔ راستے میں پڑنے والے تمام بڑے شہروں کے اسٹیشن پر یہ کارٹیاں ٹھہریں۔ دود و نزدیک کے قصبوں دیہاتوں بلکہ دور افتادہ مقامات تک سے لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لئے اسٹیشن تک پہنچ گئے۔ ٹہرے شہروں میں تو مشتاقان دید کی تعداد لاکھوں تک پہنچی جن میں خواتین نے بڑے چڑو کو حصہ لیا۔ شہروں کے مرکز و انتظامات گلی کوچوں بازاروں اور شاہراہوں سے جہاں جہاں غلاف کعبہ کا جہوس نڈر لوگوں کے ٹٹ کے ٹٹ لگ گئے اور ایسے ہتھکڑیاں و انتظام سے جلوس نکلتے کہ بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں یہ سب ہمارے دلی جذبہ عقیدت کے مظاہرے تھے۔ بعض نے دور سے نظارہ کیا

کلمہ طیبہ نظر آتا اور آنکھوں کو نور بخش ہے۔ اس کا ڈیزائن تیار کرنے والے پاکستانی ہندو مندوں نے اپنی پوری مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ غلاف جو ہمیں دین تاملی نامہ کعبہ پر چڑھایا جاتا ہے۔ اس سے قبل کعبہ کو دھونے کی رسم ہی ادا کی جاتی ہے۔ اس مبارک تقریب میں خود جلالہ سلطان سعود و ممتاز اراکین سلطنت اور اعیان ملک شریک ہوتے اور برکت حاصل کرتے ہیں۔

یہی اطلاع سن کر کعبہ کے گرد حوٹل فرش لگا ہوا ہے اس کی بجائے پاکستانی مردم کار فرش لگا دیا جائے گا جن کا رنگ سر ہے۔ اس پتھر کی جانچ کی جا رہی ہے۔ مزید امید ہے کہ یہ سعادت بھی پاکستان کو ہی نصیب ہوگی جس کے لئے ہم حضور باری میں جیتھ رہے ہیں شکرا واکریم کم ہو۔

کعبہ کو غلاف پوش کرنے کی رسم نہایت قدیم ہے۔ قبل اسلام بھی اس پر عمل ہوتا تھا۔ حضور مسلم کے ہند میں بھی کفار کی طرف سے چڑھایا ہوا غلاف موجود رہا طرہ پھر قدرت حق نے یہ شرف بھی مسلمانوں کو پہنچا دیا جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

ہمیں معلوم ہے کہ بیت اللہ ایک نہایت کفار کے قبضہ میں رہا۔ یہاں انہوں نے ۱۳۶۰ ہجرت سحر رکھے تھے جن میں لات منات سب سے بڑے تھے۔ جب اللہ نے کفر کی طاقتوں کو شکست دی اور یہ گھر تحقیق معنوں میں خدا کا گھر بنا تو پھر غلاف چڑھانے کی رسم بھی مسلمانوں ہی کے پاس آگئی۔ اور جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اسلام کے ابتدائی دور تک غلاف کعبہ کفار ہی چڑھایا کرتے تھے۔ مگر اس دور میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ایک منی عورت کے ہاتھوں اتفاق سے غلاف کعبہ میں آگ لگ گئی۔ یہ خبر حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو حضور صلعم نے فرمایا "پلو اچھ ہوا۔ کفر کی یہ آخری نشانی بھی ختم ہوئی" کفار کے چڑھائے ہوئے آخری غلاف کو اللہ کی حکمت نے اس طرح اپنے گھر سے دور کر دیا۔ حضور صلعم نے حکم دیا کہ میں میں ہی دوسرا غلاف تیار کر لیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد تک یہ غلاف بین سے بن کر آتا رہا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ سعادت مصر کو مل گئی اور ہمارے عہد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طویل عرصہ میں چند ہی بار مسلمان سلاطین کے بیچے ہوئے غلاف

کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کو شش کرتے تھے۔ جہاں جہاں سے جلوس گزرا اللہ اکبر کے فلک شکن گانے گونجنے لگے۔ معبود ہو گئی۔ لاکھوں انسانوں کے اس جوش عقیدت اور ایمان پر وہ نظاروں کو دیکھ کر حیران رہتا تھا کہ بارگاہ الہی میں قدم قدم پر جدہ شکر ادا کیا جاتے۔

یہ چومایہ جوش یہ عقیدت یہ حصول برکت کا جذبہ قدرتی بات تھی۔ مسلمانان پاکستان کے ایمان اور ان کے گہرے دینی شغف کا یہ بڑا روح پرور منظر تھا۔ ہم اس بات پر حیرت مند بھی ہو کر کہیں کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو یہ عبادت عطا کی۔ امید ہے وہ اپنے اسلام میں اس خدمت کو دشمن کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

یہ نہ صرف ہمارے اہل کمال کے ہنر کی دامن اور قدر افزائی ہے بلکہ یہ پیغام بھی ہے کہ ہمیں اسلامی روایات کو برقرار رکھنے، عالمگیر اسلامی اخوت کو ترقی دینے اور اسلام کی پاکیزہ تعلیم پر عمل کرنے میں اور بھی کوشاں ہونا چاہیے، یہ امید رکھتے ہوئے کہ ہماری یہ خدمت مقبول یا دگاہ اندرونی ہوگی اور اس کے طفیل اللہ کی نعمتیں اور برکتیں تمام مسلمانان عالم اور اہل پاکستان پر ہمیشہ ہمیشہ نازل ہوتی رہیں گی۔

بعض غرض نصیبوں کو نزدیک سے زیارت کا شرف حاصل ہو جائے جہاں آدمی کھڑے ہو کر نظارہ کر سکتا تھا، جہاں سے بھی اس کی زیارت کی جاسکتی تھی وہاں لوگ گھنٹوں پہلے سے جمع ہو جاتے تھے۔ لاہور میں صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے شوروم میں بھی اس کے ایک حصہ کو زیارت کے لئے رکھا گیا۔ اس موقع پر پرلے مصری حلاط کے ایک چیز دوکی زیارت بھی کرائی گئی تھی۔ لوگ انہوہ در انہوہ آتے جاتے تھے اور اپنی آنکھوں کو لورہ بچھتے تھے۔

مغربی پاکستان میں زیارت غلاف کعبہ کا یہ اہتمام ہوا تو جلد ہی کیے ممکن تھا کہ مشرقی پاکستان کے بھائی اس سعادت سے محروم رہتے چنانچہ ان کو بھی اس سعادت میں شریک کرنے کے لئے ہوائی جہاز سے غلاف مشرقی پاکستان بھی بھیجا گیا۔ ڈھاکہ، چائنا گرام وغیرہ میں لاکھوں انسانوں نے عقیدت کی بجھا ہوں سے اسے دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ پاکستانی کو اس غلاف کے بنانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہاں بھی جن جن راہبوں سے اس جہاں گزرا لوگوں کا پناہ مجمع ہو رہا تھا۔ مشتاقان دیدہ بہاں بھی ہر اس جہے پر نظر آتے تھے جہاں سے وہ اس کی زیارت کر سکیں۔ وہ اس کی زیارت

۴

مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مسلمانوں نے بنگلہ شہر وادب میں شیا بہا اضافے کئے ہیں۔ یہ ان کا ایک مختصر مگر سیر حاصل انتخاب جو عہد قدیم سے معاصر شہر تک پیش کیا گیا ہے۔

یہ ترجمے احسان احمد اشک اور جناب یونس آحمر نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں۔

ضخامت ۲۵۰ صفحات۔ کتاب مجلد ہے پارہہ کی

نقصیں جلد۔ طلافی لوح سے مزین۔ قیمت

چار روپے ۱۰ پیسہ۔ یہی کتاب سادہ جلد میں چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ نمبر ۸۳۔ کراچی

رسم جہاں

اظہر جاویدا

ڈھل گئی دھوپ، بڑھ گئے سائے

صحن گلشن میں مسکراتی ہوئی

رقص کرتی ہوئی بہار آئی

ایک گل، آخری ہنسی ہنس کر

نوشگفتہ کلی سے کہنے لگا

ہم چلے، رنگ و بو کی محفل سے

(ایک بھکی، سکوت، تنہائی)

خاک پر پتیاں نظر آئیں

اور وہ بھی کہاں نظر آئیں

ڈھل گئی دھوپ، بڑھ گئے سائے

نوشگفتہ کلی، بہ اذن حیات

لے کے انگڑائی، ایک پھول بنی

پھر وہی گلستاں، وہی حالات

طلوعِ نو

سلطانِ زیہری

رات بھر بیٹھی ہوئی گوشہ تنہائی میں

اوس روتی رہی گلزار میں آٹھ آٹھ آنسو

جھاملاتے رہے آنکھوں میں ستارے بہیم

جگمگاتے رہے پلکوں پہ گہر بار دھپے

مسکراتے رہے آکاش پہ بکھرے تارے

گنگناتے رہے سرمست ہوا کے جھونکے

مثل بیگانہ گذرتی رہی آوارہ صنبا

کھلکھلاتے رہے ایلیے رسیلے پتے

سرب زانو رہی غم روتی رہی شب بھر بنیم

کوئی مونس، کوئی عزم، کوئی ہجوم نہ ملا!

بستر شب سے کسی شوخ کرن نے اٹھ کر

پھینک دی دور اندھیرے میں ملگتی چادر

حجلہ شوق کے پُر نور درتپے کھولے

گل بداماں، شفقتی پردے ہٹا کر جھانکا

اوس کو باغ میں بیٹھے ہوئے روتے دیکھا

درد انگڑائیاں لیتا ہوا دل میں جاگا

بامِ نور شید سے وہ زینہ بہ زینہ اتاری

مسکراتی ہوئی، ہنستی ہوئی، چمچم کرتی

نرم شیخون سے آچھلے سے ٹپے پرایکے ساتھ

چشمِ بنیم سے ڈھلکے ہوئے آنسو پونچھے

مسکراہٹ سی فضاؤں کے لبوں پہ ڈھکی

دکھ کی ماری ہوئی دنیا میں اجالے جاگے

آخر شب کے ہم سفر

عظیم سرور

جتنا نے "اس" کے ساتھ اپنی آواز طانی شروع کر دی۔
اس ذرا سے ہنگامے میں آدھی رات بیت گئی کہتے ہیں
قدرت شکار یوں کی عمر میں اتنا اضافہ کر دیتی ہے جتنا وہ شکاریوں
صرف کرتے ہیں۔

بارہ بجے کا محل ہوگا۔ سچی قریب قریب تیار تھی۔ اسی
وقت انہیں دور کوئی سایہ سا اپنی طرف آنا نظر آیا۔ تینوں اُس طرف
دیکھنے لگے اور جب وہ سایہ قریب آیا تو دیکھا کہ بے چارے جسم
کا ایک خوبصورت نوجوان ہتھلے پر کالی بگڑی باندھ رکھی تھی۔
پوستیں میں اُس کا جسم بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ کانٹے
پر رانفل تھی۔

"اسلام علیکم"

"وعلیکم السلام" تینوں نے گرمجوشی سے جواب دیا۔
"کہو اس طرف کیسے آئے؟" جبار سمجھا کچھ اور لوگ بھی شکار
کو آئے ہوں گے۔ اور یہ شخص الاؤ دیکھ کر اس طرف نکل آیا ہے۔ لیکن
اجنبی کا جواب بڑا غیر متوقع تھا:
"یوں ہی رات گزارنے کے لئے۔"

"بسم اللہ! بیٹھ جاؤ یہیں" فتح نے مکرانے ہوئے کہا۔
جبار نے بات کا سلسلہ آگے بڑھانے کی خاطر کہا۔ "کہاں
سے آئے ہو؟"

"خارستان سے۔"

"خارستان سے؟"

"اتنی فُور سے؟ مگر کب؟"

"ابھی ابھی آیا ہوں۔ اور صبح جب سورج نہ نکل رہا ہوگا
میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

جتنی دیر میں جبار نے سجد اور شینے کی سوکھی جھاڑیوں کا بڑا
دھیر بنایا۔ عبد القصد اور فتح گئے مل کر مارخور کی کمال اتاری۔

شام کے سامنے پھیل رہے تھے۔ اور اس سے قبل کہ پہاڑ
شام کی سرمئی شالی اور دھڑلے انہیں الاؤ روشن کرنا تھا پھر مارخور کا گوشت
شہتوت کی پتلی شاخوں پر چڑھا کر الاؤ کے گرد لگاتا تھا کہ اُن کی شب
بہری کے لئے سچی تیار ہو سکے۔ گوشت کی یہ بہترین قسم لذیذ و خیر
ہوتی ہی ہے مگر جسم کو پہاڑوں کی خنکی سے محفوظ بھی رکھتی ہے۔

مقد، جبار اور فتح آج دوپہر ہی زرغون پہاڑ پر آئے تھے۔
پہاڑ پر آنے کے بعد تھوڑی سی دیر ہی میں انہیں مارخور دکھائی دیا جبار
نے خاموشی سے اُس پر فائر کر دیا۔ ایک گولی کھا کر تو مارخور باسانی بھا
جاتا لیکن وہ غصے میں پلٹا اور پہاڑ کے سینے سے باہر کی طرف نکلے ہوئے
ایک پتھر کے ساتھ اُس کا سر ٹکرایا اور وہ چکر کر گر پڑا۔ اس عرصے
میں عبد القصد اور فتح نے کی رانفلوں نے بھی آگ اٹھائی اور مارخور
تڑپنے لگا۔ پہاڑ پر آتے ہی بسم اللہ ہو گئی تھی اور اب تینوں کا یہ
خیال تھا کہ اس بار خوب شکار ملے گا اسی لئے تو وہ پورے جوش کے
ساتھ خوشی خوشی اپنے کام میں مشغول تھے۔

جبار نے ایک جگہ کچھ جھاڑیاں جمائیں اور انہیں آگ دکھادی۔
سوکھی جھاڑیوں سے ایک دم شعلے بلند ہونے لگے۔ تھوڑی سی دیر
میں مقد اور فتح نے مارخور کا گوشت بھی شہتوت کی ٹہنیوں پر چڑھا
اور الاؤ کے گرد گاڑ دیا۔

اب محض جم چکی تھی — تھوڑی دیر انہوں نے پہاڑ کی
خوشگوار ہوا، بلندی اور دادی کی خوبصورتی اور حسن کی باتیں کیں۔ انہی
باتوں کے درمیان مقد نے اٹھائی اور کاکری غار سے گانے لگا۔
فتح اور جبار واہ واہ کرتے جاتے۔ پھر فتح نے کچھ بند لگائے اور

”خیریت تو ہے؟“

”ہاں کچھ خیریت ہے بھی اور کچھ نہیں تھی۔“

فتح نے صمد اور عبد الجبار کے منہ سے قہقہے نکل پڑے۔
اجنبی خاموش اُن کے چہرے سے مکتا رہا۔

پھر جبار بولا۔ ”صاف صاف بتاؤ یا بات کیا ہے؟“
”کوئی بات؟“

”یہی کہ کس سلسلے میں یہاں آئے ہو تم۔“

”میں اگر تم لوگوں کو نہ بتاؤں تو تم میرا کچھ بھی نہیں کھا سکتے
اور اگر بتا دوں۔۔۔ تب بھی تم کچھ نہ کر سکو گے۔“

”پھر وہی بات۔۔۔ ہم تو بونہی پوچھ رہے ہیں۔ تم بگڑ رہے ہو۔
صمد نے ذرا دمیر سے کہا۔

اجنبی اُسے گھورنے لگا۔ صمد ٹھہرا سا گیا۔

”لو فتح گئے! اپنے بار کو مار خور کی ران تو کھلاؤ۔“

”نہیں! نہیں! میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ یاروں سے ہی ناراض ہو گئے۔“
جبار نے کہا۔

”نہیں۔ میں تم لوگوں سے بھلا کیا ناراض ہوں گا۔“

تھوڑی دیر وہ بونہی بیٹھا رہا۔ پھر جیسے اپنے آپ سے باتیں
کرنے لگا۔ ”جب مولوی اذان دے رہا ہو گا میں نوٹس کا رینگ پاز کر پکا
ہوں گا۔ میرے ساتھ پرسی گل ہوگی۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے
میرا یہ پہاڑ پار کر جاؤں گا۔ پھر مجھے کوئی نہ روک سکے گا۔ کوئی نہ
روک سکے گا۔ میں پرسی گل کو خوارستان لے جاؤں گا۔ پھر میسر ہو
پرسی گل مجھے ٹپتے ستائے گی اور میں اُس کے سرے لگے گی تاہیں
سن کر وجد کرتا رہوں گا۔“

”اچھا تو اس ہم پر آگئے ہو تم ادھر سے۔“

”ہاں اور یہ ہم سر کر کے آج فریہ خاں اپنے گھر لوہاں چلے جائے گا۔“

”اپنی پرسی گل کے ساتھ؟“ صمد نے نقد دیا۔

”ہاں! اپنی پرسی گل کے ساتھ۔ پرسی گل کو میں نے پہلی بار

میں کارینہ پر دیکھا تھا۔ وہ مشکیزے میں پانی بھر رہی تھی۔ کالے

بچے میں اس کا چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے برف کے درمیان

۔ میں چاند ہو۔ میں یہاں سے گزر کر خوارستان جا رہا تھا۔ پرسی گل

کو دیکھا تو میریں ڈیرہ کر لیا۔ پھر میں پرسی گل کے باپ سردار شرب خاں کے

ہاں ذکر ہو گیا۔ اور ایک دن جب سردار اکیلا تھا میں نے اُس سے کہہ دیا کہ

پرسی گل کی شادی مجھ سے کر دے۔ سردار شرب خاں پہلے مجھے گھوڑا تاروا۔

پھر بولا۔ ”پرسی گل کے جہیز کے لئے پانچ ہزار روپے دو۔ اگر اتنی رقم

لا سکو تو پرسی گل سے شادی ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔“ شرب خاں کو

یہ معلوم نہیں تھا کہ میں کس باپ کی اولاد ہوں۔ میں نے رات کی

تاریکی میں پرسی گل سے کہا۔ ”میں خراسان جا رہا ہوں۔ وہاں سے تمہارا

جہیز کے لئے روپیہ لے کر آؤں گا۔ اور تمہیں بیاہ کر کے جاؤں گا۔ پرسی گل

رونے لگی۔ وہ کہتی تھی۔ ”میرا باپ دن کی روشنی میں جہیز کے عوض مجھے

تمہارے والے کر دے گا۔ یہ ٹھیک ہے مگر میں جہیز کی رسم کو بالکل

فضول سمجھتی ہوں۔ اگر تم مجھے خوش رکھ سکتے ہو تو میں عمر بھر کا ساتھ بنا لینے

کو تیار اور اس رات کی تاریکی میں تمہارے ساتھ چلنے کو آمادہ ہوں۔

مجھے اپنے وطن لے چلو۔۔۔ لیکن میں نے اُسے تسلی دی اور جلد آنے کا

وعدہ کر کے اپنے گاؤں پہلا گیا۔ گاؤں پہنچا تو پتہ چلا میرا باپ مگیا ہے،

میں نے اپنے بڑے بھائی سے رقم مانگی لیکن اس نے پیسے دینے سے

انکار کر دیا۔ اگر مجھے اپنے بھائی کے لڑکے سے بیار نہ ہوتا تو میں اُسے

اُسی وقت کوئی کانش نہ بنا دیتا۔ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ

پرسی گل تو میرے ساتھ ویسے بھی آنے کو تیار ہے۔ میں اُسے رات

کی تاریکی میں اُس کے گاؤں سے نکال سکتا ہوں اور جب میں واپس

یہاں پہنچ جاؤں گا تو کوئی۔۔۔ بڑے سے بڑا سردار بھی مجھے اس

سے جیاد نہ کر سکے گا۔ میں یہی سوچ کر اپنے گھر سے نکلا ہوں۔ ابھی میں

پہاڑ پر چڑھ رہا تھا کہ گاؤں کا۔ پھر پچھلے پہ میں پرسی گل کے پاس جاؤں گا۔

وہ مجھے دیکھے گی تو کتنی خوش ہوگی۔ میں یہاں سے نہیں آؤں گا۔“ میں دن کی روشنی

تو تمہارے لئے نہیں خرید سکا اب رات کی تاریکیوں کی بھیک مانگتا

ہوں! پھر وہ میرے ساتھ چلی آئے گی اور صبح کی روشنی سے پہلے پہلے

ہم یہ پہاڑ پار کر چکے ہوں گے۔ چند ہی دنوں میں ہم اس طرف آ پہنچیں گے

جہاں پرسی گل مجھے ٹپتے ستائے گی اور میں اُس کے سرے لگے گی تاہیں

پر وحدہ کروں گا۔ بس یہی زندگی ہے، یہی زندگی ہے۔“

جبار، فتح، اور صمد تینوں پر سکتہ سا طاری تھا۔

”ہاں اور سنو! میرے راستے میں جو بھی آیا۔ اُس سے

میری رائے بات کر لے گی۔ اس کی آواز سے میرے علاقے کے پہاڑ

نو، نو، کراچی، اپریل ۱۹۶۳ء

نے سمجھا ابھی جا کر آپ کو خبردار کر دیں۔ ایک نوجوان خارتہائی سے آیا ہے اور وہ آپ کی لڑکی کو آج رات لے جانا چاہتا ہے۔ آپ ہوشیار رہیں۔ چراغ کی دھندلی سی روشنی میں، ردا کا چہرہ ہستیاک دکھائی دینے لگا۔ پھر وہ بولا۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم اس وقت میرے گھر پر آئے ہوئے اگر تم لوگوں نے یہی بات باہر مجھ سے کہی ہوتی تو میں اس مذاق کا ایسا مزا چکھاتا کہ ساری دنیا تماشہ دیکھتی۔“

”سردار مذاق نہیں، حقیقت ہے یہ۔“
”کیسی بے وقوفی کی بات کرتے ہو۔“

”سردار ہم سچ کہتے ہیں۔ سردار اس نوجوان کا نام بھی بتا سکتے ہیں۔ اس کا نام فرید خاں ہے۔“

”کیا بات کرتے ہو۔ فرید خاں کو تو آج سے پانچ سال پہلے میں نے خود مار دیا تھا۔ زرغون پہاڑ اور اس وادی کے لوگ اس کے گواہ ہیں کہ میری رائفل کی پہلی گولی نے فرید خاں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور دوسری گولی پر ہی اسے جگر کے پار ہوتی تھی۔ ان دونوں نے رات کی تاریکی کو، بھی سمجھ لیا تھا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ موت کے منہ میں بھی چلے جائیں گے۔“ غصہ سے شراب خاں کا بس پھول گیا تھا۔ ہمدردی سے اور جبار تینوں پرستہ طاری تھا۔

ان کی نظریں ایک نوجوان کا ہوتی تھا جو آگ کے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا:

”میں سورج نکلنے سے پہلے پہلے لوہڑ کا کارینر پار کر چکا ہوں گا، میرے ساتھ پر ہی گل ہوگی۔ پھر مجھے۔۔۔ میرا مطلب ہم دونوں کو۔۔۔ کوئی بڑے سے بڑا سردار بھی نہ روک سکے گا اور میری پر ہی گل مجھے طے سنائے گی اور میں اس کے سر پر گلے کی تانیں سن کر وجد کرتا رہوں گا۔“

اور وادیاں خوب آٹھا ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا وادی کی طرف اترنے والے راستے کی بجائے اوپر کی طرف جانے لگا۔
”مٹھرو بیٹی تو کھاتے جاؤ۔“

”مٹھرو بیٹی۔۔۔ ہم اپنے علاقے میں جا کر اپنے دنبوں کی سبھی کھائیں گے۔“

مٹھرو بیٹی جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو جبار بولا۔
”اس مٹھرو میں سردار شراب خاں کون ہے، اور یہ نام بھلا کیسا ہے؟“

”معلوم نہیں۔“

”میرا خیال ہے ہمیں اسے تلاش کر کے خبر کرنی چاہیے۔“

”ویسے ایک بات کروں“ فتح نے اچھے ہوئے کہا۔ اس

نوجوان نے جن دو چیزوں پر بھروسہ کیا ہے وہ دونوں ہی ناقابل اعتماد ہیں۔ سچو دوستو، عورت اور بددق پر بھی کوئی شخص بھروسہ کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تو اکثر لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ معلوم نہیں یہ کب بگڑ جائیں۔“

”لیکن فتح تمہارے یہ بھی سہ بھولو اگر یہ دونوں چیزیں کسی کی ہوجائیں تو لوگوں کے لئے کتنا بڑا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ جبار نے رائفل کا منہ پر جمالی۔ ”چلو، روانہ ہو جاؤ۔“

اور تینوں وادی کی طرف اترنے لگے۔

رباب کی آواز نے انہیں ”داشت“ کا پتہ دیا۔ نوجوانوں

کی محفل جی ہوتی تھی۔ یہاں سے ایک نوجوان ان کے ساتھ ہولیا۔

سردار شراب خاں ”موٹی موٹی آنکھوں اور بڑی ڈری گھنی مونچھوں والا وجیہ شخص۔“

طویل خاموشی کے بعد جبار نے کہنا شروع کیا ”سردار! ہم شکار کے لئے زرغون پر آئے تھے۔ وہاں ایسی بات ہو گئی کہ ہم

عمر قومی خواہی مسلمان نیست

ایست ممکن جز بقراں نیست

اقبال

حجلہ شرق

(مشرقی پاکستان میں چند دن)

عبد الصمد درانی

کی رہائش ہے۔ یہاں مجھے جا بجا تالاب نظر آئے جہاں عورتیں، مرد اور بچے نہاتے دھوتے اور کپڑے برتن وغیرہ صاف کرتے ہیں۔ اس کالونی میں آب رسانی کا بہت اچھا انتظام ہے۔ مولیشیل کے لئے بھی انہی تالابوں سے پانی لیا جاتا ہے۔ میں نے ایک روز اپنے میزبان سے پوچھا کہ لوگ اتنی کثرت سے پانی استعمال کرتے ہیں، سورج کی کرنیں بھی پانی کو سکھاتی ہیں مگر پھر بھی پانی کی مقدار میں کوئی کمی نہیں آتی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ میرے میزبان نے بتایا کہ ”بہت پہلے یہاں بیشمار جھیلیں تھیں اور ان میں دریائے پانی رس دس کر آتا تھا۔ جب بارشیں ہوتیں تو تالاب کیا پورا میدان اور سڑکیں تک تہ آب ہو جاتیں۔ پانی اب بھی اسی طریقے سے آتا ہے۔ مگر تالابوں کو مٹی سے بھر دیا گیا ہے اور وہاں عمارتیں تعمیر ہو گئی ہیں۔“

مشرقی پاکستان کو قدرت نے بڑی زرخیز زمین عطا کی ہے۔ اس لئے یہاں مصنوعی ذرائع سے آب پاشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں پانی لانے کے لئے نہریں نہیں بنائی جاتیں بلکہ زائد پانی کی نکاس کا مسئلہ ہے اور اس کے لئے نہریں بنائی جاتی ہیں۔ یعنی مغربی پاکستان کے برعکس معاملہ ہے۔ پھر جب یہ نہریں بن جاتی ہیں تو وہ صرف عام ضرورت کو ہی پورا نہیں کرتیں بلکہ معاشی حیثیت سے بھی بڑی مفید ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ نہریں آبی شاہراہیں بن جاتی ہیں اور آمد و رفت کا بڑا سہولت وسیلہ۔ جنگلوں سے بانس اور چاقی لکڑی کاٹ کر ان میں بہائی جاتی ہے اور چند نگرانوں کی مدد سے وہ منزل مقصود تک پہنچا دی جاتی ہے۔ دریائی سفر کے دوران کھانا بھی بانس سے ہی پکنا ہے اور وہ بڑا اچھا ایندھن ثابت ہوتا ہے۔ بانسوں کے تحت بنا کر ان پر سوتے بھی ہیں۔ یہاں تو ایسے بہت خاندان ملیں گے جو خشکی پر رہتے ہی نہیں۔ کشتیوں میں ہی

مغربی پاکستان کے لوگ یہاں نوازی میں مشہور ہیں مگر شرقی پاکستان پہنچ کر محسوس ہوا کہ ہماری یہ قدر بھی مشترک ہے اور یہاں کے لوگ بھی یہاں نوازی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ مجھے تو ڈھاکہ پہنچنے کے بعد یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں غیروں میں ہوں۔ وہی محبت، وہی عزت وہی ہلاوت سلوک جو اسلامی روایات کا نتیجہ ہے۔

ڈھاکہ پہنچنے کے دو تین دن بعد میں نے غسل کرنا چاہا تو اپنے میزبان سے پوچھتے ہوئے ذرا جھجک ہوئی، اس لئے مکان سے نکل کر ایک رکشا والے سے کہا کہ اسی جگہ لے چلو جہاں نہانے دھونے کا بندوبست ہو۔ میری مراد حمام سے تھی مگر وہ مجھے ایک تالاب کے کنارے لے آیا اور کہنے لگا۔ ”صاحب، یہاں آرام سے نہائیے۔“ میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اس پاس کے محلے کے لوگ بڑی کافی تعداد میں اس تالاب کے کنارے نہادھو رہے تھے۔ مگر میں اس طرح نہانے کا عادی نہیں۔ سوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس لئے جھجک تھی۔ خیر رکشا والے کو سمجھا یا کہ میں حمام میں نہانا چاہتا ہوں وہاں لے چلو۔ مگر وہ میری بات بالکل نہیں سمجھا۔ اس کا نہ سمجھنا بالکل قدرتی تھا کیونکہ یہاں حمام کا رواج نہیں ہے۔ مغربی پاکستان میں چونکہ حمام ہر شہر اور قصبہ میں عام پائے جلتے ہیں اس لئے ہم ان کے عادی ہو چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں حماموں کو عدم موجودگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں فیاض فطرت نے پانی بڑی افراط سے فراہم کر دیا ہے اور لوگ تالابوں پر نہاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان، دریاؤں، ندیوں کی سرزمین ہے۔ بعض بعض جگہوں پر یہ تیز کرتا مشکل ہو جاتا ہے کہ دریا، ندیاں، زمین بڑھتی ہیں یا بانی کے ایک وسیع سمندر کی کہیں خشکی ابھرائی ہے۔

ڈھاکہ کی ایک مشہور بستی ہے ”موتی جمیل کالونی“۔ یہاں آج کل نئے قسم کے مکانات بن رہے ہیں۔ زیادہ تر حکام اور سرکاری افسران

کو یاد کر لیں۔ اقبال، شاہ لطیف، رحمن بابا، وارث شاہ، خواجہ غلام فرید، نذیر الاسلام، کوئی جتیر الدین اور دوسرے شعراء کے میٹھے ریلے بول بچوں کو ازبر کرانے چاہئیں۔ بچوں میں فلمی گانوں کا میلان روکنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انہیں اپنے شعری ورثہ سے آشنا کیا جائے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں میں ثقافتی اقدار کی حفاظت کا بڑا جذبہ ہے جس کی ہر جگہ تقنید جھٹی چاہئے۔ انہوں نے بنگلہ زبان سے غیر مسلم اثرات خاص کر سنسکرت کے الفاظ اور ان کی بجائے آمیزش کو دور کرنا شروع کر دیا ہے اور ہر جگہ اسلامی تہذیب کا چاؤ نظر آتا ہے اور اس طرح مغربی پاکستان کے ساتھ ہم رنگی پیدا ہو رہی ہے۔ رسم الخط سے قطع نظر بنگلہ میں خالص اسلامی تہذیب و روایات کی علمی و ادبی نشانیاں منتقل کرنے کا کام بہت عرصے سے ہو رہا ہے، آزاد دی کے بعد سے تو اس کو خاص جہت ملی ہے۔ بنگلہ شاعری کی بعض اصناف تو خالص اسلامی اثر کا نتیجہ ہیں جیسے لوگ تیتوں میں مرشدی اور معرفتی گیت۔ رابندر سنگھت کے مقابلہ پر نذر علی کی گائیکی اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہر چند کہ مشرقی پاکستان اسلامی مراکز سے دور افتادہ ہے مگر اسلامی شاعر کی پابندی اور اسلام کی روایات سے وابستگی و شیفتگی وہاں بہت پائی جاتی ہے۔ ذہاکہ شہر میں مساجد کی کثرت، دینی اشغال سے گہرا لگاؤ، روزہ داری کا اہتمام بلیغ بہت ہی نظر آیا۔

سکھت تو گویا اسلام کا ایک ادبی ضابطہ قلعہ ہے۔ بہت ہزنفا اور بارونق شہر ہے۔ ایک جانب حضرت شاہ جلال کے جسد خاکی کو محفوظ کئے ہوئے ہے تو دوسری طرف حضرت شاہ قزاق جیسی برگزیدہ ہستی کا مزار ہے شہر میں دیکھو تو جا بجا بانسوں اور درختوں کے جھنڈوں میں درویشوں اور انبیاء اللہ کے مقبرے نظر آئیں گے۔ انہی فقر کی بدولت اسلام اس دور دراز علاقے تک پہنچا ورنہ کسی زمانہ میں یہ علاقہ کفر میں گمراہ ہوا تھا۔ اب یہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہے اور ہر شخص دین دار ہے۔ ادھر جمعہ کی اذان ہوتی اور ادھر کاروبار بند ہونے شروع ہوئے۔ لوگ جمع ہو ہو کر مسجدوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور خدا کے حضور میں پہنچ کر اپنے سینوں کو روحانی پاکیزگی کے نور سے بھر لیتے ہیں۔ مذہبی شغف کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ ان کا سلوک بڑا اچھا اور میں تعلیم اسلامی کے مطابق ہے۔ رمضان میں ہندوؤں کے ہونٹ

پیدا ہوتے ہیں، وہیں پر دان چڑھتے ہیں اور پھر ساری عمر سینہ بھر پر رواں دواں رہتے ہیں۔ کبھی خشکی پر آتے ہی ہیں تو صرف مردویان زندگی لینے کے لئے جیسے مروج، دال، تیل، چاول، چنا، وغیرہ ان چیزوں کا ماہ طور پر پھولی سے تبادلہ کیا جاتا ہے یا پھر اس کنارے سے اس کنارے تک پہنچانے کا معاوضہ وصول کر کے ضروری اشیاء خریدی جاتی ہیں۔ میں نے ان کی زندگی پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ مغربی پاکستان کے خانہ بدوشوں اور ان لوگوں میں بس خشکی اور تری کا فرق ہے۔ مغربی پاکستان کے غلابو زمین پر اویہ لوگ پانی پر ہی گھومتے پھرتے ہیں اور ان کی نہ کوئی مستقل جگہ قرار ہوتی ہے نہ کوئی معین منزل۔ موجودہ دور میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے ان فرزندوں کو بھی تعلیم و تمدن سے بہرہ مند کیا جائے اور ان کی معاشی و معاشری حالات کو بہتر بنایا جائے۔

مشرقی پاکستان کے لوگوں میں بھی مذہب، ثقافت اور اپنی طرز حیات کو برقرار رکھنے کا بڑا زبردست جذبہ ہے۔ یہاں کے میٹھا رنگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے غیر ملکوں سے واپس آتے رہتے ہیں مگر ان کا رہن بہن سادہ ہی رہتا ہے اور وہ ظاہری مغربی اثرات قبول نہیں کرتے۔ چاول، مچھلی، جو ان کی مرغوب غذا ہے بڑے سادہ طریقہ سے بیٹھ کر کھاتے ہیں اور اپنی قومی زبان کی پرورش دہر پستی کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی موسیقی کو بھی مغربی اثرات سے پاک رکھا ہے۔ عوام میں بھی اپنی موسیقی سے ہی لگاؤ ہے۔ مشرقی پاکستان کے کسی بھی ہوٹل یا رستوران میں چلے جائیے کسی غیر ملکی ریڈیو سے فلمی گانے نہیں سنے جاتے بلکہ اپنے ڈھاکہ اسٹیشن کو ہی سنتے ہیں۔ علی الصبح قرآن مجید کی تلاوت کی آواز ہر گھر سے آتی ہے۔ اس کے بعد وہ بچے جنہیں موسیقی سے دلچسپی ہے کسی نہ کسی ساز پر کچھ سیکھتے اور مرگم لاپتے بھی سنے جاتے ہیں۔ کہیں دیکھو تو کوئی صاحب سا راتھائے کسی استاد کے گھر کی طرف دوڑتے نظر آتے ہیں مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ میرے میزبان کا ساڑھے چار سال کا بچہ کھیل کود کے دوران قاضی نذیر الاسلام کی بیڑی (دبائی) بڑے نرم سے گاسا پھرتا تھا۔ جب دیکھو چل رہے چل رہے! کی دھن اس کے لبوں پر ہوتی تھی۔ یہ ایک جاندار قومی ثقافت کی دلیل ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی بولیوں کا اختلاف ہے مگر کسی کی بولی کوئی حق نہیں ہوتا اور سب اپنے دیس کی بولیوں کو ترقی دینے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ دونوں بازوؤں میں قومی شعرا کے کام بچوں

کھلے رہتے ہیں اور کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ سرسوتی پوجا کا جلوس نکلتا ہے، بیشمار ہندو مرد و زن سرسوتی (علم کی دیوی) کے جیکارے لگاتے ہوئے گزرتے ہیں، مگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آتا مسلمانوں کی اس رواداری کو اسلام کی سچی روح سمجھا جاتا ہے اور مسلمانوں کے اس سلوک کو اسلام کے عالمگیر پیغام اخوت و سلامتی کا منظر سمجھا جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ یہاں لوگوں میں مغربی پاکستان کے لوگوں سے گہری وابستگی ہے۔ اسلام دوستی، حب وطن اور ثقافتی یکجہتی کے مظاہر میں وہ ہر طرح ہم رنگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان کے شمالی علاقوں سے گئے ہوئے سینکڑوں لوگ وہاں جا کر مستقر ہو گئے ہیں اور سب بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ وہ اب اچھا کاروبار کر رہے ہیں۔ انہاس کے باغوں کے مالک ہیں یا چائے کے باغیچے خرید لئے ہیں۔ وہ کبھی کبھی اور مغربی پاکستان کی طرف بھی آتے ہیں اور کچھ دن رہ کر پھر ادھر ہی چلے جاتے ہیں اور ہر طرح مطمئن ہیں۔ ان کے بچے خوب بنگلہ سیکھ گئے ہیں، بنگلہ گانے گاتے ہیں اور رہن رہن سے بھی ایسے لگتے ہیں کہ جیسے سدا یہیں رہے ہوں۔

چانگنام سے پچیس میل دور پہاڑیوں کے درمیان کونالی دریا کے کنارے پاکستان کا سب سے بڑا کاجانہ کاغذ سازی بنا ہوا ہے۔ یہاں مغربی پاکستان سے آئے ہوئے سینکڑوں نہیں ہزاروں مزدور، کاریگر، کلرک، ڈرائیور وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اس کاخانہ کا افراتظامیہ سابق صوبہ سرحد کے ایک ریٹائرڈ لفٹنٹ کرنل ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے تک اپنے کاخانے کے مختلف شعبے دکھائے۔ وہ جس شعبے میں جاتے، مزدور اور کاریگر بڑے ادب اور احترام کا مظاہرہ کرتے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ اس میں ذاتی تعلقات کو بڑا دخل تھا، خوف یا رعب کا کوئی بھی شائبہ نہ پایا جاتا تھا۔ ادب قاعدہ کے ساتھ ایک نوٹ کی بے تکلفی بھی تھی جو باپ بچے، چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی کے درمیان ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مزدور کو شاباش کہتے، کسی کا حال پوچھتے، کسی کی بیٹھ پر پیار سے تکیہ دیتے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں بازوؤں کے درمیان ددری و اجنبیت کے قصبے کہاں سے گھٹ لئے جاتے ہیں کسی ایک دم

مثال کو سند یا ثبوت بنانا بات کا بنگلہ بنانا کہلاتا ہے اور مجھے دوران سفر آپس کے فرق کا ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آیا جس سے وہ دشمنوں کی بات پر یقین کیا جاسکے۔ چند رنگونا کاغذ سازی کا کارخانہ بھی دیکھا۔ اس کے دروازے پر جب میں موٹر رکشا سے اترتا تو سامنے مسلح باوردی پہرے دار کھڑا تھا۔ اس کے قریب سے یہ سمجھا کہ کوئی سرحدی بھائی ہے۔ میں نے پشتوں میں اسے مخاطب کیا تو قدرتی بات تھی کہ وہ ہلکا خوش ہوا۔ فوراً دروازہ کھول دیا اور مجھے اور میرے ساتھی احمد انوان صاحب کو استقبالیہ کرے لے جا کر بٹھا دیا۔ پھر چائے پینے کے لئے اصرار کیا۔ میں نے اسے کہا کہ بھائی مجھے بہت جلد واپس جانا ہے۔ مگر وہ مقررہ بجھے اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ہماری طرف کے بہت سے لوگ اس کا رخاںے کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں۔ یہاں آکر یہ بھی معلوم ہوا کہ انخان پوندروں کو لوگ یہاں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ سودی کاروبار کرتے ہیں اور کاجانہ کہلاتے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ لوگ پاکستانی نہیں ہیں اور سرحد پار سے آتے ہیں اس لئے اب لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔

چانگنام سے کس بازار کا فاصلہ چورائے میل ہے سفر تو بڑا طویل ہے مگر راستہ اس قدر حسین ہے کہ سارے چائیلے کی یہ مسافت طبیعت پر گراں نہیں گزرتی۔ بڑک پختہ ہے اور بس بہت آرامدہ بھی اور سستی بھی۔ ایک طرف کا کرایہ و فز سات روپے ہے۔ ہوائی جہاز سے کاروباری مسابقت چلتی ہوئی ہے اس لئے ہوائی سروس کے اتبارع میں یہ بس والے دوپہر کا کھانا اور سہ پہر کی چائے بھی مسافروں کو پیش کرتے ہیں۔ اس شاہراہ پر کئی بس سروسیں چلتی ہیں۔ بسوں کے علاوہ ٹیکسال اور ٹورسٹ ویگنیں بھی ملتی ہیں۔ ٹورسٹ ویگنوں کا کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ یعنی بس کے کرایہ سے دو تین روپے زیادہ ان میں سفر کرنے سے وقت بچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ۱۴ میل کے سفر میں ایک بار ہی درانٹھرتی ہیں مگر بسیں جا بجا ٹھہرتی ہیں راستے میں ٹھہرنے والے لوگ بسوں سے ہی آتے جاتے ہیں۔ بٹک کے دونوں جانب خوبصورت پہاڑیاں ہیں۔ بانس

باقی صفحہ ۳۸

تہذیب دشمن

سلیم خان گچی

کردار

ڈاکٹر ہمت علی : عقیقات کا عالم
نفیسہ : ڈاکٹر ہمت علی کی سیکریٹری
صدر : عالمی کانفرنس کا چیرمین
جبار : برفانی ہم کے دو کارکن
امان علی :
تین بابر دار
وقت : کشمیر میں دو گرہ عہد

آغاز کی موسیقی (کانفرنس دوم)

ڈاکٹر : جناب صدر اور میرے محقق دوستو! مجھے اذہم سرت
ہے کہ میں عہد عتیق کے ایک ایسے حیوان پر معلومات پیش
کر رہا ہوں جو ساری دنیا میں صرف ایک ہے اور ایک ایسے
تحقیقاتی ادارہ کے سامنے اپنی کاوشوں کو لا رہا ہوں جسے
دنیا بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔ ایسے ماہروں کا
جن میں تحقیقات کے ماہر برہنہ نانو کے ماہر جراثیمات کے ماہر
جراثیمات کے ماہر، نفسیات کے ماہر، نباتات کے ماہر، نباتات
کے ماہر، غرضیکہ جن میں زندگی کے قدرتی و غیر قدرتی سببوں کے
ماہر شامل ہیں میرے محقق دوستو! میں جو معلومات آپ کے سامنے
لے کر آیا ہوں وہ بہت قیمتی ہیں اور جتنی بھی کیونکہ ان
معلومات کو حاصل کرتے ہوئے ایک اندازے کے مطابق
پانسو تیرہ آدمی ہلاک ہوئے۔

صدر : پانسو تیرہ آدمی!

ڈاکٹر : جی ہاں پانسو تیرہ آدمی اللہ کو پیارے ہوئے، تب کہیں

جاکر عہد عتیق کے اس نادریکیت بلاکت خیز برفانی حیوان کا
پتہ چل سکا۔ پانسو تیرہ آدمیوں نے اسے خون سے آبیاری
کی تب کہیں جاکر معلومات کا یہ نہال پروان چڑھا۔
صدر : نگہ ہارے اس عالمی تحقیقاتی ادارے نے تو برفانی اتنا
کو کپڑے کے لئے مالی امداد دی تھی۔

ڈاکٹر : درست ہے جناب صدر مگر برفانی انسان نہ کپڑا جاسکا
تاہم ہماری ہم کے بہادر اور دلاور محقق اپنی جانوں پر کھیل
اس برفانی حیوان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں
کامیاب ہو سکیں۔ یہ کارنامہ برفانی انسان کو کپڑے کے
مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم، مفید اور دور رس نتائج کا
حامل ہے اور نہایت ضروری بات یہ ہے کہ برفانی حیوان
کو کپڑے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ پانسو تیرہ انسانوں کا
خون کیرنے کے باوجود وہ حیوان ابھی زندہ ہے۔

صدر : آپ اجلاس کے سامنے اپنی گراں قدر معلومات پیش
فرمیں۔

ڈاکٹر : جناب صدر اور میرے محقق دوستو۔ تھوڑے دن
ہوئے ہیں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ عجیب اپنی برفانی ہم کے
لیڈر مسٹر جبار کا خط ملا۔

(ڈاکٹر کا کمرہ)

ڈاکٹر : سیکریٹری - سیکریٹری - من نفیسہ۔

نفیسہ : (دور سے) حاضر ہوئی ڈاکٹر صاحب رترب ست، جی
ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر : یہ خط ہماری برفانی ہم کے لیڈر مسٹر جبار کا ہے۔
ڈاکٹر : ہر گز نہ سناؤ میری عینک کے شیشے زیادہ پائے ہوئے ہیں۔

کھلے رہتے ہیں اور کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ سرسوئی پوجا کا جلوس نکلتا ہے، بیشمار ہندو مرد و زن سرسوئی (علم کی دیوی) کے جیکارے لگاتے ہوئے گزرتے ہیں، مگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آتا۔ مسلمانوں کی اس رواداری کو اسلام کی سچی روح سمجھا جاتا ہے اور مسلمانوں کے اس سلوک کو اسلام کے عالمگیر پیغام اخوت و سلامتی کا منظر سمجھا جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ یہاں لوگوں میں مغربی پاکستان کے لوگوں سے گہری وابستگی ہے۔ اسلام دوستی، حب وطن اور ثقافتی یکجہتی کے مظاہر میں وہ ہر طرح ہم رنگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان کے شمالی علاقوں سے گئے ہوئے سینکڑوں لوگ وہاں جا کر مستقل آباد ہو گئے ہیں اور سب بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ وہ اب اچھا کاروبار کر رہے ہیں۔ اناس کے باغوں کے مالک ہیں یا چائے کے باغیچے خرید لئے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ادھر مغربی پاکستان کی طرف بھی آتے ہیں اور کچھ دن رہ کر پھر ادھر ہی چلے جاتے ہیں اور ہر طرح مطمئن ہیں۔ ان کے بچے خوب بیگلمیکھ گئے ہیں، بیگلمکھانے لگاتے ہیں اور رہن رہن سے بھی ایسے لگتے ہیں کہ جیسے سدا بہیں رہے ہوں۔

چانگام سے پچیس میل دور پہاڑیوں کے درمیان کرناٹلی دریا کے کنارے پاکستان کا سب سے بڑا کاخانہ کاغذ سازی بنا ہوا ہے۔ یہاں مغربی پاکستان سے آئے ہوئے سینکڑوں نہیں ہزاروں مزدور کارگر، کلرک، ڈرائیور وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اس کاخانہ کا افسرانظامیہ سابق صوبہ سرحد کے ایک ریٹائرڈ لفٹننٹ کرنل ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے تک اپنے کارخانے کے مختلف شعبے دکھائے۔ وہ جس شعبے میں جاتے، مزدور اور کارگر بڑے ادب اور احترام کا مظاہرہ کرتے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ اس میں ذاتی تعلقات کو بڑا دخل تھا، خوف یا رعب کا کوئی بھی شائبہ نہ پایا جاتا تھا۔ ادب قاعدہ کے ساتھ ایک نوع کی بے تکلفی بھی تھی جو باپ بچے، چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی کے درمیان ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مزدور کو شاباش کہتے، کسی کا حال پوچھتے، کسی کی پیٹھ پر پیار سے ہتھکی دیتے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں بازوؤں کے درمیان دوری و اجنبیت کے قصے کہاں سے گھڑ لئے جاتے ہیں کسی ایک دم

مثال کو سند یا ثبوت بنانا بات کا بنگلہ بنانا کہلاتا ہے اور مجھے دوران سفر آپس کے فرق کا ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آیا جس سے وطن دشمنوں کی بات پر یقین کیا جاسکے۔ چند گونا گواغذ سازی کا کاخانہ بھی دیکھا۔ اس کے دروازے پر حب میں موٹر رکشا سے اترا تو سامنے مسلح باوردی پہرے دار کھڑا تھا۔ اس کے قریب سے میں سمجھا کہ کوئی سرحدی بھائی ہے۔ میں نے پشتوں میں اسے مخاطب کیا تو قدرتی بات تھی کہ وہ بڑا خوش ہوا۔ فوراً دروازہ کھول دیا اور مجھے اور میرے ساتھی احمد انومان صاحب کو استقبالیہ کرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ پھر چائے پینے کے لئے اصرار کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی مجھے بہت جلد واپس جانا ہے۔ مگر وہ مقرر رہا۔ مجھے اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ہماری طرف کے بہت سے لوگ اس کارخانے کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں۔ یہاں آکر یہ بھی معلوم ہوا کہ افغان پوتندوں کو لوگ یہاں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ سودی کاروبار کرتے ہیں اور کاپی لٹا کہلاتے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ لوگ پاکستانی نہیں ہیں اور سرحد پار سے آتے ہیں اس لئے اب لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔

چانگام سے کس بازار کا فاصلہ چورائے میل ہے۔ سفر تو بڑا طویل ہے مگر راستہ اس قدر حسین ہے کہ ساڑھے چار گھنٹے کی یہ مسافت طبیعت پر گراں نہیں گزرتی۔ سڑک پختہ ہے اور بس بہت آرامدہ بھی اور سستی بھی۔ ایک طرف کاراکرا یہ مرف سات روپے ہے۔ ہوائی جہاز سے کاروباری مسابقت چلتی ہوئی ہے اس لئے ہوائی سروس کے اتباع میں یہ بس والے دوپہر کا کھانا اور سہ پہر کی چائے بھی مسافروں کو پیش کرتے ہیں۔ اس شاہراہ پر کئی بس سروسین چلتی ہیں۔ بسوں کے علاوہ ٹیکسیاں اور ٹورسٹ وینیں بھی ملتی ہیں۔ ٹورسٹ وینوں کا کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ یعنی بس کے کرایہ سے دو تین روپے زائد۔ ان میں سفر کرنے سے وقت بچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ۱۴ میل کے سفر میں ایک بار ہی ذرا ٹھہرتی ہیں مگر بسیں جا بجا ٹھہرتی ہیں۔ راستے میں ٹھہرنے والے لوگ بسوں سے ہی آتے جاتے ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب خوبصورت پہاڑیاں ہیں۔ بانس باقی

تہذیب دشمن

سلیم خان گئی

کردار

ڈاکٹر ہمت علی : حقیقات کا عالم
نقیبہ : ڈاکٹر ہمت علی کی سیکریٹری
صدر : عالمی کانفرنس کا چیرمین
جبار : برغانی ہم کے دو کارکن
امانت علی :
نہیں بار بردار
وقت : کشمیر میں ڈوگرہ عہد

آغاز کی موسیقی

(کانفرنس دوم)

ڈاکٹر : جناب صدر اور میرے محقق دوستو! مجھے از حد مسرت ہے کہ میں عہدِ عتیق کے ایک ایسے حیوان پر معلومات پیش کر رہا ہوں جو ساری دنیا میں صرف ایک ہے اور ایک ایسے تحقیقاتی ادارہ کے سامنے اپنی کوششوں کو لا رہا ہوں جسے دنیا بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔ ایسے ماہروں کا جن میں حقیقات کے ماہر برہمنوں کے ماہر حشرات الارض کے ماہر جاتیات کے ماہر انسلیمات کے ماہر، نباتات کے ماہر، نباتات کے ماہر، غرضیکہ جن میں زندگی کے قدرتی و غیر قدرتی سبھی شعبوں کے ماہر شامل ہیں میرے محقق دوستو میں جو معلومات آپ کے سامنے لائے والا ہوں وہ بہت قیمتی ہیں اور منہجی بھی کیونکہ ان معلومات کو حاصل کرتے ہوئے ایک اندازے کے مطابق پانسو تیرہ آدمی ہلاک ہوئے۔

صدر : پانسو تیرہ آدمی!

ڈاکٹر : جی ہاں پانسو تیرہ آدمی اللہ کو پیارے ہوئے، تب کہیں

جاکر عہدِ عتیق کے اس نادریکین طاقت خیز برغانی حیوان کا پتہ چل سکا۔ پانسو تیرہ آدمیوں نے اپنے خون سے آبِ حیات کی تہ کہیں جاکر معلومات کا یہ نہال پروان چڑھا۔
صدر : مگر ہمارے اس عالمی تحقیقاتی ادارے نے تو برغانی انسان کو پکڑنے کے لئے مالی امداد دی تھی۔

ڈاکٹر : درست ہے جناب صدر مگر برغانی انسان نہ پکڑا جاسکا تاہم ہماری ہم کے بہادر اور دلاور محقق اپنی جانوں پر کھینچ کر اس برغانی حیوان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ یہ کارنامہ برغانی انسان کو پکڑنے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم، مفید اور دور رس نتائج کا حامل ہے اور نہایت ضروری بات یہ ہے کہ برغانی حیوان کو پکڑنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ پانسو تیرہ انسانوں کا خون کرنے کے باوجود وہ حیوان ابھی زندہ ہے۔

صدر : آپ اجلاس کے سامنے اپنی گراں قدر معلومات پیش فرمائیں۔

ڈاکٹر : جناب صدر اور میرے محقق دوستو۔ تھوڑے دن ہوئے ہیں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ مجھے اپنی برغانی ہم کے لیڈر مسٹر جبار کا خط ملا۔

(ڈاکٹر کا کمرہ)

ڈاکٹر : سیکریٹری - سیکریٹری - من نقیبہ۔

نقیبہ : (دور سے) حاضر ہوئی ڈاکٹر صاحب رترب (جی) ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر : یہ خط ہماری برغانی ہم کے لیڈر مسٹر جبار کا ہے۔
ڈاکٹر : جی ہاں پانسو تیرہ آدمی اللہ کو پیارے ہوئے، تب کہیں

پیر مہو۔

نفسیہ : لکھا ہے (خط پڑھتی ہے)۔ قبلہ ڈاکٹر صاحب۔ تسلیم ! آپ یہ جان کر یقیناً افسردہ خاطر ہوں گے کہ ہم برفانی انسان کو پکڑنے میں قطعاً ناکام ہو گئے ہیں اور آپ یہ جان یقیناً بہت خوش ہوں گے کہ ہم برفانی حیوان کو پکڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میں اس برفانی حیوان کے چار فوٹو ارسال کر رہا ہوں۔ آپ ان تصویریں دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم نے کیسا جواب اور لاشائی حیوان قابو کیا ہے۔ میں حیوانی حیاتیات کے متعلق کی حیثیت سے بلا خوف تردد کہہ سکتا ہوں کہ ایسا حیوان دنیا کے کسی چڑیا گھر میں نہیں ہے اور نہ کسی عجائب خانہ ہی میں ایسے حیوان کا کوئی پنجرہ ہے۔ اس برفانی حیوان کی آٹھ شاخیں ہیں مگر وہ تصویر میں نظر نہیں آئیں گی کیونکہ وہ انہی شاخوں کو اپنے پیٹ کے اندریوں چھپا چکا ہے جیسے کچھوا اپنی گردن اپنے خول کے اندر چھپا لیتا ہے۔ اس کے تین دانت ہیں جو اس کے منہ کے اندر گم ہو چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دانت کی لمبائی ڈیڑھ گز سے زیادہ ہے۔ اس کی صرف ایک آنکھ ہے اس کے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ برفانی حیوان سائیکلوپس ایسے وحشی انسانوں کا مورث اعلیٰ ہے۔

ڈاکٹر : ہو سکتا ہے کہ برفانی حیوان ایک آنکھ والے وحشی انسانوں کا بعد اجداد ہو۔ ہاں آگے پڑھو۔

نفسیہ : "برفانی حیوان ابھی تک مردہ حالت میں ہے۔ یہ کیفیت غالباً سردی کی وجہ سے ہے۔ میرے ساتھی شرماتانت کا خیال ہے کہ برفانی حیوان مرجھاتے مگر میرا خیال ہے یہ ہوش ہے۔ تاہم یہ امر تحقیق طلب ہے۔ ممکن ہے مرجھا ہو۔ ممکن ہے زندہ ہو مگر سردی سے بے سدھ ہو اور گرمی کھا کر زندہ ہو جائے۔ ہم نے کوشش کی تھی کہ اس کے اوپر لاؤ جلائیں مگر ہمیں ایندھن نہ ملا۔

ہمارے پاس جو کھانے پینے کی چیزیں تھیں ڈنڈ ختم ہو چکی ہیں اور نہ پاس کوئی پیسہ ہے۔ ہر بانی کر کے ہیں کچھ رقم بچوائے۔ آپ کا تا بعد ازلہ جبار۔

کیمپ وادی ڈرائنگ

ڈاکٹر : اس خط کو فائن میں لگا دو اور برفانی حیوان کی تصویر لگا کر اب ہم میں۔ یہ دو کام کمرے کے چیک بک لائڈ میں دوغزار روپے کے چیک پر دستخط کرتا ہوں۔ تم آج بینک میں سے رقم نکالو اگر صبح کی گاڑی سے وادی ڈرائنگ روانہ ہو جاؤ۔ وادی ڈرائنگ تک پہنچنے کے لئے تمہارے پاس نقشے موجود ہیں نا؟

نفسیہ : مگر ڈاکٹر صاحب میں جاؤں گی وادی ڈرائنگ؟ ڈاکٹر : جی ہاں۔ آپ جائیں گی۔ میں خود جانا چاہتا تھا مگر انفلوئنزا کے سبب میرا برا حال ہے۔ وادی ڈرائنگ جانے کے لئے آپ کو پاسپورٹ روپے دے جائیں گے۔

نفسیہ : شکریہ۔

ڈاکٹر : یہ خط اور تصویر ان کے ٹھکانوں پر رکھ دو اور چیک بک لائڈ۔ ہاں، چہرہ اسی سے کہو دو کافی سیٹ لائے، بالائی والی۔

نفسیہ : جی بہت اچھا (دور سے) فضلو دو کافی سیٹ بالائی والی

(وادی)

نفسیہ : (خود کلامی) نقشے کے مطابق یہی وادی ڈرائنگ ہے۔ میں پہاڑ پر پہنچ کر ڈھلوان پر آئی ہوں۔ سامنے پہاڑ ہے۔ میرے دائیں جانب پہاڑ ہے، پرے بائیں جانب پہاڑ ہے۔

(ایک آدمی کے کراہنے اور ہانپنے کے سنے کرنے کی آواز)

نفسیہ : کراہنے کی آواز کہاں سے ہے؟ سنو (تین آدمیوں کے کراہنے کی آوازیں)

نفسیہ : ایک نہیں، ایک سے زیادہ آدمیوں کے کراہنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ کیوں، کہاں سے؟

(سات آدمیوں کے کراہنے کی آوازیں)

نفسیہ : پہاڑوں میں گھری ہوئی وادی ڈرائنگ۔ برف میں اٹے ہوئے چاروں طرف پہاڑ۔ بادلوں میں چھپے ہوئے

جبار : یہ برفانی پہاڑ اکثر بادلوں میں چھپے رہتے ہیں۔ اور پھر سروپوں میں تو سورج شاذ و نادر ہی اپنا مکھڑا دکھاتا ہے۔

امانت : میں اس وادی کے لوگوں کی ہمت پر حیران ہوں۔ صرف گوشت پر ہی گزارہ کرتے ہوں گے۔

جبار : اور کیا پتھروں کے گھروندوں میں رہتے ہیں۔ برفانی جانوروں کا شکار کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ سال دو چار مہینے آتی ہیں۔ ان کی مزدوری کتنے ہیں اور جو کچھ ملتا ہے اس میں سے کچھ تو غوراک پر اور کچھ کپڑے پر خرچ کرتے ہیں۔

امانت : بڑے صابر لوگ ہیں یہ۔

جبار : اور فاقہ کش بھی۔

امانت : مجبور ہے۔ بے چارے کیا کریں۔

جبار : ایک بات ہے اور وہ یہ کہ یہ وادی بجا طور پر سکون، خوشنوا اور رنگوں کی وادی کہلا سکتی ہے۔ یہاں کی ہوا میں اتنی زندگی ہے کہ مردہ زندہ ہو جائے۔

امانت : گرمیوں میں۔ سروپوں میں تو آدمی ٹھہر کر مر جاتا ہے۔

جبار : انسان گرمیوں کے چھ مہینوں میں اتنی زندگی حاصل کر لیتا ہے کہ موت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

ایک آواز (گھڑائی ہوئی) صاحب۔ وہ سانس لے رہا ہے۔ برفانی حیوان۔

دوسری آواز، جناب دانت بھل رہا ہے۔ وہ... وہ برفانی حیوان جناب۔

تیسری آواز، وہ زمین پر سے اٹھ رہا ہے۔

ایک آواز، یہ شاید اس کی آواز ہے۔

عجیب و غریب دہشتناک آواز، جو اس سے پہلے

انسان کے کان نے نہ سنی ہو۔ آہستہ سے تیز اور

پھر تیز سے تیز تر

امانت : جبار! اسے قابو کرو۔

جبار : کیسے قابو کروں؟ وہ سورج کی کرنوں سے جا چکا ہے۔

سورج کی کرنوں کو کون قابو کرے۔

برفانی پہاڑ۔

(برفانی ہواؤں کا شور اور سیٹیاں)

نفیسہ : وادی کو چیرتے ہوئے گزرنے والی تیز ہوائیں اور ان ہواؤں میں آہ و فغاں، ڈرا آگے بڑھ کر تو دیکھوں۔

(آدمیوں کے کراہنے اور ہواؤں کے چلنے کی آوازیں)

نفیسہ : جبار۔ مسٹر جبار۔

جبار : ہائے ہائے۔

نفیسہ : جبار۔ مسٹر جبار۔

جبار : ہائے مرگیا۔

نفیسہ : جبار صاحب تم! خون میں لت پت کیا ہوا، جبار مجھے بتاؤ کیا ہوا۔

جبار : کون ہوتا تم۔ تم۔ ہائے ہائے۔

نفیسہ : جبار صاحب میں ہوں نفیسہ۔ مجھے ڈاکٹر نے بھیجا ہے۔

جبار : نفیسہ! ہنس نفیسہ ہائے۔ تم کہاں، تم یہاں کیسے؟ ہائے مرگیا۔

نفیسہ : میں تمہارے لئے دو ہزار روپے لائی ہوں۔ تم نے خط جو لکھا تھا ڈاکٹر کو۔

جبار : چلی جاؤ یہاں سے۔ چلی جاؤ۔ ورنہ نہیں موت آئے گی۔

نفیسہ : کون سی موت آئے گی؟

جبار : وہی جو ہماری ہم کے آدمیوں پر اور اس وادی کے لوگوں پر آئی۔ مرگیا۔

نفیسہ : میں نہیں سمجھتی تمہاری بات۔ بتاؤ مجھے کیسی موت؟

جبار : جانتا چاہتی ہو؟ لو سنو کیسے آئی ہم تک موت۔

امانت : جبار صاحب۔ اس وادی میں آئے ہوئے ہمیں آج

دس دن ہو گئے۔

جبار : ہاں امانت صاحب۔ آج پورے دس دن۔

امانت : آج موسم کچھ نکھر نکھر رہا ہے۔

جبار : اس لئے کہ سورج بھل رہا ہے۔

امانت : جی ہاں سورج بھل رہا ہے۔ ہم نے تو گذشتہ

سولہ دن سے سورج کی سند کر رہی تھیں دیکھی۔

انہوں نے کہا کہ اگرچہ مجھے کسی بر فانی خا کا پتہ ہے۔

ایسا غار جس میں ہم محفوظ رہ سکیں؟

(جیوان کی آواز۔ انسانوں کی چیخ بکا۔ بھگدڑ)

جبار : لوگو! ڈرو نہیں۔ ہتھیار لے کر اس پر حملہ کرو۔

دوسری آٹکا، اس نے پانچ آدمی مار دیے۔

جبارہ : دوستو! نیزے بھلے اور کلہاڑیاں لے کر اس موزی؟

ٹوٹ پھوٹ۔ گھبراؤ نہیں دوستو۔

تیسری آواز: جناب بھالے کو اس پر اثر نہیں ہوتا۔ اس کی کھال بہت موٹی

اور بہت سخت ہے۔

امانت : جبار صاحب انہی جان بچاؤ۔ جان بچاؤ۔

ایک آواز: وہ چاری طرف آرہا ہے۔ وہ چاری طرف آرہا ہے۔

دودو

جبار : لوگو! دوزخ نہیں بہت سہوار ہے۔ مقابلہ کرو۔ مقابلہ۔

(جیوان کی خوفناک آواز۔ چھپتی۔ بھاگ دوڑا اور انکشاف)

آواز نمبر: یہ مصیبت آئی کہاں سے؟

آواز نمبر ۲: بس کچھ نہ پوچھیو۔

آواز نمبر ۱: آخر کچھ تو بتاؤ۔ یہ بلا کہاں سے نازل ہوئی؟

آوازِ غمیر: وادی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ پیاروں کے

اس پار سے نازل ہوئی۔

آوازِ بحیرا: پہاڑوں کے اس پار سے۔

آوازِ کبیر ۱۲ ماں برقیے پہاڑوں سے ۔

دبر فانی چہا تہوں پر بادل کی لہر چہ بجلی کی لڑک،

امانت : (دور سے) جبار۔ جبار۔ جبار۔

جبار : (دور سے) بھراؤ نہیں۔ دے رہو۔
 گمان نہ اچھڑاؤ۔ نہ کھٹکنا۔

اور امیر! صاحب برف کا عوامی ارہ ہے۔

آواز تھا : جیدہ ! شگ کی

دوب کرم حاصل گئے۔

: امانت صاحب۔ ساتھ

امانت : در آس و آسوار و لذت و آسودگی و آسایش

جواب : انہیں تھانہ دیکھ کر ہم نے ان کا تھانہ دیکھ کر بخیر کر دیا۔

بجاء : اہل بیت علیہم السلام، اہل بیت علیہم السلام سے چنے گئے کراچی میں

غالباً خوراک کی گولیاں زیادہ کھاتی ہیں۔

امانت : درود سے گولیوں پر گزارہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو خدا جلنے کیا ہوتا۔

جبار : اللہ کو ہمارے ہو جاتے۔

آواز نمبر ۱ : (دوست) صاحب۔ صاحب۔ یہ پتھر نہیں ہے۔ یہ تو کھال ہے۔

امانت : کھال ہے؟

جبار : کھال کیسی؟

آواز نمبر ۲ : جناب اگر دیکھو۔

جبار : آئے۔

آواز نمبر ۳ : یہ پتھر نہیں۔ یہ..... یہ موٹی کھال ہے۔ یہ دیکھیے۔

جبار : ہاں۔ یہ پتھر نہیں کھال ہے۔ ہٹاؤ برف۔ اور برف

ہٹاؤ۔

امانت : میں ہٹاتا ہوں۔ یہ لیجئے۔ یہ دیکھیے۔

جبار : واللہ! یہ تو کوئی جالند ہے۔ برف سے بے سدھ۔

بیہوش۔

امانت : بیہوش نہیں۔ مردہ۔ دیکھو سانس نہیں لے رہا۔

جبار : ساتھیوں اور قلیوں کو بلاؤ کہ برف ہٹائیں۔ رستے

لاؤ۔ کدالیں لاؤ۔ کھوپے لاؤ۔ چاقو لاؤ۔

آواز نمبر ۴ : صاحب۔ برف کا طوفان زوروں پر آگیا ہے۔

جبار : پروا نہیں۔ یہ حیوان بہت بڑی یافتہ ہے۔ بہت بڑی

تاریخی یافتہ۔ میں نے ایسا حیوان آج تک نہیں دیکھا،

نہ روئے زمین پہاؤ نہ صفحہ قرطاس پر۔ نہ چرٹیا گھر میں

اور نہ عجائب گھر میں۔

امانت : میرا کیمرو کہاں گیا۔ میں اس کی تصویریں لوں گا۔

جبار : اسے دھکیل کر وادی ڈراگم میں لے چلو۔ وادی

ڈراگم میں اس کے ارد گرد رستے باندھو۔

امانت : زور لگاؤ

آواز نمبر ۵ : سب ہی زور لگاؤ۔

جبار : شاباش۔ اسے دھکیلو۔ دھکیل کر وادی میں لے جاؤ

(سبھی برفانی حیوان کو دھکیلنے ہیں اور زور لگاتے ہیں)

ڈاکٹر : (حقہ کی آواز سن کر) بہت خوش ہو جبار؟

جبار : ہاں بہت خوش۔ میں نے انسانی کلو پیڈیا دیکھا ہے

اور دوسری کتابیں بھی۔ ایسا جالند رستے سے چار لاکھ سال

پہلے اس کو وارض پر ممکن تھا اب نہیں۔ ہمیں ہماری محنت

کا پھل مل گیا۔

امانت : وادی کے لوگ بہت خوش ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ

حیوان ان کے بہادر جوانوں نے پکڑا ہے۔

جبار : وہ کسی حد تک درست سوچ رہے ہیں۔ اگر وادی

سے ساٹھ ستر اور جوان نہ آتے تو ہم اسے کیسے دھکیل کر

یہاں لاتے۔

امانت : اب وہ حیوان کے ارد گرد دائرہ بنا کر ناچ رہے ہیں۔

بے تحاشہ ناچ رہے ہیں۔

جبار : وہ بہت خوش ہیں۔ ہم بہت خوش ہیں میں بہت خوش

ہوں۔

(جبار کا حقہ)

ڈاکٹر : (حقہ زن ہو کر) برفانی انسان کو تم کیسے پکڑ لو گے؟

جبار : میں نے صرف مذاق کے طور پر کہا تھا۔

ڈاکٹر : اور میں نے مذاق ہی سمجھا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ برفانی

ہم کے لیڈر کی حیثیت سے ساری ہم کی ذمہ داری

تم پر آتی ہے۔ برفانی انسان کو پکڑنے کی ایک نہیں

بیسویں کوششیں ہو چکی ہیں مگر کامیابی کسی کو بھی نصیب

نہیں ہوئی۔ اگر برفانی انسان پکڑا جائے تو یقیناً جانے

دنیا نئے علم میں ہلکے جائے۔ بلکہ زلزلہ آ جائے۔

جبار : ہماری شہرت آسمان تک پرواز کرے۔

ڈاکٹر : یقیناً۔ کارنامے شہر میں ہمراہ لاتے ہیں۔ برفانی

امیدوں کو حقیقتوں میں بدلنے کے لئے جان نثار کر دیں گے۔
ہماری عزت و وطن کی عزت سے وابستہ ہے۔

ڈاکٹر : یقیناً۔ یقیناً۔

امانت : اب اجازت چاہتے ہیں۔ ذرا گھر جا کر شام کی دعوت کی تیاری کریں۔

ڈاکٹر : ضرور۔ ضرور۔ اب شام کی دعوت پر ملاقات ہوگی۔
(دعوت میں آئے ہوئے لوگوں کا شور)

مقرر : جناب صدر اور میرے دوستو۔ برناتی ہم پر جانے والے جوان وطن کے سپوت ہیں۔ ہم ان کے سامنے اپنا سر خم کرتے ہیں۔ جناب صدر —

ڈاکٹر : اور میرے محقق دوستو۔ پوری برناتی تحقیقاتی ہم کی کارگزاری سے تو آپ آگاہ ہو گئے۔ آپ کو معلوم ہو گیا کہ

پوری ہم کے بہادر ارکان اور وادی محل دلالہ کے باہمت انسانوں پر کیا گزری، لیکن وہ وحشت ناک اور ہلاکت خیز حیوان اب بھی زندہ ہے۔ اسے پکڑنا ضروری ہے۔

صدر : ہاں۔ حیوان کو پکڑنا ضروری ہے۔ زندہ یا مردہ۔

اسے ضرور پکڑا جائے۔ اسے کیسے پکڑا جائے اس

غرض کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ضروری ہے۔ کمیٹی

موزی حیوان کو پکڑنے کا طریق کار طے کرے اور اپنی

اپنی حکومتوں سے مالی مدد لے۔ اس مالی مدد سے ہم

ایک اور ہم وادی ڈرامنگ میں بھیجیں گے جس کے پاس گولہ

بارود ہوگا اور یہی کوہ پٹری ہے۔

ڈاکٹر : جی ہاں گولہ بارود وادی کوہ پٹریوں کا ہونا از بس

ضروری ہے۔

صدر : آپ آپس میں بیٹھ کر طے کریں کہ کمیٹی میں کون کون حضرات

ہوں گے۔ ہاں ایک بات طے ہے کہ تشکیل دی جانے والی

کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر بہت علی ہوں گے۔

(اختتامیہ پر موسیقی)

انسان کی گرفتاری یا اسیری بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر

اس موسم سرما میں وہ پکڑا جائے تو مزہ آجائے،

والاند مزہ آجائے۔

جبار : ہم یقیناً کامیاب ہوں گے۔

امانت : میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ ہم جن برناتی پہاڑوں کی طرف

جا رہے ہیں وہ کئی انسانوں کی جانیں لے چکے ہیں۔

ڈاکٹر : انسان مرتے رہتے ہیں۔ کوئی گھر میں کھاٹ پر۔ کوئی

بازار میں کوئی راستے پر۔ کوئی کھیت میں۔ کوئی سولی پر۔

کوئی پہاڑ پر کوئی سمندر میں۔ موت کہاں نہیں ہے۔

ہر کہیں ہے پھر موت سے گھبرانا کیا؟ اگر آپ علم کی دنیا

کے لئے علم کی روشنی لانے کے دوران مرجائیں تو یقیناً

یہ ایک شاندار موت ہوگی۔

جبار : جی ہاں (اونچی آواز میں) امانت صاحب۔ نقشہ وغیرہ

احتیاط سے رکھ لئے نا۔

امانت : بالکل۔ آپ فکر نہ کریں۔

ڈاکٹر : تو کل صبح آپ کی ہم روانہ ہو رہی ہے۔

جبار : جی ہاں۔

ڈاکٹر : آج شام شہریوں کی دعوت کتنے بچے ہے؟

جبار : رات سات بجے۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس تکلیف کی کیسے

ضرورت تھی؟

ڈاکٹر : بھائی یہ سوال مجھ سے نہ پوچھو۔ اس شہر کے باشندوں

کے سامنے پیش کرو۔ میرا خیال ہے شہر کے لوگ اس

ہم کے ارکان کو ملک و وطن کے سپوت سمجھتے ہیں۔

امانت : ہر بانی ہے ان کی ورنہ ہم نے ابھی تک کوئی کارنامہ

سرا نہ انجام نہیں دیا۔

ڈاکٹر : ان کی توقع تو یہی ہے تاکہ تم کارنامے سرا نہ انجام دینے

چارہ ہو۔

جبار : ہم یقیناً اہل وطن کی توقع پر پورا اتریں گے۔ ہم ان کی

حق بہ حق دار۔۔۔

لطیف جلیلی

پیشانی سے ملتا۔ استاد کے پاس اخبارات کا ایک پلندہ بھی ہر وقت موجود رہتا وہ اکثر سنے والوں پر اپنی علمیت کا ہیکہ جانے کے لئے اخبارات کے اقتباسات سنا تا اور عینک اور پراٹھا کر داذ نگاہوں سے ہر کسی کی طرف دیکھتا۔ داد دینے میں شکر دینے ہمیشہ فراخ دل رہا۔

زرعی اصلاحات کی بدولت کریم بخش، جو کبھی گاؤں کا مزارع تھا، اب زمین کا مالک بن گیا تھا۔ وہ ان دنوں بے حد خوش تھا۔ وہ اب گاؤں کے زمیندار کے برابر بیٹھتا تھا۔ صرف کریم بخش ہی نہیں اس کے بیوی بچے بھی بہت خوش تھے۔ وہ سوچتے کہ وہ اب اپنی ہی زمینوں پر محنت کرتے ہیں، تو محنت کا فائدہ بھی اب ان ہی کو ملتا ہے وہ اب کوڑا کڑاے جاڑے اور چلپاتی دھوپ میں کام کرتے ہوئے ایک مسرت سی محسوس کرتے۔ وہ اب کسی غیر کے محتاج نہیں تھے۔ معاشرے کے آزاد فرد ہر اعتبار سے آزاد اور اپنی قسمت کے خالق۔ زرعی انقلاب سے پہلے کریم بخش اپنی محنت سے جو کچھ پیدا کرتا اس کا نصف سے زیادہ حصہ زمیندار کے گھر چلا جاتا۔ کچھ مالکانہ حقوق کے بدلے اور کچھ دوسرے بہانوں سے۔ سچ تو یہ ہے کہ غریب کریم بخش کے پاس جو کچھ بچ رہتا وہ اسے اس کے بال بچوں کو زندہ رکھنے کے لئے ناکافی ہوتا۔ کریم بخش کے بیوی اور بچے مسلسل بیماریوں کا شکار رہتے۔ ان حالات میں کریم بخش کی زندگی کے ساتھ بیل بنی خوراک کہاں سے حاصل کرتے۔ کریم بخش کی پریشانی کے مولیشیوں کی بھوک سے اور زمین پر پوری طرح کاشت نہ کر سکنے سے فصل دن بدن کم ہوتی گئی اور زمیندار کے مظالم اور بہانے بڑھتے گئے۔

گھر نے تیز دھار بھر کو چادر کی گتوں میں چھپایا اور پردہ کی طرف چل پڑا۔ آج مرید پور میں اس کے بڑے بھائی کریم بخش نے ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یہ دعوت وہ زمین کے مالکانہ حقوق ملنے کی خوشی میں دے رہا تھا۔ مگر گوہر علی اپنے بھائی کے پاس مرید پور دعوت کھانے کے بجائے کسی اور غرض کے لئے جا رہا تھا۔ وہ حلقہ پٹواری، نور دین، کو قتل کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کریم بخش کو استاد فضل دین کی سفارش پر زمین دے دی تھی مگر گوہر علی کو نظر انداز کر دیا تھا۔

زندگی دیے بھی بڑے کٹھن طریقے سے بیت رہی ہے۔ پٹواری کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ بیوی بچوں کا خدا حافظ ہے۔ اس نے سوچا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مرید پور کی طرف چل دیا۔ جب گوہر مرید پور پہنچا تو اس نے دیکھا کہ آج استاد فضل دین کے مکتب میں طالب علموں سے زیادہ ان بہانوں کا ہجوم تھا جو اس کے بھائی، کریم بخش، کے گھر دعوت پر آئے ہوئے تھے۔ استاد فضل دین ناک پر عینک چڑھائے اپنی بان کی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر مہمانوں سے کچھ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی فاضل استاد اپنے کند ذہن طالب علموں سے باتیں کر رہا ہو۔ حالانکہ استاد فضل دین کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ ہاں فارسی خواں ضرور تھا۔ اس کا مکتب گاہوں کے باہر ایک ہپہل کے پرانے درخت تلے تھا۔ جہاں وہ طن بھرنچوں کو بڑھاتا اور شام کے بعد ایک میلے کھیلے چراغ کی روشنی میں ہر روز گپ شپ کی محفل آراستہ کرتا۔ ایسے جیسے بڑے شہر میں ادبی محفلیں ہوتی ہیں۔ ایسی محفلیں جو قلب و نظر کو گرماتی ہیں۔ استاد ہر آنے والے کو تندرہ

سننے والے بڑی عقیدت اور انہماک سے استاد کی گفتگو سن رہے تھے۔ مگر گوہر خاموش تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے شکار کی تلاش میں لگی ہوئی تھیں۔

گوہر نے استاد فضل دین کو ٹوک کر پوچھا "استاد جی یہ تو بتائیں کہ جس طرح بھائی کریم بخش کو زمین کے مالکانہ حقوق مل گئے ہیں اسی طرح باقی کاشتکاروں کو بھی زمینوں کے مالکانہ حقوق ملیں گے۔ یا باقی لوگ عمر بھر مزارع کے روپ میں زمینداروں کے غلام بنے رہیں گے؟" استاد فضل دین پہلے تو چونکا، پھر نہایت اطمینان سے بولا: "بھائی، حکومت بالکل خافل نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ حکومت کو پہلے تو ایسے مزارعوں کی صحیح تعداد کا پتہ نہ تھا جنہیں مالکانہ حقوق نہیں ملے، لیکن ۱۹۶۰ء کی زراعت شماری کے دوران حکومت نے کاشتکاروں اور زمینوں کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اب حکومت کو صحیح اندازہ ہو گیا ہے کہ کتنے مزارع باقی ہیں جنہیں مالکانہ حقوق دیئے جائیں اور مزید کتنی زمین زیر کاشت لائی جاسکتی ہے؟"

گوہر استاد فضل دین کی باتیں کچھ اس انداز سے سن رہا تھا جیسے کہ رہا ہو کیوں جھوٹ بچتے ہو؟ سرکار نے میرے بھائی کو اس لئے زمین دی ہے کہ میں غریب رہوں۔ سرکار میری زندگی کا مذاق اڑانا چاہتی ہے۔ مجھے سمجھو کون مارنا چاہتی ہے؟

استاد فضل دین اپنی تازہ تریں اطلاعات ایک طرح سے نشر کر رہا تھا کہ حلقے کا بیٹواری گھوڑی سرپنٹ دوڑاتا مکتب میں آیا۔ فضل دین اور کریم بخش اٹھے اور بیٹواری کی طرف بڑھے۔ گوہر نے چادر کی بکلی میں خنجر کو مضبوطی سے پکڑا اور اسٹاکہ کو فضل دین اور کریم بخش کے پیچھے بیٹواری کی طرف چل پڑا۔

نور دین، بیٹواری، گھوڑی سے اتر چکا تھا۔ چوکیدار گھوڑی کی دھکم دھماکہ سے اسے کنوئیں کی طرف لے گیا۔ اور نور دین استاد فضل دین اور کریم بخش کے ساتھ مکتب کے کمرے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ گوہر ہاتھ اٹھا کر نور دین پر خنجر سے وار کرے کہ بیٹواری نے اپنی اچکن کی جیب سے ایک خاکی رنگ کا کاغذ نکالا اور گوہر کی طرف بڑھا کر کہا:

"گوہر علی! یہ لو زمین کے مالکانہ حقوق۔ میں تمہارے

ادھر کریم بخش زمین کا مالک بنا، ادھر سے گاؤں کی انجمن امداد باہمی سے بھی تعاونی قرضہ مل گیا۔ نہ صرف اسے بلکہ اس کے کئی دوسرے ساتھیوں کو بھی۔ اس نے جوان میل خریدے، تازہ بیج لئے اور خوب دل لگا کر زمین میں ہل چلایا، بیج بکیرا، اور جب فصل کافی تو پہلے سے دگنی تھی۔ کریم بخش بہت خوش تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی بہت خوش تھے۔ اور آج کریم بخش نے اس خوشی میں اپنے عزیز واقارب کی دعوت کی تھی۔ اپنے پریشان حال بھائیوں کو بلایا تھا۔ برادری کے کئی دوسرے افراد کو بھی مدعو کیا تھا۔ یوں تو پہلے بھی کئی بار کریم بخش کے گھر رشتہ داروں کا ٹھٹھا جمع ہوا کرتا تھا۔ پہلی بار کریم بخش کی لڑکی کی وفات پر جو غریب سات دن تک بخاریں جلتا رہ کر چل بسی اور غریب باپ اپنی بچی کا خمار میں تر پٹا دیکھ کر بھی اس کے علاج کے لئے ایک پھوٹی کوڑی کا انتظام نہ کر سکا تھا اور برادری والے دوسری بار نہ رخصت کی پیدائش پر آئے تھے، جب کریم بخش نے ہیل بیج کریم بخش کے لئے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ میل بیج کر کھانے کا انتظام تو ہو گیا تھا مگر وہ ایک سال چھ ماہ تک دوسرا میل نہ خرید سکا، تب اس کے پاس بس ایک چارسی گلے رہ گئی تھی جس کے ساتھ وہ دوسرا جانور کسی سے مانگ کر جوت دیتا۔ اس طرح بہت سی زمین کاشت کے بغیر رہ جاتی۔

لیکن آج کریم بخش کے گھر میں چہل پہل تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں ڈھونڈ کر خوشی کے گیت گارہی تھیں۔ اس کے بیوی بچے صحت مند اور توانا تھے۔ گھر میں ہر چیز سلیقے سے لگی تھی۔ جہاں خوش تھے مگر گوہر سخت پریشان نظر آتا تھا۔ وہ وہ کریم بخش کے بغاوت چہرے پر نظر ڈالتا، اس کے بیوی بچوں کی طرف دیکھتا اسے اپنے گھر کا خیال آ رہا تھا... اپنے بیوی بچوں کا خیال جنہیں وہ بے مروت سامانی کی حالت میں جھوڑ کر چلا آیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر کریم بخش اور اس کے بہن بھیل کے درخت کی طرف گئے جہاں استاد فضل دین کا مکتب تھا۔ استاد حسب معمول باتیں کر رہے تھے۔ گائوں کی باتیں، افسر کا ذکر، فصل کی فراوانی، کبڈی کے مقابلے اور دوسری باتیں

شگفت گل

(طرح کار میں بچوں کی نمائش فن)

ارشاد سلمان

لاوٹ، بناوٹ اور شکف سے ہمیز ہوتی ہے۔ اس میں بچہ جو اصل بچہ ہے پوری طرح جھلکتا ہے۔ ہمیں اسی صلاحیت کے نکلت کو سنبھالنا ہے۔ اگر ہم اس طرف سے غفلت یا کوتاہی ہو تو بہت سے جوہر قابلِ اہم سے ہم جہلے ہیں۔ انسان کے ابتدائی عہد کو دیکھیں تو وہ بھی انسانیت کا بچہ نظر آتا ہے مگر یہی ہے کہ انسان اس وقت بھی بہت کمزور کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ آج جب ہم غاروں میں بنائی ہوئی تصویریں دیکھیں تو نظر پڑے گا کہ انھوں کی عکاسی اس وقت کے انسان کا مشغلہ تھا۔ نزدیک جتنے بچے جو بہا اور زندگی ملے تھے، وہ جانور جن سے اس کو سابقہ پڑا تھا اور اس کے آلات شکار کوئی نہ کوئی نقش بن کر ان غاروں کی دیواروں پر منتقل ہو جاتے تھے۔ ابتدائی انسان کے اس شغل صورت گری میں ہیں اور کچھ نظر آئے ہاں آئے مگر ایک بیساختگی، سچائی، اپج اور حرارت فکر ضرور نظر آئے گی۔ شاید یہی وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے ہم ان پرانے نقوش کو بھی دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان میں نئی فنی کیا ہے۔ سب سے بڑا احساس حیرت کا ہوتا ہے۔

اس عہد کا بچہ بھی اسی طرح اپنی فطری صلاحیت کے اظہار کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے اور اگر اسے شکل بنانے کا موقع مل جائے بے ساختگی، خلوص فکر اور جرأت اظہار ضرور موجود ہوتی ہے۔

بچوں کے بنائے ہوئے نقوش بھی اپنی ہی ایک عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ایک پھول، ایک پھلوری، جو گلہائے رنگارنگ سے فرخ نظر آتی ہے اور بجائے خود ایک فنی، ذہنی لہجہ ہوتی ہے۔ بچہ کسی چیز کو دیکھ کر کیا سمجھتا، کیا محسوس کرتا اور اسے کس طرح ہم تک منتقل کرتے ہیں بچائے خود ایک موضوع مطالعہ ہے۔ بچوں کے نقوش میں اگر آپ گھومیں تو اپنے آپ کو ایک ادھی دنیا میں پائیں گے۔ یہاں بچہ کئے لئے ہر شے حقیقی ہوتی ہے، بڑی ہی محسوس اور محسوس۔ یہ تو ہو گا کہ بچہ کی ڈرائنگ

بچے بچائے خود فطرت کا ایک ایسا عطیہ ہیں جو ہر وقت ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھل کو دلی حالت میں کبھی اپنی صورت بتاتے کہ نہیں، کبھی اپنی ذہنی افتاد کے کسی اور مظاہر سے غور سے دیکھیں تو اس پرانے مفکر کی سچائی محسوس ہوتی ہے کہ بچہ واقعی آدمی کا باپ ہوتا ہے اور وہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں اور کردار ایک جھٹکتے ہوئے درخت کے مانند طرح طرح کے برگ و بار حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ بڑوں کا کام یہ ہے کہ اس ننھے سے پودے کی اچھی طرح آبیاری کریں تاکہ جب وہ بڑا ہو تو جسم، ذہن اور نفسی و روحانی اعتبار سے دیگر انسانوں میں اپنے وجہہ و موقع قدر و قیمت کے باعث الگ پہچانا جاسکتا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ہر فرد شاہ بلوط نہیں بن جاتا اور ہر بچہ لازماً ایک عظیم شخصیت میں مبتدل نہیں ہوتا لیکن ہم کسی بھی شعبہ حیات کا ذکر کریں تو یہی نظر آئے گا کہ ہر بڑا آدمی کبھی بچہ ہی تو تھا۔ صحیح تربیت اچھے ماحول اور مناسب پرداخت نے ہی اس کو کسی ممتاز مقام پر پہنچایا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ عظیم و مثالی ماحول ہی ہر بچہ کو پیش آئے، بلکہ زیادہ یہی دیکھا گیا ہے کہ گذری میں اصل چھپے ہوتے ہیں اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کونسا بچہ ایک عظیم انسان بن جائے گا۔ اس لئے قدرتی بات یہ ہوتی کہ ہم ہر بچہ کو اپنی امید گاہ سمجھیں اور اسے اس توقع کے ساتھ پروردان پڑھائیں کہ اس میں بھی قدرت نے بڑی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ توجہ دانی کہ درس گروں کے ساتھ ساتھ مناسب حالات پیدا کئے جائیں تو اکثر بچوں کی شخصیت و صلاحیت بار آور ہو سکتی ہے۔

بچوں کی صلاحیتیں بڑھانے کی طرح کے روپ اختیار کرتی رہتی ہیں مگر دیکھا گیا ہے کہ بچہ جب اپنے اہل خانہ سے کوئی چیز بنائیں گھر یا اپنے ذہن و تصور کو کسی کاغذ پر منتقل کریں تو اس وقت وہ صحیح معنوں میں اپنے وجود اور اپنی خودی کو ایک نمود بخشنے ہیں۔ ایسی نمود جو

دی جا رہی ہے، اور کئی فنی نمائشیں ملاکاتی، صوریاتی اور ملکی سطح پر منعقد کی جا چکی ہیں۔

اسی طرح کی ایک نمائش فن پچھلے دنوں ڈھاکہ میں منعقد ہوئی تھی جس میں مشرقی و مغربی پاکستان کے بچوں نے حصہ لیا۔ یہ نمائش ڈھاکہ کی مشہور فنی درسگاہ "آرٹ انسٹی ٹیوٹ" کے ایوان میں ترتیب دی گئی تھی اور اکیس سو پچاس فنکار بچوں نے اس کے لئے اپنے نقوش بھیجے تھے۔ ان نقوش کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ رنگ، خط اور سوجھ بوجھ کی نئی نئی راہیں کھلتی چلی جا رہی ہیں۔

کسی پارہٴ فن کی قدر کا فیصلہ کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے اور بچے کے فن پر کوئی فیصلہ کر دینا اور بھی مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔ اب بچوں کے لئے سارے فنی نمونے ہمارے سامنے تھے اور کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کی اپنی انفرادی حیثیت یا قیمت نہ ہو جس تصویر کو بھی دیکھو اک جہان رنگ و خط تھا، اور یوں اک جہان معنی بھی، مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے ہاں بھی فنی تاشی میں فن نمود پانے کے لئے مچل رہا ہے۔ اس نمائش ہی میں جن ننھے فنکاروں کے نام لئے جاسکتے ہیں ان میں علاوہ اوروں کے ان بچوں کا ذکر خصوصاً کیا جاسکتا ہے، آنسین (انصاری ۱۲ سال)، غزالہ شاہین (۶ سال)، عابد حسن (۱۰ سال)، نسیم اختر (۱۰ سال)، میٹھو (۱۲ سال)، گیتی (۵ سال)، ارونا (۱۱ سال)، نورالاسلام (۹ سال)، امینہ خانم (۹ سال)، فوزیہ دانی (۹ سال) اور رضا (۱۰ سال)۔

نمائش کے ان نقوش کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان بچوں کے سامنے دنیا ایک نئے معنی لے کر جلوہ گر ہوئی ہے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے قلم و قریاس کی مدد سے ظاہر کر دیا ہے۔ دیکھئے ان میں رنگ ہے، فاصلہ ہے، پھیلاؤ ہے، تناسب ہے، توازن ہے۔ آنسین، انصاری نے برش سے جو کچھ بنایا ہے خاص طور پر بڑا توانا ہے۔ مشرقی پاکستان کے جانے پہچانے ماحول کی بات۔ کشتیاں اور کشتی جیل گاڑی وغیرہ شاہین کی تصویروں میں حیرت اور تازگی کا عنصر نظر آتا ہے۔ یہ دو باتیں تو اکثر بچوں کے فن میں آپ ضرور پائیں گے۔ اس کی دو پہنیں؟ واقعی قابلِ داد تھی۔ عابد حسن کے کام میں سادگی کی صفت تھی۔ تاحمد نے سنہری سنہری کھیت اور نرند کی گاؤں کا نقشہ کھینچا تھا جہاں کی جزئیات بہت صحیح تھیں۔ پس منظر میں گھلتا ہوا ماحول اس بچے نے خوب دکھا یا تھا۔ رضا اور نسیم، دونوں دس سالہ بچے اچھی تصویریں

میں کبھی صحت و تناسب ہو گا اور کبھی نہیں ہو سکتا ہے کہ اس کا نقش مسخ، بہم یا ممانعہ آمیز ہو گا۔ اس نے جو کچھ بنایا ہے وہ جاذبِ نظر ضرور ہو گا۔ لیکن ایک اور اس کی سطح پر اس کا نقش کو دیکھنا ہو گا اور نہ آپ ایک بڑا تماشہ اور ایک بڑا نیرنگ فکر و نظر ہو دیں گے۔ بعض نقش عجیب ہوں گے، بعض ہل بھی اور بعض اوقات بھدے۔ شاید آپ ایسی ضبط نہ کر سکیں۔ مگر یہ جلنے آتا ہے۔ یہی وہ نفسیاتی لمحہ ہے، جب آپ کی سفیدگی کی آنکھیں ہوتی ہے۔ بچے نے جو بھی نقش کھینچا ہے۔ آپ کے نزدیک ہل ہو سکتا ہے مگر نگاہ آمیزہ ساز، میں شکستہ شیشہ بھی عزیز ہوتا ہے، اس لئے ہونڈ کی نگاہ اور سمجھنے کی سچی روح کے ساتھ اسے دیکھئے۔ یہ صاحبِ ہر فن ساتھ میں ہیں اس کے اور ایک نقش بنا کر لائے ہیں۔ کاغذ پر دو چار خطا ہیں، دو چار فقط انداز بات پر ضرور ہی کہ یہ میدان میں کھیلے ہوئے بچے ہیں۔ اگر آپ نے ان کی بات نہ مانی تو وہ آپ کو یقین دلا کر رہیں گے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں صحیح ہے۔ اگر آپ نے تصویر کی روح کو نہیں پایا تو اس میں بچے کا کیا قصور ہے؟ جیسے جیسے بچے کی عمر بڑھے گی اسے وہی معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت اشیا کیا ہے، تصویریں کیا ہونا چاہئے، خط و خال کسے کہتے ہیں اور تناسب و توازن کس چیز کا نام ہے۔ مگر ابھی اسے اپنی من مانی کرنے دیجئے۔ آج وہ مفکرانہ فکر بنانا ہے توکل وہ ایک عالم حیرت بھی بنا سکے گا۔

نقش نگری بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بڑی تیزی اور پرسش بخشی ہے۔ تعلیم کے اہروں نے اس کی اہمیت کو بہت عرصہ قبل محسوس کر لیا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے اسکول کے بچوں کو تصویر اور گیمیل مٹی کے چرند پرند بنانے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ اس طرح بچوں کو اپنی فنی صلاحیت کے اظہار کا موقع ملتا تھا اور تعلیمی رفتار کی ترقی بھی اس میں مقصود تھی۔

کسی دانا نے کہا ہے: بچہ اپنی جگہ و ایک قانون ہے اور اسے اپنی تکنیک کو مرتب و مہذب بنانے کی پوری آزادی ملنی چاہئے۔ شاید یہی بات ہے کہ اب ہم بچے کی آنا و حضرت کو پھیلنے بھولنے کا موقع دیتے ہیں اور بچوں کی نقاشی میں بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ یوں بچوں کی نقاشی اتنی اہمیت اختیار کر گئی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ان کی نمائشیں بھی ترتیب دی جا رہی ہیں اور ہر طرح کا سیلاب ثابت ہوئی ہیں۔

پاکستان میں بھی اب بچوں کی نقاشی کی طرف پوری طرح توجہ



دنوں ڈھا کہ انسٹی ٹیوٹ میں مغربی و مشرقی پاکستان کے فونہال فنکاروں
، نمائش نقاشی ترتیب دی گئی تھی جس میں ملک کے ہر حصہ سے
نو عمر اور ہونہار نقاشوں نے حصہ لیا ۔

اس نمائش کی چند ممتاز تصاویر یہاں پیش کی جانی ہیں ۔

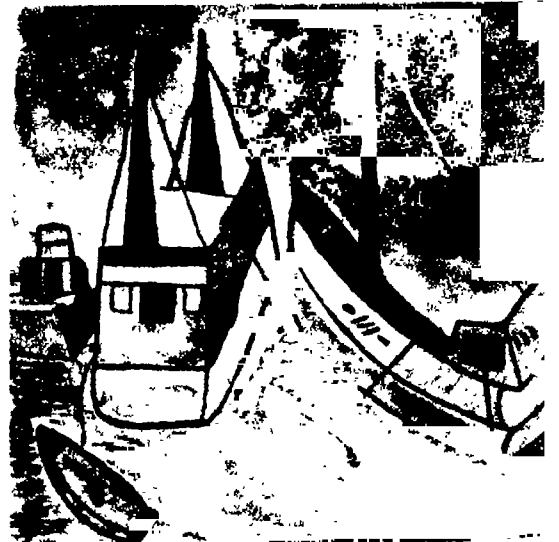
مشو (معین العابدین) : ساڑھے سات سال



نورالاسلام : ۹ سال

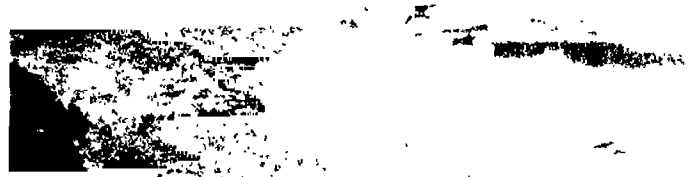


آیم - جمال الدین : ۸ سا



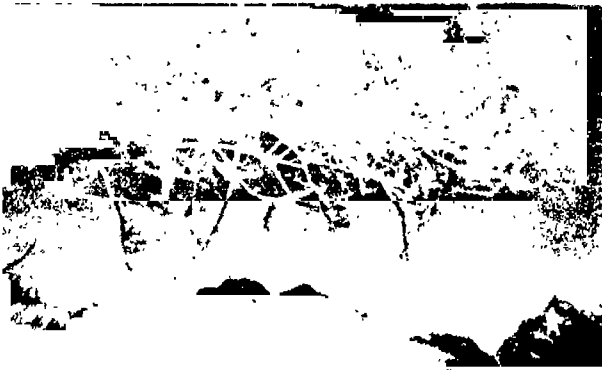
غزالہ شاہین : ساڑھے چھ سال

’یک چمن گل‘



سرغزوار

برفستان



بل کھاتے دریا



لمبوش وادی



اکستان کا شمال نہ صرف اپنی برکش اور بلند وبالا
ہاڑوں، اپنی برف پوش چوٹیوں، لمبوش وادیوں اور
درتی مناظر کی فراوانی کے باعث مشہور ہے، بلکہ وہ
اریخ و تہذیب کے کئی دھاروں کا سنگم بھی رہا ہے
ور عرصہ دراز سے اپنی دفاعی حیثیت کے باعث بھی
یک اہم خطہ سمجھا جاتا ہے۔ اس خطے میں ریاست
مائے چترال، گلگت، ہنزہ، دیر، سوات اور باجوڑ کے
علاقے خصوصی امتیاز کے مالک ہیں۔ یہاں گلگت
ور نواحی علاقوں کے چند رنگین اور خوبصورت قدرتی
مناظر پیش کئے جاتے ہیں۔

جو ہم سب کے لئے موجب مسرت و فخر ہے نئی دہلی میں مشہور فنکار شکر نے حال ہی میں بچوں کی جو بین الاقوامی نمائش فی ترتیب دی تھی وہ مقام آسانی کی بنیاد پر تھی۔ ۷۷ ملکوں سے تقریباً ایک لاکھ نقوش اس مقابلہ میں شریک ہوئے تھے۔ ان نقوش میں ہمارے دو بچوں کو بھی بین الاقوامی انعام ملا۔ ایک صاحب کا نام ہے مبارک حسین (۱۰ سال) اور دوسرے صاحب "ایم" کہلاتے ہیں (۱۵ سال) یہ بچے مرکزی کالج کھارمیلہ (مشرقی پاکستان) کے فنی ادارے کے رکن بھی ہیں۔

مختصر یہ کہ ہم بچوں کی ان تصویروں کو دو وجوہ کی بنا پر پسند کرتے ہیں، ایک تو یہ بات کہ بچے ہم سے اتنے قریب ہیں، عزیز ہیں اور یہ کہ وہ بالغوں کے معیار فن کی طرف بڑی تیزی و دہشتندی سے بڑھ رہے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ بچے اپنی تصویریں بنا کر کس قدر خوش اور مطمئن ہوتے ہیں اور اپنی اس مسرت و احساس کو کیسی کامیابی اور خوبصورتی کے ساتھ ہم تک منتقل کر دیتے ہیں۔ ہم انہوں پر ان کا یہ احسان ناقابل فراموش ہے :

نہلتے ہیں۔ نور اسلام کی گھاٹ پر لگی کشتیاں آپ کی توجہ پہنچنے نہیں دیتی تھیں۔ میٹرو میاں قی بھی صرف سات سال کے ہیں۔ باب رفا کی سرزمین کے نو نوال۔ گرہیں بھی کس باپ کے بیٹے۔ پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ نقاش، زمین العابدین کے فرزند۔ اس بچے کو فن کی بڑی امید مانا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو اونہٹے ہوئے دکھایا تھا۔ جاڑے کا سال ہے، شام ہو چکی ہے اور ماں بیٹھی (شاید بیٹے کے لئے ہی) کوئی اونی چیز من رہی ہے! زمینی اثران کی بڑی، ہمیشہ مثال ہے۔

یسی قاضی، گیتی، ارونا، ششین، معصومہ خانم، فوزیہ دانی، جمال الدین اور پرویز احمد وغیرہ ایسے بچے تھے جو "ممتاز" فہرست میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان سب میں وہ بات ضرور تھی جس سے یہ انداز ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے بچوں میں فنی انہار کی بڑی عمدہ صلاحیت ہے اور فنی نسل سے ہمیں بہت سے اچھے فنکار ملنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ صرف اپنے ہی ملک میں نہیں، ہمارے بعض زمین بچوں نے تو بچوں کے بین الاقوامی مقابلوں میں بھی امتیاز حاصل کر لیا ہے

نیا ادبی انعام

ترقی اردو بورڈ، کراچی، ادارہ مصنفین پاکستان، پاکستان رائٹرز گلڈ کے اشتراک اور مالی تعاون سے بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید کتابوں کا ایک انعامی مقابلہ منعقد کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل موضوعات پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں پر نقد انعامات کا اعلان کیا جاتا ہے :-

انعامات :

عنوانات :

(۱) کہانیوں کا مجموعہ دکل تقریباً ۵ ہزار الفاظ

(۲) ڈرامہ ۵۰۰ منٹ کا مکمل

(۳) طویل کہانی دکل تقریباً ۵ ہزار الفاظ

(۴) سیر پاکستان پاکستان کے دلچسپ تاریخی اور جغرافیائی

مقامات کا بیان، مع تصاویر۔

(۵) مائٹس کے کرشمے یا دلچسپ تجربے

ہر عنوان پر مبلغ ۵۰۰ روپے کا ایک انعام پیش کیا جائے گا۔

کتاب صاحب کتاب کی ملکیت رہے گی۔

شرائط مقابلہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) مسودات خیر مطبوعہ ہوں اور مقابلے میں شریک ہونے والے

مصنف کی تحریر اور ملکیت ہوں۔

(۲) مسودات مکمل اور قابل اشاعت ہوں۔

(۳) زبان سادہ اور پیرایہ بیان دلچسپ ہو۔

(۴) انعام پانے والے کتاب مصنف کی ملکیت رہے گی لیکن اس کی

پہلی اشاعت کا حق ادارے کو حاصل ہوگا۔ اگر والدین نے

اس کی اشاعت منظور کی تو اس کی خاص شراط مصنف کے

ساتھ علیحدہ طے کی جائیں گی۔

(۵) انعامات اور ان سے متعلق جملہ امور کی بابت ترقی اردو

بورڈ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔

(۶) کلاسیکی یا دوسری کتابوں کے خلاصے قبول نہیں کیے جائیں گے۔

(۷) مسودات ۳۰ جون ۱۹۶۳ء تک حسب ذیل تپے پہنچ جائے

چاہئیں۔ اس کے بعد وصول ہونے والے مسودات مقابلے

میں شریک نہ ہوں گے۔

شان الحق حقی۔ سکرٹری ترقی اردو بورڈ

۶۷۲۔ اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی ۷

آئے گی رت ساون کی

زہراء ڈار

بیت بکارت آ۔ یہ ماحمیں نے کہا تھا لیکن کیا وہ رت۔ ہمارے رت۔ جس کا اس شاعر نے اس ذوق و شوق اور حسرت سے ذکر کیا ہے۔ واقعی بیت بکارت ہے؟ یہ نظم اس کا جواب ہے۔ (ادارہ)

نگر نگر میں چسپاں کر دو
سان آئے والا ہے
ڈگر ڈگر پر چلنے والو
بادل چھلنے والا ہے
بجیل اور غمور گھٹ میں
تھوم تھوم کے آئیں گی
ساون کی جیل پر یاں آکر
گھوم گھوم کے نکالیں گی
دم جھم کی آواز رسیلی
کانوں میں رس گھولے گی
برساتوں کی رسیا، کالی
کوئل کو کو بولے گی
جانے کب سے دل توالا
بیتے میں تھمدا یا تھا
"پی پی" کا دل و ذرا نہ
کب سننے میں آیا تھا
جھیل، سمندر، ندی نالے
اب بھرنے ہی والے ہیں
فطرت جن کو رکھنا چاہے
وہ کب مرنے والے ہیں

جگل میں پریت میں، تھل میں
میٹھے نئے نئے گونجیں گے
دادی دادی صحرا صحرا
آج خوشی میں بھومیں گے

نگر نگر میں جا کر کہہ دو
پت جھڑک کی جا بھی چکی
نازک پات جلائے والی
لو آخر شرم یا بھی چکی

اب خوشیاں ہی خوشیاں ہو گئی
غنی نہ پر پھیلانے لگی
گھر گھر میں دیوالی ہو گئی
آشا جوت جگائے گئی

لدی بھندی گہنائی تاریں
گلی گلی میں گھومیں گئی
جل پر یوں کے روپ میں آکر
لاکھوں ہیریں بھومیں گی

اب کوئی نہیں کہہ دو ہوگا
اور نہ کہیں گے آئے گا
را بھیا کوئی نہ جوگی ہوگا
اور نہ کان چھدائے گا

پھر بھی نہ جانے کیوں دل میرا
مر جھایا سا رہتا ہے
سب کچھ ہوتے ساتھ چلا
کلا یا سا رہتا ہے

”ماہ قاشقار“ (چترال)

سید غلام حسن شاہ کاظمی

خود ریاست کے باشندے اس کا تلفظ چترال کرتے ہیں (قلمی تاریخ چترال از مرزا غلام مرتضیٰ خاں)۔ مولانا محمد سپر مرحوم کا شعر ہے:

مسافر گشت دیدم شہر بسیار
ندیدم بھیجے جگہ مثل چترال

اس لفظ کا صحیح مفہوم متعین کرنا مشکل ہے تاہم اس سے مناسبت رکھنے والی بعض ترکیب پر غور کرنے سے اعلازہ ہوتا ہے کہ ان کے اجتماعی مفہوم میں دائرہ، مرکزیت، آفتاب، ماہتاب اور ان کی روشنی شامل ہے۔ اس سے مراد دارالحکومت ہی متصور کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس لفظ کی اصلیت فارسی ہے تو ہو سکتا ہے کہ ابتدائی اصطلاح ”چترآرا“ (سایہ فگن۔ سایہ آراستن) ہو۔ اس سے مراد بھی ”حکمران“ یا ”دارالحکومت“ ہی ہے۔ چترار کے آخری ”ر“ کا ”ل“ سے بدل جانا کوئی خاص بات نہیں کیونکہ فارسی میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ لہذا چترار کا چترال ہو جانا محض تلفظ، لہجہ اور املا کے تصرفات ہیں۔ اصل لفظ چترار ہی ہے جیسا کہ مقامی باشندوں میں اب بھی مروج ہے۔ اس کے معنی ہیں ”چمن زار“۔ سید احمد شہید کے مصنف مولانا غلام بریل ہر رکھتے ہیں، ”چترال کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ اصل لفظ چتر تھا۔ چتر چترالی زبان میں چمن کو کہتے ہیں۔ چترار بمعنی چمن زار“ چونکہ وہ مغلوں، ترکوں، تاتاریوں، چغتائیوں وغیرہ کے اقدار سے دوچار رہا لہذا اس کے تلفظ کے سلسلے میں ان کی زبان کی کمی و زیادتی سے بھی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔

کم و بیش سو برس سے اس کا نام چترال ہی مروج ہے اور اس کا یا آخری نام ہے جو ہمارے ہاں چترال کے تلفظ و املا سے متعارف ہے (مکتوب مرزا غلام مرتضیٰ خاں)۔ تقریباً

وہ سرزمین جس کو آج ہم چترال کہتے ہیں صدیوں کی طویل مدت میں جانے کتنے منازل طے کرتی اور طرح طرح کے روپ بدلتی اس دور میں داخل ہوئی ہے لیکن جگہ نکتہ شناس سے اس کی کوئی ادراپوشیدہ نہیں رہی ہے:

بہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوشش
من انداز قدت را می شناسم

چترال کے صد ہا پہلو ہیں جو دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر ان صد ہا پہلوؤں کو دو چار صفحات میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں۔ بہر کیف ان چند سطروں میں چترال کا تعارف پیش کرتا ہوں اور بہت سی تفصیلی باتوں اور حقیقی حالات کو بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔ سب سے پہلے اس کی جغرافیائی کیفیت کا بیان کرنا ضروری ہے۔ موجودہ ریاست چترال کے شمال میں علاقہ دھان اوڑنگا واقع ہے۔ مغرب میں افغانستان کے علاقہ زیباک، کافرستان اور باشگل ہیں۔ جنوب میں علاقہ گبرونگ، ریاست دیر اور باجوڑ کی آبادیاں ہیں۔ مشرق میں گلگت اور کوہستان سوات کے خطے ہیں۔ چترال کی سب سے اہم وادی ۲۳۵ میل لمبی ہے۔ وہ پانچوں کے درہ برودھیل سے شروع ہو کر جنوب میں ارندونگ افغانستان کی سرحد پہنچتی ہے۔

آج چترال کا لفظ پوری ریاست کے لئے استعمال کیا جاتا ہے مگر پہلے یہ صرف اسی مقام کا نام تھا جسے شاہ کٹوراول (۱۶۶۱ء) نے اپنے دارالحکومت کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پہلے یہ ایک محدود مقام کا نام تھا اور اب اس کا پوری ریاست پر اطلاق ہوتا ہے۔ کتنی آبادیاں اور ویرانے اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ ریاست سے باہر کے لوگ تو اس کو چترال ہی کہتے ہیں مگر

ایک صدی قبل اس کا نام قاشقار تھا۔ یہ منگولی زبان کا لفظ تھا جس کو فارسی میں کاشغر کہتے تھے۔ میرے خیال میں اس کا ماخذ منگولی زبان ہے کیونکہ ابتدائی سے یہ علاقہ منگولین نسل کا مرکز توجہ اور مسکن رہا ہے۔

قاشقار کی لغوی تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم کوہستانی ملک اور برفانی علاقہ ہے۔ محل وقوع کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ واقعیت کی بنا پر بھی اس کا یہ نام مروج ہوا۔ لوگ غلطی سے اس قاشقار کو کاشغر سمجھنے لگے "چونکہ اولیٰ نے اس کا نام (چترال) قاشقار سنا تھا۔ اس لئے بیان کرتے وقت کبھی کبھی کاشغر بھی بولتے رہے۔ عام لوگوں نے اسے معروف کاشغر سمجھ لیا جو پارقند کے پاس ہے" (سید احمد شہید جلد ۱ ص ۱۲۱) اور پھر یہ غلط فہمی اس حد تک پہنچ گئی کہ سید احمد شہیدؒ کی چھوٹی بی بی کے اخلاف بھی اپنے مادری سلسلے کو معروف کاشغر ہی کی طرف منسوب کرتے رہے۔ (مولانا تہر) دراصل قاشقار اور کاشغر میں کوئی معنوی فرق نہیں۔ فرق صرف بعد و مسافت کا ہے اور جیسا کہ جناب مرزا غلام مرتضیٰ خاں نے مجھے ایک مکتوب میں لکھا ہے، ترکستان کے کاشغر اور اس ملک کے قاشقار میں صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر کو کاشغریا قاشقار بزرگ کہتے ہیں اور موخر الذکر کو کاشغریا قاشقار خورد۔ دونوں کا املا اور تلفظ قاشقار بھی ہے اور کاشغر بھی لیکن دونوں کا محل وقوع مختلف ہے۔ باجوڑ، سوات و فیروز خان اب بھی لوگ اسے قاشقار ہی کہتے ہیں۔ بہر حال اس کا اطلاق قاشقار کاشغریا قاشقار یا کاشغر کاشغریا ہو لیکن یہ چترال ہی کا قدیم نام ہے اور اس کا اطلاق کسی ایک قریہ پر نہیں بلکہ پورے ملک پر ہوتا تھا۔ چنانچہ افغانی سرحدات کے مشہور عالم دین، اخوند داویدہ ننگر ہارے (۱۲۸۶ھ) نے اپنی مشہور تصنیف "تذکرۃ الابرار والاشرا" (ص ۱۲۸) میں قاشقار کا لفظ پورے ملک کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے "ملکت قاشقار" لکھتے ہیں۔

مولانا تہر نے کاشقار یا قاشقار نام کی کسی بستی کے

متعلق لکھا ہے کہ اب تک اس کا ذکر نقشوں میں ملتا ہے لیکن مرزا غلام مرتضیٰ صاحب اس نام کی کسی بستی کا وجود تسلیم نہیں کرتے (البتہ وہ اپنے ایک مکتوب میں قاشقار کے حدود میں اوداس کے متصل ایک اور بستی کا نام قاشقار بتاتے ہیں۔ وہ مولانا مہر کی بتائی ہوئی بستی پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خاص چترال سے چند میل کے فاصلہ پر "یک قریہ واقع است کہ نام اس قاشقار ہی باشد" قاشقار، قاشقار اور قاشقار تینوں میں قاشقار اکثر لفظی دلچسپ ہے۔ ان الفاظ کی ساخت اور صورت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وضع قطع میں منگولین ہیں کیونکہ نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔

بہر حال قاشقار میں کوئی بستی فی الواقع اس نام سے نہ پہلے آباد تھی اور نہ آج چترال یا اس کے آس پاس مضافات میں قاشقار نام کی کسی بستی کا سراغ ملتا ہے۔ البتہ قاشقار کے ہمزون اور قریب المخارج دو جگہ ہیں ہیں جن کا ذکر جناب غلام مرتضیٰ خاں نے اپنے مکتوب میں کیا ہے۔

یہاں کاشغریا قاشقار کے ایک خاص مفہوم کا ذکر غالباً خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ علامہ محسن فانی کشمیری (۱۸۸۶ء) نے اپنی کتاب "دبستان مذاہب" میں صفحہ "ماہ کاشغر" ایک جگہ استعمال کیا ہے۔ اس کی تشریح کے سلسلہ میں یہ حاشیہ (ص ۳۱۳) ایذا ہوا ہے: "ماہ کاشغر ماہ صیام است کہ کنایہ از خوابان و ماہ و شان ترک ہم است۔ اس سے دو امکانات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ مخصوص جمالیاتی لفظ گوناگوں کی وجہ سے کاشغریا قاشقار نام پڑ گیا ہو۔ دوسرے اپنے مخصوص اوصاف ہی کی وجہ سے لوگوں کے ذہن پر یہ نام چھا گیا ہو۔ یہ ویسا ہی کنایہ ہے جیسا کہ ہلال عید کا کنایہ کلید میکہہ شہر تھا:

ہلال عید براوج افق ہو یداشد

کلید میکہہ گم گشتہ بود پیداشد

"ماہ کاشغر" کی تعبیر ایسی ہی ہے جیسے ماہ کنعان

ماہ مصر، مہینے، ماہ پارہ وغیرہ۔ شاید اسی مناسبت ہی سے ماہ سے "مہتر" کا لفظ حکمرانان قاشقار کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ آج بھی وائی چترال کو مہتر چترال کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ قاشقار موجودہ ریاست چترال ہی کا قدیم نام ہے۔ یہ کسی ایک قریہ یا موضع کا نہیں بلکہ اس کا اطلاق پورے ملک پر ہوتا تھا جس کے حدود وہی تھے جو آج ریاست چترال کے ہیں۔ یاسین، مستونج، یونیال اور گلگت کی جانب رخ کریں تو قاشقار کے حدود کہاں پر ختم ہوتے ہیں اس کے جواب میں جناب مرزا غلام مرتضیٰ خاں لکھتے ہیں کہ عہد سابق میں ارندو سے لے کر مستونج اور تورچہ تک قاشقار کہا جاتا تھا۔ وائی یاسین سلیمان شاہ (۱۸۴۴ء) کی حکومت مستونج سے گلگت تک تھی مگر گلگت کے علاقے قاشقار میں شمار نہیں کئے جاتے تھے۔ قاشقار صرف مستونج سے لے کر ارندو تک محدود تھا اور یہ آج بھی ریاست چترال میں شامل ہیں۔ بہر حال لادری سے مستونج تک کے علاقہ کو پہلے بھی قاشقار کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں۔ قاشقار کا لفظ موجودہ چترال کے حدود پر پورا چلائی جاوی ہے چترال سے پہلے پوری ریاست کا نام قاشقار تھا۔ یہ ایک ہی ریاست کے دو نام ہیں، ایک مقدم دوسرا مؤخر۔

قاشقار سے پہلے اس خطہ زمین کا نام بلوڑ تھا۔ زبانی قدیم کے بعض مورخین اس کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ کرغز وغیرہ کے لوگ اب بھی اسے بلوڑ ہی کہتے ہیں۔ مصنف تاریخ رشیدی (سال تصنیف ۱۹۵۱ء) مرزا حیدر دو غلات کا شغری گورگانی (سال وفات ۱۹۵۸ء) نے بلوڑ کے حدود اربعہ، اس کے باشندوں کے مذہبی عقائد، طرز جنگ اور بعض دوسرے حالات لکھے ہیں اور ان پر سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا ہے۔ اس قلمی کتاب سے بعض ضروری باتوں کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ بلوڑستان کی حد شرقی ولایت کاشغر و یار قند ہے۔ حد شمالی میں بدخشاں اور حد مغربی میں کابل، لغمان اور لغمان ہیں۔ حد جنوبی میں سواد کشمیر ہے۔ مابین اور اس کے گرد اگر چار ماہ کا راستہ ہے۔ تمام ملک میں پہاڑ اور درے ہیں۔ تنگی کی یہ کیفیت ہے کہ تمام ملک میں ایک

فرخ بھی زمین ہموار نہیں۔ آبادی بہت ہے۔

۲۔ بلوڑ ایک کافرستان ہے۔ باشندوں کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ وہ کسی چیز سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو بھی چاہے کر گزرتے ہیں۔

۳۔ ہر گاؤں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتا ہے عورتیں گھر کے کاموں اور زراعت میں مصروف رہتی ہیں اور مرد جنگ میں۔ کھانے کے وقت عارضی طور پر صلہ ہوجاتی ہے اور کھانا ختم کرنے کے بعد پھر جنگ چھڑ جاتی ہے۔

۴۔ جس کا سلسلہ غروب آفتاب تک جاری رہتا ہے پھر عورتیں درمیان میں پڑ کر دوسرے دن صبح تک کیلئے صلہ کر دیتی ہیں کبھی کبھی تو رات بھر جنگ ہوتی رہتی ہے۔ چرواہا ہیں کم ہیں۔ اونٹ اور بھیڑ بکریاں بھی قلیل البتہ۔

۵۔ گائیں بکثرت ہیں جن سے دودھ ممکن بجفایت حاصل ہوتا ہے۔ ہر درہ کے لوگوں کی زبان جدا ہے جنگ و جدل کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی زبان سے واقف نہیں رہاں باغات اچھے ہیں جن میں ہر قسم کے میوے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر انار کی ایک عمدہ قسم ایسی ہے جو بلوڑ کے علاوہ کہیں نہیں دیکھی گئی ہے۔ اس کے دانے سفید و شفاف اور شیریں ہوتے ہیں۔

بلوڑستان کی اصطلاح سے بھی پہلے ریاست چترال کا قدیم تاریخی نام کہوڑستان تھا یعنی کہوڑ قوم کی سرزمین۔ ابوریحان البیرونی نے محمود غزنوی (۱۰۲۱ء) کے حملوں کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ جلال آباد سے گلگت تک پہاڑوں میں ترکمان آباد ہیں (قلمی تاریخ چترال)۔ البیرونی نے کہوڑ اقوام کو ترکمان لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہوڑ قبائل جلال آباد سے گلگت تک پھیلے ہوئے تھے اور سارے علاقہ کو کہوڑستان کہا جاتا تھا۔ ۲۲۶ قبل مسیح میں اس ملک کا مروج نام کہوڑستان تھا۔ چنانچہ مصنف تاریخ چترال (قلمی) نے لکھا ہے کہ جب سکندر یونانی کی افواج نے آساک کے مقام پر دریا عبور کیا تو اس عہد کے مورخین نے اسے کہوڑ آپس۔

(KAHADAPSUS) لکھا ہے۔ یعنی دریائے کہو۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہو قوم اس وقت آسمان کے علاقوں پہلے
سے موجود تھی۔

چترال کی پرانی ملکی تقسیم میں اس کے دو شمالی اضلاع۔
مولیکہو (زیریں کہو) اور توریکہو (بالائی کہو) ہیں اس
سے قبائل کہو کے لغزات و مقبوضات پر ہلکی سی روشنی
پڑتی ہے۔

کوہ اور کہو قریب المخارج الفاظ ہیں جن کے اطلاق
میں بھی معمولی فرق ہے۔ اس لئے ان کے مراتب کو ملحوظ
نہ رکھا جاسکا۔ انگریزی (KAHOSTAN) جب اردو میں
لکھا گیا تو کہوستان کو بھی کوہستان یا کہستان لکھا۔ اور
بول چھانے لگا۔ اس التباس و ادغام نے اصل صورت ہی منہ
کر دی۔ اگر چترال کو کوہستان کہا جائے تو اس لئے غلط نہیں
سمجھا جائے گا کہ وہاں واقعی پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ غیر چترالی
مشکل سے سمجھ سکتے ہیں کہ چترال کا قدیم تر نام کہوستان اور
اس کے معنی قبائل کہو کا مکن ہے۔ جہاں دونوں کے تلفظ
میں فرق ہے وہاں ان کے معنوں میں بھی فرق ہے۔ قبائل کہو
کی زبان کو آج بھی کہووار کہا جاتا ہے۔ یہی زبان ہے جسے
ہم لوگ چترالسی کہتے ہیں۔ اہل ملک کے افہام و تفہیم کا
بڑا ذریعہ یہی زبان ہے جو اہل ملک کے لئے مادری زبان
کا درجہ رکھتی ہے؟

*

اے کرمی خواہی نظام عالمے
جستہ اور اساس نمکے
داستان کہنہ شمشہ باب باب
نکر را نشان کن از اتم الکتاب
(اقبال)

رقص شر و برق

صادق مصطور

یہ خطہ گل رنگ و ضیا بار و طرب ریز
یہ مرکز انوار حسین، ملک بہاراں
یہ نہرہ جبینوں کی، یہ نہراؤں کی بستی
یہ چاند تاروں کی زین، شہر نگاراں

ہے پیش نظر خواب زینجا کا نظارہ
سنتا ہوں کسی چاہ سے یوسف کی صلاؤں
کھلتے ہیں یہاں پھول گلستانِ ازل کے
اک جنتِ تم گشتہ کی آئی ہیں ہوائیں

کھلتے ہوئے ہر سمت شعاعوں کے درپچہ
ڈھلکا ہوا انوار میں ناہید کا ڈیرا
پائل سی چھنکتی ہوئی پھر رقص صبا میں
پھر جاگ اٹھا شہر نگاراں میں سویرا

یہ شونخ ہواؤں سے الجھتی ہوئی زلفیں
یہ اودی گھٹاؤں میں ریخ ماہ مثالاں
رقص شر و برق کا عالم سرستی
گلکار ہوئے عارض خورشید جلالاں

سبزے پہ چھلٹا ہوا سوسن کا سراپا
پھولوں میں نکھرتی ہوئی نرگس کی جوانی
یاد آیا محبت کو فسون حسین جوان کا
دہرانے لگا ذہن کوئی بھولی کسانیاں

رومان و جنوں کا وہ بلاخیز زمانہ
شہزادگی مملکتِ خواب کا عالم
وہ چاندنی راتیں، وہ سمندر کا کنارہ
وہ چھاؤں میں نادوں کی ہے تہاب کا عالم

اُس مرکز انوار سے پھر لوٹ رہا ہوں
منزل مری ہستی کی خدا جانے کہاں ہے
لیکن مے ٹوٹے ہوئے خوابوں کا سفینہ
اس سیلِ تجلی کے تلاطم میں دواں ہے

غزل

بشیر فاروق

محمد صدیقی

یاد ہیں ہم کو ابھی تک وہ زمانے اپنے
جب تری زلف کے سائے تھے ٹھکانے اپنے
ہم وہی ہیں کہ جنہیں پیار کیا تھا تو نے
تجھ کو بھی یاد ہیں کچھ اگلے زمانے اپنے
جانتے ہیں کہ تغافل ہے ترا شیوہ، مگر
پھر بھی آجاتے ہیں ہم جی کو جلانے اپنے
فکرِ تعبیر کی زحمت ہو گوارا کیونکر
خواب جب ہوتے ہیں اس درجہ بہانے اپنے
نگہِ شوق نے دم توڑ دیا گیسر اگر
کام آتے بھی کہاں تک یہ بہانے اپنے

جب بھی پیغام بہاروں کا صبا لائی ہے
بے حجابانہ مجھے آپ کی یاد آئی ہے
اب تو آگیا غورِ رشید صبحی لے کر
رات پہمانہ مہتاب چسلا لائی ہے
لالہ و گل کی جبینوں پر شکن آئے ہیں
جب بھی تیرے لب و رخسار کی بات آئی ہے
گلشنِ درد میں زخموں کے سوا کچھ نہ ملا
عشق کے شہر میں رسوائی ہی رسوائی ہے
مند خنجر و گھل پر نہ ملا حسن کو چین
عشق کو بتر پر خار پر نیند آئی ہے
کل بھی تھی مولس و غمخوار تری یاد وفا
آج بھی یاد تری ہم دم تنہائی ہے
صبح غم، نالہ شب، سوز و گدازِ محفل
لے کے سوغات یہ سلوائے جیات آئی ہے
آہ کرتا ہوں تو آتا ہے جنوں پر الزام
بات کرتا ہوں تو اندیشہ رسوائی ہے
زندگی نغمہ پر شوق و طرب ریز نہیں
زندگی درد سدا ہے شکبائی ہے
پھپھ گیا، مہر جہاں تاب، قمرِ دوب گیا
سمیع جاں سوز ہی اک محرم تنہائی ہے
پیکرِ گل میں کہیں جانِ منشا ہی نہ ہو
وہی شوخی، وہی مستی، وہی رعنائی ہے
کل بھی ہر داغ تھا ہر مچول کا سینہ فاروق
آج بھی زخمِ فشاں لالہ صحرائی ہے

مجلد مشرق : بقیہ ۳۸

قریب وہی لباس و وضع جو دودھ بھکشوں یعنی فقرا کا ہوتا ہے۔ رنگامتی میں چمکے قبیلہ کے لوگ بانس کی دو منسلزلہ "باشائیں" بناتے ہیں۔ یہی ان کا مکان ہے اور یہی ان کا دلشیزی گھر۔ مکان کی پچلی منزل میں دلشیزی باندھ دیئے جاتے ہیں اور اوپر کی منزل میں خود رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح رہنے سے وہ سانپ اور دیگر موزی جانوروں سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر مچھلی، سبزی اور چاول پر گزارہ کرتے ہیں۔ یہاں ایک خاص قسم کی کھجور اور طرح طرح کے کیلے بڑی کثرت سے ہوتے ہیں۔ گراما میں کنٹھال نامی ایک سبزی بھی ادھر پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ دودھ پینے کے عادی نہیں اور دودھ سے طرح طرح کی مٹھائیاں بناتے ہیں خاص کر دس گلہ۔ ربربری کے بھی بڑے شوقین ہیں اور یہاں لوازی بھی خوب کرتے ہیں شتعل مزاج بھی ہوتے ہیں مگر زیادہ تر پرامن رہتے ہیں۔ اور اب پاکستان کا باشندہ ہونے کے بعد تو متمدن زندگی کی طرف براہ قدم بڑھنا۔ ہے ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو رہا ہے۔

اور عمارتی نگرشی کے جنگل میں یا تالاب ہی تالاب جہاں دیکھوڑ عورتیں اور بچے نہادھورسے ہیں یا مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ یہاں حکومت کی طرف سے مچھلی پالنے کے مثالی فارم بھی بنے ہوئے ہیں جہاں اعلیٰ قسم کی مچھلی کا شکاروں اور ابھی پروردوں کو مہیا کی جاتی ہے۔ چانگام کے جنگلوں میں بعض بعض درخت تو بڑے ہی پرانے ہیں۔ تین تین سو سال پرانے درخت یہاں عام ہیں۔ چانگام کی ایک نمائش میں مجھے ایک درخت کے کچھ حصے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا گھیرا ہوا فٹ تھا اور یہ سولہویں صدی کے اوخر میں بویا گیا تھا۔ اس درخت کا نام چپا فلی بتایا گیا یعنی چپا مچھول کا درخت۔ اس کی نگرشی بڑی مضبوط ہوتی ہے اور گھر کا درجن بہت عمدہ بنتا ہے۔

چانگام کے پہاڑی علاقوں میں کئی قبائل آباد ہیں۔ جیسے چمک، مونگ، مورونگ وغیرہ۔ یہ لاندہب ہیں۔ چمک اور مونگ قبیلہ کے کچھ لوگ دودھ مذہب کے ماننے والے بھی ہیں عورتیں ایک چھوٹا سا لہنگا پہنتی ہیں۔ مرد گروسے رنگ کا کفن یا لباس استعمال کرتے ہیں۔ سرمندانے اور کھراویں پہنتے ہیں۔ قریب

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کر سکے اور ہمیں اپنے وطن کی، پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس کر سکے۔

"نوائے پاک" میں ملک کے نامور شعراء کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں، گیت

اور ترانے درج ہیں۔ کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گر دلو ش سے آراستہ گلیٹ آپ

بہت نفیس اور دیدہ زیب — قیمت صرف ایک روپیہ

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ نمبر ۸۳ کراچی

حق بہ حق دار... بقیہ ص ۷۷

اب تو یقین آگیا نا؟ نور الدین نے کہا: "دعوت ہوگئی جناب دعوت!" استاد فضل دین نے بھی ہنستے ہوئے کہا: "جی ہوگئی! گوہر علی نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا، اور خیر کنوئیں میں پھینکنے کے لئے گلی میں مڑ گیا۔"

گھر گیا تھا تمہاری گھر والی نے مجھے دودھ پلایا اور مالکانہ حقوق ملنے کی خوشی میں اڑوس پڑوس میں گڑا بھی بانٹا ہے۔ گوہر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ "تم مجھے گالیاں دیا کرتے تھے۔ اور میری عرضی پر غور نہ کرتے تھے۔"

قرآن السعدین : بقیہ ص ۷۸

شہروں میں موجود ہے :

دگرگرم روی سایہ و درخشہ نہ جو نیم
بلا سخن از طوبی و کوثر تنواں گفت

آں راز کہ در سینہ نہانت نہ خط است
بمدار آواں گفت بہ مہر تنواں گفت

اور یہ "کافری اور لے شاعری" ہر دو بار بیان کی جاسکتی ہے جو مرتبہ حلاج ہے۔ چنانچہ حلاج اگر کہتا ہے کہ جہاں کہیں بھی جہاں رنگ بو ہے وہ یا تو در مصطفیٰ سے ہے یا تلاش مصطفیٰ میں ہے۔ اقبال کے نزدیک اس مسئلہ کا یہی حل تھا جو انہوں نے پیش کیا۔ غالب اور حلاج کی شخصیتوں کا فرق بھی واضح کر دیا "جاوید نامہ" میں غالب کی شرکت جو خیالات کے تحت علامہ اقبال نے ضروری سمجھی، ان کا انہماک غالب کے ان

ماہ نو

میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

- ۱۔ "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معقول معاوضہ دیا جائے گا جس کے بعد وہ ادارہ کی ملکیت ہوں گے اور وہ انہیں حسب منشا ہر طور سے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔
- ۲۔ مضامین بھیجے وقت مضمون نگار حضرات "ماہ نو" کے میعار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
- ۳۔ ترجمہ یا تھفیں کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
- ۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
- ۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
- ۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
- ۷۔ مضامین صاف اور خوش خط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔
- ۸۔ بہتر بہت صاف اور مکمل درج کیجئے۔
- ۹۔ انے مضامین نظر و شر کی نقول اپنے پاس بھی رکھئے۔ غیر طلبیدہ اور ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کیلئے ڈاک کے مناسب پیکٹ روانہ کیجئے۔

(ادارہ)

اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ: بقیہ منہ

PURE AS THE NAKED HEAVENS,
MAJESTIC, FREE.

یہی بات اقبال پر صادق آتی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ
ملن کا کلام باوجود ترغیبت ہونے کے عام طور پر نہیں پڑھا جاتا۔
انگریزی ادب کے چند عالموں کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ اسی طرح اقبال
کے کلام کا بیشتر حصہ صرف چند عالم فاضل حضرت کے لئے ہے، سب
کے لئے نہیں۔ کیونکہ متذکرہ وجوہ کی بنا پر اس کی اپنی محدود ہو گئی ہے،
عام نہیں رہی۔ کونسا حصہ آفاقی نوعیت رکھتا ہے، اس طرف میں پہلے
اشارہ کر چکا ہوں:

(برشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

انسان کم ہیں۔ وہاں چرند، پرند، پھول، پتے، چاند، تارے، سورج،
دنیا، سمندر، ہوا، وقت، غرض مجرور و غیر مجرور، ذی روح و غیر ذی روح
سب انسان سے باتیں کرتے ہیں لیکن انسان آپس میں بات بہت کم کرتے
ہیں۔ روزمرہ زندگی سے، میرے نزدیک اقبال کی یہ بے نیازی بھی
ان کی آفاقیت میں ایک حد تک مانع ہے۔ آخر ہم ہر وقت فکر و تخیل کی
دنیا میں ہیں پر وہاں کرتے نہیں رہ سکتے۔ ہاں کبھی کبھی اڑان لگا لینے میں
کوئی ہرج نہیں۔

ملن کو خطاب کر کے درود سوتا تھا کہ:

THY SOUL WAS LIKE A
STAR, AND DWELT APART
THOU HADST A VOICE WHOSE
SOUND WAS LIKE THE SEA

مسلم بنگالی ادب

بنگلہ سے ترجمہ

ڈاکٹر انعام الحق، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ
لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء،
اہل قلم، شعراء اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں

چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے، سرورق

دیدہ زیب اور رنگین ضخامت ۲۰۰ صفحہ

قیمت صرف چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۳۸ کراچی

اک بار پھر

رفعت جاوید

تو لوگ خود ہی راستہ دیئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی چھوٹوں کو بھی خود بخود راستہ دے دیا جاتا ہے۔ یا وہ خود راستہ بنا لیتے ہیں۔

چنانچہ جب ابا جان حسب معمول اپنے ساتھ بہت سے دھوئی کارڈ لفافوں میں بند لائے تو ہم نے ان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ان میں سے ایک میرے من بجاتے قوی مرکز کتب کا دھوئی رقعہ بھی تھا۔ جس کی ایک نمائش کا آنکھوں دیکھا حال پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ اور ایسے کہ نہ تائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ دل سینے میں اچھل پڑا کہ اب پھر کوئی مفت کا تماشا ہے۔ کلفٹن پر عید کا میلہ نہ دیکھا گیا، یہی ہے۔ چنانچہ ہم نے اس کا رڈ کو مل خفیت شمار کرتے ہوئے ہتھیلیا جیسے بعض ناشر دوسرے ناشروں کی کتابوں پر اپنا لیبل لگا کر اپنی بنا لیتے ہیں۔ یہ سب ہنرمندی کے نشانی ہیں اس لئے ہم کسی سے کیوں پیچھے رہیں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اسی کارڈ کو لے کر اس نئی تقریب میں جا دھکیں مگر ابا جان نے نوبت یہاں تک پہنچنے سے بچالیا۔ خود ہی کہنے لگے وہ تم لے کتابوں کی نمائش دیکھی تھی نا۔ اب ایک ایسی ہی چیز ہونے والی ہے۔ انعام دیئے جائیں گے۔ ہم نے مکر کر تے ہوئے جیسے ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ کہا واقعی پھر تو ہمیں بھی ساتھ لے چلیے۔ سچ کا ثواب نذر کر دیں گا حضور کی ابا جان کسی کے مصرعے کے اس برجستہ استعمال پر پھر کھ گئے۔ اور حامی بھری۔ ہم نے بھی دل میں سوچا کیا خبر ہمارا نام بھی بھول چکے سے انعام یافتہوں میں شامل ہو جائے۔ اور کوئی نہیں تو ہمارے ابن الشاہ صاحب وہ آشک شوقی والا انعام ہی دے ڈالیں۔ گھر سے جھوٹ موٹ ایک کتابچہ مرتب کر کے لئے چلتے ہیں۔ گو ہمارے لئے اس تل میں شاید ہی تیل ہو۔ اب بھی وقت ہے۔۔۔

ترا لطف ہوتے نہیں لگتی دیر!

اب میں یہ گڑ خوب کچھ گیا ہوں۔ یہ کہ اگر کوئی تقریب ہمد ہی ہو تو اس میں کیسے جایا جائے۔ بس انسان کو مکتور اساجے جھمک اور بے دھڑک ہونا چاہئے۔ پھر سارے کام خود ہی ہو جاتے ہیں۔ جب کسی شادی میاہ میں گہما گہمی ہو تو کون کون پوچھتا ہے کہ بھتی کون ہو۔ اور پھر میرے جیسے بر خور داروں کو وہ تو ایسے موقعوں ہی کے لئے ہوتے ہیں اور ہر کوئی ان کی آؤ بھگت کرتا ہے۔ شادی میاہ نہ ہی کوئی اور ہی علمی ادبی فنی ثقافتی قسم کی تقریب ہے۔ وہاں تو لوگوں بالوں کے لئے اور بھی آسانی ہے۔ یعنی کھلے عام داخلہ۔ بڑے بڑے لوگ نکٹ یا کارڈ دکھاؤ ہوں اور یا لوگ گیٹ کیپر کی آنکھ بچا کر بڑوں کی ٹانگوں میں سے ہوتے ہوئے کوھر کے کہ صر نکل جاتے ہیں۔ سچ پوچھتے تو یہ کہ تب ہم نوہنوں نے بار کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ہمارا یہ بھی خطا نہیں گیا۔ سب کہتے ہیں بڑے ہونہار ہیں اور ان کے ابھی سے چکنے چکنے پات ہیں۔ خیر یہ تو یونہی بات بنانے کی خاطر بات ہوئی۔ ایک سیوا سادہ عملی گریہ ہے کہ ابا جان کو دھوئی رقعے اور کارڈ وغیرہ وغیرہ تو آتے ہی رہتے ہیں۔ اور بقول شخصے کبھی سو کو یعنی اکیلے، کبھی دو عورت یعنی مشر اور مشر اور کبھی سمفونی یعنی مع اہل و عیال، سنگت کی سنگت۔ اب ہم اس وغیرہ وغیرہ کا فائدہ نہ اٹھائیں تو ہمیں ہونہار کون لگے۔ اور وہ ہونہار جو مستقبل کی امید ہوں! اچھا رقعہ یا کارڈ ابا جان ہی کے نام ہی۔ پھر بھی کیا ہے۔ آج کے بچے کل کے باوا جان ہی تو ہوتے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ یہ سوانگ آج ہی بھرا جائے۔ چنانچہ ہم بڑی بے تکلفی سے ان ہی کا رقعہ یا کارڈ مع لفافہ جیب میں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور جس شان سے مرزا غالب کان پر رکھ کر قلم مکتے تھے۔ اسی طرح ہم بڑی آن بان سے کارڈ کو نذر جیب کر لیتے ہیں یا ہنل میں دبا کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ بڑوں یا انصاف بڑے بڑوں کو

غرض ہوتے ہوئے وہ دن آہی گیا۔ ہم پہلے ہی سے جاق چوبند ہو کر بیٹھے تھے۔ آجانی آتے ہی لوگ کیوں میاں تیار ہو ہم پہلے ہی کے بیٹھے تھے۔ دیکھ کر بوٹے شاہش! سوہم نے بازار میں پہنچ کر ایک ٹیکسی لی۔ یہ تو میں نے محض رعب ڈالنے کے لئے کہا ہے کہ کسر شان نہ ہو ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں موٹر کشا ہی میں بیٹھے تھے اور وہ بھی ویسا ہی جیسا کہ وہ گھوڑا جس کی تعریف میں ہمارے نامی گرامی شاعر سودا لے ورق پر ورق سیاہ کر دیئے ہیں۔ یہ اباجان سے چھپا کر نکھ رہا ہوں۔ ورنہ ڈر ہے کہ کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں۔ لیجئے اب تو بقول شخصے صاحبے کا بھانڈا چورا ہے میں پھوٹ ہی گیا اور بی مانو جھل کر کھیلے سے باہر آ ہی گئی ہیں خدا ہی خیر کرے! — ٹیکسی یعنی موٹر کشا پہنچ دریچہ سڑکوں سے ہوتا ہوا جن کی نہ جگہ ہے نہ شمار۔ ایک راؤنڈ ایبوٹ کا چکر کاٹ کر پلو گراؤنڈ اور ایک تھیلے سے ادھر رک گیا جہاں کھجور کے بہت سے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں چھوٹی سی چار دیواری میں داخل ہوئے۔ ایک ہوٹل کی دھرت آفریں خوشبوؤں نے خیر مقدم کیا آپ انہیں ہوشربا یا مہر آزما جو بھی چاہے کہہ لیجئے۔ اس لئے کہ اس کا نام بھی صابرینہ ہی ہے۔ واہ! کیا شاندار عمارت بنائی ہے۔ سراپا آرٹ یہ پاکستان آرٹ کونسل کی عمارت بالکل ویسی ہی — آرٹ کی کوئی چیز ہوئی چاہئے۔ نیچے ہی کشتی یا جہاز نما فرش پر کتا بوں کی جگہ کا اہتمام تھا۔ رنگ برنگی کرسیاں لگی تھیں۔ اور ان پر گتے کی تختیاں چسپاں۔ کسی پر بہان کی کسی پر بریس اور کسی پر کچھ لکھا ہوا۔ ہم نے بہتر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ کسی پر بر خوردار کی تختی بھی ہو۔ لیکن بندوبست کرنے والے شاید یہ بھول گئے تھے۔ اس لئے ہم بھی بڑوں کی صف میں جا بیٹھے۔ اور سب بڑوں سے ہاتھ ملاتے رہے۔ جیسے میزبان ہمیں ہیں دیکھا تو تماشا یوں میں ”صاحب لوگ“ بھی تھے یعنی یورپین۔ سامنے دو لوگ تھے۔ نظراہنی پر جم کر رہ گئی۔ بھیلی نمائش کا نقشہ نکٹا ہوں میں پھر گیا۔ کتنے سلیقے سے اچھی اچھی کتابوں کے گرد پیش دونوں بے رڈوں پر چسپاں کر دیئے گئے تھے۔ یہ رنگا رنگی دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ ہمارے یہاں کتابوں کی روز بروز خوب تر ہوتی ہوئی پیشکش کے یہ کتنے عمدہ اور کتنے فرواں نمونے تھے۔ جی چاہا یہ دونوں بڑوں

ہی اٹھا کر چلتا بنی۔ لیکن ان موجودوں کا بھلا ہر جنہوں نے اتنی بھاری مہر کم چیز اٹھالے جانے کی ایسی آسان تدبیر کر دی ہے۔ ایک باکس کیمرا میرے پاس ہی تھا۔ جھٹ فوکس کیا۔ اور فوٹو لے ڈالے۔ ایسے کہ ایک اچھا خاصا البم تیار ہو گیا۔ اور تب سے میں ان کے پرنٹ نکلا کر اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں۔ اپنے بچوں اور دوستوں کو دکھا کر خوب وار چال کی ہے۔ بلکہ کچھ تجارت میں بھی تھ رنگے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے صدر ہمیشہ سائنس پڑھنے اور ٹیکنالوجی پر زور دیتے رہتے ہیں۔

جب سارے لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر جم گئے تو انعامی کارڈ کی تہید اٹھائی گئی میرا شعر جناب انشائے۔ شاید ایسے لوگوں کو برکت کا دوہا کہتے ہیں۔ انہوں نے اس پر لطف صحبت کی غرض عافیت پر روشنی ڈالی۔ اور سستی کتا ہیں۔ اچھی کتابیں۔ پیاری کتابیں۔ ”کا اچھا اور پالا فقرہ دہرایا۔ اور کہا یونیسیکو کے ساتھ مل کر تو ہی مرکز کتب کس طرح کتابوں کو اچھا اور اچھا بنانے کے درپے ہے۔ اور جو لوگ اس کام میں اس کا ساتھ دینا ان کو اچھے نیچے انعام بھی دیتا ہے تاکہ وہ اور بھی اچھی کتابیں نکالیں۔ اچھی مطلب دیکھنے میں پیش کر رہے ہیں۔ یعنی نیک سے مکمل درست ہوں۔ ان کی ٹیپ ٹاپ خوب ہو۔ تاکہ ان کو دیکھنے، لینے اور پڑھنے کو جی چاہے۔ کتابوں کی اشاعت کی الف ب ج تو صحیح ہے۔ ان کی بات چیت کرتے کرتے کچھ بھی ہوئی چیز بننے لگی میں ڈرا کر کہیں یہ بھی امتحانی پرچہ نہ ہو۔ مگر پھر دل کو تسلی دی کہ یہ پرچے کیسے ہو سکتے ہیں اور یہ جانتے بڑے بڑے بزرگ بیٹھے ہیں وہ طالب علم کیسے ہو سکتے ہیں۔ اگر ہوتے تو کتنے ہی سر (SIR) ہمارے اور گرومنڈ لائے دکھائی دیتے کہ کوئی نقل نہ کرے۔ مگر یہاں تو ہر طرف نقل ہی نقل ہو رہی تھی کیونکہ کچھ پاس ایک ہی مضمون کا پرچہ تھا۔

جناب ابن انشاء نے اپنی تقریر دہلیز سے منٹے کے بعد پردہ کا اعلان کیا۔ میں بڑھ بڑھو کہ ابن انشاء اور انگریزی میں بات چیت۔ خیر جو تھوڑی سی ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتا تھا اس سے بولنے والوں کی بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پتہ تو کیا پڑنا — مگر چپ چاپ سنا رہا۔ اور ایک مرد خدا سے تو رہا بھی نہ گیا۔ میری طرح ابھی اسکول میں پڑھ ہی رہا تھا کہ یہ منچا فریوان بلحاظ صاحب ہمارا ایک قومی زبان اردو میں

شاندار تقریب ہوئی۔ سنا ہے پشاور اور دھاکہ میں بھی کچھ ایسی ہی کارروائیاں ہوئی ہیں جو کتابوں کی اچھائی کے حق میں بڑی ہی نیک فال ہے۔

میں اور غالباً دوسرے لوگ بھی یہ جاننے کے مشتاق تھے کہ جب یہ اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ بھی مجھے اپنے ترجمان ہی کے ذریعے سے

معلوم ہوا۔ انہوں نے پہلے ہی کیا مرے کی بات کہی۔ یہ کہ وہ نہ تینوں میں ہیں نہ تیرہوں میں۔ یعنی وہ نہ ناشر ہیں نہ کتب فروش نہ لائبریرین یعنی حفاظ۔ جو بھانت بھانت کے لوگ یعنی گروہ یہاں موجود ہیں ان میں وہ صرف پڑھنے والوں ہی کے زمرے میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اور جو کہ ان کا کام تعلیم سے ہے اس لئے وہ اس ہی کہیں گے جس کا دھن کھاتے ہیں۔ ہمارے ملک کا ایک بہت بڑا مسئلہ کیا ہے؟ — خواندگی — سچ ہے ہمیں پہلے آقاؤں کو پڑھا لکھا کرنا چاہئے تب کہیں جا کر ملک ترقی کر سکتا ہے۔

اور جب پڑھنے کو سامان ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ اس کے بغیر تو پڑھنا لکھنا وہی تالاسیہ بغیر چانی کے۔ اور چانی ہے بغیر تالے کے۔ دونوں باتیں برحق۔ لکھنے والوں کی دال روٹی کی فکر تو لازم ہے ہی جیسی وہ کام کی باتیں کر سکتے ہیں۔ یعنی کوئی سنہری انڈا دے سکتے ہیں۔ ایسے کام جھٹ پٹ یا مفت نہیں ہو سکتے۔ اور ہمارے زمانے کے تقاضے تو بڑے ہی شدید ہیں۔ پیٹ سیر ہو تو دماغ بھی کام کرتا ہے۔ خیر، جناب! نے لکھنے والوں، چھاپنے والوں، بیچنے والوں، اور سنبھالنے والوں کے بارے میں بڑی ہی سچے کی باتیں کہیں جو پلے میں باندھ رکھنے ہی کے لائق نہیں بلکہ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ باتیں تو جو ہوتی تھیں سو ہوئیں۔ یہ نہ ہوتیں تو تہید کیسے بندھتی اور جلسہ کیسے ہوتا؟ دیکھنا یہ تھا کہ وہ کون سے بھاگوں ہیں جنہیں پہلی بار انعام ملا اور اکرام بھی۔ ان میں سے کچھ پرانے موجدوں یعنی جگادری تھے اور کچھ نئے۔ فیروز سنز، اردو اکیڈمی سندھ پرانے اور لائبریری کارپوریشن نئے میں نے آزمائش کے طور پر پہلے ہی گرد پڑاؤ کو دیکھ کر کہ اور مثال لیا تھا کہ انعام کس کس کو مل سکتا ہے۔ سولہ محل کی رائے سے میری رائے بھی مل ہی گئی۔ ایک کتاب تو دیر سے میری آنکھوں میں گھب رہی تھی اور سچ پوچھتے تو کٹنگ بھی رہی تھی الائندہ اندر علی کی یہ دلچسپ، نٹ کھٹ مخلوق ہوا اور جیسی ہے فیصد چوڑوں پر ہو تو لال بندر انعام پائے گا اور ضرور پائے گا۔ اور اب تو بڑے بھی انہیں کے ساتھ ہوئے ہیں۔ انہی کی کہانیاں بھی خوب چھپی ہے۔

کاہنوائی کیوں نہ ہوئی کہ ہمارے بھی کچھ پلے ٹپتا۔ اس لئے بالکل میرے دل ہی کی بات کہی۔ خبر ان کی تسلی یوں کی گئی کہ اس برس نہیں اگلے برس سہی۔ اتنا بھی کافی ہے۔ دگر نہ یا ر لوگ ہمارے لحسنک انگریزی ہی بولتے جائیں تو ان کو کون روک سکتا ہے۔

شیخ منظور الہی کا نام تو پہلے ہی سنا تھا۔ وہ ہمارے تعلیم کے سکتہ ہیں جیسی ان کا نام لینے میں اتنی بے تکلفی برتی ہے۔ وہ اس جلسے کے صدر ہوئے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام کون نہیں جانتا۔ مانے ہوئے ادیب اور ماہر تعلیم۔ اور اب علاقائی مرکز لونیسکو ہوائے جنوبی ایشیا کے کرتا دھرتا۔ پہلی بات اور پیشقدمی کا فرما ان کے نام پڑا اور انہوں نے اس کا حق بھی خوب ادا کیا۔ ان کا یہ کہنا سو فیصد ٹھیک ہے کہ اس دن کا اجلاس عجیب نہیں کتابوں کی دنیا میں شگب میل ثابت ہو۔ اس لئے کہ اس میں لکھنے والے چھاپنے والے، فخر کتب فروش لائبریرین اور میرے جیسے پڑھنے والے بھی موجود ہیں۔ یہ ایک اچھی بنیاد ہے۔ اور اس پر جلد ہی بڑی شاندار عمارت بھی تعمیر کی جائے گی۔ جیسی کہ مثال طور پر خود آریٹ کوئٹل کی وہ عمارت تھی جس میں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ یہ میری طرف سے جملہ معترضہ سمجھئے۔ مدعا یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے لئے اچھے سے اچھا مواد فراہم کیا جائے۔ اور اس کی ایسی داغ بیل ڈالی جائے کہ دلوں میں بات کہیں کی کہیں پہنچ جائے۔

اب اس بات چیت میں جسے انگریزی داں سمینا کہتے ہیں۔ میں تو اسے مینار ہی سمجھا اور وہ بھی کچھ ایسا غلط نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی باتوں سے چاروں طرف فوری نوک پھیلنے لگے۔ آغا ایم جعفری صاحب مکینیکل ڈائریکٹریٹ نے بات کچھ اور آگے بڑھائی۔ اور کتابیں چھاپنے کی پیشہ ورانہ جنموں کا ذکر کیا۔ اور زہب کیا۔ انہوں نے اس کام کی ساری تاریخ بتائی۔ اس قسم کا پہلا سمینا ۱۹۵۹ء میں ہوا جس کا شرف پاکستان کے شہر مری کو حاصل ہے۔ جب وہ بول چکے تو میں نے ابا جانی سے پوچھا کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔

انہوں نے کچھ وہاں سمجھا یا اور کچھ گھر پر جا کر۔ انگریزی سمجھ میں آئے نہ آئے مگر باتیں ساری بڑی کام کی تھیں۔ بہت اچھی بات ہے کہ اس کام کو ترقی دینے کے لئے ہمارے یہاں ایک انجمن موجود ہے جس نے پچھلی بار اتنی شاندار فائز کتب کی تھی اور پچھلا دور میں بھی ایسی ہی

کتاب تیار کروں اور اگلے سال انعام پاؤں۔ چنانچہ میں نے خوبصورت چمکے کاغذ اور دھڑلے سے سمیٹ کر ایک بڑی خوبصورت کاپی بنالی ہے۔ اس پر خوش خط لکھے جارہا ہوں کیا؟ یہ خبر نہیں۔ اور اس کو طرح طرح کے نقش و نگار سے خوب آراستہ بھی کیا ہے۔ اگر لال بندہ انعام لے سکتا ہے تو ہم نہیں لے سکتے؟۔ انعام بھی، اکرام بھی اور۔۔۔ نام بھی۔ دیکھ لیجئے اگلے سال ضرور انعام بھی لے کر پہنچے گا اور سند بھی۔

ہاں تو مجھے ہاتھوں ایک لطیفہ بھی ہے۔ اعلیٰ جناب ابی انشاء۔ ناموں اور انعام کا اعلان تو کر ہی رہے تھے۔ سندیں الگ تھیں اور چیک الگ۔ وہ پہلے انعام پانے والوں کو سندیں تو دیتے گئے مگر چیک اور ان کے لغاتے شاید اپنی ہی جیب میں ڈالتے گئے! یعنی الگ رکھ چھوڑے۔ آخر حق حقدار کو پہنچانا ہی پڑا۔ اور وہ لغاتے انعام پانے والوں یا ان کے کسی نمائندے کے سپرد کر دیئے گئے۔ جلسہ کو تو ختم ہونا ہی تھا۔ مگر میں گھر واپس آیا تو ایک بہت بڑی انگ لٹے ہوئے۔ یہ کہ میں بھی آج ہی سے ایک شاندار

صور اسرافیل

قاضی نذیر الاسلام کی منتخب شاعری کے اردو تراجم مع مقدمہ
قاضی نذیر الاسلام مسلم بنگال کی نشاۃ الثانیہ کا پہلا نقیب اور داعی ہے جس کے گرجدار آہنگ نے صور اسرافیل کی طرح قوم کے قن مردہ میں پھر حیات نو پھونک دی تھی۔ اب یہ لاوا ایک آتش خاموش کی مانند ہے مگر اس مغنی آتش نولنے، ہمارے دلوں میں حب وطن، حب ملت اور حب زندگی کی جو قندیل روشن کر دی ہے وہ سدا جلتی رہے گی۔

نذیر الاسلام کی زندگی بخش شاعری اور مدوح پروہ گیتوں کا یہ انتخاب پندرہ اہل فن کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

کتاب خوبصورت اور ڈھانچے میں چھاپی گئی ہے۔ کتاب کا ہر حصہ دیدہ زیب، آرٹ کی جدو دلوں سے مرصع جسے مشرقی پاکستان کے نامور نقاش زین العابدین نے خاص اس مجموعہ کے لئے تیار کیا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسہ۔

ادارۃ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی

تصوف اور ادب و معاشرت کی تحقیق و مطالعہ کے کام میں مصروف ہیں اور ان کی کاوشیں منظر عام پر آ رہی ہیں۔

نئی مطبوعات:

تاریخ چترال

اصل تحریر (فارسی): مرزا محمد عرفان (مرحوم)
تالیف و اضافہ: مرزا غلام مرتضیٰ خان
اردو ترجمہ: وزیر علی شاہ
صفحات: ۴۳۴
قیمت: دس روپے
لٹے کے پتے:

(۱) شیخ محمد امین فاروقی بازار دوش ریاست چترال۔

(۲) قریشی جنرل اسٹورز۔ بازار قصہ خوانی۔ پشاور

نقشہ پر نظر ڈالیں تو شمالی پاکستان میں آزاد ریاست چترال کشمیر، مقبوضہ ریاست جنوں و کشمیر اور ملحقہ علاقہ، بلتستان، گلگت، ہنزہ، دیر، سوات اور چترال نظر آتے ہیں۔ ایک جہد یہ خطے جغرافیہ نویسوں اور مؤرخوں کی تحریروں میں درہستان، اور کہوستان کی معنی خیز اصطلاحوں سے یاد کئے جاتے تھے اب بھی بعض مؤرخ اور محقق ان خطوں کو یہی نام دیتے ہیں۔ ان ریاستوں میں بلوچستان، کافرستان اور نورستان نام کے علاقے بھی شامل ہیں۔ حقیقیات، نسبیات اور تاریخ و ثقافت کے ہر پہلو ان خطوں کی علمی و اداری تحقیق کے کام میں مصروف ہیں مثلاً اطالوی ماہر آثار قدیمہ، پروفیسر ٹوچی، جنہوں نے کچھلے ہی دلفن ریا سوات میں یونانی تہذیب کے آثار پر اپنی تحقیقات مرتب کی تھیں اور ایک رپورٹ صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں پیش کی تھی۔ ان اطالوی پروفیسر کے علاوہ دو جرمن محقق، ڈاکٹر کارل جٹما و دو جرمن ہرے بھی اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ محمد پاکستان کے تاریخ داں اور علم دوست حضرات ہیں ڈاکٹر دانی، جناب اللہ بخش راجپوت، جناب عبدالحمید اثر افغانی اور سید غلام حسن شاہ صاحب کالمی آزاد جموں و کشمیر وغیرہم شمالی پاکستان کے ان خطوں کی تاریخ و ثقافت، تہذیب

ریاست چترال کے مشرق میں گلگت اور ریاست سوات کے کوہستان فی علاقے، مغرب میں کافرستان (نورستان) شمال میں دھان و شکاشم (افغانستان) اور جنوب میں گبرونگ اور ریاست دیر و باجوہ کے خطے ہیں۔ ریاست نہ صرف اپنے قدرتی پُر فکوحہ مناظر کے باعث مشہور ہے بلکہ دفاعی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت واضح ہے۔ ان چیزوں کے باوصف یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے ان خطوں کی بہت مرتب حالت میں معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔ بیرونی سیاحوں نے یہاں کے خطوں کے تذکرے لکھے ہیں اور چترال کا بھی ذکر کیا ہے مگر یہ معلومات زیادہ تر سرسری سطحی اور اضافی سی ہیں، تحقیق و تاریخ ان کا موضوع نہیں، اس لئے ان کی معلومات پر زیادہ انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ چترال کے دانشوروں اور ادیبوں نے بھی تاریخ و ثقافت کے ضمن میں کچھ زیادہ کاوش نہیں کی، ان کا زیادہ قلم زیادہ تر رومانی اور صوفیانہ شاعری پر صرف ہوا۔ مولانا محمد سید نے چند تاریخی واقعات کو نظم بھی کیا ہے مگر یہ کوشش بھی زرمیہ شاعری کے ایک اچھے نمونے کے طور پر ہی قابلِ داد ہے مگر تاریخ، ریاست اور آثار و تہذیب کے پہلو پر بھی توجہ دیتے ہیں۔

اس اعتبار سے تاریخ چترال ایک اہم دستاویز ہے جس کے مطالعے ہم چترال کے طبعی حالات و کوائف، تہذیب و ثقافت کے علاوہ اس خطے کے مختلف قبائل، گروہوں اور مشاہیر سے بھی روشناس ہوتے ہیں۔ تذکرہ اقوام چترال کے عنوان سے کتاب میں جو معلومات ہیا کی گئی ہیں وہ نسبیات کے ماہرین کے لئے بھی کچھ کامیاب موضوع ہیں اور عام قارئین کے لئے بھی بہت سی نئی باتوں کی کاشف ہیں۔ کتاب میں مناظر اور معاشا کی سطح سے زیادہ قصا و تاریخ شامل ہیں جن سے کتاب کے مشمولات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ (دس۔ خ۔ گ۔)



ہماری موسیقی

فن نغمہ کی تاریخ۔ اور اس کے فن و فلسفہ پر سیر حاصل نظر مرتبہ: رفیق خاور

- نئے موضوعات کا اضافہ
 - پاکستانی موسیقی کے موجودہ مسائل
 - ساز و آہنگ کی دنیا میں مسلمانوں کا عظیم حصہ
 - مسلم فنکاروں کے اعزازات موسیقی، تمدن و تاریخ انسانی میں نغمہ و آہنگ نے کیا کردار ادا کیا۔
- چند موضوعات:

مشاہیر موسیقی: امیر خسرو، سلطان حسین شرقی، میاں تان سین، شاہ عبداللطیف بھٹائی، تان رس خاں، سمیت خاں، فیروز خاں، تاریخ موسیقی، موسیقی اور تمدن عالم، موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ، پاکستانی موسیقی، ہماری موسیقی کے ساز پاکستانی موسیقی، مشرقی پاکستان کے لوک گیت، مغربی پاکستان کے لوک گیت، راگ درپن، وارث شاہ، مسائل موسیقی، تجدید موسیقی، قومی ترانے کی موسیقی اور سرگم، ہماری موسیقی کے مسائل، سُر تولیسی۔

چند ممتاز اصحابِ قلم
سید عابد علی جابد، جناب شاہد احمد دہلوی، جناب خادم محمد الدین، قاضی احمد میاں، اختر جوناگڑھی، ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، فیروز نظامی، سید برہہ آغا، سجاد سرور نیازی، احمد علی، چھاگلا۔
سیلا محمد علی، عاصمہ حسین، امین الرحمن، رفیق غزنوی و سادام آذوری

کتاب میں مختلف سازوں کی آڈیو پیسری بھی ہے
ہر صفحہ کی نقیصہ نقاشی بھی شامل ہے۔

کتاب: نقیصہ اردو شاپ میں

نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت

سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے

قیمت صرف پانچ روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۸۳۳، کراچی

صحت اور دانت



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد متل کیا گیا ہے دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو کسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش :- ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے محوین وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ :- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار :- ہمدرد منجن کی دیر پا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔



ہمدرد منجن

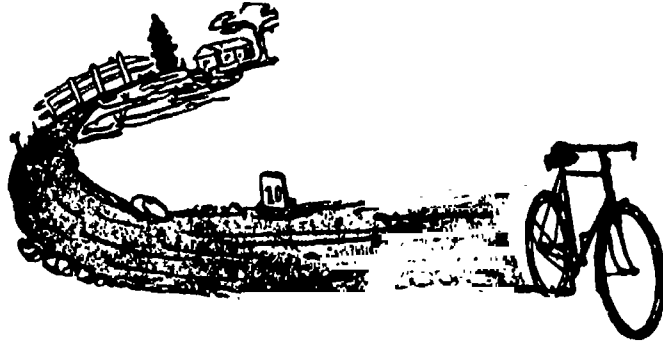
مسکراہٹ میں شش اور دانتوں میں بچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے



ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور

فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر آپ کے پاس بہترین کوالٹی کی یہ :

موجود ہے !



مستم سائیکل

آپ کہ غیر ملکی سائیکلوں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے - مشہور و معروف پائیدار اور تیز رفتار
"مستم سائیکل" ہر چھوٹے بڑے شہر میں کفایتی دامنوں پر دستیاب ہے

چین سے دو خط



دل روز تمام علاج جلدی امراض

چترم کے چوٹے سنسی لاجوری چوٹے
مغلانی چوٹے ناسور بیکٹریا بال آؤر ڈاؤنٹیل غارش
محج خست زیر کچھالی - گیتی - رولی - ماسور چنڈی رتہ بہارہ
درو - ملین یوجن چوٹ - نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں
کے کاٹے اور ڈسے کا بیضر اور تیرہ ہدف ملان ہے -

چیرہ باز اور مریم بی سے نجات دلاتی ہے

قیمت فی شیشی

دو روپیہ - ایک روپیہ

انڈین کینیڈل
چنگ کنگ چین
۲۵ اگست ۱۹۶۲ء

..... گزشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی ارسال کردہ
دل روز کی شیشی لی - شکریہ! مجھے دس سال کے عرصہ سے
یہ تحفہ ملی - ہر قسم کی دسی و دگریزی ادویات استعمال
کیں مگر کچھ بھی آفت نہ ہوا - دل روز کو صرف
چھ دن لگانے کے بعد تمام شکایت باقی رہی -
کاش! مجھے پہلے ایسے تیرہ ہدف علاج کا علم ہوتا.....

ن - ا - رخ
میر

انڈین کینیڈل
چنگ کنگ چین
۲۵ جولائی ۱۹۶۲ء

..... مجھے کچھ عرصہ گون پر ایک قسم کی کھینچ
والے سے ہیں جن کی وجہ سے غارش بہت ہوتی ہے
نشانات تو رنگ دم سے ملتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آفت نہیں ہوا! افضل میں آپ
کی دوائی دل روز کا اشتہار دیکھ کر خیال ہوا کہ ایسے ہی
استعمال کر دوں گی مگر میں نے کراؤنڈ تھالی استعمال کیا آپ
مہربانی فرما کر ایک شیشی دل روز تمہارے بلائیے پر
بندوبست لاسل وائر کر سکتے ہیں.....

ن - ا - رخ
میر

سندائے استعمال میں ہے

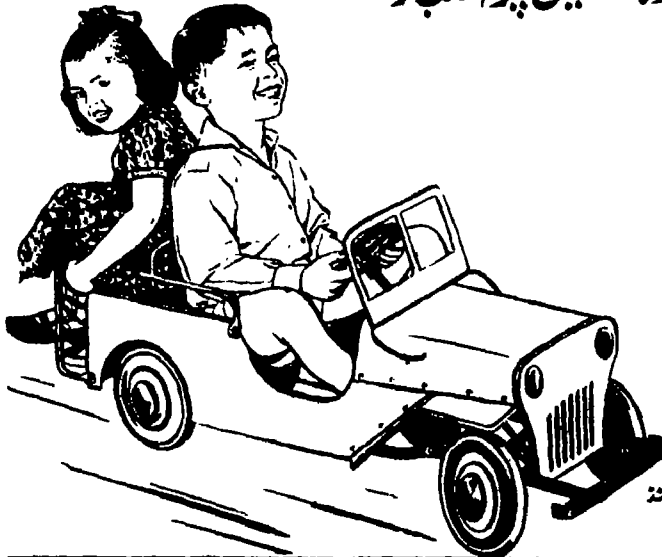
حکیم طاہر الدین اینڈ سنز دروازہ لاؤ فیروز پور روڈ لاہور - خوب

ہر شہر و وافر و شس طلب کریں

اگر غور کیجئے تو یہی چھوٹی چھوٹی چیزیں...

بڑی خدمات انجام دیتی ہیں، مثلاً برماشیل سروس انڈنٹ کا
خندہ پیشانی کے ساتھ آپ کی ضروریات کا پورا کرنا، تہذیب کے ساتھ
برہمگاری کا واپس کرنا وغیرہ۔
ہمارے لئے بھی یہ سب بہت اہم امور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ برماشیل کے
سروس انڈنٹ کو ڈرائیوے سروس کی مکمل تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ آپ کی
ضروریات کو اپنا اولین فرض سمجھے۔ لیکن یہ تو برماشیل کی خدمات کا
محض ایک حصہ ہے۔ اس کے علاوہ برماشیل کی اور خدمات بھی ہیں جن میں
تیل کی ان تمام اعلیٰ اشیاء کی فراہمی بھی شامل ہے جو صنعت و زراعت
صحت وادیہ اور وسائل حمل و نقل کے لئے ضروری ہیں۔

خدمت اپنا افتخار برماشیل پر اعتبار



برماشیل آئل اسٹونک اینڈ لاسٹری بیونگ کمپنی آف پاکستان پرائیویٹ
(انگلستان میں قائم شدہ) کمپنی ممبران کی ذمہ داری محسوس

۶	سید شیر علی کاظمی	نذر اور اردو فارسی	صور اسرافیل :
۹	عابد وانا پوری	ڈرامہ بھکار زندگی	رقاضی نذرا لاسلام
۱۱	قاضی نذرا لاسلام	شب کی تنہائی کے ہمدم! (طویل نظم)	
	مترجمہ: یونس آحمر		
	قاضی نذرا لاسلام	جھلسلی دیکھائی تیشلی	
۳۳	مترجمہ: افسرہ پوری		
۱۵	ابن الرحمن	اظہاریت	مقالات :
۲۱	ضمیر علی بدایونی	تخلیق کی آگ	
۲۵	•	پاکستان، (دوش، امروز، فردا):	مسائل ملت :
۳۰	انور حسین	الغلاب سے آئین یک	
۴۴	عبدالرشید خان	(اترا ترے کنارے)	ثقافت :
		(دادی سندھ میں عربوں کی آمد):	
۲۹	طاہر آحمر	سوات میں اجنبی	نظم :
۲۰	صہبا اختر	سزا	
	خواجہ غلام فرید بادلہدی	(علاقائی ادبیات): سافول	سبک :
۴۴	مترجمہ: حشمت فضلی		
۴۴	سلطان باہو - مترجمہ سرور مجاز	"حق کے سونے شہر میں باہو...!" (ادبیات)	
۲۸، ۵۰	شیداجوئی	تالش دہلوی	غزلیں :
۵۰، ۲۴	رضی اختر شوقی	مارت حمادی	
		"ہوتا ہے شب و روز"	فن :
۵۳	اشرف ذکائی	(پاکستان میں شوقیہ تھیں)	
۵۱	منظف احمد ظفر	دیارِ سحر (منظف آباد، آزاد کشمیر)	تعارف :
۵۸	•	آشوب دہر زلفتِ خوراک کے خلاف مالی جنگ	لیل و نہار :
	قاضی نذرا لاسلام		سرورق :

نذرل اور اردو فارسی

ستید شبیر علی کاظمی

در اصل اس ہی کی بیشتر نظموں کا اثر ہے اور نئے اسالیب اظہار کی پیروی کا ایک ہمہ گیر سلسلہ ہے۔

اس بحث کے لئے میں نے نذرل کی صرف دس نظموں سے ایک انتخاب الفاظ کیا ہے اور ایک یاد و نظیں یہاں بطریق مثال پیش کی ہیں ان سے نذرل کے ادبی سفر اور اس کے تدریجی و انقلابی رجحان کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ اگر اس کی پیروی کی جائے تو اردو اور بنگلہ کی اساسی اقدار اور زیادہ قریب آسکتی ہیں۔ نذرل نے دونوں زبانوں کی خلیجوں کو پلٹنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے اور یہ کوشش ہمارے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے اس کی بعض نظموں میں تو مصرعے کے مصرعے ایسے ملتے ہیں جن پر عام فہم اردو کا گمان کرنا بیجا نہ ہو گا۔ ایک نظم ہے۔ "کمال پاشا" اس کے الفاظ اس کی روشن مثال ہیں:-

کمال تو نے کمال کیا بھائی

ہو، کمال، تو نے کمال کیا بھائی

شاہاش بھائی۔ شاہاش دسی۔ شاہاش تو شہر میرے

پٹھا دی۔ دشمن سب جمع گھر ایک دم شیرے

بل دیکھی بھائی۔ بل ہمارے۔ دیناے کہ دکرے نا

(بلو بھائی کو تو)

ترکی تیز تلوارے

خوب کیا بھائی۔ خوب کیا

بزدل اوئی دشمن سب بالکل صاف ہو گیا

خوب کیا بھائی۔ خوب کیا بھائی

مار دیا بھائی۔ مار دیا

دشمن سب مار گیا۔

قلعہ فتح ہو گیا

پردہ انہیں

نذرل نے جہاں بنگلہ شاعری کو اردو چیزوں سے ملا لیا کیا وہاں اس کو ایک مخصوص فکری و لسانی رجحان بھی دیا جو بنگلہ کے مسلمہ و مروجہ اسلوب سے ایک بغاوت تھی۔ یہ بغاوت اسلامی موضوعات، تقویٰ اور معتقدات کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور اردو کے عام فہم الفاظ کی تبلیغ و بے ساختہ آمیزش کا استعمال تھا۔ یہ بات اس قدر چونکا دینے والی تھی کہ بنگلہ ادب کی دنیا میں ایک ہچکچاہٹ مچ گئی۔ جو لوگ سنجیدہ طبیعت تھے وہ ادب میں اس اضافہ کا غور سے مطالعہ کرنے لگے اور کلام کی معنویت اور اسلوب بیان کی ندرت کا لطف اٹھانے لگے۔ نذرل چونکہ فطرتاً حریت پسند اور تقلید دشمن باغی ہے اس لئے در ماندہ انسانیت کو سہارا دینے کے لئے اس نے جو بھی صور پھونکا وہ اپنے آہنگ میں گر جدار اور ہر طرح نیا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے جو زبان بھی اختیار کی وہ اس کے مافی الضمیر کا ساتھ دینے والی تھی۔ پیرایہ بیان میں نت نئی راہیں پیدا کرنے کے علاوہ اس نے زبان میں سنسکرت کے غلبہ کو رد کیا اور اردو فارسی کے الفاظ کے لطیف امتزاج اور اسلامی موضوعات کی درآمد سے اسے وہ حرارت و برجستگی اور آناجستگی جو اس کے کلام کو موزوں تر اور قلب و نظر کو اور زیادہ گرم کرنے والی ثابت ہوئی۔ یہ اس کی وسیع المشرقی اور اسلامی اقدار کے ساتھ فطری وابستگی کی بھی ایک دلیل سمجھی گئی۔ نذرل نے بنگلہ ادب میں جوئے بزرگ و بار پیدا کئے وہ بعد میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے بلکہ نذرل گیتی (نغمہ نذرل) ایک عام ادبی رجحان بن گیا جو دراصل اس جوہر قابل کے تمام ادبی تجربوں کا ہی بنا و قوں اور اسلوب و اظہار کی قدیم پابندیوں سے گریز ہی کا ایک دوسرا نام تھا۔ بنگلہ کے نوجوان لکھنے والوں کو اس سے ایک ہمیز ملی اور اس وقت پاکستان کے متاز بنگلہ ادیبوں میں اس رجحان کا پایا جاتا

جانے دو بھائی جو گیا

قلعہ فتح ہو گیا

کمال، تو نے کمال کیا بھائی :-

اُن کی ایک اور نظم ”اند پاشا ہے۔ اس میں بھی
یہی لے ہے :-

”اے خدا۔ اے علی۔ لاؤ میری تلوار۔ فریاد!“

اُن کی نظم ”محرم“ میں یہ سلسلہ دراز تر ہوتا نظر آتا ہے :-

علی زادہ حسینیر دیکھا ہوتا جدی پائے

ماں فاطمہ آسمان کا ندے کو لے گئیں پاش

رن جانے قاسم وہ دو گھر پیر نوشاہ

اماں گوبانی داؤ پیچھے گلو چھاتی ماں

ہانکے سیر سر دے گا۔ نہیں دے گا عام

پی لود تو بانی شیش۔ پیے گا کاکھا خون

دادا۔ تیری گھر کیا برباد پائمال

حلقوم ہلے تیغ اوکے بوٹے چھاتی تے

آفتاب چھپے نلو آندھیاریا راتی نے

آسمان بھرے گلو گنو دھلی تے دوپہرے

لال نیل خون جھڑے کفر بر اوپرے

بیٹا دیر ہو رہا پیر بن ہاتھ آہ

عرشیر پائیہ دھرے کا ندے ماما فاطمہ

اے خدا! بدلتے بیٹا دیر رکھتے

پر جتنا کرو گناہ پانی کم بخیر

مکو محرم ایلو۔ میلو چلے ہو کال

بھولی گوا جو۔ شہید ہو لال

سلم! قدا آج زین العابدین

واحسینا۔ کیندے تانی جاوے دن

پھر ایلو آج شہی محرم ہیند

تیاگ چائی۔ مرثیہ کرندن چائی نا

اوشیش قرآنیر ہاتے تیغ عربیر

دنیا تے نا تو نائے۔ مسلم کارو دیشیر

تر بے شنو۔ روئی شنو۔ باجے کتھارام

شمشیر ہاتے فو بانده شمشیر عام

نیجے چھے نقارہ۔ ہانکے نقیب تریج

ہوشیار اسلام ڈوبے تہو شور جو

جاگو اشو مسلم ہانکو حیثیری ہانک

شہیدیر دن سب لال لال ہوتے جاگ

نوشاہ سا جنون کچھا آستین

میدان لٹاتے رے لاش ایسی خاص دن

حسینر متو پی بو پیالہ سے زہرے

حسینر متو نیمو کچھے چھری قبرے

اصغر شمو دیبو بچہ رے قربان

ظالمیر داد شہو دیبو آج گور جان

سکیتہ آر شہت پاش دیبو ماتا کفیا

قاسمیر متو دیبو جان رو دھی انیائے

محترم۔ کر بلا۔ کاندے ہائے حسینا

دیکھو مورو سورجے اے خون جنو شو شے نا

(دیکھو تان کا سورج) (نہیں نکھاتا)

اس نظم کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ

نذول نے دقت کی آواز کا ساتھ دیا اور اپنی اس نظم کی تخلیق سے

ادبیات عالیہ میں ایک بیش بہا اضافہ کیا تھا۔ روایت ہے کہ یہ

نظم علامہ اقبال کو بھی سننے کا اتفاق ہوا تھا اور انہوں نے

فرمایا تھا کہ نندہ الاسلام کی اس نظم نے لوگوں کے دلوں میں غرور

ایک آگ لگادی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ یہ رسمی داؤد تھی بلکہ ایک

حقیقت کا اظہار تھا۔

آنادی سے قبل اردو داں طبقہ نذول کے کلام سے بہت

زیادہ آشنا نہ تھا۔ گاہے گاہے ان کی نظموں کے ترجمے اردو

رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے مگر سب سے زیادہ

ہوش - جوش - شہرت - گھر - دیب - حساب - دل -
داغ - دس ہزار - بھائی - برادر - آب زمزم - سپہ سالار -
سلام - کلام - زخمی - دلاور - جانور - افسوس - تخت -
سنان - زنجیر - خنزیر - زورور - شیر - گیدڑ
کنجوس دل - مدینہ - مشکل - ہتھیار - کاندھا - شیطان
بیابان (کمال)

۶ - سارا میدان - نشانی - افسوس - شیرز - خون خونی -
دلیر - شیر میر - قربان - بندوق توپ - خون خوش کھنڈ -
حامد - نقیب - حیدر - خون خوشی - عشق - (دن بھری)
۷ - شہید - ابو - دلیر - یونانی - مصری - کھانی - دجلہ
عراق اعظم - زندہ - خنجر - (شط العرب)

۸ - رحمان - خاموش - گردن - ذوالفقار - شیر خدا -
دودھاری - آستانہ - چٹا میدان - جلا - قیامت - (قربانی)

۹ - ذات - آنسو - ماتم - دنیا - علی زادہ - دلدل - یزید -
شمر - دامہ - شیرز - اللہ دربار - کم ذات - قطرہ -
دربار - قبر - نقارہ - ہوشیار - آستین - خاص دن -
پیالہ - زہر - ظالم - داد - (محترم)

اس فہرست کو اور بھی طویل دیا جاسکتا ہے۔ لیکن نذرل
کے کلام کے مجموعے اور دیگر تحریروں میں اب کیا ہوتے چارے ہیں
بلکہ بعض تو نایاب ہو چکے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کے منتخب
کلام سے ہی جو ڈھاکہ سے حال ہی میں شائع ہوا تھا استفادہ کیا ہے

مقبولیت ان کی نظم "باغی" ترجمہ کی اشاعت سے ہوئی۔ ہر صنف
کے اکثر علمی و تعلیمی حلقوں میں نذرل کا ذکر سننے میں آتا تھا اور
جونہی وہ اس وقت کے انقلابی رجحانات سے متاثر تھے نذرل
کی شاعری پر جان دیتے تھے اور پھر اردو میں بھی اس کے آہنگ
کی گونج سنائی دینے لگی۔

میں نے نذرل کی چند چیدہ نظموں سے ایسے الفاظ کا
انتخاب کیا ہے جو اردو اور ہنگامہ میں مشترک سرمایہ کی حیثیت رکھتے
ہیں اور ہمیں ذہنی طور پر یکساں محسوس کرنے اور قی بکھیتی کے شعور
کو ہر وقت نظر کے سامنے رکھنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں

۱ - عرش - چنگیز - بدو - اسرافیل - خون - ہمت - براق -
تازی - ہادیہ - دوزخ - مشعل - (باغی)

۲ - تلوار - لال - فیتہ - طوفان - گل بار - بھانسی -
جوالا (خون آلود زمین)

۳ - جگت ماتا - ہمالیہ - جل - شانتی - (اگنی)

۴ - ہتھوڑی - تاؤ دینا - کچا کلیجہ - شیطان - سیڑھی -
ہنسی - کالا ناگ (دھوم کیتڑ) (دودھار ستارہ)

۵ - خونی رنگین - سنگین - نیت و نابود - زیر - ذکیت -
بد نصیب - خراب - اللہ - کلا - ہلا - کل ملک - آزاد

مرد غازی - ملا - شور - شہید - قصائی - غصہ - چار -
خون خرابی - خوبصورت - کر بلا میدان - ظالم -
سیاہ - مردہ - گرم تازہ - بہشت - جمال - آج -

ضرورت ہے کہ ہم اپنا زندگی جہد حاضر کے سامنے تقاضوں کے
مطابق بنائیں۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہم اپنی اخلاقی قدروں کی
حفاظت کرتے ہوئے ان چیزوں سے بھی آزادانہ استفادہ کریں
جو دوسروں سے ہمیں مل سکتی ہیں۔

نیلما رشل محمد ایوب خان

ڈرامہ نگار نذرل

عابد دانا پوری

نذرل کی ادبی و سیاسی تحریروں میں دونوں ہی عنصر کارفرما نظر آتے ہیں، رومانی بھی اور باغیانہ بھی۔ جہاں تک ڈراموں کا تعلق ہے اس نے تین مکمل اور چار ایک انکی ڈرامے ہمیں حطاکے ہیں۔ جتنے جتنے ڈرامائی پارے بھی ہیں ملتے ہیں مگر وہ اس قدر مختصر ہیں کہ مکمل یا باقاعدہ ٹائٹل کا نام نہیں نہیں دیا جاسکتا۔ دراصل یہ نوھر بھول کے لئے وقتاً فوقتاً مرتب کئے گئے تھے اور انہیں منظوم ڈرامائی بولی ہی کہا جاسکتا ہے۔

نذرل کے ڈراموں میں رسائی بہت بلند اور اظہار اثر اور اثر پذیر ہے نیگور کی تختیلی پرواز اور تعویذی موضوعات سے ایک ایسا گریز جس نے بنگال کی ادبی دنیا میں ایک پھل مچھلی کی طرح نمودار ہوا تھا۔ نذرل نے بنگال کی ادبی دنیا میں اس لئے گیتوں میں شریعت کے ساتھ فتنگی کا اس نے خاص خیال رکھا ہے۔ لیکن نشر کے مکالموں کو بھی اس نے جدید تکنیک سے آشنا کیا اور بعد میں یہ چیز ادبی ڈراموں کی ایک عام روش ہو گئی۔ مثلاً ”مدھو بالا“ میں کی تکنیکی تجربے نظر آتے ہیں۔ یہ طویل ترین منظوم ڈرامہ ہے جو اس نے چالیس سال کی عمر سے متجاوز ہونے کے بعد قلمبند کیا تھا۔ اس کا ابتدائی ڈرامہ تیس سال کی عمر کے لگ بھگ لکھا گیا تھا اور غیر منظوم تھا۔ اس کے ایک پہلے ڈرامے ”پتلی بیبی“ ”گرگیا کا بیاہ“ میں بھی گیت اور نظمیں ہیں اور وہ ہی نے کار کا بھی آتی رہتی ہے۔ ویسے یہ ڈرامہ نثری تخلیق ہے۔ اس کے ایک ایک ایکٹ والے ڈراموں میں جھلملی، سینو بند، بھوت بیاہ (بھوت کا ڈر) اور عید مشہد ہیں۔ سینو بند اور بھوت بیاہ کو چھوڑ کر نذرل کے تمام ڈراموں میں موضوع محبت اور اخوت کا جذبہ ہے جو ابھر آئے تو دنیا کی تمام بلائیوں اور بے اعتدالوں کی طرح بن سکتا ہے۔ سینو بند میں نذرل نے خشنی ایجادات کو فطرت کی نشوونما

یوں تو نذرل کی شہرت ایک باغی شاعر کی حیثیت سے ہوئی مگر اس کے ڈراموں کی دھوم بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ چونکہ خود راگ، رنگ اور صدا و ادا کا دلدادہ و فنکار تھا اس لئے تمثیل نگاری اور ٹائٹل منڈلی پیار یعنی پیشکش کے میدانوں میں بھی ایک جہم قابل ثابت ہوا اور جب تک یہ شمع ایک شمع فروزاں رہی برابر اپنی جوت جگاتی رہی۔ اس کے گیت ہوں یا ٹائٹل، انی سب میں اس کی شعلہ زوئی، اس کا گرجا اور آہنگ اور عالمگیر پیغام حریت و امن رچا بسا ملے گا۔ جس وقت تک یہ آتش جوان رہی لوگوں کے دلوں میں جب وطن اور حریت آدم کا شعلہ بھی روشن رہا۔ اس وقت قومی جذبات پھمے ہوئے تھے۔ جنگ عظیم اول کے بعد کا زمانہ تھا اور سامراجی طاقت کے خلاف لوگوں کے احساسات چڑھی ہوئی ندی کی مانند تھے۔

یوں روایتی مضامین بھی شعروں میں بندھ رہے تھے اور حسن و عشق کی داستانیں سنانے والے بھی اپنے گیت لکھ رہے تھے مگر یہ نذرل ہی تھا جس نے اس جھڑ بزمیر میں پہلی بار تیغ و سناں اڈل کی بھی لے چیر لی اور لوگ ایک نئے آہنگ و مضنون سے واقف ہوئے۔ بنگلہ شامی میں اس طرح ایک انقلاب لانے کے ساتھ ساتھ اس نے اسٹیج پر بھی کچھ تجربے کئے۔ مختلف و متضاد موضوعات کو گلے ملنے دکھایا۔ مگر رومان و انقلاب کا یہ آمیزہ کچھ زیادہ دیر تک نہ بچایا جاسکا اور اس کی بعد کی تحریروں میں اپنا الگ ہی جادہ تراشی نظر آتی ہیں۔ بہر کیف اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا انداز بیان، آہنگ، موضوع اور اسلوب کی — بہت سے نئے مسافروں ادب کے لئے رہ نما ثابت ہوئے۔ نیگور جیسے لوگوں نے بھی اسے خراج عقیدت پیش کیا اور نذرل گیتی ”نذرل کے نغمے“ بنگلہ شامی کی ایک مانی ہوئی تحریک بن گئی جو آہستہ آہستہ لوگوں کو اس منزل کی طرف لے گئی جس نے بالآخر ایک آزاد پاکستان کی شکل اختیار کی۔

اور خواتین پر ایک خاصانہ حملہ قرار دیا ہے۔ مگر بعد میں نذر دل کا تصور بدل گیا تھا اور وہ ان طاقتوں کو ناگزیر ماننے لگا۔ اس ڈرامے میں نذر دل کے دل کی آواز گونجتی ہے اور حسن و الفت کے کرشمے اپنا رنگ جلاتے ہیں۔

بھوت پرستوں میں نذر دل نے اپنا تصور محبت اور باہمی میل ملاپ کی خوبیاں اجاگر کی ہیں۔ اس میں سامراجی طاقتوں کا ہتھوڑا دل سے نکال دیئے کی تلقین بھی جا بجا ملتی ہے، جو اس وقت کے پس منظر میں بڑا زبردست اور کاری حملہ تھا۔

الایا (سراب)، میں اس نے حب الوطنی، باہمی محبت اور عشق کے اصلاحی پہلو کو لیا ہے۔ اس ڈرامہ میں جو مردانہ کردار ہے اس نے تین متفرق قسم کی محبتوں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا ہے۔ حسن کی کشش، قربانی کا جذبہ اور ذوقِ طلب۔ یہ ڈرامہ بھی نہایت کامیاب اور مؤثر ہے۔ اس ڈرامہ میں جو نژاد کردار ہے وہ کبھی کشش کا شکار ہے۔ ایک طرف محبت کی خوشی ہے، مگر وہیں ہیں، مگر ناکام — ایک ذہن ہے جو پورے عرصہ پر ہے مگر محبت کی زم ناکی سے نا آشنا ہے۔ اس ناکام میں جذباتِ منظر کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے نئے روپ دکھاتے ہیں۔ کبھی غم و اندھ کے طوفان بھٹ پڑتے ہیں۔ کبھی طانیت و آسودگی کی لہر آجاتی ہے کیونکہ محبت کرنے والے کا دنیا دوسری تمام طاقتوں پر غالب آجاتا ہے۔

جھلملی میں نذر دل نے محبت کے مارے ہوئے دو کرداروں کو لیا ہے۔ ایک مرد اور ایک خاتون۔ ان کی آرزوئیں اور تمنائیں قدامت پسند عناصر کے ہاتھوں مجروح ہوتی ہیں، مگر نذر دل نے اپنی ہمدردیاں زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ رکھی ہیں اور وہ یہ کہہ کر پردہ گردا دیتا ہے کہ بھتی محبت خود ایک ناقابلِ تسخیر قوت ہے اور جس محبت میں خلوص اور پاکیزگی موجود ہو وہ تمام رکاوٹوں کو مہدم کر دیتی ہے۔

دھو ہالا اصل میں لوک کہانیوں کی گونج ہے۔ اس ڈرامے کے ہیرو اور ہیروئن کسی دور دیں کے رہنے والے ہیں۔ اور شہزادہ، شہزادی کے روپ میں آتے ہیں۔ دونوں میں پہلی ملاقات

ہوتی ہے اور پہلی ہی نظر کار گر ہوتی ہے۔ خواب و خیال کی پرپیاں اپنا جادو چلا دیتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر چند ہی لمحوں بعد پرپیاں ان دونوں کو الگ الگ کر دیتی ہیں۔

لیکن یہ فراق ہی ان کی دائمی الفت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ محبت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اس ڈرامہ میں بھی دونوں کردار خاص کر شہزادہ، سچائی اور خلوص کی قوتوں سے نذر دل کی تمام دشواریوں کو دور کر دیتے ہیں۔ راہ کی ناہمواریاں، زمانہ کی نیرنگیاں اور حالات ایک ایک کر کے سلنے سے ہٹ جاتے ہیں۔

”پیتلر ہے“ (گڑیا کی شادی) میں انسانی اخوت اور عالمگیر برادری کا پرچار ہے۔ ذات، فرقہ، مقام اور رنگ و نسل کا امتیاز مٹانے کی تلقین ہے۔ یہاں وہ کہتا ہے کہ نفرت کے جذبہ کو مٹاؤ اور انسانیت کو دفاع نہ کرو۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑا ہوا انسان ان آلود گلوں سے کس طرح بچ سکتا ہے؟

نذر دل نے اپنے ناکام، سبیلی میں اس کا بھی جواب دیا ہے۔ اس میں وہ بتاتا ہے کہ صرف محبت اور احساسِ محبت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محبت کی کامیابی کے لئے عملی صداقت بھی موجود ہونی چاہئے۔ دوسرے محبت بے مقصد اور ناکام رہتی ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے وہ کہتا ہے کہ انسانوں کے تفکرات، ان کے دکھ سکھ خوشی و بد حالی کا اصلی سبب معلوم کرو۔ محبت کرنے والوں سے وہ کہتا ہے

کہ اگر دوسروں کے رنج و ملال کا تمہیں علم یا احساس نہیں ہے تو محبت بھرا یہ نازک، انمول دل ایک ادنیٰ سی چیز بن کر رہ جائے گا۔ لہذا حقیقت کی طرف آؤ اور زندگی کے سانچے کو عمل کی آغی سے بچتے کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ نذر دل نے یہ باتیں کہہ کر صرف لغائی نہیں کی ہے بلکہ خود اس نے اپنی زندگی سے محبت و خلوص اور اخوت و احسان کی عملی تفسیر بھی پیش کی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید بجا نہ ہوگا کہ اس کی نگارشات میں اس کی اپنی آپ بیتی بھی ہلکی ہلکی بھلکتی رہتی ہے اس لئے خلوص و واقعیت نے انہیں ایک ایسا صفحہ عطا کر دیا ہے جو اس عظیم شاعر اور ناکام نویس کو دنیا کے ادب میں ہمیشہ ایک منفرد مقام پر فائز رکھے گا۔

”شب کی تنہائی کے ہمدم....“

از نندہ السلام
ترجمہ: یونس احمد

جاگتے رہنا دریچے کے قریب تا صبح دم میرے لئے
الوداع اے میرے ہمدم الوداع !
لے شب دیجور میں پھیلی اُجالے کی کرن
یہ دریچہ اب نہ ہو گا دیکھیں
اب نہ تنہائی میں ہو گی گفتگو
اب نہ چپکے کا محل صدر رنگ سے میرا چین

آساں کی گود میں با چشم تر
کہہ رہا ہے چاند، لو آئی سحر
رات کی آنکھوں میں دم باقی نہیں
(جام میں خالی پڑے، ساقی نہیں)
اے مسافر اٹھ کر اب آہا چلی دن کی برات !
دھل چکا ہے خواب کا سحر حسین
اب نہیں یاں رات کی رانی نہیں
دیکھتی ہے مڑ کے تاریکی کی چشم دل نشیں !

چونک کر اٹھا مجھے محسوس کچھ ایسا ہوا
گرم پیشانی پہ کس کی سانس کا لمس حسین
اک سکون مستقل دینے لگا ؟
آج کی شب ہے سر بالیں پہ کون ؟
میند جب ٹوٹی تو کیا دیکھا دریچے کے قریب
شب کی تنہائی کے ہمدم چھالیہ کے پیروں
اور کچھ نہیں !

آنکھوں آنکھوں میں ہوئی تھی رات بھر جو مجھ سے بات
میرے ہمدرد آگئی گم گشتہ یادوں کی برات!
سوزِ شمع چشمِ دروں سے شب کی خاموشی میں جب
قطرہ ہائے اشک گر پڑتے تو یہ تھے ترے
یوں مجھے محسوس ہوتے جیسے ہو پتیم کا میرے سرد ہات!
جب بھی سن لیتا تری شاخوں کی دھیمی سی صدا
دل تڑپ اٹھتا کہیں اُس کی صدائے غم نہ ہو!
میں نے ان پتوں میں تحریکِ بنگاہِ نیم باز
اُس کی دیکھی ہے بہ صد شوقِ تمام
اُس کے جسمِ مرمر میں ہیں ہے ترے ہی جسم کا دکھش تناؤ!
سرِ سراہٹِ دہم تیری کہ جیسے ہوں اُسی کی سسکیاں
یہ جھکی شاخیں تری ہیں اصل میں آنچل مری محبوب کا
اور یہ ٹھنڈی ہوا تیری
کہ جیسے اس کی انگشتِ حنائی کا ہولس جانفزا!

ان خیالاتِ حسیں کی گو دین پھر آگیا خوابِ حسیں
میں نے پھر دیکھا سرِ بالیں تجھے
چپکے چپکے گرم پیشانی کو بوسہ دے گیا!

غالباً انجان پن میں پا کے تیرے ہاتھ کا لمسِ حسیں
ہاتھ میرے بھی بڑھے تھے
ہائے لیکن لاج کے مارے دریچے سے نہ آگے بڑھ سکے!
یہ دریچہ اب نہ شاید کھل سکے
رہگذر آوازِ دہی ہے کہ -
”اب وقتِ وداع آ ہی گیا!“

اس سے پہلے کہ خدا حافظ کہوں
دل یہ کہتا ہے تری باتیں سنوں
کچھ سناؤں تجھ کو اپنے من کی بات!

آہ لیکن جانتا ہوں تیرے من کا درد پاسکتا نہیں
تیرے من کی بات سن سکتا نہیں
جانتا ہوں ہم نہ ہوں گے آشنا
درد کے گیتوں سے دل دونوں کے تڑپیں گے سدا!

قلب کو تسکین گر ملتی ہے تیری دید سے
کیوں گراں گزرے دلِ محبوب پر؟
چشمِ گوہر بارے میری اگر تیرا جمال
مثلِ "سناج زرفشاں" چمکے تو کب میری خطا؟
تجھ کو پا کر گھر بساؤ بھٹکا نہیں
میں بناؤ بھٹکا نیا امیر، حسین!

تیری شناخوں پر کبھی شاید نہ بیٹھا ہے کوئی
تیرے پتوں کے جھبہ دکوں سے
نہ چہکا ہے کوئی طائر کبھی
تو اکیلا ہی رہا چپ چاپ آنکھیں وا کئے
سب دریکے بند تھے!
ہائے لیکن میں تری خاطر رہا ہوں رات بھر
مثلِ بسمل منتظر!
میں فدا تجھ پر مرے قلب و نظر!
میں نے ہی لکھی ہے تجویرِ محبت تیرے برگِ سبز پر
بس یہی ہے باعثِ تسکین و وجہِ زندگی
تجھ کو بھر دیکھوں نہ دیکھوں غم نہیں.....!

اے مرے محبوب تجھ کو دیکھ کر
پھر نہ جاگوں گاکبھی
رواقِ محفل کی خاطر پھر نہ آؤں گاکبھی
خاموشی کی اک نئی دنیا مری ہوگی
اکیلا! دھوپ تاپوں گا خیالِ یا میں کھویا ہوا!

اس سے پہلے کہ خدا حافظ کہوں
چاہتا ہوں تجھ سے پوچھوں اک سوال
چشم بوریوں سے کیا تو نے بھی دیکھا ہے مجھے
جس طرح دیکھا تھا میں نے یہ دریچہ کھول کر؟
شدت جذبات سے تپتے کبھی لہرائے کیا؟
چاندنی چھٹکتے گی جب رنگین آنچل سے ترے
اور دوڑے گا رنگوں میں تیری جب خونِ نشاط
تیرے دل میں عارضی جہاں کی باتیں اُس گھڑی
آئیں گی یاد؟

کیا تری سانسوں سے اس گھر میں بھی اٹھے گا دھواں
چاندنی سے کیا تری آنکھوں میں آئے گا خسار؟
کیا خیالِ یار میں تو بھی رہے گا گم سدا؟

تیرے پاؤں دفن ہیں مٹی میں اور اڑتی ہے خاک
سر پہ تیرے اک فضاٹے پیکراں
دھوپ میں تپتا ہے دن کو
شب کو شبنم میں ٹھہرتا ہے یہ جسمِ نازنین
آہ لیکن تاب اگر یہ بھی نہیں
تاب اتنی بھی کہ چلائے کبھی
موت کی ایون کھ کر کھو چکا ہے زندگی!
دل تیرا روتا نہیں جب اپنے دکھ کی ضرب سے
درد کیوں اٹھے گا تیرے دل میں میرے کرب سے

بھول جانا اگر کبھی آ جاؤں بھولے پن سے یاد
کھل اگر جائے دریچہ بند کر دینا ندیم
پاس کا جس کو نہ مٹی میں بھلا
آساں پر کس طرح آئے گا بات؟
(ڈھونڈنا اس کو عبت ہے، یہ ہے انہونی سی بات)

اظہارِ ریت

(مغربی ادب کی ایک اہم تحریک)

امین الرحمن

اسی دور میں ایک اہم شہور جرمن فلسفی، ایڈمنڈ ہسمرل منظرِ اظہار کے تصور کو ایک نئی مابعد الطبیعیاتی شکل مستعار دے کر منظرِ اظہار کو فلسفے کا ایک ہمگیر شعبہ بنانے میں مصروف تھا۔ اسی طرح جرمن مفکر تھیوڈور ویس نے بھی غریب نظریہ پیش کیا تھا جس کی رو سے بے جان اشیاء میں بھی جذبات کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ماہر نفسیات، فروید اپنے نودریافت نفسیاتی تجزیے کی مدد سے لاشعوبہ اور خوابوں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان تمام فلسفیانہ سرگرمیوں کا یوں ادب کے ہمعصر ادب اور فن پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اظہارِ ریت کی تحریک کے پیدا ہونے سے کچھ ہی عرصہ پہلے یورپ میں ادب اور فن کی دنیا میں فکر و خیال کی ایک نئی حقیقت کے اظہار کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔

اس نئی حقیقت کے اظہار میں صرف فلسفیانہ سرگرمیاں ہی کارفرمانہ تھیں بلکہ اس کے پس پردہ کچھ عمرانی و اقتصادی وجوہ بھی کارفرم تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے انجمنستان اور یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہو رہا تھا، اور اس کی وجہ سے مغربی زندگی بعض نئی اقتصادی اور تہذیبی قدروں سے متعارف ہو رہی تھی۔ اس سے مذہب، سیاست ادب اور فن کے اداسے بھی ان کے قدروں سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انہی قدروں کی وجہ سے مغرب کے لوگ زندگی اور اس کے تعلقات پر مادی نقطہ نگاہ سے غور و فکر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ روح اور جسم کا جو تعلق ایک ثنویت کی صورت میں آفریقہ سے چلا آ رہا تھا، اب اس تعلق کے ایک جزو پر تو زیادہ زور دیا جانے لگا مگر دوسرے کی

تاثریت کے بعد مغربی ادب و فن کی غالباً سب سے ہمگیر تحریک وہ ہے جو "اظہارِ ریت" کے عنوان سے معروف ہے۔ اس تحریک کو ہمگیر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس تحریک نے نہ صرف مغربی مصوری کے جدید رجحانات کا رخ موضوع اور میت کے اعتبار سے بدل دیا بلکہ اس تحریک سے جدید مغربی ادب کی ہیئت اور مایوبہ بھی ایک بہت گہرا اثر پڑا۔ یوں تو اظہارِ ریت کی تحریک کے آغاز سے پہلے مغربی ادب انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تاثریت، نوکلاسیکیت، اوندوایت جیسی جدید ترین تحریکوں سے متاثر ہو چکا تھا اور اس عرصے میں نہ صرف مغربی ادیبوں کا انداز فکر اور اندازِ اظہار اپنے پیشرووں سے بہت حد تک بدل چکا تھا بلکہ مغربی مصوری کے انداز اور اسلوب پر بھی ان جدید تحریکوں کا نمایاں اثر پڑ چکا تھا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ فکر و خیال کی وہ بڑی رجحانیں جو سولہویں صدی کی رومانیت اور فطرت پسندی سے پھوٹا تھا، انیسویں صدی کے آخری سالوں میں کئی اوجھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ چکی تھی۔ اگرچہ فکر و خیال کی ان چھوٹی چھوٹی شاخوں کا ایک مرکز پریسٹ آفٹن تھا تاہم ان کی وجہ سے ادب یا فن میں کسی بڑی تحریک کے سرچشمے کا پھوٹ پڑنا کچھ ناممکن بھی نہ تھا۔ کیونکہ ہمعصر فلسفے کی بدولت مغربی ادب اور فن میں نئی نئی تحریکیں پیدا ہو رہی تھیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اگر ایک طرف جرمنی میں نقطہ کے فلسفے کا بہت زور تھا تو دوسری طرف فرانسیسی (بیسویں صدی کے اوائل) برکٹن کا فلسفہ وجدان بھی کچھ کم مقبول نہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر اسی زمانے میں جرمن مفکر، ہارٹمین لاشعور کی مدد سے تعلقات اور لاتعلقی کے باہمی تعلق کی عنایت درپا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حامیوں نے تو اشتراکیت ہی کو انسانی زندگی کی غیر معنی سمجھا اور ایک ایسے عمرانی نظام کو دنیا میں رائج کرنے کی کوشش کی جس کا منشاد و منتہا محض انسان کی مادی فلاح و بہبود تھا۔

کچھ اس قسم کے فلسفیانہ اور عمرانی پس منظر میں اظہارِ ارادہ کی تحریک کے پینچے کے موقع پیدا ہو رہے تھے جو اپنی تمام ہمہ گیری کے باوجود یورپ کے ایک محدود حصہ میں شروع ہوئی۔ اب قریب قریب تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ اظہارِ ارادہ اپنی ابتداء اور انتہا میں ایک خالص جرمن تحریک تھی۔ جو وسطی یورپ کے ان حصوں میں شروع ہوئی جہاں جرمن زبان بولی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اظہارِ ارادہ کی ابتدا کا سرخ لگانے کے لئے اس تحریک کے نقاد عام طور پر پہلی جنگ عظیم سے پہلے کے جرمنی کی اس عام روحانی بے چینی کا جائزہ لیتے ہیں جو ۱۸۷۰ء کی جنگ جرمنی و فرانس سے پیدا ہوئی تھی۔ ۱۸۷۰ء کی اس جنگ میں اگرچہ فتح جرمنی ہی کو نصیب ہوئی تھی لیکن اس جنگ کے بعد جرمنی کے اندرونی حالات کچھ اس قسم کے ہو گئے تھے جس سے وہاں نہ تو معاشرتی قدیں برقرار رہیں اور نہ روحانی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی بڑی تیزی سے جدید مشینی صنعت کے میدان میں نرنی کر رہا تھا۔ ملک میں سرمائے کا پھیلاؤ زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ بڑی تیزی سے سیاسی طاقت حاصل کر رہا تھا۔ لیکن اس اقتصادِ دی اور سیاسی طاقت کے ساتھ ساتھ جرمنی میں سیاسی بحران بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ جن سے جرمنی کی سیاسی بنیادیں غیر مستحکم اور غیر محفوظ ہو گئیں تھیں۔ معاشرے پر ان سیاسی بحرانوں کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن معاشرے میں عام فرد کی حیثیت بالکل ڈالو ڈول ہوئے گی۔ عام فرد کی شخصیت کو نہ تو جرمن زمیندار "ہینک" جیسی جاگیر دارانہ فراغت ہی ارازی ہوئی تھی اور نہ اسے جدید صنعتی سرمایہ دار جیسا مالی استحکام ہی حاصل تھا۔ عام فرد کی اس ڈالو ڈول معاشرتی حیثیت سے ہم عصر جرمن ادیب اور فنکار بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں ادیبوں کی ایک ایسی لہر کا پیدا ہونا ضروری ہو گیا جو عام فرد کی اس معاشرتی حیثیت سے انتہائی غیر مطمئن تھے۔ یہ جرمن ادیب اپنے ملک کے

اہمیت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ روح کی اہمیت ختم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ مغرب کا انسان اپنی اس نئی میکائی تہذیب میں خود ایک مشین بن کر رہ گیا تھا۔ اس نئی میکائی تہذیب میں مذہب کی حیثیت بڑی سطحی اور ثانوی سی رہ گئی تھی۔ ایسویں صدی میں ڈائمنڈ اور کھلے وغیرہ نے حیاتیات میں جو بنیادی تحقیقی کام کیا تھا اس سے انگشتان اور یورپ کے مذہب بنیادوں کو بڑی تقویت پہنچی۔ اور انگلستان جیسے نسبتاً قدامت پسند ملک میں بھی عقلیت کی ایک اچھی خاصی تحریک چل نکلی۔ اس کے علمبرداروں نے جدید سائنس کے اکتشافات کی رو سے جن میں نظریہ ارتقا کو خصوصیت سے بہت بڑا دخل تھا انجیل اور انبیاء کے معجزوں کو اپنی عالمانہ اور منطقیانہ تنقید کا ہدف بنایا۔ اس سے عیسوی کلیسا کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ جن باتوں کو لوگ پہلے مذہبی اعتبار سے روحانیت اور نصوٹ پر محمول کرتے تھے اب انہیں مکمل کھلا جہالت اور توہم قرار دیا جانے لگا۔ ماہرین نفسیات نے اعصاب کے افعال کا بغور مشاہدہ کر کے یہ ثابت کیا کہ جن ذہنی وارداتوں کو ہم روحانی تجربہ کہتے ہیں وہ دراصل اعصاب کے بعض خاص قسم کے افعال کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس کی حقیقت علت و معلول کے اصول میں مضمر ہے نہ کہ کسی روحانی عمل میں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ روحانی تجربے کی بنا پر مذہب اور نصوٹ نے جن واجباتِ تعظیم روحانی قدروں کی ترویج کی ہے وہ دراصل ایسے نفسیاتی اصولوں پر مبنی ہیں جن کی صلی توجہ ممکن ہے۔ اسی طرح طبیعیات میں ذرے کی حقیقت معلوم کرنے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں ان کی وجہ سے مادہ اور توانائی میں ایک قابلِ تشریح تعلق درپا ہونے کی امید بھی بندھ گئی تھی جس کا قدیم مادہ یا حدوث مادہ جیسے مذہبی اور باعقل طبیعیاتی مسئلوں پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ اس دور میں سیاسیات میں بھی بہت سے نظریے دریافت ہوئے۔ ہیکل کے فلسفہ جدیدیات کو مارکس نے ایک خاص عمرانی مفہوم عطا کیا۔ اور اس کے ذریعے سے تاریخ اور اقتصادیات کی ایک نئی توجہ بھی پیش کی گئی اشتراکیت نے بہت سے لوگوں کی جن میں خواص اور عوام سبھی شامل تھے، بہت متاثر کیا۔ مارکس کے

کیونکہ یہ تحریک جواں سال جرمن پود کی خواہشوں، حسرتوں اور بے اطمینانیوں کا ایک دالہ نہ اور پرورش اظہار تھی اور اسی لئے اس تحریک نے جرمنی کے ان جواں سال ادیبوں کے لئے اپنے ملک کے معاشرتی اور سیاسی حالات پر غور کرنے کا موقع بہم پہنچایا تھا۔ جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جرمن ادب میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ چنانچہ تحریک اظہارِ ریت کے تمام نقاد اب اس بات پر متفق ہیں کہ ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ جواں سال جرمن ادیبوں نے شعوری طور پر جرمن ادب میں ایسے عناصر شامل کرنے شروع کر دیے تھے جنہیں بعد میں اظہارِ ریت کا نام دیا گیا۔ اور جو ۱۹۲۰ء کے قریب باقاعدہ طور پر جرمن ادب کا جزو لا ینفک بن چکے تھے۔

اظہارِ ریت کی ادبی تحریک کے مقاصد کیا تھے اور انہیں پورا کرنے کے لئے کیا انداز اختیار کیا گیا تھا۔ ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ اظہارِ ریت ادب اور فن کی کئی اور مغربی تحریکوں کے مانند کوئی ترسٹی ترشائی واضح اور باقاعدہ تحریک نہیں ہے۔ بلکہ اسے ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک کے بہت سے جرمن ادیبوں کے فکر و خیال کا ایک ہیونی کہنا چاہیے۔ اظہارِ ریت کی تحریک کے آغاز کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اظہارِ ریت کی اصطلاح پہلے پہل کب وضع ہوئی۔ چونکہ اظہارِ ریت کی تحریک کا پہلے پہل مصوری میں آغاز ہوا اس لئے بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے اظہارِ ریت کی اصطلاح کا مصوری ہی پر اطلاق کیا گیا ہوگا۔ ایک جرمن نقاد کوہن کے کہنا ہے کہ تحریک اظہارِ ریت نے واضح طور پر ۱۹۱۰ء میں جنم لیا تھا۔ چنانچہ ہمیں اظہارِ ریت کے آغاز سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے اس سال سے آگے نہیں جانا چاہیے۔ اور نہ ہمیں اس اصطلاح کے ادبی یا اصطلاحی استعمال کو اس سے پہلے تلاش ہی کرنا چاہیے۔ کوہن نے پکاسو اور کاندینسکی کے فن پر اظہارِ ریت کی اصطلاح کا اطلاق کیا ہے جو ۱۹۱۰ء کے قریب جدید طرز کی تصویریں بنا رہے تھے۔ کچھ نقاد یہ بھی کہتے ہیں کہ خود کاندینسکی نے ۱۹۱۰ء کے قریب اظہارِ ریت کی اصطلاح مصوری کے جدید رجحانات کو موسوم کرنے کے لئے وضع کی تھی۔ لیکن ایک اور جرمن نقاد بیڈنگ کے رائے میں اظہارِ ریت

سیاسی سطح نظر سے بھی کچھ مطمئن نہ تھے جو اس زمانے میں دراصل ایک سیاسی جمہوری دور سے گزر رہا تھا۔ جرمنی کا یہ جمہوری دور بھی عجیب دور تھا۔ اس دور میں جرمنی کا دانشور طبقہ تین گروہوں پر مشتمل تھا۔ ایک گروہ فائلڈنگ آچکا تھا۔ دوسرا گروہ حال سے مطمئن نہ تھا اور تیسرا گروہ جو ابھی پیدا ہوا تھا بے دست و پا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی عام فضا بددلی، بے چینی اور بے اطمینانی کا ایک کھلا ہوا اظہار تھی جو پہلی جنگ عظیم کے شروع ہوتے تک موجود رہی۔

پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے سے چار سال قبل یعنی ۱۹۱۰ء میں جرمن عوام کی زندگی، فن اور ادب کو تیزی سے بدلتی ہوئی قدروں میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔ جرمنی کے نئے صنعتی معاشرے میں جرمن تہذیب کی پرانی قدروں اور پہلے معیاروں کو جو زمانے کے جدید تقاضوں کی نفی کرتے تھے، مٹایا جا رہا تھا۔ اور اس معاملے میں کسی قسم کا شخصی احترام ملحوظ نہ رکھا جاتا تھا۔ یہ حال ایک نئے قسم کے جرمن ادب کو جنم دینے کے لئے بہت سازگار تھے۔ جرمن ادب ابھی تک گذشتہ صدی کی دو تحریکوں یعنی تاثریت اور نقد و مابینت سے متاثر تھا اور جواں سال جرمن ادیب ان تحریکوں کو جدید تقاضوں کی کسوٹی پر پرکھ رہے تھے۔ نورمانٹ کے پیر ابھی تک یہ کوشش کر رہے تھے کہ ادب میں زندگی کے اس حسن اور تخیل کو برقرار رکھا جائے جو ہر زمانے کے انسان کو اپنے لمحات حسرت و غم میں درکار ہوتا ہے اور جس کے بغیر زندگی انہی تمام خارجی حقیقتوں کے باوجود نامکمل رہتی ہے لیکن اس قسم کی نقد و مابینت کا عہد اپنے تمام خوبصورت اور دلآویز مقاصد اور عزائم کے باوجود ختم ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے دس برسوں کی زندگی مشینی دور کی کڑی حقیقتوں اور شدید آلائشوں سے دوچار تھی۔ ادھر جنگ اور جنگ کی انواہوں نے اس نورمانی ادب کی طمانیت آمیز فضا کو مضطرب کر رکھا تھا۔ چنانچہ حیب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو جرمن ادیبوں کے ہاتھ میں اظہارِ ریت کی صورت میں پہلے ہی سے ایک بہت مؤثر ہتھیار موجود تھا۔

اظہارِ ریت کو دراصل نورمانوں کی تحریک کہنا چاہیے

کی اصطلاح ۱۹۱۵ء سے پہلے تحریر و تقریر میں استعمال ہی نہیں ہوئی۔ اس کا کہنا ہے کہ کتابوں، رسالوں، اخباروں اور پمفلٹوں وغیرہ کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۱۹۱۳ء سے پہلے اظہارِ ریت کی اصطلاح شاید کسی ایسے مضمون کے عنوان کے طور پر استعمال کی گئی ہوگی جس میں مصوری یا ادب کے ان رجحانات کا ذکر ہو جو ۱۹۱۶ء سے پہلے شروع ہو چکے تھے۔ لیکن ایک اور جرمن نقاد فرٹس کاپ نے لکھا ہے کہ اظہارِ ریت کی اصطلاح فرانس میں مائیس کی تصویروں کی ایک نمائش کے موقع پر ۱۹۰۱ء میں وضع کی گئی تھی۔ چنانچہ اب بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ مصوری میں اظہارِ ریت کی اصطلاح کم از کم ۱۹۰۱ء سے تو ضرور استعمال ہو رہی ہے۔ جہاں تک اظہارِ ریت کی اصطلاح کو ادبی مفہوم مستعار دینے کا تعلق ہے۔ ایک جرمن نقاد اولڈر لینڈ کا نام لیا جاتا ہے۔ اس نقاد نے ۱۹۱۱ء میں ایک اور جرمن نقاد ہولتس کے ایک نظریے سے جو شاعری میں لٹریچر اور جوئے متعلق تھا اختلاف کرتے ہوئے لفظ ایک مضمون میں اظہارِ ریت کا لفظ پہلے پہل ایک ادبی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جرمن نقاد سوسٹیگرل کی رائے ہے کہ جرمن ادیبوں میں ۱۹۱۰ء سے پہلے (اور اس نے اس مدت کا تعین تقریباً بیس سال کیا ہے) ایسے میلانات کا سراغ ملتے ہیں جنہیں بُری آسانی سے اظہارِ ریت کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے۔ لیکن سب سے پہلے اظہارِ ریت کی اصطلاح کو ایک نہایت ڈھیلے ڈھالے مفہوم میں ان لوگوں کا جرمن ادیبوں کی تحریروں پر چسپلا کیا گیا جو ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک جرمنی کے معاشرتی مسائل پر نظم، ناول یا ڈرامے کی صورت میں کچھ نہ کچھ کہتے رہے تھے۔

بعض نقادوں کی رائے ہے کہ اظہارِ ریت کی اصطلاح فرانس میں جرمنی کے مقابلے میں بہت پہلے رائج ہو چکی تھی۔ وہاں کے نقاد دو کسال نے فرانسیسی زبان میں اس اصطلاح کے رائج کرنے میں نمایاں کام کیا ہے۔ لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ جرمنی میں یہ اصطلاح ۱۹۱۱ء کے بعد یعنی ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں مکمل طور پر رائج ہو چکی تھی یعنی ایک ایسی بے نام تحریک کو جو پہلے ہی اپنے عنوان میں تھی اظہارِ ریت کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اور یہ کسی بہت ہی لطیف نقاد کا کام دکھائی دیتا ہے۔ اظہارِ ریت کی اصطلاح سے کیا مراد لی جاتی ہے؟ یہ سوال خاصا ٹیڑھا ہے کیونکہ بعض نقادوں کی رائے میں اظہارِ ریت کی اصطلاح بھی "رومانیت کے مانند بڑے ڈھیلے ڈھالے مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے۔ اور جو ابہام رومانیت کی اصطلاح سے وابستہ ہے کچھ اسی قسم کا ابہام اظہارِ ریت کی اصطلاح میں بھی نظر آتا ہے کیونکہ ان نقادوں کی رائے میں فنون لطیفہ کے مختلف اصناف پر جن میں ڈرامہ، شاعری، مصوری اور موسیقی وغیرہ کے پیشوا نمونے شامل ہیں بغیر سوچے سمجھے اظہارِ ریت کی اصطلاح اطلاق کیا گیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو اظہارِ ریت کی اصطلاح میں خواہ مخواہ غیر ضروری معنوی گنجائش پیدا کی گئی اور دوسری طرف اظہارِ ریت نمونوں کی کثرت سے فائدہ اٹھا کر اس تحریک کو فنی اور ادبی لحاظ سے ہم گیر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ نقادوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے اظہارِ ریت کے دائرے میں ہر شے کو شامل کرنا شروع کیا تاکہ اس تحریک کو ہم گیر ثابت کیا جاسکے۔ مثلاً اس تحریک کا معنوی تعلق قدیم یونان اور روم کے کلاسیکی فکر سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔ ترون دسٹی کے یورپ کے طور طریقوں اور فکر و خیال کے بارے میں جو تحریک جماعتیت کے نام سے بعد کے زمانوں میں چلی اسے بھی اظہارِ ریت کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اٹھارہویں صدی میں جرمن ادب میں جو تحریک "طوفان و فساد" کے نام سے شروع ہوئی تھی اسے بھی اس تحریک کے منوازی سمجھا گیا اور رومانیت کی تحریک کا تو خیر اظہارِ ریت کے ساتھ کئی باتوں میں اکثر مقابلہ کیا جاتا ہے۔

اظہارِ ریت پسندوں کے ایک طبقے کی رائے ہے کہ یونان کی ان تمام ماضی کی تحریکوں اور اظہارِ ریت کے درمیان کئی باتوں میں مشابہت موجود ہے، لیکن اظہارِ ریت کو ایک ہم گیر تحریک ثابت کرنے کی کوششوں نے اس تحریک کو نہ صرف ڈھیلے ڈھالے کر دیا۔ بلکہ اس میں ایک ایسا تضاد بھی پیدا کر دیا جس سے اس تحریک کے منشاء و عمل میں بہت حد تک تفاوت پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جرمن نقاد ڈیوٹر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

کوئی بھی ایسی کوشش جس کا مقصد اظہاریت پسندوں کے محض نفرت یا اس نظریے کے عملی اطلاق کی مدد سے اظہاریت کی کوئی تعریف وضع کرنا ہے، بیکار ہوگی کیونکہ اس سے اس تحریک کے ہائے میں مکمل طور پر وہ شواہد پیش نہیں کئے جاسکتے جن کی اس ضمن میں ضرورت پڑتی ہے۔

بہت سے عقائد اظہاریت کی ادبی تحریک اور مصوری کی تحریک میں کوئی خاص فرق قائم نہیں کرتے۔ اور اس تحریک پر کسی خاص فن کے حوالے کے بغیر بحث کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک مسئلہ امر ہے کہ مصوری کی تحریک اظہاریت نے بعد کی ادبی تحریک پر اثر ڈالا۔ مصوری میں اظہاریت کا پہلے ہی سے ایک باقاعدہ نظریہ موجود تھا جسے اظہاریت کی ادبی تحریک کے علمبرداروں نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ادبی اظہاریت کا نظریہ مصوری کی تحریک اظہاریت کے اس قدر قریب ہے کہ ان دونوں کی مماثلت کو کسی اتفاق کا نتیجہ کہنا غیر منطقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصوری کی تحریک اظہاریت کو سمجھنے کے بعد ہی ادبی اظہاریت کی تحریک کا باقاعدہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اظہاریت سے پہلے مصوری کی سب سے بڑی تحریک تاثریت تھی۔ تاثریت دراصل مظاہر قدرت یا دوسرے غظروں میں خارجی دنیا کے حقائق کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے کینوس پر پیش کرنے کا ایک طریقہ کار تھا۔ تاثریت سے پہلے فطرت پسند مصور کینوس پر خارجی دنیا کے صرف ان حقائق کا ہیرو غماز کھینچ دیتے تھے جو ان کے ذاتی مشاہدے میں آتے تھے۔ ان کا طریق کار عکاسی کا طریقہ کار تھا۔ تاثریت پسند مصوروں نے اس طریقہ کار میں چند بنیادی تبدیلیاں بھی پیدا کر دیں اور خارجی دنیا سے اپنا تعلق بھی نہ توڑا لیکن اس کے برخلاف اظہاریت پسند مصوروں نے مشاہدے میں آنے والی حقیقت سے جان بوجھ کر گریز کیا۔ اور خارجی دنیا کی جگہ ایک داخلی تخلیق کی۔ جیسا کہ جرمن نقاد مرزلسکی نے لکھا ہے کہ "اظہاریت وہ پہلی فن ہے جس نے فی الحقیقت مشاہدے میں آنے والی حقیقت سے گریز کیا ہے۔ اور فن نے مشاہدہ کی جگہ داخلی حقیقت کی نقائی کرنا چھوڑ دیا۔ اور اس حقیقت

اظہاریت کا فلسفیانہ پہلو ٹریسچیدہ اور بہت حد تک مبہم بھی ہے کیونکہ ہر اظہاریت پسند ادیب اور نقاد نے اس ضمن میں فلسفیانہ موٹسنگا فیاں کی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان نقادوں کی تحریک اظہاریت پر لکھی ہوئی بیشمار تحریروں میں سے حشو و زوائد کھال کر ان کا ایک خلاصہ یا انتخاب کر لیں تو ہمیں اظہاریت کے ادبی منشا کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی اظہاریت کی معنوی ہیئت ترکیبی جن اجزاء پر مشتمل ہے ان میں سے چند یہ ہیں :

۱: انا کا کشف و فروغ : دنیا ہر فرد و حادثات کی خود تخلیق کی ہوئی ہوئی ہے۔ داخلی دار و اتوں کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ خارجی حقائق سے مماثل ہو جائیں۔ (اضداد کی کشمکش)

۲: لاشعور : ہم احساس یعنی بے جان اشیاء کا انسانی جذبات سے یا ذہنی کیفیات متعارفینا۔ وجدان، ناسخ یعنی خارجی حقائق کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنا۔ (خفاقی کی رویائی نوعیت)

۳: روح اور نفس : احساس رفتی تخلیق کے وقت سرور کی کیفیت۔

۴: مذہب، خدا کی تلاش، قضا و قدر سے جنگ۔ (ماوراء فطرت یا خرقی عادت)

۵: انسان کی عظمت، انسان کی قدر و قیمت، ایک روحانی

اخوت (انسانی قدروں کی از سر نو تشکیل)۔

ظاہر ہے یہ کسی بہت ہی جامع تحریک کا لائحہ عمل ہی ہو سکتا ہے جو ویسے تو صرف دس برس تک جاری رہی مگر اس کی نمود و نمونہ کم از کم ترقی صدی تو ضرور صرف ہوئی ہوگی جب ۱۹۲۲ء کے قریب تحریکِ انہادیت ختم ہوئی تو اس زمانے کے نقادوں نے اس تحریک کی ہیئت ادبی "کا سرانجام" ماضی کے جرمن ادب اور زندگی میں لگانے کی کوشش کی۔ خود اس تحریک کی زندگی میں جو تنقیدی ادب شائع ہوا اس میں اس تحریک کا وشتہ ماضی سے خاص طور پر ثابت کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ جو من ادیب ہرمان ماہر نے جب ۱۹۱۶ء میں انہادیت پر اپنی کتاب شائع کی تو اس میں اس نے اس تحریک کے ضمن میں عموماً کا بار بار اس انداز میں ذکر کیا گویا وہ اس تحریک کا رد و

جدا علی ہو۔ لیکن بعد کے زمانے کے کثر نقادوں نے گوتے کے نام کو اس تحریک سے بالواسطہ یا بلاواسطہ وابستہ کرنے کی مخالفت کی۔ بہر کیف، اس میں کوئی شک نہیں کہ گوتے کے علاوہ جرمن فکر کے جدید دور میں چند ایسی شخصیتیں ضرور موجود ہیں جنہوں نے فی الواقع انہادیت کی تحریک کے فروغ کے لئے ایک نہایت کامیاب بیسٹو علمی پس منظر تخلیق کیا انہادیت کے اس علمی پس منظر کو سمجھنے کے لئے میکس ویر، اول فٹن، میکس شیلر، سٹیل، وورنگر اور ہرل جیسے جرمن مفکروں کی تحریروں کا مطالعہ ناگزیر ہے کیونکہ یہی لوگ جدید ترین ادب اور فکر کے بانیوں میں سے ہیں۔ اور انہادیت کی تحریک جدید جرمن ادب اور فکر کی ایک اہم شاخ ہے۔

★

سزا

صہبا اختر

کس تقدیر نے

غم کی دوہری زنجیروں سے

مجھ کو مجبوری کی چٹان سے باندھ رکھا ہے

روزِ عقاب اندھیروں کے میر بھی کلیجہ کھاتے ہیں

میں بھی پروتھیس کا سینہ رکھتا ہوں

لیکن مجھ پر آگ چرا لانے کا بھی الزام نہیں

پھر یہ کیا ہے

کون سی نیکی کی یہ سزا ہے

فلاح وطن، قومی یکجہتی اور تعم
ترقی کی راہیں :

مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوا
سے براہ راست خطاب اور حل مسائل
کی تدبیریں

(لائل پور میں ایک مہتمم بالشان
عوامی جلسہ سے خطاب)



خوراک اور خوراک : گنگا کو باڈک (مشرقی پاکستان
کا منصوبہ ترقی - گندم کی ترقی یافتہ فصل کا معا



”دعیا“ ساتھ لائے : الحاج سید امین الحسینی، مفتی اعظم فلسطین
کی طرف سے ایک نادر نسخہ قرآن پاک کی پیشکش

ی پاکستان کی متوازن ترقی : ڈھاکہ میں نئے جنرل پوسٹ آفس کی نو تعمیر عمارت کا افتتاح





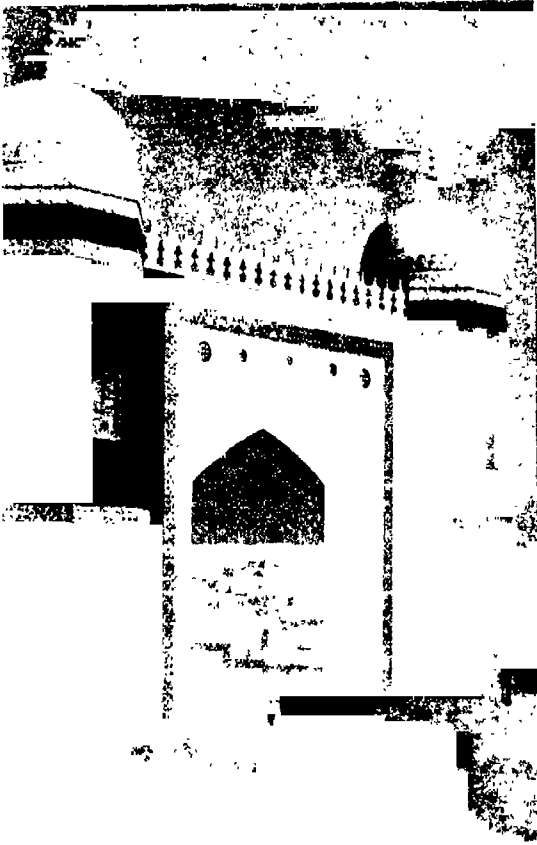
دنیا کے سب سے کم عمر جرنل، محمد بن قاسم کی سرکردگی میں عربوں کی فوجی سپہم نے سب سے پہلے دیبل، موجودہ بھنبور، (نزد دراجی) سرزمین پر قدم رکھے۔ یہاں ایک مسجد اور اسلامی بستی کے آثار برآمد ہو چکے ہیں۔

اُترا ترے گنوارے جب کارواں ہمارا

ہر صغر میں سب سے پہلا درواں ملت سرزمین سندھ پر ہی اترتا تھا۔
دراجی کے بالکل نزدیک دیبل کے مقام پر، حو اب بھنبور کہلاتا ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ قریب سے دراجی کو "باب الاسلام" بھی کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے ہی دریائے سندھ کو "سہران" کے کنارے اور با معنی
نام سے یاد کیا۔ اسلام نے ہی یہاں لوگوں کو وحدت الہی کی صحیح تعلیم
دی اور اس کے مطابق نئے آداب حیات سکھائے۔

ماضی میں وادی سندھ کی تہذیب زبردست علاقوں تک محیط تھی اس
لئے ہماری ثقافت کے آثار جا بجا ملتے ہیں۔ اس دور میں بھی سندھ کی قریبی و
عظمت میں اضافہ کرنے کے لئے ہر طرح کے وسائل سے نام لیا جا رہا ہے۔



حدید : دریائے سندھ پر ایک جدید آہنی پل - (روہڑی)

قدیم • عظمت، شہرہ کی ایک علامت - (قر قندہ) • (نزد دراجی)

”تخلیق کی آگ“

ضمیمہ علی بدایونی

آہ پایندہ نہیں

لذت و کیف کا یہ ہنگام جلیل

وہ فطرت کے اس گریز یا حسن کا زیادہ دیر تعاقب نہ کر سکا۔ اور فطرت کو ایک نئے اصول یا پیدائش سے آشنا کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ فن کی پیدائش اس خواب کی مثبت تعبیر تھی۔ یہ تعبیر فطرت کے لئے بہت ہولناک تھی۔ اس کا چہرہ صبح داغدار نظر آنے لگا۔ اور اس کا انتشار انسان پر آشوب ہو گیا۔ اس کا مطلق و تنہا وجود اضافی حیثیت میں نمودار ہوا۔ وہ محض ایک ذریعہ ثابت ہوئی، ایک طاق جس میں انسان نے اپنی عظمت کا چراغ روشن کیا۔ اسی لئے فراتر کا نکالنے فن کو ایک ایسی آگ کے نام سے پکارا جس میں اشیا جل کر دوبارہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ یعنی اس دنیا کو جس میں خدا کی زمین اور اس کا نیلا آسمان موجود ہے۔ اسے جلا کر ایک نئی دنیا پیدا کی جائے جس پر اس کی اپنی تخلیق کی ہر شے ہو۔ فن کی ماہیت کے متعلق کا نکال کا یہ بیان کافی غور و خوض کی دعوت دیتا ہے۔ اور کئی کتابوں پر بھاری ہے۔ تخلیق عمل کی اندرونی ماہیت ان مختصر غظوں میں موجود ہے۔ کا نکال کی عظمت کے ثبوت کے لئے اس کا یہ قول کافی ہے۔ سیزان نے کہا تھا فطرت خطوط سے جاری ہے اور سیزان کے اس قول کو فن کی ماہیت کے متعلق اس کے بعض مداحوں نے جامع ترین بیان قرار دیا لیکن کا نکال کا یہ بیان سیزان کے قول پر یقیناً ایک اضافہ ہے۔ کیونکہ فطرت گو خطوط سے جاری ہے لیکن اشیا سے جاری نہیں۔ سیزان اپنی تعریف میں قلب ماہیت کے اسرار زائل کو دسمتھ سکا۔ ”خط“ بیشک فطرت میں اجنبی اضافہ کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ لیکن فطرت کے بغیر فطرت میں اجنبی اضافہ اسی طرح ممکن نہیں جس طرح عدم کے بغیر حق کا وجود محال ہے۔ فن تخلیق اس مجموعہ

زمین کے گرد و پیش میں روشن اجسام کا رقص و خرام کیا دکش نہیں۔ یا آسمان کی روئے نیلگوں میں شفق کا گلابی حاشیہ دلپذیر نہیں۔ یا وہ روشن دائرہ دکش نہیں جس کی فیاض اور گرم شعاعوں نے زمین کو زندہ کی کا تحفہ دیا۔ یا زمین کی آغوش میں بسنے والے قطار اندر قطار لالہ گل اور سرسبز انسانی آنکھ سے محبت کا کوئی مطالبہ نہیں کرتے۔ یا سمندر کی بے کل روح کا وہ نغمہ لازوال ہوش رہا نہیں جو موج کے مضرب سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں کوئی چیز غیر دکش، غیر دلپذیر اور بد صورت نہیں۔ انسان نے فطرت کے حسن کو ہمیشہ شدت سے محسوس کیا ہے۔ جہاں ایک طرف وہ فطرت کے بے رحم اور ہولناک قوانین سے خائف اور شاکہ کی رہا وہاں دوسری طرف اس کے نظر افراد حسن و جمال کا بھی تخیل رہا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کو حسین اور دکش تسلیم کرنے کے باوجود وہ اس کے ان نعمت ہائے بوقلموں سے اس قدر جلد کیوں اکتا گیا کہ اسے زیادہ دکش اور زیادہ ہوش رہا نظاروں کی ضرورت پیش آئی۔ اور فن کی تخلیق کرنی پڑی۔ وہ فطرت کے حاکم کردہ حسن اور برت پر کیوں نہ قانع رہ سکا۔ اور اس سر کو جو قرنہا قرن سے فطرت کے استاد جمال پر سجدہ ریز تھا اسے اٹھانا پڑا اور اپنے ہی آستانہ پر سر بسجود ہو گیا۔

جیل تربیں گل و لالہ فین سے جس کے

نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو

اس کی جہ شاید یہ ہو کہ فطرت کا حسن اس کا اپنا حسن نہ تھا۔ وہ اس سے اپنی تخلیق کی مانند پیار نہیں کر سکتا تھا۔ فطرت کا حسن اس کے تابع نہ تھا۔ وہ اس کی پذیرائی کے برگ و ساز سے فارغ بھی نہیں ہونے پا تا تھا کہ وہ اپنا رخت سفر باندھ لیتا۔ اور مردہ کی سے روانہ ہو جاتا اور وہ زیر لب نالہ کش ہو جاتا۔

کی حیثیت رکھتی ہے جو بحر بیگناہ کے بطن سے نمودار ہوتی ہے گواس کا وجود منفرد ہے لیکن قائم بالذات نہیں سمندر کی سطح سے اس کی وابستگی ناگزیر ہے کیونکہ :

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
میر تقی میر نے گلچیں کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا :

گلچیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
نخستہ جگر پڑے ہیں نہیں برگہائے گل

اس شعر میں میر نے گلشن اور گلشن فن کا فرق ظاہر کیا ہے۔ گلستانِ فطرت بھی حسن و خوبی کا ایک منظر ہے۔ لیکن انسانی سے اس کا رشتہ خارجی ہے۔ برخلاف اس کے فن کا باغ ایک داخلی رشتہ کا حامل ہے۔ اس میں فنکار کی اپنی روح کا عکس موجود ہے۔ اس شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ فنکار ایک حد تک فطرت کے نقش قدم پر چلنے سے مجبور ہے۔ لیکن حقیقت کی سرحد بھلانگ لینے کے بعد وہ تخلیق کی پراسرار فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ اور فطرت کی یکسانیت اس کے سراغ میں ناکام رہتی ہے۔ گلچیں کو سمجھ کر چنے کا مشورہ اسی لئے دیا گیا ہے کہ یہ باغ جو فنکار نے اپنے خون سے سینچ کر تیار کیا ہے، فطرت کے حقیقی باغ سے کسی قدر مشابہ ہے۔ اسی لئے بودیہ نے فطرت کو لغت کے نام سے پکارا۔ فطرت فن کی لغت ہے جس طرح زبان محض لغت نہیں ہوتی لیکن لغت کے بغیر بھی اس کا وجود ناممکن ہے۔ کافکا کے قول میں فنی تخلیق کے متعلق دو بنیادی نکات موجود ہیں۔ ایک یہ کہ فن فطرت کی عکاسی نہیں ہے اشیاء کو مجسمہ پیش نہیں کرتا بلکہ فنکار پہلے اشیاء کو تباہ کر دیتا ہے اور دوسری بات یہ کہ اشیاء کو تباہ کر دینے کے بعد وہ انہیں کی خاک سے ایک نیا جہل پیدا کر دیتا ہے اس لئے یہ تباہ کاری اور باز آفرینی کا مشترک عمل ہے۔ اسی لئے کافکا نے اس کو آگ سے تشبیہ دی۔ آگ جہاں ایک طرف تباہی ویراں بادی کا نشان ہے وہاں دوسری طرف فرینش اور حیات کی بھی منظر ہے۔ یہ آگ بخشش کا آزاد عمل ہے۔ اشیاء کی ساری بد صورتی بے آہنگی اور ان کا انتشار موزونیت و نظم کی بدحواسی لیتا ہے۔ اس طرح ان کا وجود توبائی رہتا ہے لیکن ایک انقلاب سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ انقلاب اسی آتش سوزی کا اجماع ہے جسے کافکا نے فن کہہ کر پکارا ہے۔ فطرت کی ساری بد صورتی اسی آگ میں حل جاتی ہے آگ کے اس پہلے عمل کو مارٹن ہیڈیگر فطرت کی تباہی و زوال کے نام

سے پکارتا ہے۔ یہ عمل فطرت کو تباہ کرتا ہے۔ جلاتا ہے اور زوال کی طرف لے جاتا ہے۔ اور دوسرا عمل جو تعمیری اثرات کا حامل ہے وہ فطرت کو پیدائش، افزائش اور زیبائش سے روشناس کرتا ہے۔ اسی لئے ایک صاحب نے آرت کو فطرت کی تخلیق کے نام سے پکارا۔ فطرت کی تخلیق کے معنی ہرگز یہ نہیں ہوتے کہ فطرت موجود کے پہلو پر پہلو ایک نئی فطرت کی تخلیق کی جائے۔ بلکہ اس سے مراد فطرت کا علامتی اظہار ہے۔ جس میں انسان کی اپنی فکر اور اپنے معنی شامل ہوتے ہیں۔ یہ معنی اور فکر فطرت سے آزاد ہوتے ہیں انسان چونکہ فطرت سے بے نیاز ہو کر اپنی آزادی کا اظہار کر سکتا ہے، اس لئے آرت وجود میں آیا۔ اس سلسلہ میں مارٹن ہیڈیگر نے انسانی عظمت کے اس تابناک پہلو پر وافر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے نزدیک کائنات میں انسان ہی ایک ہستی ہے جو آگ کی کوش ہے۔ وہ کائنات اور اس کے بے معنی انتشار میں موجود ہے۔ یہ انتشار اس کی ذات میں بھی کارفرما ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں نظم و ترتیب کی بھی روح موجود ہے۔ جو چیزوں کو انتشار کا شکار ہونے سے بچا لیتی ہے۔ اسے ہیڈیگر "قربت" کے نام سے پکارتا ہے۔ انسان کو چیزوں کی قربت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اور اس قربت سے وابستگی کا اقرار۔ ایک دنیا کی تخلیق اور اس کے عروج سے اور اسی طرح ایک دنیا کو تباہ کرنے اور اس کے زوال سے ہوتا ہے۔ قربت کا لفظ یقیناً وحشت طلب ہے، دراصل یہ لفظ جرمن شاعر فریڈرک ہولڈرلن نے استعمال کیا۔ اس سے غالباً اس کی مراد یہ ہے کہ حقیقت اور اس کے لوازمات متعلقات کو تسلیم کیا جائے۔ حقیقی دنیا میں ہر وہ چیز موجود ہے جو مرتفع ہو کر فضا میں نمودار ہوتی ہے۔

اگر فنکار اشیاء اور شمولات فطرت کی پذیرائی کیلئے آمادہ نہیں تو وہ لذتِ تخلیق سے بھی بے بہرہ ہے۔ کیونکہ فن موجودات میں اضافہ کا نام ہے۔ لیکن اگر یہاں کچھ موجود ہی نہ ہو تو پھر اضافہ کا لفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اور فنی تخلیقات خود کو مٹا کر مٹنے میں کام لیں گی۔ اس لئے چیزوں کی موجودگی کا اقرار کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور فنی موجودات، حقیقی موجودات کے دوش بدوش چلتی ہیں۔ اور ان سے قربت و بیگانگی کا اقرار کرتی ہیں اور اس قربت کا اقرار کرنے کے بعد فنکار کی آزادی کا سرچشمہ بھٹ پڑتا ہے

اور فطرت کا طویل و بے معنی سکوت خلل پذیر ہونے لگتا ہے۔ سارے تیرے کیا خوب کہا ہے کہ فطرت جیوش اور فن جو گنگو ہے۔ فنی تخلیق کا لمحہ آزادی کا طویل ترین لمحہ ہے۔ یہاں انسان آزاد خلق اور فخر ہار ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا وجود اساس پاتا ہو کر زندگی اس اساس کو گنگوئے محض کے نام سے پکارتا ہے۔ اور ادب و شاعری کے بغیر زبان کا وجود ناممکن ہے۔ زبان انسانی آزادی کا مکمل ترین اظہار ہے۔ اس آزادی کا جس کی بیکراں آغوش میں انسان فطرت کی دوسری موجودات سے الگ پرواز کر رہا ہے۔ حقیقی زندگی میں حقیقت اور فطرت کے اصولوں کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن فنی تخلیق کے لمحہ میں انسان فطرت سے کھیل سکتا ہے۔ اس کی قلب ماہیت کر سکتا ہے۔ اور اپنی دنیا کو فطرت کے اٹل اور ناقابل تغیر قوانین سے آزاد کر سکتا ہے غالب کہتا ہے:

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
ہر گرد و لب سے چراغ رہنما را بایاں
ہر گرد و لب کو چراغ رہنما را بادیکنے سے فطرت کے حقیقی تعینات بکھر جاتے ہیں حقیقی زندگی چراغ بھی رکھتی ہے چراغ رہنما بھی۔ لیکن یہ چیزیں تخیل کی آنکھ سے جل اٹھتی ہیں۔ دھواں صاف ہونے کے بعد اب ہمیں کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ اب نہ وہ سورج وہ سورج نہ چراغ و چراغ ہے۔ بلکہ وہ کائنات کے زوال پذیر میلان کی علامتیں ہیں۔ اسی لئے پال کسٹلے فطرت کو فنا کا

اور فطرت کا طویل و بے معنی سکوت خلل پذیر ہونے لگتا ہے۔ سارے تیرے کیا خوب کہا ہے کہ فطرت جیوش اور فن جو گنگو ہے۔ فنی تخلیق کا لمحہ آزادی کا طویل ترین لمحہ ہے۔ یہاں انسان آزاد خلق اور فخر ہار ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا وجود اساس پاتا ہو کر زندگی اس اساس کو گنگوئے محض کے نام سے پکارتا ہے۔ اور ادب و شاعری کے بغیر زبان کا وجود ناممکن ہے۔ زبان انسانی آزادی کا مکمل ترین اظہار ہے۔ اس آزادی کا جس کی بیکراں آغوش میں انسان فطرت کی دوسری موجودات سے الگ پرواز کر رہا ہے۔ حقیقی زندگی میں حقیقت اور فطرت کے اصولوں کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن فنی تخلیق کے لمحہ میں انسان فطرت سے کھیل سکتا ہے۔ اس کی قلب ماہیت کر سکتا ہے۔ اور اپنی دنیا کو فطرت کے اٹل اور ناقابل تغیر قوانین سے آزاد کر سکتا ہے غالب کہتا ہے:

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
ہر گرد و لب سے چراغ رہنما را بایاں
ہر گرد و لب کو چراغ رہنما را بادیکنے سے فطرت کے حقیقی تعینات بکھر جاتے ہیں حقیقی زندگی چراغ بھی رکھتی ہے چراغ رہنما بھی۔ لیکن یہ چیزیں تخیل کی آنکھ سے جل اٹھتی ہیں۔ دھواں صاف ہونے کے بعد اب ہمیں کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ اب نہ وہ سورج وہ سورج نہ چراغ و چراغ ہے۔ بلکہ وہ کائنات کے زوال پذیر میلان کی علامتیں ہیں۔ اسی لئے پال کسٹلے فطرت کو فنا کا

POINT OF DEPARTURE کہا ہے۔ سا و تراود بلا قولے اس کو اس طرح کہا ہے کہ ادب کچھ نہ کہنے کی کوشش ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے سارتر نے لکھا ہے۔ حقیقی دنیا میں دو چیزیں موجود ہیں۔ کہن اور گھوٹا لیکن ادب کہتا ہے کہن کا گھوٹا اظہار ہے کہن کا گھوٹا حقیقت میں موجود نہیں ہے۔ کہن اور گھوٹا دو لفظ موجود ہیں جب یہ دو لفظ ملے تو کہن کا گھوٹا پیدا ہوا اس لئے ادب کو لفظوں کے جلنے کا عمل کہا جا سکتا ہے۔ لفظ چونکہ شے کی منقلب شکل ہے۔ اس لئے اسے بالواسطہ اشیاء کے جلنے کا عمل کہا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سارتر اور بلا شول بھی لافکا کے جلنے ہوئے تھے چارہ ہے۔ لافکا کی تعریف اس قدر جامع

”میں نے تجھے حسن کی تابندگی اور حیات ابدی کا تحفہ دیا کیا تو مجھے مردانہ بدصورت ہونے سے نہیں بچا سکتی“

ظاہر ہے موح کا بے رحم خرام اسے کیا جواب دے سکتا ہے۔ یہی کہ اس کا جواب اپنے فن میں ڈھونڈنا۔ جو فن مجھے زندہ رکھے گا وہ تجھے بھی زندہ رکھے گا۔ میری پشت پر فطرت کے ماضی اور اس کے گلوں قوانین کا زبردست دباؤ ہے اور میرے لئے ممکن نہیں کہ تجھے ڈوبنے سے بچا سکوں۔ اس سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری

کھنچ جاتا ہے۔ اسی شعور نے اسے فن، سائنس اور جملہ ذہنی فکری
ثمرات سے مالا مال کیا۔ زبان کی پیدائش بھی اسی شعور کا نتیجہ ہے۔
شعور کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس نے مظاہر فطرت کو نام و
اور اسی شعور ہی کے مطالبات نے اسے فطرت کی فنی تخلیق پر مجبور کیا۔
کا فکا کی تعریف میں شعور کی صاحت بھی موجود ہے۔ جب فن ایک ایسی
آگ ہے جس میں اشتہار جل کر دوبارہ پیدل ہو جاتی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ آگ
فطرت سے زیادہ طاقتور اور آ زاد ہے۔ کسی چیز کو تباہ کرنے کیلئے
یہ ضروری ہے کہ اس چیز سے زیادہ طاقتور ہوں۔ یہ تخلیق ہما کی آگ
ہے جو فطرت کو جلاتی ہے اور پھر پیدا کرتی ہے۔ اس لئے یہاں فن سے
زیادہ طاقتور و آزاد کوئی چیز نہیں جو تخلیق کی آگ روشن کرتا ہے۔
اور فطرت کو ایک نئے اصول پیدائش سے روشناس کرتا ہے ۛ

فنی کا دشمن سے حقیقت اور اس کے قوانین کسی قسم کا کوئی اثر
قبول نہیں کرتے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ آسان دکشن اور شفق حسین
ہے تو کیا آسان کی دکشی یا شفق کا چہرہ ہمارے اس نفع سے
کسی قسم کا کوئی اثر لیتا ہے اگر ہم یہ نہ بھی کہتے تو بھی اس کی موجودگی
میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ فطرت کی تشریں و آرائش انسان کے لئے نہیں
وہ خود کفنی ہے وہ بے نیاز اور سنگدل ہے۔ وہ انسان سے کتنی تم
کے تاشی یا تعریفی کلمات نہیں مانگی وہ تو بس موجود ہے اور اس کے
سوا کچھ نہیں جانتی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ موجود ہے۔ ایک پہیہ
ہے جو مسلسل گھوم رہا ہے ایک گولہ ہے جو مسلسل لڑھک رہا ہے۔
انسان کی بد قسمتی یا خوش قسمتی یہ ہے کہ اسے یہ معلوم ہے کہ وہ موجود
ہے اور ہمیں اس کے اور فطرت کے درمیان ایک خط امتیاز

★ ★ ★

ایسا روٹھا ہوا بھی کیا ہوگا کچھ اُسے بھی خیال سا ہوگا
خون دل ہو کہ شیوہ تسلیم ہم پر جو قرض ہے ادا ہوگا
رات کے اس سکوت کے پیچھے کوئی تو دل دھڑک رہا ہوگا
دن ڈھلا اس کا کچھ حساب کرو آج کس کس کا دل دکھا ہوگا

شوق سو جاؤ رات بھگ چلی

کون ایسے میں جاگتا ہوگا

رضی اختر شوق

پاکستان:

(دوش، امروز، فردا)

مرکزی و صوبائی کاہنہ تھے، سیاسی جماعتیں بھی موجود تھیں۔ یہ تھا کہ براہ راست عام انتخابات عمل میں نہ آسکے تھے اور وہ کن عنامر کی بدولت نہ آسکے تھے یہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ قومی اسمبلی کو ایک گورنر جنرل کے غفلان نے ہی توڑ دیا تھا، مگر ان باتوں کے باوجود ملک میں سیاسی آزادی — بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ضرورت سے زیادہ ہی آزادی — موجود تھی۔ ملک میں بے شمار سیاسی پارٹیاں تھیں، لیڈر تھے اور ہر جگہ جلسے، جلوس، نعرے، تھے۔ مگر ملک کا کاروان ترقی جہاں تھا وہیں رکا کھڑا تھا۔ کیونکہ یہ سب ظاہری باتیں تھیں قومی استحکام کا جسم اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس پورے ڈرامے میں شے شے صاحبان اقتدار — صاحبان حیثیت اور نام نہاد بڑے بڑے سیاستدان اپنا اپنا کارواں کر رہے تھے۔ مگر عام آدمی بالکل بے دست و بالکل بے بس، تماشائی بنا ہوا تھا۔ بلکہ اس ساری جنگ اقتدار اور اس ساری جنگ زرگری کا پیچھے بنا ہوا تھا۔ کیونکہ صرف سیاسی زندگی ہی نہیں ملک کی ساری سرگرمیاں، تجارت، کاروبار، صنعت، تعلیم، زراعت، و معیشت ہر چیز ہی بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، جسم سیاست کے ان مفاسد کو دودھ کرنے کے لئے ۱۹۵۸ء کا انقلاب کارگر حربہ ثابت ہوا اور آخر قری کے اس ڈرامہ پر پردہ گرا دیا گیا۔

چند سال تک ایک فعال اور آشفانے حال حکومت ملک کا نظم و نسق چلاتی رہی۔ اُدھر عوام نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ مختلف اصلاحات نے ہمیں بتایا کہ جمہوریت اگر صحیح طریقے پر چلائی جاتی تو اسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ ”جمہوریت“ کا یہ نعم البدل لوگوں کو بہت بھایا۔ مگر مفکر انقلاب خود اس بات کے حق میں نہ تھا کہ مارشل لا کو مستقل علاج سمجھا جائے۔ ملک میں احساس ندراری

قیام پاکستان کے بعد سے ہی ہم جمہوریت کا نام بھی سن رہے ہیں اور اس کے نمونے بھی علم و تجربے میں آتے رہے ہیں۔ ہمارے سابق حکمران ہمیں جس طرز جمہوریت سے آشنا کر گئے تھے وہ اپنی جگہ کوئی بڑی چیز تو نہ تھی مگر اس میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ ہمارے ملک کی ذہنی افتاد، ہمارے حالات و ظروف اور ہماری مخصوص ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ مغربی طرز جمہوریت ان ملکوں کو ہی زیادہ راستی ہے جہاں معاشرہ بالخصوص متوسط طبقہ، مستحکم و بانجبر ہو۔ مراد یوں سمجھئے کہ پارلیمانی طرز حکومت اور صدرانی نظام مملکت کے درمیان انتخاب کا سوال تھا۔ پارلیمانی طرز حکومت کو ہم کافی آزما چکے تھے اور یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ نا اہل سیاستدانوں اور معاشرہ دشمن عنامر کے ہاتھوں جمہوریت کس طرح بارتہ پچھا لطفال بن چکی تھی اور حالات نے ایسی منزل کو چھو لیا تھا کہ اس وقت صرف فشر فضا ہی کام دے سکتا تھا تاکہ جسم سیاست سے فاسد مادہ خارج کر کے نیا خون پہنچایا جاسکے۔ یہ ضرورت اکتوبر کے انقلاب نے پوری کی اور اصلاح احوال کے جوہر وسیلے ہم اپنے حالات کے مطابق اختیار کر سکتے تھے، انہیں بروئے کار لایا گیا۔ مگر ظاہر تھا کہ مارشل لا کی موجودگی یا جمہوریت کی عدم موجودگی کوئی مستقل حل نہ تھا اور نہ اس انقلاب کے ہوشمند مفکر کو ہی یہ بات پسند تھی کہ ملک کو ہمیشہ ہنگامی حالات سے دوچار رکھا جائے۔ اس لئے اُس نے شام انقلاب کو ملک سے جو وعدہ کیا تھا کہ جمہوریت جلد بحال کر دی جائے گی، اس کا لفظاً اور معنا ایفاء کیا۔

۱۹۶۷ء کے بعد کے حالات پر نظر ڈالئے تو ہمیں جمہوریت کے تمام لوازم موجود نظر آتے ہیں اور یہ الزام نہیں رکھا جاسکتا کہ پہلا جمہوریت کے فروغ و نشوونما کو کوئی موقع ہی نہیں دیا گیا۔ ملک میں کیا نہ تھا؟ قومی پارلیمنٹ تھی، صوبائی اسمبلیاں تھیں،

پیدا کرنے اور کاروان ترقی کو آگے بڑھانے کے لئے اس نے اپنے وعدہ کا ایفاء کیا بلکہ رضا کارانہ طریق پر اپنے تمام اختیارات حکمرانی عوام کی طرف بھر منتقل کر دیئے۔ جو شاید انقلابات عالم کی تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے!

مگر ساتھ ہی صدر ایوب کا اپنا ایک تصورِ مملکت بھی تھا، اور وہ یہ کہ جو بھی طرز حکومت طے کیا جائے عوام کے مزاج و افتاد کے مطابق ہو اور جو جمہوری نظام بھی رائج کیا جائے اسے لوگ سمجھ بھی سکیں۔ نیز سمجھ کر چلا سکیں۔ یہ طرز ایسا ہو کہ ہمارے وطن کی جو خصوصیات ہیں ان کے تقاضے بھی پورے ہو سکیں۔ وہ محض مغربی طرزِ حکمرانی کی نقالی نہ ہو۔ بہر نوع اس کا فیصلہ بھی جمہوری طریق پر کیا گیا اور ایک کمیشن نے یکم جنوری ۱۹۶۲ء کو اپنی رپورٹ پیش کر کے ملک میں نئے آئین کے لئے راہ ہموار کر دی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ اس آئین کو کچھیں اس کی پشت پر رہا ہی مملکت کا جو عملی تصور کارفرما ہے اسے جانچیں اور اس کو تسلیم کر کے اپنا سیاسی سفر پھر شروع کر دیں۔

آئین کو ہر طرح جمہوری اور حقیقی طور پر قابل عمل بنانے کی سعی کی گئی ہے۔

ملک کے دونوں صوبوں میں اسمبلیاں قائم کی گئیں اور پورے ملک میں ایک مرکزی مقننہ کام کر رہا ہے۔ مقامی کونسلوں نے اپنے ووٹ سے اسمبلیوں کے لئے نمونہ اپنے جانے پہچانے آدمی منتخب کئے۔ مقامی کونسلوں کے نمائندے خود عوام نے بنیادی جمہوریت کے نظام سے چنے تھے اور ان کا انتخاب عام حق رائے دہندگی بالغان کے اصول پر ہوا تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظام بھی اس دور کی ایک ایسی دیہاتی جیسے جمہوریت کے اصل اساس کے طور پر بہترین طریق کار تسلیم کر لیا گیا ہے، نہ صرف اپنے ملک بلکہ بعض دوسرے ملکوں میں بھی، جہاں اس طرز حکمرانی کو اچھا سمجھ کر اپنایا جا رہا ہے۔ نئے آئین نے صدر کو اپنے کا بینہ کے اراکین کا انتخاب کرنے کا مجاز قرار دیا ہے اور اس طرح جو کا بینہ بنی ہے وہ آئے دن کی سیاسی تقلبات پر اور وزارتی شکست و ریخت کا مکمل سدباب بھی کر دیتی ہے۔

اس صدارتی طرز حکومت کے دو فوائد تو بالکل واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک کو آئینی اور جمہوری نظام مملکت بھی مل گیا اور سابقہ حالات کے غور کرنے کا بھی دروازہ بند کر دیا گیا کیونکہ جب تک

معاشرہ اچھی طرح اور کافی وسیع پیمانہ پر تعلیم یافتہ اور ترقی آشنا نہ ہو اور اس کے سیاسی رہنما زیادہ بالغ نظر نہ ہوں اس وقت تک ادنیٰ سطحوں پر لامحدود سیاسی آزادیاں دینا مفادِ وطن کے لئے مضرت ثابت ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مگر لوگوں کو سیاسی کاموں سے عملاً وابستہ ہونے کی ضرورت ہے اس لئے نظم و نسق مملکت چلانے کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے عوام کے نمائندوں کو اپنی بنیادی مجلس کے ذریعہ پوری طرح آزادی عمل دی گئی ہے۔ چنانچہ ان بنیادی جمہوریتوں نے ہی ملک کے لئے ایک مستحکم سیاسی اساس بنایا ہے۔

یہ تو مرض کا ایک علاج ہوا، اور بفضلِ تعالیٰ بہت شافی بھی رہا۔ مگر علاج کے ساتھ پرہیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ازالہ مرض میں مدد ملے۔ اس غرض سے ملک میں نا اہل سیاستدانوں کو کچھ سال کے لئے سیاسی زندگی سے علحدہ رکھنے کا آرڈیننس بنادیا گیا۔ اور سیاسی پارٹیاں بھی ممنوع قرار دے دی گئی تھیں۔ غرض اسی پس منظر میں ۲ جون ۱۹۶۲ء کو ملک کے نئے آئین کے تحت مرکزی مقننہ کا اجلاس راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ اراکین نے سرد و گرم ہر طرح کا رویہ اختیار کیا اور وہ شے جسے آزادی اظہار کہتے ہیں اور جسے جمہوریت کا بنیادی اصول مانا گیا ہے، اس موقع پر بھی موجود رہا۔ حکومت خود اس بات کی خواہاں ہے کہ تعمیری نکتہ چینی کر دوا رکھے تاکہ رائے عامہ سے قریب تر رہے اور اصلاح و تکمیل کے مراحل میں نمائندگانِ ملک کی آرا سے واقفیت حاصل کی جائے۔ سیاسی جماعتوں کی بحالی بھی اسی وجہ سے کی گئی ہے کہ ملک میں سیاسی خلا موجود نہ رہے، کیونکہ سیاسی خلا عوام میں افواہوں کے پھیلنے، زبانی طعن دراز کرنے، اور کاناپھوسی کی ہمیں چلانے کا موجب بن جاتا ہے جو کسی بھی ترقی پسند ملک کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں جو کچھ لیل و نہار ہیں وہ اخبار میں طبقوں سے پوشیدہ نہیں۔ مگر ان مجالس کے باہر سیاسی مطلع بھی گہرا براؤن ہوے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ غبار کب تک چھٹے گا۔ سیاسی جماعتوں کی بحالی کے بعد ملک میں کئی جماعتیں جو ماضی میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی تھیں، پھر برسرِ عمل آگئی ہیں۔ مگر حالات کی رفتار ابھی تک سیال حالت میں ہے۔ خود حکومت

جماعتیں اپنی رکن سازی کی ہم چلا رہی ہیں۔

مغربی پاکستان میں دوسری سیاسی پارٹیاں بھی موجود ہیں مگر ان کے مؤیدین کی تعداد کچھ زیادہ بڑی، یا مؤثر نہیں۔ مثلاً نیشنل عوامی پارٹی، ریپبلکن پارٹی، عوامی لیگ وغیرہ۔ ملک میں ایک متحدہ قومی محاذ بنانے کی بھی سعی کی گئی ہے جس میں ہر پارٹی کے نمائندے موجود ہوں گے۔ مگر ہر گروپ نے اس محاذ میں شریک ہونے کے لئے اپنی جدا جدا شرائط پیش کی ہیں کوئی پورے آئین کو ہی بدلنا چاہتا ہے، کوئی اس کی اصلاح و ترمیم چاہتا ہے، کوئی کچھ، کوئی کچھ! لیکن ان جماعتوں کے رہنما وقتاً فوقتاً جو بیانات دیتے رہتے ہیں ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس محاذ کو بھی پوری سمجھتی حاصل نہیں ہے۔ غرض اس وقت ملک کا سیاسی خواب تعمیر کی کثرت سے پریشان ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مطلع سیاست پر کون کون سے ستارے طلوع ہوں گے، اور کیا کاروشیناں بکھیر کر افق کے کس پار پہنچ جائیں گے۔

البتہ یہ سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ ملک کی اس سیاسی بے یقینی کے ضمن میں حکومت کس طرح سوچتی اور عمل کرتی ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ کیونکہ صفا دکھائی دے رہا ہے کہ بلند آہنگ تقاضوں کے پیش نظر حکومت ملک کے آئین کو اور زیادہ جمہوری بنانے کے سلسلے میں قدم اٹھا چکی ہے۔ بنیادی حقوق کا بل ڈھاکہ کے موجود اجلاس میں پیش کیا گیا ہے اور اس کی منظوری کے لئے جملہ مساعی بروئے کار لائی جا رہی ہیں۔ عام مطالبہ یہ تھا کہ ملک کا نام آئینی طور پر "اسلامی جمہوریہ پاکستان" رکھا جائے۔ اسے بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ رائے دی کیشن مقرر کیا گیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ صدر پاکستان کی خدمت میں پیش کر دی ہے اور بالمراسم انتخابات کا اصول منظور ہونے کی توقع کی جا رہی ہے۔ بحث کو بھی مقننہ کے کنٹرول میں دینے کا امکان ہے۔ اسی طرح ماہرین قانون کی آراء کے مطابق ہائی کورٹوں کو اپیل سننے اور نظر ثانی کے اختیارات بھی مل جائیں گے اور اب ایبٹ وزوہ لوگوں

کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ عوام سے قریب تر آنے اور اصلاح ترقی کے منصوبوں کو پوری طرح مکمل و کامیاب بنانے کے لئے جہاں اور باتوں کی ضرورت ہے وہاں عوام کا اعتماد و تعاون جیتنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے حکمران کا بینہ کو بھی کسی فعال اور با اثر جماعت کی تائید حاصل ہونی چاہئے تاکہ ملکی فلاح کے پروگراموں کو آگے بڑھایا جاسکے۔ صاحب رائے حضرات نے خلوص نیت سے یہ چاہا تھا کہ ملک میں صدر پاکستان، فیڈل مارشل محمد ایوب خان ہی کی ایک ایسی وقیع و قد آور ہستی ہیں جنہیں سارے ملک کا اعتماد حاصل ہے اس لئے اگر وہ اپنی ایک سیاسی جماعت کی تشکیل پر رضامند ہو جائیں تو بہت سی سیاسی پیچیدگیوں کا از خود ازالہ ہو جائے گا مگر اس تجویز کو صدر پاکستان نے خود ہی پسند نہیں فرمایا۔ اس لئے کافی خور و فکر کے بعد یہ طے کیا گیا کہ ملک کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ کو بحال کیا اور فعال بنایا جائے کیونکہ یہی وہ جماعت تھی جس نے پاکستان بنانے میں مدد دی تھی اور لوگوں میں بھی اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود بہت سے وزرائے کابینہ کی شخصی تائید بھی اسی جماعت کے حق میں تھی کیوں کہ ان میں سے بیشتر ایسے حضرات ہیں جو سیاست کے میدان میں جانی پہچانی ہستیاں ہیں اور یہ جماعت بھی وہ جماعت ہے جس کے ساتھ خود باقی پاکستان قائد اعظم اور معمار پاکستان قائد ملت مرحوم کی یادیں وابستہ ہیں۔

مگر ہوا یہ کہ مسلم لیگ کی تشکیل تو بھی گونا گون مشکلات کا شکار ہو گئی کیونکہ بہت سے پرانے لیڈر ایبٹو کی زد میں تھے اور جو باقی رہے تھے وہ شاید اتنے با اثر نہ تھے کہ ایک نئی اور عظیم طبعی تحریک کو چلا سکیں۔ ان میں بعض لیڈر تو حکومت کے کھلم کھلا مخالف تھے۔ اس لئے مشکلات اور بھی بڑھ گئیں مگر وہ نذر ان شوق کو منزل پر پہنچنے کی جستجو ہو تو راہ کی دشواریاں ہمت کو اور ہمیز دیتی ہیں۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مسلم لیگوں کا ایک کنونشن منعقد کر کے آئندہ لائحہ عمل طے کیا جائے۔ یہ کنونشن بھی اختلاف کا مور د بن گیا اور بعض لیگی لیڈروں نے اپنی ایک کونسل مرتب کرنے کا اہتمام کیا۔ یہ کونسل وہی تھی جو اکتوبر ۱۹۵۸ء کا انقلاب آنے سے قبل بنی ہوئی تھی۔ اس وقت مسلم لیگ کی یہ دونوں ہی

غزل

تالش دہلوی

خاک اڑاتے ترے وحشی کو سرد دیکھتے ہیں
کوئی صحرا ہو گولا سا اٹھا دیکھتے ہیں
ہم سے پہلے سر منزل کوئی پہنچا ہے ضرور
دُھندلے دُھندلے سے نشانِ کف پا دیکھتے ہیں
رُخ ہی ہو جائیگا موسم کی ہوا کا معلوم
ہمیں خاکستری دل اپنی اڑا دیکھتے ہیں
اُس میں ہے نگہ شوق کی تو لو پوشیدہ
آج یہ پردہ حائل بھی اٹھا دیکھتے ہیں
تیری نگیں بدنی کا انہیں اندازہ ہے
جو ہمیشہ تجھے رنگین قبا دیکھتے ہیں
نکمت و رنگ کی یہ موج کہاں سے آئی
پھول کھلتا ہے تو ہم سوئے صبا دیکھتے ہیں
مردہ گوش ہوا جلوہ چشم مشتاق
ہم اسکر لے ہم آنا ہوا دیکھتے ہیں
پے بہ پے پڑتی ہیں ساقی کی بنگا ہیں تالش
حاصل میکدہ ہر غرض پا دیکھتے ہیں

کو درخواست دینے پر بعض حالات میں صدر پاکستان معافی بھی دے سکتے ہیں۔ غرض اس قسم کے بہت سے مطالبات تسلیم کئے جا چکے ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت حزب اختلاف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون پر آمادہ ہے رائے عامہ کی بعض پر اس کا ماتھ ہے اور جب تک کوئی بات مراحتاً وطن دشمن یا عقائد اسلام و پاکستان کے خلاف معلوم نہ ہو اس کے قبول کرنے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا جاتا رہے گا۔

مگر حزب اختلاف سے عارضی سمجھوتہ کر لینا نہ کوئی بڑا کارنامہ ہے اور مسائل کا مستقل حل۔ لیکن یہ بھی نکتہ ارباب اختیار کی نظر سے اوجھل نہیں کہ آزاد اظہار رائے اور محض نکتہ چینی و مخالفت، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس لئے بعض ناگزیر پابندیوں کا باقی رکھنا بھی لازمی ہو جاتا ہے۔

زبانِ وطن کے لئے آمریت کا الزام لگا دینا یوں تو بہت آسان ہے مگر آئینی آداب و روایات کا خیال کیا جائے تو حقیقت کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے۔ اب مثلاً صدارتی طرز حکومت میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ حزب اختلاف کی مخالف رائے پر وزیر مستعفی ہو جائیں۔ وہ اپنی مقررہ مدت سے قبل نہیں ہٹائے جاسکتے خواہ فرض ایوان پر انہیں شکست ہی کیوں نہ ہو جائے۔ لیکن ایک ہونٹند عجب وطن کا بیڑہ کا بھر بھی یہ روایتی فرض رہتا ہے کہ قوم کی بعض پر ماتھ رہے اور سیاسی موسم کے تغیر کو نگاہ سے اوجھل نہ رہے۔ اس لئے حزب اختلاف کو حتی الامکان جینے کی ہی کوشش کی جاتی ہے۔ ویسے ہمارے قومی مقصد میں حکومت کو اکثریت حاصل بھی ہے۔

۱۵۶ نشستوں میں سے دو اس وقت خالی ہیں۔ ۱۴۰ ممبر کسی پارٹی سے منسلک نہیں، ۶۰ اراکین حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھے ہیں پھر بھی ۸۰ اراکین مقصد حکومت کے موید ہیں۔ مغربی پاکستان کی اسمبلی میں ۱۰۰ اور مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں ۱۲۰ اراکین حکومت کی تائید میں ہیں۔

مگر کیفیت یہ ہے کہ لوگوں کے گروپ یا جماعت کی تشکیل کسی اصول و سیاسی عقیدہ و پروگرام پر مبنی یا منظم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں فرد پرستی کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اور سیاسی لوگوں کی بصیرت ابھی اُس وسعت و ہمدگیری کی محتاج نظر آتی ہے جو ملک کو صحیح (باقی صفحہ ۵۱)

سوات میں حبشی

طاہر احمر

(دل کے اس پار)

کتنا رنگین ہے خاموش ہے یہ شہر خزاں
نزد پتوں پہ سلگتے ہوئے پھولوں کا دھواں
گرد کی گود میں سوئے ہوئے گاؤں کا سرخ
راہ کے پھول پہ ٹہرا ہوا کوئی ارماں
برت زاروں کے حسین بن میں اُٹتے بادل
اور وادی میں گر جتے ہوئے دریا کا سماں
مرغزاروں میں چاروں کے دکھتے پتے
دیو داروں کے گھنے سائے میں سبزہ لڑاں
کتے گلپوش کتاروں سے گزرتی ندی
موج در موج ہے رنگینی گل سے تاباں
گنگناتی ہے حسین شام شفق کی لو پر
جیسے خورشید کی کرنیں ہوں کہ زلفاں قضا
اپنی تنہائی میں افسردہ و گنہام ساچا ند
انچے کہار پہ ٹہرا ہوا حیراں حیراں
اک حسینہ ہے سر راہ کسی یاد میں گم
اور وادی میں وہ سوئے ہوئے خاموش مگا

ایک مدت ہوئی چھوڑے ہوئے وادی سوات
دل کے دیوانے میں ہیں گیت ابھی تک لڑاں
(دل کے اس پار)

دم بدم سرد خزاں پھول اُڑاتی گذرے
گیت کی آگ سرشام بھجاتی گذرے
سردیج بستہ ہواؤں میں بھرتا ہوا جوش
نیچے وادی میں گزرتے ہوئے دریا کا خروش
دیو داروں کے گھنے گھوڑا ند میرے جنگل
دیوتاؤں کی سی نخوت سے اُٹتے بادل
برف کے گاؤں کو جاتی ہوئی اک راہ گندہ
جس کے جنگل میں جواں برف اُڑانے شہپر
نرم چہروں پر سرشام شفق کی کلیاں
اور مرے گاؤں کی پُر کیف سہانی کلیاں
برف کی دُھند میں پٹے ہوئے بلور پہاڑ
کتے تاریک بیا بالوں میں آندھی کی فغاں
آج تنہائی میں اے غم دل بے تاب بھی ہے
ڈھلتے سائے جوں رزتے ہیں تو مہتاب بھی ہے

انقلاب سے آئین تک

انور حسین

عام طور پر جو شکایت کی جاتی ہے اور بالعموم سوجے سمجھے بغیر کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان آئینی نشوونما یا حقیقی جمہوریت کے قیام میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ ایسی تنقید کرنے والے اس بنا پر کہ انقلاب بہر حال انقلاب ہے خواہ وہ بے کشت و خون ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے ذریعہ اہل پاکستان کے مزاج و افتاد کے مطابق جمہوری حکومت کے نشوونما کے تصور کو مضحکہ خیز خیال کرتے ہیں۔ وہ مغربی جمہوریت یا اس امر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ کس طرح دنیا کے اکثر آزاد ممالک اس کی پیروی کر رہے ہیں افسوس کرتے ہیں کہ پاکستان ایسا کیوں نہیں کرتا۔ اور اس سے قاصر کیوں ہے۔

بنابرین یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مغربی وضع کی جمہوریت کے دیگر ممالک میں نشوونما ارتقا اور کامیابی یا ناکامی سے متعلق کوائف اور پاکستان کی مخصوص افتاد اور مسائل کی صحیح غمازی سے تمام مغالطوں اور ذاتی اغراض پر مبنی غلط بیانیوں کی کھوجا کھرچٹ جائے گی۔

جہاں تک باقاعدہ تاریخ کا تعلق ہے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ہیرودوش کے زمانہ قدیم سے لے کر اب تک کئی قوموں نے کئی ممالک میں جمہوریت کا تجربہ کیا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا رہا؟ اس کا جواب دینے وقت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قیصر عظم اور جلیل القدر نپولین سے لے کر البانیا پر جیسے چھوٹے ملک کے احمد زورنگ اب سب باجیروت افراد نے خود کو اپنے ملک کے دستور سے زیادہ طاقتور بنا کر آخر کار اس کا خد کے پرزے کو ہڑپ کر لیا تھا۔ اور یوں جمہوریت کو بالآخر اپنی موت یا شکست کے ساتھ ہی دفن کر کے اپنی قوم کو تباہی ویرانی میں مستغرق کر دیا تھا۔

انگلستان ہی کو لے لیجئے۔ اسے موجودہ غیر مرقوم دستور

اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں انقلاب درحقیقت محض انقلاب نہ تھا بلکہ تغیر و ترقی کا پیش خیمہ تھا اور اس کی بدولت اس کی رفتار ترقی اور بھی تیز ہو گئی تو شاید اس میں تضاد کا شائبہ نظر آئے۔ بادی النظر میں ممکن ہے ایسا ہی معلوم ہو لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ عین حقیقت ہے۔ اور سچ پوچھئے تو بانیان انقلاب کا حقیقی منشا بھی یہی تھا۔ وہ اس کو ارتقاء مسلسل کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کی بدولت بروئے کار بھی آ رہی ہے۔

جہاں تک تضاد کا تعلق ہے یہ بھی فی نفسہ کچھ ایسی چیز نہیں جس کی طرف بڑھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جائے کہ اس پر بھی است؟ کیونکہ یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ بعض اوقات متضاداتوں میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور انتہاؤں کے سرے بھی آپس میں مل جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ جو چیزیں بظاہر آپس میں ملتی جلتی ہیں وہ بسا اوقات اٹل بے جود ہوتی ہیں۔ یہ ساری باتیں اظہار من الشمس ہیں اور وہی لوگ ان کو محسوس نہیں کرتے جو مغربی کبریٰ پر غور و خوض کئے بغیر جھٹ کوئی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض لوگ صحیح صورت حال کو جانپ تو لیتے ہیں لیکن چونکہ انہیں محض ذاتی اغراض سے سروکار ہوتا ہے اس لئے وہ اس سے اغماض کرتے ہوئے محتاج کو اس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ دوسرے لوگ گمراہ ہول اور لان کا مطلب پورا ہو جائے۔

اس سلسلہ میں زیادہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ حقائق کو کسی بری نیت سے مسخ نہ کیا جائے بلکہ اس کا سبب پرمبر کرد کاوش نیز اس سیاسی بیدار مغزی اور فہم رسا کا فقدان ہو جو انسان کو کسی چھپو معاملہ کے خلاف یا حق میں رائے قائم کرنے کے لئے اس کے موافق مخالف پہلوؤں پر غور کرنے کی صلاحیت عطا کرتے ہیں۔

لیکن تاریخ نے بار بار اس امر کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ انہوں نے اپنے لئے جو نصب العین مقرر کیا تھا اس کو حاصل کر کے اپنی فہم و فراست اور فطری صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔

مثال کے طور پر یہی دیکھ لیجئے کہ دور آزادی سے پہلے ہندی کیفیت کیا تھی۔ ہماری ہمسایہ قوم کی ہٹ دھرمی اور حکمران قوم کی چالبازی کے باعث ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی مستقبل بھی نہیں دکھائی دیتا تھا کہ وہ آزاد ہوں گے بھی یا نہیں۔ اور آزاد ہو کر بھی ان کی کیا حالت ہوگی۔ اس وقت ہمارے فلسفی، شاعر، علامہ اقبالؒ کے ذہن رسا نے پاکستان کا تصور کیا۔ اور قائد اعظمؒ نے اس کو حائل کرنے کا مصمم ارادہ، فرزندِ ملت اپنے قائد کے گرد جمع ہو گئے اور قرارداد لاہور منظور ہوئی۔ مخالفین پاکستان نے اس کا تسخیر کر دیا۔ نتیجہ نکلتے۔ اور دنیا نے اسے محض ایک ڈھونگ یا زیادہ سے زیادہ مذاقِ شعور سمجھا۔

لیکن عوام کے بے پناہ ارادہ، کی مناسب تنظیم، اس کی صحیح پنج پر کار فرمائی اور برادری اتحاد استعمال پاکستان کو "دھوم دھام کے ساتھ" معرض وجود میں لا کر ہی رہا۔ اب ہم پر خندہ زن ہونے کی بجائے دنیا پر خندہ زن ہونے کی باری ہے جس میں تقسیم کا وہ اصول جس کی بنیاد قیام پاکستان سے پڑی، ایسے تمام عوارض کا مجرب علاج بن گیا ہے۔ چنانچہ کوریا اور ویت نام کے پیچیدہ معاملے اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اور تو اور ہندوستان نے بھی جو پاکستان کا بدترین نقاد ہے، اس سلسلہ میں حد کر دی ہے۔ ملکی وحدت پیدا کرنے کی کوشش میں ناکام رہ کر (جس میں پاکستان کو کامیاب ہونے کی ضرورت تھی) حکمرانانِ دہلی ان ریاستوں (صوبجات) کو جو ویسے تو چھوٹی ہیں لیکن ہیں بلکی تکلیف دہ، چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

اور ہندو آزادی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر دستور ۱۹۵۴ء تک کے زمانے میں پاکستان بے درپے کئی حادثوں سے دوچار ہوا۔ یعنی حملہ کشمیر، جونا گڑھ اور ماٹوہ پر ہندوستان کا زبردستی قبضہ، مسلمانوں کے خون کی جابجا ارزانی، لاکھوں پناہ گزینوں کی دھڑا دھڑا آمد، بابائے ملتؒ کی مرگ ناگہان، ۱۹۵۰ء میں غرقِ اترانہ ظلم و ستم کی از سر نو فتنہ آرائی، ۱۹۵۱ء میں قائد ملت کی شہادت، خوفناک آفاتِ سادی وغیرہ وغیرہ نے قوم اور اس کے قائدین کو ایک طویل

بروئے کار لانے کے لئے آشوبِ حوادث سے معمور کتنی ہی صدیوں سے گزرتا پڑا، ایسی صدیاں جن کا دامن بادشاہوں کے ساتھ نوابوں کی جنگوں، بادشاہوں کے سرفقم کرنے، محافظِ قوم کے ایک سالہ پیر کو برسرِ عام دار پر لٹکانے وغیرہ سے بھر رہا ہے۔ جب انگلستان کی نوآبادیوں نے جارج سوم کی حکومت سے برائی کر کے موجودہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بنیاد رکھی تو کیا انہوں نے اپنے سابقہ وطن کی حکومت یا آئین کو نمونہ بنایا؟ قدرتی طور پر وہ ایسا کرنے سے معذور ہے۔ انہیں اپنا آئین خود وضع کرنا پڑتا کہ وہ اسے اپنے لوگوں کے مزاج و افتاد کے مطابق بنائیں۔ اور اسے بھی اپنی موجودہ وضع اختیار کرنے کے لئے کتنی ہی کدو کاوش اور محنت و مشقت سے کام لینا پڑا۔ اور کتنی ہی کشمکش اور خون خرابے سے گزرنا پڑا۔

پھر وہ مغربی ملک جس نے دنیا کو آزادی، مساوات اور اخوت کا غیر فانی نعرہ دیا ہے، جمہوریت کے ساتھ ۱۷۸۹ء سے برابر کھینٹا ہی رہا ہے، جیسا کہ اس کے تاریخی حالات سے صاف پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ وہ ہنوز اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ایسی ناکامیوں کی اور مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو لوگ واقعات سے ناواقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مغربی وضع کی جمہوریت ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اور جن ملکوں کے بعد ان اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی ہے، وہاں اس کا بہت برا اثر ہوا ہے۔

اس لئے اگر پاکستان ان تجربوں سے سبق لینا چاہتا ہے تو وہ بے جا نہیں۔ اس کے لئے نہ تو یہ مناسب ہے کہ وہ بے پناہ راستے پر گامزن ہو اور نہ یہ کہ دوسرے ملکوں کی اندھا دھند پیروی کرے۔ ایک طرف قائدین کے خضر راہ بن کر صحیح راہ دکھائے اور دوسری طرف ان کی ہدایات پر عمل کرنے والے مقتدیوں کی سعی و کوشش اور جدوجہد نے ہمیشہ قوموں کو اپنا راستہ آپ تراشنے اور اپنے ہی طور پر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی توفیق عطا کی ہے۔ جب کبھی انہوں نے اپنی راہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان کے دشمن ان کا مضحکہ اڑاتے رہے ہیں اور دوسرے ان کی مساعی کے ناکام ہونے کے بارے میں پیشگوئیاں کرتے رہے ہیں۔

مختص میں مبتلا رکھا۔

جو لوگ ایسے پُر آشوب حالات سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اس نازک زمانے کو اپنی نامبارک کارستانی کے لئے بہت ہی موزوں خیال کیا۔ چنانچہ انہوں نے جو ہر لیے بیج بوئے تھے وہ کسی ٹوہ کے دانتوں کی طرح موثر ثابت ہوئے۔ اور یہ تمام انہی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان تقریباً تباہی کے کنارے آگیا اور اہل پاکستان کو قیامت کی گھڑی بالکل سامنے دکھائی دینے لگی۔ دنیا چپ چاپ یہ تمام منظور دیکھ رہی تھی اور منتظر تھی کہ یہ گھڑی کب آتی ہے۔

لیکن اگر ایک شاعر کے ذہن رسالے پاکستان کا تصور کیا، اس کا خواب دیکھا، اگر ایک قائد نے اس کے لئے جدوجہد کی اور اس جنگ میں کامیاب ثابت ہوا تو خدا کے فضل سے صدر پاکستان محمد ایوب خان کی شکل میں ایک نجات دہندہ بھی نمودار ہو گیا جس نے ۱۹۵۸ء میں عین وقت پر میدان میں قدم رکھا اور اس ابتری کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک لیا۔ تب سے ہمارا کارواں برابر آگے ہی گئے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اُس منزل کی طرف جو اس جو مسئلہ قائد نے اس کا منتہا قرار دیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس منزل مقصود، اس مقام عافیت کی طرف بڑھنے کی کوشش میں ہمارا کارواں جو بالکل نئے راستے پر چل رہا ہے، اور بھی زیادہ شدید صعوبتوں اور آزمائشوں، مشکلات و خطرات میں مبتلا رہا ہے۔ اور یہ ایسے صائب ہیں جس میں کوئی کارواں بھی جمانے جانے جنگلوں اور صحراؤں میں گرم سفر ہو۔ مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا مگر ان میں کوئی راستہ نظر آتا ہے نہ نشان راہ۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے تاریخی دن کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور کل چار سال کے بہت ہی مختصر عرصے میں جو شاندار

کارناموں کا ہجوم نظر آتا ہے، وہ اس قدر معروف ہیں کہ ان کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ لیکن جہاں تک آئینی ارتقا کا تعلق ہے اس کے بارے میں چند سطور بے محل نہ ہوں گی۔

ملکی حالات کا بڑا ہی حقیقت پسندانہ جائزہ دیتے ہوئے محسوس کوائف کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور جذباتی و شوریدہ سرانہ شنید کی ذرا بھی پروا نہ کرتے ہوئے صدر پاکستان، محمد ایوب خان، بیباک اور آگے بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے بنیادی جمہوریتوں کی شکل میں ایک غیر معمولی انتظامی انتہ کی ہے۔ اس درجہ کامیاب کہ دوسرے ہمسایہ ملکوں نے بھی جو جمہوریت کے تجربے کر رہے ہیں اس سلسلہ میں پاکستان ہی کی پیروی کی ہے اور اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ صدر ایوب ہی کے زیر ہدایت ان کے ماہرین دستور نے ایک ایسا جمہوری آئین وضع کیا ہے جو جمہور کے مزاج کے مطابق ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ صدر ایوب خان ایک بڑی قوم کے سچے قائد۔ ایک بے باک، کھرے اور روشن دماغ صاحب فہم انسان کی حیثیت سے جو کچھ کرتے ہیں لوگوں کا اعتماد حاصل کر کے ہی کرتے ہیں اور جو چیز انہوں نے بنائی ہے اس میں ترمیم و تصرف کے خلاف نہیں ہیں۔ اگر لوگ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ اس میں تغیر و تبدل کیا جائے، حالات ان کا تقاضا کریں اور کوائف و مصالح ان کو جائز قرار دیں۔ ترقی کے جو مدارج اب تک طے ہو چکے ہیں، ان سے ایک دیانت دار مبصر کے دل میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستان دنیا کے تمام جمہوریت پسندوں کے لئے ایک مثالی مقام بن جائے گا اور جب ہمارے صدر دنیا کے نامور دستور سازوں اور مفقنوں میں شمار ہوں گے۔

جھلسلی

قاضی نذر اللہ اسلام
مترجمہ: افسر راہ پوری

علیمہ بیگم: وہ تو گیلی، لاڈو، ڈھنڈی سانس لیتی ہے، اچھا میں کاغذ
اُنکے دیتی ہوں، کیوں، ٹھیک ہے نا؟
فیروزہ: نہیں امی، بچا ہی دود بچف آواز سے چنچا اٹھتی ہے (بچا
فورا)!

علیمہ بیگم: خدا کے لئے روؤ نہیں۔ لے ابھی بچلے دیتی ہوں دیتی
بچلے جاتی ہے کہ بہت سے برساتی پٹنگے آکر تھکے گرد
ناچنے لگتے ہیں۔ فیروزہ انہیں گھوم گھور کر دیکھنے لگتی ہے
فیروزہ: نہ بچاؤ امی، پر فالے کتنے اچھے لگتے ہیں ذرا مجھے دیکھئے۔
علیمہ بیگم: (مسکراتی ہوئی نڈی ہے) اچھی ہوئی ہے نا، اچھا نہیں بچاؤ
لیکن بیٹی، پٹنگے بدن پر، چہرے پر گر گئے۔ ذرا تہی ہٹا کر
رکھ دوں۔

فیروزہ: (چینے لگتی ہے) میں کہہ چکی ہوں کہ پٹنگوں کو دیکھوں گی!
علیمہ بیگم: (بچی کو چوم لیتی ہے) میری بیٹی، اس قدر چنچ چنچ کر نہ پلو،
اس سے مرض اور بڑھ جائے گا۔ میں تہی نہیں ہٹاتی۔
فیروزہ: (پٹنگی باندھے پٹنگوں کو دیکھتی رہتی ہے) امی، ایک پٹنگا
پکڑ کر مجھے دو تو۔!

علیمہ بیگم: چھی! بیٹی، پٹنگے نہیں چھوتے۔ تجھے آج کیا ہو گیا ہے
فیروزہ؟

فیروزہ: (روہاںسی ہو کر لاڈ، نہیں تو میں چنچ چنچ کر آسمان سر پر
اٹھا لوں گی۔)

علیمہ بیگم: نہیں بیٹی، نہیں، چنچنے کی ضرورت نہیں (ایک پٹنگا پکڑ
فیروزہ کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ وہ پٹنگے کو الٹ پٹنگ
غور سے دیکھتی ہے،)

فیروزہ: یہ لو، اس کا تو ایک پر ٹوٹ ہی گیا..... آ.....

کردار:

مرزا: گاؤں کا رئیس

علیمہ بیگم: مرزا صاحب کی بیوی

فیروزہ: مرزا صاحب کی سولہ سالہ لڑکی

حبیب: ایک حسین و شکیل نوجوان

مرزا صاحب کا پڑوسی

ڈاکٹر

پہلا منظر

(مرزا صاحب کی دو منزلہ کوٹھی۔ بالائی منزل پر ایک

کمرہ۔ مرزا صاحب کی سولہ سالہ لڑکی بستر حالات پر

بے سوجھ بڑی ہے۔ تمام کھڑکیاں بند ہیں، البتہ

بچھم کی طرف کا دروازہ کھلا ہے۔ باہر بارش

ہو رہی ہے۔ مرزا صاحب کی بیوی علیمہ بیگم پٹنگ سے

لگی بیٹھی ہے اور فیروزہ پٹنگا تھل رہی ہے۔ دن ختم

ہو چلا ہے۔ مطلق ایک لودھو نے کی دیر سے کمرے کا

اندھیرا لمحہ بر لمحہ کر رہا ہوتا جاتا ہے۔ علیمہ بیگم اٹھتی ہے

اور لائین جلا دیتی ہے)

فیروزہ: امی!

علیمہ بیگم: (دوڑ کر پٹتی ہے اور پیار سے اپنے چہرہ کو فیروزہ کے

چہرے سے ملا کر بولتی ہے) میری بیٹی، میری زندگی!

فیروزہ: (بچی بچاؤ۔)

علیمہ بیگم: کیوں بیٹی! کتنا اندھیرا ہو گیا ہے، ڈر نہیں لگے گا تجھے،

فیروزہ: (اوپر، نہیں، تم مجھے گود میں لے کر بیٹھو ذرا انا کا

پٹ جاتی ہے) جی بہت بری لگتی ہے، امی!

اچھا امی، تنگے کو تو بہت دکھ ہوا ہوگا؟
حلیہ سگیم: کیوں نہیں۔

فیروزہ: تب تو امی سے چھوڑے دیتی ہوں۔ اتنی تمہارے نیچے کھڑے
(حلیہ سگیم تنگے کو نیچے رکھ دیتی ہے) امی، باہر بہت پانی
برس رہا ہے نا؟

حلیہ سگیم: ہاں بیٹی بہت دھڑے برس رہا ہے جھجم سناٹی نہیں دیتی؟
فیروزہ: مجھے تو جھجم کی آواز بڑی بھلی لگتی ہے، امی،
اٹا کہاں ہیں؟

حلیہ سگیم: دلہیز میں ہیں شاید

فیروزہ: اچھا، اگر خوب چنچ چنچ کر روؤں تو وہ سن پائیں گے؟
حلیہ سگیم: اچھی بیٹی، پھر رونے کی رٹ، انہیں بلا دوں!
فیروزہ: نہیں، نہیں امی، میری اتنی کتنی اچھی ہیں۔ اچھا امی، اگر تم
ابھی گاؤ تو اب سن لیں گے؟

حلیہ سگیم: بڑی پاچی ہے تو۔ تیرا مطلب میں سمجھ گئی۔ یہ گانے کا
وقت ہے، اتنے اب اسیں گے تو ضرور خفا ہوں گے۔
فیروزہ: اتنی باتیں میں وہ سن پائیں گے، امی، میری اچھی اتنی ذرا
آہستہ آہستہ آواز دو، وہی برسات کا نغمہ۔

حلیہ سگیم: اچھا کا دیتی ہوں دھیرے دھیرے، اب کیا گانا آتا؟
پھپھ میں وہ گیت گاتی تھی۔ پھر یہاں آئی تو اسے
بھلانے ہی کی کوشش کرتی پڑی۔ جانتی ہوں، کتنے سے
تمہارے ابا کتنا چڑتے ہیں۔

فیروزہ: سنا سنا کر کوئی چڑ بھی سکتا ہے؟ ابا بھی عجب آدمی
ہیں.....

حلیہ سگیم: پہلے تو ناراض نہ ہوتے تھے، خیر اب تو میں جانا بھول گئی
جکی ہوں۔ ایک آدھ گیت تیری دھڑ سے یاد رہ گیا۔

فیروزہ: پہلے ابا گانے سے ناراض نہ ہوتے تھے؟

حلیہ سگیم: نہیں، لو، اب گائے دیتی ہوں۔

گوسرا، خیر سادون جھجم برس رہا ہے
آنکھ میں ہوں اکیلی، دل کیوں اٹھ رہا ہے
یہ تیرگی سی کیسی پیروں پر چھا رہی ہے
موج ہوا یہ کیسی شانوں میں گھرا رہی ہے

اس تیرگی میں آخر بھرتی ہوں کیوں پریشان

ہوں کس کی جستجو میں کس چیز کی ہوں خواہاں

بیدوں کی جھاڑیوں میں تنک کر وہ موڑ مٹیا

یہ کون بھولا راہی نیچے قدم کے ہٹسرا

یہ باتیں سے گیسوس کے چٹنگ گٹھے ہیں

یہ کس کی انکڑیوں کے آہو بٹنگ گٹھے ہیں

فیروزہ: امی کھڑکی کھول دو ذرا بادل دیکھوں گی۔

حلیہ سگیم: نہیں بیٹی کھڑکی نہ کھینگی۔ سردی لگ جائے گی۔ ایک

گیت اور گاتی ہوں، سنو!

فیروزہ: نہیں امی اور گیت نہ سنوں گی۔ کھول دو کھڑکی امی،

(حلیہ سگیم جنوبی رخ کی کھڑکی کھولنے کے لئے جاتی ہے)

وہ کھڑکی نہیں امی، پورب والی کھڑکی۔ پورب کی ہوا

سے قدم کے پھول کھینتے ہیں نا امی؟

حلیہ سگیم: وہ کھڑکی کھلی تو تمہارے ابا مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔

جنوب کی کھڑکی کھول دیتی ہوں۔ جنوب کی کھڑکی

کھول دیتی ہے۔ دور تک جھل پھیلا ہوا ہے، مگر

منہ کی وجہ سے دھندلا لگا رہا ہے)

فیروزہ: ایک لمبی سانس کھینچ کر دوسری کروٹ لے لیتی ہے۔

پھر کچھ دیر کے بعد اسی کروٹ ہی لیٹ جاتی ہے

اور پونہ لیٹ لیٹی کھڑکی طرف ہلکتی، اور شاید

روتی بھی جاتی ہے۔ امی!

حلیہ سگیم: روتی ہے بیٹی!

فیروزہ: اچھی امی، ابا تم کو بہت مانتے ہیں؟

حلیہ سگیم: معلوم نہیں (آنکھیں پونہ کھتی ہیں)

فیروزہ: پہلے بہت مانتے تھے؟

حلیہ سگیم: نبی ہٹا کر رکھ دوں، تمہاری آنکھیں نہیں دکھیں؟

فیروزہ: شاید وہ امی مگر بتاؤ مجھے!

حلیہ سگیم: (جتنی ہٹا دیتی ہے) خدا کے لئے ذرا چپ ہو کر سو جاؤ

بک بک کرنے سے بیمار امی اور بڑھے گی۔

فیروزہ: اچھا بتاؤ نا امی، میں سب سمجھتی ہوں۔ ابا نے کبھی

کسی کو چاہا ہی نہیں، ورنہ کوئی آدمی بھی اتنا شمس

دکھڑکی میں سے گیت کی مدھر لہریں داخل
ہونے لگتی ہیں)

دل کے سمجھاتے سے آنکھیں اور بھی ہوتی ہیں تر
دور جاؤں کس طرح، رکھتے ہیں مجھ کو باندھ کر
خواب برہم ہو گیا، شام جلدائی آگئی
پاؤں میں کس کی لٹوں کی دفعۂ بیڑی پڑی
کس کا چہرہ دیکھ کر ہنسا کا آیا خیال
اشک سے بھیگی زمیں پر، پاؤں رکھنے والے
موت کی جانب اگر جاؤں تو بل جاتا ہے وہ
طلعت شب میں مجھے وہ رہ کے ٹپاتا ہے وہ

دل کے سمجھانے سے
رگیت کے ختم ہونے پر سامنے والی کھڑکی میں
روشنی چمک اٹھی ہے اور اس روشنی میں ایک
خوبصورت نوجوان نظر آتا ہے۔ وہ ہنسنے
باندھے فیروزہ کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا ہے)

فیروزہ: اسی فراہی اور تیز کردو تاکہ اس کھڑکی سے میں بھی طرح
دیکھی جا سکوں! باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی
دیتی ہے)

علیہ بیگم: اے فیروزہ بند کر دے پردے کی کھڑکی کو، بند کر
.... بڑے آبا آسے ہیں! مرزا صاحب کے کمرے میں
داخل ہوتے ہی ہوا کے ایک تیز جھونکے سے تہی گل
ہو جاتی ہے اور علیہ بیگم اسے دوبارہ جلاتی ہے)
مرزا: کھڑکی بند کرنے کی اب کوئی ضرورت نہیں۔ میں

بہت دیر سے تم لوگوں کی کارستانیاں دیکھ رہا ہوں۔
صاف صاف سن لو، تمہارا جو جی چاہے کرو، مگر میری
آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا
(علیہ بیگم پر سکتہ طاری ہے) اور اس مردود لڑکے
— میں کیا کہوں — جی چاہتا ہے کہ کچھ بید کی
تھپوں سے پاؤں سے لیکر سر تک (غصہ سے)
دانت میتا ہے دن رات گانا، دن رات گیت،
دن رات ہانسی، دن رات سرویج شوغل

اور خشک ہوتا ہے!

علیہ بیگم: تو چپ نہ رہے گی فیروزہ، میری لڑکیوں جان
ہلکان کیوں کرتی ہے؟ ڈاکٹر نے خاموش رہنے کے لئے
کہا ہے نا۔

فیروزہ: اچھا امی، کل وہ پردے والی کھڑکی کھولیں گی نا؟ تب تو
ابا خانہ ہوں گے؟

علیہ بیگم: دکھانپ جاتی ہے! کیا کہتی ہے فیروزہ! آنسوؤں کے
انٹرنے سے آواز بھیج جاتی ہے)

فیروزہ: کل وہ کھڑکی کھولنے کے لئے نہ کہوں گی امی! (مکیہ میں
اپنا چہرہ پھیپتی ہے)

علیہ بیگم: دست سی بن جاتی ہے۔ پھر وہ ہانسی ہو جاتی ہے! سمجھی
ابھان، تیری بات سمجھی۔ تو ہمیں جلا بھنا کر جائے گی۔

لو میں ابھی پردے کی کھڑکی کھول دیتی ہوں پردے کی
کھڑکی کھلتی ہے تو سامنے والے گھر کی کھڑکی دھندلے
میں چمکتی تھی ہے اندر کھڑکی کے سامنے کوئی بے تابی سے

ٹھہرتا نظر آتا ہے۔ دور کی وجہ سے وہ سا آدھا دکھائی
دیتا ہے۔ پھر وہ سایہ کھڑکی میں خاموشی سے کھڑا
ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فیروزہ کی کھڑکی کی
طرف گھور رہا ہے علیہ بیگم آڑ کر کے ساری کے
پلو سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگتی ہے)

فیروزہ: دے تا نا! اس کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے امی،
ہانسی نہیں کیتی؟ کوئی رو رہا ہے شاید،
ڈرپ کرنا باہر کوئی رو رہا ہے امی امی، سنو امی!

علیہ بیگم: کوئی نہیں روتا بیٹی، کوئی نہیں منہ کا شوہر ہے
..... اول ہوں، نہیں شاید حبیب گارہا؟
سرویج بجا کر

فیروزہ: آہ بارش تمہم جاتی تو کچھ سن ہی لیتی۔ بارش تمہم کی
ہے، نا، امی!

علیہ بیگم: ہاں بیٹی، اب تم چلی ہے۔

فیروزہ: امی، امی، گیت سنو گیت؟ آہ ذرا بھی
شوہر نہ ہو۔ امی چپ چاپ سنو!

قرآن تلاوت کرنا اور نماز پڑھنا تک دو بھر ہو گیا ہے۔
..... بد معاش، باجی نہیں کا..... ہوں! یہ نکتہ
بی۔ اے پاس کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ توفیل
ہے ہی۔ پھر میں اس طہریم خاں سے اپنی بیٹی کی شادی
کر دوں،..... یہ مینہ اور مسور کی دال!

حلیہ سگیم، دیکھو، میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں، خدا! ہستہ بولو،
آج نہ جانے وہ کیا کیا باتیں کہنے جا رہی ہے۔

مرزا: دپوری کھڑکی بند کرتے ہوئے ہوں! یوں کھڑکی
کھول کر کوئی بھی لڑکی گھورتی رہے گی تو وہ بیباک
نہ ہوگی تو کیا اچھی رہے گی؟ دیکھو، فیروزہ کی ماں
تہیں نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے.....

اس بڑھاپے میں بھی تمہارے گانے کی لت نہ گئی
..... خدا جانے وہ کونسی خوش گھڑی تھی کہ دینے

ایک اسکول کی پڑھی لکھی لڑکی سے بیاہ کیا اور اس
عذاب میں مبتلا ہو گیا۔... کتنی بڑی بھول ہوئی ہو!

حلیہ سگیم: ... یہ بھول نہ ہوتی تو ہم دونوں اچھے ہی رہتے۔
مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ ایک گریجویٹ کٹرپن سے
دارمنا سکتا ہے۔

مرزا: جو چیزیں منع ہیں، ان سے پرہیز کرنا تمہارے نزدیک
کٹرپن ہے۔ یہ طعنہ تو میں بہت دفعہ سن چکا ہوں
حلیہ سگیم: کوئی نئی بات ہے تو کہو۔

حلیہ سگیم: ہے تو ضرور، مگر چکنے گھڑے پر کہیں بوند پھرتی
ہے۔ تم برابر گیت گانے کا طعنہ دیتے ہو، مگر شاید
تم کو یاد نہ رہا کہ میرے گانے ہی کی وجہ سے تم
مجھ سے بیاہ کرنے پر آمادہ کار کھائے بیٹھے تھے۔

مرزا: بھولا نہیں ہوں، لیکن اس وقت مجھے معلوم
نہ تھا کہ تمہارا گانا صرف آنکھوں کا آنسو اور
دل کا درد ہی بن سکتا ہے۔ گانا برا ہے، اس کی
حقیقت مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی ادا سمجھ۔

گانا بول ہی منع نہیں ہے۔

حلیہ سگیم، خیر، بحث، مباحثہ کا یہ موقع نہیں۔ خدا کے لئے

اسے تو سکون سے مرنے دوا
مرزا: خیر یہ تو ٹھیک ہے کہ میری ذات سے تمہیں سکون

نصیب نہ ہوا۔ میری خشک دہلے کیف زندگی تم
لوگوں کے لئے سنس خوشی کے پھول نہ کھلا سکی

صرف کانٹے آگاتی رہی ہے، لیکن مرنے پر بھی میری
وجہ سے سکون نہ ہو سکا۔ اتنی بڑی گالی دینے کی

چندال ضرورت بھی نہ تھی! حلیہ سگیم حیرت زدہ سو
ہو جاتی ہے۔ فیروزہ کروٹ بدلی کر آنسو پونچھتا،

ہے اور پھر باپ کی طرف غور سے دیکھنے لگتی ہے
مرزا بے چینی سے اور صراحت دھرتیلے ہیں)

فیروزہ: ابا! ذرا میرے پاس آکر بیٹھو۔
مرزا: (چوڑک اٹھتا ہے) حلیہ! ذرا فیروزہ کو سنبھالو! میں ڈاکٹر کو
بلا لاتا ہوں۔

فیروزہ: اہ... ہا... دیکھتے نہیں، کیسی طوفانی بارش ہو رہی ہے
آپ نہ جانیے۔ میں دوا نہیں کھاؤں گی..... میرا
پاس آکر بیٹھو..... اپنی بیٹی کے پاس۔

مرزا: (جنم بڑھو کر) مگر میرے رہنے سے تو تمہارا مرض اور
بڑھ جائے گا۔

فیروزہ: آج اور نہ بڑھے گا۔ آئیے ابا آئیے۔ (مرزا سر ہلنے
بند کر فیروزہ کی پیشانی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے
لگتا ہے) ابا۔ میں خوب چلا چلا کرتا تھا کوئی
آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟

مرزا: بولو، بیٹی بولو، ضرور بولو!
فیروزہ: آپ پورب کی کھڑکی کھولنے کیوں نہیں دیتے؟

مرزا: (دفعۃً بھڑک اٹھتا ہے) وہ مردود۔ باجی بد معاش
بند!۔ لیکن بیٹی، تو اچھی تو ہو۔ اگر وہ اس بار

بی۔ اے پاس کرے تو موتیوں کا یہ ہار اس کے
گلے میں ضرور ڈال دوں گا، یہ میں پہلے بھی کہہ چکا
ہوں۔

فیروزہ: لیکن ابا، میں اچھی ہونے سے رہی۔
مرزا: (کانپ جاتا ہے) نہیں بیٹی، میری بونہو راجی

گدروں گی — پورب کی کھر کی کی طرف سے تم
اپنی کھر کی کی جھلمی کھلی رکھنا!
حبیب: لیکن تمہارے گھر کی کھر کی تو بند ہے
فیروزہ: میں جاؤں گی تو وہ خود بخود کھل جائے گی۔
حبیب: تو پھر میں چلا...
فیروزہ: جاؤ — مگر میرے گھر کی کھر کی بد جو جھلمی ہے
اس کے نیچے وہی الوداعی گیت ایک بار پھر
سناتے جاؤ...
حبیب: (گاتلے) — آہستہ آہستہ اس کی آواز فضا میں
ٹوب جاتی ہے،

ہوتی میری الفت کی مالا فوروہ
جلی جا رہی ہوں کہاں ابدیدہ
کسے ڈھونڈتی ندی کے کنارے
بتاؤ کہاں نقش پا ہیں تمہارے
خدا جانے، مجھ کو یہ کیا ہو گیا ہے
میرا درد ملا میں گوندھا ہوا ہے
دھڑکن سے جو بتیاں ٹوٹتی ہیں
”نہیں ہے یہاں اب کئی بولی ہیں
جو برصا کی آگنی ہے تار پٹیں ڈھک
اسی آگ سے میں بھی ہو جاؤں کھنک
پکاروں میں اس پار تم کو یہیم
مدا د تم اس پار سے آگئے ہوں“

فیروزہ: اتنی، اتنی، میرا دل پیٹھا جاتا ہے۔ ذرا مجھے سنبھال کر
بٹھائیے — آبا آپ جانیے، خدا کے لئے جانیے...
اتنی اتنی ساری بتیاں کہاں سے جل اٹھیں! —
(خوش آجاتا ہے)

حبیب: کچھ سنتے ہیں آپ! — جلدی کیجئے ذرا ڈاکٹر کو بلا لینیے۔
میں آپ کے قدم چھوتی ہوں — میری بیٹی، میری گڑیا،
میری فیروزہ!

مرزا: فیروزہ بیٹی لوٹ آ بیٹی، ہوش میں آجا — میں حبیب کو
بلانے جاتا ہوں۔ (جلدی سے باہر نکل جاتا ہے)

ہو جائے گی۔ ابھی ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔
فیروزہ: اوں ہوں، — کبھی اچھی نہ ہو سکوں گی۔ اچھا آبا!
اسے اس گھر میں آنے کیوں نہیں دیتے؟
(دھنستہ مرزا بستر سے اٹھ بیٹھتا ہے اور چلاتا ہے) میں
اس کا خون کر ڈاؤں گا — شیطان نے میری بچی کو
مار ڈالا ہے۔

[اسی اثناء میں باہر دروازہ پردستک ہوتی ہے]
حبیب: میں آگیا — میرا خون کر ڈالئے — اتنی، دروازہ
کھولو، دروازہ...
مرزا: خبردار جو کسی نے دروازہ کھولا — بھاگ یہاں سے

مردود، پا جی!
حبیب: امتحان کے نتیجے شائع ہو گئے ہیں!
مرزا: تو نے پاس کیا ہے؟
حبیب: معلوم نہیں — تار بھیجا ہے۔ خبر آئی رہی ہوگی۔
مرزا: جھوٹا مسکار! پہلے خبر آجائے تو پھر آتا۔ ابھی دور ہو
یہاں سے۔ فیروزہ کی بیماری اور خطرناک ہو جائے گی۔
حبیب: جی، آپ میرا خون کر س گئے نا — مجھے قتل کر دیجئے،
مگر دروازہ کھولئے۔

حبیب: آنے بھی دو — تم پر تو ہر وقت جلال پڑھا رہا ہے۔
مرزا: تم چپ رہو — اس کی شرارت تم کیا سمجھو۔
ہو نہ ہو پولیس ساتھ لے کر آیا ہو گا۔ مجھ سے کہہ لو نا
چاہتا ہے کہ میں اس کا خون کرنا چاہتا ہوں۔ سنئے
کان کھولی کر! میں نے تیرے خون کرنے کی دھمکی کبھی
نہیں دی۔ تو بھلا مانس ہے تو چپ چاپ اپنے گھر
لوٹ جا۔

فیروزہ: اپنی رسوائی کے کیل درپے ہو! تم جاؤ — جاؤ خدا
کے لئے — مجھے تم مل گئے ہو۔

حبیب: میں تمہیں مل گیا ہوں!
فیروزہ: ہاں میں نے تمہیں پایا ہے۔
حبیب: لیکن میں نے تو کچھ نہیں پایا۔
فیروزہ: کل پا جاؤ گے — میں آج تمہاری ہی راہ سے ہو کر

(دوسرا منظر)

[عالم خواب - ساتویں تاریخ کی کشتی ہلال پر حبیب اور فیروزہ آس پاس بیٹھے نظر آتے ہیں۔ کشتی ہلال سے ابر سفید کا پردہ بندھا ہوا ہے۔ ایک سرخاب کشتی ہلال کو فضائے ملکوتی میں ہولے ہولے کھینچ رہا ہے۔ چکور اور چکوریوں کے برسے منڈلا رہے ہیں۔ سارے آسمان پر جنیبل کے سفید سفید بھول کھل اٹھے ہیں۔ درد سے حبیب کے چہرے پر مورہ لگی روشنی ناچ رہی ہے]

فیروزہ : ہم کہاں ہیں حبیب؟

حبیب : (ہنستے ہوئے) لا حول ولا اِ— یہاں کسی کو نام لے کر نہیں پکارتے۔ یہاں جو آتا ہے، وہ اپنا نام نشان چھوڑ کر آتا ہے۔ سمت و جہت سے بے نیاز ہو کر آتا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی حبیب آ سکتا ہے نہ کوئی فیروزہ۔

فیروزہ : یہاں ہم جو آتے ہیں۔

حبیب : ذرا اس چاندنی کی آرسی میں اپنا چہرہ غور سے دیکھو!

فیروزہ : (ہٹکا بٹکا ہو کر) یہ کیا ہوا؟ میرا چہرہ تو پہچانا نہیں جاتا میں کون ہوں؟

حبیب : (ہنستا ہے) تم کیا نظر آتی ہو؟

فیروزہ : میرے چہرے میں بہت ساری صورتیں دکھائی دیتی ہیں، جیسے شکنتلا، مالویرکار کی صورت، مہاشتا، جیسے لیلیٰ کی صورت — جیسے میرسن کی صورت۔

حبیب : بالکل ٹھیک ہے، تمہارے چہرے میں آج دنیا کی تمام برائی کی ماری عورتیں جمع ہو گئی ہیں — یہاں جو آتا ہے، وہ حبیب ہو کر آتا ہے یا "محبوب"۔

بن کر۔ اس دنیا میں مرد یا عورت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، کوئی پہچان نہیں۔ یہاں کی پہچان "حبیب" ہے یا "محبوب"۔ یہاں ہر شخص یوں ہی پکارا جاتا ہے۔

(فیروزہ شرم سے جھک اٹھتی ہے۔ چاند کے چاندوں طرف دھنک کے ساتوں آسمان پر دفعہ پھیل جاتے

ہیں)

فیروزہ : چپ، چکور، چکوریاں نہ سن لیں۔

حبیب : سننے دو۔ اس دنیا میں ہم نے محبت کی جو باتیں سیکھیں ہیں، وہ یہاں پہنچ کر تھمک بن گئی ہیں۔ دیکھی نہیں ہو، اس بساط نیلگوں پر یہ جو آن گنت تارے نمودار ہیں، یہ جو چکورا چکوریاں تارے کاٹ رہی ہیں، اپنی سرگوشیوں کو سننے کے لئے تو بے تاب ہیں۔

فیروزہ : یہ کون سادیں ہے، محبوب، (چاند ڈولنے لگا ہے) حبیب : دیکھا، چاند کیسے جھکولے کھا رہا ہے۔ تمہارے محبوب کہنے سے۔ اس لفظ سے اس پرزہ ساطاری ہو گیا ہے۔ یہ عالم خواب ہے۔

فیروزہ : یہ عالم خواب ہے! خواب تو ٹوٹ جائے گا۔ پھر میں تم سے بچھڑ جاؤں گی؟

حبیب : بچھڑا بھی سکتی ہو اور نہیں بھی۔ میں ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ یہ عالم خواب عارضی ہے۔ اسی لئے یہ اس قدر دلکش ہے، نہیں نہیں یہ عالم خواب لازوال ہے، یہ اراٹوں کی حسین و جمیل دنیا ہے، اسے موت کا سایہ چھو بھی نہیں سکتا۔ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے۔

فیروزہ : تو دل میں دوسرے سائیکوں پیدا ہوتا ہے؟ یہ خواب ابھی پریشان ہو جائے گا، اسی لئے تو؟

حبیب : یہ ختم ہو جانے کا ڈر، یہ گم ہو جانے کا اندیشہ اسی لئے یہ دنیا اتنی من موہنی اور مدھر ہے اسی لئے تو ہم ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی یہ خواب درہم برہم ہو جائے گا، اسی لئے تو ہم پلک جھپکاتے بغیر ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ گم ہونے کے خوف ہی سے تو یہ ستارے، سیارے، چاند اور سورج باہم مربوط ہو کر رقص کرتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرتے۔

فیروزہ: تو کیا یہ بہشت ہے؟

حبیب: ہاں، یہی بہشت ہے

فیروزہ: تو پھر دوسرے بہشتی لوگ کہاں ہیں؟

حبیب: شیریں، لیلیٰ، زلیخا۔ فریاد، مجنوں۔

حبیب: ذرا میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھو۔

فیروزہ: (ڈر کر حبیب سے لپٹ جاتی ہے) ارے کیا؟

تہارا چہرہ تو پہچانا بھی نہیں جاتا۔ اس میں وہ

تمام مرد نظر آ رہے ہیں جو ازل سے گریہ کناں

ہیں۔

حبیب: رہنس کر اور فیروزہ کی پیشانی کو اٹکی سے چھونے لگے

ڈرنے کی کوئی بات نہیں جانم! ایک مرتبہ پھر

میرے چہرے کو دیکھو۔ تم جس کو دیکھنا چاہو گی

وہی نظر آئے گا۔

فیروزہ: (غور سے دیکھتی اور اطمینان کا سانس لیتی ہے)

اچھا، مگر بہشت کے حور و غلمان کہاں ہیں؟

حبیب: وہ بھی سب یہیں ہیں۔ تم دل میں خیال کر و گی تو

فوراً سامنے آجائیں گے۔ یہاں ہر کام نیت سے

ہوتا ہے۔

فیروزہ: وہ سب ہمارے ہی اندر ہیں؟

حبیب: ہاں نہیں۔ اسی بہشت میں۔ مرنے دو۔

مرد، اور عورت۔ ہم اور تم۔ ازل سے

آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ بغیر ایک دوسرے کے

ہوئے۔ پاک چھپکنے ہی سے یہ دنیا اوجھل

ہو جاتی ہے۔ اگر آنکھ جھپکی تو حسن و سحر کا

یہ عالم تباہ ہو جائے گا، گم ہو جائے گا۔

اور ہم تم۔

فیروزہ: (حبیب سے لپٹ جاتی ہے) میرے محبوب!

[چاند ڈولنے لگتا ہے۔ چکوری چکوری تیزی

سے محو پرواز ہیں۔ حبیب اور فیروزہ دھیرے

دھیرے چاند کے ساتھ ہچکولے کھاتے ہوئے

فضائے بیسٹ میں محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔]

تیسرا منظر

[مرزا کی کوٹھی۔ فیروزہ پلنگ پر بے ہوش پڑی

ہے۔ کمرے میں ڈاکٹر، حلیمہ بیگم اور مرزا نظر آتے

ہیں۔ صبح کے آثار نمودار ہو چکے ہیں۔ آسمان اب

تک ابر آلود ہے۔ کسی پرندے کی آواز فضا کا

سینہ چاک کرتی، موتی دور تک چلی جاتی ہے۔

لائٹن کی روشنی کچلا چلی ہے۔ حلیمہ بیگم بار بار پتو

سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہے اور فیروزہ کے چہرے

کی طرف غمگین نظروں سے دیکھتی ہے۔ مرزا بے قرار

میں کبھی ٹہلتا اور کبھی ٹنگتا ہے۔ دفتہ پورب کی

کھڑکی پورے طور پر کھول دیتا ہے۔ حبیب کا گھر

قبر کی خاموشی میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ حبیب کے کمرے

کی کھڑکی بند ہے۔ البتہ اس کی جھلملی کھلی ہوئی ہے

بھلملی میں سے بکھتے ہوئے چراغ کی زرد، اداس روشنی

خشک آنسوؤں کی طرح چمکتی ہے۔ اندر اور کچھ نظر نہیں

آتا۔ ڈاکٹر بار بار فیروزہ کی نبض ٹٹولتا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر

اس کے ہاتھ میں ایک سوئی لگا تلے اور خاموشی سے

آنکھیں پونچھتا باہر چلا جاتا ہے]

(حلیمہ دفتہ پھٹاڑ کھا کر فیروزہ پر گرتی ہے)

حلیمہ بیگم: بیٹی، میری فیروزہ، واپس آجا، تو واپس آگئی۔ میری

جان، میری روح۔

مرزا: فیروزہ بیٹی، میں اسے دھو دھو لے جا رہا ہوں۔ خدا یا،

اس بار تو مجھے معاف کر دے! میں تیرا فضا سمجھ گیا ہوں۔

حلیمہ، میری بیٹی کو سنبھالے رکھنا۔ میں حبیب کو تلاش

کر کے لاتا ہوں۔ (طوفان کی تیزی سے باہر چلا جاتا ہے)

فیروزہ: امی، بہت رونی ہوتا؟ وہ کیا! پورب کی کھڑکی کس

نے کھولی؟

(حلیمہ بیگم بیٹی کی پیشانی چومتی ہے)

حلیمہ بیگم: تمہارے ابا نے کھولی ہے۔

فیروزہ: ابا کو ذرا بلا دو۔

حلیہ بیگم: وہ تو حبیب کو لانے گئے ہیں۔ آج تم دونوں کی شادی ہے نا (اداس ہنسی ہنستی ہے)

فیروزہ: (چٹکیلی مسکراہٹ کے ساتھ) امی، تم اب کو بہت چاہتی ہو نا؟

حلیہ بیگم: (ن ہنستی ہوتی) آج پہلی بار (منہ پھیر لیتی ہے)
(فیروزہ مال کا ہاتھ چومتی ہے)

فیروزہ: ہر معاش کہیں کی۔ تب تو سمجھو آپ کی شادی بھی آج ہی ہوئی ہے! تو میں تمہاری کیا ہوئی؟

حلیہ بیگم: تو ہماری بیٹی ہے، لاڈ ہے، اور کیا؟
فیروزہ: (اچانک اٹھ بیٹھتی ہے اور حبیب کی جھلکی کی طرف

گھورنے لگتی ہے) امی، امی، وہ کھڑکی کیوں بند ہے؟
حلیہ بیگم: روٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے رات کو کہاں چلا گیا ہے۔

جلنے لگا کہاں؟ آتا ہی ہوگا۔ تمہارے آبا اس کے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔

فیروزہ: (مرغ بسل کی طرح بستر پر لوٹنے لگتی ہے) امی، اب وہ نہ لوٹے گا۔ میرا خواب سچا ہے۔ اس کے آنسو

ڈوبتے ہوئے چاند کی آنکھوں میں تیر رہے ہیں۔
امی، امی۔ یہ کیا ہے.... یہ کون کا رہا ہے....

[دور فضا میں حبیب کے گانے کی خم انگیز آواز آتی ہے]

اے میرے محبوب! تو میرے حافظ کی دوسری طرف جلوہ گر ہے۔
میں تجھے شاید پہچانتی ہوں۔

میں تیرے چاند سے آشنا ہوں، تو میرے ستارے کو جانتا ہے۔
اس جلن پہچان کی وجہ سے میں تارہ بن کر جاگتی ہوں اور بار بار

چمک کر فضا میں کھو جاتی ہوں۔ میں پکولہ بونے چراغ جلائے
تیری راہ دیکھ رہی ہوں۔

اے میرے محبوب! اپنی کھڑکی کی جھلکی بٹا دے۔ چراغ بجھتا ہے
اسے بھاری بنا ہی اچھا ہے۔

نئے تاروں کے ساتھی پکارتے ہیں! اے میرے محبوب! میرے دل،
میری راتیں و دہلی گیت سن کر کیوں روتی ہیں؟

فیروزہ: امی، امی۔ چاند کے اس پار یہ گیت سنائی دیتا
ہے۔ یہ گیت عالم خواب کا گیت ہے۔ دولع

کا گیت ہے۔ امی، امی، امی!
حلیہ بیگم: حبیب، حبیب۔ میرے بیٹے، دوڑ کر آ جا۔

تیری فیروزہ کی رخصتی کی گھڑی آچکی ہے۔ بیٹی،
میری بیٹی (تڑپتی اور لوٹتی ہے)

(زوروں سے دروازہ پر دستک ہوتی ہے)
حبیب: مرزا صاحب، دروازہ کھولئے۔ تار آ گیا ہے میں

پاس ہو گیا ہوں!۔ دروازہ کھولئے۔ (دروازہ
پر اتنے زور سے ٹکراتا ہے کہ وہ ٹوٹ جاتا ہے)

امی، امی، فیروزہ کہاں ہے میں پاس ہو گیا ہوں
دیکھو یہ تارا، امتیاز کے ساتھ پاس ہوا ہوں۔

حلیہ بیگم: حبیب، حبیب، دیر ہو گئی بیٹے، فیروزہ کی رخصتی
تو ہو بھی چکی!

حبیب: (گلوگہ آواز میں) رخصتی!۔ ہو چکی!
حلیہ بیگم: ہو چکی بیٹے، اس پورب کی کھڑکی کی طرف سے۔ لو

اب میں کھڑکی کی جھلکی کھولے دیتی ہوں۔
حبیب: امی، امی۔ میں اسے ڈھونڈنے جاتا ہوں۔

اس ڈوبتے ہوئے چاند کی آنکھوں میں اس کا اشارہ
صاف لہر رہا ہے۔ فیروزہ!۔ فیروزہ!

(جھجکڑ کی تیری سے دوڑ کر نکل جاتا ہے) +

ہماری موسیقی

فنِ نغمہ کی تاریخ - اور اس کے فلسفہ پر سیر حاصل نظر

مرتبہ: رفیق خاورد

نئے موضوعات کا اضافہ

پاکستانی موسیقی کے موجودہ مسائل

ساز و آہنگ کی دنیا میں مسلمانوں کا عظیم حصہ

مسلمان فنکاروں کے اعجازاتِ موسیقی، تمدن و تاریخِ انسانی میں نغمہ و آہنگ نے کیا کردار ادا کیا

چند موضوعات

مشاہیرِ موسیقی: امیر خسرو، سلطان حسین شرقی، میاں تان سین، شاہ عبداللطیف بھٹائی، تان رس خاں، سیت خاں، فیروز خان

تاریخِ موسیقی: موسیقی اور تمدن، عالمِ موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ، پاکستانی موسیقی، ہماری موسیقی کے ساز

پاکستانی موسیقی: مشرقی پاکستان کے لوگ گیت، راگِ درپن (وارث شاہ)

مسائلِ موسیقی: تجدیدِ موسیقی، قومی ترانے کی موسیقی اور سرگم، ہماری موسیقی کے مسائل، سرنولسی۔

چند ممتاز اصحابِ قلم

سید عابد علی عابد، جناب شاہد احمد دہلوی، جناب خادم محمد الدین، نافی

احمد میاں اختر جوگہاڑی، ڈاکٹر نسی کش خاں بلوچ، فیروز نظامی، سید طیبہ آغا،

سجاد سرتود نیازی، احمد جی، چھاگلا - سید امجد علی، عاصمہ حسین، امین الرحمن،

رفیق غزنوی اور ماہم آذوری۔

کتاب میں مختلف سازوں کی آرٹ پیپر پر بھی ہوئی آٹھ

صفحے کی نفیس تصاویر بھی شامل ہیں - کتاب

نفیس اردو ٹائپ میں نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت

سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

قیمت صرف پانچ روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۸۳ کراچی

”تن کے سونے شہر میں باہو...“

سلمان باہو رح
ترجمہ: سرور مجاز

علم ہدایت سے خالی ہوں ایسے ہادی جھوٹے ہو
مردیکہ حق حاصل ہو تو پھر کیا موت کے کھٹکے ہو
پیر ملے پیر پیر نہ جائے ایسے پیر بکھتے ہو
وہ مرشد بھی کیسا باہو جو ارشاد نہ بخشے ہو

بات پڑھنے والا باہو فاضل ہو گا کیسے ہو
جس نے لفظ حقیقت پایا بخت اسی کے اسیچے ہو
نیت افلاک کریں جگ روشن پھر بھی ظلمت ناچے ہو
ہو حق کی تبدیل نہیں تو سامنے علم میں قیصے ہو
تن کے سونے شہر میں باہو دل ہے ایک محلہ ہو
ہونے دل میں بس کر میری کی ہے خوب تسلی ہو
سب کچھ میں سنتا ہوں باہو ایک سوائے اللہ ہو
بے دردوں کی دنیا باہو پھڑوں کا ہے سگھہ ہو

جیتے جی مر رہنا ہو تو سنگ فقیراں رہے ہو
گر کوئی کالی طعنہ دے تو اس کو جی جی کہئے ہو
کوڑا کرکٹ پھینکے کوئی کوڑا بن کر رہے ہو
یا ر کی خاطر اس دنیا میں سب کچھ باہو سہئے ہو

کیا بغداد کی باتیں باہو کانٹے جس کے کلیاں ہو
میرے تن پر کپڑے جیسے درزی کاٹے لیراں ہو
ان لیروں کی کفنی پہنوں جاؤں سنگ فقیراں ہو
پھر بغداد کے شہر میں مانگوں بولوں میراں ہو

پڑھ پڑھ علم دکھائے سب کو کیا تیری دانائی ہو
دودھ اگر بھٹ جلے باہو کیا آئے بالائی ہو
سونا ہاتھ میں لیکر باہو ہاتھ نہ بد لے راٹی ہو
ٹوٹے دل جو راضی کرے اس نے منزل پائی ہو
ملاحفظ کریں تکبر لوگ بچارے سیدھے ہو
بغلوں میں یہ داب کتابیں چھانیں گلیاں کوچے ہو
دعوت دیکھیں جہاں مرغن وہیں لگائیں ڈیمے ہو
بیچ کائی کھائیں باہو دو جگ کے ٹھکرائے ہو

پڑھ پڑھ علم کتابوں والا عالم ہو گئے سارے ہو
عشق کا لفظ نہ جانیں باہو لوگ بڑے بے چارے ہو
ایک نگاہ سے عاشق دیکھے لاکھ کر ڈستارے ہو
لاکھ نگاہ سے دنیا دیکھے دنیا پھر بھی مارے ہو

سانول

خواجہ غلام فرید بہاولپوری
مترجمہ: حشمت فضل

اوسانور یا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
چاروناک کی چاندنی جو بن یونہی بیت نہ جائے
مکھڑا ایسا سند جس کو دیکھ کے من لپ جائے
اوسانور یا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
او کو لکھا کوک نہ اتنی ترپے مورا منوا
میں جل جل کر اکھ بھی ہوں یاد آئے ساخو
ہے پردیس میں مورا پر تیم کیوں مجھ کو ترپائے
اوسانور یا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
تل جل کاٹیں جیون آجا پریت نبھائیں ساؤل
ایسا نہ ہو موراؤل تجھ بن جیسے مرگئی مومل
جیون جوت بھیجے پر راجہ آئے تو کیا آئے
اوسانور یا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
چھوڑ کے اجیئے تمل کو آجا "ماڑ" کریں آباد
من کو چاہ ملن کی تیرے کرے اس کو شاد
ساو باں، سول ملن کو مینا گوں تو جو بھل جائے
اوسانور یا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
تیری کارن پلک پلک پر میں نے دیپ چلائے
چنچل چال کے دکھن کو میں تیرے ہی ہوں ٹائے
ساجن تیری راہ میں ٹٹھی ہوں میں نین بچائے
اوسانور یا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
چا دو گرہیں تیرے چنچل مشغ، کیٹیلے نین
گھنگھر والے بال میں ظالم من کو کوں بے چین
اوسانور یا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
چاروناک کی چاندنی جو بن یونہی بیت نہ جائے

اترا ترے کنارے...

(وادئی سندھ میں عربوں کی آمد)

عبداللہ شہید خان

اد پر کھول دیئے مسلمان سیاحوں کو لوازمات سفر کی بھی چنداں ضرورت نہ پیش آتی تھی۔ ان کے ٹھہرنے کے لئے مساجد موجود تھیں اور کھانا پکانے کا بجائے سرائیں بھی بنا دی تھیں۔

مسلمانوں کی حکومت کا پرچم اگر ایک طرف اطلالنگ کے ساحلوں سے الگ تھلگ چین تک ہزار ہا تھا تو دوسری طرف بحیرہ کیپسین سے سندھ تک مسلمان پہنچ چکے تھے۔ ساتویں صدی سے چودھویں صدی تک مسلمان تجارت، حکومت اور سیاحت کے میدانوں میں آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ علم و حکمت اور تحقیق و ثقافت کی حدود بھی ان کی جولانگاہیں تھیں۔ تاریخ و جغرافیہ، ہیئت و نقشہ ساز، مصنوعات و نوادیر — غرض علم اشیاء کی جہان بینی میں مسلمان اُس وقت کی تمام اقوام عالم سے بڑھ چکے تھے کیونکہ علم و دانش کے پرانے سونے اس وقت ہر جگہ سوکھ چکے تھے۔ ”سلسلۃ النوارین“ ابو زید کے حاشی، ”کتاب المسالیک“، ”کتاب البلدان“، ”تاریخ البلدان“ اور یعقوبی، قزوینی، ابوالفدا کی تالیفات کی اہمیت سے آج کون علم دوست منکر ہو سکتا ہے۔

اگر ہم اس بڑے تغیر کی تاریخ پر ہی غور کریں تو کئی اہم باتیں معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ ابن بطوطہ کا احاطہ، القوی کی ”مسالک الابصار“ اور قلقشنڈی کی تحریریں جس قدر مکمل واضح اور محکم حالات و کوائف کی پمدہ کشائی کرتی ہیں ان کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

بہر کیف، میں یہاں سندھ پر عرب تسلط کی کہانی مختصر بیان کرتا ہوں۔ یہاں حرب کوئی دو سو سال تک جھک رہا ہے اور اپنی تہذیب کے امنٹ نشان چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ یہاں ہندو حکمرانوں کا پھر تسلط ہو گیا۔

اسلام کی فتوحات کے ساتھ مسلمانوں میں ذوق سفر کو بھی ترقی ہوئی اور ان کی فہم کو طلبیت نے بھی ان کا بڑا ساتھ دیا۔ ماضی میں بہت سی قومیں پانی سے ڈرتی تھیں، بہتوں کے نزدیک سمندر پار جانا پاپ تھا، مگر مسلمانوں نے سہر طلمات تک میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے تھے اور جس سرزمین پر پہنچ جاتے تھے اپنے پیچے کشتیاں جلا ڈالتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی ہمت عالی تو تھی ہی مگر ایک فرمان خدا وندی بھی تھا — ”سیر فی الارض“۔ مسلمانوں نے لفظاً و معنیاً اس پر عمل کیا اور دنیا کو دیکھنے، جاننے اور دریافت نو کے مرحلے سر کرنے میں وہ حیرت انگیز طرہ تک پہنچ گئے حالانکہ سفر کی صعوبتیں اور دشواریاں، جوان کو پیش آتی تھیں وہ اس قدر ہمت شکن تھیں کہ دنیا میں قدم اس طرح کی جرأت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ مسلمانوں نے تجارت و سیاست، حکومت و سروری کے ڈانڈے علم و حکمت سے طار کھے تھے اور انی دونوں میدانوں میں ان کا ترقی پسند قدم آگے ہی بڑھتا جاتا تھا۔ آج ان کے سفری کارناموں کی داستان سنو اور تاریخ و جغرافیہ کے میدانوں میں ان کی علمی تحقیق کاموں کی کہانی کو دہراؤ تو عقل و دنگ رہ جاتی ہے جوں جوں حکومت کی حدیں آگے بڑھیں، دھند نزدیک کے ہمایوں سے پہچان بھی بڑھی۔ پڑھی ملک کے حالات، جاننے کے لئے لوگ پھیلنے ہی چلے گئے۔ کسی کو علمی جستجو تھی، کسی کو زور کا شوق، کسی کو عقائد و لباس و اطوار زیت جاننے کی دھن تھی تو کسی کو نہایت جمع کرنے کا ذوق۔ سچ نے مسلمانوں کو ہر سال ایک مرکزی مقام پر جمع ہونے کا حکم دیا تھا، اس کی عملی حکمت اب روشن ہو رہی تھی۔ فرمان نبویؐ یہ تھا کہ علم کی تلاش میں جاؤ اگر وہ دور چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں نے ان باتوں کو گروہا باندھا اور عمل کے ذریعے دین و دنیا کی دولتوں کے دروازے کھلے

مسلمانوں کے شہر اور قلعے اُن کے ہاتھ سے نکل گئے اور قلب سندھ میں بہت سی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اسی دور میں فاطمی داعیوں کے گروہ ادھر آنے شروع ہوئے اور مسلمانوں کے عروج کی داستان پھر سنائی دی۔ ۹۷۷ء میں انہوں نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور عربوں کا شہر منصورہ جو ہمارے ہاتھ سے صحرایہ تھا ۸۵۵ء میں اسماعیلیوں کے قبضہ میں آ گیا۔

اس تمام دور میں سندھ کا تعلق باہر کی اسلامی دنیا سے بھی برقرار رہا۔ ایک طرف ہندوستان سے باہر کے اسلامی حاکم کے ساتھ اور دوسری طرف خود اس برصغیر کے ساتھ۔ یہ دور علمی و ثقافتی روشنی کا بھی دور تھا اور سندھ کے علماء، شعراء اور صوفیا کا شہر دمشق و بغداد تک پہنچا تھا۔ عرب مؤرخوں اور جغرافیہ نویسوں نے آج سے ۸۰۰ سال پہلے کے سندھ کا جو حال اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے وہ داستان ایک سہری داستان دینے پر حیرت کہ عربوں کی بہت سی مادی نشانیاں مرور آیام اور حادثہ فطرت بالخصوص دریائے سندھ کی طوفانی خیز لہروں نے ختم کر دی ہیں مگر جریدہ عالم پر عربوں کی تہذیب و تمدن کے جو نشان ہیں وہ انمٹ اور جاودانی ہیں۔

جس وقت عربوں نے سندھ کی سر زمین پر قدم رکھا یہاں کا سب سے بڑا شہر برہمن آباد (الہیرونی کے مطابق برہمن) تھا، مگر سیاسی و فوجی مصالحوں کی بنا پر عربوں نے اپنے بھی کئی شہر بسائے جیسے منصورہ اور محفوطہ۔ محفوطہ دریائے سندھ کے اُس پار تھا اور منصورہ ساحل سمندر کے قریب برہمن آباد سے کوئی ۲۰ فرسخ کے فاصلہ پر عربوں نے ہی دریائے سندھ کو ہرآن کا نام دیا۔ اسی کی ایک شاخ منصورہ کے گردا گرد بہتی تھی۔ ابن حوقل کے بیان کے مطابق یہاں دریا بجیرہ عرب میں آ کر گرتا ہے منصورہ اس کے پاس تھا۔ ابوالفضل اسے پرانے بکھرے تعبیر کرتا ہے۔ بعد میں یہ منصورہ ہی عربوں کے قبریشی حکمرانوں کا صدر مقام بنا اور دارالامیر کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ شہر تقریباً ایک مربع میل کو محیط تھا۔ آب دہوا اُن کی طرح اُس وقت بھی گرم تھی۔ حالات لکھنے والوں نے بتایا ہے کہ یہاں کھجور اور نیشکر بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ عرب

سیاح کہتے ہیں کہ ہم نے یہاں صرف ایک ہی پھل پیدا ہوتے دیکھا جسے لوگ لیٹوں کہتے ہیں۔ یہ سیب کی برابر ہوتا ہے، بڑا کھٹا اور ایک پھل ہوتا ہے، خوش ذائقہ، جسے امباح (آنبہ) کہتے ہیں۔ یہ پھل کثیر اور سستے تھے۔ بعض عرب سیاح کہتے ہیں منصورہ خلفائے عباسیہ کے چشم و چراغ المنصور کے زمانہ میں بنا تھا۔ مگر تاریخی حقیقت یہ ہے کہ یہ شہر عباسیوں سے بہت پہلے امویوں کے عہد میں تعمیر ہو چکا تھا۔ ابن حوقل نے بھی اس کی پائش ایک میل لمبی اور ایک میل چوڑی بتائی ہے۔ بشری کے نزدیک منصورہ مرکزی شہر ہے، سندھ کا دارالحکومت ہے اور دمشق کی مثال ہے۔ مکانات لکڑی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ جامع مسجد اینٹوں اور پتھروں کی ہے۔ اور کافی وسیع ہے۔ شہر کے چار بڑے دروازے ہیں۔ عمارات ٹانگوں، پتھر اور مٹی کی ہیں۔ ان پر پلستر بھی ہے۔ بہت بارونی شہر ہے۔ فرحت و سیر کی جگہ ہے۔ کوچہ و بازار لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ اور ہر طرح کا مال سامان فروخت کے لئے موجود رہتا ہے۔ کم رتبہ لوگ ایرانی لباس پہنتے ہیں مگر امرا بھاری مرصع عبا ئیں استعمال کرتے ہیں۔ نیز شلواریں اور کرتے بھی۔ بال بے رکھتے ہیں۔ سونے اور تانبے کے سٹے چلتے ہیں۔ تاناری سٹکے بھی رواں ہے۔ درہم (دینار) کا وزن عام درہم سے پانچ گنا زیادہ ہے پھل بہتات سے ہے۔ گوشت زرا ہے، بیرونی اور مقامی پھلوں کی کثرت ہے۔ منصورہ کا بیان ہے کہ منصورہ کی حکمرانی میں تین ہزار دیہات اور گاؤں ہیں۔ حاکم کے پاس ۴۰ ہزار فوج اور آٹھ ہاتھی بھی ہیں۔ بشری نے لکھا ہے کہ یہاں کے لوگ عام طور پر خوش خلق ہیں۔ علم کا بازار گرم ہے اور بہت سے جید عالم یہاں موجود ہیں لوگ خوش باش چاق و چرند اور ہنرور ہیں۔ اوصاف حمیدہ سے متصف۔

ٹانگ اور شہر جو آج بھی ہمارا بڑا شہر ہے ملتان تھا۔ خود داد بہ کا کہنا ہے کہ یہ شہر سجستان کے صدر مقام زہد سے کوئی دو ماہ کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ بھی منصورہ کی برابر بڑا ہے اور اسے ”مدینۃ الذہب“ (سونے کا گھر) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نام بھی عربوں نے دیا تھا کیونکہ جب عربوں نے ملتان فتح کیا تو یہاں انہیں چالیس ہجرت کی برابری

مالک تھا۔ لوگوں کے دسترخوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے تھے، یہ ہند کا حقہ مانجا جاتا تھا اور ایک دریا کے کنارے بنا ہوا تھا جو سمندر کے مقام پر مہراں سے آکر مل جاتا تھا۔ ملتان سے منقرہ ملک کے علاقے میں ایک قوم آباد تھی جو نادھ کہلاتی تھی۔ اس میں بھی کئی قبیلے تھے جو تباران سے مکران اور منقرہ سے ملتان تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ برہمنی خانہ بدوشوں کی مانند تھے اور عجیب طرح کے گھر بناتے تھے۔ اکثر مہراں کے ارد گرد دلدلوں میں پناہ لیتے تھے۔ ان کے اونٹ بڑے عمدہ ہوتے تھے۔ اس میں ایک قسم "کرہ" کہلاتی تھی جس کے دو کوبان ہوتے تھے اور خراسان کے علاقے میں ان کی بڑی ملک تھی۔ یہ اونٹ خوش خوش ہوتے تھے۔ ان کے علاقے میں اناج کھکشا، بھل، اونٹ، بیل اور بھیڑ بکڑت موجود تھے۔ اس علاقے کو "علی" کہا جاتا تھا اور وجہ اس کی یہ تھی کہ ایک شخص علی نامی نے اسے فتح کیا تھا اور اسے اپنی ملکیت بنا لیا تھا۔

اب عربوں کے مشہور شہر دیبل کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ یہ "ہفت اقلیم" کے دوسرے قطع میں واقع تھا۔ "تقریم البلدان" کا مصنف کہتا ہے کہ یہ سندھ کے ساحل پر واقع تھا مگر بڑا گرم شہر تھا۔ اس لئے اس کی آبادی کبھی نہ تھی۔ مہراں کے جانب شرق بنا ہوا تھا اور سامنے سندھ کی کھاری تھی۔ یہ سندھ کی سب سے بڑی اور مشہور بندرگاہ بھی تھی۔ اس لئے کاروبار بہت ترقی پر تھا۔ یہاں سرسوں بہت تھی، کھجور بقرہ سے منگائی جاتی تھی۔ منقرہ اور دیبل کے درمیان چھوڑ کا سفر تھا۔ "تقریم البلدان" کا مصنف ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے ہے کہ ایک اور بڑا شہر سدوسان یا سپہوان ہے۔ یہ مہراں کے مغرب میں ہے۔ یہ اس مقام پر بنے جہاں ہفت اقلیم میں سے تیسری اقلیم کا خط گزرتا ہے۔ ابن حوقل لکھتا ہے کہ "یہ بڑی زرخیز جگہ ہے۔ دولت کی افراط ہے۔ بازار بڑے بڑے ہیں اور چاروں طرف بہت سی بڑی بستیاں اور منڈیاں بنی ہوئی ہیں۔"

سودا دستیاب ہوا تھا۔ ایک "بحرہ" کا وزن ۶۶۲ پونڈ (انگریزی) ہوتا تھا۔ ملتان میں سودے کا ایک بہت بڑا بت بھی رکھا ہوا تھا جس کے استھان پر بڑا قیمتی چڑھاوا چڑھتا رہتا تھا۔ اس بت کو ایک قسم کی سرخ کھال سے ڈھک رکھا تھا اور صرف آنکھیں چھتی رہتی تھیں۔ یہ آنکھیں قیمتی پتھروں کی تھیں۔ سر پر سنہری مکھڑھار رہتا تھا۔ یہ بت مربع شکل کا تھا، اس کے چار ہاتھ تھے جو کہنی سے نیچے پہنے ہوئے تھے۔ مندر پر سنہری کلس تھا اور بڑے بڑے مضبوط دروازے تھے۔ ستون بلند اور دیواریں ٹھیک تھیں۔ پوجنے والوں کے نزدیک ہندو سند میں اس کے مقابلہ کا کوئی قابلِ تکویم صنم نہ تھا۔ اس پاس کے رجاؤں نے جب آپس میں جنگیں جہاں کرتے تو اس مندر کے پجاری مل کر غار بین کو دھمکاتے کہ اگر انہوں نے ملتان کے اس پاس میں خونریزی کی تو مندر کے بت کو جلال آجائے گا اور تمہیں توڑ پھوڑ کر برباد کر دے گا۔ اکثر یہ دھمکی کارگر ثابت ہوتی تھی اور لٹنے والے باز آجاتے تھے۔ اس وجہ سے لوگوں کے دلوں میں بت کی ہیبت بھی تھی اور عزت بھی کیونکہ وہ اس طرح عوام کو تباہیوں سے بچالیا کرتا تھا۔ ابن خرداد بہ کا کہنا ہے کہ ملتان ایک بہت بڑا شہر ہے۔ چاروں طرف ایک فیصل ہے جس کے چار بڑے پھیلاؤ ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں افراط سے ملتی ہیں اور لوگ مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ منقرہ کی طرح یہاں بھی لوگ شہوار پہنتے اور فارسی و سندھی بولتے ہیں۔ اطراف شہر میں ایک نہر بہتی ہے جو آخر کار مہراں میں آکر گرتی ہے۔ شہر سے نصف فرسنگ کے فاصلہ پر ایک قلعہ ہے جہاں حاکم رہتا ہے۔ وہ کبھی ملتان نہیں آتا سوائے نماز جمعہ کے لئے۔ اس وقت وہ ہاتھی پر سوار ہوتا ہے اور اس سے اتر کر نمازیوں میں آن ملتا ہے۔ یہاں کا حامل (گورنر) قریش ہے مگر منقرہ کے حاکم کا باجگزار نہیں ہے بلکہ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے۔

عرب مؤرخوں نے ایک اور سندھی شہر کا نام لیا ہے۔ اس کا نام سندھور تھا جو ملتان کے جنوب میں تین دن کی فاصلہ پر واقع تھا۔ یہ تجارت کا مرکز تھا اور بڑی دولت و حشمت کا

ہیں اور حاکم کو بڑی آمدنی ہے۔

علاء الملک کی ہمرہی میں وہ ایک میدانی جگہ پہنچا ہے جو تہہ کہلاتی ہے اور شہر سے سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں اسے پتھر کی بیٹھاریوں سے تیاں اور جانور نظر آئے۔ کہتے ہیں کہ یہ خون بدل گئے ہیں۔ کسی کا صرف سر سے کسی کا صرف پاؤں۔ وقس علی ہذا۔ بعض پتھروں کی شکل دانوں کی سی تھی۔ گہروں سے بھی معلوم ہوتے تھے اور دان سی چیز بھی نظر آئی۔ مکانوں کی نمود اور شہر بناہ بھی دکھائی دیتی تھی۔ پھر ہمیں ایک مکان کے آثار دکھائی دئے جس میں تراشیدہ چٹان کی ایک کوٹھڑ بھی تھی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ ایک پوری چٹان انار سے کھدی ہوئی لگی ہے۔ اس پر ایک مجسمہ دھل تھا جو انسان جیسا معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ سر پہنٹ بڑا تھا، اور اس کا دہن چہرہ کے ایک رخ پر پھل ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جانب پشت تھے جیسے وہ کوئی قیدی ہو۔ ادھر ادھر ٹری بدبو دار جمیلیں سی تھیں۔ بعض دیواروں پر ہندی حروف کندہ نظر آئے۔ علاء الملک نے ابن بطوطہ کو بتایا کہ بعض مورخین کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا مگر تھا مگر یہاں کے لوگوں کو پتھر کا بنا دیا گیا اور یہ مجسمہ ان کے سردار کا تھا جس پر عتاب نازل ہوا تھا۔ اس مکان پر اب بھی ناچہر کا گھر کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب!

ابن بطوطہ کی معلومات کے مطابق پتھر بھی ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب۔ اس کے وسط میں سے دریائے سندھ کی ایک نہر بہتی تھی۔ نہر کے بیچ میں ایک جگہ تھی جہاں مسافروں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اسے کھلو خال نے بنایا تھا جس وقت وہ سندھ کا گورنر تھا۔ یہاں ابن بطوطہ کی ملاقات شہر کے قیدی سے بھی ہوئی جن کا نام تھا صدر الدین الخنقی۔ شہر کے قاضی ابو حنیفہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ شیخ شمس الدین محمد الشیرازی، ایک خدا رسیدہ نیک سیرت بزرگ سے بھی ابن بطوطہ ملا اور انہیں ۱۲۰ سال کی عمر کا پایا، ان کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔ پتھر کے شہر سے وہ ”اجہ“ کی طرف گیا۔ یہ بھی دریائے سندھ کے کنارے پر بسا ہوا تھا اور ٹہا بار ولق شہر تھا۔ اب وہ سندھ کے دار الحکومت ملتان تک پہنچا ہے۔ یہیں امیر الامرا کا قیام ہے۔ یہاں سے کوئی دس میل کے فاصلہ پر سرک کے کنارے عسروا بادا ایک جی اسے ملی جہاں دریا بھی بہتا تھا اور

اچھا شہر تھا۔ اس دیکھو وہ ایسا دریا جاتا ہے جسے بغیر کشتیوں کے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ ملتان کی سرک یہیں سے گزرتی ہے۔ یہاں مسافر کو ٹہرنا پڑتا ہے اور بڑی سخت تلاشی لی جاتی ہے۔ ابن بطوطہ کا تجربہ یہ ہے کہ جب ہم یہاں پہنچے تو رواج یہ تھا کہ سوداگر جو بھی سامان لائیں اس کا چوتھائی حصہ حاکم ملتان کے حوالہ کر دیا جاتا تھا یعنی سرکاری مال خانہ میں جمع ہو جاتا تھا ہر گھوڑے پر سات دینا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ جب ابن بطوطہ دو سال بعد ہندوستان سے لوٹا تو سلطان کے حکم سے یہ ٹیکس معاف کر دیا گیا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ سوداگر لوٹے سے سوائے زکوٰۃ اور عشر (دسواں حصہ) کے کچھ وصول نہ کیا جائے اور اسے عباسی خلیفہ، ابوالعباس کے نام کی قسم کھانی پڑتی تھی۔ ”میرے سامان کی تلاشی شروع ہوئی تو سخت پریشانی ہوئی۔ کوئی مال دولت تو نہ تھا مگر بچے بڑے بڑے دکھائی دیتے تھے! مگر خدا کا کرم کہ قطب الملک، گورنر ملتان، کا ایک بڑا فوجی افسر ادھر سے گزرا اور اس نے حکم دیا کہ میرے سامان کی تلاشی نہ لی جائے اور ایسا ہی ہوا۔“

”ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور رات لب دریا بسر کی۔ دوسرے روز صبح ملک البرید (سپرٹنڈنٹ ڈاک) ہمارے پاس آیا۔ یہ اصل میں سمرقند کا رہنے والا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو شہر اور محلہ کا کاروبار دیکھتا اور خبر نامہ تیار کر کے بادشاہ کو پرچہ بھیجتا۔ اس خبر نامہ سے ہر آنے جانے والے کی بابت اطلاع اور دوسرے احوال و حادثات کی خبر بادشاہ کو ملتی رہتی تھی۔ میں اس کی ہمرہی میں عامل ملتان کے پاس پہنچا۔ اس سرکاری افسر نے ہی عامل سے اس کا تعارف کرایا جو بہت خندہ پیشانی سے ملا اور مصافحہ کر کے اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ یہاں ابن بطوطہ نے عامل کی خدمت میں ایک غلام، ایک گھوڑا، کچھ کمکش اور بادام بطریق نذر گزارنے۔ ہند کے امراء کی خدمت میں یہ چیزیں بطور تحفہ یوں پیش کی جاتی تھیں کہ یہاں کیا بات تھیں اور زیادہ تر خراسان سے منگائی جاتی تھیں۔ اس امیر کا احوال ابن بطوطہ سے ہی سنئے

”یہ امیر ایک بڑے تخت پر بیٹھا تھا جو کالیٹوں سے مزین تھا۔ نزدیک قاضی صاحب تشریف فرما تھے جن کا نام سالار تھا۔ نزدیک خلیفہ تھے، جن کا نام میں نہیں جانتا۔ دائیں اور بائیں جانب فوجی

گھی میں پکا ہوا سالن حاضر کیا جاتا ہے۔ اس میں پیاز و حنیہ اور ک
وغیرہ بھی ہوتا ہے یہ سالن چین کی بنی ہوئی نفیس رکابیوں میں
پیش ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک شے سامنے رکھی جاتی ہے جسے
یہ لوگ 'سموسہ' کہتے ہیں۔ اس میں قیمہ ہوتا ہے جس میں بادام،
اخروٹ، لہسن، پیاز اور مسالے لے ہوئے جوتے ہیں ویر باریک
ورق جیسی، گھی میں پکی ہوئی روٹی کا خول ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے
سامنے ایسے چار یا کچھ سموسے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد گھی میں
پکے ہوئے چاولوں کی ایک ایک تاب آتی ہے جس پر ایک بھنا ہوا
مرغ ہوتا ہے۔ پھر ایک غذا آتی ہے جسے 'نعمتہ القاضی' کا نام
دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آغا ہریہ کی باری آتی ہے۔ جب
کھانا شروع ہوتا ہے اور وہ تقریبات لب فرش آکر سلطان کی طرف
منہ کر کے جھک کر خدات 'بجالاتا ہے۔ پھر باقی حاضرین کے
سامنے مرتیلیم خم کرتا ہے۔ یہ جھکنا اس قدر ہوتا ہے جیسے نمازیں
رکھتا ہو۔ اس تقریب کے بعد کھانا شروع ہوتا ہے مگر اس سے
قبل سوئے چاندی کے پیالوں میں عرق گلاب میں بنا ہوا شربت
پیش ہوتا ہے۔ شربت کے بعد دار و فہ تقریبات با واز بلند ہوتا
کہتا ہے جس کا مطلب ہے کہ کھانا شروع کر دیا جائے۔ کھانے
کے بعد جو کا عرق پیش ہوتا ہے۔ جسے فقہ کہتے ہیں اور جب یہ بھی
ختم ہو جائے تو بان سپاری پیش ہوتے ہیں، جن کا پہلے ذکر کر چکے ہیں
پان سپاری منہ میں رکھنے کے بعد حاضرین ضیافت پھر ایک بار
بسم اللہ کے منتظر رہتے ہیں اس موقع پر ہر شخص انڈر کر
جھک کر آداب بجالاتا اور رخصت ہوتا جاتا ہے۔

حکام سر قد کھڑے تھے۔ جنگی سپاہی امیر کے پیچھے ایٹا دے تھے۔ بہت
کمانیں بھی رکھی تھیں۔ جب کوئی تیر انداز فوجی ملازمت کے لئے پیش ہوتا
تو اس سے ان میں کی ایک کمان زکمرے کے لئے کہا جاتا۔ ہر کمان کی
سختی جدا جلاتی اور جوتے انداز جتنی قوت بازو دکھا سکتا تھا اس کے
مطابق ہی تنخواہ مقرر ہوتی تھی مگر سپاہی اس سپ سواروں میں بھرتی
ہونا چاہتا تو اس کے سامنے ایک بڑا ڈھول رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کا
کام یہ تھا کہ نیزہ کی مدد سے اس نقارہ کو ضرب لگائے۔ دیوار کے
ساتھ ایک حلقہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ سوار گھوڑے کو اتنا سرپٹ دوڑاتا
کہ وہ اس حلقہ سے پیوست ہو جاتا۔ اگر اس نے جا بکرتی تو اس
حلقہ کو اپنے نیزہ میں پرو دیا تو اسے اعلیٰ شہسوار مانا جاتا تھا۔ مگر
کوئی سپ سوار نیزہ باز بھرتی ہونا چاہتا تو اس کے لئے زمین پر
ایک گنبد رکھ دیا جاتی۔ امیدوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ادھر
آتا اور گنبد پر تیر چلاتا۔ اس کی تنخواہ کا تناسب گنبد پر ڈار کر لگی
جہازت پر منحصر ہوتا تھا۔

شاہی ضیافت کا حال بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے:

سب سے پہلے چیتیاں لائی جاتی ہیں۔ بڑی تیلی۔ پھر
بھیر آتی ہے جسے چارچہ ٹکڑوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر ٹکڑا
ایک کھانے والے کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر گھی میں ڈوبی
ہوئی گول گول روٹیاں آتی ہیں ان روٹیوں کے بیچ میں ایک شیرینی
بھری جاتی ہے جسے مہا بونیز کہتے ہیں۔ ہر بارہ نان پر ایک
چھوٹی سی میٹھی رکھی ہوتی ہے جسے انہی شکل کے باعث 'خیشق'
کہتے ہیں۔ یہ میدے، شکر اور گھی کا آمیزہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد



ماہ نو کی ترقی اشاعت میں حصہ لیکر پاکستانی ادب ثقافت سے اپنی علمی دلچسپی کا ثبوت دیجئے

غزل

عارف آجمازی

شیدہ آجمازی

دیکھ کر آئینہ دل میں ترا عکسِ جمال
جاگ اٹھے ہیں نگاہوں میں غزالِ خیال
اُف وہ مہتاب سی صورت وہ خمیدہ ابرو
کسی فنکار کا موضوع ہیں نازکِ خدِ خال
وادی زلف میں بھٹکی ہوئی بے تاب نظر
سنبلستاں میں ہو جیسے کوئی آوارہ غزال
وہی وحشت وہی دہن وہی شہیدہ ہری
رنگ لایا ہے تری شوخ بھکا ہی کا سوال
کوئی تصویر نہیں، کوئی تمنا بھی نہیں
کتنی افسردہ و بے نور ہے دنیا کے خیال
وضع غم بنے لگا تھا مے کردار کا رنگ
ترمی رفتار نے بدلی مرے افکار کی چال
دل پہ چھایا ہے وہی غم کا اندھیرا عارف
اب نہ امید بہاراں ہے نہ ارمانِ وصال

دلائے خوں کے آنسو زندگی نے
نہ آئے پھر بھی جینے کے قرینے
ٹٹائے چشمِ حسرت نے خزینے
تراٹے ہیں محبت نے گنگینے
ہوئے شوقِ جاناں لے اُری ہے
خدا جانے کہاں ٹھہریں سفینے
متاعِ بادہ سے خالی ہیں شیشے
خلوصِ درد سے عاری ہیں سینے
کسی کا نام آتے ہی زباں پر
چھلک جاتے ہیں دل کے آگینے
ستارے ڈوب کر بھرے فلک پر
نہ ابھرے ڈوب کر دل کے سفینے
بہ عنوانِ سال یک تبسم
کہاں تک چاک ہوں پھولوں کے سینے
مگر وہ ایک لمحہ مختصر سا
گزرے کو گزرے ہیں جینے
حکمتاں تا بہ صحرا تیرے نغمے
منائے ہیں مری آشفنگی نے
ہے کسی یوسف نفس کی آمد آمد
رواں ہیں نکھرت گل کے سفینے
شریکِ دردِ نہاں کون ہوتا
بہ مجبوری پڑے ہیں اٹک پیٹنے
یہ کس شیریں دہن نے تجھ کو شیدا
غزل کہنے کے بجٹے ہیں قرینے

دیارِ گل

(منظر آباد - آزاد کشمیر)

منظر احمد ظفر

بالکل برباد ہو گیا۔

منظر آباد کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو حکمران خاندان، جبکہ کاذب آنا ضروری ہے۔ یہ خاندان ماضی میں ادھر آیا اور کشمیر پر حکمران ہو گیا تاریخی اطلاعات یہ ہیں کہ ہلاکو خان کا ایک جرنیل تھا، ذوالقدر خان، اس نے ۶۱۳۲۳ میں کشمیر کے نواح پر زبردست حملہ کیا۔ اس حملہ کے

باعث کشمیر پر ہر طرح کی تباہی آئی اور نظام معیشت تو بالکل ہی تباہ ہو گیا مگر اس حملہ کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ فدائیان اسلام کو ادھر آنے اور دینی تبلیغ کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ دماندہ انسانیت کو سہارا مل سکے۔ اس سے قبل پچھلی، (ضلع ہزارہ) میں اسلام کی روشنی پھیل چکی تھی اور اس کا پیغام دودھ در تھک پہنچنے کے لئے دروازے کھلنے چاہا ہے تھے۔ ہلاکو خان کے اس گمانڈر کے پاس مختلف صلاحیتوں کے لوگ تھے، جو کچھ تو وہاں چلے گئے اور کچھ وہیں رہ پڑے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بنی امیہ کے بہت سے عربی النسل لوگ جب فتوحات کے جلو میں بدخشاں تک پہنچے تو پھر وہیں بس گئے۔ خاندان اموی کی ہم میں ایک نامور شخص کا شرف خان بھی تھاجس نے دھتور (نزد ایبٹ آباد) میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اسی کا پوتا صفدر خان تھا جو سلطان محمد خان والی پکھلی کا سپہ سالار بنے۔ یہ لوگ کافی عرصہ تک یہاں حکمران رہے اور اسی تاریخی خانوادہ کے لوگوں نے اپنی موروثی جاگیر اور متحدہ علاقوں پر ایک خود مختار حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ آگے چل کر یہی خاندان بہتہ کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے منظر آباد کو ہی اپنا دار الحکومت بنایا۔ اس طرح پوری وادی نیلم پر ان سرداران وقت کا قبضہ ہو گیا۔ منظر آباد جنگوں کا میدان بھی بنا رہا ہے کبھی یوسف شاہ چک کی فوجیں ادھر آئیں۔ کبھی اکبر اعظم نے ادھر فوجیں بھیجیں۔

منظر آباد۔ آزاد کشمیر کا صدر مقام۔ سطح سمندر سے تقریباً

ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ کافی قدیم اور تاریخی اہمیت کا شہر ہے اور دریائے کشن گنگا پر بسا ہوا ہے۔ اب اس دریا کا نام نیلم ہے جو اس کے قدرتی ماحول اور موجودہ فضا کے اعتبار سے موزوں ترین نام ہے۔ منظر آباد خاندان جبکہ کے ایک نامور سردار، منظر خان نے آباد کیا تھا لیکن اس کی تاریخ چنا کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ بعض پرانے کاغذات میں اسے چکڑی کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ جو یہاں کی مقامی بولی میں 'دلہل' کے معنی رکھتا ہے۔ ہر چند کہ شہنشاہ جہانگیر کشمیر جاتے ہوئے اس مقام سے دو مرتبہ گذرا مگر اس نے بھی اپنی ترک میں اس جگہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ صرف اتنا حال ضرور ملتا ہے کہ "کم ترنگ" (موجودہ گوجرہ) کے سامنے ایک اونچی سی جگہ ہے، بڑی عمار اور نہایت پر نفصا۔ یہاں شہنشاہ جہانگیر نے نماز ظہر کے بعد کا وقت سیر و تفریح میں گزارا تھا اور فضا کی دلچسپی نے شہنشاہ کو بہت محظوظ کیا تھا۔ گوجرہ کے مقام پر اس عظیم بادشاہ کا بنایا ہوا قلعہ اب بھی موجود ہے اور خاصی اچھی حالت میں ہے۔ جہانگیر نے اس جگہ کو سرائے لکھا ہے، جو جلال آباد کے قلعہ کے سامنے واقع ہے۔ یہ جگہ منظر خان کے چھوٹے بھائی، جلال خان نے بسائی تھی۔ آج کل آزاد حکومت جموں و کشمیر کے مرکزی دفاتر اسی جگہ ہیں۔

منظر آباد کے شمال مغرب میں اکبر اعظم کا بنایا ہوا ایک قلعہ بھی موجود ہے، مگر اب خستہ حالت میں ہے۔ یہ قلعہ چونکہ ڈب گلی یعنی ایک درہ کے سامنے ہے اس لئے ڈوگروں کے دور میں یہاں ایک حفاظتی چمکی بھی بنی ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ٹوٹ پھوٹ بھی ہوئی رہی، خاص کر دریائے نیلم کی شوریدہ سر بہوں نے اسے کافی نقصان پہنچایا اور کوئی دیکھ بھال بھی نہیں ہوئی اس لئے قلعہ

کبھی یہ جگہ سکھوں کی رزم گاہ رہی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کا مرکز و محور بھی رہی مقامات رہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے زمانہ میں یہاں جو سردار حکمران تھے ان میں آپس کی نا اتفاقی بہت تھی۔ اس لئے سازشیں بھی ہوتی تھیں اور اسلام کے دشمن اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ فروری ۱۸۳۱ء میں مظفر آباد اور اس کے ملحقہ دیہات میں جب مجاہدین پہنچے قرآن کی جمعیت بکھر چکی تھی اور وہ دشمنوں سے لڑنے بھڑتے شہید ہو گئے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک ختم ہو گئی تو اس کے ہندو سال بعد ۱۸۶۶ء میں انگریزوں نے وہ مشہور معاہدہ (امرتسر) کیا جس کی رو سے جوں و کشمیر کا خطہ گلاب سنگھ کے حوالہ کر دیا۔ اس معاہدہ کو دنیا کی تاریخ میں بدترین معاہدہ کہا جاتا ہے کیونکہ چھڑا سی ہزار مربع میل کا علاقہ بھرتھ لاکھ "ناک شاہی" سکوں کے عوض بیچ ڈالا گیا۔ "ناک شاہی" روپیہ صرف دس آن کا تھا۔ "چھڑاں فروختند" ! صبح ہی کہا گیا ہے۔

اس رسوائے عالم معاہدہ کے بعد جو رد عمل عوام میں ہوا وہ قدرتی تھا۔ ریاست کے گونہ گونہ میں نفرت کا زہر پھیل گیا۔ عوام نے احتجاج کیا جسے نا عاقبت اندیش حکمرانوں نے بغاوت کا خطاب دیا۔ مسلمان آبادیوں پر بے پناہ ظلم توڑے گئے ہزاروں مسلمان شہید کئے گئے۔ مظفر آباد بونچھ، میرپور اور راجپور کے علاقے خاص طور پر ظلم و تعدی کا نشانہ بنائے گئے۔ مگر غیور مسلمانوں

نے ظلم کے آگے گردنیں نہیں جھکائیں۔ جب حوصلہ جات تنگ ہو گیا تو سینکڑوں مسلمان خاندانوں نے اس نواح سے ہجرت کر، اور پورے برصغیر میں پھیل گئے اور اپنی خدا داد صلاحیتوں سے انہوں نے ہر شعبہ زندگی میں اپنے لئے ایک ممتاز مقام پیدا کیا۔ ہر چند کہ ابتدائی احتجاج کو ظلم کی قوتوں نے وقتی طور پر دبا دیا تھا مگر ظلم و نا انصافی کے خلاف لوگوں کے دلوں میں جو لاداسلگ رہا تھا وہ ایک دن پھوٹ بیٹھنے کے لئے بلقرا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۳ جولائی، ۱۹۳۱ء کو مسلمانوں نے کشمیر نے پوری قوت کے ساتھ للکارا۔ یہ تحریک آزادی تھی جو برابر برہمتی رہی اور وہ دباؤ نہ جاسکی۔ گرفتار بانی اور گولی مارنے کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ خود مظفر آباد میں سو سے زیادہ مقتدر اصحاب کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد تحریک میں مزید جوش پیدا ہوا اور ۱۹۴۷ء میں مظفر آباد ہی جنگ آزادی کا مرکز بنا۔ یہی جہاد آزادی کا مرکز ہے اور آج بھی آزاد جموں و کشمیر کی حکومت کا صدر مقام ہے جو تہ آزاد کشمیر کے نظم و نسق، تعلیم و ترقی اور فلاح و بہبود کا سیاسی محور ہے اور امید ہے کہ جس طرح ماضی میں مظفر آباد اپنا تاریخی کردار ادا کرتا رہا ہے، مستقبل میں بھی یہ اپنا ممتاز حیثیت برقرار رکھے گا۔

پاکستان، دوش، امروز، فردا: بقیہ صفحہ ۲۸

نویزائیدہ ہے اور ہم نے بدلنے طرز حکومت کی جگہ ایک نیا اسلوب سیاست اختیار کیا ہے۔ اس لئے ابتدا میں مشکلات کا پیدا ہونا کچھ حیرت انگیز نہیں۔ اصل میں جس چیز کی ضرورت ہے، وسیع النظری اور وسیع القلبی ہے جس کی بنیاد صرف وطن، اور حب وطن ہوا یعنی تعمیر و فلاح مملکت کا جذبہ۔ جس کی موجودگی کی طرف سے ہمیں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

دہشتی کی دولت سے لالچ کر کے۔ ویسے حزب اختلاف کے خلاف کیا بھی اکثر شکوک رہتی ہیں کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ ہر سیشن کے ساتھ راکیں کی نشستیں بدلتی رہتی ہیں اور یہ کیفیت اسی وقت ہی استحکام پاتی ہے جب معاشی و سیاسی اصولوں پر مبنی پروگرام کھینچنے والی جماعتیں ہمارے ملک میں ابھریں۔ لیکن اگر اس وقت یہ مطلع اتنا صاف نہیں ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات ہے۔ دہشتی و مایوسی کی۔ آخر ہماری مملکت

دربائے جہلم اور دریائے نیلم (آزاد کشمیر) کے سنگم پر
شہنشاہ جہانگیر کا قلعہ

دیوار گل (مظفر آباد)

اس وقت کشمیر پر ساری دنیا کی نظریں لگی ہوئی
ہے۔ کشمیر کے ساتھ ہمارا تاریخی، قومی اور ثقافتی رشتہ
قدرِ محکم اور ناقابل شکست ہے کہ اسے کوئی بھی
کوشش ہم سے جدا نہیں کر سکتی۔

آزاد جموں و کشمیر کی حکومت کا صدر مقام،
شہر آباد، ایک قدیم تاریخی شہر ہے جس کے اطراف کی
مزرعین سے ہماری تاریخ کے نئی روشن ابواب کی یادیں
استہ ہیں۔

آثار قلعہ ۱





دور نو میں ہرجمہتی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی ادب و فن کی سرپرستی کا مسئلہ بھی جاری ہے اور اس وقت علمی، ادبی اور فنی سرگرمیوں کے لئے جو سازگار فضا بنائی جاتی ہے، وہ اس سے قبل نہ تھی۔

دیگر فنونِ جملہ کے ساتھ فنکاروں کی توجہ نسقیدہ نمائندگی کی طرف بھی ہوئی ہے اور حال ہی میں ملک کے دونوں نازوؤں میں کئی باب ادبی خدمات انجام دی گئیں۔



ہنگو ڈرامہ ”کالا پیلا“ کا ایک منظر

کامیاب ڈرامے سادہ و پرکار لباس اور سازوسامان کے ساتھ بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔



”کنچن مالا“ (ایک منظر)

”ہوتا ہے شب و روز...“

(پاکستان میں شوقیہ تھیںٹر)

اشرف ذکائی

میں شوقیہ ہنرمندان تیار کی سرگرمیوں کو اگر ہم دیکھیں تو بہت سی باتوں کا جواب از خود مل جاتا ہے۔

پہلی بات تو یہی ہے کہ ڈرامہ کو لوگ شوق سے دیکھنے آتے ہیں اور ہمارے ہاں اچھے کھیل لکھنے والوں کی ایسی کمی نہیں ہے، پیشکش اور ہدایت کاری کے جوہر بھی دستیاب ہیں۔ بیشک منڈیوں کی کسر ہے مگر اکثر بڑے شہروں میں کافی ہال مل سکتے ہیں جنہیں تھیںٹر کی پیشکش کے لئے ٹھیک ٹھاک کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ بعض یونیورسٹیوں کے پاس تو باقاعدہ انتظامات بھی ہیں جہاں ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اسٹیج پر آکر دانتیں حاصل کرتا رہتا ہے۔ البتہ بدلے ہوئے ذوق کی پذیرائی میں ہمیں کئی باتوں کا اہتمام ضرور کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ پیشکش وقت طلب نہ ہو اور وقت طلب بھی نہ ہو، یعنی کم سے کم وقت میں، کم سے کم مالی و انتظامی سربراہی کے ساتھ، کھیل پیش کیا جاسکے۔ ساز و سامان سادہ ہو، سیٹ اور لباس لازماً ”زرق برق“ نہ ہوں اور وہ انداز کا رونا نظر سے پرہیز کیا جائے تاکہ معمولی بساط پر بھی اداکاری اور صداکاری کے جوہر دکھائے جاسکیں۔ نقشہ کی خوبی، مکالمات کی جستی اور پیشکش کی دوسری ٹوک پلک سے ہم کسی بھی شام تیار کو ایسا دلچسپ، متنوع اور پُر لطف بنا سکتے ہیں کہ دیکھنے والے جب گھر واپس جائیں تو ”ایک بار دیکھا ہے، ہزار بار دیکھنے کی“ ہوس ہے ”کا احساس“ لئے ہوئے جائیں۔ اور ایسا کرنا چندان دشوار نہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بے جان تصاویر، بے روح حکوس اور فلم کی مہمل نغمہ سرائی سے گھبراچکے ہیں اور اگر خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا جائے تو وہ لوگ بھی جنہیں ہم ”وجہ چہارم“ کے تماشائی کہتے ہیں، ایسی چیزوں کو پسند کرنے لگتے ہیں بلکہ

یہ سمجھتے ہیں کہ متحرک و گویا تصاویر کے رواج نے ہمارے ہاں بالخصوص، تھیںٹر کا چراغ گل کر دیا ہے اور عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ تھیںٹر میں تھیںٹر کی جو بھی بُری باڈی روایت قائم ہو چکی تھی وہ بھی کسی بن کھلے پھول کی طرح مرجھا گئی۔ گزشتہ صدی کی ابتدا سے ۲۲-۱۹۲۱ء تک تھیںٹر کچھ نہ کچھ سانس لینا رہا مگر متحرک تصاویر نے اس کو ختم کر دیا۔ بعض شہروں میں پیشہ وارانہ طور پر کچھ کام ہوتا رہا اور کچھ سات سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا مگر گویا تصاویر کی آمد نے تو اس کا بازار بالکل ہی سرد کر دیا۔ لگے سرسبز، اس دنیا میں کام کرنے والے جتھوں، پرانے اداکاروں اور تھیںٹر سے ذوق رکھنے والے ہدایت کاروں، ہلکے ٹھکانوں اور دوسرے کارکنوں کو کسمپرسی کھا گئی یا عوامی شوق کی ادنیٰ بلقی رتوں نے ہضم کر لیا۔ ریڈیو کی ترویج نے اداکاروں کو پیشکش کے اس نئے آلہ سے روشناس کرایا مگر اس میں بھی صرف وہی پنپ سکے جو اداکار سے زیادہ صدا کا رتھے۔ تھیںٹر کی ادنیٰ روایات پہلے ہی کچھ زیادہ بلند یوں کو نہ چھو سکی تھیں مگر پھر بھی ہلکے لکھنے والے کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے اور جن لوگوں کو فن نیا ترے دل لگا دیتا بہت اچھے ڈرامے اسٹیج پر لاتے بھی رہے اور لکھتے بھی رہے۔

یوں آزادی کے بعد سے تھیںٹر کی روایات کو حیات نو بخشنے کی برابر کوشش ہو رہی ہیں اور اگر ملک کے سب سے بڑے ادارہ فنیوٹیل آئس کوئٹل آف پاکستان کی کوششوں، نیز یونیورسٹیوں اور عوامی اسٹیج تھیںٹر کی سعی کی طرف ایک نظر ڈالی جائے تو یہ مایوسی نہیں ہوتی کہ تھیںٹر کے لئے ہمارے ہاں اب کوئی امکانات باقی نہیں ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے جسٹس جمیل، اور کراچی جی جی، ڈھاکہ اور لاہور

آہستہ آہستہ مذاق سدھرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی فصول کی بد ذوقی کے مقابلہ پر اب کی فلسا زوی کو دیکھیں تو اصلاح نہ جان مودوم نظر نہیں آئے گا۔ دو جبار کی لہری اور بلند ہی کے درمیان بھی بہت سی خلیجوں کو ہمیں پائسل ہے، مگر مایوسی کی گہمی کوئی دھڑ نہیں ہے۔

اب اگر میں حال کی شوقیہ پٹکیشوں کا ہی ذکر کر دوں تو آپ میرے سخیل ہوں گے کہ تھیر کی طرف سے مایوسی کا واقعی کوئی جواز نہیں ہے۔ سب سے پہلے میں کراچی کا ہی ذکر چھیڑنا ہوں۔ یہاں "آرٹس کونسل آف پاکستان" کسی نہ کسی عنوان پر ثقافتی ورثہ کی ترمیم اور تحفظ کا ایک نہ ایک اہتمام کرتی ہی رہتی ہے۔ فنونِ جمیل میں نقاشی کی پرورش و ترمیم کے ساتھ ساتھ فنِ دکا کا کی طرف بھی اس کی توجہ ہے اور بخوش ذوق تھیر کے پرانے رسیاں مل بیٹھ کر یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کوئی شام تیار تر کس طرح منائی جائے جو دلدادگان فن اور عام تماشاخیوں سب کو ہی رچ جائے۔ چنانچہ ایسے ہی چند فن پرور حضرات نے پچھلے دنوں بین طریہ کھیل بیک وقت اسٹیج پر پیش کئے اور ایک ایسی سہانی شام کا انتظام کر دیا جو ہمیں ہل من مزید کا نعرہ بلند کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

یہ تینوں ایجاگنی ڈرامے تھے۔ ایک ہی شام میں تینوں کھیل لانے کی تجویز یوں رکھی گئی تھی کہ تینوں کھیلوں میں بین ہی ادا کا تھے اور تینوں میں وہی کام کرتے تھے۔ یعنی ہر ادا کا کو تین مختلف روپ دھارنے تھے۔ ان تینوں کھیلوں کی ہدایت کا بھی ایک ہی صاحب نے کی۔ ابراہیم نقیس صاحب۔ جن کی ادا و صدا کے جوہر دیکھتے اور سننے کا لوگوں کو پہلے ہی اتفاق ہو چکا ہے۔ ان کے ساتھ طلعت صدیقی تھیں اور محمود علی تھے۔

پہلا کھیل "مگرم" تھا جسے مورٹن کے کھیل "ساکس اینڈ باکس" سے اردو اسٹیج کے لئے مختار کیا گیا تھا۔ کھیل میں ایک زلیخا بانی ہیں اور روایتی لینڈ لیڈری کی تمام صفات سے ہیں۔ وہ اپنے فکر کا ایک کمرہ ایک وقت دو کمرہ داروں کو کرایہ پر اٹھا دیتی ہیں۔ پہلا کمرہ دار کسی پریس میں کام کرتا ہے اور ہمیشہ رات کی شفٹ میں کام کرتا ہے۔ دوسرا کمرہ دار کسی ٹوپی بنانے والے کے ہاں کام کرتا ہے، صبح سویرے اٹھ کر چلا جاتا ہے اور رات لئے آتا ہے۔

دونوں کو ایک ہی کمرہ ملا ہوا ہے مگر دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرا صاحب کسی اور کمرہ میں رہتے ہیں مگر ایک دفعہ زلیخا ہائی کی شامت آ جاتی ہے کیونکہ دونوں کمرہ دار کسی گڑ بڑ کی وجہ سے ایک وقت اپنے کمرہ میں اپنے آپ کو ایک دوسرے کے منہاں پاتے ہیں۔

کافی طوفان اٹھتے ہیں۔ بڑی گڑ بڑ مچتی ہے مگر آخر کار معاملہ صلح صفائی کے ساتھ طے پا جاتا ہے۔ حاضرین کے حظ و لطف کا احساس ان کے چہرہ دل سے نمایاں تھا، مگر دوسرا کھیل گزارش ہے جب پیش ہوا تو لوگوں کو اور بھی زیادہ مطف آیا۔ یہ پنجاب کے کسی گاؤں میں جو دھری صاحب کی بیٹھک کا قصہ تھا۔ ایک تو انا گھر دل کا مریض دیہاتی ہے دھری صاحب کے پاس آنا دوران کی اکلوتی لڑکی نے اپنے پیغام شادی دیتا ہے۔ پہلے سین کے بعد کو سین بڑی افراتفری مگہ، اردھاٹے لبریز آتے جاتے ہیں مگر آخر کار جو دھری صاحب خود اس قضیہ کا فیصلہ کر کے رکھ دیتے ہیں کہ ساتھ کر دیتے ہیں اور نوک اصغریت کے کھٹے ہوئے تیسرے ڈرامہ کو دیکھنے کے لئے اپنی بڑھتی ہوئی مہنسی کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کھیل میں نتھو دھوبی آتے ہیں، اس کی بیوی خیری آتی ہے جو کسی نوکر کی بیٹی ہے۔ ان کی بھی شادی ہوئی ہے۔ عین شادی کی رات کو ڈاکو آ جاتے ہیں جو ان دونوں کو پکڑ کر کوٹھڑی میں قفل کر دیتے ہیں اور خود شراب پینے چلے جاتے ہیں۔ دھوبی بٹا ہا تو بی ہے مگر دھان پالا ہے اور بٹا سہا ہوا ہے لیکن خیری بلا کا چلتا پرزہ ہے اور بڑی ہوشیاری اندر حاضر دماغی سے کام لے کر اپنے آپ کو اور اپنے مہاں کو اس قید سے آزاد کر لیتی ہے۔

تینوں کھیلوں میں مجھے ہوئے ادا کار محمود علی کا کام بڑا عمدہ رہا۔ اسٹیج کی اداکاری، اظہار جذبات، چہرہ کا انا رچھاؤ اور مکالموں پر قدرت واقعی قابلِ داد تھی۔ "مگرم" میں ابراہیم نقیس کا کام بھی معیاری تھا۔ نتھو خیری میں طلعت صدیقی نے شروع سے آخر تک اپنا دل خوب نبھایا۔

سامان کے لئے کچھ زیادہ مگ و دو نہیں کرنی پڑی تھی۔ معمولی سیاہ پس منظر پر دہنے ہر موقع پر خاص کام دیا۔ اسٹیج کی روشنیاں اور میک اپ بھی ٹھیک رہے اور کچھ گڑ بڑ نہیں ہوئی، جو بجائے خدایک کا نام ہے ورنہ شوقیہ تھیروں میں

داد حاصل کی۔ ان ڈراموں کے علاوہ اور بھی ڈرامے یہاں پیش ہوتے رہے ہیں۔

راولپنڈی میں کچھ تعمیراتی ابتدا ہو چکی ہے۔ اور گھوٹا گلی کے لائسنس کالج میں بھی تعمیر کا چرچا ہو رہا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کی طرف بھی آپ کچھ نظر ڈالیں کیونکہ یہ رنگ رنگ کا دیس ہے۔ رقص و نغمہ کی سرزمین ہے اور فن تیار تو کی پہاں جگہ جگہ پرورش ہوتی رہتی ہے۔

”جاگو آرٹ سینٹر“ کا تعارف اب ضروری نہیں رہا ہے۔

اس نے کئی شوقیہ ڈرامے پیش کر کے یہاں دھوم مچا رکھی ہے۔

”دھاکہ انسٹیٹیوٹ آف انجینئر“ میں اس نے ”کچن والا“ چار لاکھ

مسلل پیش کیا۔ یہ ایک روایتی ”بیہ“ تھا۔ شمس الدین ابوالکلام نے

اس پر مبنی ایک ناول بھی سنا ہی بیٹا لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جاگو

نے جو پیش کش اسٹیج کی تھی وہ ناول اور بیچے دونوں ہی کامیاب منہ نکالا۔

”کچن والا“ ایک خوبصورت لڑکی ہے جو سپر وں کے گھر میں

پیدا ہوئی ہے۔ یہ لوگ کشتیوں میں رہتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے

بڑی خانہ بدوشوں کی طرح ان بحری خانہ بدوشوں کا بھی کوئی گھروں

نہیں ہوتا اور جہاں نہاں انہما کشتی میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ آلا

دمنڈا کریم ان ”بیدریوں“ یعنی سپروں کی لڑکی ہے۔ وہ آموں

کے ایک جھنڈ میں اپنا راستہ بھول جاتی ہے اور یہ نہیں جانتی کہ

اپنے قبیلہ میں کس طرح واپس جائے۔ یہاں اس کی ملاقات کچن

(گوہر تیل) سے ہو جاتی ہے۔ محبت ہو جاتی ہے۔ سپروں کا ایک لوجا

لڑکا ہے مدن، دیو کسا، اسے ان کی محبت کا علم ہو جاتا ہے

اور وہ چونکہ خود کالا کشتی لڑکی ہے اس نے جلن کی وجہ سے دیپے

آزار ہو جاتا ہے۔ تاکہ کچن کو قید میں لے آتی ہے اور اسے سپروں

میں شامل کرنے کے لئے کہتی ہے مگر اس کی بات نہیں مانی جاتی۔

اور مدن مالا سے اپنی شادی رچنے کا انتہام کر لیتا ہے۔ اس کی باتیں

ایک اور لڑکی چمپا سن لیتی ہے۔ چمپا مدن پر غصہ اور مدن اس

فائدہ اٹھا کر اسے زہر ملا چیل کھانے کو دیتا ہے تاکہ وہ مر جائے

اور اس کی ٹوہ نہ لے۔ مالا اور کچن سپروں کے جنگل سے بچنے

بھاگنے ہیں مگر مدن ان کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور وہ ان دونوں

زہر ملا سانپ چھوڑ دیا ہے لیکن قسمت انہیں بچا لیتی ہے اور

مصنوعی چہرہ سازی کے سلسلے میں عجیب عجیب بدحواسیاں ہرزاد ہو ا کرتی ہیں۔

اب میں آپ کو ذرا سی دیر کے لئے پشاور یونیورسٹی

کی طرف لے چلتا ہوں۔ یہاں بھی شوقیہ تیار تو لڑائی کا اچھا نمونہ

جمع اپنے ذوق کی پذیرائی کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ بلکہ ایک ڈراما

یونٹ بنا ہوا ہے جو یونیورسٹی میں ایک مستقل تعمیراتی تعمیر کا

خواب ہی نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ اس کی تکمیل کے لئے پوری طرح

کوشاں بھی ہے۔ اگر یہ تعمیر بن گیا تو اس جامعہ کے مختلف

شعبوں کے شیدائیان تیار تیار اپنی صلاحیتوں کا بڑا اچھا

نما ہر کر سکیں گے۔ ماضی میں ”رومیو جولیٹ“ اور ”سپلٹ“

جیسے ڈرامے پیش ہو چکے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ڈرامہ ایک

مشکل اور پیچیدہ فن ہے اور خصوصی صلاحیت کے ساتھ خصوصی

مشق و مزاولت بھی چاہتا ہے۔ اب یہ جگہ طلبہ کی درس گاہ تھی

اس لئے قدرتی بات تھی کہ ان کی توجہ اپنی تعلیمی ضروریات اور

پڑھے ہوئے اسباق کے دہرانے پر زیادہ مرکوز تھی اس لئے

شیکسپیر کے ساتھ ان کا فکری لگاؤ انہیں اسٹیج پر بھی لے آیا

تاکہ ڈرامہ کی نظری باتوں کے سمجھنے کے ساتھ ساتھ عملی باتوں

سے بھی آگاہی ہوئی رہے۔ شخص انگاری انسانی احتیاسات

و تجربات کا بہترین وسیلہ اظہار ہے۔ یہ ایک طرح خود انسان کے

اپنی خودی کی نمائش کرنے اور دوسروں کی خودی کو اپنے اوپر

طاری کر کے پیش کرنے کا نام ہے۔ جیسے ہوئے صفحے پر جو کچھ

لکھا ہے اسے بھری وسعتی ڈھانچہ میں لانا ایک واقعہ، احساس،

ایک کیفیت، ہم درجا کو دوبارہ زندہ کرنے کے مترادف ہے۔ اور

ظاہر ہے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے، مگر جب مکمل ہو جائے تو ذہنی طاقت

دھانی کشائش اور تسکین احساس کا بڑا نامور نمونہ بن جاتا ہے۔ پھر

ادبی قسم کی موسیقی اور نفسیاتی شاہکار نقاشی اس کا مقابلہ

کر سکتی ہے ورنہ کوئی چیز نہیں۔

پشاور کے طلبہ جامعہ نے بہت سی باتوں کو سوچ کر

ایڈورڈ کالج، ہال کو ہی پسند کیا۔ ”سپلٹ“ کو پیش کرنا ویسے بھی

مشکل تھا اور کام کرنے والے نا تجربہ کار بھی تھے۔ مگر اداکاروں

کا فی محنت سے، مکیا اور معمولی سا زور سامان سے اچھی پیش کش کی

سپیرول کا سردار میں اس موقع پر آ جاتا ہے۔ سانپ ہلٹ کر
مدن ہی کو کاٹ لیتا ہے اور حبیب و محبوب ہمیشہ کے لئے سپرول
کا ساتھ چھوڑ کر اس وسیع دنیا میں بھل جاتے ہیں۔

یہ نفس واداکاری کا ڈرامہ ہے جو اظہار کی شاید سب سے
پیچیدہ شکل ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ یہ "چپ سوانگ" بھی
ہوتا ہے، یعنی الفاظ بولے نہیں جاتے بلکہ صرف حرکات و سکنات
سے پولڈ ڈرامہ پیش کیا جاتا ہے۔ گنجن مالا کے دیکھنے سے یہ بات
واضح ہو جاتی تھی کہ بغیر مکالموں کے بھی ڈرامہ پوری قوت و توانائی
اور صفات اداکاری کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ٹیکسٹ کے اعتبار
سے بھی یہ کھیل بڑا کامیاب رہا۔

★

بہرِ فتح ان چند جزوی باتوں کے تعارف سے اس بات کا
مہیں ضرور علم ہو جاتا ہے کہ ملک میں تھیر کی روایات کو زندہ
رکھنے کے لئے جملہ لوازمات موجود ہیں، اور اس بات کی بڑی
ضرورت ہے کہ اس فن کی آبیاری کے لئے ہر صلاحیت کے
لوگ اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ کام کئے رہیں اور اپنے علاقوں کی
روایاتی کہانیوں کی جھلکیاں اور جدید تجربات انسانی کی گامگر
لیے کھیلوں کی صورت میں نہیں تو ایک نئی نئی شکل میں ہی پیش
کئے رہیں۔ اسی طرح لن تیار کو زندہ رکھا جاسکتا ہے جس کے ذریعے
ہم اپنی تاریخ، ثقافت اور زندگی کے ماضی، حال اور مستقبل کی
داستان کو محفوظ کر سکتے ہیں :

تبصرہ ۱

”نگار“ رامپور

نگار کا سفر جیات بھی خاصا طویل رہا ہے اور یہ اردو
کے ادبی رسائل میں شاید سب سے طویل العمر مجلہ ہے۔ مجھ کو اس میں
جنم لینے کے بعد یہ لکھنؤ آ گیا۔ مشابہت سے شیب تک کئی منزلیں
یہاں طے کیں۔ مگر یکایک اس کی ایک کرن کراچی کے مطلع سے بھی
نمودار ہونے لگی اور لکھنؤ سے بھی جلوہ دکھاتی رہی۔ مگر آثار ہی تھے
کتاب تک جو ثابت تھا سب سے ہوا چاہتا ہے اور اب تو نگار ہندوستان کا
کی مستقل شکل اختیار کر چکا ہے۔ فطرت میں چونکہ غلامی ہے
اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ ہند میں محفل ادب سے یہ نگار کشیں رخ
یوں ہانک پر دے کر جائے، اسلئے رامپور والوں نے اس طائر کے
پر باندھ کر اپنے گھر سے ہی تارے دینے شروع کر دیے ہیں۔

اس وقت تک اس کے تین شمارے موصول ہو چکے ہیں
اور یہ دیکھ کر طمانیت ہوتی ہے کہ گو اس طائر خوش پرواز کی شاخ
آشیانہ بدلی ہوئی ہے مگر طرزِ نوآوری میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔
ہمیں معاصر کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ غالب پر

لکھنے والے حضرات اپنی قلمی کاوشوں کو ادھر آدھر چھپوانے کی
 بجائے برصغیر کے صرف تین محلوں سے مختص کر لیں یعنی ہندوستان، میان
”نگار“ (رامپور) اور ”آجکل“ (دہلی) اور پاکستان میں ”ماونو“
کراچی، اس میں شک نہیں کہ اس طرح غالب پر جو کام برصغیر میں
ہو رہا ہے وہ پرانگی، گمنامی اور گشتی کے سانحے سے نکال جائے گا۔ اس
سلسلہ میں لکھنے والوں کا ایک معین ”فروغ“ بننے سے تحریریں بھی محفوظ رہیں گی
اور قارئین بھی غالب پر پڑھنے کے لئے ادھر ادھر ٹھکانا ٹوٹے مارے
نہیں پھوس گئے۔ جہاں تک ادارہ ماونو کا تعلق ہے اس نے اس روایت کو
جو وہ آزادی سے قبل ”آجکل“ میں قائم کر چکا تھا، پاکستان میں بھی برقرار رکھا
اور ان پندرہ سولہ سال میں غالب پر ان کا کچھ تحریری و تصویری مواد شائع
کر دیا ہے جو بجائے خود غالبیات پر ایک اہم کام تصور ہو گا۔

”نگار“ رامپور میں غالبیہ کے تحت جو دستاویزی مندرجات قلم
کئے جا رہے ہیں ایک اچھی تجویز ہے اور اس پرمل بھی خوش ذوقی کے ساتھ
کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ ان فردِ غالب پاروں کو اور اوراقِ محل کی طرح
منتظر نہیں ہوتے دیا جائے گا بلکہ کتابی صورت میں لا آئیں ایک دستبند
کی شکل دے دی جائے گی : (لط - ق)

صور اسرافیل

قاضی نذرا لاسلام کی منتخب شاعری کے اردو تراجم مع مقدمہ

قاضی نذرا لاسلام مسلم بنگال کی نشاۃ الثانیہ کا پہلا نقیب اور داعی ہے جس کے گرجا
آہنگ نے صور اسرافیل کی طرح قوم کے تین مردہ میں پھر حیات نو بھونک دی تھی۔ اب
یہ لاوا ایک آتش خاموش کی مانند ہے مگر اس مغنی آتش نولے ہمارے دلوں میں حب وطن،
حب ملت اور حب زندگی کی جو قندیل روشن کر دی ہے وہ سدا جلتی رہے گی۔

نذرا لاسلام کی زندگی بخش شاعری اور روح پرور گیتوں کا

یہ چیدہ انتخاب پندرہ اہل فن کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

کتاب خوبصورت اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ کتاب کا ہر حصہ دیدہ زیب آرٹ کی جدولوں سے

مرصع جسے مشرقی پاکستان کے نامور نقاش

زین العابدین نے خاص اس مجموعہ کیلئے تیار کیا ہے

قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسہ

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۳۳ کراچی

آشوب دہر

(قلّت خیراک کے خلاف عالمی جنگ)

ہم دیکھتے ہیں کہ جدید مواصلات اور تیز رفتار ذرائع نے انسان کو قدرت دی ہے کہ وہ غذاؤں کی حمل و نقل جلد کر سکتا ہے۔ یہ عذر کچھ معقول نہیں رہتا۔ اور پھر یہ امر سامنے ہے کہ لازمی طور پر وہ ملک یا سماج بھوکے نہیں جن کی آبادی زیادہ سے زیادہ ہے۔ آج اقوام متحدہ کا عالمی ادارہ اسی جنگ کا ہر اولیٰ دستہ ہے۔ اور اس کے تعاون سے سائنس دان اور ماہرین محاشیات مل کر نوعِ انسانی کی بھرپور لائی بھوک کو مٹانے کے لئے میدان میں آتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ساری دنیا اور پاکستان میں ۲۱ مئی سے ۲۸ مئی تک اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بھوک سے آزادی کا ہفتہ منایا گیا تھا۔ ہمارے ملک میں بھی بڑے گہرے فکر اور خلوص سے بھوک کے حلقوم پر زندگی نے ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں پورے ملک میں مذاکرے ہوئے، مجالس ہوئیں۔ سائنس دانوں اور دانش ورانوں نے پکڑ دیئے اور بھوک کے خلاف عمل کیا گیا کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آئندہ کی دنیا کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بڑھتی ہوئی نسل کو صحیح اور مناسب غذا دینا ہے۔ آبادی تیزی سے بڑھ چکی ہے اور بڑھ رہی ہے لیکن ذرائع پیداوار میں یہ اضافہ جلد ممکن نہیں۔ اقوام متحدہ کے پاکستانی صدر چودھری محمد ظفر اللہ خان کے خیالات اس اہم اور تشویش ناک مسئلہ کی طرف صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: ”آج نوعِ انسانی کو کئی مسائل درپیش ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور سنگین معاملہ بھوک اور افلاس کا ہے کئی مسائل مثلاً ایٹمی تجربات پر پابندی، تخفیفِ اسلحہ اور ایٹم کا پُر امن استعمال اور خلائی سفر کے معاملات ایسے ہیں جو ہر مذاکرات اور قوموں کے باہمی معاہدوں سے حل ممکن ہے لیکن ایک مسئلہ اس سے بھی زیادہ نازک ہے اور اس پر

بھوک کی آگ صرف جسم ہی نہیں روح اور تخیل کی کونپلوں تک کو جھلسا دیتی ہے بلکہ اس کا پہلا حملہ تو احساسات لطیف اور احساسِ مروت پر ہوتا ہے۔ اور پھر بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں دھل سکتی۔ آج بنی نوعِ انسان کے سامنے جو بڑے بڑے معاشرتی اور سماجی مسائل ہیں ان میں بھوک سب سے اہم ہے۔ بھوک کا سیاہ اور مخوس عفریت اب بھی انسانی تہذیب اور خوشیوں پر اپنا پنج پھیلائے ہوئے ہے۔ آج بھی اس کا سایہ بھری بری انسانی بستیوں کو جاڑ دیتا ہے اور ان میں مائتا۔ پیار۔ تہذیب اور محبت کی جوت بجھ جاتی ہے۔ آج کی تہذیب دنیا میں جب کہ انسان علم و ادب سے عظیم لائبریری بھر چکا ہے۔ اس کی آرٹ گیلریوں میں بہترین فن کے مجسمے ہیں۔ اس کے تخیل میں عظیم منصوبے جنم لے رہے ہیں۔ اس کی انجلیاں برق و باد پہنچا کر رہی ہیں اور آدم خاکی زمین سے بلند ہو کر خلا کی پہنائیوں کو چیرتا ہوا چاند پر گندیں پھینک رہا ہے آدم کے بیٹے اور بیٹیاں بھوک سے بار بار تلملاتی ہیں۔ آج بھوک صرف ایک جبرانیاتی یا قدرتی المیہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ سائنس کی عظیم قوتوں نے انسان کو وہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ ہر قسم کی غذا نہ صرف زمین سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں اگائے بلکہ اب تو وہ مصنوعی غذائیں بنا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اب سائنس کی ترقی سے غذائیں مدتوں تک محفوظ رکھی جاسکتی ہیں۔ آج بھوک قدرتی المیہ سے زیادہ ایک معاشرتی اور سماجی مسئلہ بن گیا ہے۔ پہلے زمانے میں قحط قدرت یا موسموں کا خطاب تھا لیکن آج بھوک عموماً انسان کی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ نوعِ انسانی اس قسم کی بھوک کے خلاف جنگ کرنا چاہتی ہے۔ اگرچہ اس میں ایک حد تک دخل کثرتِ آبادی، زمین کی فصلوں پر زیادہ انسانی کاپیٹ پالنے کا بوجھ اور شرحِ آبادی میں اضافہ بھی ہے۔ لیکن

فوری طور سے کوئی معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ عالمی بھوک کا مسئلہ صرف دستخط کر کے توہیں نہیں حل کر سکتیں۔ اس کو مٹانے کے لئے لگاتار ایک عرصہ تک انسانی ذہانت اور باوقی ذرائع کا صحیح استعمال کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے شعبہ خوراک و زراعت کی بھوک کے خلاف ہم بڑی مقدس اور اہم جنگ ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ بھوک ایک ایسا دلخیز ہے جس کو انسان کی پیشانی سے مٹانا ہوگا۔ آج اس کا مٹانا مشکل نہیں۔ اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے غذا اور زراعت کے شعبے نے بتایا ہے کہ آج ہر ۳ ہزار انسانوں میں سے کم از کم آدھے یا تو بھوکے ہیں یا تو کوئی مناسب غذا نہیں ملتی۔ دنیا کے غذائی ذرائع کو نہ صرف اتنا بڑھنا چاہیے کہ وہ ان سب کو مغفل اور پوری غذا بہم پہنچائے بلکہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی جہر سال ۵ کروڑ کی رفتار سے پھیل رہی ہے پیٹ بھرے کے لئے سامان دے۔

انسانی بھوک کی ہمیشہ سے کئی قسمیں رہی ہیں:-

- ۱۔ قدرتی اور جغرافیائی بھوک۔ موسموں اور بارشوں کی کمی سے ہوتی ہے۔
- ۲۔ معاشرتی اور سماجی حالات کے تحت پیدا شدہ قحط۔
- ۳۔ غذا کا نہ ملنا یا کم ملنا۔
- ۴۔ غلط اور حیاتین سے خالی غذا یا مناسب غذائیت کا نہ ہونا۔

دنیا کو آخر الذکر دو بھوکوں سے بھی لڑنا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ غذائیت میں صحیح توازن نہ ہونے سے بھی انسان بھوکا رہتا ہے۔ اندازہ ہے کہ دنیا کے تقریباً سو کروڑ باشندے نامناسب غذائیں کھاتے ہیں۔

اب اپنے ملک کی طرف آئیے۔ ہمارے وزیر خوراک نے اقوام متحدہ کے زیر اہتمام "بھوک سے آزادی" کی مہم پر ایک پیغام میں کہا ہے کہ دنیا سے اور پاکستان سے بھوک مٹانے کے لئے حکومت اور نجی اداروں کا تعاون بڑا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ سائنسدان دانشور اور ماہرین تعلیم مل کر باہمی ایچے سے بھوک کے خلاف مقدس جنگ لڑیں تاکہ نوع انسانی کی اس وسیع بیماری کو مٹایا جاسکے۔ آپ نے کہا کہ بھوک ایک بیماری ہے جس کا علاج ضروری ہے۔

واقعی یہ حقیقت بھی ہے کہ افریقہ اور ایشیا کی عظیم آبادیاں

۱۔ قدرتی اور جغرافیائی بھوک۔ موسموں اور بارشوں کی کمی سے ہوتی ہے۔

۲۔ معاشرتی اور سماجی حالات کے تحت پیدا شدہ قحط۔

۳۔ غذا کا نہ ملنا یا کم ملنا۔

۴۔ غلط اور حیاتین سے خالی غذا یا مناسب غذائیت کا نہ ہونا۔

دنیا کو آخر الذکر دو بھوکوں سے بھی لڑنا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ غذائیت میں صحیح توازن نہ ہونے سے بھی انسان بھوکا رہتا ہے۔ اندازہ ہے کہ دنیا کے تقریباً سو کروڑ باشندے نامناسب غذائیں کھاتے ہیں۔

اب اپنے ملک کی طرف آئیے۔ ہمارے وزیر خوراک نے اقوام متحدہ کے زیر اہتمام "بھوک سے آزادی" کی مہم پر ایک پیغام میں کہا ہے کہ دنیا سے اور پاکستان سے بھوک مٹانے کے لئے حکومت اور نجی اداروں کا تعاون بڑا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ سائنسدان دانشور اور ماہرین تعلیم مل کر باہمی ایچے سے بھوک کے خلاف مقدس جنگ لڑیں تاکہ نوع انسانی کی اس وسیع بیماری کو مٹایا جاسکے۔ آپ نے کہا کہ بھوک ایک بیماری ہے جس کا علاج ضروری ہے۔

واقعی یہ حقیقت بھی ہے کہ افریقہ اور ایشیا کی عظیم آبادیاں

۱۔ جنگل اگانے پر زور دیا جا رہا ہے۔

۲۔ سیملا و تھور کے خلاف مہم جاری ہے جو بڑا خطرہ ہے اور جس سے ہر سال لاکھوں ایکڑ زمین ناقابل کاشت ہو رہی ہے۔

۳۔ نہروں کے کنارے بند باندھ کر سیلابوں کی روک تھام

۴۔ نئے پشٹون اور بندوں کی تعمیر۔

۵۔ بہتر بیجوں کی تقسیم۔

حال میں چارے ہاں زراعت اور آبپاشی کے کئی بڑے منصوبے تکمیل کر رہے ہیں۔ کوٹری براج - دریائے سندھ پر گندو بیراج کی تکمیل - دارمک بند - راول بند اور ملاکنڈ منصوبے کی تکمیل

مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مسلمانوں نے بنگالہ شعروادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ یہ ان کا ایک مختصر، مگر سیر حاصل انتخاب ہے جو عہد قدیم سے معاصر شعراء تک پیش کیا گیا ہے۔

یہ ترجمہ آئن احمد آشک اور جناب یونس آفر
نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں۔
صفحات ۲۵۰۔ کتاب مجلد ہے، پارچہ کی
نغیں جلد۔ طلائی لوح سے مزین۔ قیمت صرف
چار روپے ۵۰ پیسہ یہی کتاب سادہ جلد میں چار روپے

ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۔ کراچی

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار
کر سکے اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس کر سکے۔

”نوائے پاک میں ملک کے نامور شعراء کی
لکھی ہوئی وطن جذبات سے برنہ نظمیں گہیت
اور ترانے درج ہیں۔

کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گرد و پوش سے
آراستہ بگیٹ آپ بہت نفیس اور دیدہ زیب
قیمت صرف ایک روپیہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۔ کراچی

چناب سے پدما تک (عوامی کہانیاں)

ہمارا ملک اس لحاظ سے کافی ممتاز و منفرد ہے کہ اس کا دامن طرح طرح کی اچھوتی، دلچسپ، عوامی کہانیوں کے گہرائیوں میں ڈھکیا ہوا ہے۔ مغربی پاکستان کی دنیا دل آویزیوں کا ایک بوقلمون مرقع ہے تو مشرقی پاکستان کی بھی ایک اپنی ہی دنیا ہے اپنی ہی فضیلت ہے، انیس ہری بھری، مسحور کن۔ مگر فرزندِ ان کو وہ دونوں اور ایک و جھرا ہوں با نرم کوشِ دُوب میں جھکتی جھکتی کہنیاں ندیوں اور اُردنی گھٹاؤں کے دیس والے ہوں، ان سب کے ذہنوں، تجزیوں اور احساس نے جن جن کہانیوں کو بنیاد پر ختم دیا ہے وہ ایک ہی چیز کی غماز اور عکاس ہیں۔ عوام کے اپنے دل کی دھڑکنیں۔ ان کی حیات کی جھلکیاں اور سادہ و سنجیدہ جذبات و احساسات کی بے لوث تصویریں۔ ہر کہانی پر تحلیل کی کار فرمائی ہے یا بیانِ واقعہ کی تفسیرِ جمیل۔ مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان، ان کی رو میں ایک ہی ہیں۔ اس لئے ان عوامی کہانیوں کا مطالعہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر لانے اور باہمی تعارف و یکجا نگاہ کا احساس پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

چند جھلکیاں:

تعارف: رفیقِ خاؤں: ابتدا میں ایک بسیط و مقدمہ جس میں عوامی کہانیوں کے مخصوص تیوروں پر مرتبہ ایک بھرچرہ روشنی ڈالی ہے۔
ایک کے اس پار: موسیٰ خاں گل مکئی، آدم درخان، محبوبہ جلات، یوسف کڑھما، شہی نور دلی، زار ساگہ، ہیرام گل اندام۔
بیچِ ندر: ہیرانچھا، ہیر سہال، مرزا صاحب، سوہنی جینوال، یوسف زلیخا، میندھرا مول۔ سہی۔
وادیِ ہیران: سسی پنوں، سرستی، مول رانز، عمر ماروی، سوار دلی، بیلا چنیس، لوزی جام تاجی۔ وادیِ بولالان: بیلی تود۔
کشمیر: گلخوار شہر مارچ۔
مشرقی پاکستان: جوا، گونائی بی بی، دیوانی مدینہ، ساحل ریکیا، آئینہ بی بی، کنول کند۔ اس مجموعہ کا ایک اہم و دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر کہانی کے ساتھ اس کی ایک مختصر منظوم جھلک بھی پیش کی گئی ہے۔
قیمت صرف دو روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳۳۔ کراچی

آشوب دہر : بقیہ صفحہ ۵۹

مشرقی پاکستان میں کرنا فلی پروجیکٹ اور کپتانی بند کی تکمیل وہ عظیم کارنامے ہیں۔ جو حکومت نے، بنجر زمینوں سے غذا حاصل کرنے کے لئے انجام دیئے ہیں۔ اب مسئلہ صحیح اور متوازن غذا، اس کی صحیح تقسیم اور معاشرتی احساس کا ہے۔ تو اس سلسلہ میں سائنس دان۔ ماہرین معاشیات اور غذا و زراعت کے ماہرین کو چاہئے کہ وہ عام آبادی کے مسائل کو جلد سے جلد حل کرنے میں مدد دیں۔ تعلیم اور ہدایت سے لوگوں میں ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ اگر بیدار ہو جائے تو بھوک کے خلاف جنگ میں فتح ہوگی اور اہل وطن بھوک کی غلامی سے چھٹکارا پائیں گے، کیونکہ تہذیب اور شائستگی کے تمام دعوے اس وقت تک باطل ہیں جب تک آبادی کے افراد بھوک سے تمللارہے ہیں۔ شاید اسی لئے تمام پیغمبروں اور بادلوں نے سب سے پہلے بھوک کے خلاف جنگ کی ہے۔ اور اسے تمام مصیبتوں اور برائیوں کی جڑ بتایا ہے۔

شہری و دیہاتی متروکہ زمینوں کے

یونٹ

کا اگر آپ نقد معاوضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو

پتہ ذیل پر تشریف لائیں۔

دفتر: سٹار پرائیٹ ڈیلرز

نمبر ۲۳۔ انارکلی۔ لاہور فون (۶۷۲۶۶)

نوٹ:- قسطوں پر کلم اور یونٹ فروخت کر کے معقول معاوضہ حاصل کر سکتے ہیں

مسلم ہنگالی ادب

ہنگالہ سے ترجمہ

ڈاکٹر انعام الحق، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں ہنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ، اور اس کے ثقافتی، ادبی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشوونما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعراء اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی

گئی ہے اور مجلد ہے، سرورق دیدہ زیب

اور رنگین فحاشات ۲۰ صفحات۔

قیمت صرف چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳ کراچی

ماہنامہ کراچی، مئی ۱۹۷۳ء

ڈبلو پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی۔ سینٹ



مپل لیف

ZERPAK

زیر پاک

مقبول کا نام

یہ اعلیٰ معیار کے سینٹ ہماری قوی آستینوں کو
حقیقت کا روپ دے رہے ہیں

مپل لیف سینٹ ہر کسی
کو سچا کامیاب بنانے کے لیے
فون تعمیر کے کاموں اور انجینئرنگ
پیشہ ورانہ پیشہ کی
پیشہ ورانہ پیشہ کی
اور سب سے زیادہ اسلام آباد
کی تعمیر و ترقی کے
دوسرے تعمیراتی منصوبوں
کے لیے
مپل لیف
سینٹ کا انتخاب
کیا ہے۔

زیر پاک سینٹ ہر کوئی
کاغذی طور کے طور کے تعمیراتی
موزوں سمجھا گیا۔
چونکہ ان کے خوراک اور مالی معیار کی وجہ سے ہی
ہر کسی کو ان کا استعمال اور پیشہ ورانہ
آہستہ آہستہ ان کے عظیم تعمیرات
کے لیے زیر پاک سینٹ استعمال
کیا جا رہا ہے۔
یہی نہیں بلکہ اس کے ڈی۔ ایس۔ کی
اس کی عین ترقی کے لیے
عمرانوں میں بھی یہی سینٹ
استعمال ہو رہا ہے۔

ممبران پاکستانی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن



”ماہ نو“ میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

- ۱۔ ”ماہ نو“ میں شائع شدہ مضامین کا معقول معاوضہ دیا جائے گا جس کے بعد وہ ادارہ کی ملکیت ہوں گے اور وہ انہیں حسب منشا ہر طور سے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔
- ۲۔ مضامین بھیجنے وقت مضمون نگار حضرات ”ماہ نو“ کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
- ۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
- ۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
- ۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
- ۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
- ۷۔ مضامین صاف اور خوش خط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔
- ۸۔ پتہ بہت صاف اور مکمل درج کیجئے۔
- ۹۔ اپنے مضامین نظم و نثر کی نقول اپنے پاس بھی رکھئے۔ غیر طلبیدہ اور ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے داکے مناسب ٹکٹ روانہ کیجئے۔

(ادارہ)

خیابان پاک

پاکستان کی علاقائی شاعری کے منظوم تراجم کا انتخاب
علاقائی شاعری کی روایات - سہائے گیت اور میٹھے بول پاکستان کی نغمہ ریز سرزمین کی خام
پیداوار ہیں۔ ان کے منظوم اردو تراجم کا یہ انتخاب چھ زبانوں کے اصل نغمات کی صدائے
بازگشت ہے۔ ساٹھ سے زیادہ مقبول شعراء کا کلام -
کتاب لغتیں اردو ٹائپ میں بڑے سائز پر
وضع داری کے ساتھ طبع کی گئی ہے۔
گرد پوش مصور ضخامت :
تین سو صفحات (۳۰۰)
قیمت چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۸۳۳ کراچی

صحت اور دانت



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن 'جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد مکمل کیا گیا ہے' دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو کسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش :- ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو چھٹی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے نگوٹیں وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ :- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار :- ہمدرد منجن کی دیر پا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔



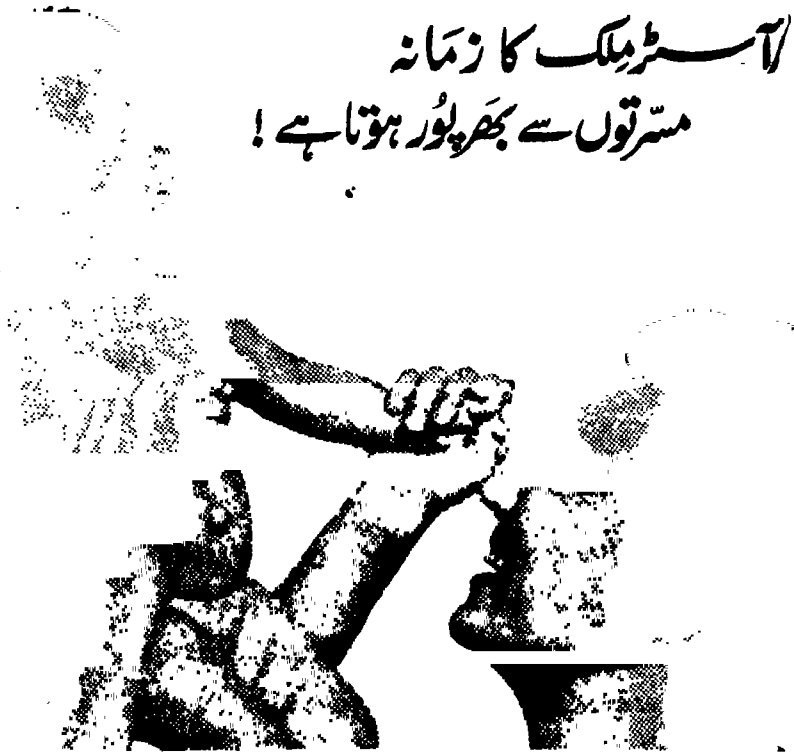
ہمدرد منجن

مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں چمکتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے



ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور

آسٹرمیلک کا زمانہ مستروں سے بھریا ہوتا ہے !



وہ زمانہ جب بچے کی پرورش آسٹرمیلک پر ہوتی ہے، ماں اور بچے دونوں کے لئے مستروں کا زمانہ ہوتا ہے۔
آسٹرمیلک بچے کو تندرست و مطمئن رکھتا ہے جس کی بدولت اسے چین و آرام نصیب ہوتا ہے۔ دوسری
طرف ماں کی مستروں کی بھی کوئی حد نہیں رہتی، کیونکہ وہ اپنی اولاد کو ہر طرح خوش و خرم دیکھتی ہے۔
جی ہاں! آسٹرمیلک بچے کی صحت اور مناسب نشوونما کے لئے مضبوط بنیادیں قائم کرتا ہے۔

آسٹرمیلک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے، اس میں فولاد ملا یا گیا ہے تاکہ بچوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے
اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے وٹامن ڈی بھی شامل کیا گیا ہے۔ اسی لئے اچھا دودھ چھٹ جانے پر یا
اس کی کمی پوری کرنے کے لئے دائرہ مند مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹرمیلک دیتی ہیں۔



آسٹرمیلک

ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل

بچوں کی پرورش پر ایک مفید کتاب
آسٹرمیلک کی کتاب اردو میں دستیاب ہو سکتی ہے۔ بچے دینے والے ہر
۵۰ پیسوں کے ٹکٹ، بھیجے اور ایک کتاب مفت حاصل کیجئے۔
پتہ: ۱۰ ویس نمبر ۶۶ - ۶۷ - کراچی ۷۔

مسلم بنگالی ادب

(بنگلہ سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ اپنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتابت نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔

سرورق دیدہ زیب اور رنگین - ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)



چین سے دو خط

انڈین انٹرنیٹریل
چنگ کنگ چین
۲۵ اگست ۱۹۶۲ء

..... گزشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی اسل کردہ
دل روڑ کی روشنی کی شکر! مجھے دس سال کے عرصے سے
یہ تکلیف تھی۔ ہر قسم کی دسی، انگریزی ادبیات استعمال
کیں مگر کچھ بھی آفت نہ ہوا۔ دل روڑ کو صرف
چھو دن لگانے کے بعد تمہیں ہم شکایت بانی رہی۔
کاش! مجھے پہلے ایسے تیرہ ہدف مطلق کا علم ہوتا.....

ن۔ ا۔ غ
میگر

انڈین انٹرنیٹریل
چنگ کنگ چین
۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء
..... مجھے کچھ عرصے گزرنے پر ایک قسم کی محنت ہے
والے سے ہیں جن کی وجہ سے غائب بہت ہوئی ہے
نشانات تو رنگ و دم سے ملتے ہیں مگر یاد جو
انگریزی علان کے آفت نہیں ہوا! افضل میں آپ
کی وائی دل و ذکاوت کا اشتہار دیکھ کر خیال ہوا کہ اسے بھی
استعمال کر کے کھول لیں گے کہ انڈین انٹرنیٹریل کی آپ
مہربانی فرما کر ایک نئی شیڈ دل و ذکاوت کا اشتہار لایا ہے
بند لیا ہوا اسل وائڈ کر سکتے ہیں.....

ن۔ ا۔ غ میگر

دل روز تمام لاء علاج جلدی امراض

ہر قسم کے پھوٹے پھسے پھسے لاپوری پھوٹے
مغلانی پھوٹے یا سورنگیٹ درد بال توڑ داؤدینیل غار ش
گنج خست زیر کچھالی۔ گجی۔ رسولی۔ سحر وینڈی۔ رینہ مبار
درد۔ ملین یوجن چوٹ۔ نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں
کے کاٹے اور ڈسے کا بغیر اور تیرہ ہدف مطلق ہے۔

چیر بھاڑ اور مریم ٹپی سے نجات دلاتی ہے

قیمت فی شیڈ

دو روپے - ایک پیسہ

۱۹۶۲ء استعمال میں ہے

حکیم طاہر الدین اینڈ سنز ڈالروڈ لاء فیروز پور روڈ لاہور خیاب

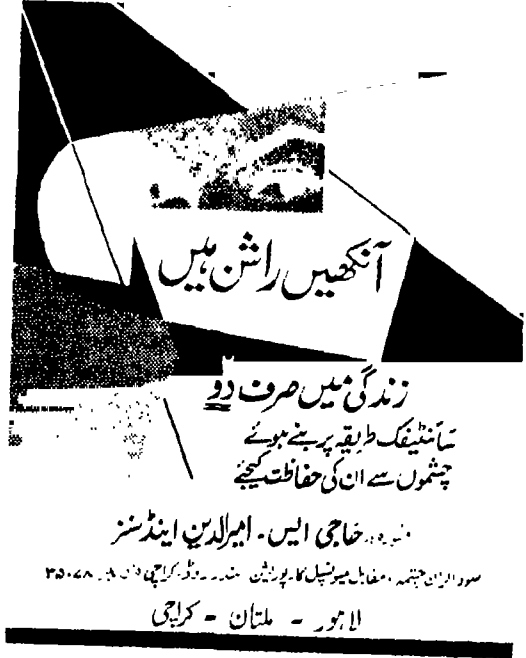
ہر شہر وادوں میں طلب کریں

» ماہ نو «

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

- ۱ - غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس آئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں -
- ۲ - مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے -
- ۳ - ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین کو ناقابل اشاعت تصور کیا جائے -
- ۴ - ادارہ ڈاک میں کسی مسودہ کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں -

(ادارہ)



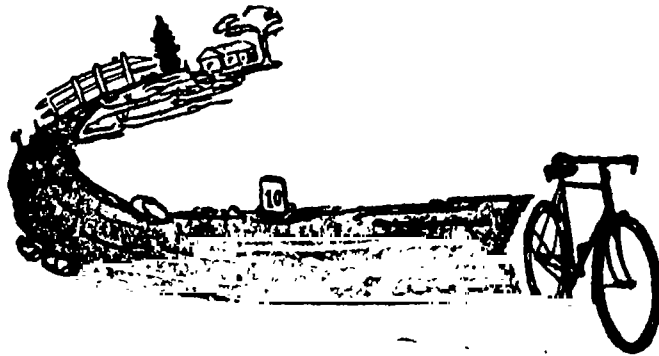
زندگی میں صرف دِل
سائنٹیفک طریقہ پر بنے ہوئے
چشموں سے ان کی حفاظت کیجئے

امیرالدین اینڈ سنز
سرورازان چشمہ، مقابل میونسپل کارپوریشن مندر، ڈاک کراچی ۷۵۰۰۸

لاہور - ملتان - کراچی

فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر آپ کے پاس

بہترین کوالٹی کی بہ :



موجود ہے !

رستم سائیکل

آپ کو غیر ملکی سائیکلوں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے - مشہور و معروف ہائیدار اور تیز رفتار
» رستم سائیکل « ہر چھوٹے بڑے شہر میں کفایتی داسوں پر دستیاب ہے

شمارہ ۶

ماہِ نو

جلد ۱۶

جون ۱۹۶۳ء

مدیر: ظفر قریشی

۶	آمنہ صدیقی	نوائے دوش (ڈپٹی نذیر احمد کی شاعری)	فسانہ ہی ہم لوگ؟
۱۱	جمیل نقوی	ابرار یا بار	
۱۳	انور سعید گیلانی	مشعل پریچ و تاب (مولانا محمد علی جوہر عزم)	
۱۷	محمود صدیقی	اک طرفہ شاعری... (مولانا حسرت عثمانی عزم)	
۱۹		ہمنفسان رفتہ (نقیس بھگوری عزم کے نامہ سائنہ کے خطوط) رئیس میسنڈاؤ	
۶۲		مرگ شوکت	
۲۴	سید قدرت نقوی	عالم یک شہر جستجو	مقالہ:
۳۲	صہب الکنوی	بزرگ بچوں کے دھس ہیں (ریونٹاؤ)	کہانیاں، ریونٹاؤ، ڈرامہ:
۳۷	ظفر حسین	نمر علی کہانیاں	
۴۱	سید احمد رفعت	نظارے (کھیل)	
۵۴	سحر انصاری	کبھری ہوئی شبیریں	منظمیں:
۵۴	عرفان عزیز	ابر رواں	
۳۱		شان الحق حقی	غزلیں:
۵۵	تمہید الاسلام سید	رضی ترمذی	
۵۰	سید غلام حسن شاہ کاظمی	سید گل (ہزارہ)	مغربی پاکستان:
۴۸	سید جگر کاظمی	مکمل ہے گلہ ہے باز خواں... (پشاور میں عید)	
		★	
۵۶	رشید نیاز	چین اور اسلام	تاریخ:
۶۰		(ہماری ڈاک)	ماوشما،
	(عید)	یوم بہاراں	سرورق:

فکاپٹ

۵۰ پیسہ

شائع کردہ:
ادارۃ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

سکالانہ چندہ

پانچ روپے ۵۰ پیسہ

رعجب دیتا تھا انہیں لشکر جہاز کا کام
کہ زمانے میں بندھی اپنی ہوا رکھتے تھے
فتح اک خادمہ تھی ان کی اور اقبال غلام
مختصر یہ ہے کہ پہلے یہ خدا رکھتے تھے

نذیر احمد کے نزدیک مسلمانوں کی ہستی کا سب سے بڑا سبب لہجہ
تھا۔ اس نے انہوں نے جا بجا جہالت کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔
اور تعلیم کی افلاہیت و اجمیت کو واضح کیا ہے۔ علم ان کے نزدیک
سب سے بڑی دولت ہے، مگر وہ علم نہیں جو ”ذہنی حیاشی“ کی حیثیت
رکھتا ہے، بلکہ وہ علم جس سے زندگی کو بنایا اور سنوارا جاسکے۔ نذیر احمد
اس علم کو ”علم نافع“ کہتے ہیں اور اسی کو عام کرنے کی تمنا انہیں بے تاب
رکھتی ہے۔ وہ اس حقیقت پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں کہ سلطنت کے بچے بچا
کے غم کی تلافی علم ہی سے کی جاسکتی ہے۔ وہ قلم کی حکومت کو دوا می سمجھتے ہیں،
یوں کہ اس کے مقابلے میں باقی سب حکومتیں بیچ ہیں:

حکومت ہے بیچی حکومت قلم کی
نہ بددق و سیف و سنان و علم کی
خدائی خزانوں کی کبھی قلم ہے
کہ جو حرف لکھتا ہے وہ اک رقم ہے
قلم کا قلم ہے قدامت سے جاری
اسی کی حکومت کو ہے پاداری
اگر اس حکومت سے ہم کام لیتے
تو شاہنشاہی مفت بے دام لیتے
گئی سلطنت اس کے جانے کا غم کیا
نہیں پاس کاغذ دوات اور قلم کیا
مگر علم کہ ہم نے طاقت نہ جانی
نہ جانی نیاقت، نیاقت نہ جانی
گو استاد منشور و منظوم ہیں ہم
ولے علم نافع سے محروم ہیں ہم

اہل یورپ کی تقلید بھی وہ صرف اسی حد تک چاہتے ہیں
کہ ان سے علم — ”علم نافع“ حاصل کیا جائے۔ ان کے نزدیک
اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول تو یہ علم اہل یورپ نے خود مسلمانوں

سے حاصل کیا تھا، لہذا مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اہل یورپ سے اپنی اس
امانت کو واپس لیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل یورپ کی ساری ترقی
علم ہی کی بدولت ہیں، انہوں نے بحریہ و کاسینڈ چیر کر جا بجا اپنی فتوحات
کے جو جھنڈے گاڑے وہ علم ہی کی بدولت ہیں، اس لئے مسلمانوں
کو اگر اپنی فلاح مقصود ہے اور انہیں اہل یورپ کی طرح اقوام عالم
کی نگاہوں میں ممتاز ہونا ہے تو انہیں علم حاصل کرنا چاہئے۔ نذیر احمد
انگریزوں سے شیر و شکر ہونے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں، مگر محض
اس لئے کہ ان سے علم و ہنر حاصل کر سکیں۔ انہیں یہ کسی طرح پسند نہیں
ہے کہ مسلمان انگریزوں کو ”خیر“ سمجھیں اور ان سے گریزاں رہیں:

مگر کیا ظلم ہے ہم بدگماں ہیں اس قدر ان سے
کہ ہر اک بات میں رکھتے ہیں پرہیز و حذر ان سے
الہی کب وہ دن ہوگا کہ ہوں شیرو شکر ان سے
تو پھر جی کھول کر حاصل کریں علم و ہنر ان سے

بطور خوش دلی ایک ایک کی عادت کو مہ جائے
یورپی کچھ تفرقہ مذہب کا رہ جائے تو وہ چاہئے
لیکن اس سلسلے میں وہ خلصے محتاط نظر آتے ہیں۔ انگریزوں
کی تقلید میں وہ ”ابن الوقت“ کا سا انداز پیدا کرنے کے خلاف ہیں۔
وہ یہ نہیں چاہتے کہ مسلمان اپنی معاشرت کو بھی اہل یورپ کی نقلی
کا آئینہ بنا کر رکھ دیں، اور اپنی وطنی و قومی خصوصیات کو بھول جائیں،
انگریزوں سے ”شیر و شکر“ ہونے کا مطلب صرف ایک ہے کہ اس طرح
”علم نافع“ حاصل کیا جائے۔ وہ صرف یورپ کے علم کے مداح ہیں، وہ ان
کے تمدن کے نہیں۔ یورپ کے تمدن کو تو وہ ”سکھ ملتیں“ (کھوٹا سکھ)
تک کہہ جاتے ہیں اور اس امر پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ وضع یورپ
کو پسند کیا جا رہا ہے:

تمدن میں داخل ہوئی وضع یورپ چلن ہو چلا سکھ ملتیں کا
وہ تقلید وضع یورپ کو ہر اعتقاد سے اپنی قوم کے لئے نقصان
سمجھتے ہیں، اور انہیں یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں ”کو اچلا ہنس کی
چال...“ والا حال نہ ہو،

کیا پیش لئے دیکھیں تفسد وضع یورپ
کو سے ہیں چال ساری ہم ہنس کی چلے ہیں
گویا اس طرح وہ سرسید تحریک کے ایک بہت بڑا... مسلح

نذیر احمد کہتے ہیں وہ کافر سی، لیکن دنیوی فائدے کے لئے ان کی باتیں ماننی ہی چاہیں:

پٹس کیا ہوسید کے نزدیک پیچھے سونجی یہ کافر۔ سہی بلا کفر
وے گر کہ دنیوی فائدے کی تو کیا مند سے کر لو! بغضال پر لرز

ایک دوسری نظم میں کہتے ہیں:-

خدا نے کیا ہم میں اک شخص پیدا
مسلمانوں کی قوم کا دل سے سفید
ہو اسلام کا بول بالا کسی ڈھب،
یہی اس کا دیں ہے یہی اس کا مذہب
ہر وقت قوم میں ہر وقت شاعلی
وہ بے چارہ کیا جانے قرض و نوافل
یہ بے دیں ہے یا کہ دیں دار ہے یہ
تمہارے ہی کارن دل انگار ہے یہ
مرد ہر پوجے ہیں، پتھر کسی نے
مگر کی ہے قومی پرستش اسی نے
سخن قوم کا قوم ہی سے سخن ہے
اسے جانتے سوتے ہں ایک دھن ہے

ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور (۱۹۸۹ء)

میں نذیر احمد نے سرسید کا جو مرثیہ پڑھا تھا، وہ نذیر احمد ہی کی شاعری میں نہیں بلکہ اردو کے شخصی مرثیوں میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ حالی کے مرثیہ غالب کے بعد شاید ہی کوئی شخصی مرثیہ اتنا بلند پایہ ہو۔ اس میں نذیر احمد نے ایک فرد کو پوری قوم کی علامت قرار دے کر ایک فرد کا نہیں پوری قوم کا ماتم کیا ہے۔

اگر کوئی یہ پوچھے کہ نذیر احمد کی بہترین نظم کون سی ہے تو بلا خوف تردید اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے جو ”فسانہ مبتلا“ کے آخر میں بطور منیمہ درج ہے۔ یہ نظم جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کثرت ازواج کے رد میں ہے۔ لیکن نذیر احمد نے اس نظم میں مسلمانوں کے تمام مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ نذیر احمد کی پہلی نظم ہے، لیکن اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ان کی بعد کی نظموں میں ملتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

ہونے کے باوجود اکبر آبادی کے ہم نوا ہیں، جیسے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی پس ماندگی کو ختم کرنے کا جو سب سے بڑا علاج تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ سرکاری ملازمتیں حاصل کریں سرکاری ملازمتوں میں ہندو پیش پیش تھے، اس طرح مسلمان انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے غلام بھی بن گئے۔ اس دور میں غلامی کو تمام قومی رہنماؤں نے محسوس کیا اور اس کو ختم کرنے کی طلب قیام کی۔ نذیر احمد بھی اس سلسلے میں خارش نہ رہے اور وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں، ایک نظم میں سرسید کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم ہیں بہت عاشقوں کے فسانے جو عاشق ہووے عشق کی قدر جانے
کچھ ہے ہر شے احمد کو دیکھا تو سمجھے کہ ہاں عشق ہوتا ہے ایسا
خوش بن جائے غریب و غنی ہر طبقہ خدا پوچھے ذات قوم ان کی کیا ہے
مذاہب طبعیت کے ہوتے ہیں مختلف مگر جس طرح کی روح دلیے فرشتے
قدر طلب گر خدا اس کو زور دے مگر منت کو یہ مسلمان کرے
مسلمان کلکٹر، مسلمان کمشنر مسلمان ہر ایک صیفے میں افسر
ہر جگہ جیسے ہی مولیٰ جی ہوں ٹکس دھوم سے چل کے کچھ میں جی ہوں
سرسید کا ذکر آگیا ہے تو یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ سرسید

نذیر احمد سے بڑا احمد کوئی نہیں مل سکا۔ حالی اور دوسرے مشاہیر کی رفاقت تسلیم۔ لیکن نذیر احمد نے جس طرح سرسید کو ان کے مقاصد میں کامیاب دیکھنے کے لئے کوششیں کی ہیں، ان کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ نذیر احمد اسے درے سنے ہر طرح سے مدرستہ العلوم ملی گریڈ کی مدد کرتے رہے۔ وہ اپنی جیب خاص سے ہی نہیں مدد کرتے تھے بلکہ دوسروں کی جیبیں بھی خالی کر دیتے تھے۔ سرسید کی ذات اور ان کے مقاصد سے انہیں پوری پوری ہمدردی تھی، انہیں بعض مذہبی معاملات میں سرسید سے اختلاف تھا اور اس کا انہوں نے بڑا اظہار بھی کیا، لیکن اس اختلاف کی وجہ سے وہ سرسید کی خوش رضا کے منکر نہ ہو سکے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا سرسید کی تعریف کی ہے اور منظومات میں تو شاید ہی کوئی نظم سرسید کے ذکر سے خالی ہو۔ نذیر احمد نے ہر موقع پر سرسید کی قومی ہمدردی کو سراہا ہے اور انہیں بہت بڑا رہبر قوم قرار دیا ہے۔ سرسید پر کفر کا فتویٰ لگا۔

موتوں ہم ان کو چپکے چپکے سمجھایا کئے
اب جو کچھ کہنے کو ہیں سو بر ملا کہنے کو ہیں
کوئی لے بھی جائے ہم سے دل کہ قصہ پاک ہو
یہ حسینان جہاں بھی دل رہا کہنے کو ہیں

آدل سے ہوتے آئے ہیں دنیا میں انقلاب
اک طرح پر کسی کا زمانہ رہا نہیں
جو واقعہ ہے اس کا سبب ہے کوئی فرد
ٹوٹا کسی مقام سے یہ سلسلہ نہیں
کیا رویے کہ غور سے دیکھا تو واقعی
اپنا ہی ہے قصور کسی کی خطا نہیں
ہم آپ جھنے دیتے نہیں نقش مدعا
ورد ہمارے ہاتھ میں سب کچھ ہے کیا نہیں

صبر رخصت ہوا سنتے ہی ترازم سفر
تم تو کل جاؤ گے یہ ہم سے ابھی چھوٹ گیا
نہ سہی پڑے۔ تجھے دکھلاؤں گا اپنی پرواز
گر قفس سے ترے صیاد کبھی جھوٹ گیا

ہمیں جو صید زبوں سب نے دیکھ پایا ہے
ہر ایک بے سبب آمادہ ہے جفا کے لئے

رحمت اے دست جنوں زحمت سے فارغ کو یا
جیب و داماں دونوں غائب ہیں سلوائیں گے کیا

نذیر احمد کی شاعری ان کی قادر الکلامی کی آئینہ دار ہے
انہوں نے مشکل زمینوں میں طویل نظمیں لکھی ہیں اور کہیں
آدھ کا احساس نہیں ہوتا، سپاٹ اور "بغیر شاعرانہ" شام و
ان کے ہاں ہے مزور، لیکن بہت کم۔ اکثر جگہ شاعری کے
خوبصورت نمونے ملتے ہیں، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو، ایک
نظم میں اسلام کو باغ سے تشبیہ دی ہے اور پھر اس باغ کا نقشہ

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

جیسے نذیر احمد کی تمام نظمیں اسی مسدس کی وضاحت میں لکھی گئی
ہوں۔ ہماری قومی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے شاید ہی کسی
نقاد نے اس مسدس کے بارے میں کچھ کہا ہو۔ میرے نزدیک ہماری
جدید شاعری کی بنیاد جن دو چار نظموں پر ہے۔ ان میں یہ مسدس بھی
شامل ہے۔ یہ نظم اسی سے زائد بندوں پر مشتمل ہے بے ثباتی
دنیا کے ذکر سے اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ اور اس میں مسلمانوں کے
مروجہ وزوال اور ان کے ماضی و حال کی تصویر کشی دلچسپ پیرائے
میں کی گئی ہے۔ اس کے بعض بندوں پر تو ایسا گمان گزرتا ہے
جیسے اقبال کو اسی مسدس نے "شکوہ" لکھنے پر آمادہ کیا ہو۔

ہم نے بنایا اہل جہاں کو خدا پرست
ہم نے دلایا یاد انہیں وعدہ الست
ہم نے کیا بتوں کے تئیں سرنگون بیت
ہم نے اتارہ نشہ صہبائیاں مست

شائستگی کی بیل ترقی کے ساتھ تھی
پود اس کی ہے لگائی ہوئی اپنے ہاتھ کی
نذیر احمد نے غزل کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اور اسی
وجہ سے ان کے زمانہ میں انہیں "شاعر کی بجائے" ناظم
کہا جاتا تھا۔ نذیر احمد کے علاوہ اردو میں شاید ہی کوئی اور
شاعر ہو جس نے غزل کا ایک آدھ شعر نہ کہا ہو، ورد یہاں تو
یہ عالم ہے کہ زندگی بھر غزل کی مخالفت کرنے والے بھی غزلیں
کہے بغیر نہ رہ سکے۔ نذیر احمد کی شاعری ایک خاص مقصد کی
حامل تھی، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے غزل مفید مطلب
نہ تھی۔ اسی لئے انہوں نے غزل کی طرف توجہ نہ کی۔ اس کے باوجود
ہن کی نظموں کے بعض اشعار تغزل کے حامل ہیں۔ ایسے چند
شعر سنئے، جن پر غزل کے شعروں کا گمان ہوتا ہے:-

تو چاہتا ہے سیر مجھے دردِ جام سے
اور یاں سبو بھی قطرہ ہے گرتا گلہ نہ ہو
مجھ کو دیا گیا ہے وہ مایوس دل جسے
احساس شادمانی لا تقنط نہ ہو
جو آرزو ہے اس کا نتیجہ ہے افعال
اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو

ابر دریا بار

جمیل منقوع

نمود و در دل شب رونے، ابر دریا بار۔ اور ڈپٹی نذیر احمد "ابر دریا بار"
ہی تو تھے۔ "سید والا گہر کی بزم کے ایک رکن کین جن کی ساگرہ اسٹل
انجن مضیفین پاکستان (کراچی) نے بڑے اہتمام سے منائی۔ بہ بہار میں نظم ہی
تقریب کی یادگار اور اسی چشم و چراغ مغل کی آب و تاب کا لطیف پرتو ہے۔

(ادارہ)

ہر ایک صنف سخن تھی فسانہ و افسوں	بقدر ظرف تصور تھی کائنات ادب
سمجھتے تھے ادب و فن کو بادۂ گلگوں	ہر ایک کہنے حکایت تھی نثر میں واسوخت
ہر ایک لفظ کے ساغریں نشہ افیوں	ہر ایک بات میں ایہام و صنعت تعلیل
ادب کی جان تھے شرح و بیان سوز و دل	"زہے کرشمہ کریوں دے رکھا تھا دل کو فریب"
جنوں کا نام خرد تھا خرد کا نام جنوں	ادب تھا عشق کی غارت گری سے شرمندہ
یہی طلسم تھا مرغوب خاطر محضوں	وصال و ہجر تھیں دو کروٹیں فانیوں کی
بس اک بہشت ثمال تھا اور دل مفتوں	جیسے شرم سے تحت الشعور رہی تھا
جناب شیخ کی سادہ دلی تھی وجہ سکوں	خیال جلوہ گل سے خراب تھے میکش
رقیب و حسرت دیدار و دیدہ میگوں	شراب خانہ و خمار و شیشہ مئے ناب
جفا و جور و ستم کی حکایت پُر خوں	جگر کا درد، جگا ہوں کے تیر، خنجر ناز
ادب کی جان تھے ایسے ہی بیشتر مضمون	"وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد"

مزاج نکتہ و لہجہ خود پرست و عرش نشین
جھکی ہوئی در محبوب پر ادب کی جبیں

ازہرم سید والا گہر چرائے غاسٹ
کہ بر فروخت چو خورشید روئے اردو را
نور و در دل شب روئے ابر دریا بار
نیز، باقی اسلوب کو نذیر احمد
نزد اکب و گہرا بجوئے اردو را
فشانہ در ہمہ اطراف بوئے اردو را

جنوں بھی عقل کی کوتاہیوں کا محرم ہے
وہ علم و فضل کی دولت بھی کوئی دولت ہے
فقیہ شہر خرد کو یہ راز سمجھائے
نہ دوسروں کو نوازے نہ اپنے کام آئے

عروس فکر کے زانو پہ رکھ کے آئینہ
نئے نشاط سے بدست اہل غفلت کے
الط کے تلخ حقائق کے رخ سے تیرہ نقا
کبھی حکایت صبر گریز پا کہہ کر
مشام عقل کو خوشبو سے روشناس کیا
بنا کے شکوہ "راحت جواحت پیکال"
کبھی حقوق و فرائض کا تجزیہ کر کے
کبھی نصوح کے پردہ میں چند پند دئے
کبھی تراش کے رویے صادقہ کا طلسم
سنا کے مردہ دلوں کو کبھی فسانہ غدر
صلے میں راست بیانی کے کافر ی پائی
رخ حیات کے نقش و نگا چمکائے
عیوب انہیں کی زباں سے کچھ ایسے گنوائے
ضمیر عصر کے چہرہ کے داغ دکھلائے
دل و نظریہ مطعن کے تیرہ بر سائے
اگر کبھی چین و دل میں پھول بر سائے
بناتِ نقش کو آدابِ شرم سکھلائے
مقلدوں کو شریعت کے راز سمجھائے
کبھی روایت زہر سے قلب گموائے
نئے مبادی حکمت کے تار سلجھائے
بڑھادائے نگہ سو گوار کے سنائے
رہ سلوک میں ایسے مقام بھی آئے

ہمیشہ دست بکا رگرہ کشائی زد
چوں با خدا بتواند دم از خدا کشائی زد

رئس الاحرار مولانا محمد علی "جوہر"

۱۸۷۸ء - ۱۹۳۱ء



"مرے "جوہر" آپ کے جوہر لہے"

حاک حمتا ہے اُتر موت سے ڈر۔ ہے یہی
 ہوس زنسب ہو اس درجہ تو رہنا ہے یہی
 فلزم عشق میں ہیں نفع و سلامت دونوں
 اس میں ڈوبے بھی تو دیا پار اترنا ہے یہی
 اور کس وضع کی دیوا ہیں عروسان بہشت
 ہیں کفن سرخ ، تنہاؤں کا سنورنا ہے یہی
 حد ہے بستی کی کہ بستی کو باندی جانا
 اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی
 ہو نہ مایوس کہ ہے فنج کی تقریب شکست
 قہر مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی
 نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو "جوہر"
 کام لرنے کا یہی ہے ، تمہیں کرنا ہے یہی



لوح کی نقاب کشائی

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں ممتاز مقام حاصل
کرنے کے لئے ہمیں جدید فنون کی تحصیل پر اور زیادہ
زور دینے کی ضرورت ہے۔ پچھلے دنوں ملک میں ایک
اور فنی درسہ کا قیام عمل میں آیا۔

(گورنمنٹ پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ) : (افتتاح : صدر پاکستان



اس درسہ میں برقی قوت کا شعبہ

ملک کی
یونیورسٹی
کے
وائس چانسلر
ایوان
(راولپنڈی)
میں
ملک کے
اہم تہذیبی
مسائل پر
غور و



شعلہ پرتیچ و تاب

(رئیس و حصار مولانا محمد علی جوہر)

انور سعید گیلانی

ہے فرق جینے اور مرنے کا کوئی شاعر نہ بات نہ تھی بلکہ تامل حقیقت تھی۔
چنانچہ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ :
لاکھ جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوس زلیت ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
اور انہوں نے اپنے شاندار منصب العین کو ہمیشہ ہوس زلیت سے
بلند تر رکھا اور اس مقصد جمیل کو اس پر ترجیح دی۔

ابوالاثر حفیظ کے اس خراج تحسین کو یاد کیجئے
جو انہوں نے اس بطل حریت کو یاد کیا ہے۔ ان کا الہام
سرفروشانہ ذوقی جہاد ایسے ہی خراج تحسین کا مستحق ہے۔
وہ اس کا بہ شدت تمام متقاضی ہے۔

آزادی کے اس بے پاک پرستار نے دیکھا
کہ ایک قوم کی قوم باہر بخیر ہے۔ وہ بے بس
ہے، بے دست و پا ہے، مورد تعزیر ہے۔ وہ ایک
ایسے دامن سخت میں گرفتار ہو چکی ہے جس سے ناپائی کی
امید موبہوم نظر آتی ہے۔ اور اس کو نجات دلانے کے
لئے طرفان حوادث کے خلاف انتہائی بے باکی سے
سینہ سپر ہونے کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں مخالف
عناصر سے محترمانہ لینے کا ارادہ ہی قابل تصور تھا۔ چہ جائیکہ کوئی شخص حقیقت
پر یکا جیات میں کوئی پرکربستہ موجد اور اہل من مہارذ کا نعرہ
بلند کرتے ہوئے داد شجاعت دیتا۔

مولانا محمد علی ان حوصلہ مند انسانوں میں سے تھے جنہوں نے
اس زبردست چیلنج کو بے محابا قبول کیا اور شدید سے شدید شہادت
مصائب کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی لٹکا لٹکی آواز
آج بھی وقت کے پردوں کو چیر کر آتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ اعلان کی

ایک ایسی ہستی بننا تو گناہ زمانہ بھی ہے اور افسانہ بھی۔ وہ خود
زندہ تھی۔ اس لئے اس نے ایک ایسی روایت کو جنم دیا ہے جو آج بھی
زندہ ہے۔ اور جب بھی ہم اپنے اس باطن کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔
جو کچھ ایسا دور بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم میں اور اس میں
کل ۲۳ سال ہی کا تو فرق ہے۔ میں الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی وفات
۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو تریپن ہسپتال کی عمر میں واقع ہوئی تھی۔ تو ہم

اس مجاہدوں کے مجاہد اور جنگ آزادی کے مشعل سے
دوچار ہوتے ہیں جس نے زندگی کی، فسرہ رگوں میں
تازہ خون دوڑا دیا تھا اور سینوں کے اندر دل کی
دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔

مولانا محمد علی نے ایک نہایت نازک اور
بڑے پُر آشوب زمانے میں جب آزادی کا نام تک لینا
جرم تھا اور جس کی ہنر اور رسن سے ادھر کچھ بھی انتہائی
بے باکی کے ساتھ میدان جہاد میں قدم رکھا اور اپنی تمام
زندگی اس کے لئے وقف کر دی۔ وہ حقیقی معنوں میں
شمع آزادی کے پروانے تھے اور اس پروانے کا انجام بھی
وہی ہوا جس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

پھر نہ دیکھا ہم نے جزیک شعلہ پرتیچ و تاب
شمع تک ہم نے بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیس

یعنی انہوں نے اپنی ساری حیات آزادی کی جدوجہد میں ختم کر دی۔
قوم نے آزادی کے اس مجاہد کو یونہی رئیس الاحرار کے خطاب
سے یاد نہیں کیا۔ یہ اس یگانہ روزگار شخصیت کی قدرو منزلت کا اقل
تقاضا تھا۔ اگر اس سے بھی بڑھ کر کوئی جلیل القدر خطاب ممکن ہوتا تو وہ
اس کے بھی پوری طرح مستحق تھے کیونکہ ان کے نزدیک محنت میں نہیں

”دیوان جوہر“
(جلد دوم گزشتہ)

مرتبہ

خورا محمد حسن

ناشر

شیخ غلام علی ایڈیشنر

لاہور و کراچی

صفحات : ۱۷۰

قیمت ۱۰ روپے

ہانگ جزا سی شدت سے گوش زد ہوتی ہوئی روجوں کو تڑپاتی امدادوں کو گراتی ہے۔

۵ دورِ غلامی بیشک تھا وہ لوگ جنہوں نے دورِ آزادی میں آنکھیں کھولی ہیں وہ اُن دنوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے جب افکار پہ قید اور جذبات پر زنجیریں تھیں اور ساتھ ہی انسان کی بات چیت اور عمل پر بھی زنجیریں چڑھا دی گئی تھیں۔ کس کی مجال تھی کہ اپنا سر بھی اٹھا کر چل سکے یا حکمِ حاکم کے سامنے مرنے بھی کر سکے اور مسلمانوں کے لئے تو لطف و کرم اور بھی سوا تھا۔ اجنبی طاقتوں کا بے نام گراؤ ستم ہی نہیں بلکہ انہائے وطن کی رقابت، ریشہ دوانی اور جادو خانہ طرزِ درویش کا جو روستم بھی، جو کچھ کم سنگین اور گراں بار نہ تھا۔

یہ فضا تھی جس میں محمد علی، شوکت علی سلسلے اُسے امدادوں کی بے باک آوازیں بلند ہوئیں۔ تحریکِ خلافت کا غلغلہ بلند ہوا۔ دلوں بھائی اس تحریک کی روح و رواں اور محرکِ آما علامت تھے۔ جیسی تحریکِ اہم بالشان تھی اسی طرح ان کی شخصیتیں بھی اہم بالشان تھیں۔ جہادِ آزادی کے نعروں سے بھرپور فضا میں جینا حقیقی ملنوں

میں جینا تھا۔ اس میں ایک بے پناہ دلولہ آفرینی تھی۔ ایک بے پناہ جوش و خروش۔ طول و عرض ملک میں تحریکِ خلافت گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ دونوں مجاہد بھائیوں کی للکار بھی۔ آج یہ آواز اس شہر میں بلند ہوتی تو کل دوسرے شہر میں۔ لمبے لمبے شہر اور جلوس ہر ہر دیں میں دلولہ ہی دلولہ پیدا کرتے ہوئے، اور میلوں لمبے جلوسوں کے سامنے یہ دونوں کوہِ پیکر بستیاں۔ رعب انگیز و جاہت اور شجاعت کی تصویر۔ اُن کی مخصوص ٹوپیاں، چاند ستاروں سے مزین، دور ہی سے اپنے پر عظمت پر شکوہ اور باوقار پہننے والوں کے دبدبہ میں اضافہ کرتی ہوئی اور پھر اُن کی برسرِ عام شعلہ فشاںی۔ یہ وہ منظر ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک وقت تھا جب ہندوستان کے گوشے گوشے سے افغانستان تک خلافت، خلافت ہی کے نعرے گونجتے تھے۔ اور پچھلے بچے کی زبان پر یہ ناقابلِ فراموش بول تھے،

”بولی آماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دے دے

ہجرت کی تحریک کا یہ سماں دیکھنے کے لائق تھا کہ کس طرح کنبے کے

کنبے اپنا گھربا چھوڑ کر، قلیل ترین زاد راہ سے کمرِ آزادی کے گیت بجاتے ہوئے انتہائی دالہا نہ پن کے ساتھ افغانستان کی طرف ہجرت کے لئے چلے جاتے تھے۔ یہ سب علی ہمدردان کے بے اندازہ اثر اور مقبولیت کا ہی کرشمہ تھا۔

مولانا محمد علی جوہر ”کامریڈ“ اور ”ہمدرد“ جیسے بلند پایہ اخبارات کے مدیر کی حیثیت سے بھی جدید صحافت کے بانی مبنی اور انگریزی امدادوں میں نئے فکر و افکار کے پہلے انقلابی داعی اور معاصر تھے حقیقتہً ہماری نئی نشاۃ الثانیہ کے بھی اولین نقیب تھے۔ ان کے نزدیک صحافت تمام تر زندگی کے انقلاب اور آزادی کی آئینہ دار تھی۔ جہاں وہ بذاتِ خود سرناپا پیکرِ حریت تھے وہیں ان کی صحافت بھی آزادی و انصاف کا نعرہ مستانہ تھی۔ چنانچہ وہ آخری دم تک انہی کے حلیف رہے یہاں تک کہ انہوں نے غلام آباد ہند میں مرنا بھی گواہ نہ کیا۔ ان کو زندگی ہی نہیں موت میں بھی ایک غلام سر زمین سے وابستہ ہونا گوارا نہ تھا۔ یہ ان کے لئے باعثِ ننگ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد علی آج بھی زندہ ہیں۔ وہ ہماری نظروں میں آج بھی ”رئیس الاحرار“ ہیں اور کشمکشِ حیات میں ہمارے لئے ایک بے نظیر مثال، ایک دلیلِ راہ، اور ایک زبردست محرک ہیں۔ ان کی شخصیت ایک ایسا شعلہِ جوالہ ہے جس کے قریب آتے ہی ہم خود بھی پیکرِ التهاب بن جاتے ہیں اور خواہ ہمارے حالات کچھ بھی ہوں، ہم بعینہً وہی روش اختیار کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے عہد کے مطالبات کے رد و دود و اختیار کی تھی۔ بیشک غلامی کے تقاضے اور شعلے نہایت دشوار ہوتے ہیں لیکن آزادی کے تقاضے اور شعلے بھی کچھ کم دشوار نہیں ہوتے بلکہ وہ تو ان سے بھی زیادہ دشوار ہوتے ہیں۔ اور ان سے غلبے کے لئے اور بھی زیادہ بے باکانہ جذبہ و جوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ رئیس الاحرار کی انقلاب آفرین شخصیت ہمیں برابر ہمہ گیر ہے، ہمارے سینوں میں آزادی کی برقی حرارت بھرنے، ذوقِ جہاد کو اشتعالک دینے، کٹھن سے کٹھن حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے، مردہ دلوں میں اپنے آتشیں نفس سے روحِ حیات پھونکنے اور مردہ کے تقاضوں پر لبیک کہنے کی تحریک دلائے کے لئے ہر دم موجود ہے۔

آج رئیس الاحرار ہم میں اپنے اُس پیکرِ آزادی کے ساتھ موجود

۱۷

اپنی قلم ہے تو سرورق پر اپنے قلم - چند جملے بھی ملاحظہ ہوں:

۱: فکر گزار اور ممنون ہیں کہ کہ ہم متذکرہ بالا۔

۲: ایسے بر محل شعر پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ

۳: ایسے وقت اختیار کیا کہ ان کی علالت کہ۔

۴: دونوں کی شاعری کا جواں گاہ بھی عدا ہے۔

۵: ملا، اور دوسری فروگذاشتوں پر بھی ایک نظر:-

۱) اٹھ کر رہے ہوئے، مسجد و قبر، روزانہ زنداں،

گھنکھٹا - ایسا خرابات معان است دریا

رندان اندر است! اور دریا کے درمیان "و"

غائب!

۲) شب فرقت کی جو گھڑیاں کا گزرنا ہے یہی،

خطوط او پس کے عکس یکم وضع ہونا تو خیر ناگزیر تھا لیکن

ان دونوں اور تعلق میں عکس و عکس کا التزام نہ تھی

خصوصاً جب لقل میں 'خار چشم ساقی، بھی شامل

ہو جائے۔ مثلاً:

— اس آستان پاک پر گہنا ہے چل کے سر

— مگر قریب ہے یوم الحساب دیکھو تو

— اگلی سی اب نہ زخم کی طغیانیاں کہاں۔

جب ہماری ادبی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اس وقت جدید شاعری

کا سلسلہ بالکل نیا تھا۔ اور جو رز و روش بھی اختیار کی گئی تھی اس کی

حیثیت ابتدائی نمونوں کی تھی۔ یوں بھی شعرو فن کا تصور کچھ اتنا آگے

نہیں بڑھا تھا اور مذاق شعری بھی ابتدائی کا آئینہ دار تھا۔ اس

لئے اگر 'آج' اور اس دور کے انداز تصور میں فرق پیدا ہو چکا ہو تو

کچھ عجب نہیں۔ ممکن ہے آج کے نقاد جو کلاسیکی شاعری اور قدیم

امول انتقال سے بہت پرے ہٹ چکے ہیں اور مغرب کے تنقیدی

نظریوں اور مسکلوں سے بخوبی آشنا ہیں، وہ اس ابتدائی دور کے شعری

ادبی مظاہر کو کچھ اور نظر سے دیکھیں۔ لہذا جوہری نہیں ان سے پہلے

اور بعد کے اکثر شعرا کا اس تبدیلی نظر سے متاثر ہونا لازم ہے اور زندگی

کی طرح ادب و فن میں بھی ارتقا کا تقاضا یہی ہے کہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو

کو ملحوظ رکھتے ہوئے سابقہ فن پائوں کو از سر نو پر رکھا جائے اور ان کی

قدرو قیمت متعین کی جائے۔

نہیں ہیں جس کو دیکھتے ہی وجاہت اور حمیت کی زندہ علامت ہماری
نظروں میں پھر جاتی تھی، لیکن ان کا کلام، جوان کی آتشیں شخصیت کا
غلاں ہے آج بھی ہمارے پاس ایک عزیز و ورثہ کی طرح موجود و محفوظ

زندہ دار و درو آئنا مرد

ادبیم اس خاکستری اس آتش گرم کا سراغ لگا سکتے ہیں جس نے

انہیں اور ان کے ماحول کو تا متر شعلہ و شرار بنا دیا تھا اور وقتنا جو

ہم سب کے دل میں ہے کہ ہم ان آتش پاروں کو ان کی شایان شان

خوش آئند شکل میں بھی دیکھیں، "دیوان جوہر" میں پوری کردی گئی

"دیوان جوہر" کو جناب نور الرحمن نے بڑے اہتمام سے

مرتب کیا ہے۔ یہ اہتمام یوں ہے کہ دوران اسیری میں مولانا نے

اپنے ہاتھ سے جو کلام قلمبند کیا تھا اور جسے اب ہماری قومی میوزیم

میں محفوظ کر دیا گیا ہے اس کا عکس حاصل کر کے اس کے بالقابل

تسلطیق خط میں بھی اسے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے دیوان جوہر

کی تاریخی حیثیت اور شیکش کی وجہ بہت بڑھ گئی ہے۔ ابتدا میں

مرتب نے "پیش لفظ" میں اس عہد کی ایک زندہ و گویا تصویر بھی

پیش کی ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود

غیر معمولی دلچسپی کا حامل ہے اور جس سے ان کی ملی و سیاسی

سرگرمیوں کے ساتھ صحافت اور شاعری کی چنگا ریاں بھی

ابھر رہی ہیں۔ مرتب نے جو کچھ خود دیکھا ہے اسے دوسروں کو بھی دکھانے

کی کوشش کی ہے۔ اس لئے اس کے بیان میں وہ تمام باتیں ہیں

جو ذاتی مشاہدہ و تجربہ کے رچاؤ سے پیدا ہوتی ہیں اس سے

رہیں الاحرار کی شخصیت بڑی خوبی سے اجاگر ہوتی ہے اور ہم

یا تو ان کے سوانح سے لطف اندوز ہونے معلوم ہوتے ہیں یا

کسی معاصر کی ڈائری کے ادراک کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس

کرتے ہیں۔ سیرت اور شاعری کے تدارف کا حق بھی ایک اور ناظر

جناب ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی: صدر شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی

نے ادا کیا ہے، جس سے تصویر اور کجی واضح، بلکہ شوخ رنگ ہو جاتی

ہے۔ اور ہم رئیس الاحرار میں دولت مند ادا پاکستان ہی کے طائر

پیش رس کا عکس پاتے ہیں۔ سلسلہ کی آخری کڑی جوہر کے حالات

زندگی کی سن واد تریب ہے۔

تعارف میں بعض فروگذاشتیں بھی ہیں۔ مثلاً گرد و پوشا:

ظاہر ہے کہ جہاں تک شاعر کا کلام اپنے دور کی حقیقتوں کی فطرت ہوتا ہے اور اس کی دامانگیوں میں شریک، اس تک وہ دور رفتہ کی یادگار ہو کر رہ جاتا ہے اور جو حصہ غیر مکتبی زمانہ سے متاثر نہیں ہوتا، وہ بدستور قابل اعتبار ہوتا ہے۔ بنا بریں ناقد یا مرتب کا یہ فرض بھی تسرر پاتا ہے کہ وہ اس نقطہ نگاہ سے زیر نظر کلام کا جائزہ لے۔

"دیوان جوہر" کی موجودہ ترتیب اس "بارامنت" کے احساس سے بیگانہ ہے۔ اس لئے جدید قاری اس میں ہمدردی ہی کی مدائے بازگشت سنتا ہے۔ جیسے ناقدین بھی تمام تر شاعری کے ہم آواز ہوں۔ جوہر ہوں یا ان کا ہم وضع دوسرا شعاع مثلاً حضرت ان کے بارے میں بنیادی سوال انقلاب اور تغزل کی بنیادی غیریت ہے۔ انقلاب کی روح بغاوت کی روح ہے۔ روایت سے بھر کریز اور تجدید کی طرف پیش از پیش اقدام۔ تغزل عاشقانہ لب و لہجہ اور عادی میلان کا آئینہ دار ہے جس میں کاوش کسی نگرسی یا جذبہ باقی انگینخت کے تحت ابھر کر افق کے دسبے تک نہیں پہنچ سکتی۔ لہذا یہ انقلاب کی بے چین، غیر مطمئن، آتش زیر پاہ کی طرح غزل کی ہم مزاج نہیں۔ یہ دونوں دست و گریباں ہیں اور جو شعاع انقلاب کا حق غزل کے ذریعہ سے ادا کرنا چاہتا ہے وہ انقلاب کی حقیقی روح تک رسائی نہیں پیدا کر سکتا۔ جوہر کے سلسلے میں یہ طالع دلچسپی کا باعث ہے کہ کہاں غزل کی۔ پھر ہی میں ہے کہ وہ کسی کے پڑے رہیں۔ سے پڑے ہٹ کر ہم ایسے ہو جاتے ہیں کہ کسی در پر پڑے نہ رہیں، یعنی ایک ہی جگہ پر جم کر نہ رہ جائیں۔

ظاہر ہے کہ جوہر کے کلام کا کامیاب حصہ وہی ہے جس میں انقلاب فی الحقیقت انقلاب ہی کے رنگ میں ہے وہ تمام تر انقلاب ہے اور اس میں اسی کی روح رچی بسی ہوئی ہے۔ ان کے کلام کا یہ حصہ زندہ جاوید ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اس حصہ کو خصوصیت سے الگ کر کے اس پر نظر ڈالی جائے۔

شعروادب میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ صاحب فن کی آواز اس کی لہری آواز ہو۔ دوسروں کی آواز کا عشرت ان نہیں کیونکہ

انسان کی اپنی آوازیں ایک خاص انفرادیت، ایک خاص اٹھلاؤ ہوتی ہے۔ وہ شہیدہ آوازوں کا ہنگامہ زار نہیں ہوتی۔ مولانا محمد علی طبعاً جلوت کے آدمی تھے۔ ایسے انسان جن کو جماعت کے ساتھ انس ہو۔ اسی نے انہیں ایک ہر دلعزیزہ سربراہ بنایا تھا۔ دوسروں سے گھل مل جانے والا انسان۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو دوسروں میں کوئی بریگا لگی محسوس نہیں کرتے۔ ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ اور یہ ملنساری، یہ ہم آمیزی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ ان کے ساتھ ان کی بات چیت، ان کے الفاظ، ان کے خیالات ان کے احساسات کو بھی اپنا ہی سمجھتے ہیں اور انہیں ایسی بے تکلفی سے کام میں لاتے ہیں گویا وہ انہی کے ہوں۔ شعر و سخن کا سارا ذوق سارا مال و منال شعر کہ ہے اور وہ شعری ہمہ اوست کے قائل ہیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر چلتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دوسروں کے قدموں کے ساتھ ان کا اپنا قدم بھی ہے۔ یہ ہم قدمی ان کے یہاں جا بجا نمایاں ہے۔ چنانچہ جس طرح لوگ نثر کے حوالے دیتے ہیں اسی طرح وہ شاعری میں دوسروں کے حوالے دیتے ہیں۔ اس طرح "دیوان جوہر" میں کتنے ہی دیوان جمع ہو گئے ہیں، بالخصوص دیوان غالب، جس کی آوازاں کے ہاں ہر کہیں کو بختی نظر آتی ہے۔

سب سے بڑی خصوصیت جو قاری کو متاثر کرنے بغیر نہیں رہ سکتی مولانا کا بے اندازہ خلوص ہے۔ وہ فطرتاً ہی شاعر اور سربراہ تھے۔ شاعری ان کے لئے محض مشغلہ تھی۔ اس لئے ان کو شعر و سخن کے سخت گیر معیار سے جانچنا بھی بجا نہیں تھا۔ ہم یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ احساسات کی شدت نے ایک ذہین صاحب ذوق شخص کو، جو بنیادی طور پر مدبر و سیاست دان تھا، شاعر بنا دیا۔ اس لئے اس کی شاعری کی روح دیوان شعریات کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔ اور جہاں وہ ایسے انقلابی شاعر نہیں ہیں، وہ غزل کی پرانی روایت سے بیاہ کرتے ہیں اور یہ بھی ان کی طبع و فطرت ہی کا خاصہ ہے۔ وہ اپنی فطرت کے اخلاص سے بے نیاز نہیں رہ سکتے؛

لوگوں کو یاد آئیں گی باتیں ہمساریاں!

”اک طرفہ تماشائی“

محمد صمد الحق

برابر شائع ہوتی رہیں، جنہیں لوگ بڑے شوق سے پڑھتے، اور ان پر اظہار خیال کرتے رہتے تھے۔ سودیشی کی تحریک چلی تو مولانا کو اس سے دلی لگاؤ پیدا ہو گیا کیونکہ وہ سامراج کے خلاف اس ہتھیار کو بڑا ہی مؤثر سمجھتے تھے۔ کھنڈر پہننے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کھنڈر فروخت کرنے کا کاروبار خود بھی کیا۔ انہوں نے بدیشی مال کا بائیکاٹ صرف زبانی طور پر نہیں کیا بلکہ خود عمل سے اس کا طریقہ بھی بتایا۔ سیاست میں وہ موتی لال، گوکھلے اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں کے خیالات سے متفق نہ تھے بلکہ ملک کی حکمت عملی کو زیادہ پسند کرتے تھے اور نرم رو ایندروں پر بہت بُری طرح برستے تھے۔

سامراج کے خلاف عمل اور قلم کا یہ جہاد بڑھتا ہی چلا گیا اور ۱۹۰۸ء میں ان کی بعض تحریروں میں حکومت وقت کے عتاب میں آگئیں جس کی وجہ سے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ پاداش میں قید با مشقت بخیر ہوئی۔ اس وقت کے جیل خاندوں میں اخلاقی قیدیوں کے ساتھ سیاسی قیدی بھی رکھے جاتے تھے اور ان کے ساتھ بدترین اخلاقی مجرموں کا سلسلو کیا جاتا تھا۔ اسی قید فرنگ جھگڑنے میں شاید حسرت نے ہی پہل کی تھی۔ اس وقت ’اے‘ ’کلاس اور‘ ’بی‘ ’کلاس کی پُر تکلف جمیلیں نہ ہوتی تھیں اس لئے حسرت کو بھی اخلاقی قیدیوں کے لباس میں ان ہی کے ساتھ رکھا گیا اور وہاں انہیں سخت تکلیفیں، مشقیں اور بے عرقی کے سوا ہنسی خوشی برداشت کئے گا۔ اگست ۱۹۰۸ء کے شمارہ (اُردوئے معلیٰ) سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا جیل میں داخل ہوئے تو ان کو ایک لنگوٹ۔ جائجیہ، کرتہ، ٹوپی پہننے کو ملا اور اڑھنے بچانے کے لئے ایک کسبل اور ٹائٹ کا ٹکڑا عنایت کیا گیا تھا۔! جرمانہ الگ ہوا تھا۔ مگر سامراج نے اپنا پونڈ بھر گوشت اس طرح وصول کیا کہ ان کتب خانہ ہی بیچ ڈالا اس کتب خانہ میں بہت سی نادر کتابیں

برصغیر کی تاریخ آزادی کا تذکرہ ہوا اور ادب کی بات چلے، حسرت کا یاد آنا ننگز پر ہے۔ ادب اور سیاست کو آمیز کرنے میں ان کا بڑا ہتھوڑا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ان کے سیاسی معتقدات شعری پیکر میں بھی ڈھلے رہے اور انہوں نے اپنی آتشیں طبیعت کے اظہار کے لئے شعر کو بڑی خوبی کے ساتھ وسیلہ بنایا۔ اُن کا یہ کہنا کہ چٹائی کی مشقت کھٹا مشق سخن بھی جاری رہتی تھی، کوئی شاعرانہ بات نہیں ہے بلکہ بیان واقعہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسرت کی زندگی کا ہر لمحہ برصغیر کی کامل آزادی کے لئے جدوجہد کرتے گزارا اور انہوں نے بیباکی اور حق گوئی کا جو معیار و نمونہ پیش کیا اس پر اس عہد کے بہت کم سیاسی آدمی پورے اترتے ہیں۔ ادب سے اُن کا لگاؤ زمانہ طالب علمی سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں ”اُردوئے معلیٰ“ کا اجراء نہ صرف ان کے ادبی ذوق کی تکمیل کا وسیلہ بنا بلکہ سیاسی معتقدات کے ابلاغ اور سامراج کے خلاف جنگ کا ایک ہتھیار بھی ثابت ہوا۔ برصغیر میں ان کے ادبی مضامین اور سیاسی و مذہبی مقالات شائع ہونے شروع ہوئے تو سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ہر چند کہ مولانا کے مالی وسائل بہت ہی محدود تھے مگر وہ ”اُردوئے معلیٰ“ شائع کرتے رہے اور محلی طباعت و پیشکش کے باوجود وہ شوق سے پڑھا جاتا تھا۔

سیاسی میدان میں بھی ان کی انفرادیت اور شدت مزاج کا عنصر برابر موجود رہا۔ ۱۹۰۴ء کا ذکر ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا مجلیس میں اجلاس ہوا اور مولانا بھی بطور مندوب اس میں شریک ہوئے۔ یہاں انہوں نے بڑی دھواں دھار تقریر کی اور نرم رو سیاست دونوں کو بتایا کہ سامراج سے جنگ کرنے کے لئے کس دل گردے کی ضرورت درکار ہے۔ ۱۹۰۵ء میں کل ہند صنعتی کانفرنس ہوئی تو وہاں بھی ان کی شعلہ بولی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ان کانفرنسوں کی رودادیں ”اُردوئے معلیٰ“ میں

قلمی نسخے اور دیگر نواد جمع تھے اور خود مولانا کا بیان ہے کہ وہ چار ہزار سے کم کے نہ ہوں گے مگر حکومت وقت نے انہیں صرف ساٹھ روپے میں فروخت کر دیا۔

غرض یہ تھے وہ میل و نہار جس میں حسرت زندگی بسر کر رہے تھے مگر ان کے پلے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی اور وہ سرکش سامراج سے برابر لڑتے رہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے سیاسی موقف کبھی ایک جیسے نہیں رہے بلکہ نرم و فادارانہ پالیسی کا ہی ردحان رہا۔ ۱۹۲۱ء میں کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا تو مولانا نے کامل آزادی کی قرارداد پیش کر دی اور اپنی تقریر سے ایسی آگ لگائی کہ سیاست کا سنہ ہی بلی گیا مگر یہ بوالعجبی بھی خوب تھی کہ اس تحریک کی پہلی مخالفت خود کانگریس جی نے کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس حکومت کے ساتھ وفاداری کا رینڈیشن پاس کر چکی تھی اور مولانا کامل آزادی سے کٹر کسی چیز پر رانی ہونے کو تیار نہ تھے۔ کانگریس کے حالات سے بیزار ہو کر مولانا نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو اپنے سیاسی کاموں کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ کل ہند مسلم لیگ کے صدر بھی منتخب ہوئے، مگر اسی سال انہیں نظر بند بھی کر دیا گیا مولانا ۱۹۳۶ء سے قیام پاکستان تک مسلم لیگ سے وابستہ رہے اور اپنے خیالات پیش کرتے رہے۔

عقیدہ کی پختگی اور عمل بہیم کے وصف نے انہیں بے خوف، مستقل مزاج اور میابک و حق گو بنا دیا تھا اور وہ جس چیز کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے اس کو پوری قوت و جوش کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ سلامتی ایک علمبرہ وصف تھا جو ان کی زندگی میں ہمیشہ برقرار رہا اور یہ بھی ایک اصول پر مبنی تھی۔ اصول یہ تھا کہ قومی رد پے کو ذاتی عجز و وقار اور آرام کے لئے صرف نہ کیا جائے بلکہ جو گھر بڑا واحد عام طریقہ زیست ہے اسے برقرار رکھا جائے اور قومی دولت اس پر ہرگز خرچ نہ کی جائے کیونکہ قوم کا پینہ قوم کی امانت ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے کردار پر روشنی ڈالنے والا ایک واقعہ سنئے۔ دلی میں اسمبلی کا اجلاس ہونے والا تھا۔ مولانا رکن تھے اور اس میں شریک ہونے کے لئے آ رہے تھے۔ دلی پہنچنے کی تفصیل اطلاع وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم اسٹیشن پر جمع ہو گیا مگر کوشش کے باوجود مولانا کہیں نظر نہ آئے اور لوگ یا بوس ہو کر لوٹ گئے۔ عام خیال یہ تھا کہ مولانا نے اسمبلی

کے اجلاس میں شرکت منسوخ کر دی ہے۔ مگر دوسرے دن صبح کو جب اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو اراکین اسمبلی یہ دیکھ کر بڑے متعجب ہوئے کہ مولانا تو بنفس نفیس ایوان میں موجود ہیں۔ اراکین اسمبلی نے مولانا سے پوچھا کہ یہ کیا جبر ہے تو فرماتے تھے کہ میں نے جس گائیڈ سے آنے کی اطلاع دی تھی اسی سے آیا تھا مگر لوگ مجھے جہاں تلاش کر رہے تھے میں وہاں مل ہی نہیں سکتا تھا۔ لوگ مجھے فرسٹ کلاس یا سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں ڈھونڈ رہے ہوں گے اور میں تھوڑی سی ہنگر کرنا ہوں۔ پھر لوگوں نے پوچھا کہ قیام کہاں رہا؟ تو انہوں نے بتایا کہ ایک مچھی میرا واقف ہے، اسی کے پاس ٹہرا ہوں۔ اراکین اسمبلی نے کہا کہ آپ کے لئے تو فلاں ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔ اس پر مولانا مسکرائے اور کہنے لگے کہ میں یہاں ایک فرض ادا کرنے آتا ہوں فرسٹ، سیکنڈ کا کرایہ وصول کرنے یا پریسکلف ہوٹلوں میں ٹھہرنے کے لئے نہیں آتا۔ قومی دولت کو اس طرح خرچ کرنا اسراف ہے اور وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ نقص سے مبرا اور بے لوث خدمت وطن ان کی زندگی کا جوہر تھا اور انہوں نے اسے ساری عمر نبھایا۔ مولانا کا یہ عالم کہ انہیں دیکھا کہ ایک معمولی سا کھدڑ کا پاجامہ، پیوند لگی شیر وانی پہنے، سر پر بغیر پھندے کی ترکی ٹوپی اوڑھے چلے آ رہے ہیں۔ بعض اوقات تو دو دو پاؤں میں دو وضع کی جوتیاں نظر آتی تھیں!

ان کی حبشیات — یعنی جیل کی شاعری — میں ان کا اصل جوش و جذبہ نمایاں ہوا ہے۔ جیل میں کاغذ قلم و دوات ملنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مگر حافظہ بلا کا پایا تھا۔ جو کچھ کہتے ایک دیوان کی برابر ہوتا مگر ہر بار جب جیل سے طلوع ہوتے تو کلام کا ایک بڑا ذخیرہ ارد و ادب کے لئے بطور ارمغان لے کر آتے۔ ذہن کی بڑائی، اور آمد سخن ایک چڑھتا دریا ہوتا اور قید فرنگ کی معوقین ان کی لہجہ سے کہنے ایک نعمت ہی ثابت ہوتی۔

عشق میں خوفِ جاں سے درگزرے
ہم نے ٹھانی جودل میں، گرگزرے
شامِ فرقت کٹے، نہ ہجر کی رات
صبح گزرے نہ دوپہر گزرے
روح کو محوِ جمالِ ربخ جاناں کو لیں
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو ملکستاں کر لیں
باقی مسئلہ پر

ہمنفسانِ رفتہ

رائیس مینائی

جلدی رہی۔ جناب نفیس (مرحوم) کے نام جو خطوط آتے رہتے تھے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں شائع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ میں مرحوم کے چند چندہ خطوط کچھلے دلوں شائع بھی کر چکا ہوں۔ اب اس تحریر کے ساتھ بعض اور غیر مطبوعہ خطوط پیش کرتا ہوں۔ یہ خطوط جہاں اور باتوں پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں بعض ادبی مسائل بھی مس کرتے ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر عروض کی کوئی بات چلی اور جناب نفیس (مرحوم) اور حضرت آخر کھنوی کے درمیان رائے کا اختلاف ہوا۔ استاد جلیل مانک پوری (مرحوم) کو دونوں صاحبی نے اپنا حکم مقرر کیا ان کا فیصلہ نفیس (مرحوم) کے حق میں ہوا۔ چنانچہ ۲۹ اپریل ۱۹۴۰ء کے ایک خط میں حضرت آخر نے لکھا: میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے باوجود اس مصرع کو خارج از بحر قرار دینے کے، میری مزید استدعا پر خود اس کے جواز کی سند ڈھونڈ لی۔ (کوچہ زلف کے ایرے پھرے)۔ مناسب ہو تو حضرت جلیل کو اطلاع دے دیجئے کہ مجھے اپنی تقطیع کے غلط ہونے کا اعتراف ہے۔

جناب صفدر مرزا پوری (تلمیذ حضرت جلیل مانک پوری) نے اس تذکرہ کی اصلاح میں شائع کی تھیں، لیکن دورِ دوم میں سودا کی کوئی اصلاح انہیں دستیاب نہ ہو سکی مگر وہ ان کی تلاش میں تھے، جناب نفیس (مرحوم) نے ”مرتبہ“ (تکمیل فروری ۱۹۲۷ء) میں سودا کی ان اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے سودا کی وہ اصلاح شائع کی جو قائم چاند پوری کی مثنوی ”درویش و عروس“ پر انہوں نے دی تھی۔ جناب صفدر مرزا پوری نے اپنی تالیف ”مشاطہ سخن“ کا جب دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو یہ اصلاح بھی بدلتکر درج کی۔

پھر کیف، موصوف کی زندگی کا تراجم اردو شعروادب

ادبیات میں مشاہیر کے خطوط کا مطالعہ بچائے خود ایک اہم موضوع ہے اور یہ کوشش مستحسن ہے کہ اردو میں بھی مکاتیب کی دریا اور شاعت کا سلسلہ اب دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے ہمیں مکتوب نگار کے ذاتی حالات و کوائف سے ہی آگاہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے ادبی کام کا پس منظر بھی معلوم ہوتا ہے اور لکھنے والا جن نفسی کیفیتوں سے دوچار ہوا، اس کے تجربات حیات کیا تھے اور کسی خاص تحریر کی نزول کیا تھی، یہ باتیں بھی اکثر ہمیں ان نجی خطوط ہی میں ملتی ہیں، کبھی خفی بھی چلی۔ ایک مغربی ادیب تو اس باب میں کافی مبالغہ سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اب شاعری کی بجائے ادباً نثر کی حکومت ہوگی۔ اس فکر میں جہاں انشائیہ، نقد اور تاریخ کا دور دورہ ہوگا وہاں خطوط کی بھی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی، خیر۔ شعری تا جوری کو گزند پہنچے یا نہ پہنچے، اتنا ضرور ہے کہ مکاتیب کی اپنی ایک اہمیت ضرور ہے اور ہمیں اس سرمایہ سے اپنی تاریخ ادب کے لئے بہت سے جواہر پارے مل سکتے ہیں۔ یہ خیال بجا ہے کہ خطوط کے بنیادی مباحث یا احساسات اگر ایک ہوں بھی تو ان کا اپنا جدا لہجہ اور لکھنے والے کی شخصیت کا فرق موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے خطوط اب منظرِ عام پر آ رہے ہیں جو بجائے خود تیرکات میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو تاریخ ادب کے مطالعہ میں بھی بڑی مدد دے سکتے ہیں۔

جناب نفیس (مرحوم) کو بھی اردو ادب سے گہری دلچسپی تھی اور بنگلور جیسے دور افتادہ مقام پر رہتے ہوئے بھی ان کا اردو شعروادب سے لگاؤ تمام عمر قائم رہا اور اس سلسلہ اپنے عہد کے مشاہیر شعراء و ادباء سے بھی ان کی مراسلت و مکتبات

یہی وجہ ہے کہ میرا کوئی شاگرد نہیں! میں واقعی اس قابل نہیں ہوں۔ خود اپنے لئے کبھی کبھار کہہ لیتا تھا اب ضعف پیری و لامر و حادثہ یہ سلسلہ بھی نہیں۔ مفلسی ضعیفی پیری میں ماشاء اللہ کثرت اولاد و طفیف صرف چالیس روپے جیسے تین ہزار کے برابر سمجھتا تھا مگر جب میاں بی بی صرف دو روپیہ کھانے والے تھے بچپن سال کی عمر میں چوتھا عقد بچہ کیا، خدا نے اولاد دی، اس کا لاکھ لاکھ شکر، دماغ کا یہ حال ہے بجائے خط کے میں نے اپنی سوانح عمری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابھی ابھی اظلاس میں ماہ مبارک کی آمد غنیمت معلوم ہوئی تھی لیکن بیک کر کچھ اور کہنے لگا آپ کی محبت اور دیانت پر بھر دیا ہے میرے خط کا ایک حرف بھی کسی کی آنکھ کاں تک نہ پہنچے (ماہ مبارک کے آغاز ہی میں مجھے یہ مطلع کہنا پڑا۔)

جن کے ہاں ایک رند روزہ دار آئے کوہے
خام ہوئے کوہے میرے گھر دھار آئے کوہے
ماہ مبارک گذر گیا تو عید کے دن یہ مقطع کہنا پڑا۔
میکرے میں عید مجھ مفلس کی ہو جائے ریاض
دے کے اک چلو کوئی تیس روزوں کا ثواب

اس ماحول کو دیکھئے اور آنے والے وقت کو میں باہر بیٹھا ۲۰ سوال کو کچھ لکھ رہا تھا اندر سے پیام آیا ہسپتال سے دانی کو بلوا۔ آدمی گیا دانی کے عوض لیڈی ڈاکٹر آئی چارہ کار کیا تھا اندر گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد یہی کبھی مبارک ہو فیس کے بچپن اور بچپن کے دل بچاؤ اس لئے کہ ایک نہ شد و شخص۔ جھوٹے وعدے کے ساتھ تگ کا کرار یہ دے کر رخصت کیا معلوم ہوا کہ توام بھائی بہن دو بچے پیدا ہوئے بی بی کی مشکل تو آسان ہوئی میاں کی مشکل کیوں کر آسان ہو اب ہم ہیں اور میر کا یہ مصرع:

گر می سبزہ رنگوں سے اور گھر میں بھونی بھاگ رہی ہیں

گھر کا یہ حال نہ دو دو پلائی نہ کھلائی نہ کھانا پکانے والی ایک زچہ دو بچے میاں بقول خود اس عمر میں۔

اس شیخ کہن سال کی اللہ سے بزرگی

جنت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا!

چٹی کے چوتھے روز زچہ کی بغضیں سا قطنہ اناشاد کام دیتا ہے زبان امید زیت و دوزخ حال منقطع حکیم صاحب ہیں اور قوت ٹبھانے کے نسخے حب جواہر جہرہ عجوبہ مردارید اور قیمتی جواہر شمس اللہ نے فضل کیا

کی تحقیق اور اس کی خدمت میں گذرا۔ اس سلسلہ میں مثا ہیر ادب سے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی اور ایسے بہت سے خطوط کا ایک ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا تھا جو ہمارے ادباء و شعرا کی زندگی کا ہی عکس نہ تھے بلکہ علمی، ادبی اور شعری نکات و مسائل پر بھی ان میں بہت کچھ اشارے تھے۔

میں یہاں نفیس بنگلوری مرحوم کے نام چند مشاہیر کے لکھے ہوئے خطوط پیش کرتا ہوں، جو غیر مطبوعہ ہیں۔ سب سے پہلے جو خط درج کیا ہے وہ حضرت ریاض خیر آبادی کا ہے اور ان کی زندگی کے ایک ایسے دور سے تعلق رکھتا ہے جب وہ انہماکی غیرت اور خانگی پریشانیوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے اور اپنی نجی زندگی کا یہ واقعہ انہوں نے نفیس مرحوم کو بے کم و کاست پوری صداقت کے ساتھ لکھ دیا تھا۔ مگر پاس خود داری کے باعث اس بات کی تائید لکھی تھی کہ اس خط کے مشمولات کی کسی کو بھینک بھی نہ پڑے۔ مگر اب جبکہ کاتب اور مکتوب الیہ دونوں ہی اللہ کو پیا رہے ہو گئے اس اخفا کی چندال ضرورت نہیں اور ریاض کے خط کو یہاں اس نیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ ہمیں علم ہو سکے کہ ہمارے مشا ہیر ادب کیسی کیسی ذہنی دوزخوں میں سے گزرا کرتے تھے اور اہل علم کی مانتا کا عالم کیا ہوتا تھا۔ ان کے اس خط سے لیکن سپیئر کا یہ قول یاد آتا ہے کہ خطوط کو اہم بنانے میں لکھنے والے کے خلوس، براہ راست اظہار مطلب اور صداقت واقعہ کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ باتیں ریاض کے خط میں از بس موجود ہیں۔ دیگر خطوط میں بھی بعض ادبی معاملات کی طرف اشارہ ہے یا لکھنے والے مشاہیر کے ادبی مشاغل اور نجی کیفیات کا پرتوجہ سے کئی اہم باتیں فاری کے علم میں آتی ہیں۔ اس امید ہے کہ یہ خطوط کچھ کی نظر سے دیکھے جائیں گے:

ریاض خیر آبادی:

خیر آباد: (یو۔ پی) ۴ مئی ۱۹۳۷ء:

عزیزی! محبت نامہ ملا۔ آپ کی جگہ میرے دل میں پہلے سے۔ میں دو تین چینی سے از بس پریشان تھا۔ اب بھی ہوں۔ مگر کم میں کیا کسی کا کلام دکھوں میں استاد کے بعد تمام دنیا کو بھاگ رہا ہے،

طہ ریاض نے اتارا میں اسیر سے فیض حاصل کیا
اس کے بعد امیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔

(نواب سراج الدین احمد خان) سائل دہلوی:

۱۹ جولائی ۱۹۶۳ء:

عزیز من! سلامت: آپ کا خط ملا قطعاً تالیف
آپ نے مثنوی کے فرمائے ہیں بہت خوب ہیں۔ شکریہ مثنوی
کی اشاعت ملتوی کر دی گئی ہے کیونکہ میری صحت اب پہلے سے
بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ دس منٹ کے لئے بھی اٹھ کر
ہیں بیٹھ سکتا۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اختلاج کے دھڑے
پڑتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ کے استفسارات کا جواب دینے
سے محذور ہوں۔ دعا پر زور ڈالنے سے دورے پڑ جائے
احتمال ہے۔

خدا رکھے فصاحت جنگ بہادر راجیل کا اور ہمارا
معاملہ خیر نہیں ہے۔ آپ ان سے درِ وقت کر لیجئے۔
والسلام (سائل دہلوی)

زاہد سہارنپوری:

سہارنپور، محلہ شاد دلایت: ۱۹ مئی ۱۹۶۳ء:

عزیز مصرا تھا دیوسف کنخان دادا!

سکرم اللہ العباد۔

کل آپ کا نامہ دادا ملا۔ آج جواب لکھ رہا ہوں۔ میری
حالت گرمی کے موسم میں اس قدر ابتر ہو جاتی ہے کہ مرمر کر سکتا ہوں
پڑھنے لکھنے کی اٹھاروں نوبت نہیں آتی احباب کا کلام ٹپا ہے۔
کون دیکھے۔ آپ کی خاطر ہر حال عزیز ہے اس لئے جس طرح
بھی بن پڑا کچھ بنا سکا کہہ دیجیئے ہوں۔

آپ نے یہ نہ لکھا کہ جنگویرہا مشہور مصنوعات اور عمدہ
پھل کیا کیا ہوتے ہیں۔ میں پھلوں کا دلدادہ اور حریص ہوں مرحوم

سلہ شہنشاہ نور الدین جہانگیر اور ملکہ درجہاں کے حالات زندگی
اور ان کے واقعہ عشق پر سائل مرحوم ایک بڑی خوب طویل مثنوی
لکھ رہے تھے عنوان تھا کوڑا علی نور۔

(ادارہ)

تہ روزائے سہارنپور میا شاد تھا۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے اور ہند
کرانچے نامے خوش گوشہ تھے مگر گناہی اور بے اعتنائی کا شکار ہوئے۔

دس دن گزریے تھے بشدیر تنگھے نے دورا زحل پھرنا امید کر دیا، پھر
اللہ نے فضل کیا بچا رہے بچوں پر کیا گزری اور بچوں سے زیادہ مجھ
بڑے پر کیا گزری کچھ نہ پوچھئے ایک ہفتے سے میں آشوب چشم میں مبتلا
تھا اب اتنا بہتر ہوں کہ آپ کی غزلیں دیکھیں اور یہ خط لکھا۔ قدیم
اور جدید غزل کے سب شعر اچھے نظر ثانی کی ضرورت ہے نہ
اصلاح کی میں نے کبھی کبھی چھپا ہوا کلام بھی دیکھا آپ استاد سے
مسلل فیض اٹھا رہے ہیں، محروم ہوں تو ان کے فیض سے ہیں۔
مطبوعہ تالیفات میں تین ناول تھے، دو کا پتہ نہیں چلتا ایک کی
کچھ جلدیں بدقت فراہم ہوئیں اس کا نام حرم سرا ہے۔ رینالڈ کے
ناول "لور آف دی حرم" کا ترجمہ ہے مگر میری زبان میں بغایت
دلچسپ ہونے سے مکمل حرم سرا یعنی حصہ اول و دوم قیت تین آدھ
پاکا آئے دی، پی، آپ کے نام مع محصول ڈاک وغیرہ روانہ
کرتا ہوں کہ غزل لکھانی چھپائی خراب ہے بایں ہمہ بہ اعتبار دلچسپی
یہ کہنے میں تکلف نہیں: علامہ نریخ بالاکن کہ از رانی ہنوز۔
دیکھنے کے بعد ناپسند ہو یا گراں گزریے تو احباب کو دکھا دیجئے گا۔
اس ذریعہ سے کچھ درخواستیں اور آجائیں گی، ناپسند ہو تو براہیں
کر دیجئے گا میں قیمت واپس بھیج دوں گا۔ خیر مطبوعہ تالیف دیوان
ہے کوشش کر رہا ہوں خدا کے جلد چپ جائے۔
الغافہ جلیل صاحب یاد آگئے ہیں اس لئے انہیں بھی اس
خط کے لطیف حصوں کی نقل بھیجتا ہوں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ
آپ نے غزلیں بھیجیں اور میں نے کیا جواب دیا۔ خط کو کتنا کہ
مسلل جاری ہے تو اچھا۔

راقم:

رات آخر وقت نازک ہے ریاض

لو لگی ہے شمع کی اللہ سے!

*

۱۔ ریاض کا کلام ان کی وفات کے بعد ریاض رضوان کے نام

سے چھپا اور بڑی آب و تاب کے ساتھ۔

۲۔ جلیل مانگ پوری فصاحت جنگ بہادر جلیل مانگ پوری

استاد میر عثمان علی خان، دکن)

اردو کے عروض پر شبہات جو کئے ہیں وہ قابل لحاظ ہیں عنقریب نظر ثانی کروں گا اور آپ کی تحریر کو پیش نظر رکھوں گا، فرصت کا انتظار کروں گا ہوں، میرے ہاتھ کی تحریر آپ کے کر کیا کریں گے اول تو میرا خط ایسا نہیں کہ اس کا شمار اچھے خطوں میں ہو، دوسرے آج کل ہاتھ میں کسی قدر وعشہ بھی ہے جس سے خط ادنیٰ خراب ہو گیا لہذا معافی چاہتا ہوں، آپ کا تخلص نفیس بہت مناسب اور مشہور بھی ہو چکا ہے اس کو ہرگز بدنام نہ چاہیے۔ رشک نہ بچا لفظ ہے نہ اچھی چیز ہے، یمنہذا تاریخ کے ایک بڑے مشہور شاعر اور صاحب تصانیف و صاحب تلامذہ کا تخلص ہے۔ لہذا آپ تخلص بدلنے کا خیال ترک کر دیجیے، نفیس بہت عمدہ لفظ ہے اور معنی بھی بہت پاکیزہ ہے۔ وہ شخص جس کا تخلص نفیس ہے وہ خود قابل رشک ہے۔ والسلام: ساحت جنگ جلیل کان النذر

حضرت لوح ناروی

از تارہ ضلع الہ آباد: ۳۰ اگست ۱۹۳۵ء

ہفتہ عشرے سے میری طبیعت اچھی نہیں طوفانِ لوح کے کاتب، حافظ محمد علیم صاحب، ناروی جلال صاحب لکھنؤ کے شاعر ہیں مکتوبات کے جس مصرع میں کچھ اختلاف انہیں ہوا انہوں نے بغیر میری اطلاع کے تصرف کر دیا۔ بعد چھپنے کے مجھے خبر ہوئی میں بہت ان پر ناخوش ہوا۔ لیکن جب دیوان شائع ہو چکا تو کیا کرتا بہت سے مقامات پر ان کا تصرف تم پاؤ گے۔ وہ مصرع یوں ہے:

غور کی زندوں نے لیکن حل نہ عقدہ ہو سکا

کہنے لگے کہ غور مذکور ہے۔ میں نے کہا آپ کے لکھنؤ میں ہو گا۔ دلی میں تو تائید ہے۔ اور کیا لکھوں دلی جانے کے لئے آمادہ ہوں!

(لوح)

اکھرا اثبات دونوں پہلو میں شاعر کا مقصد دوسرے مصرع سے واضح ہو گا۔

(۲) ”کون گنلا ہے مری قبر یہ گریاں ہو کر نہ گریاں صبح، ہو کر غلط گریاں ہو کر مری قبر یہ گنلا یہ ترکیب صحیح نہیں ہے۔ مصرع ہل ہے۔“

(۳) ”خون کی چادر جو پھیلے گی گفن ہو جائے گا۔ اس مصرع میں ”ہو جائے گا“ صحیح ہے۔“

(۴) ”آج بوسہ تجھے دیتے ہی بنے گا اے جاں کچھ ترا وعدہ نہیں ہوں کہ میں مل جاؤں گا“ دیتے ہی بنے گی ”صحیح مگر اے جاں“ نہایت ہل، دوسرے مصرع میں ”کچھ“ بول چال کے خلاف ہے۔

(۵) ”چمک دندان میں افروز ہر دم سے یہ ثابت ہے جناب عائشہؓ سے“ قافیہ تو ہو سکتا ہے عائشہؓ میں ”ہ“ نہیں ہے بلکہ ”ت“ ہے مگر میں احتیاط کرتا ہوں ”مہ“ ”رہ“ قافیہ ہو سکتا ہے۔

(۶) ”مندر کرنے کو جگر پارے لئے جاتا تو ہوں“ تاوک ناز نگاہ یا رد کہیں کیا کرے

”شتر گریہ نہیں ہے شاید آپ کو“ جاتا تو ہوں“ اور ”دیکھیں“ کی وجہ سے شبہ پیدا ہوا مگر بول چال کے لحاظ سے دونوں مصرعے درست ہیں ”دیکھوں“ بھی بچائے ”دیکھیں“ ہو سکتا ہے۔

(۷) ”یہ فسانہ تو مرے لوک زباں رہتا ہے“ یہ مصرع ہل ہے ”لوک زباں“ کے معنی اور مفہوم کو سمجھنے کے لئے حضرت دایح کے اس مصرع پر غور کیجئے: ”یہ یا زبمی لوک زباں ہو نہیں سکتا“ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ زیادہ والسلام:

(عزیز یا جنگ)

حضرت جلیل ماکپوری:

دنوا! سلام مسنون۔

آپ کا لوازش نامہ پہنچا۔ مافیہ سے آگہی ہوئی، آپ

۱۔ حضرت جلیل کے ”رسالہ عروض“ پر جناب نفیس جٹلوری نے اپنے کچھ شبہات ظاہر کر کے حواشی لکھے تھے خط میں اسی کی جانب اشارہ ہے۔

*

عالم یک شہر جستجو

سید قد رت انقوی

تحقیق کی منزل آخر تک پہنچنے کے راستے تیر و تار، کہیں کہیں کچھ روشنی نظر آتی ہے مگر ساتھ ہی گہرے تاریکی ہیں، ذرا سی لغزش کا نتیجہ کوشش بے سود ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ہر شیبہ و فراز پر نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھ جائے۔ مگر منزل تک رسائی ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے کی سی کیفیت ہے۔

ہم ماضی سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں۔ حال سے بھی کچھ نہ کچھ ہی حاصل ہے۔ ان کے طفیل ہم مستقبل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ ماضی اور حال سے حاصل شدہ سرمایہ میں سے کھوٹے کھڑے کو پر کھے بغیر اپنا نام اور تصرف میں لانا دانشمندی کی دلیل نہیں بلکہ شعور و انتقاد سے کام لے کر برتنہ چاہئے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماضی و حال کی لغزش ہی مستقبل کے لئے راستہ کی راہ بھاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت کی حال چند لفظوں کی داستانیں حقائق کی نقاب کشائی کرتی نظر آتی ہیں کسی مفہوم کو ادا کرنے کی غرض سے الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ صدیوں سے پیش آنے والی ضروریات، حالات و واقعات، بزرگوں کے تجربات و مشاہدات کی بدولت وجود میں آئے جب کوئی لفظ وجود میں آتا ہے تو اس کا حقیقی مفہوم وہی تسلیم کیا جائے گا جو وقت و تخیل مقصود ہو گا۔ الفاظ تغیر لسانی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس تغیر کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک حرفی (املائی و لسانی)، دوسری معنوی۔ مثلاً "افراق فری" اصل میں افراط و تفریط یا افراط و تفریط تھا جس کے معنی جدا امتداد لٹھنا یا گھٹنا، غیر معتدل، غیر متوازن تھے۔ اردو میں آیا تو تغیر لسانی کا شکار ہوا "ط" کو "ج" ہوا نہ کر سکا اور یہ ساقط ہو کر "افراق فری" بن گیا۔ املا اور لہجہ کے علاوہ معنی میں بھی تصرف ہوا، اور بل چل، گڑ بڑ، جھگڑا، گھبراہٹ، پریشانی کے معنی لئے جانے لگے۔ تغیر کی مثالیں بکثرت ہیں بالخصوص

یہ کائنات اور اس کے جلوہ ہائے رنگارنگ، مظاہر فطرت کی بوقلمونی، مخلوقات اور ان کی کشمکش حیات، بحری و برکی آویزش، اجتناب نسیم و درخشاں شبہ نسیم، بتسام غنچہ، انتشار نسیم، بوئے گل، نوائے بلبل، قصہ شہر، تلاطم امواج، طوفان باد و باران، ہر شے اور ہر کیفیت محتاج اظہار، اظہار انداز و اسلوب بیان سے پر تاثیر، تاثیر انتخاب الفاظ پر موقوف، الفاظ قبولیت عامہ کی سند کے محتاج، جن میں صدیوں کے انقلابات کی داستانیں مضمران و داستانوں کا سرسراہ نگار لانا ہے جسے شیر کا۔

کائنات میں ہر شے تغیر کی دستبرد کا شکار ہوتی ہے۔ اشیاء کی بقا، تغیرات کا مقابلہ کرنے میں پوشیدہ، انسان اس کائنات پر تصرف کے حق سے مشرف، اس لئے نوا میں فطرت میں حسب منشاء تغیر و تبدل کرنے کا اسے مجاز، مگر انسان کے اس عمل میں زیادہ تر بہتری و بہبود کی روحان کا فرما، اس بہتری و بہبودی کے دو روپ، ایک منفعت، دوسرے زینت۔ بالطبع حسن پسند انسان منفعت میں بھی زینت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس تصرف کی نمایاں مثالیں باخباتی میں نظر آتی ہیں۔ رنگارنگ پھول، انواع و اقسام کے پھل، پیوند کاری اور عمل تعلیم کے نتائج ہیں۔ فطرت میں تصرف، منفعت و زینت، جلوہ آشکار ہے، مگر اس جلوہ ظاہر میں کتنی طویل داستان پنہاں، سفینہ چاہئے اس بحر سیکڑوں کے لئے؟ ابتدائی روپ، آباد و اجداد کے تجربات، ان کے اثرات، راہ ارتقا میں موانع، مشکلات، تدریجی پیشرفت، اب کون تہنہ؟ یہی حال اس کائنات میں آباد نوع بشر کے ذریعہ اظہار زبان اہل اس ذخیرہ الفاظ کا ہے۔ مفرد، مرکب، بظاہر مفرد بیاطن مرکب، مفرد ابتدائی روپ، اس میں عمل ترمیم و تنسیخ، مرکب کی پہلی شکل، تجربات کی نرا در پر چڑھ کر سدول ہونے کے مراحل، سب معنای تحقیق

(۱) اِکَل، اِکَل بمعنی تنہا، اکیلا۔ ایک سے ماخوذ یعنی ایک + ل = ایل، اکل جیسے بوجھل تو نڈل وغیرہ۔ عموماً بچے زمین پر کیریں کھینچ کر خانے بناتے اور ایک ٹانگ اور پراٹھا کر دوسری سے اچھلتے اور ان خانوں میں سے گول ٹھیکر یا گٹا (گٹا) ٹھوکر یا کر یا ہر شکل لیتے ہیں، شمالی ہند میں اس کھیل کو اِکَل وِکَل اور اِکَل وِکَل کہتے ہیں پنجاب میں پہلے دُوج کہتے ہیں۔ یہ اِکَل پر اِکرت (اکرت) اور اِکَل سنسکرت (अकल) سے اردو میں آیا۔ کھیل کا نام اس کے وجود اور استعمال کی بین مثال ہے۔ بعض اس کو بالف مفتوح (اکل) کہتے ہیں مگر اکثریت کا تجان بالف کمسور (اکل) ہی ہے۔

(۲) کھرا = اس لفظ کی پانچ صورتیں ہو سکتی ہیں،
(۱) کھرا = آخر (جانوروں کے چارہ کھانے کی جگہ) +
(فاعل) = آخر، کسان جو عموماً ٹھکانے ہوتے ہیں خ کا تلفظ
اور انہیں کر سکتے ان کے لہجے میں خ اپنے قریب الخرج کھڑے
بدل گئی۔ اکھڑا تغیر سانی سے کھرا بن گیا۔ اکل کھرا = اکیلی
آخر والا۔

(ب) کھرا = خور (اور خورون) + (فاعل) = خور، پیچی
مندرجہ بالا تغیر سانی سے کھرا بنا۔ اکل کھرا = تنہا کھانے والا۔
(ج) کھڑا بمعنی بدمزاج، سخت، کھڑا۔ تغیر سانی سے م کی
تشدید دوہر ہو گئی۔ اکل کھرا = اکیلا بدمزاج، الگ تھلک۔
(د) کھڑا بمعنی چارہ کھانے کی جگہ، یہ بھی آخر کی بڑی ہوئی شکل
ہے جو "لی" لاحقہ کے ساتھ کھڑی بن کر مستعمل ہے + (فاعل)
اکل کھرا = تنہا جگہ پر کھانے والا۔

(و) کھرا = کھڑا بمعنی سم + (فاعل) اکل کھرا = ایک یا اکیلے
سم والا۔

اس مرکب لفظ کی یہ پانچ قرین قیاس صورتیں ہو سکتی ہیں مگر
میرے نزدیک آخر سے ماخوذ ہونا زیادہ بہتر ہے۔ یعنی "اکل آخر" =
تغیر کے بعد "اکل کھرا" بنا، کیونکہ یہ لفظ خاص کسانوں کے طبقہ کی پیدائش
ہے۔ کسانوں کے ہاں بیلوں کی جھڑیاں ہوتی ہیں یا اڑتھ اور گاڑی وغیرہ میں
دو پہلے جوتے جاتے ہیں۔ جب ان کو تھان پر لا کر باندھا جاتا ہے تو ہر جڑی
کی آخر مشترک ہوتی ہے جو عموماً مستطیل شکل کی بنائی جاتی ہے۔ یہ دونوں پہل
جڑوں وغیرہ میں ساتھ جیسے ہیں چارہ بھی ساتھ ہی کھاتے ہیں۔ ان میں اگر

غیر زبانوں سے درآمدہ الفاظ میں یہ عمل زیادہ ہوتا ہے۔ نیز مرکبات میں بھی
اس کے کافی آثار ملتے ہیں مثلاً "الف ننگا" جس کے معنی ہیں بالکل ننگا،
جس کے بدن پر کوئی پلڑا نہ ہو۔ محاورے میں بے شرم اور زیادہ دلیکے
معنی لئے گئے۔ یہ لفظ "الف ننگا" تغیر سانی کا شکار ہوا اور "ننگا"
بن گیا۔ الف اور نون سے جو ثقالت پیدا ہوتی تھی ختم ہو گئی۔ آوارہ،
لچا، شہید، بدتماش اور بد معاشرہ معنی لئے گئے۔ "سی طرح" "دھڑنگ" "دھڑنگ"
ہے جو "ننگ" "ننگا" کے ساتھ بطور تابع آتا ہے یعنی "ننگ دھڑنگ" اور
"ننگا دھڑنگ" اصل میں دھڑ + ننگ اور دھڑ + ننگ تھا۔ دھڑ کے معنی
"ٹنگ" سے بھی اس کارشتہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ دھڑ + ننگ اور
دھڑ + ننگا لیکن یہ ترکیب اس لئے قرین قیاس نہیں کہ "ننگ" کے معنی
عضو، جسم کا کوئی حصہ بھی ہیں اور "ننگا" لباس کی ایک قسم کو یا اگر کھا
بھی ہے۔ ننگ اور ننگا کے ساتھ اس مرکب کا استعمال معنوی طور پر
قباحت پیدا کرے گا۔ اس لئے صحیح اور مناسب اجزائے ترکیبی دھڑ +
ننگ اور دھڑ + ننگا ہی ہیں۔ ایک نون تلفظ میں کر گیا اور رواں لفظ
دھڑ + ننگ اور دھڑ + ننگا بن گیا۔

تغیر معنوی کی مثالیں بہت ہیں "اردو" ہی کو لیجئے، لشکر
لشکر گاہ، لشکر کی بازار کے لئے استعمال ہوا، لیکن اب یہ تینوں معنی
ختم ہو چکے ہیں اور صرف زبان کے لئے استعمال ہو رہے ہیں مگر ان مجاز
معنی میں بھی ابتدائی معنی کا تصور موجود ہے کہ اس زبان کی تخلیق میں
لشکریوں کا بہت زیادہ ہاتھ ہے اور انہی کی نسبت سے اس زبان کو
اردو کہا جانے لگا۔

اگرچہ ہر لفظ کا مرکب یا تغیر سانی یا تشکار ہونا ضروری نہیں
لیکن اکثر الفاظ تغیر کی زد میں آکر سدھل بنے ہیں بعض کی داستان
کافی طویل اور دلچسپ ہے۔ "اکل کھرا" ہمارے زبان میں خود غرض
انگ تھلک رہنے والا بے مروت، اپنے ہی فائدہ کی فکر میں رہنے والا
دوسروں سے مل جل کر نہ رہنے والا، بدمزاج آدمی کو اکل کھرا کہتے ہیں۔
یعنی مجازی ہیں جو اس لفظ کی تخلیق کے بعد نتائج سے اخذ کئے گئے ہیں یہ
لفظ مفرد نہیں بلکہ مرکب ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی: وِج تخلیق، مقام
تخلیق اور ابتدائی معنی مطور ذیل میں ملاحظہ فرمائیے،

مرا اِکَل کھرا: یہ لفظ درحقیقت کسانوں کے ذریعہ رائج
ہوا۔ اس کے اجزائے ترکیبی کی حسب ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں،

کھانے نہیں دیتا تھا، اس سے لڑتا تھا پس اس کو الگ آخو پر باندھا گیا تو اکل آخو کا کہا۔ یہ اکل آخو تغیر لسانی سے اکل کھرا بنا۔ اکل اس اکل کھرے بیل کی فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اکل کھرا مجازی معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔

قبہا سما : ہر سال موسم بہا پاتا ہے مگر اس حقیقت کا علم کہ یہ بہا داور نو بہا قدیم ایرانیوں میں بتکدوں کے نام تھے۔ غالباً یہ بتوں کے نام ہوں گے انہی کے نام سے یہ بتکدے موسم کے گئے ہوں گے۔ بہا رخاں آج بھی بت خانہ کے ہم معنی ہے۔ موسم کے معنی میں بھی مجازاً اس بت ہی کی نسبت سے رائج ہوا۔ اس بت کے جیظہ اقتدار میں بہتری بہودی، رونق، سرسبزی و شادابی وغیرہ کو خیال کرتے ہوں گے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ انہی کے پیش نظر اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہوں، یہ (بہتری و بہودی) + آرا (امرا زادوں) = بہ آرا بہتری لانے والا توکم بہا رہتا ہی ہے بہتری، بہودی اور منفعت بخش موسم، پورے پھولوں سے اور درخت پھلوں سے لدا جاتے ہیں۔ ہر طرف مسرت و شادابی ہوتی ہے گویا موسم بہار، بہ آرا پاتا ہے۔

تخل ۱! میں نے لفظ خدا کے متعلق اپنے مضمون "خدا۔ مفرد یا مرکب مطبوعہ ماہ نو اکتوبر ۱۹۶۱ء میں مفصل بحث کی تھی اور اس کو مفرد ثابت کیا تھا۔ عام لغات میں مندرج ترکیب، خود + آرا (امرا زادوں) خود آنے والا اور مولف فرہنگ نظام کے خیال یعنی خدا کا مادہ ختم بمعنی واجب الوجود کو غلط ثابت کیا تھا۔ لیکن اب ایک اور خیال ترکیب ظاہر ہوئی ہے یعنی خدا دو لفظی مرکب نہیں بلکہ سہ لفظی ہے جس کے اجزائے ترکیبی قدیم فارسی اور انہی کے متبادل سنسکرت میں اس طرح ہیں :

سنسکرت : سو (آپ، روح) + تس یا تہ (لاحقہ) = سوتہ (اپنے آپ سے، بخودی خود) + دھات (باقی، پائندہ) = سوتہ دھات = اپنے آپ سے باقی، خود بخود پائندہ۔

فارسی : خرد (فطرت، عادت) + ت (لاحقہ) = خرت یا خود (اپنے آپ، خود بخود) + دات (لاحقہ) = خرت دات = اپنے آپ سے باقی خود بخود پائندہ (واجب الوجود)

ان اجزائے ترکیبی کی تشریح اس طرح ہے کہ خود + ت = خرت خود اور خدا میں خود مشترک ہے قدیم ترین فارسی میں خدا، خود ہی ہے،

کوئی بیل مرکبنا ہوتا ہے تو اس کو الگ آخو پر باندھتے اور چارہ دیتے ہیں، ایسے بیل کو "اکل آخو" وغیرہ صورت اکل کھرا کہتے ہیں، پس یہ مرکب آخو سے زیادہ قرن قیاس ہے۔ جس کی تائید کھر (کھری) سے بھی ہوتی ہے۔ جتنی میں بھی دو گھوڑے ساتھ جڑتے جلتے ہیں لیکن اول تو ان کا استکان ہی بہت کم ہے، دوسرے یہ گھوڑے صرف بھی میں جتنے وقت ساتھ ساتھ ہوتے ہیں ورنہ الگ الگ رہتے ہیں۔ نیز گھوڑوں کو دانہ تو پیسے یا بانٹی میں کھلایا جاتا ہے، جہاں شرکت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اور گھاس بھی الگ الگ ہی ڈالی جاتی ہے اس لئے اصطبل سے اس کا تعلق نہیں۔

اس مرکب کا دوسرا جز "کھرا" بمعنی بد مزاج بھی ہو سکتا ہے لیکن مرکب معنوی اعتبار سے مہل ہو جاتا ہے کیونکہ اکل اور کھرا میں تسلسل معنوی کے لئے عطف ضروری ہے کھرا کو تابع بھی قرار نہیں دے سکتے۔ اسی طرح مرکب کا دوسرا جز "کھر" بمعنی سم بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی معنوی اعتبار سے غلط ہے کیونکہ کسی جانور کا اکیلا سم نہیں ہوتا۔ اکیلے سم خلاف حقیقت ہو گا۔ اگر سم سے لڑنے کا تصور دیا جائے تو بھی یہ خلاف واقعہ ہے کیونکہ اس قسم کے جانور سم سے نہیں بلکہ سینگوں سے لڑا کرتے ہیں۔ پس یہ دونوں اجزائے ترکیبی خلاف حقیقت اور غلطی سے دو ہیں۔

"خوڑے سے مرکب قرار دینے میں معنوی قرینہ ضرور موجود ہے لیکن حقیقت واقعہ سے مناسبت نہیں، کیونکہ اکل + خورا (کھرا) = اکیلا کھانے والا۔ تنہا چارہ کھانے والے تو اکثر جانور ہوتے ہیں جیسے گائے بھینس وغیرہ، ان کی آخو بھی الگ ہوتی ہے اور بلا پنے چارہ میں غیر کی شرکت کو گوارا بھی نہیں کرتے، مگر ان میں سے کسی کو بھی "اکل کھرا" نہیں کہا جاتا کیونکہ ان کے ساتھ کسی کی شرکت کا تصور ہی نہیں ہے البتہ بیلوں کی جوڑی میں شرکت و اتحاد کا تصور موجود، عدم شرکت و اتحاد، خلاف رسم و عادت، اور اسی خلاف رسم و عادت عمل سے یہ مرکب وجود میں آیا۔ کیونکہ جب تک یہ دونوں بیل ایک ہی آخو پر لڑ بھڑ کر کھاتے رہتے ہیں تب تک ان میں سے لڑنے والے بیل کو اکل کھرا نہیں کہتے، بلکہ جب ان میں سے مرکب بیل کو الگ آخو پر باندھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "اکل کھرا" ہے، اپنے ساتھی کو وار تہ ہے۔ اسی لئے میں نے آخو سے ترکیب پانے کو ترجیح دی ہے۔ اکل آخو (اکل کھرا) ابتدا میں ایسے بیل کے لئے استعمال کیا گیا جو اپنے ساتھی کو ایک آخو پر چارہ

کے لئے اختراع ہوتا تو ابتداء میں اسی معنی میں استعمال کیا جاتا اور دوسرے معنی میں تغیر لسانی کے مراحل طے کرنے کے بعد رائج ہوتا لیکن ظاہر ہے کہ ابتداء میں معنی اللہ مستقل نہیں ہوا بلکہ بعد میں استعمال کیا گیا ہے۔ لہذا جب ابتداء میں استعمال میں یہ معنی موجود نہیں تو اجزائے ترکیبی کی تطبیق کیونکر ممکن ہو سکتی ہے اور ان کو کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟ اب ملاحظہ فرمائیے کہ قدیم فارسی میں ذات الہی کے لئے کون کون سے الفاظ مستقل تھے۔ لفظ خدا قدیم فارسی میں کب سے مستقل ہے اور کن کن معنی میں، اس کی اطلائی اشکال کیا کیا تھیں؟

قدیم فارسی میں ذات الہی کے لئے، بَغ، مَرْد، اَہورامزدا، یَزَتان، یزدان اور یَزَد مستقل تھے۔ بَغ عہد پانچواں منشی اور اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے پادشاہ آئور (۴۰۵-۴۲۱ ق م) کے کتبہ سارگون میں "بَغ داتی" کی شکل میں ملتا ہے۔ اس کے بعد "بَغ دیش" ایک مہینہ کا نام یعنی ماہ ستائش خدا، کتبہ داراوش میں ہے، دوسرے کتبوں اور دستاویزوں میں بَغ بمعنی خدائے عالم آیا ہے۔ "بَغ دات" یعنی خدا داد اور "بَغ کرت" یعنی خدا کرد، دو بادشاہوں کے نام ہیں۔ ایک آتش کدہ کا نام بھی "اَہورامزدا" یعنی آتش جلال یزدان ہے شہنشاہان ساسانی کی سکوں میں بھی "بَغ" بمعنی خدا پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس لفظ کے معنی میں فرق آیا ہے اور کچھ بجز چند مرکبات زبان فارسی سے بالکل ناپید ہو گیا ہے۔ ساسانی سکوں پر یہ عبارت کدہ ہے جس میں "بَغ، یزدو، یزدان، اور یزتان" بمعنی اللہ استعمال ہوئے ہیں:

"مَرْد و کیشی یعنی اَرْتخشتر ملکان ایران منوشتن یزدا" یعنی خدا پرست و خدا نگاہان ار و شیر شہنشاہ ایران جس کا خاندان خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح "مَرْد و کیشی یعنی شیر و ہری ملکان ملکا ایران منوشتن یزدا" "سکہ شاہ پور پر کند ہے۔ نیز کتبہ شاہ پور ملکان شاہ میں "مَرْد و کیشی یعنی شیر و ہری شہان شیری ایران و ابلان کی چترت یزدان ہے یعنی، خدا پرست و خدا نگاہان شاہ پور شہنشاہ ایران و غیر ایران جس کا خاندان خدا سے پرستہ ہے۔ خط منی مادی میں بھی اہرمزدا (خدا) اور بغا (خدا۔ بزرگ) موجود ہے۔ "بَغ" کے متعلق کتبہ اشور بہار نے لکھا ہے "در عہد پانچواں منشی و تا چند قرن بعد بَغ نام پروردگار عالم بردہ است" اہورامزدا کے متعلق لکھتے ہیں اور مزدا، دہا مل اہور

در میانی عہد میں خوتامی، ات کا تبادلہ سے مسلم، اس لئے خوتامی سے خدا ہو سکتا ہے، مگر وہ کا تبادلہ ت سے نہیں اس لئے سہل بات یہ ہے کہ خدا کو خود ہائی سے ماخوذ مانا جائے، اور وہ میں تخفیف ہو کر دینا قبول کیا جائے۔ یا خدا = خوت دات اولاً خوتاد بمعنی دو تہمت (باد) ہوا، اس کے بعد خوتامی (بجذرت د) ہوا، یا خوت دات = خوتامی (بجذرت) ہوا پھر خوتامی = خدا ہو گیا خوتامی بمعنی مالک، حاکم، قادر (بادشاہ) مستقل تھا، ساسانی عہد میں خالق و مالک کل اور ہرمزدا کے لئے استعمال ہوا، قدیم فارسی میں بمعنی اللہ بھی استعمال ہو رہے تھے جیسے اہرمزدا و خدا۔ مذکورہ اجزائے ترکیبی اور تشکیک پر غور رکھئے؟ "خو" بمعنی فطرت عادت قدیم فارسی میں خو نہیں تھا بلکہ "خیم" تھا۔ خیم میں سے م ساقط ہو گئی اور ی و او معروف سے بدل گئی، خینا خیم کی مثالیں یہ ہیں: خیم خرد فرخ مرت، (دو خوی و خرد مزد فرخ) اور ابورنجیم ہوسرواں (برنج خوی خسرواں)۔ نیز دژخیم بمعنی بد فطرت تا حال باقی ہے۔ پس خود اور خدا میں مشترک "خو" معنوی اور اطلائی حیثیت سے نہیں ہو سکتا۔ نیز خو میں و او معروف ہے اور خود، خدا کی ابتداء کی شکل خوتامی میں و او معدول ہے۔ "خو" مخ معد و او معدولہ اوستا اور پہلوی میں ایک مفرد حوت (ے) ہے اس کی ہجائی مطابقت بھی نہیں ہو سکتی۔ فارسی میں خود ہائی کی دھکا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ دات ہے جس کے معنی عطیہ ہیں اس مفروضہ، خود دات کے معنی عطیہ فطرت ہو سکتے ہیں، نہ کہ خود خود۔ فارسی قدیم میں خوتامی بمعنی اللہ نہیں ہے، بلکہ بمعنی بادشاہ یا مالک ہے یا زیادہ سے زیادہ فرشتہ تراجم ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس مراد معنی کے ساتھ ساتھ، مالک، صاحب، اور بادشاہ کے معنی بھی لئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً "اہرمزدا خوتامی" میں آقا یا بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ اہرمزدا کے معنی ہو گئے ہیں اگر خوتامی کے معنی بھی اللہ کے لیں تو دونوں کے اجمال کا جواب کیسے ہو گا؟ دراصل خوتامی = صفت اور ہرمزدا بمعنی اہرمزدا بادشاہ۔ لسانیات کا ایک عام اصول ہے کہ لفظ وقت تخلیق و اختراع اپنے اہلی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ یہ مفہوم منزل و ارتقا کا شکار بعد میں ہوتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ خوتامی بمعنی مالک، آقا اور قادر (بادشاہ) مستقل تھا۔ ساسانی عہد میں خالق و مالک کل "اہرمزدا" کے لئے استعمال ہوا، اجزائے ترکیبی کی خود تغلیط کر رہے ہیں کیونکہ یہ لفظ جیسا کہ اجزائے ترکیبی کے معنی سے ظاہر کیا گیا ہے اگر واجب الوجود کے معنی

اور وہ میں میں عام لفظ ہے یعنی ایک خاص انداز کا تحت یا
چو کی جو سلمان رکھنے کے لئے مخصوص ہے۔ جیسے لکھنے پڑھنے کی میر لکھنے
کی میر، سنگھار میر وغیرہ انگریزی میں اس کو ٹیبل (Table) کہتے ہیں ظاہر
ہے کہ اس میر کا میر یاں سے تعلق نہیں ہو سکتا کیونکہ میر پر کھانا کھانا اور
کھانا پاک و ہند میں عام نہیں، چند گھرانوں کا میر پر کھانا کھانے کے دن
کی بات ہے، میر یاں نہ صرف اردو میں بلکہ پاک و ہند کی بیشتر زبانوں
اور بولیوں میں رائج ہے۔ ان اقوام اور علاقوں میں بھی جہاں میر کو کسی
حیثیت سے بھی استعمال نہیں کرتے، صاحب خانہ، جہاندار کو میر یاں ہی
کہتے ہیں۔ بجا پور کے مشہور شاعر شوقی نے سلطان عادل شاہ والی بجا پور
کی تقریب شادی کے متعلق ایک شہنوی میر یاں نامہ لکھی ہے۔ اس تیک
شہادت سے ثابت ہے کہ میر یاں کا لفظ اردو اور دوسری زبانوں میں
فارسی سے آیا۔ فارسی میں یہ لفظ قدیم زمانہ سے متعل ہے۔ اس لئے
اس کو فارسی میں تلاش کرتے ہیں۔

”میر یاں“ ہم کو قدیم فارسی میں مشکل ”میر و پان“ ملتا ہے۔ قدیم
ایمانوں میں مذہبی دعوت کو ”میر و د“ کہتے تھے جیسے مسلمانوں میں دعوت
نذر نیاز، حقیقہ، ختنہ، ولیمہ وغیرہ ہیں چنانچہ اوستا سے ہوتا ہے پہلوی
میں ترجمہ ہوئی ہیں ان میں ایک کتاب ”افریس میر و د“ ہے جس میں اس
قسم کی مذہبی دعوتوں کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ محفل غاشی یا جشن کی
تعریف میں بھی ایک کتاب اورستانی تاریہ سورآفرس“ ہے اس میں
”میر و پان“ اور ”میر و د“ کے الفاظ مذکور ہیں۔

”گوش و اریست شاخ و دیہان (کہ) ایڈر مستید، تاک اورستانی
تاریہ اس سورآفرس از ریز تان و سپاستار یہ اس میر و پان طری سخن
گوئیم“ یعنی توجہ فرمائیے آپ نیک حضرات جو یہاں تشریف لائے ہیں
تاکہ اس جشن مسرت بکانب خدا کی مستانیش اور اس صاحب ولیمہ و حق
کے شکر یہ کہ لئے ہم کہہ کہیں۔ ”ہماک زو ہر مس دو یہ کیز تان پز اس
میر و ارنیک کرت“ (تمام طاقت و قوت اس بزرگ کے لئے جسے خدا نے
اس بزم ولیمہ و مسرت کی توفیق ارزانی فرمائی)۔ ”سپاس ایہ میر یاں کی کہ
روچکار انداخت و ساخت کرت“ (اس صاحب ولیمہ (دعوت) کا شکریہ
جس نے اس دن کو قایم کیا اور انتظام کیا،) ساسانی عہد میں میر و اور
میر و بان کی خدمت کرنے والے ایرانی طبقہ کی تقسیم کے لحاظ سے طبقہ
چارہ میں داخل تھے جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس قسم کی دعوتوں

میں قدیم معنی (مالک، فرمانروا وغیرہ) موجود ہیں پس اجزائے ترکیبی سے
جو معنی (واجب الوجود) معین کئے گئے ہیں جبکہ ان معنی میں استعمال
ہی نہیں ملتا تو اجزائے ترکیبی کی جستجو قیاسی ہوسکتی ہے زیادہ حیثیت
نہیں رکھتی کیونکہ اصول لسانیات کے ذریعہ امر کلیتہً غلط ہے کہ لفظ
کے اجزائے ترکیبی سے جو معنی مرتب ہوں وہ معنی ابتدائیں نہ لئے جائیں
بلکہ صدیاں گزر جانے کے بعد ان معنی کی طرف رجوع کیا جائے عقل سلیم
اس کو قبول نہیں کر سکتی۔ پس معنی کی عدم موجودگی سے اجزائے ترکیبی
غلط اور مرکب کہنا بھی نا درست ہے۔

”مکنو اسرا“ یہ لفظ پاک و ہند کی قدیم تہذیب کا نمائندہ ہے۔
کیونکہ سرزمین پاک و ہند میں زراعت کو اولیت حاصل ہے۔ بالخصوص
قدیم زمانہ میں کاشتکاروں کی کثرت تھی اور قریب قریب بیشتر آبادی کا
یہی پیشہ تھا۔ موجودہ زمانہ کی طرح ذرائع آبپاشی میں آسانیاں نہیں۔
آج کی طرح نہروں کا جال بھی پھیلا ہوا نہ تھا، بلکہ بارش کے علاوہ آبپاشی
کا دار و مدار زیادہ تر کنوؤں پر تھا۔ چرس یا چرس (چمڑے کا بڑا ڈول) کو
بیل کھینچتے تھے۔ اس کام کے لئے کم از کم تین آدمی درکار ہوتے تھے۔
ایک چرس کو سہارنے والا۔ ایک بیلوں کو ہانکنے والا۔ ایک حکمت کی
کیاریوں میں پانی پھیرنے والا۔ پہلے مشکل کام کو انجام دینے کے لئے
بھرپور طاقت کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے چرس سہارنے والا اور سہارنے
کی خدمت فوجانوں بالخصوص خیر شادی شدہ جوانوں کے سپرد ہوتی تھی
اسی خدمت کی مناسبت سے خیر شادی شدہ فوجان کو کنوارا کنوؤں
(علامت اضافت) یعنی کنوئیں سے نسبت رکھنے والا، کنوئیں کے
کام کو انجام دینے سے تعلق رکھنے والا، کہا گیا اور آج تک اسی نام سے
یا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح گھر میں ضروریات کے لئے فوجان لڑکیاں کنوؤں
سے پانی بھر کر لیا کرتی تھیں یہ خدمت بھی عموماً خیر شادی شدہ لڑکیوں کے
سپرد ہوتی تھی انہیں کنواری کہا گیا، پنکٹ کی رنگینی اور رونق انہی کے
دم سے تھی، کنوواں + ری (علامت اضافت) = کنواری اسی کی
نشاندہی کرتی ہے۔

”میر یاں“ وہ شخص جس کے گھر کوئی بہان آیا ہو جس نے
کسی کی دعوت کی ہو۔ صاحب خانہ، میر یاں کہلا آئے میر یاں مرکب
ہے، میر + یاں سے۔ بان فارسی لاحقہ فعلیت ہے۔ اس کے جز اول
”میر“ کے متعلق غور کرنا ہے کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟

خزاں کہا گیا۔ میرے نزدیک اس کی ایک اور صورت ہے یعنی خیزنہ (امرازا سنسن، یعنی اٹھنا) + ان (لاحقہ حالہ) = خیزان یعنی اٹھتا ہوا تغیر لسانی سے ہی حذف ہو گئی خزاں رہ گیا یعنی وہ موسم جس میں چڑھتی ہوئی نظر آئے، سرسبز و شادابی، رونق ختم ہو جائے یہ قیاس ہمارے پیش نظر ہے، بہار میں یہ باتیں موجود ہوتی ہیں خزاں میں اٹھ جاتی ہیں۔

کنیز، کنیا: یہ دونوں فارسی و ہندی لفظ ہم معنی ہیں اگرچہ اب کنیز لفظ کی معنی میں مستعمل ہے مگر قدیم فارسی میں مطلق لڑکی، عورت کے معنی میں مستعمل تھا کنیکان بمعنی دختران، درستائش درخت نور (طوفان انار، نالیان) میں آیا ہے اور "کنیز کار" بمعنی دوشیزگان رسالہ ریزک و خسرو گوانان (پہلوی) میں موجود ہے۔ قدیم فارسی میں بزرگ بعدہ نرہ علامت تانیث تھی کنیز بمعنی لڑکی تغیرات زمانہ کی بدولت بمعنی لڑکی استعمال ہو کنیز بزرگ، کنیزہ، کنیز تغیراتی اشکال ہیں۔ ہندی میں کنیا بمعنی لڑکی مستعمل ہے، اس کے معنی میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی مگر دیلا علامت تانیث (کنیا ہے۔ کنیز و کنیا دونوں کا مادہ کن ہے جو قدیم فارسی و سنسکرت کی یکانگت و یکسانیت کی دلیل ہے۔

* دختر، دوہتر، ڈاٹر (DAUGHTER)، دوشیزہ پہلے تین لفظ فارسی، ہندی اور انگریزی میں لڑکی اور بیٹی کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ تینوں ہم معنی الفاظ ہندی یورپی لسانی سنجہ کی بنیاد وحدت کاشوت ہیں۔ قدیم انسانی تمدن میں، زراعت اور نگہ بانی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ قبائل کے ایک علاقے سے دوسرے علاقہ کی طرف ہجرت کے اسباب میں زرخیز زمین اور عمدہ چراگاہوں کی جستجو کو اولیت قرار دیا گیا ہے۔ وسط ایشیائے آریائی قبائل کا اظہار جانب میں انتشار کا سبب چراگاہوں کی تلاش ہی بتایا جاتا ہے۔ اس گلہ بانی کے دور میں بھی تقسیم کار کا طریقہ رائج تھا، چنانچہ مویشیوں کا دودھ دوہنے کی خدمت لڑکیوں کے سپرد ہوا کرتی تھی۔ فارسی دختر ہندی میں دوہنا سے دختر اور دوہتر بنا ہے۔ دختر + آ = دختر ہے خ اور ہ کا تباہ دل ہوتا ہے جیسے مہر شید، خورشید، دختر اور دوہتر ایک ہی ہیں، جن کی اصل دوخ ہے اور خ آہیں بدل جاتی ہے (باقی صفحہ ۳۰ پر)

انتظام کے لئے ایک خاص گروہ تھا جس کے ذمہ کھانا پکانا اور کھانا کھانا یہ ایک طرح کا پیشہ بن گیا تھا۔ میز و کے متعلق ملک الشعرا تہاہار نے لکھا ہے کہ میز و ایک طرح کا دینی ولیمہ تھا، جس نے اب مطلقاً خوشی اور مہمانی کے معنی حاصل کر لئے ہیں مگر لکھا ہے میز و، نذر یا مذہبی جشن کی دعوت کو کہتے تھے جو مالدار لوگ دیتے اور اہل قریہ کو کھانا کھلاتے تھے یہ لفظ بھی تبدیلی مذہب کی وجہ سے زبان میں باقی نہیں رہا اور اس کی جگہ ولیمہ نے لی۔ فارسی دمی میں بھی بہت کم استعمال ہوا ہے اور اس کے معنی بھی بدل گئے ہیں۔ مہمانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، آخری سہ اسے بہتر داندروں تہمت

دی بہتیز داندروں ہزار فریدوں

فرخی کے شعر میں میز و کا لفظ میز و بر و زہر و استعمال ہوا ہے اس شعر میں میز و کے معنی بزم سرور و دعوت کے ہیں۔ امور مذکورہ سے واضح ہونے کے معنی بیان اصل میں میز و بیان تھا درمیان سے ثقالت کے باعث گرجائی میز بیان باقی رہ گیا صاحب خانہ و نہادار کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ مگر ابتدائی معنی کا تصور اب بھی موجود ہے یعنی دعوت کرنے والا، اپنے گھر آئے ہوئے کو کھانا کھلانے والا، قدیم صرف دینی دعوتوں کے مخصوص تھا اور اب عام ہے۔ اسی طرح کسی کے گھر جانے والے کو مہمان کہتے ہیں جو مرکب ہے مہ (بزرگ) + مان (لاحقہ تشبیہ) = مہمان بزرگ کی مانند گھر آنے والے کی عزت کی جاتی ہے۔ بزرگ خیال کیا جاتا ہے اس لئے یہ لفظ مہمان وجود میں آیا۔

اردو میں "میز" بمعنی ٹیبل، پرنگالی لفظ ہے اس کا میزبان سے کوئی تعلق نہیں۔ اردو میں پرنگالیوں کے زمانہ سے آیا۔ فارسی میں بھی رومی و انشی سے داخل ہوا ہے فارسی سے اردو میں آنا اس لئے قرین قیاس نہیں کہ غیر ملکی زبانوں کے اثر و نفوذ کے زمانہ میں پاک و ہندوستان میں لسانی روابط باقی نہ تھے۔

"خزان" (پت جھڑ کا موسم) اس لفظ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ خرد (گرم پٹے کا نام) + ان (لاحقہ نسبتی) یعنی وہ موسم جس کا تعلق خرد (گرم پٹے) سے ہو۔ ایران میں جاڑوں کا موسم خزاں کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نام ہوا۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ خرد (امرا زرخیزدن بمعنی گھسنا) + ان (لاحقہ حالہ) خزاں یعنی گھسنا ہوا کیونکہ ایران میں جاڑوں کے موسم میں ہفت ہاری ہوتی ہے لوگ گھروں میں گھس جاتے ہیں اس لئے اس کو

غزل

شان الحق حقی

دنیا ہی کی راہ پہ آخر رفتہ رفتہ آنا ہوگا
درد بھی دے گا ساتھ کہاں تک بے دل ہی بن جانا ہوگا
حیرت کیا ہے ہم سے بڑھ کر کون بھلا بیگانہ ہوگا
خود اپنے کو بھول چکے ہیں تم نے کیا پہچانا ہوگا
دل کا ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے اور کہاں اب جانا ہوگا
ہم ہوں گے اور وحشت ہوگی اور یہی ویرانہ ہوگا
بیت گیا جو یاد میں تیری اک اک لمحہ دھیان میں ہے
الفت میں جی ہارنا کیسا جو کھویا سب پانا ہوگا
اور تو سب دکھ بٹ جاتے ہیں دل کے درد کون بتائے
دنیا کے غم برحق لیکن اپنا بھی غم کھانا ہوگا
دل میں ہجومِ درد ہے لیکن آم کے بھی اوسان نہیں
اس بدلی کو یونہی آخر بر سے بن چھٹ جانا ہوگا
اس بستی کا کون میسا اس بستی کا کون خدا
خود ہی حشر اٹھانے ہوں گے مرنا اور جی جانا ہوگا

”کرن پھول“ کے دیس نیں

صہب الکھنوی

ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان رشتہ اخوت و یکجہتی کو مضبوطیت مضبوط تر کرنے کے لئے جہاں اور طبقات کا باہمی میل جول اور افہام و تفہیم ضروری ہے وہاں ملک کے دانشوروں، فنکاروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں، صحافیوں، محققین، راجہ، راجہ کوہستار، کراچی، ایک بڑا موثر وسیع ہے۔
کچھ حصہ ہوا مغربی پاکستان کے پانچ ممتاز ادیب و صحافی — (مولانا راؤ فیضی، مدیر صحت، جناب صہب الکھنوی، مدیر افکار، جناب شریو لہنا، صدر شہید صحافت کراچی یونیورسٹی، جناب قیوم ملک، مدیر ایئر پرائز اور جناب ذاکر علی، غائبانہ، قویہ، راولپنڈی — آپ رداں کی سرزمین، اگر پھول کے اس دیس کی سیاحت کے لئے گئے تھے۔ اس وفد کے ایک رکن، جناب صہب الکھنوی نے دھان، پائت اور مانجھریوں کی اس ہری بھری فردوس بردارماں سرزمین، آنکھوں دیکھا حال ایک رپورٹاژ کی شکل میں مرتب کیا ہے جس کا کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

(ادارہ)

سنہ ۱۹۶۳ء، ۲۵ جون (۱۹۶۱ء) :

ریلوے اسٹیشن پر کافی بھیڑ تھی۔ چٹا کا رنگ کے افسر تعلقات حامد اسٹیشن پر موجود تھے۔ اور ٹیکسیاں بھی تیار تھیں۔ سامانی لے کر ۵ منٹ میں ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ریسٹ ہاؤس اسٹیشن سے نزدیک ہی اسٹیشن روڈ پر واقع تھا۔ ہمارے قیام کے لئے چونکہ کمرے محفوظ تھے اس لئے کوئی دقت نہ ہوئی۔ مولانا فیضی، قیوم ملک اور شریو لہنا اپنے احباب سے ملنے چلے گئے۔ ذاکر صاحب اور میں، ہمارے دھوکہ بازار کی سیر کرنے گئے۔ اسٹیشن روڈ پر ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ کتابوں کی بھی کپڑے کی بھی، پھلوں اور فرنیچر کی بھی۔ پھلوں کی ایک دکان پر کھل اور اناس دیکھ کر ذاکر صاحب رک گئے اور بھاؤ پوچھا۔ پھل والے نے ایک روپیہ کھل کا اور تین روپیہ اناس کے بتائے۔ ذاکر صاحب نے ساوگی سے پوچھا۔ تین روپے کے چار اناس! دکاندار نے کہا۔ نہیں صاحب، تین روپے کا ایک۔

ذاکر صاحب حیران رہ گئے۔ دکاندار سے کہنے لگے۔ بھائی ہم نے مہینے سے مہنگا اناس بھی سات آنے کا خریدا ہے۔ یہ تو بہت مہنگا ہے۔

کرن پھول (ادارہ) :

پھل والے نے معصومیت سے جواب دیا : صاحب، یہ چاہیہ کام ہے، سستا اناس صرف سلہٹ میں ملتا ہے۔ اس سول جوا کے دوران میں شہر شہر کے فرق اور مشرقی پاکستان میں پھلوں کی قلت، کثرت کا تجزیہ کرتا رہا۔ بالآخر ذاکر صاحب نے آم خرید ہی لئے۔ آم سلے کر ہم نے کچھ دیر بازاروں کے چکر لگائے۔ اجالا بڈ پو اور ریدرس چیمبرس کی دکانوں پر گئے۔ وہاں سے ریسٹ ہاؤس لوٹ آئے۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے ہی چاہیہ کام کا مشہور مسکا ہوٹل ہے۔ ہم جب ریسٹ ہاؤس پہنچے تو مولانا فیضی، شریف المجاہد اور قیوم ملک واپس آچکے تھے۔ افضل صاحب ہمیں مسکا ہوٹل میں کھانے کے لئے لے گئے۔ کھانا بہت اچھا تھا۔ چنانچہ اس اعلیٰ انتظام کے لئے افضل صاحب کو آج مولانا نے ”آٹھ“ نمبر دے کر دریا دلی کا ثبوت دیا۔ ۱۰ بجے کے قریب ہم ریسٹ ہاؤس لوٹ آئے۔

کراچی کے بعد چاہیہ کام ہی پاکستان کا سب سے بڑا بندہ لگا ہے اور دنیا کا پاکستان کے بعد اس شہر کی آبادی چار لاکھ سے بھی زائد ہے۔ ہے۔ تانہ کے ورق لٹے تو پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کی ابتدا قدیم ریاست تریپورہ کے مجیروں کے ایک گاؤں کی حیثیت سے ہوئی تھی۔

لے کر ڈاکٹر کٹرس بنگلہ پہنچے۔ یہ بنگلہ ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے اور راستہ کافی پُر ہیچ۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے ہمیں دور دور تک شہر اور پہاڑی سلسلے نظر آئے۔ راستے کے دونوں طرف گھنی جھاڑیوں، خود رو پودوں اور رنگارنگ پھولوں کا نہایت دلغریب نظارہ تھا۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کے حق اور ان کی دلکشی کے چرچے ہم نے مزور سنئے تھے لیکن آج اپنی آنکھوں سے اس حسین علاقے کو دیکھ کر لیا۔ ہمارے پہنچنے کے فوراً بعد کرنل صاحب بھی دوسری جیب میں آگئے۔ بنگلے کے کمرے کھلوائے اور ہمارا سامان رکھوایا۔ جب ہم کمروں میں گئے تو معلوم ہوا کہ ایئر کنڈیشنڈ ہیں!۔ منہ ہاتھ دھو کر بنگلے کے وسیع ہال میں آن بیٹھے۔ افضل صاحب نے اس دورانی میں کپتانی فون کیا تو کسی صاحب نے کہا، آج اپنے کھانا تیار ہے۔ کرنل صاحب نے اسٹیشن ویگن ہمارے لئے روک رکھی تھی چٹاگانگ ہم اس میں کپتانی کے لئے روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت کرنل صاحب نے کہا کہ بائیں بے تک کپتانی سے واپس آجائیں تاکہ کرنل فلی پیئر مل بھی دیکھ لیں۔

اس وقت ڈیڑھ بج رہا تھا اور اب ہم اسٹیشن ویگن میں بلند پہاڑی کے بیچ درجی راستوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دھوپ میں پہاڑیوں کا سبزہ یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت نے سبز مٹل کا فرش بچھا دیا ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان دریلے کرنل فلی ایک بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی کی طرح بہہ رہا تھا۔ بلندی سے اتر کر جب میدانی علاقوں میں آئے تو مناظر کا حسن کچھ اور بھی نکھر گیا۔ اب اونچے نیچے پہاڑ اور خوبصورت جنگل حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ سڑک اچھی تھی اور اسٹیشن ویگن نہایت آرام دہ ۸-۹ میل کا راستہ معلوم بھی نہ ہوا۔

کپتانی میں: یہاں پہنچ کر کئی جگہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن صبح رہبری نہ ہو سکی کہ کھانا کہاں ہے۔ ہر ایک نے یہی بتایا کہ فلاں جگہ، چلے جائیے۔ دو چار مقامات کے چکر لگانے کے بعد ہم ایک صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر افضل صاحب کو گیسٹ ہاؤس کا پتہ بتا دیا اور اندر چلے گئے! خیر۔ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کیا۔ اس تمام عرصے میں ہم اس بات کے منتظر رہے کہ کوئی ذمہ دار شخص آئے گا اور ہمیں کپتانی

پر واقع ہے۔ اسٹیمر دریا کے وسط میں کھڑا تھا۔ ہم لوگ چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اسٹیمر پر پہنچے۔ اسٹیمر کی دوسری منزل پر ہماری نشستیں مخصوص تھیں۔ اب دریائے کرنا فلی تھا اور اسٹیمر کا ایک اور سفر۔ ہماری منزل چندر گونا تھی، جہاں کرنل فلی پیئر مل ہے، وہاں سے کپتانی جانا تھا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اسٹیمر روانہ ہوا۔ ہمارے اسٹیمر کے علاوہ دریا کے چوڑے سینے پر ان گنت چھوٹی بڑی کشتیاں اور اسٹیمروں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ کرنل فلی، چٹاگانگ ہی نہیں بلکہ پورے مشرقی پاکستان کا مشہور ترین اور اہم ترین دریا ہے۔ پہاڑی علاقے میں اس کے دونوں طرف نمز پانس کے گھنے جنگل ہیں بلکہ نایل، پھالیہ، اور گجور وغیرہ کے درختوں کا بھی ایک وسیع سلسلہ ہے۔ اسی دریا میں ہم نے خوب جہاز رانوں کے طرز کی کشتیاں بھی پہلی بار دیکھیں۔ ان کشتیوں کو شپیان کہتے ہیں۔ پتہ چلا کہ شپیان کے چلانے والے طرہ بڑے جیلے اور اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں اور ان جہاز نما کشتیوں کو لے کر کبھی کبھی وہ ہر ایک تک پہنچ جاتے ہیں۔

چندر گونا میں جہاں کرنل فلی کاغذ کا کارخانہ ہے چٹاگانگ سے تقریباً ۲۰ میل دور ہے اور کپتانی، جہاں آج بھلی کا نہایت اہم منصوبہ زیر تکمیل ہے، تقریباً ۳۵ میل کے فاصلہ پر۔ افضل صاحب نے بتایا کہ ہمارے قیام و طعام کا انتظام کپتانی میں ہے لیکن جب ہم لوگ تقریباً ساڑھے بارہ بجے چندر گونا پہنچے تو وہاں ہمیں رہبری کے لئے کوئی صاحب موجود نہ تھے۔ افضل صاحب نے پہلے کی طرح اس موقع پر بھی بڑی مستعدی سے کام لیا۔ لپک کر تھانہ گھاٹ پر پہنچے اور کرنل فلی کے ایڈمنسٹریٹو آفیسر، کرنل سکندر خاں جٹا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ وہ افضل صاحب کے ہمراہ گھاٹ پر تشریف لے آئے اور ہمیں کپتانی کے بجائے وہیں اُتار لیا۔ گھاٹ پر خاصی بھڑکتی۔ مگر کربانی میں نو عمر لڑکے لکڑی کے ڈبوں میں بسکٹ، مٹھائی کی گولیاں اور مرمرے آواز لگا کر بیچ رہے تھے۔ بعض لڑکے تختوں کو کشتی بنا کر تیر بھی رہے تھے۔ ہم لوگ اسٹیمر سے اتر کر گھاٹ پر آ گئے۔ کرنل صاحب بڑے تپاک سے ملے اور فرمایا کہ ابھی سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ حضرات میرے ساتھ آئیں۔

تھوڑی دیر میں ایک اسٹیشن ویگن آگئی اور ہم سامان

خوبصورت مکانات اور بنگلے یا تو تعمیر ہو چکے تھے یا تکمیل کے مرحلے میں تھے۔ پہاڑیوں سے نیچے میدانوں میں اس منصوبے کے وفاتر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کپتانی ایک نیا اور خوبصورت شہر بن چکا ہے۔ کپتانی بننا و شہر کی تعمیر میں ہزاروں پاکستانیوں کا خون پسینہ شامل ہے جنہوں نے آرام و راحت کا تصور کئے بغیر اپنے ملک اور قوم کی خوشحالی کے لئے شبانہ روز محنت سے کام کیا۔ اس نئے شہر میں اسکول، اسپتال، کیل کے میدان، وسیع شاہراہیں، بازار اور دور دور تک پھیلی ہوئی آبادی اس بات کی غارتھی کہ یہاں کے رہنے والوں کو تمام سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ چمکا قبیلہ: کپتانی اور چند رگونہ کے راستے میں ایک مقام آیا جہاں سے راجگامانی مکوراستہ جاتا تھا۔ راستے کے دوسری طرف دریلے کرنا فلی تھا۔ راجگامانی، چمکا (جسے "چاکما" بھی کہتے ہیں) قبیلہ کا صدر مقام ہے۔ یہیں سے چانگام کے وہ پہاڑی سلسلے بھی شروع ہوتے ہیں جن کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل ہے اور جہاں گھنے جنگلوں میں باگھی، شیر، چیتے، جیسے خوفناک جانوروں کے درمیان بارہ قبیلے بسے ہیں جن میں چمکا، مونگ، موگ، پنکھوس، اور ماگہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان قبیلوں میں چمکا اور ماگہ دوسب سے بڑے قبیلے ہیں۔ پہاڑی چانگام کے ۲۹۶ گاؤں میں سے ۹۴ میں چمکا ہی بسے ہوئے ہیں۔ تمام قبیلوں میں یہ قبیلہ زیادہ مشہور اور نسبتاً زیادہ مہذب بھی ہے اور اپنے سردار کا، جسے "راجہ" کہتے ہیں بے حد وفادار ہے۔ موجودہ راجہ کافی روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ قبیلے کے بچے علم تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں یہ قبیلہ منگول اور آریائی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور صدیوں سے ان پہاڑیوں پر آباد ہے۔ اس قبیلے کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو ہیں۔ یہ چمکا زبان بولتے ہیں جسے بنگالی کی ایک بولی کہا جاسکتا ہے۔ کھیتی باڑی ان کا خاص پیشہ ہے۔ جسے "بھوم" کہتے ہیں۔ پہاڑی دھلاؤں پر یہ لوگ دھان، روئی، میز، وغیرہ کی کاشت کرتے ہیں۔ درانتی اور کلہاڑی کے طرز کا ایک خاص اوزار جسے "داؤ" کہا جاتا ہے، فصل اور لکڑی کاٹنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ نئی اور ترقی یافتہ دنیا کی تقریباً تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہیں۔ روئی پیدا کر کے قبیلے کی عورتیں اپنے لئے خود ہی کپڑا بن لیتی ہیں۔ مرد جنگل سے بانس کاٹ کر اپنا گھر اور فرنیچر تیار کر لیتے ہیں۔

جیسے اہم مقام کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس تمام دورے میں یہ پہلا مقام تھا جہاں کسی شخص نے ہماری آمد سے دلچسپی نہیں لی۔

تین بجے کے قریب ہم واپس ہوئے اور واپسی میں ہم نے کپتانی کا وہ عظیم منصوبہ بھی دیکھا جو کرنا فلی کثیر المقاصد منصوبہ ترقی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ منصوبہ واقعی بڑے اہم مقاصد کا حامل ہے۔ سب سے بڑا مقصد تو یہ ہے کہ کرنا فلی میں جو آئے دن سیلاب آتا ہے اس کا سد باب کیا جائے دوسرے اس دریا پر بند باندھنے سے جو پانی محفوظ ہوگا وہ کھیتی باڑی کے کام میں لایا جائے تیسرا اور سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ اس بند سے بجلی پیدا کی جائے۔ یہ منصوبہ ۱۹۵۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور جس رخاارے ہم نے کام ہونے دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ سالانہ چھ ہیلیے میں منصوبہ مکمل ہو جائے گا۔ اور تکمیل کے بعد پین بجلی سے ایک لاکھ بیس ہزار کلو واٹ بجلی پیدا ہو سکے گی، جس سے اضلاع دھاکا، میمن سنگھ، سلہٹ، تریبورا، نواکھالی اور چانگام کے ہر گاؤں میں بجلی کی روشنی پہنچ جائے گی اور توقعات کے مطابق خیراتی پاکستان کے ذریعہ کروڑوں سے زائد افراد اس سے فیضیاب ہو سکیں گے۔

یہ منصوبہ ۱۹۶۱ء کے آخر میں مکمل ہو چکا ہے۔ انسانی فکر اور مشینی طاقت نے یہاں بڑے بڑے پہاڑوں کو جس طرح کاٹا ہے اور دریاؤں کا رخ پھیر کر کپتانی کا عظیم و شہرہ مند جس طرح تعمیر کیا ہے اسے دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ کپتانی کا بند دیکھ کر ہم اس نوزائیدہ شہر سے گزرے، جہاں ہر طرف تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر ان گنت

۱۔ یہ بند انجینئری کے کمالات اور انسانی عدم تعاون کا بڑا عظیم کارنامہ ہے۔ اس پر ہضف کر دے زائد خرچ آیا ہے۔ ۸۰۰ ڈال کی محکم بنیادوں پر یہ بند مندر سے ۱۲۰ ڈال اونچا ہے اور دریائے کرنا فلی پر ۳۳ سو فٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ پانی کے بہاؤ کو روکنے اور نکلنے کے لئے ۱۲ آبی دروازے بنائے گئے ہیں جو خود کار مشینوں سے کنٹرول اور بند کئے جاسکتے ہیں۔ خشکی کے زمانے میں جس قدر پانی کو بھروں کے ذریعہ کھیتوں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ ایک انسان کے مطابق اس پانی سے ایک لاکھ ایکڑ سے زائد زمین سیراب ہو سکے گی۔ اس ہند کی تعمیر جو افراد متاثر ہوئے ہیں انہیں نئی جگہوں پر آباد کر دیا گیا ہے۔

رزم و بزم کے عیت گھاتے پھرتے ہیں۔ عورتوں کو بھولوں سے بھی عشق ہے اور گھینے پاتوں سے بھی، جو عورت چاندی کے ہوتے ہیں۔ مرد اور عورتیں کافی صحت مند اور جفاکش ہیں۔ چکنے کشی تیراکی اور رس کشی کے کھیلوں سے خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

پہاڑی علاقے کے گھنے جنگلوں میں بانس اور قیمتی لکڑی کے علاوہ ہاتھی، شیر، چیتے وغیرہ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگل کاکس بازار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہی جنگلوں سے انہی خاص طریقوں سے پکڑے جاتے ہیں جسے "کھیدا" کہتے ہیں۔

ہمارے آنے سے چند روز قبل چانگنام کے پہاڑی علاقوں میں کثرت سے بارش ہو چکی تھی جس کے سبب رانگامانی جانے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ دریائی سفر سے تقریباً ۱۲ گھنٹے صرف ہوتے مگر ہمارے دورے کا پروگرام بڑا محدود تھا اس لئے خواہش کے باوجود ہم رانگامانی تک نہ جاسکے۔ راستہ میں ایک خوبصورت مقام پر دریائے کرناٹکی اور سرسبز پہاڑوں کے پس منظر میں سفید صاحب نے گروپ فوٹو لے کر سفر کے ان لمحوں کو یادگار بنا دیا۔ یادوں کے نقش تو کبھی کبھی دھندلا بھی جاتے ہیں لیکن نقوشیروں کے نقش یادوں کے چراغ کی مانند ہمیشہ جلتے ہی رہتے ہیں۔ وقت اور زمانے کی گرفت سے آزاد۔

پہاڑی راستوں سے گزر کر ہم ایک اور دوراہے پر آئے جہاں سے کاکس بازار کو راستہ جاتا تھا اور جو اس وقت بارش کے سبب ناقابل گزر تھا۔

کاکس بازار: چانگنام کی پہاڑیوں کا سلسلہ براہ کی سرحد کے ساتھ ساتھ میلوں جنوب تک چلا گیا ہے، جہاں ساحل پر مشہور تفریحی مقام کاکس بازار واقع ہے۔ کاکس بازار کا ساحل ۶ میل لمبا ہے۔ اور یہ دنیا کا سب سے لمبا ساحل مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں ایک انگریز مہم جو، مشر کاکس نے یہاں آنے کے بعد ایک موگھ گاؤں کے چار طرف لکڑی کے جنگلے کھڑے کر دیے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ ایک اہم چھاؤنی بھی بن گیا تھا۔ اور جاپانیوں نے اس پر ۶۶ مرتبہ بم برسائے۔ چانگنام سے یہاں اسٹیمر کے ذریعہ بھی آسکتے ہیں اور ہوائی جہاز سے بھی۔ کھٹائی اور چند رگونا کے درمیان ہمیں (باقی صفحہ پر)

چھانگام عورتیں بڑی ہنرمند ہوتی ہیں۔ جھٹنا، کاتنا، رنگنا، گھڑوں کو سنبھالنا کھیتیں پر مردوں کا ہاتھ پٹانا ان کے محبوب شغل ہیں۔ جاڑوں میں یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور گرمیوں میں جنگل کی قیمتی لکڑی اور بانس کاٹتے ہیں۔ سادہ لباس، سادہ زندگی اور سادہ غذا اس قبیلے کی خصوصیات ہیں۔ مرد ٹخنوں تک لنگوٹیں ہی باندھتے ہیں۔ عورتیں اسکرٹ اور بلاؤز کی طرز کا ایک لباس پہنتی ہیں۔ تن کن ساڑی کا رواج بھی عام ہو رہا ہے۔ یہ تمام کپڑے گھروں میں ہی تیار ہوتے ہیں۔ چاول ان کی خاص غذا ہے۔ جانوروں کا گوشت بھی استعمال کرتے ہیں اور تبا کو بہت زیادہ پیتے ہیں۔ سال کے سال چیت کے موسم میں چودھویں رات کو یہ لوگ ایک بڑا جشن مناتے ہیں جسے "مٹھن مانا" کہتے ہیں۔ تہوار کے موقعوں پر چاول کی شراب پی جاتی ہے۔ اچھے اچھے کھانے پکاتے ہیں۔ بدھ مذہب پر عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کی عبادت کے طریقے ہندوؤں کی پوجا پاٹ سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔

قبیلے میں شادی بیاہ کی عجیب و غریب رسمیں رائج ہیں۔ اسی طرح پیدائش اور موت پر بھی یہ اپنی دیرینہ روایات پر ہی عمل پیرا ہیں۔ شادی کے موقع پر دولہا کے بائیں جانب دلہن بیٹھتی ہے۔ رشتہ داروں میں سے ایک مرد ایک عورت دولہا دلہن کو کمرے باندھ دیتے ہیں۔ گرہ لگانے سے پہلے شادی میں شرکت کرنے والے حاضرین سے اجازت حاصل کی جاتی ہے۔ گرہ کے بعد دونوں اپنے خاندان کے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور وہ چاول، روٹی، گھاس، وغیرہ ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور دعا دیتے ہیں۔ گھاؤں کا بجا باری شادی کی یہ تمام رسمیں انجام دیتا ہے۔ لڑکے کی پیدائش کے وقت دو مرتبہ ہندو ق چلائی جاتی ہے اور لڑکی کی پیدائش پر ایک بار۔ قدرتی موت پر چکنی عام طور پر لاش کو جلاتے ہیں لیکن وبائی امراض میں مرنے والوں کو دفن کر دیا جاتا ہے اور سات دن تک مرنے والے کا سوگ رہتا ہے۔ اس دوران میں گوشت، انڈے، اور پھل کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ لڑکے سر کے بال منڈوا دیتے ہیں۔ اور کئی مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں تاکہ مرنے والے کی روح کو اطمینان نصیب ہو۔

قبیلے کے مرد اور عورتیں ذوق بطیف سے بھی عاری نہیں۔ بانسری ان کی مقبل عام موسیقی ہے اور بانسری بجانے میں مرد اور عورتیں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ گویئے گاؤں گاؤں گھومتے اور

سُرِیلی کہانیاں

ظفر حسین

راگ راگیاں کا نون میں رس گھولتی ہیں۔ اسی طرح وہ سُرِیلی کہانیاں بھی جو ہر حال کے رسیا گانے والوں سے غلط رکھتی ہیں۔ اور پھر بڑوں سب کے لئے لچک کا باعث ہیں۔ اس لئے مضمون نگار نے انہیں کچھ ایسے ہی کہہ دئے ہیں سب اس سے بے لطف اندوز ہو سکیں۔ (ادارہ)

گزرتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب پرندے کی چوچ سے اسی طرح سات پر پیدا ہوتے ہیں تو ان سروں کے پیدا ہونے ہی اُس پرندے کے گھونسلے میں آگ لگ جاتی ہے جس میں وہ پرندہ جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ پرندے کی اس خاک سے کچھ عرصے بعد دج و دایک اندھا پیدا ہوتا ہے جس میں سے پھر ایک موسیقار پیدا ہوتا ہے۔ یہ پرندہ ہمارا ہر کسی طرح گھاس بھوس کا گھونسلہ بنا تا ہے اور پھر جل کر خاک ہو جاتا ہے غرض اس طرح یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

انسان نے اس پرندے کی چوچ سے نکلے ہوئی آوازوں ہی سے سنا سروں کا خیال لیا اور انہیں سروں کے بھرے سے دنیا بھر کی موسیقی بنی ہے۔ موسیقی کو لفظ، ذرا ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دنیا کی اکثر زبانوں میں بھلا اور یہ لفظ اسی پرندے کے نام سے بنایا گیا ہے۔ ہمارا اپنی زبان میں بھی گانے بجانے کے علم کو علم موسیقی ہی کہتے ہیں۔

موسیقی نے کس طرح جنم لیا اور کس طرح یہ نام پایا یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا۔ اب میں دور پرے کی باتیں چھوڑ کر اپنی ہی کہانیاں سناتا ہوں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے موسیقار پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اس فن میں جو نام پیدا کیا اس کی داستان بھی سننے والی ہے۔ سب سے پہلے میں خلیفہ ہارون رشید کے درباری گوہر کا قصہ آپ کو سناتا ہوں، ابراہیم موصلی،

تم نے خلیفہ ہارون رشید کا نام تو سنا ہی ہو گا۔ خلیفہ اپنے زمانے میں بہت سے علوم اور فنون کی سرچھی کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے دربار میں جہاں بڑے بڑے ادیب اور شاعر جمع ہوتے تھے وہاں موسیقی کی محفلیں بھی بڑی شان و شوکت کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے کا سب سے

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ گانے کی آواز عام بول چال کی آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی لئے گانے کی آوازوں کو سُرِیلی آوازیں کہتے ہیں۔ یہ آواز یہ تعداد میں کل سات ہوتی ہیں، جنہیں ہم سُرِی کہتے ہیں ہر سُرِی دن بے شمار آوازیں سننے رہتے ہیں۔ مثلاً انجن کی سیٹی کی آواز۔ موٹر کے بارن کی آواز۔ ہوائی جہاز کے اڑنے کی آواز۔ بندوب کی آواز۔ جانوروں اور پرندوں کی آوازیں، اور ہماری آپس کی بول چال کی آوازیں وغیرہ۔ لیکن یہ سب آوازیں سُرِیلی آوازیں نہیں۔ سُرِیلی آوازیں وہی ہیں جو ہم گانا گاتے وقت اپنے گلے سے نکالتے ہیں یا وہ آوازیں جو کسی موسیقی کے ساز سے نکلتی ہیں۔ موسیقی کی آوازیں انسان نے کس طرح دریافت کیں، اس کے بارے میں ہر ملک اور ہر قوم میں مختلف کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہوا و برہما کے سب سے بڑے دیوتا تھے، کے دربار میں کچھ دیوتے اور کچھ پریاں۔ پرلوں کی آواز باریک تھیں اور دیوؤں کی آوازیں بھاری تھیں۔ ہوا دیوتے انہیں آوازوں سے مختلف سروں کو چن لیا اور بعد میں یہ سُرِیلی انسانوں کو سکھا دیئے۔ لیکن ان سروں کے بارے میں سب سے مزید احکامیت یونانیوں میں پائی جاتی

موسیقار:

وہ حکایت یہ ہے کہ موسیقار نامی ایک پرندہ ہوتا ہے۔ اس پرندے کی چوچ میں سات سوراخ ہوتے ہیں۔ یہ پرندہ ایک خاص موسم میں گھاس بھوس کا گھونسلہ بنا کر اس میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس وقت پرندہ کی چوچ کے سوراخوں میں سے ہوا ہو کر گزرتی ہے تو سات سُرِیلی پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب ہوا کسی سوراخ میں سے ہو کر گزرتی ہے تو اس سے آواز ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً بانسری کے سوراخوں سے جب ہوا

رزم و بزم کے گیت گاتے پھرتے ہیں۔ عورتوں کو پھولوں سے بھی عشق ہے اور گھنٹے پاتوں سے بھی، جو عموماً چاندی کے ہوتے ہیں۔ مرد اور عورتیں کافی صحت مند اور جفاکش ہیں۔ چمکے کشمی تیراکی اور رس کشی کے کھیلوں سے خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

پہاڑی علاقے کے گھنے جنگلوں میں بانس اور قیمتی لکڑی کے علاوہ ہاتھی، شیر، چیتے وغیرہ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگل کاکس بازار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہی جنگلوں سے آگے خاص طریقوں سے پکڑے جاتے ہیں جسے "کھیدا" کہتے ہیں۔

ہمارے آنے سے چند روز قبل چانگنام کے پہاڑی علاقوں میں کثرت سے بارش ہو چکی تھی جس کے سبب رائگاں مانی جانے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ دریائی سفر سے تقریباً ۱۲ گھنٹے صرف ہوتے مگر ہمارے دورے کا پروگرام براہمہدود تھا اس لئے خواہش کے باوجود ہم رائگاں مانی تک نہ جاسکے۔ راستہ میں ایک خوبصورت مقام پر دریائے کرنا فنی اور سرسبز پہاڑوں کے پس منظر میں سفید صاحب نے گروپ فوٹو لے کر سفر کے ان لمحوں کو یادگار بنا دیا۔ یادوں کے نقش تو کبھی کبھی دھندلا بھی جاتے ہیں لیکن تصویروں کے نقش یادوں کے چراغ کی مانند ہمیشہ جلتے ہی رہتے ہیں — وقت اور زمانے کی گرفت سے آزاد۔

پہاڑی راستوں سے گزر کر ہم ایک اور دروازے پر آئے جہاں سے کاکس بازار کو راستہ جاتا تھا اور جو اس وقت بارش کے سبب ناقابل گزر تھا۔

کاکس بازار: چانگنام کی پہاڑیوں کا سلسلہ براہی کی طرح کے ساتھ ساتھ میلوں جنوب تک چلا گیا ہے، جہاں ساحل پر مشہور تفریحی مقام کاکس بازار واقع ہے۔ کاکس بازار کا ساحل ۷ میل لمبا ہے۔ اور یہ دنیا کا سب سے لمبا ساحل مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں ایک انگریز مہم جو، مشر کاکس نے یہاں آنے کے بعد ایک موگہ گاؤں کے چار طرف لکڑی کے جنگلے کھڑے کر دیے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ ایک اہم جہاز بنی بھی بن گیا تھا۔ اور جاپانیوں نے اس پر ۶ مرتبہ بم برسائے۔ چانگنام سے یہاں اسٹیمر کے ذریعہ بھی آسکتے ہیں اور ہوائی جہاز سے بھی۔ کھٹائی اور چند رگونا کے درمیان ہمیں (بانی مسٹر پرا)

چانگنام عورتیں بڑی ہنرمند ہوتی ہیں۔ مینا، کاتنا، رنگنا، گھول کو سناہان کھیتیں پر مردوں کا ہاتھ بٹانا ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ جاڑوں میں یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور گرمیوں میں جنگل کی قیمتی لکڑی اور بانس کاٹتے ہیں۔ سادہ لباس، سادہ زندگی اور سادہ غذا اس قبیلے کی خصوصیات ہیں۔ مرد سونوں تک لنگوٹی ہی باندھتے ہیں۔ عورتیں اسکرٹ اور بلاؤڈ کی طرز کا ایک لباس پہنتی ہیں۔ آبنائے ساری کارواج بھی عام ہوتا ہے۔ یہ تمام کپڑے گھروں میں ہی تیار ہوتے ہیں۔ چاول ان کی خاص غذا ہے۔ جانوروں کا گوشت بھی استعمال کرتے ہیں اور تبا کو بہت زیادہ پیتے ہیں۔ سال کے سال چیت کے موسم میں چودھویں رات کو یہ لوگ ایک بڑا جشن مناتے ہیں جسے "مغن مانا" کہتے ہیں۔ ہتھوڑے کے موقعوں پر چاول کی شراب پی جاتی ہے۔ اپنے اپنے کھانے پکھتے ہیں۔ بدھ مذہب پر عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کی عبادت کے طریقے ہندوؤں کی پوجا پاٹ سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔

قبیلے میں شادی بیاہ کی عجیب و غریب رسمیں رائج ہیں۔ اسی طرح پیدائش اور موت پر بھی یہ اپنی دیرینہ روایات پر ہی عمل پیرا ہیں۔ شادی کے موقع پر دولہا کے بائیں جانب دلہن بیٹھتی ہے۔ رشتہ داروں میں سے ایک مرد ایک عورت دولہا دلہن کو کمرے باندھ دیتے ہیں۔ گرہ لگانے سے پہلے شادی میں شرکت کرنے والے حاضرین کے اجازت حاصل کی جاتی ہے۔ گرہ کے بعد دونوں اپنے خاندان کے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور وہ چاول، مدنی، گھاس، وغیرہ ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور دعا دیتے ہیں۔ بکاؤں کا بجا رہی شادی کی یہ تمام رسمیں انجام دیتا ہے۔ لڑکے کی پیدائش کے وقت دو مرتبہ بندوٹ چلائی جاتی ہے اور لڑکی کی پیدائش پر ایک بار۔ قدرتی موت پر چٹکا عام طور پر لاش کو جلاتے ہیں لیکن وبائی امراض میں مرنے والوں کو دفن کر دیا جاتا ہے اور سات دن تک مرنے والے کا سوگ رہتا ہے۔ اس دوران میں گورنمنٹ، انڈے، اور جھیلی کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ لڑکے مرنے کے بال مندوا دیتے ہیں۔ اور کئی مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں تاکہ مرنے والے کی روح کو اطمینان نصیب ہو۔

قبیلے کے مرد اور عورتیں ذوقِ بطیف سے بھی عاری نہیں۔ بانسری ان کی مقبول عام موسیقی ہے اور بانسری بجانے میں مرد اور عورتیں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ گویے گاؤں گاؤں گھومتے اور

سُرِیلی کہانیاں

طفہ حسین

راگ و گیتوں کا فن میں رس گھولتی ہیں۔ اسی طرح وہ سرِیلی کہانیاں بھی ہر سزا کے رسیا گانے والوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور چھوٹے بڑوں سب کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ اس لئے مضمون نگار نے انہیں کٹھا بھی ایسے ہے کہ چھوٹے بڑے سب اس سے لطف اُدرنے میں سکیں۔ (ادارہ)

گدزرتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب پرندے کی چوچ سے اسی طرح سات سر پیدا ہوتے ہیں تو ان سروں کے پیدا ہوتے ہی اُس پرندے کے گھونسلے میں آگ لگ جاتی ہے جس میں وہ پرندہ جل جھن کر خاک ہو جاتا ہے۔ پرندے کی اس خاک کے کچھ عرصے بعد درخت و دریا ایک انداز پیدا ہو جاتے ہیں جس میں سے پھر ایک موسیقار پیدا ہوتا ہے۔ یہ پرندہ بڑا ہو کر اسی طرح گھاس پھوس کا گھونسلہ بنا تا ہے اور پھر جل کر خاک ہو جاتا ہے غرض اس طرح یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

انسان نے اس پرندے کی چوچ سے نکلی ہوئی آوازوں ہی سے سنا سروں کا خیال لیا اور انہیں سروں کے نور سے دنیا بھر کی موسیقی بنی ہے۔ موسیقی کا لفظ ذرا ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دنیا کی اکثر زبانوں میں نکلا اور یہ لفظ اتنی پرندے کے نام سے بنایا گیا ہے۔ ہمارے اپنی زبان میں بھی گانے جلنے کے علم کو علم موسیقی ہی کہتے ہیں۔

موسیقی کے کس طرح جنم لیا، در کس طرح یہ نام پایا یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا۔ اب میں دو پرے کی باتیں چھوڑ کر اپنی کہانیاں سناتا ہوں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے موسیقار پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اس فن میں جو نام پیدا کیا اس کی داستان بھی سننے والی ہے۔ سب سے پہلے میں خلیفہ ہارون رشید کے درباری گوتے کا قصہ آپ کو سناتا ہوں، ابراہیم موصلی،

تم نے خلیفہ ہارون رشید کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ یہ خلیفہ اپنے زمانے میں بہت سے علوم اور فنون کی سرچھی کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے دربار میں جہاں بڑے بڑے ادیب اور شاعر جمع ہوتے تھے وہاں موسیقی کی محفلیں بھی ٹہری شانِ شوکت کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے کا سب سے

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ گانے کی آواز عام بول چال کی آواز سے مختلف ہوتی ہے، اسی لئے گانے کی آوازوں کو سرِیلی آوازیں کہتے ہیں۔ یہ آوازیں تعداد میں کل سات ہوتی ہیں، جنہیں ہم سُر کہتے ہیں۔ ہم آٹھ دن بے شمار آوازیں سنتے رہتے ہیں۔ مثلاً آغون کی سیٹی کی آواز۔ موٹر کے ہارن کی آواز۔ ہوائی جہاز کے اڑنے کی آواز۔ بندوبست کی آواز۔ جانوروں اور پرندوں کی آوازیں، اور ہماری آپس کی بول چال کی آوازیں وغیرہ۔ لیکن یہ سب آوازیں سرِیلی آوازیں نہیں۔ سرِیلی آوازیں وہی ہیں جو ہم گانا گانے وقت اپنے گانے سے نکالتے ہیں یا وہ آوازیں جو کسی موسیقی کے ساز سے نکلتی ہیں۔ موسیقی کی آوازیں انسان نے کس طرح دریافت کیں، اس کے بارے میں ہر ملک اور ہر قوم میں مختلف کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جہا دیو، جو ان کے سب سے بڑے دیوتا تھے، کے دربار میں کچھ دیوتے اور کچھ بریاں۔ پرلوں کی آواز باریک تھیں اور دیوؤں کی آوازیں بھاری تھیں۔ تہا دیو نے انہیں آوازوں سے مختلف سروں کو جنم لیا اور بعد میں یہ سُر انسانوں کو سکھا دیئے لیکن ان سروں کے بارے میں سب سے مزید احکامیت یونانیوں میں باقی جاتی

موسیقار:

وہ حکایت یہ ہے کہ موسیقار نامی ایک پرندہ ہوتا ہے۔ اس پرندے کی چوچ میں سات سوراخ ہوتے ہیں۔ یہ پرندہ ایک خاص موسم میں گھاس پھوس کا گھونسلہ بنا کر اس میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس وقت پرندے کی چوچ کے سوراخوں میں سے ہوا ہو کر گدزرتی ہے تو سات سُر پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب ہوا کسی سوراخ میں سے ہو کر گدزرتی ہے تو اس سے آواز ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً بانسری کے سوراخوں سے جب ہوا

اب آپ بھی ایسی ہی کوئی دھن متنائیں۔ مگر وہ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے بہت شرمندہ ہوا۔ باروں رشید کو یہ بات نامنی پڑی کہ اس وقت ابراہیم موصلی سے بڑھ کر کوئی دوسرا فنکار موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد خلیفہ نے اس کا رتبہ بھی بڑھا دیا اور ہر طرح ابراہیم موصلی کے فن کی قدر دانی کی!

شاہی قالین،

خلیفہ باروں رشید کا دور حکومت بہت اچھا تھا اور اسی وجہ سے لوگ عام طور پر بہت خوش حال اور دولت مند بھی تھے۔ میوں اور رسیوں کے عالی شان مکان تھے اور ہر طرت شعر و شاعری اور موسیقی کے چرچے تھے۔ خود خلیفہ باروں رشید کے دربار میں بہت سے اچھے اچھے گویے ملازم تھے۔ ان گویوں میں ابراہیم موصلی اور ابن جابر کی چنگ کا واقعہ بھی کہانی میں پڑھ چکے ہوں یہ کہانی سنو:

باروں رشید نے اپنے درباریوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا پہلے گروہ میں وزیر، شہزاد، عا اور بڑے بڑے فوجی حاکم ہوتے تھے جو بادشاہ کے قریب بیٹھتے تھے دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہوتے ہوتے تھے جو شاہی ندیم ہوتے تھے یعنی بادشاہ کے خاص دوست، ان کے علاوہ ادیب، شاعر، گانے والے اور دوسرے فن کار ہوتے تھے تیسرے گروہ میں ساز بجانے والے، بدمذہب یعنی لطیفے سنانے والے اور داستان سرا یعنی قصے سنانے والے اور اسی طرح کے فنکار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ساز بجانے والے نے جس کا نام برصوم تھا ساز بجانے والوں رشید کو بہت خوش کیا۔ باروں رشید نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا افغان تھا ہے۔ برصوم نے فوراً درخواست کی اُسے دوسرے درجے کے گروہ میں شامل کیا جائے۔ باروں رشید نے کہا کہ اگر وہ ابن جابر کی طرح فخریہ کار سنا دے تو اُسے یہ اعزاز بخشا جاسکتا ہے۔ برصوم نے فوراً ساز اٹھایا اور ابن جابر کی مخصوص دھنوں کو اس انداز سے بجا کہ خوابن جاتے بھی وہ وہ کہہ اٹھا۔ باروں رشید نے خوش ہو کر اُسے اسی گروہ کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا جس میں ابن جابر شامل تھا اور ساتھ ہی اُسے ایک بڑا قیمتی قالین بھی انعام میں دیا۔ برصوم یہ قالین لے کر خوش خوش اپنے گھر گیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خبر بھی سارے شہر میں پھیل گئی کہ اس کا رتبہ بلند کر دیا گیا ہے۔

بڑا گویا ابراہیم موصلی تھا۔ شروع شروع میں ابراہیم موصلی ایک بہت بڑا ادیب بھی تھا۔ لیکن ایک روز اس نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا کہ اس بزرگ نے موصلی سے کہا: ابراہیم، اگر تم شعر کی جگہ موسیقی کو اپنانے کی کوشش کرو تو تم دنیا کے بہت بڑے آدمی بن سکتے ہو اور تمہارا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہ سکتا ہے۔ اس بات کو سنتے ہی ابراہیم موصلی نے موسیقی سے یکطرفہ شروع کر دی۔ کچھ عرصہ بعد اس فن میں اس نے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ واقعی اس زمانے کے گانے والوں میں وہ سب سے بڑا استاد مان لیا گیا۔ ابراہیم کی کیفیت یہ ہو گئی کہ وہ ہر وقت موسیقی کی تاثیر میں ڈوبا رہتا تھا اور جب کسی گاتا تو لوگوں پر بھی گہری کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کچھ مدت بعد ابراہیم کو اپنے فن پر اس قدر مان ہو گیا کہ اس نے اپنے زمانے کے دوسرے فنکاروں سے ملنا جلتا تک بند کر دیا بلکہ بعض اوقات وہ خلیفہ کا حکم بھی ٹال جاتا۔ باروں رشید کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے ابراہیم کو نیچا دکھانے کی ایک ترکیب سوچی۔ اس نے اپنے ایک اور مستار گویے کو جس کا نام ابن جابر تھا، حکم دیا کہ وہ ابراہیم سے مقابلے کی کوشش کرے۔ ابن جابر جانتا تھا کہ ابراہیم کے مقابلے کی اُس میں تاب نہیں ہے۔ لیکن خلیفہ کے حکم کو نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے سے جہا ابراہیم کی محفلوں میں لایا جا لیا کرتا تھا چند ایسے راگ یاد کر لئے جن پر ابراہیم کو بڑا ناز تھا اور جو ابراہیم ہی کے بندے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس نے باروں رشید کی خدمت میں عرض کی کہ مقابلے کی محفل منعقد کر دی جائے۔ چنانچہ ایک جلسہ ہوا جس میں سب دیوانی جمع ہوئے۔ اور باروں رشید نے ابن جابر سے کہا کہ کچھ نئے نئے پیش کرو۔ ابن جابر نے ابراہیم کے بنائے ہوئے نئے نئے گانے اور کہا کہ میں نے یہ حال ہی میں اختراع کئے ہیں۔ اس کے بعد باروں رشید نے ابراہیم سے کہا کہ ان کے مقابلے پر آپ بھی کچھ نئے نئے سنائیے۔ ابن جابر سے ان نغموں کو سن کر ابراہیم خود بڑا حیران تھا مگر اس نے باروں رشید سے انتہائی کراہی کے بجائے کل اسے اپنا ہنر پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ باروں رشید نے یہ بات ان کی۔ ابراہیم نے گھر جا کر اپنی ایک نئی دھن ایجاد کی اور جب دوسرے دن ابراہیم نے یہ دھن دربار میں پیش کی تو اہل محفل اور خود خلیفہ باروں رشید پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ صبح کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ نغمہ ختم کرنے کے بعد ابراہیم نے ابن جابر کی طرف دیکھ کر کہا کہ

ایک گویا مرگیا اور ہاروں رشید نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا گویا مقرر کیا جائے۔ اسحاق نے موقع دیکھ کر بادشاہ سے دربار کی سفارش کی جس پر بادشاہ نے حکم دیا کہ ذریاب کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ اسحاق خوش خوش ذریاب کو لینے کے لئے آیا لیکن ذریاب نے دربار میں جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس دربار میں اپنے استاد کے ساتھ بیٹھ سکوں۔ بہت بھلے بھلے پر ذریاب نے کہا کہ وہ اس شرط پر جانے کے لئے تیار ہے کہ اس کے کسی خاص لفظ کی فرمائش نہ کی جائے بلکہ اپنی پسند کا نغمہ گلے کی اجازت دی جائے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ وہ اپنا ہی عود بجائے گا۔ دوسرے کسی عود کو بجانے کی شرط نہ لگائی جائے۔ کیونکہ دوسرا عود خود اس کے استاد کا تھا۔ اسحاق نے اس پر کہا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اور میں بادشاہ سے تجھے اپنا ہی نغمہ گلے اور اپنا ہی عود بجانے کی اجازت دلوا دوں گا۔ ذریاب ہاروں رشید کے دربار میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی اجازت کے بعد اس نے نغمہ الاپنا شروع کیا۔ اس کے گلے کا ایسا سماں بندھا کہ سدا درباری تو ایک طرف اسحاق بھی مہو ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اسے انداز نہ تھا کہ اس کا شاگرد اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ اس کے سامنے اب اس کا چراغ بھی جلنا مشکل ہے۔

خلیفہ ہاروں رشید نے ذریاب کے گلے سے خوش ہو کر اسے بہت کچھ انعام دیا اور اسی وقت اسے درباری گویوں کی صف میں شامل کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اسحاق کو ہدایت کی کہ وہ ذریاب کو تعلیم دینے میں اور زیادہ محنت کرے۔ اسحاق بظاہر تو دربار سے خوش ہو کر آیا لیکن اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ذریاب سے اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگا۔ ذریاب استاد کے دل کی بات سمجھ گیا اور ایک روز موقع پا کر فیاد سے نکل کھڑا ہوا اور قرطبہ میں جا کر آباد ہو گیا۔

قرطبہ کے خلیفہ نے ذریاب کی بڑی عزت کی اور اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ کہتے ہیں آج کل اسپین کی موسیقی پرچوری موسیقی کا اثر نظر آتا ہے وہ سب ذریاب ہی کے فنون کا اثر ہے۔

حکیم بوعلی سینا،

حکیم بوعلی سینا کا نام کس نے نہیں سنا ہے۔ ان کا اصل نام

اس خبر کو سن کر بہت سی عورتیں برصوم کی ماں کو مبارکباد دینے کے لئے آئیں۔ ماں نے خوشی میں اس قالین کو کھڑے کھڑے کر ڈالا اور ہارنے والی کو ایک ٹکڑا دے دیا جب برصوم گھر آیا تو یہ دیکھ کر بڑا پریشان ہوا کہ بادشاہ کے عطا کئے ہوئے قالین کے ٹکڑے کھڑے کر دئے گئے ہیں۔ اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کیونکہ بادشاہ کے دئے ہوئے انعام کو اس طرح چیز یا بھڑا یا ایک طرح بادشاہ کی توہین کر رہی تھی۔ برصوم اسی فکر میں رہنے لگا کہ بادشاہ کی ناراضی سے کس طرح بچا ایک روز اس نے ایک خاص نغمہ تیار کیا اور دربار میں بجایا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ایک بار پھر اس سے پوچھا کہ اسے کیا انعام دیا جائے اس پر برصوم نے کہا کہ "جان کی امان!" بادشاہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکا اور حکم دیا کہ وہ اپنا مطلب صاف صاف بیان کرے۔ اس پر برصوم نے قالین کے ٹکڑے کھڑے کر دینے کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ تو بادشاہ یہ واقعہ سن کر بہت مہنسا۔ اور برصوم کو ایک اور قالین عطا کر دیا اور اس کی ماں کی خطا بھی معاف کر دی۔

ذریاب :

ہاروں رشید کے دربار کا ایک نامی گویا اسحاق بھی تھا۔ دراصل یہ ابراہیم موسیقی کا بیٹا تھا اور اس نے فن موسیقی اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ ابراہیم موسیقی کے بعد ہاروں رشید نے اسحاق کو اپنا درباری گویا مقرر کر دیا تھا۔ اسحاق کا ایک شاگرد تھا جس کا نام ذریاب تھا اسحاق اپنے اس شاگرد کو بہت محنت سے تعلیم دیتا تھا اور بہت خوش ہوتا تھا کہ ذریاب رفتہ رفتہ فن موسیقی میں بڑی ترقی کر رہا ہے۔ ذریاب کو اس فن سے اس قدر لگاؤ تھا کہ استاد کی بتائی ہوئی چیزوں پر بے حد محنت کرتا تھا یہاں تک کہ وہ بعض نغموں کے گانے میں تو استاد سے بھی باری لے گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنے کمال کو کبھی استاد پر ظاہر نہیں ہونے دیا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ جہاں اس کا استاد اس پر بے حد مہربان ہے وہاں وہ حدود وجہ سالادی بھی ہے یعنی دوسرے فنکاروں سے جلتا بھی ہے اور یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا شاگرد اس سے بڑھ جائے یا اس کے مقابلے کا ہو جائے۔ ایک زمانے تک ذریاب اپنے استاد، اسحاق سے تعلیم لیتا اور مشتق کرتا رہا۔ اتفاق سے ہاروں رشید کے دربار کا

تو بہت لمبا چوڑا ہے۔ مگر عام بول چال میں "حکیم بوعلی سینا" کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ ان کا لمبا نام بھولنے کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ایسے ہی بڑے بڑے نام رکھے جاتے تھے تاکہ لوگوں کے حسب نسب کا پتہ چل جائے۔ ان کا نام تھا "ابوعلیٰ الحسین ابن عبداللہ بن حسن ابن علی ابن سینا" مغربی ملکوں کے لوگوں نے اپنی بولی میں انہیں "اوی سینا" کہنا شروع کر دیا۔ ان کی طبی کتابوں سے یورپ والے عرصہ دراز سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکیم بوعلی سینا اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم، فاضل اور بڑے سائنس دان تھے۔ اس زمانے کے علموں میں کوئی ایسا علم نہیں تھا جس پر انہیں پوری پوری قدرت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ وہ فلسفہ، منطق، تاریخ، مختلف زبانیں، طب، علم نجوم، نہایت اور علم موسیقی سب ہی کے زبردست عالم تھے۔ ان کی زندگی بھی عجیب و غریب تھی۔ کبھی کبھی انہیں غریبی اور افلاس کا منہ دیکھنا پڑا، تو کبھی بھی وہ وزارت کے عہدے تک پہنچ گئے۔ علم طب پر جو تحقیق حکیم بوعلی سینا نے کی ہے وہ آج بھی طبی وقت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ حکیم بوعلی سینا وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انسانی جسم کو چیر بھاڑ کر اس کے اندرونی اعضا کا معائنہ کیا۔ اس طرح وہ علم تجربات کے بھی باوا آدم مانے جاتے ہیں۔ ان کی طب اور تجربات کی قابلیت کے بارے میں بے شمار داستانیں مشہور ہیں۔ سنتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی عورت چلتے چلتے گر کر مر گئی۔ لوگوں نے حکیم بوعلی سینا کو اس بات کی اطلاع دی تو وہ فوراً دوڑے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں وہ عورت پڑی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک سو فی صد گائی اور اسے اس عورت کے جسم میں ٹھونپ دیا اور وہ عورت پھر سے زندہ ہو گئی! ممکن ہے کہ یہ بات افسانہ ہی ہو۔ کم از کم اس بات کی وجہ جو حکیم بوعلی کی زبانی نقل کی گئی ہے وہ یقیناً ایک افسانہ ہے مگر سنا ہے کہ آج کل کے سرجین بھی بعض اوقات دل کی حرکت بیکاریک بند ہو جانے پر دل میں سوئی چھوڑتے ہیں، جس سے اکثر مرے ہوئے انسانوں میں جان آجاتی ہے۔

بہر حال قصہ یہ ہے کہ حکیم بوعلی سینا نے مختلف علموں پر قدرت حاصل کر لی تھی لیکن انہیں "حکیم" کا خطاب عطا نہ ہوا تھا۔ اس لئے کہ وہ لوگ جو ان کے مخالف تھے وہ ہر موقع پر ان میں کسی نہ کسی علم کی کمی بتا دیا کرتے تھے اور بے جا اسے بوعلی سینا کو وہ علم حاصل

کرنا پڑتا تھا۔ ایک موقع پر ان کے ایک دشمن نے بادشاہ وقت سے کہا کہ بوعلی سینا زبان عربی سے واقف نہیں۔ ان کی طبیعت اس زبان میں ایسی نہیں کہ انہیں حکیم کا لقب دیا جاسکے۔ حکیم بوعلی سینا اس حوالہ سے اتنے شرمندہ ہوئے کہ انہوں نے تین سال کی محنت میں اس زبان پر ایسی قدرت حاصل کر لی کہ ایک کتاب لکھی جس کا نام "لسان العرب" ہے یعنی عربیوں کی زبان۔ حکیم بوعلی سینا نے چند ایک ایسی ہی اور کتابیں بھی عربی زبان میں تصنیف کیں، دران کتابوں کی جلدیں بنوا کر ان پر خاک مٹی لگا دی تاکہ وہ بہت پرانی معلوم ہوں۔ اس کے بعد یکتا ہی بادشاہ کو دیں کہ وہ انہیں ان صاحب کو دکھائیں جنہوں نے ان کی زبان پر اعتراض کیا تھا، اور کہیں کہ یہ کتابیں کبھی جنگل میں سے ملی۔ اور کسی پرانے عالم کی تصنیف معلوم ہوتی ہیں۔ ان صاحب نے ان کتابوں کو کئی روز تک غور سے پڑھا اور اس کے بعد بادشاہ سے کہا کہ یہ کسی ایسے آدمی کی تصنیف ہیں جو عربی زبان کا مستند عالم ہے۔ اس کے بعد یہ بات ظاہر کر دی گئی کہ یہ کتابیں حکیم بوعلی سینا کی تصنیف کی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایک بار ان پر اعتراض کیا گیا کہ وہ علم موسیقی کے ماہر نہیں ہیں، اور ایسے شخص کو جو اس علم کا ماہر نہ ہو اور اس کا مظاہر نہ کر سکے۔ حکیم کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔ حکیم بوعلی کو علم موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ بدستور ہونے کی وجہ سے سگا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اس اعتراض سے بچنے کے لئے حکیم بوعلی نے ایک ساز ایجاد کیا اور اس کے بجائے کی مشق شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد اس ساز کے بجانے میں انہوں نے خوب کمال حاصل کر لیا ایک روز دربار میں موسیقی کی محفل ہوئی تو اس وقت کے باکمال لوگوں نے اپنا اپنا ہنر پیش کیا۔ رئیس وقت حکیم بوعلی سے ہر ایک کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور بوعلی ہر ایک کے فن میں کوئی نہ کوئی عیب بکمال دیا کرتے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے چڑ کر کہا کہ باکمال لوگوں کی عیب جوئی وہ کرے جو خود صاحب کمال ہو۔ بوعلی سینا کو یہ بات زریع نہیں دیتی۔ حکیم بوعلی اس موقع کے منتظر ہی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا کمال پیش کرنے کی

اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر بوعلی نے "سینائی" پر وہ نغمے بجانے شروع کئے جو اس سے پہلے دوسرے لوگ نہیں سنا سکتے تھے۔ اور ان نغموں کو کچھ اس طرح بھایا کہ سننے والے بہت ہوت ہو کر رہ گئے۔ حکیم بوعلی کی اس ایجاد کا نام "سینائی" رکھا گیا جواب "سینائی" کے نام سے مشہور ہے۔

نظارے

ستیا احمد رفعت

مارنے والا چھوڑے۔

ظفر: سیدی طرح مونگ پھلیاں دے دو۔
شاگرد: نہیں دوں گی نہیں دوں گی۔ دیکھوں میرا کیا کرتا ہے۔
ظفر: نہیں دوں گی، ابھی جا کر اماں سے کہتا ہوں اماں
شاگرد: جا... کہہ دے۔ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ کہہ دے۔
بدلتیز کل خود بیٹھا ہوا ٹھونس رہا تھا۔ ہم نے مانگیں،
بھیا دو پاڑیں بھی دیکھ تو منہ بنا لیا۔ اب ندیدہ بن کر گیا،
... (منہ ہٹا کر) آ پا مونگ پھلیاں ہیں بھی دو.....
جا نہیں دیتی۔

ظفر: (زبردستی کہتے ہوئے) ابھی نہیں دوں گی..... دیکھو
دے دو..... (زچ سا ہو کر) یہ تم.....
شاگرد: اف اللہ۔ ظفر کے بچے، دیکھ میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔
اف اللہ۔ دیکھ میں تیرے ہاتھ پر کاٹ کھاؤں گی۔
اس عرصے میں ظفر شاگرد سے زبردستی کچھ مونگ پھلیاں
چھین لیتا ہے)

ظفر: ہوں!!... دیکھا آپا جان صاحبہ کیسے مزے سے
یہ مونگ پھلیاں لے لیں تم سے۔
شاگرد: اف۔ ظفر۔ دیکھ میں روئے لگوں گی..... میری ساری
کلائی..... بدلتیز کہیں کا.....

ظفر: (مونگ پھلیاں چھیل کر کھاتے ہوئے) کیسی مزے دار ہیں
..... آہا ہا..... واہ! یہ دیکھو آپا کیسی بخنی ہوئی
ہیں۔

شاگرد: دیکھ ظفر مجھے واپس کر ساری مونگ پھلیاں در نہ.....
(ظفر کی طرف جھپٹنا چاہتی ہے)

کردار:

ندیں: بڑی ہیں۔ عمر تقریباً ۱۸ سال
لسری: چھوٹی ہیں۔ عمر تقریباً ۱۶ سال
حامد: ان کا بھائی۔ عمر تقریباً ۲۲ سال
شاگرد: ایک لڑکی۔ عمر تقریباً ۱۲ سال
ظفر: اس کا چھوٹا بھائی۔ عمر تقریباً دس سال
خالہ: شاگردہ اور ظفر کی ماں: نوکرانی۔

★

(جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو ایک کونٹھی کا ڈرامٹک
روم نظر آتا ہے جو واجبی سامان سے آراستہ ہے۔ اس کے
عقب میں اور دائیں جانب ملحقہ کمروں کے دروازے
نظر آ رہے ہیں۔ بائیں جانب باہر سے آنے کا راستہ
ہے.....)

شاگردہ معمولی لباس پہنے جس سے اس کی غریب
نمایاں ہے۔ ایک المٹری معمولی شکل صورت کی لڑکی
باہر کے دروازے پر بھاگتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے
پیچھے اس کا بھائی ظفر بے کھدے کپڑے پہنے۔ شاگردہ کے
پیچھے دوڑ کر آتا ہے۔ اور شاگردہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے
اور کہتا ہے۔)

ظفر: دیکھ آپا کی بچی۔ تیری ناک پر ایسا گھونسلہ مارا ہے

یہ لمبی لمبی سی ناک سب پچک کر رہ جائے گی۔
شاگردہ: (خود کو بچھڑاتے ہوئے) اولانے دوسرے ہاتھ کی ٹمھی کو
اگ کر کے ہونٹوں میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔ بڑا آیا گھونسلہ

زریں: ارے خالہ - خالہ - خالہ اف خالہ تو نہیں ہے۔
شاگرد کو اس کی ماں سے چھڑاتی ہے۔

خالہ: دوامت میں کس اس سے تو بہتر ہے کہ یہ نہ جانا ہے۔
زریں: ارے خالہ ... خدا کے لئے اس طرف تو نہ کو سو۔
آخر کیا کیا اس نے؟

خالہ: بس بیٹی۔ میں تو اس لڑکی سے تنگ آگئی ہوں مگر خدا
ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپریشن ہو گا۔ اور یہ مونگ پھلی
کھاتی پھر رہی ہے۔ اب میں یہاں تمہارے ہاں تو کڑی
کروں یا اس موٹی کو ہسپتال لے کر پھروں۔

زریں: ہسپتال لے کر میں چلی جاؤں گی۔ یہ کونسی بات
ہے۔ (ایک دم موڈ بدل کر) کیوں شاگرد! میرے
کہا تھا۔ کہ تم میرے گھر سے باہر نہ نکلتا۔ پھر تم کیوں
آئیں یہاں بچہ چلو جا کر پڑھو۔
خالہ: اے بیٹی! بس پڑھ لیا اس نے اب... یہ کیا پڑھے گی۔
اما کی لڑکی تو ماما ہی بنے گی۔

زریں: اوہ خالہ! تم دیکھو تو کچھ دن۔ آخر میں نے تم سے وعدہ
کیا ہے شاگرد کو وہ لڑکی بنا دوں گی کہ تم شخص اس کی مثالیں
دیا کرے گا شاگرد سے! جاؤ۔ چلو۔ جا کر پڑھو۔
شاگرد: بے پائی اندر کے گھر کی طرف جاتے گئے ہیں
خالہ: بارہ سال کی لڑکی! اور اماک کو نہ دھنا نہیں آتا۔
جب کسی کام کو کہو، فوراً ٹوڑاٹھ سے جواب دے
دے گی۔

زریں: (شاگرد سے) سنو شاگرد! شاگرد دروازے کے
قریب تک جاتی ہے! اب میں تمہاری اماں سے تمہاری
کوئی حکایت نہ سنوں۔ کیا سمجھیں! بس جاؤ جا کر فوراً
سبق پڑھو!

(شاگرد کسی قدر اٹھٹھاتی مسکراتی ہوئی گھر کے
اندھڑی جاتی ہے)

خالہ: بیٹی! تم میرے بچوں کا جتنا خیال کرتی ہو۔ میں
کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔

زریں: واہ خالہ! انم بھی تو ہمارے گھر میں اتنا کام کرتی ہو۔

ظفر: دیکھو آپ! میری طرف مت آنا۔ ورنہ ابھی تو تمہاری ایک
ہی پوڑی ٹوٹی ہے۔ کہیں یہ سب ہی شہید نہ ہو جائیں۔

شاگرد: اوہ! خون بھی ٹوٹ گیا! یہ دیکھو!
ظفر: اب دیکھ لیا تم نے کتنا بہادر ہے تمہارا بھائی!! ... ہا ہا ہا
... بڑی مزے دار ہیں آپا ... (مونگ پھلیاں کھلتے
ہوئے) یہ مونگ پھلیاں

شاگرد: (جھپٹ کر ظفر کی طرف بڑھتی ہے) دیکھ دے دے
.... ظفر

ظفر صوفے کے پیچھے بھاگ جاتا ہے۔ شاگرد اسے
پکڑنے کے لئے دوڑتی ہے۔ اور اس طرح ظفر اور
شاگرد ڈورانگ روم میں ایک دوسرے کو پکڑنے کی
کوشش کر رہے ہیں۔ کہ اندر کے دروازے سے
ان کی ماں داخل ہوتی ہے۔

خالہ: ارے ... ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔
شاگرد: دیکھو اماں! اس ظفر کے پیچھے نے میری مونگ پھلیاں
چھین لیں۔

خالہ: مونگ پھلیاں! تم مونگ پھلیاں کھا رہی ہے میں تو تجھ
سے تنگ آ چکی ہوں۔ اب مونگ پھلیاں کھا رہی ہے۔
اور بات ہو گی۔ تو رات بھر بھوں بھوں کر کے کھانا۔
شاگرد: اماں! وہ تو میں بھی تو نہیں کھاؤں۔ (ظفر آہستہ آہستہ
باہر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا ہے)

خالہ: ظفر ... ادھر آ ... ارے یہاں آنا ...
میں تجھے بتاؤں۔

(اس عرصے میں ظفر وہاں سے اچھٹا ہوا
گھر سے باہر چلا جاتا ہے خالہ شاگرد کے
قریب آتی ہے۔ اور اس کے کان پکڑ کر
بال گھسیٹتی ہے)

شاگرد: تنگ آگئی ہوں تجھ سے۔ بارہ سال کی لڑکی ...
تجھے موت آ جائے تو اچھا ہے ...

(اتنے میں اندر کے گھر سے زریں
ایک دم آ جاتی ہے۔)

حامد: خالہ، یہ حامد پڑا کس پر ہے۔ بڑا سٹھرا داغ پایا ہے اس نے۔
خالہ: ظفر کے ابا تو بڑے ہی سیدھے سادے تھے۔ انہی بے وقوفی
بہا کی وجہ سے تو وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔

حامد: مگر صاحب ظفر کیا بات ہے اس کی۔ اب تمہیں سناؤں
ایک دفعہ کیا ہوا۔ نسرن کی کا پی پر اس کی لکچر اور خط
کرتی ہے۔ بڑے بڑے میز سے۔ تو ظفر صاحبہ
ان کے دستخطوں میں گول دائرہ ملا دیا اور دوپٹہ منٹ
ڈال کر بالکل اتو کی سی صورت بنا دی۔ نسرن سے
پوچھنا اس کی لکچر اسٹریسی ہے۔

خالہ: میاں، ظفر کا ہے کون دیکھ بھال کرنے والا۔ اب تو
خاصا بڑا ہو گیا ہے اسے کسی سکول میں داخل
کرادو نا۔

حامد: ظفر تو بہترین آرٹسٹ بن سکتا ہے۔ بس یہ جو کبھی کبھی
شرارت کرتا ہے، اور ایسی شرارت جس سے نقصان
ہو جائے اس سے غصہ بہت آتا ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو۔
ذرا میرے امتحان ختم ہو جائے دو۔ اسے کسی انگریزی
اسکول میں داخل کراؤں گا..... ارے زری...
زری... بھی مجھے اپنا پن دے دینا۔

(یہ کہہ کر وہ زری کے کمرہ کی طرف چل دیتا ہے)
خالہ جس کی آنکھوں میں ایک مسرت اور خوشی
ہے، آہستہ آہستہ باہر کے دروازے کی طرف
بڑھتی ہے۔ اور جب وہ دروازہ کے پاس
پہنچتی ہے تو حامد زری کے کمرہ سے بھاگتا ہوا
نکلتا ہے۔ اور زری اس کے پیچھے پیچھے

بھاگتی جان..... حامد — بھاگتی جان
بھاگتی جان کہتی ہوئی، آتی ہے اور حامد کو کہنے
کی کوشش کرتی ہے۔ مگر حامد جلدی سے دفتر
کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ اور فوراً دروازہ بند
کر لیتا ہے۔ زری دانت پیستی ہوئی آکر صوفے
پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس صوفے میں خالہ باہر جا چکی
ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی چھوٹی بہن نسرن

ہیں پکا کر کھلاتی ہو اور دوسرے کام کاج کرتی ہو
آخر ہمارا بھی کوئی فرض ہے یا نہیں۔

خالہ: بیٹی میں تو نوکر ہوں۔ جو کچھ کرتی ہوں اس کی تنخواہ
مجھے مل جاتی ہے۔ پھر میرا تم پر کیا احسان۔

زری: خالہ! شاکرہ تو مجھے نسرن سے بھی زیادہ عزیز ہے۔
سچ کہتی ہوں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ شاکرہ اور کچھ نہیں
تو بی۔ اسے تو کمرہ ملے..... مگر ذرا اس کا ذہن خراب
ہے۔ ورنہ اب تک تو میں میرٹس کا امتحان دلا دیتی۔۔۔

ذکرہ کے دوسرے دروازہ سے حامد اپنے ہاتھ

میں ایک پن لئے داخل ہوتا ہے

حامد: خالہ! یہ دیکھئے (پن خالہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)
خالہ اسے دیکھتی ہے۔)

خالہ: یہ کس نے توڑا؟ یہ ظفر کے بچے کا ہی کام ہو گا۔

حامد: جی ہاں! خالہ مجھے تو تمہارے بڑے چلے پر ترس آ جاتا ہے۔
ورنہ ظفر کی تو وہ مرمت کروں کہ اسے آدمی بنا کر رکھ دوں۔

خالہ: تو حامد میاں، تمہیں شے کس نے کیا ہے۔

زری: حامد بھائی کیا ہوا۔ دوسری نب ڈالو لینا۔ خالہ کو کیا
دکھا ہے ہو۔

حامد: ارے خالہ! تم غواغواہ اداں ہو رہی ہو۔ زری میں تو
خالہ کو یہ بتانے آیا تھا کہ یہ حضرت ظفر میری چیز دل سے
کیا کیا مشقی فرمایا کرتے ہیں۔

خالہ: حامد میاں تم نے اس بد بخت کو اپنے سر پر بھی تو اتنا چڑھا
رکھا ہے۔

حامد: تو ظفر سے بھی تو ایسا ہی۔ واللہ مجھے تو اس کی ذہانت اور
ہوشیاری دیکھ کر رشک ہونے لگتا ہے کس بلا کا دامغ
پایا ہے۔

(زری اپنے کمرہ کی طرف جا لے گئی ہے۔)

حامد: زری! ذرا مجھے اپنا پن دے دینا... بڑا ضروری وہ...
وہ نوٹس لکھنے ہیں....

زری بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھتی، مذہباتی
اپنے کمرہ میں چلی جاتی ہے

باہر کے دروازے سے ڈرائنگ روم میں
داخل ہوتی ہے۔ اور زربین کو حیرت سے
دیکھتی ہے۔

نسرین: کیا بات ہے باجی۔ منہ لٹکائے کیسے بیٹھی ہو۔ (زربین
کوئی جواب نہیں دیتی) بتاؤ نا۔

زربین: جاؤ۔ نسرین اپنا کام کرو۔

نسرین: آخر کوئی بات بھی ہے بتاؤ نا۔

زربین: مجھے یہ بتاؤ آخر میں تجھے کب تک شیلڈ کرتی رہی۔
نسرین: ہوا کیا؟

زربین: یہ دیکھ!..... (اسے پن دکھاتی ہے).... معلوم ہے
حامد بھائی کس قدر بگڑ رہے تھے۔ اس کا ٹوڈا سا
مذاق ہو گیا۔ اور اتنا بیوقوف بن گیا.....

نسرین: بھائی جان بہت بگڑ رہے تھے! تو کہہ دیا ہوتا کہ ظفر
نے توڑا ہے۔

زربین: ظفر بے گناہ کو خواہ مخواہ مجرم ٹھہراؤں۔ بھائی جان
کہتے ہیں کہ قاسم کے علاوہ یہ کسی اور کا کام نہیں ہے
نہ تو قاسم کو اتنی لفٹ دے اور نہ ایسی باتیں سننی پڑیں

نسرین: تو میں کوئی لفٹ دیتی ہوں اسے۔

زربین: اس دن وہ تیری کاپی پر وہ تیری لکچر، کیا نام ہے
اس کا۔ اس کے دستخطوں کو اتوں کی شکل میں نہیں
تبدیل کر گیا تھا۔

نسرین: تو اس میں کیا ہو گیا۔

زربین: تو تو خود آؤ ہو گئی ہے۔ نہ وہ مجی کو اچھا لگتا ہے؛
نہ ڈیڈی کو۔ اور بھائی جان تو اب اس سے بہت ہی
بھٹانے لگے ہیں نسو! اب تو جانے اور تیرا کام۔

میں آخر کب کب تجھے شیلڈ کرتی رہوں گی۔

نسرین: تو کوئی بات بھی ہو۔ قاسم خود ہر پہانے سے چلے
آتے ہیں۔ میں تو بات بھی نہیں کرتی۔

زربین: تو غالب کے شعروں کا مطلب کیوں پوچھا تھا تو نے۔

نسرین: باجی تم ہی نے تو کہا تھا کہ قاسم سے پوچھ لو۔ یہ بھی
شاعری میں غالب سے کم نہیں ہیں۔

زربین: اوہ نسو! تو بالکل ہی بے وقوف ہے۔ میں نے تو
ٹانٹ کیا تھا۔ آپ سنجیدگی سے غالب کے اشعار اس کے
سامنے کر بیٹھ گئیں۔ اسے وہ تو اکنو مکس کا اسٹوڈیو
ہے وہ شاعری کیا جانتے۔

نسرین: تو مجھے اس سے کیا دیکھی ہے۔ غالب کے شعر تو میں
کسی سے بھی پڑھ سکتی ہوں۔

زربین: تو پھر منع کیوں نہیں کر دیتی۔ صاف منع کر دو۔ کہ مجھے
بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو ایسا ہی
پڑہانے کا شوق ہے تو باجی کو اکنو مکس پڑھائیے جا کر
نسرین: تو بھائی جان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

زربین: اوہ کتنی بھولی ہے تو بھی نسو۔ تو سمجھتی ہے جیسے میں
قاسم کو گھاس ہی توڑاؤں گی۔ اسے ایسے بدتمیز قسم کے
آدمی کو تو وہ اتوں بناؤں کہ وہ بھی یاد رکھے۔ مگر تو
تو بے وقوف ہے نا۔ تجھے وہ اور بھی بے وقوف بنا کر
رکھ دے گا۔

نسرین: قاسم اتنے برے تو میں نہیں باجی۔ خواہ مخواہ تم انہیں
ایسا سمجھتی ہو۔

زربین: (نسرین کا ہاتھ پکڑ کر اندر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے
کہتی ہے) تیرے بھولپن پر مجھے پیار بھی آتا ہے۔ لیکن
نسو! آخر میں تیری بہن ہوں دشمن تو نہیں ہوں۔ اب
قاسم تجھ سے بات کرے تو صاف پھٹکار دیجو۔

(یہ باتیں کرتی دونوں لڑکیاں کمرے کے اندر
چلی جاتی ہیں۔ اور باہر سے ظفر موگ پھلیاں
کھانا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے۔
اور پھر بڑے انداز سے پھیل کر صوفے پر بیٹھ
جاتا ہے۔ اور گردن ہلا ہلا کر مزے لے لے کر
موگ پھلیاں کھانے لگتا ہے۔ حامد کمرے کا دروازہ
کھولتا ہے۔ اور جب ظفر کو بیٹھا ہوا دیکھتا ہے
تو دے پاؤں آکر پیچھے سے ظفر کی گردی پکڑ
لیتے ہے۔)

حامد: کیوں بیٹا، کیسے پکڑے گئے! بولو۔ اب اپنے پن کے

حامد: ارے پاگل صغیہ کی کوٹھی مکتے پاس بھی ایک دوکان ہے۔ کیا سمجھ۔ وہ بڑی اچھی مونگ پھلیاں بیچتا ہے۔ وہاں سے لادو، اور سنو۔ صغیہ کو یہ لغافہ اور یہ ڈبہ دیتے آنا۔۔۔۔۔

حامد اپنی تپلون کی جیب سے لٹاؤ اور ایک چھوٹا سا مٹھی ڈبہ نکال کر ظفر کو دیتا، جو ظفر لینے میں پس و پیش کرتا ہے۔

حامد: کیا بات ہے۔

ظفر: بھائی جان، یہاں کہتی ہیں صغیہ باجی کے ہاں نہ جایا کر۔

حامد: کیوں؟ اوہ تم دہائی شراکت کرتے ہو گے نا۔ صغیہ کہہ گئی تھی۔ تم نے اس نے باغ میں سے گلاب کے پھول توڑے تھے۔

ظفر: بھائی جان! میں نے تو۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ اماں نے وہ خط۔۔۔۔۔ جو تم نے بھیجا تھا نا۔۔۔۔۔ وہ دیکھ کر کہا تھا۔۔۔۔۔

حامد: وہ خط تم نے اپنی اماں کو دکھایا تھا۔ اس بار یہ خط بالکل جیب میں چھپا کر لے جانا۔ کسی کو معلوم نہ ہو۔ جاؤ۔ اور لوریہ دو آئے۔ لو۔۔۔۔۔ پکڑو۔

ظفر: (ظفر دو آئے لے لیتا ہے اور حامد خط اور ڈبہ اس کی نیکر کی جیب میں بھونسن دیتا ہے)

ظفر: بھائی جان۔ یہ دیتے ہی بھاگ آؤں گا۔

حامد: نہیں اس کا جواب لے کر آنا۔ کیا سمجھ۔ جاؤ۔ اور دیکھو ظفر، کسی کو پتہ نہ لگے، جاؤ۔۔۔۔۔ بڑا اچھا۔۔۔۔۔

..... ہاں۔۔۔۔۔ آج

(ظفر مسکراتا ہوا کمرہ سے باہر کے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ حامد اپنے کمرہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ اور پھر اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر لیتا ہے۔ اس کے بعد زریں بی سنوری اپنے کمرے سے باہر آتی ہے اور ڈرائنگ روم کے قدامت آئینہ میں کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیتی ہے۔

توڑنے کی کیا سزا دوں؟

ظفر: بھائی جان!۔۔۔۔۔ اف۔۔۔۔۔ میری گردن تو چھوڑیے۔

(حامد اس کی گردن چھوڑ دیتا ہے)

ظفر: بھائی جان۔ قسم خدا کی وہ پن قاسم صاحب نے توڑا ہے۔

حامد: چپ نہ ہو۔ یہ سب تمہاری کارستانی تھی۔ میرا پن تم نے توڑا ہے۔

ظفر: بھائی جان، میں سچ کہتا ہوں۔ وہ قاسم بھائی، نسریں باجی سے پن چھین رہے تھے اور۔۔۔۔۔

حامد: چپ نہ ہو۔ اگر ایسی کوئی بات منہ سے نکال تو منہ توڑ دوں گا۔

ظفر: (دروکھا سا ہو کر) بھائی جان میری کوئی خطا بھی ہوئی

حامد: اچھا یہاں بیٹھ۔ اور مجھے یہ بتا کر میں تجھے آخر کتنا چاہتا، اور تو ہر وقت شراکت کر کر کے میری ساری چیزیں خراب کرتا ہے۔

ظفر: بھائی جان میں ایمان سے کہتا ہوں۔ میں تو آپ کے کمرے میں جاتا بھی نہیں۔ جب سے اماں نے منع کیا ہے۔

حامد: ارے تیری اماں نے میرے کمرے میں آنے سے منع کر دیا، مجھے۔ (ظفر اثبات میں سر ہلاتا ہے) پگلا کہیں کا۔ اے! تو تو واقعی پاگل ہی ہے۔ کیا ہے جیب میں تیرے، دکھا اس کی جیب میں سے مونگ پھلیاں نکالتا ہے، اوہ تو لاٹ صاحب بہ مونگ پھلیاں کھا رہے ہیں۔ لاؤ مجھے بھی دو۔ (حامد ایک مونگ پھلی پھیل کر کھاتے گھٹا ہے) اے یار یہ تو بڑے مزے کی ہیں۔ (انہی جیب سے دو آنے نکال کر چلو دو آنے کی مونگ پھلیاں مجھے بھی لا کر دو۔ (ظفر دو آنے لے کر چلنے لگتا ہے) سنو، ظفر! جی بھائی جان۔

ظفر: کدھر ہے مونگ پھلی والے کی دوکان

ظفر: وہ سامنے جو پتھر ٹل ہے نا، بھائی جان۔

حامد: ارے ہاں ہاں! صغیہ کی کوٹھی کے پاس۔

ظفر: نہیں نہیں بھائی جان۔ وہ تو ادھر ہے اور دوکان ادھر۔

اندھنے والوں کو ٹھیک کرتی ہے کہ اس عرصے میں شاکرہ وہاں آجاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ارد و کا قاعدہ ہے۔

شاکرہ: باجی آپ تو جا رہی ہیں؟ (ندیں اثبات میں سر ہلاتی ہے) مجھے سبق نہیں دیں گی، میں نے سب یاد کر لیا۔ سناؤں۔
الف سے آم.... بسے بی۔ پ سے پنکھا....
زریں: ہاں ہاں۔ اب اگر تجھے سبق دوں گی اور سناؤں تجھے یہ سنا تا قاعدہ ختم کرادوں گی شاکرہ کیا سمجھی۔ دیکھ، جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تو میرے کمرہ میں بیٹھی رہنا۔ باطل باہر نہ جانا۔ (کھڑکی کے باہر دیکھتی ہے) جیسے وہ کسی کے آنے کا انتظار کر رہی ہے)

شاکرہ: اچھا آپا باجی۔

زریں: اور دیکھو! وہ جو میرے پڑھنے کی کرسی ہے۔ اس پر تم خوب بیٹھ کر پڑھو۔

شاکرہ: باجی۔ جہاں کی کرسی پر

زریں: ہاں۔ وہ بڑے کمال کی کرسی ہے۔ اس کرسی پر بیٹھ کر بہت پڑھا جاتا ہے۔

شاکرہ: مگر باجی تم جا کہاں رہی ہو؟

زریں: ارے بھئی۔ صفیہ کے ہاں۔ کل میرا ٹسٹ ہے۔ (کھڑکی کے پاس جا کر دیکھتی ہے)

شاکرہ: وہ کیا باجی۔

زریں: ارے کل میرا امتحان ہے نا۔ اور مجھے صفیہ کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا ہے۔

شاکرہ: باجی، وہ کرسی جو اتنے کمال کی ہے۔ اس پر ہی بیٹھ کر کیوں نہیں پڑھتیں۔ صفیہ باجی تو باتیں زیادہ کریں گی۔

زریں: بھئی کہیں کی۔ اور دیکھو اول تو میرے کمرہ میں کوئی آئے گا ہی نہیں۔ جب تم میری کرسی پر بیٹھی رہو گی تو

سب ہی تمہیں گتے کریں اپنے کسرہ میں ہوں۔ ٹھیک ہے نا۔۔۔

زریں پھر آئینہ میں اپنا جائزہ لیتی ہے۔ اور پھر اپنا پرس کھول کر دو آنے نکالتی ہے کھڑکی کے پاس جاتی ہے۔

اودھارا ہوتے آنے کا کسی کو اشارہ کرتی ہے زریں: (شاکرہ سے) لو یہ دو آنے ان کی مونگ پھلیاں منگا کر کھا لینا۔ جاؤ۔ جلدی کرو۔ ظفر سے منگا لینا۔ میں لے بیٹھتی ہوں۔

(یہ کہہ کر زریں... باہر کے دروازے سے چلی جاتی ہے۔)

(شاکرہ قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس

انداز سے زریں کی طرح اپنا جائزہ لیتی ہے اور پھر

زریں کی نقل کر کے اپنے اچھے ہوئے بالوں

کو ٹھیک کرتی ہے۔ اور دھڑکی کو اپنے بالوں میں

گھسیٹ پھول کی طرح نکلنے لگتی ہے کہ اس عرصے

میں ظفر باہر سے اچھلتا ہوا آتا ہے)

ظفر: آپا.... آپا، لو۔ مری جا رہی تھیں دو چار مونگ پھلیاں کے لئے۔ (اپنی جیب سے ٹھیکیاں بھر کر مونگ پھلیاں نکالتا

شاکرہ: ارے یہ اتنی ساری مونگ پھلیاں کہاں سے لے آیا۔

ظفر: چار آنے حامد بھائی جان نے دئے تھے۔ شاکرہ: کیوں۔

ظفر: اوہ۔ آپا۔ کھاؤ نا، بھائی جان نے ایک لفافہ اور ایک ڈبیا صفیہ باجی کو بھیجی تھی۔

شاکرہ: کیسی ڈبیا؟

ظفر: ارے آپا۔ بڑے خوبصورت ٹاپس تھے اس ڈبیا میں۔

تم دیکھتیں تو تمہاری رال ٹپک پڑتی کھاؤ نا۔ یہ مونگ پھلیاں!

شاکرہ: حامد بھائی جان نے صفیہ باجی کو ٹاپس بھیجے تھے!

ظفر: ہاں اور صفیہ ٹاپس پہن کر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر خوب منہ بنا بنا کر محاکئے لگتیں۔

(آئینہ کے سامنے گویا صفیہ کی نقل اتارتا جا رہا ہے) لو کھاؤ مونگ پھلیاں!....

شاکرہ: اور جب زریں باجی وہاں پہنچی ہوں گی تب تو....

ظفر: زریں باجی کہاں پہنچی ہوں گی؟

شاکرہ: صفیہ کے ہاں گئی ہیں نا۔

ظفر: (ہنستے) ارے آپا۔ زریں باجی تو قاسم صاحب کے

ظفر: یہ دیکھو (ایک لفافہ نکال کر دکھاتا ہے)۔ یہ ہے صنفِ باجی کا خطبہ حامد بھائی جان! اسے دیکھیں گے تو کیا پتہ آئے گا کہ دے دیں۔ نہ جانے کتنا ہے)

شاگرد: ظفر، سن تو..... ارے.... یہ لفافہ مجھے تو دکھا۔

ظفر: تم اسے دیکھ کر کیا کرو گی۔ لو دیکھو۔

(شاگرد لفافے کو لے کر اس میں سے خط نکالتی ہے۔

اور الٹ پلٹ کر دیکھتی ہے۔ ظفر ٹہرے طنز سے کہتا ہے۔)

ظفر: ہونہ! جیسے پڑھ ہی تولیں گی اس میں کیا لکھا ہے۔

لاؤ۔

شاگرد: ارے تحریر تو سہی۔ یہ ہے الف.... الف سے آم۔

ارے یہ ہے، ب.... ہاں.... یہ عجیب ہے...

ب سے بی.... اور یہ ہے.... پ.... پ سے

پنکھا....

ظفر: (شاگرد سے خط چھین کر) لاؤ.... پڑھنا تو آتے ہیں۔

آپا پڑھنا تو سیکھ لو پہلے۔

(ظفر یہ کہتا ہوا، حامد کے کمرہ کی طرف،

جاتا ہے۔ شاگرد معاً.... تو آدم آئینہ

کے سامنے آتی ہے۔ اور بالوں کو زریں کی

نفل کر کے، درست کرتے لگتی ہے۔ اور

اس میں پھول کی جگہ دو ٹی لگاتے لگتی ہے۔

وہ دوانی پھسل کر زمین پر گر پڑتی ہے۔ شاگرد

خواہ مخواہ ہنسنے لگتی ہے۔ اور پردہ آہستہ

آہستہ گرتا ہے)۔

ماہ نو

کا اگلا شمارہ

جملہ اور امت کی مشترک اشاعت ہوگی۔

اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ

پر ایک سیر حاصل نمازہ المعارف ثابت ہوگی۔

مفضل اعلیٰ اس شمارہ میں ملاحظہ کیجئے۔

(ادارہ)

سامنے وہاں لائبریری ہوئی ہیں۔ چلو میں دکھاؤں!

شاگرد: کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ وہ دیکھو،

اس گلاب کے پودے کے پاس، ہیں نا۔ مجھے قاسم صاحب

لے دیکھا تو جناب مجھے یہ چلنوزے دے۔ یہ اتنے سارے۔

شاگرد: ہوں جب ہی تو مجھے مونگ پھلیاں دے رہا ہے (مند باندی)

لو آپا۔ مونگ پھلیاں کھاؤ۔ چلنوزے خود رکھ لئے،

بلاؤ۔

ظفر: نہیں آپا۔ چلنوزے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ اور

چھٹکے بھی ہوتے ہیں!

شاگرد: ہونہ! چھٹکے بھی تو کتنی مصیبت سے ہیں۔ مونگ پھلی تو

یوں دیا اور لو.... کھالیا۔ چلنوزے چھینے میں تو ناخن

دکھ جاتے ہیں۔

ظفر: جب چلنوزے کھا کر دیکھو گی تب پتہ چلے گا۔

شاگرد: اچھا، دو چار دے تو سہی۔

ظفر: ادنیٰ ہونہ! — شاگرد گہرے خیالات میں گم ہے)

کیا سوچے لگیں آپا؟

شاگرد: سوچ رہی ہوں۔ آپا نسریں کو جا کر یہ بتاؤں کہ قاسم صاحب

اور ندیں باجی وہاں لان پر بیٹھے ہیں۔ اور چلنوزے

کھا رہے ہیں۔

ظفر: تو مجھے کیا، چلنوزے مل جائیں گے۔

شاگرد: نسریں باجی مجھے چار آنے دیں گی جناب۔ انہوں نے

مجھ سے وعدہ کیا تھا، اگر میں قاسم صاحب اور زریں

باجی کو لان پر بیٹھا دیکھوں اور انہیں بتا دوں تو وہ

مجھے چار آنے دیں گی۔ ظفر چار آنے کے کتنے چلنوزے

آئیں گے؟

ظفر: ایک چھینک تو آ ہی جائیں گے۔

شاگرد: چلو چار آنے نہیں۔ دو آنے تو دے ہی دیں گی۔ دوائے

آپا نواریں نے دے ہی دئے ہیں۔

ظفر: یہ بات ہے۔ تو میں بھی ابھی حامد بھائی جان سے چار آنے لاتا

ہوں۔

شاگرد: ہونہ! جیسے وہ مجھے چار آنے تو دے ہی دیں گے۔

گلے گاہے باز خواں...

(عید است و نشاط و طرب و زمزمہ عام بہت)

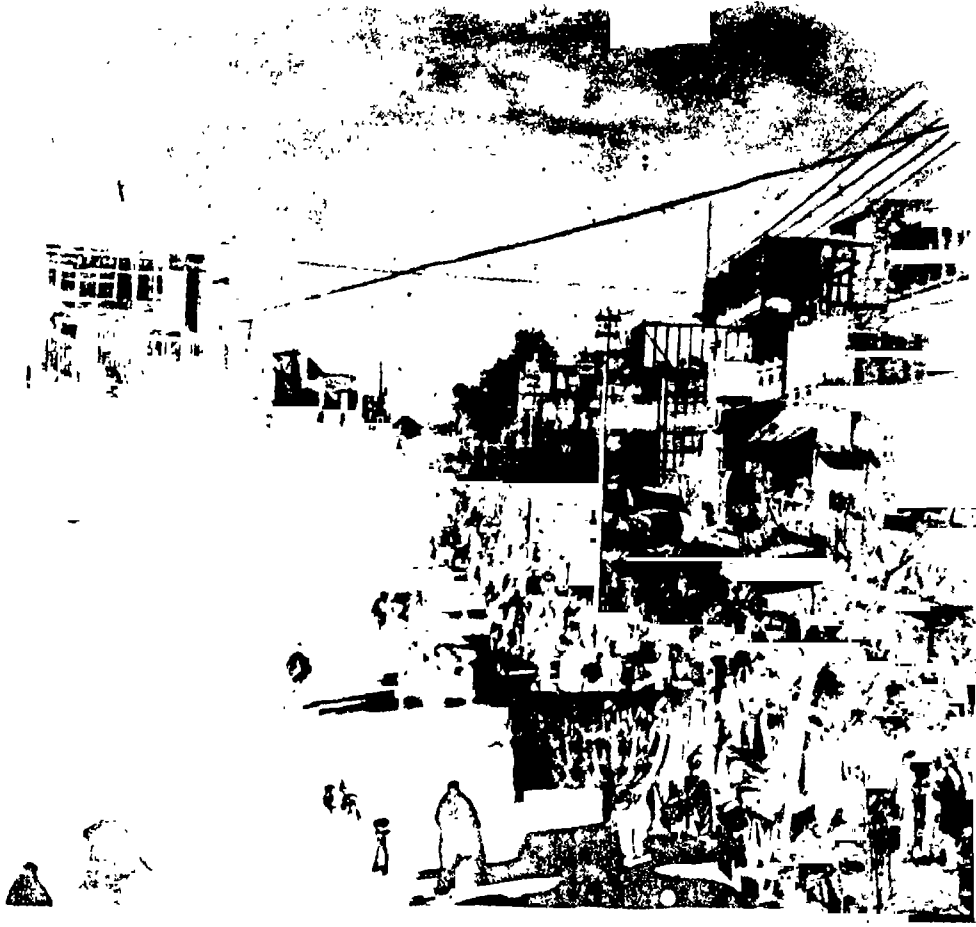
سینا جگر کاظمی

عید ہر حال عید ہے خواہ وہ عید انظر ہو یا عید الضی۔ لہذا ارباب ذوق عید کو عیدین تصور کرتے ہیں۔
دو دنوں سے نشاط اندوز ہوں کہ ہم خرما بھی ہے اور ہم ثواب بھی۔ (ادارہ)

پشاور شہر۔ قدیم سے خوش پوش خوش خندک اور مشہور خطہ ہے۔ نیز اسلامی روایات اور رسومات میں پیش پیش نظر آتا ہے۔ یہاں عیدین کا بڑا اہتمام کیا جاتا۔ چاند نظر نہ آتا تو سینٹر صاحبان روپیہ خرچ کر کے دور دور سے چاند کی مصدقہ خبریں منگواتے، اس کے علاوہ یہ شہر پیشہ وہ اور دستکار شہر ہے۔ لوگ رات رات بھر بیدار رہ کے جان توڑ محنت کرتے، تاکہ ضروریات پوری ہوں۔ مائیں بچوں کے کپڑے سیتیں مشینیں توختیں نہیں، لہذا ہاتھ سے سلائی کی جاتی۔ ہاونگتے جارہے ہیں اور کام ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی عورت مٹی کا گھڑا اوندھا کئے سوتیاں تیار کر رہی ہے، بال برابر باریک۔ خوشی و اقارب کے ہاں بھیجنا سب سے مقم ٹھہرا۔ اس خوشی میں محنت دو بھر نہیں معلوم ہوتی۔ کوئی بچہ روکا کوئی ددڑی کے سر پر سوار کوئی مچی کے پاس بیٹھا ہے۔ کوئی اپنے کپڑے سر ہانے رکھ کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کپڑے اٹھ کر دیکھ لے۔ دستکار کہتے ہیں اللہ کرے کل چاند نہ نکلتے۔ کام بہت رہ گیا ہے۔ الغرض امیر و غریب عید کا ہتھیار ہوئے ہیں۔ اللہ اللہ کر کے صبح ہوئی۔ بند و قیں، قراہینیں دغیں۔ ڈھاکوں نے عید کا اعلان کیا۔ ڈھولکئی، نفیر لیں اور سُرناؤں کی آوازیں آنے لگیں گھر کی مستورات ماٹھیں، نماز سے فارغ ہو کر پانی گرم کرنے کے لئے چولہے پر رکھا۔ بچوں اور مردوں نے نئے کپڑے پہنے نماز عید کی تیاری ہے۔ سبحان اللہ بچوں کی زرق برق لباس کناری گڑھ لے کا کا ایسا کہ سچھینو عید کا گیا۔ ادھر شہر کے بڑے بازار۔ بہانہ لڑی، راملاس بازار

ڈبگری بازار، ملک منڈی کا چوک، قصہ خوانی بازار، بازار بزازاں، جہانگیر پورہ، کوتوالی، کٹرہ دشم گراں، بازار چڑوے کو باں، بازار کلاں، کریم پورہ بازار وغیرہ وغیرہ کی دکانیاں سمجیں۔ کھانے پینے کی چیزیں نیز طرح طرح کے کھلونے بک رہے ہیں۔ لوگ سوتیاں کھا کر نماز عید پڑھنے بچوں کے لئے عید گاہ روانہ ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر لوگ دوستوں عزیزوں سے مصافحہ معانقہ، علیک سلیک کرتے، چھوٹوں کا بزرگوں سے تعارف کراتے، رومال میں انڈے، مٹھائی، بڑے پکڑے لئے بچوں کے واسطے طرح طرح کے کھلونے خریدتے گھر واپس آئے۔ ادھر گھروں میں، پیٹنگیں پڑ گئیں۔ بہن بیٹیاں جمیل روی ہیں۔ آپس میں ہنسی مذاق اور چہلیں ہو رہی ہیں۔ ہر چند روپیہ پیسہ اٹنا دافر نہیں۔ مگر صبر و قناعت بے حد ہے۔ ارزانی نے حقیقی خوشی سے دو چار کیا ہوا ہے۔ اور اشیا و خورد و نوش کے خالص و بے آمیز ہونے نے قوت حیات وافر بخشی ہوئی تھی۔ بڑی بالحاظ اور مودب دنیا تھی۔ کیا جمال بہو بیٹی کے سر سے دوپٹا سرک جلے۔ ہاں سچی ہنسی، کھیل میں ایک دوسرے کو چھیڑا جا رہا ہے۔ مگر مہذب طریقہ سے۔

خیر، پہلا دن عید کا شہر ہی میں گزرا۔ دوسرا دن چڑھا۔ یہ میلہ جہاں اب نئی آبادی ہے یعنی مکڑی بازار، وہاں لگتا تھا۔ شتنگری دروازہ سے ہنر تک رشک کے دھڑلے بازار لگتا اور خورد و نوش کی دکانیں سجائی جاتیں۔ ایک روپے چار آنے پر مٹھائی



بازار قصہ خوانی

پشاور

ہمارے عظیم اور قدیم شہر، کے
کوچہ و بازار سنگ و خشت کے تودے
نہیں ہیں بلکہ وہ مقامات ہیں جہاں زندگی
ہر وقت تیز تیز سانس لیتی ہے۔ وہ ہمارے
قدیم فنون کے اساتذہ دار بھی ہیں اور حیات و
ثقافت کے آئینہ دار بھی۔ جن میں ماضی کی
جھلکیاں اور روشن مستقبل کی دمک قدم قدم
پر نظر آتی ہے۔

چوک یدگار



مکون پہول، گے دیس



چانگام



’غان کی فردوس بداماں وادی ہو یا ہرے بیرے
اٹدم کے سدا بہار گھنے جنگل ، تندرو دریا اور
مڈی کی ہماہمی سے گونجنے والے صنعتی علاقے ،
سب ہمیں دعوتِ نظارہ دینے اور اس مشترکہ
رشد کی یاد دلاتے ہیں جو ہماری قومی یکجہنی
سب سے بڑی اساس ہے ۔

سندربن اور چانگام کے پہاڑی علاقوں میں
الحصوص فطرت اپنے پورے حلال و جمال کے
ساتھ نظر آتی ہے ۔

سندربن (کوهستانی علاقہ چانگام) میں دریائے سنگو کا طلسمی نظا



چانگام کا پہاڑی قبیلہ ، چکما

گوشت دنبہ ۲ آنے میر، پیسے کے ایک اور دو انڈے، چھ پیسے سیر دودھ، دو پیسے یا آدھ سیر گندہ ریاں، ایک پیسے کے چار کباب پیسے کی ایک روٹی جو آج ۲ آنے کی ہے، ۲ آنے سیر گوشت موٹا۔ ایک پیسے میں کچوری یا کچھی۔

گاوؤں کے لوگ شہر میں آتے۔ اپنے عزیز اقارب کے لئے مرغیاں۔ گتے۔ گڑ کا شیرہ۔ آٹا۔ اور گڑ بنا ہوا لاتے۔ کیونکہ ان کو رات گزارنی پڑتی تھی۔ کتنے فراخ دل لوگ تھے۔ عید پر خاص کر آٹھ آٹھ دس دس روز ہمانداریاں ہو کر تیں۔ شرفا کا لباس تھا لٹھے کا کرتہ اور شرعی پاجامہ واسکٹ اور گلے میں رومی چنر یا موسم کے لحاظ سے لٹھے کا، سنجیہ کیا ہوا فرغل، سر پر شمال یا ملل کا صاف یا پشاور کی لنگی، شانہ پر سرخ بھاری رومال، بعض کے پاس ہاتھ میں نسوار کی ڈبیا، ہاتھ میں عصا، کسی کے شانہ پر کابلی بٹو، پیر میں پشاور کی نازک جوتا۔ شرک کے کنارے گائیں، بھینسین ذبح ہوتیں اور دیہات کے لوگ دودو چار چار سیر گوشت ختمہ بد کر لے جاتے۔ ایک طرف گٹکا بازی ہو رہی ہے، تو دوسری طرف پہلوانوں کی کشتیاں لڑی جا رہی ہیں، کہیں خانہ زادے نیزہ بازی کر رہے ہیں، کسی جگہ چار بیتہ بازی ہو رہی ہے، مکرئی بازار کے تھانہ کے دوسری طرف ٹیلوں پر مستورات، بچے طبقہ کی بفع اوڑھے بیٹھی سیر کر رہی ہیں۔ عزیز واقارب کھانے پینے کی اشیاء لالا کر دے رہے ہیں حتیٰ تو یہ ہے کہ شرارت کا کسی کو خیال نہ تھا۔ آج کل کا زمیندار تو پاکستان کی برکت سے، دولت سے کھیل رہا ہے۔ پہلے کا دیہاتی اگر لنگی نئی ہے تو جوتا پرانا۔ کرتا لٹھے کا ہے تو پاجامہ پرانا ہے۔ بچے کے سر پر صرف زری کی ٹوپی ہے تو عید ہو گئی، جوتا نیا ہے تو باقی کپڑے دکھلے ہوئے۔ اور یہ پشاور کی عید صرف پشاور کی عید تھوڑی ہے۔ اب تو پشاور سے لے کر لاہور، اور لاہور سے لے کر ڈھاکہ، چانچھام، سلٹ ٹنک ایک ہی مضمون ہے۔ کیونکہ اب تو جہاں دیکھئے پاکستان ہی پاکستان نظر آتا ہے۔ نہ کوئی جدا جدا، الگ تنگ علاقے رہے نہ سرحدیں۔ بلکہ ساری حدیں ٹوٹ کر ایک ہی ملک بن گیا، اس لئے جو رنگ ایک جگہ ہے وہی ہر جگہ ہے۔ پشاور میں عید کے میلہ کی جو چل پہل ہے۔ بعینہ ویسی ہی لاہور، کراچی

کوئٹہ، حیدر آباد اور ڈھاکہ وغیرہ کے میلوں میں ہے، عید ہی قربانی کا جذبہ ہی، اس کا فلسفہ وہی، بنیاد وہی — یعنی مذہب جو سب کا مذہب ہے اور معاشرہ، تہذیب سب ایک ہی ہیں۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے۔ یہی بات ہی تو سب کو ایک بنا دیتی ہے۔ نہ کوئی بختوں نہ بیخانی نہ بلوچ نہ سندھی نہ بنگالی۔ بلکہ سب کے سب پاکستانی ہی پاکستانی — اپنی قومی وحدت پر فخر کمنار۔ سارے کے سارے اسلام ہی کے عظیم روحانی رشتہ میں منسلک ہیں۔ اگر ہمیں اتحاد و یکجہت کا روح پرور منظر دیکھنا ہو تو اس کے لئے غالباً حیدر میں سے بہتر کوئی موقع نہیں۔ ایک طرف طرح طرح کی دلچسپیاں ہمارے بہت سے بھائیوں کو مشرقی پاکستان سے یہاں لے آئی ہیں اور دوسری طرف آب رواں کی بان و بہار سرزمین، مشرقی پاکستان کی کشر بھی مغربی پاکستان کے لوگوں کو دہاں لے گئی ہے۔ اور مذہب نے انہیں ایک ہی مقام پر یکجا کر دیا ہے جو ہر کہیں عید گاہ کی شکل میں نظر آتا ہے۔ عید کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملنا، محبت، خلوص، یکجہتی، کا کتنا روح پرور منظر ہے۔ خدا کرے یہ آٹا و یکجہت روز افزوں ہو اور ہمارے وطن عزیز کو بیش از بیش مضبوطی و استحکام عطا کرے ۛ (ریجنل ریڈیو پاکستان۔ پشاور)

غیر طلبیدہ مضامین
کی

واپسی کے لئے

مناسب ٹکٹ روانہ کیجئے،

اور اپنا پتہ

صاف اور خوشخط لکھئے۔

(ادارہ)

”سبد گل“

(ہزارہ ، پھللاں دا کھارا !)

سیتل غلام حسن شاہ کاظمی

علامہ ابیرونی نے ”کتاب الہند“ میں دریائے سندھ کا ذکر کرتے ہوئے اسے دریائے ”ویہند“ کا نام دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ انگ کے پہاڑوں سے نکلتا ہے جو ترکوں کی حدود میں واقع ہیں۔ اس دریا کو اندس۔ انگ اور اباسین کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ابیرونی کے سفر میں جو قنوج سے کشمیر تک کے حالات ملتے ہیں اس میں شرشارا، تھانیس، جالندھر اور ہریان کے نام آتے ہیں جن کے بعد اوشتان (سری نگر) پہنچ جاتے ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ شرشارا یا ہزارہ ہی ہے۔ ابیرونی کے عہد میں مسافر پہاڑ کے قدیم راستے سے صود گزرتے تھے۔ یہ ایک اہم پٹا تھا اور کشمیر جانے کے لئے ادھر سے گزرن پڑتا تھا۔ جب اکبر اعظم نے ادھر تک پرشہور قلعہ بنوایا اور آبادی بڑھی تو اس ساری سرزمین کی اہمیت بڑھ گئی۔ آج کل یہ مقام معمولی جگہ ہے۔

اس تمام تفصیل سے مراد یہ ہے کہ ہزارہ کا علمی اور ادبی حوالہ سے بھی تعارف کرا دیا جائے۔ لغوی تحقیق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زند کے ابتدائی تلفظ — سہاؤرا — (ہزارہ) سے جڑا نہیں کیا جاسکتا۔ تغیر اجہ کے باعث یہ ہزار آ مشہور ہوا۔ بالائی ہزارہ کے بعض علاقوں میں دھڑب الامثال بولی جاتی ہیں ”ہزارا پھللاں دا کھارا“ (ہزارہ بھولوں کا ڈکرا ہے) دوسری مثل ہے ”خدا دے گمائے پکھلی چھوڑ ہزارے آئے“ (خدا سے پھر جانے والے پکھلی چھوڑ کر ہزارہ آجاتے ہیں!)۔ اس بات سے یہ ظاہر ہے کہ ہزارہ سرسبز و شاداب اور معاشی خوشحالی کا مقام ہے اور لوگ ادھر آتے ہیں۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ٹیکسیلا سے آگے جو حکومت قائم تھی اس کا نام آرشا ضرورتاً جن میں ماتھی اور پکھلی شامل تھے۔

ابھی تک کوئی فیصلہ کن رائے قائم نہیں کی جاسکی ہے کہ ہزارہ کا نام کیونکر پڑا۔ اسی طرح سرزمین ہزارہ کی حدود کا تعین بھی مشکل رہا۔ یہاں انگریزی تسلط ۱۸۴۹ء میں قائم ہوا تھا۔ جو آزادی ملے تک جاری رہا۔ انگریزی عہد میں ہزارہ کی جو حدود مقرر ہوئیں، اس سے قبل کچھ مختلف تھیں۔ صرف لفظ ”ہزارہ“ کی بابت کئی رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ اسے ہزارا اور ہزارہ دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔ کوئی اس کو ایک ہزار — پرند — سے نسبت دیتا ہے جو ایک ہزار آوازیں مختلف نغموں میں نکال سکتا تھا۔ گو اس کا وجود محض قیاسی ہے۔ ہزارہ کو ”ہزار داستان“ (دجل) سے بھی نسبت دی گئی ہے۔ سنسکرت میں اسے سہسرا بتایا گیا ہے اور ”سہاسرا“ (ایک ہزار — سنسکرت) کے عنوان سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ زند میں یہی لفظ سہاؤرا *sawhara* یعنی ایک ہزار آیا ہے۔ ضیا بخشی بدایونی نے ۷۵۱ھ میں اس لفظ کو بطور قافیہ بتا ہے :

عطارد را بود اوراق پارہ

دفع زہرہ مانند از ہزارہ

ضلع کے ”گزٹیر“ میں بھی اس نام کی تحقیق پر روشنی ڈالی گئی ہے : ”پہلے ہزارہ ایک خاص علاقہ کا نام تھا مگر اب سارے ضلع کے لئے مستعمل ہے۔ اسے ارشا (ارتھ، آرشا) *URASHA* سے مشتق سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نام اوراش (*ORASH*) ورش (*RASH*) بھی معلوم ہوا ہے یہ اس نام سے ملتا جلتا ہے جسے ہابھارت میں آرا کا کہا گیا ہے۔ پٹوکی (۷-۳۲۶ ق۔ م) نے اپنے جغرافیہ میں اس ضلع کے لئے *oupa* یا *apda* لکھا ہے (ص ۷) اور اسے دریائے سندھ و جہلم کے مابین قرار دیا ہے۔

(گزٹیر ضلع ہزارہ، مطبوعہ ۱۸۸۳ء)

ہے جو وسعت میں کہیں بڑھ چکا ہے، مغرض یہ پورا علاقہ تاریخ و تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اور اس عہد میں بھی اس سرزمین سے بہت سے اعلیٰ تاریخ گر پیدا ہو چکے ہیں جن کے وطن پرور کارنامے آج بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔

تاریخی وثقافتی پس منظر پیش کرنے کے بعد ہزارہ اور ادبیات کے موضوع کو بھی چھیڑنا دلچسپی کا باعث ہو گا اس لئے جہت جہت اس پر بھی چند سطور یہاں پیش ہیں۔ ہزارہ کا ذکر فارسی، پنجابی اور اردو میں برابر ملتا ہے۔

ہیرورائجھا کا قلعہ فارسی میں لکھا گیا تو اسے افسانہ دلیزیڑ کا عنوان دیا گیا۔ یہ سعید سعیدی کا لکھا ہوا ہے (عہد شاہجہاں ۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۸ء)۔ راجھا کا تعارف کراتے ہوئے ہزارہ کا ذکر اس طرح زبان پر آیا ہے:

مشہور زمانہ راججہ نام است
در دہر خانہ راججہ نام است
دیدم پدش مقدم دہر
مشہور جہاں مسلم دہر
نامش موجو میان مردم
منظور قبیلہ جان مردم
اصل و نسبش بدین ہزارا
کردم من خست آشکارا

پنجابی قصبے فارسی زبان میں "کے معنیٰ کی رائے ہے کہ موجو کو آج بھی کہتے ہیں اور یہ کہ تخت ہزارہ ضلع سرگودھا میں واقع ہے۔ ہیرورائجھا کا قلعہ بطور مثنوی محمد رادلانی نے بھی لکھا ہے (۱۰۹۶ھ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرورائجھا کی رہنے والی تھی اور اس کے باپ کا نام چچک سیال تھا۔ یہ لڑکی جب جوان ہوئی تو عشق کا قلعہ شروع ہوا۔ اس زمانہ ہی میں تخت ہزارہ میں ایک رئیس حکمران تھا جس کے آٹھ بیٹے تھے، مگر وہ سب سے چھوٹے بیٹے کو زیادہ چاہتا تھا۔ قبیلہ کے نام پر اس کا نام بھی راجھا مشہور ہو گیا۔ اسے ماہی اور دھیدو کے ناموں سے بھی پکارا جانے لگا۔

حکیم چٹاپی نے ۱۱۱۰ھ میں قلعہ "ہیر و ماہی" تالیف کیا۔

اسی طرح اگر وہ کا مقام ہے جہاں آثار قدیمہ کی موجودگی آج بھی ظاہر ہے۔ ادھر ایبٹ آباد کے جنوب مشرق میں سرین نامی پہاڑ اور راجہ رساؤ کے زمانہ کے غار بھی پائے جاتے ہیں۔ گڑھی حبیب اللہ کے اوپر کٹ بھلہ اہد بانہ بقولہ کے مقامات ہیں جو دریائے گنہار کے دونوں کناروں پر واقع ہیں اور کسی وقت میں قلعہ بند شہر تھے اور ان کے آثار آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ مجھے ایک سفر کے دوران کوٹ بھلہ کے مقام پر ایک پتھر بھی دستیاب ہوا تھا جس پر چینی یا سنسکرت رسم الخط نظر آتا تھا، مگر میں اس تحریر کو حل نہ کر سکا مغرض ان تمام اطراف میں ہمارے علاقہ کی قدیم تہذیب کے آثار اور منادید کی موجودگی ایک دلچسپ واقعہ بات ہے جو محققین کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوں گی۔

حبیب اکرمی نے کہ چکا ہوں ہزارہ کے کئی نام مشہور ہیں جن میں یہ زیادہ مشہور ہیں: چچہ ہزارہ، گوجر ہزارہ، سخت ہزارہ، پنج گٹھ ہزارہ، میدان ہزارہ، ہیری پور ہزارہ۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ چچہ دراصل چچی ہی ہے۔ اس کا چینی تلفظ یوچی ہے سابق پنجاب کے اضلاع، گجرات، شاہپور اور جہلم میں چچ قبیلہ کے افراد بکثرت آباد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی وقت میں یہاں حکمران رہے تھے۔ اس کے بعد ہجرت کر کے دور در دور پہنچ گئے۔ سخت ہزارہ اور میدان ہزارہ ناموں سے اس کے ارتقاء کی صفت کا اظہار ہے۔ ہیری پور ہزارہ کا نام گورنر سردار ہیری سنگھ کوہ کے نام پر پڑا۔

لفظ ہزارہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہاں یہ بات بھی ظاہر کر دینی مناسب ہے کہ یہ نام بہت جگہ ملتا ہے مثلاً افغانستان میں اس نام کی ایک قوم آباد ہے اور جہاں یہ لوگ رہتے ہیں اسے "ہزارہ جات" کہتے ہیں۔ ہجرت کی تحصیل میں ایک گاؤں بھی ہزارہ نام کا موجود ہے۔ سخت ہزارہ نام کا بھی ایک اور گاؤں سرگودھا کے ضلع میں واقع ہے۔ روایت یہ تھا کہ ہزارہ نام کے قبائل جہاں بستے تھے اپنی بستی کو ملتا جلتا نام دیتے تھے۔ اگر تفصیل میں جاؤں تو سابق پنجاب کے اکثر اضلاع میں یہ قبیلہ آباد ملے گا۔

اس سرزمین کی قدیم سلطنت ارشا کے نام سے معروف ہے اور یہ بالائی ہزارہ (وغیرہ) کے علاقوں کو محیط تھی یہیں ایبٹ آباد

انہوں نے بھی ماہی را بھجا کو اپنے وطن ہزارہ میں دکھایا ہے جہاں وہ ہمیر سے رخصت ہونے کے بعد پہنچا، اور بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ ان کے قہقہے میں جب را بھجاسے دریافت حال کیا جاتا ہے تو وہاں بھی ہزارہ کا تعارف موجود ہے :

گفتا کہ مرا وطن ہزارا صحت
ایں بلبل در چین ہزارا است
را بھجا نسب است و ماہیم نام
نزدیک چناب جائے آرام
فیقر اللہ افوق نے بھی قہقہہ ہمیر را بھجا لکھا ہے (۱۱۵۴ء)۔

اور اس میں بھی ہزارہ کا ذکر موجود ہے :

کنوں گل زمین ہزارہ لقب
کہ آغا کند شبنم فیض رب
زما بھجن بود مرقدے یادگار
زیارتگہ خاص و عام دیار
چنین ہمیر را قہقہہ جھنگ نام
گرامی مزار لیست با احترام

منشی سدر داس آراٹم نے بھی قہقہہ ہمیر را بھجا بز باقی فارسی تحریر کیا (۱۱۶۱ء)۔ یہ سید وراث شاہ کے معاصر تھے۔ انہوں نے بھی بتایا ہے کہ را بھجا تخت ہزارہ کے ایک بارونی شہر ہزارہ میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام معز الدین تھا جو ہزارہ کا رئیس تھا۔ اس لڑکے کے علاوہ اس کے تین اور بھی بیٹے تھے۔ ہمیر جھنگ سال کے مسلم نامی ایک سردار کے ہاں متولد ہوئی۔

ان ادبی حوالوں سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہزارہ اور تخت ہزارہ مشہور مقامات تھے مگر خاص ضلع ہزارہ کی توضیح ضروری نہیں ہوتی گو بعض مقامات پر ضلع تخت ہزارہ اور شہر ہزارہ کا نام آنے سے کچھ رہنمائی ضروری ہے۔

بعض تدریسی حوالوں میں بھی اس مقام کی راحت ملتی ہے۔ مرزا اعظم بیگ اکٹر اسسٹنٹ کمشنر، بندوبست، ہزارہ نے جو تاریخ ہزارہ ۱۸۷۷ء میں لکھی تھی اس کا ایک جلد یہاں ملاحظہ پیش کیا جاتا ہے "ہزارہ لاہور سے ۲۳۲ میل دور، بجانب شمال دو آبہ سندھ ساگر (راہین دریاے سندھ و جہلم) میں واقع ہے۔

اس ضلع کا بڑا شہر ہری پور ہے۔ اسے سردار ہری سنگھ تلہ نے میدان ہزارہ میں آباد کرایا تھا۔ یہی ضلع کا دار الحکومت تھا۔ اگر نئی عہد کے ابتدائی دور میں بھی یہی صدر مقام تھا۔ اس لئے یہی یہ مقام ہزارہ معروف ہوا۔ ۱۸۵۷ء (۱۳۷۳ھ) میں دھمکوت کو بھجوانی کے لئے انتخاب کیا گیا کیونکہ یہ ضلع کے وسط میں واقع ہے۔ اس جگہ کو میجر جیمس ایبٹ نے یونی بھی پسند کیا تھا کہ یہاں کی آب و ہوا سرد اور معتدل ہے۔ انہی کے نام پر ایبٹ آباد کی بنیاد رکھی گئی۔ ضلع کی حدالتین ہیں ہری پور شمال مشرق میں ۳۳ میل کے فاصلہ پر ہے، مگر ضلع کا نام پر دستور ہزارہ ہی رہا۔

مقبورہ روایات سے اس ضلع کی وجہ تسمیہ یہ بھی معلوم ہوئی کہ ۱۳۹۸ء (۸۰۱ھ) میں امیر تیمور یہاں پہنچا اور قتل کوں کا ایک قبیلہ قاتل ہری پور کے گرد و نواح میں بس گیا اور ہزارہ پتا بعض ہو گیا۔ ان کے نام پر یہ مقام "میدان ہزارہ قاتل" بھی مشہور ہے۔ بلکہ ۱۸۶۸ء تک کے کاغذات بندوبست میں یہی نام درج ہوتا رہا۔ ملاحظہ میدان جہاں ترکوں کا یہ قبیلہ آباد تھا۔ ترکوں کے بقید قبیلہ پکھلی میں آباد تھے۔ شہنشاہ جہانگیر کے وقت تک یہ قبائل یہاں پائے جاتے تھے۔ اب بھی ان کی اولاد موضع گھیر وال (گہروال) میں آباد ہے۔ ایک دفعہ جہانگیر کشمیر جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تو اس قبیلہ کے سردار بھی پیش ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے قبیلہ کا نام قاتل بتایا تھا۔ یہ علاقہ ۲۰ میل لمبا اور ۲۰ میل چوڑا ہے۔ شمال و مشرق میں کشمیر جنوب میں راولپنڈی اور کسی قدر شمال و مغرب میں پشاور ہے۔ بقیہ حصہ علاقہ غیر میں بجانب غرب و شمال واقع ہے۔ اس کی تین تحصیلیں ہیں۔ سائبرہ، ایبٹ آباد اور ہری پور۔

ضلع ہزارہ کی تاریخ اور جغرافیہ پر نظر ڈالتے ہوئے مولانا سید عبدالعبار شاہ صاحب سٹھانوی (مروم) اپنی تصنیف بنی ہری میں ایک جگہ لکھتے ہیں "پھر افغانستان سے یکے بعد دیگرے قویں دوسری افغان قوموں پر حملہ آور ہو کر، ان کو ملک بدر کر کے، قابض ہوتی رہیں۔ اکثر قوموں کا بقیہ ضلع ہزارہ میں اب تک پایا جاتا ہے کہ وہاں توہین ہیں۔ دلازاگ ہیں، سلماقی ہیں۔۔۔ یوسف زئی ہیں کاکڑ ہیں۔ جردن ہیں۔ صوافی ہیں۔ ترک ہیں۔ حبیب خیل پچھلے آئی قویں آکر ملک پہلوں سے لے کر ان کو ہندوستان میں نوکھیلی رہیں۔

ثقافتی دھاروں کا سنگم ہونے کے اعتبار سے بھی یہ جگہ ایک ممتاز اہمیت کی مالک رہی ہے اور اب جبکہ اس نواح میں ہمارا نیار دارالحکومت — اسلام آباد — بن رہا ہے اس کی تاریخی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ تاریخ اپنا تسلسل منقطع نہیں ہونے دیتی — اگر کچھ کڑیاں کسی وقت محو معدوم بھی ہو جائیں تو آنے والا دور انہیں پھر مربوط و منسلک کر دیتا ہے اور اس طرح انسان کی تاریخ کا مطالعہ مرتب و مکمل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں یقین کامل ہے کہ اب جبکہ ہمارے نئے دارالحکومت — اسلام آباد — کی تعمیر یہاں شروع ہو چکی ہے مستقبل میں بھی یہ سرزمین اپنی قدیم عظمت و سر بلندی کی روایات کو برقرار رکھے گی۔

اُن سب کا بقیہ نمونہ ضلع ہزارہ میں رہ گیا ہے۔ وجہ تسمیہ ضلع ہزارہ کی ہزار ہا اقوام کا مجموعہ ہونا بتلایا جاتا ہے۔

مولانا نے لفظ ہزارہ کی بابت جس عوامی شہرت کا ذکر کیا ہے وہ درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ صرف ۲۳ قبائل کو ”ہزارہ اقوام“ تعبیر نہیں کیا جاسکتا اور یہ قبائل بھی جدا جدا اقوام نہیں بلکہ چار بڑی قوموں کے ہی برگ و بار ہیں۔

غرض تاریخ اور ادب میں ہزارہ کی طرف اشارہ جگہ جگہ ملتا ہے اور ہم اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ مقام نہ صرف اپنے قدرتی مناظر کی دلکشی، آب و ہوا کی طرنگی اور صحت افزا ماحول کے اعتبار سے نہایت نفیس جگہ ہے بلکہ تاریخ کا گہوارہ ہونے اور

دہ کریں پھول کے دیں میں۔ بقیہ ص ۳۱

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے: کتنی حسین جگہ ہے یہ! — یہاں فوٹو ہو جائے۔ ”واہ وا! سبحان اللہ!“ — یہ آواز مولانا خیری کی تھی۔ اور پھر ہم سب ایک ایک کر کے دیگن سے نیچے اتر آئے۔ پُرکون ماحول، ہر سمت ہریالی۔ ایک طرف دریا، دوسری طرف اونچی پہلی پہاڑیاں اور پہاڑیوں پر بلند قامت درختوں کا پھیلاؤ۔ ساری دنیا سحر زدہ سی لگ رہی تھی۔ سفید صاحب نے تصویریں نقطہ نظر سے ایک موزوں جگہ ہمیں کھڑا کیا اور ایک ”کلیک“ کے ساتھ پہلے کی طرح اس مقام کو بھی جاودا بنادیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم چند رگوتا کے ڈائریکٹرس بچھے پڑے پہنچ گئے جہاں کرنل صاحب ہمارے منتظر ہی تھے۔ کرنل صاحب نے چلنے سے ہماری تواضع کی۔ چائے پی کر ہم ان کے ہمراہ کرتافلی پیرل دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں ہم نے اپنے ملک کی تیسرے رشتہ رزنی کا پہنچ جس طرح چلتے ہوئے دیکھا، اس کا حال میں اگلی صحبت میں بیان کروں گا۔

★

کاکس بازار جانے والی ٹرک بھی ملی جو بارش کے سبب ناقابل گزرتھی۔ کاکس بازار ساحل سمندر پر ایک خوبصورت سا شہر ہے۔ لکڑی کے مکانات، ناریل کے درختوں کے جھرمٹ، پگڑا، مندر، پہاڑیوں پر استوپ — ترقی یافتہ شہروں سے الگ تھلگ — ایک خاموش اور پُر سکون بستی جہاں نہ شہروں کی گہما گہمی ہے اور نہ تھنخ اور بناوٹ سے ملوث زندگی۔ شہروں اور ہنگاموں سے بیزار انسان اکثر راحت اور آسودگی حاصل کرنے یہاں آتے ہیں اور رات کے سناٹے میں سمندر آسمان اور ساحل میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ طوفانی لہروں کے مدھراگ سن کر دنیا و مافیہا کے غموں سے لاتعلقی ہو کر اس کے سارے دکھوں اور غموں کو بھول جاتے ہیں۔ اس خوابناک بستی میں آفاقی سنا بھی ہے اور متلاطم اور پُرتشو سمندر کا قدرتی حصار بھی۔ سمندر کی بیکراں وسعتوں کو دیکھ کر انسان اکثر یوں محسوس کرتا ہے جیسے خود وہ معدوم ہو کر رہ گیا ہو۔

میں ابھی کاکس بازار کی پہنائیوں میں گم تھا کہ ایک خوبصورت پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر ہماری ریشمن و یگن یکھٹ رک گئی۔

★

بکھری ہوئی شبیہیں

تھرا نصاریٰ

ابر رواں

عرفات، عزیز

یہ گل نشان بہاریں

یہ سرو کے دختوں کی دل ربا قطاریں

یہ جوئے آب رنگیں

یہ احمریں دریچہ، یہ آفتاب رنگیں

رنگوں کی آبشاریں

محمل حریر و دیبا جن کے بدن نکھاریں

گوہر نشان ستارے

مستی میں قفس کرتے بدوش ماہ پارے

یہ رم گزیدہ آہو

یہ دشت آرزو کے بے اعتبار دلجو

یہ فکر و فن کے پیکر

یہ ذہن و روح و دل کے سطوت پناہ زیلہ

نازیش ہیں کفر و دیں کی

بکھری ہوئی شبیہیں، اک حسن دل نشیں کی

اس دورِ ناریسی میں

اے دل! یہ چاہتا ہوں اک باز زندگی میں

اک بُت نیابنا لوں

اس حسن منتشر کو وجدان میں سجالوں

وہ سراپائے جمال پر وقار

صانعِ فطرت کا یکتا شاہکار

آج بھی جس کلبے تجھ کو انتظار

حاصلِ نقش و نگار کائنات

آبروئے جلوہ ہائے شش جہات

مُطرب سازِ نازلِ سوزِ حیات

ایک جلوہ شاہدِ مستور کا

اک شگوفہ شاخِ بارِ طور کا

ایک ساغرِ بادہ پُر نور کا

عقبتِ قلب و نظر کا پاسباں

بخش کر مجھ کو شعورِ دو جہاں

چل دیا جیسے کوئی ابر رواں

زندگی میری ابھی معصوم ہے

غنیچہ خاموشی کا مفہوم ہے

آرزو جس کی تیرا مقصوم ہے

چھپ کر میری اُمنگوں کے رباب

چھپ گیا جانے کہاں وہ ماتِ باب

دل ہوا جس سے مہلِ اضطراب

اک طلسمِ شوخی و تحسیر ہے

میرے خوابِ شوق کی تعبیر ہے

اک مصوّر کی سبھل تصویر ہے

مادرائے حسنِ صبح و شام ہے

یاد جس کی ساغرِ الہام ہے

میرے افسانے میں جس کا نام ہے

اے حرمِ دل بتا وہ کون ہے؟

غزل

رضی ترمذی

تمہید الاسلام ستید

کیا ہوا فسانہ شوقِ ناکام
کوئی آغاز، نہ کوئی انجام
ایک لمحہ سا کہیں چمکا تھا
جس کا حاصل ہے یہ اندوہِ دوام
خاک ہے دل مگر اس پر اب تک
تیرا نقشِ کفِ پا ہے الزام
آرزو روزِ ازل سے رسوا
دل ہمیشہ سے بچا رہا، بدنام
تم ہمیشہ سے چمن کے مالک
ہم ازل سے وہی مرغِ تیر دام
گل ہوئے جاتے ہیں آنکھوں کے چراغ
اب سجاتے رہو اپنے دردِ بام
برگِ آوارہ سے پھرتے رہئے
مثلِ شبنم کہیں کیجے نہ قیام
اس سے زنجیر و سلاسل اچھے
اک قدم اور ہزاروں احکام
رفتگاں یاد بہت آتے ہیں
اب ٹھہر جا کہیں دورِ ایام
غمِ دوراں ہی غنیمتِ جانو
دلِ مرحوم چلو غم تو ہے نام
دل نے کیا راز چھپا رکھا ہے
سارے عالم میں بچا ہے کھرام

منزلِ شام و سحر دیکھتے ہیں
ہم تری راہ گزر دیکھتے ہیں

یہ کڑی دھوپ یہ تپتے صحرا

آگ تا حدِ نظر دیکھتے ہیں

صحرا زنداں کے در پہ کے قریب

چند بکھرے ہوئے پردیکھتے ہیں

بھیگتی رات یہ تاروں کا غبار

چاند کا رختِ سفر دیکھتے ہیں

زرد مٹی میں کھل اٹھے میں گلاب

شاخ در شاخ نثر دیکھتے ہیں

زخم کھلتے ہیں تو شیدائے بہار

اک نیا باب ہنر دیکھتے ہیں

ٹوٹتے پتے سلگتے ہوئے پٹر

شعلے اڑتے ہیں جادو دیکھتے ہیں

چین اور اسلام

رشتہ کی بنیاد

مستحق۔ مگر اس باب میں قورات کو نظر انداز کرنا ہی مشکل ہے جس میں واضح طور پر حضرت یافث کو حضرت نوحؑ کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-
"نوح ۵۰۰ برس کا تھا جب اس سے حالہ - سام اور یافث تھے یہی بیٹوں
نوح کے بیٹے تھے اور انہیں سے نسل انسانی زمین پر پھیلی۔" (لوقا ۱۸: باب ۹ ص ۱۱)

ان حوالوں کے بعد یہ ملنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ جن کا نام حضرت نوح کے پوتے کی وجہ سے ہی پڑا اور یہ کہ وہاں نسل آدم کے بنے اور بڑھنے کا سلسلہ ان ہی کی وجہ سے شروع ہوا۔ پھر یہ سلسلہ ہمارے وقت تک پہنچتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو وقاص، صحابی رسولؐ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اپنے قافلے کے ساتھ یہاں پہنچے۔ یہ قافلہ ایک وفد کی شکل میں تھا جو اس وقت کے فخرور چین کے دربار میں اسلام کا پیغام لے کر گیا۔ اس بات کی تصدیق کے لئے مشہور چینی تاریخ نویس ہوئی ہوئی ان والہ کا حوالہ کافی ہے۔ اہل چین حضرت ابو وقاصؓ کو ہمارے مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں شہنشاہ "یون ہوئی" حکمران تھا (۶۵۱ء)۔ حضرت ابو وقاصؓ کا انتقال بھی اسی سرزمین پر ہوا اور ان کا مزار مبارک شہر کنکین میں موجود ہے اور اس وقت مرجع خلافت ہے۔

پچھلے دنوں جب پاکستان اور چین کا سرحدی معاہدہ ہوا اور اس کی توثیق کے لئے ہمارے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو چین گئے تو ان صحابی رسولؐ کے مزار مبارک پر بھی پہنچے اور فاتحہ خوانی کا شرف حاصل کیا۔ اس پر ایک کتبہ نصب ہے جو ۱۹۵۲ء کی تاریخ ظاہر کرتا ہے جو بادشاہ یون ہوئی کا تیسرا سال جلوس تھا۔

(بحوالہ ترجمہ "یون ہوئی ان والہ" ص ۱۱)

چین ایشیا کی ایک عظیم اور نہایت قدیم سلطنت ہے جو اور باتوں کے علاوہ اپنی تاریخی ایجادات — کاغذ اور بارود — کے لئے بھی مشہور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل چین اپنی دشمنی ہندو اور ایکجا پسندی کے باعث ہمیشہ سے ہی مشہور رہے ہیں۔ خود ہماری زبان میں "مکارخانہ چین" اور "مگ چین" کے الفاظ ان کی نقش گری اور نفاست کار کی طرف ہمارا ذہن منتقل کرتے ہیں۔ چین یوں بھی ہمارے ذہن میں رہتا ہے کہ خود جعفر زکریاؒ کی زبان مبارک پر اس کا نام آیا تھا جب انہوں نے امت کو یہ ہدایت کی تھی کہ علم طلب کرو اگرچہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد نبویؐ کی تعمیل میں مسلمان یہاں آنے شروع ہوئے اور سب سے پہلے حضرت ابو وقاصؓ اپنے قافلہ کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

قدیم مخطوطات اور دستاویزوں سے یہ ظہور ہوتا ہے کہ یہاں نسل انسانی کا آغاز حضرت نوحؑ اور ان کے صاحبزادے حضرت یافث سے ہوا، جن کی اولاد یہاں کثرت سے پھیلی۔ حضرت نوحؑ کے ایک پوتے کا نام ہی چین تھا اور اس وجہ سے یہ سرزمین ان کے نام پر مشہور ہو گئی۔ مشہور مورخ محمد قاسم آفغان آبادی کا بیان ہے:
"فرزندان یافث بموجب حکم پدری سجد و مشرق شمال سے ہمارے درآں ملک اور از فرمان پدر آئند۔ ارشد اولاد "ترک" نام داشت و جمع ترکان روزگار از "مغل" و "اوزبک" و "چغتائی" و "ترکمانان" ایرانی از نسل او سبند۔ و سپردوم یافث چین نام داشت کہ ملک چین بدو موسوم است۔" (تاریخ فرشتہ، جلد ۱، ص ۵۸، سطر ۵)۔ اسی بات کی تائید حافظ ابن خلدونؒ نے بھی فرمائی ہے۔ حضرت محمود غزنویؒ کی بھی یہی خیال ظاہر کرتے ہیں۔ مگر بعض لوگوں نے اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ اور حضرت چینؑ تو کیا حضرت یافثؑ کو بھی نسل نوحؑ سے نہیں

بڑے کہ اندھنی بغاوتیں دہانے کے لئے مسلمان حکمرانوں سے مدد لی جاتی تھی۔ چنانچہ خاندان ٹانگ کے بادشاہ، جنگ یونگ کے دور میں سال جلوس میں دربار کے ایک مسلمان سپہ سالار، مسیحی، کو باہر کے مسلم حکمرانوں سے مدد مانگنے کے لئے بھیجا گیا۔ درخواست کا معقول ظاہر کرتا ہے، "ملک مغرب میں مسلمان سب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ان کی سلطنت بحیرہ روم سے کاشغر تک پھیلی ہوئی ہے۔ دنیا کے اکثر حصے ان کے قبضے میں ہیں۔ ہمارے ملک میں بغاوت ہو رہی ہے جنہیں فرو کرنے کے لئے ہمارے پاس لشکر بہت کم ہے۔ ہم مسلمانوں سے مدد کی توقع رکھتے ہیں" (محوالہ شاہی تذکرہ چین)۔

ٹانگ بادشاہ کے عہد میں ایک مسلمان کو جن کا نام یانگ یونگ تھا چنشی (ڈاکٹر) کا خطاب دیا گیا تھا۔ ۹۲۳ء میں اور دو سال جو مسلمان تھے ملک چین میں بڑی شہرت کے ملک بنے۔ ایک کا نام تھا، لی شیانگ، اسے تی بینی بھی کہتے ہیں۔ یہ اپنے وقت کا مشہور اور جلیل القدر حکیم تھا اور مسلمان دانشور "ہو کونگ یون" تھا جو بڑا زبردست شاعر تھا۔ غرض بے شمار تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ ٹانگ اور سوگ بادشاہان چین کے زمانوں میں اسلامی سلطنتوں کے ساتھ اس ملک کے بڑے اچھے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ مسلمان اپنے ملک کے بڑے وفادار تھے اور اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ خدمت وطن میں بھی دل و جان سے شریک رہتے تھے۔ مسلمانوں نے اس ملک میں اس قدر عزت حاصل کی اور اسلام کا پیغام ایسا عالمگیر ہوتا چلا گیا کہ ۱۹۲۴ء تک ان کی تعداد ایک کروڑ سے بھی متجاوز ہوئی۔ جس وقت ملک چین میں سوگ بادشاہوں کا زمانہ آیا تو مسلمانوں اور چینوں کے تعلقات اور بھی مضبوط ہو گئے، اور بادشاہ سوگ کے ساتویں سال جلوس (۱۱۳۶ء) میں ایک مالدار عرب تاجر ابوعلی، کینٹن میں آکر آباد ہوئے اور کینٹن کے ایک تحصیلدار، چن بلہ، نے اپنی حقیقی بہن کا رشتہ بھی ان سے کر دیا اور یہ کوئی اکیلی مثال نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات برابر بڑھتے رہے۔

عہد یونگ میں کوہلے خاندان کو خاص شہرت ملی اور مسلمانوں کا اثر و سیرج بڑھا۔ تولی خان، چنگیز خان کا پوتا اور ہلاکو خان کا بھائی تھا، اس تولی خان کا ایک لڑکا تھا جس کا نام

حضرت ابو وقاص کے ساتھ جو عرب مسلمان چین میں داخل ہوئے انہوں نے اسلام کا پیغام دُور دُور پہنچایا اور ہزاروں کیلا لگوں انسان اس چین میں کی روشنی سے فیضیاب ہوئے۔ اس وقت مسلمانوں کی آمد کا حال مشہور چینی مؤرخ "چاو جو یوئی" اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے: "کینٹن میں اجنبی لوگ بہت ہیں۔ ان کے کھانے بھی وہی ہیں جو ہم بھی کھاتے ہیں۔ لیکن سوار کا گوشت ان کے نزدیک سخت ممنوع ہے"۔ کتاب، THE STORIES OF HANG HAI میں مرقوم ہے کہ کینٹن میں عربوں نے ایک مینار تعمیر کیا تھا جس کا نام "دی سینک" (مینار یادگار) رکھا گیا تھا۔ اس کی بلندی ۴۰ فٹ ہے ہر صبح وہاں سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اس میں نعرے لگائے جاتے ہیں اور اس مینارہ کے نیچے ان لوگوں کی عبادت گاہ ہے۔ ایک دوسری کتاب "تاریخ یوکان" کے مؤلف نے بھی چینی مسلمانوں کی بابت لکھا ہے کہ "خان یونگ میں دریائی مسافروں نے آکر سکونت اختیار کی ہے۔ عبادت کے لئے مذہب اتھوڑھوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ صف بہ صف کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔ ان کا اپنا الگ ہی عبادت خانہ ہے مگر یہ بات معلوم ہے کہ اس میں کوئی ترشا ہوا بت یا مورت وغیرہ نہیں ہوتی بلکہ وہ آیا آیا (اللہ! اللہ!) پکارتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیا ہے۔ عبادت خانے میں لمبے لمبے کتے بھی ہیں جن کی زبان عجیب ہے۔ جب عبادت کرتے ہیں تو ایک ہی آواز طار کر نکالتے ہیں اور ایک طرف اپنا رخ رکھتے ہیں۔ اس سے ہمارے دلوں پر ان کی ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔ ایک اور تاریخی حوالہ کتاب "ٹائی پیگ" میں ملتا ہے جو ۹۷۶ء میں لکھی گئی تھی۔ "جس وقت ٹانگ زین کونگ کے لشکر نے یانگ چاو میں بغاوت کر دی۔ اس وقت جتنے آدمی ہلاک ہوئے ان میں سے کئی ہزار مسلمان تھے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اس چھوٹے سے شہر میں مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد تھی تو سارے چین میں ان کی آبادی کس قدر ہوگی۔

چین کے حکمران خاندان ٹانگ نے بیرونی مسلمان سلطنتوں سے بڑے اچھے تعلقات قائم کرنے تھے اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ خود دربار چین میں مسلمان شیر بڑی کثرت سے تھے۔ ان کی وجہ سے ہی خارجہ پالیسی ایسی بنی تھی کہ مسلمان سلطنتوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات برابر قائم رہنے اور یہ باہمی مراسم اخلاق اتنے

چاؤ۔ ہولی چاؤ۔ نیاگنگ ناگنگ چاؤ۔ مگر جب لفظی ترجمہ کی طرف خیال کریں تو یہ "اشلام"۔ "اشلا"۔ "اسلام"۔ "اسلم" ہو جاتا ہے۔ معنوی لحاظ سے "واشفا" اور "واشفی چاؤ" کہلاتا ہے۔ عہد ناگنگ میں حضور سرور کائنات صلعم کو "میرلو" یا "مخامو" اور "ناؤ" کہتے تھے۔ مگر اس کا صحیح ترجمہ ۱۹۲۸ء میں ہوا۔ کینٹن کی مسجد النبیؐ میں یہ اسم مبارک "مخامو" کی صورت میں کندہ ہے۔

یہ دعویٰ کہ اسلام بزرگشیر نہیں بھیلابل کسی حجت کا محتاج نہیں رہا ہے اور اس کے لئے شاردلائل موجود ہیں۔ دود کیوں جائیں خود چین کی مثال لیجئے جہاں اسلام کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور مسلمان عزت و وقار کی جگہوں پر فائز رہے ہیں۔ اس وقت بھی چین میں کروڑوں مسلمان ایسے ہوئے ہیں۔ بیکن اور شنگھائی میں بے شمار مسلمان موجود ہیں اور عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں خود اپنے ایک بزرگ کا واقعہ لکھتا ہوں۔

میرے یہ بزرگ ۱۹۲۶ء میں سریشیگھائی سے تشریف لائے جو وہاں عرصہ سے مقیم تھے انہوں نے فرمایا کہ اس شہر میں مسلمان بہت اچھی حالت میں ہیں اور اپنی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہاں بڑی بڑی مسجدیں بھی بنی ہوئی ہیں جو بہت خوبصورت اور صاف ستھری ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے اپنے ہوٹل بھی ہیں اور علامت کے طور پر اپنے سائن بورڈ پر ایک کوزہ کی شکل بنا دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس ہوٹل میں حلال اشیائے خورد و نوش پیش کی جاتی ہیں ۱۹۲۳ء میں "تان کینگ" کی مرکزی مجلس میں بھی مسلمانوں کی کافی بڑی تعداد شریک تھی اور اس سے مسلمانوں کی سماجی حیثیت کا علم ہو سکتا ہے تعلیمی میدان میں بھی مسلمان کسی سے پیچھے نہیں اور ۱۹۲۳ء میں وزیر تعلیم مسلمان تھے اور چینی ترکستان کا گورنر بھی حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا۔ موجودہ چین میں جب سے ماؤزے ناگنگ اور چوایں لائی کی قیادت مستحکم ہوئی ہے مسلمانوں کی سیاسی، فوجی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کی رفتار بڑی نمایاں رہی ہے اور امید ہے کہ اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

کوئٹہ خان تھا اور وہ چین پر ۳۵ سال تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکمرانی رہا۔ (وفات ۱۹۹۳ء) اس کے عہد میں سید اجل بخاری کا خاندان وزارت کے عہدہ پر فائز تھا۔ ان بزرگ کے طفیل ابھی کوئٹہ خان کا پوتا "آئندہ سلطان" والی فتلت اپنی ڈیڑھ لاکھ فون کے مسلمان بزرگ اور تقریباً سارے چینی ترکستان میں اسلام پھیل گیا۔ کوئٹہ خان کے بعد اس کا پوتا التجائی تو خان تخت چین پر جلوہ آرا ہوا جس کے اکثر امراء مسلمان تھے۔ اسی کے عہد میں وزیر رشید الدین فضل اللہ نے فارسی زبان میں اپنی مشہور تاریخ "سوامع التواریخ" مرتب کی۔ ان تمام سرگرمیوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان سیاسی اور سماجی لحاظ سے ترقی کی بڑی منزلوں تک پہنچ گئے تھے جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ تقریباً ایک سو سے زائد مسلمان چین کی مرکزی حکومت میں بڑے بڑے منصبوں پر فائز تھے اور دانش و فہم میں بھی ان کا ایک ممتاز مقام تھا۔ چنانچہ اس دور کے عظیم مسلمان شاعر، ننگ فونالگ، کا دیوان آج تک چینی زبان میں موجود ہے اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ مسلمان سیاست و ادب کے ساتھ فن تعمیر کے بھی دلدادہ تھے اور انہوں نے کئی اہم یادگار عمارات بنوائیں۔ ان تعمیرات میں سب سے ممتاز بنیاد شہر بیکن ہے جس کا بانی بزرگ تھا۔ ملاحظہ ہو "سوامع التواریخ" رشید الدین فضل اللہ علیہ السلام اس سلسلہ میں یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چینی زبان میں اسلام اور مسلمان کے الفاظ کی بھی تحقیق کی جائے۔ یہ دونوں نام چینی زبان کے ہر دو میں مختلف رہے ہیں مگر مطلب ایک ہی رہا ہے۔ ان الفاظ کی کتابت میں بھی فرق پایا جاتا ہے اور اس کا صحیح تعین کبھی نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چینی زبان میں اسلام اور مسلمان کے تلفظ و اطلاق نظر آتے ہیں مگر ان کو جس طرح بھی ادا کریں مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ بعض نے لفظوں کی صرف دیان رکھا اور بعض نے معنوں کا لحاظ کیا۔ سمجھ لوگ قوم کے لحاظ سے اس کا تلفظ کرتے ہیں اور معنی مراد دیتے ہیں۔ یہاں لفظ اسلام کا لفظی ترجمہ اور معنوی مطلب پیش کرتا ہوں۔ نسلی اعتبار سے اسلام کے یہ نام مشہور ہیں، ہولی ہولی

سُورَةُ خَالِدٍ وَنَوِيْدٍ مَسِيْحًا

کی حیاتِ طیبہ پر ”مالا نو“

کا شمارہ خصوصی

یہ شمارہ جولائی اور اگست ۱۹۶۳ء کا مشترکہ شمارہ ہوگا جو عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید کے موقع پر

شائع ہو رہا ہے

”ہم نے تمہارے لئے رسول اللہؐ میں بہترین اسوہ اور
قابل تقلید مثال قائم کی“ (احزاب)

ملک اور بیرون ملک کے نامور علما کے کام اور ممتاز اہل قلم کے مضامین نظم و نشر
روضہ مبارک کی رنگین شیبہ
مقاماتِ مقدسہ کی باصرہ نواز تصاویر۔

حضور سرور کائناتؐ کی زندگی ہمارے لئے، اور کل عالم کے لئے
ہر عہد و زمانہ میں، ایک ایسی شمسِ راہ ثابت ہوئی ہے اور ہوتی
رہے گی کہ جس کی روشنی میں ہم دین اور دنیا کی ساری نعمتیں، فلاح
اور فیوضِ حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمیں اس عہد میں روحانی بلندی اور دنیاوی برکات کے حصول میں، اسوہ نبویؐ کے روشن و انقلاب آفرین پہلوؤں کو اور بھی
زیادہ جاننے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر ”ماہ نو“ کا شمارہ خصوصی بصیرت افروز اور ایمان پرور مضامین
نظم و نشر کی ایک سلسلہ مرقعہ پیش کر رہا ہے۔

یہ شمارہ خصوصی جو جولائی اور اگست ۱۹۶۳ء کی مشترکہ اشاعت ہے، جولائی کے وسط میں شائع ہوگا۔ قارئین اور
ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں اور مطلوبہ تعداد ”مسیرت رسولؐ نمبر“ سے فی الفور مطلع کریں۔

ضخامت تقریباً دو سو صفحات، قیمت ۲ روپیہ

۱۵۱۱ مطبوعہ پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

ماوشا

ستیم قدرت نقوی (ملتان)

تو نہیں البتہ تصور میں باطن پرودہ سمیوں کی طرح فلمی نمائش کا سافقت
جہ کیا۔ بیساختہ زبان سے نکل گیا۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
واہ بسے ابہام و اشاریت کا کمال! بقدر۔ بائت راز دلی پر سہا
سب دفتر کھلا، مگر غیر کچھ بھی نہ سرتا سر کھلا۔
- اک بزرگ ہمیں ہمسفر لے "خوب! چچا غالب اور امریکہ کی
سیر! اچھی سوچی! لطف آگیا۔ جیل نقوی صاحب اور آفاق عشاء
کو کس لئے شریک نہیں؟ کیلہ تھے نہیں چرلے؟

فروغی کا پرچہ ملا تھا۔ پڑھا، دل خوش ہو گیا، بیساختہ داد
دیے کوچی چاہا۔ اب کے تو پورا غالب نمبر بنا دیا ہے۔ اللہ کسے جوش
عمل اور زیادہ! عنوان نزلے، مضمون انوکھے، نظمیں لا جواب شمار
دامن دل می کشد کہ جا اینجا است کا مصداق! مولانا تھر کا مضمون
مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔ واقعی ہمیں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں
کرنا چاہیے کہ غالب نے اسلاف کے سرمایہ سے کیا فائدہ اٹھایا اور
اس پر کیا اضافہ کیلے۔

غالب نمبر کے سطح میں آپ سے داد پائی۔ ہم تو
اس کو شش میں تھے کراتے اور مٹی دینے دلیع بناتے
مگر جتنائے صفحات اور لکھنے والوں کی کوتاہی
عارض ہوئی اس لئے جو کچھ دلیا دیا متیرا یا
حاضرین کی خیانت طبع کے لئے پیش کر دیا۔ اچھے
خوش ذوق حضرات نے اسے المان نعمت کا
مصداق سمجھا یہ ادارہ کے لئے باعث صد شکریہ۔
(مدیر)

رشید امجد دراولپنڈی

ماہ نومبر ۱۹۶۲ء میں میری مبلوہ لوک کہانی "لہ سے
متعلق سلیم خاں لگی صاحب نے بعض بحثات کے بعد فرمایا ہے کہ لہ
لوک کہانی نہیں بلکہ مضمون ہے۔
غالباً معترض نے لہ کے شروع میں دئے ہوئے نوٹ کو
بغور نہیں پڑھا۔

لوک کہانی کا رابطہ عوام سے ہے اور لوک کہانی کہنے
والے لغت داں، مؤرخ یا محقق نہیں ہوا کرتے بلکہ جو سنتے آتے

ماک رام صاحب کو "مولانا آزاد بنام غالب" اچھا مضمون
سوچا.... مگر پہلو دار جملوں سے ذمہ کا پہلو کیوں بھالا جائے۔
"نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ ہم کیوں کسی کی نیت پر حملہ کریں۔ اگر یہی
بات ہے تو آجیات میں اس پہلو واری کا شکار کون نہیں ہے مولانا اللہ
کے خلوص میں شک کی گنجائش نہیں، غالب کی وفات پر قطعہ خارج اس پر
دال ہے جو غالب اگر وہ یا دہلے کسی اخبار میں شائع ہوا تھا اور پھر اس
دور کے حالات، تہذیب، ذہنی افتاد اور تاریخی عوامل کو سامنے رکھ کر
دیکھا جائے تو مولانا آزاد نے حقیقت کے خلاف نہیں لکھا ہے۔
آزاد کا مرتبہ اس سلسلہ میں اس لئے بلند ہے کہ مولانا آزاد ہی
کے تذکرہ نے مولانا حالی کو یادگار غالب لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔
مولانا حالی نے تذکرہ آزاد سے کما حقہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ہمیشہ یائیں
آجیات ہی سے لگتی ہیں۔ رہا زبان کا معاملہ تو مرزا کی زبان پر
دلی والوں نے ہمیشہ ناک بھوں چڑھائی ہے۔ حالی یادگار میں زبان
کے مسئلہ کو بالکل ہی گولی کر گئے ہیں۔ اگر زبان کے متعلق انہیں لکھنا پڑا
تو وہ بھی دلی کی حادراتی زبان سے غالب کی زبان میں دیکھاتے۔
... "گنجہ باز خیال" کی گنجہ بازی نے نہ معلوم کتنی محفلیں
برسم کردیں، نہیں، بلکہ پیش کردیں۔ نیز گیک تنہا نہ کی رون گردانی

انہیں آئندہ فساد کو سنا دیتے ہیں۔

میں نے بھی اسے جس طرح سنا، لکھ دیا۔ میں نے یہ لوگ کہانی تحریر کی ہے کوئی مضمون یا جوابہ "شمون" نہیں لکھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو نہ صرف اللہ کے نام سے متعلق بلکہ اس کی تاریخ پیدائش و وفات کے بارے میں بھی بحث و تحقیق کرتا۔

دنیا کی بیشتر لوگ کہانیوں سے متعلق اختلاف رائے ہے۔ اللہ ہی کو لکھیے۔ "تذکرۃ العارفین"، "اسرار الابرار" تاریخ کشمیر، "تاریخ کشمیر" تاریخ جدولی کشمیر میں اس کے متعلق حوالے ملتے ہیں۔ منشی محمد الدین فوق (مروج) نے بھی اپنی کتاب "لذکارہ" میں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ لیکن تذکرہ نویس اس کی تاریخ پیدائش و وفات سے متعلق بالو خاموش ہیں یا اختلاف رکھتے ہیں۔ آج تک یہ نہیں چلی سکا کہ اللہ مسلمان تھی یا ہندو کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اللہ نے سید حسین سمٹائی جس کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ ایک نظم میں مشہور اوہلئے کرام اور عارفان حق کے ساتھ اللہ کا ذکر بھی موجود ہے:

ازاں حمد لائے عارف
کہ اسرار حق را بود کاشفہ
ز سید حسین منفعت یافتہ
سوئے مرکز صدق بشناختہ

لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے اسے ہندو ہی لکھا ہے۔ اسی طرح اللہ کے نام کا مسئلہ ہے۔ فوقی نے اس کے کئی نام لکھے ہیں مثلاً دل دو، دل شوروی، اللہ ایشوروی، اللہ عارفہ، وغیرہ۔ معلوم نہیں اس میں کونسا نام درست ہے۔

لہذا کردار دراصل ہندوستانی معاشرت کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ کہانی علامتی ہے اور اس لئے سنائی جاتی ہے کہ عورتوں میں فرماں برداری اور فرض کا احساس پیدا ہو۔

لہذا اس کے ظلم صرف اسی لئے برداشت کرتی ہے کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے۔ کیا کسی ایسی بیوی سے جو ساس کی اتنی عزت کرتی ہو یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے خاوند سے بھی

بے پناہ محبت کرتی ہوگی۔ سمجھ میں نہیں آتا بیوی کا خاوند کے گھر میں بازو حاصل کرنا کیوں قابل اعتراض ہو؟

اسی طرح چاولوں کی طشتری میں پاٹ کی موجودگی سے متعلق میں اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ کہانی اسی طرح سنی ہے۔ اگر پاٹ اللہ کے شمسرتے ہی دیکھا تو اس سے کہانی کے پاٹ پر کون اثر نہیں پڑتا۔

شاہ ہمدانی کا نام محمد الدین فوق نے سید علی ہمدانی لکھا ہے۔ "لذکارہ" - فوقی: صفحہ ۸۰۔

مختصر یہ کہ اللہ صرف لوگ کہانی ہے اور اسے اسی طرح سنا دیا گیا ہے یہ کوئی تحقیقی چیز نہیں ہے۔ رہ گئی اس کی ترویہ لیکن ایک پریوری اترتی ہے۔ اس میں نقلہ عروج و خیرہ موجود ہے۔ لہذا اسے افسانہ ہی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ مدیر ماہ تو نے بھی سے ترتیب دینے ہوئے افسانہ ہی لکھا ہے:

آپ کا خط کچھ عرصہ سے ہمارے پاس محفوظ تھا اور اب شائع کیا جا رہا ہے جس میں آپ نے کئی صاحب کے کچھ اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ یہ ظاہر بہ بحث طوالت طلب نہیں معلوم ہوتی اور آپ کا یہ موقف کہ اللہ محض ایک، لوگ کہانی ہے اور اسے ایسا ہی سمجھنا بھی چاہیے، درست معلوم ہوتا ہے۔ بہت سی لوگ کہانیاں تحقیق اور ترقیق کی خوردبین کے نیچے اگر جزئیات میں پرانندہ نظر آتی ہیں اور تاریخی شواہد کی آنکھ تو انہیں اور بھی زیادہ گھٹلا دیتی ہے اس لئے ان کا متن بس یہی ہے کہ انہیں اساطیر الاولین کے ذیل ہی میں رہنے دینا اور جو راوی اسے جس طرح بیان کر دے سن لیا جائے تاکہ حکایت بے فرائض ہو۔

(مدیر)

مرگِ شوکت: — ”حقیقی معنوں میں ایک قومی سانحہ۔“
 — ”مجھے ان کی وفات سے بجز درد مرہنہ نہیں ہے۔“
 — ”ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔“
 (صدر پاکستان)

وہ عدم کے پہاڑ تھے چلا گیا۔
 وہ اپنے چچے، کچھ یادیں اور اپنی کچھ باتیں چھوڑ گیا۔ مگر کتنا تمام۔ شاید ناقابلِ تمام۔
 ایک مشاقِ صفائی، ایک بے ہول شکار، لوہیں، اور شکر منگل دوست ہم سے جدا ہو گیا۔ اور کیسے وقت!
 اس کی ادنیٰ شہرت ”سودیشی ریل“ سے شروع ہوئی اور پھر تو اس کے ہاں وہاں رکھلائے والے قلم نے مضامین قلم کے ایسے ٹوہ فوٹا نبار لگائے
 کہ اس کی سودیشی ریل بھی بہت پیچھے رہ گئی۔ وہ قاضی جی بنگر بھی آیا اور ہر شام کیا کیا ادائیں نہ دکھا گیا۔ اس کی باتیں یاد رہیں گی،
 اس کی ہنسنے والی باتیں ہمیں کیا کیا دُر لائیں گی۔

اب میں ظرافت سب سے ڈیرھی کھیر ہوتی ہے اور اگر آدمی یہ حس قدر کا لیکر پیدا نہ ہوا ہو تو اسے نبھانا مشکل ہو جاتا ہے اور آدمی اگر
 لکھتا ہی رہے تو خود اک احمق کہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اس صنف میں ممتا نہ تمام پیدا کرتے والے چند ہی نام نظر آتے ہیں۔
 افسوس کہ یہ کھینچ پک کھینچ جس قدر جلد پیدا ہوتی تھی، اتنی ہی جلد ختم بھی ہو گئی۔
 فرحت اللہ بیگ گئے، عظیم بیگ چغتائی پر وہ کر گئے۔ پطرس، حسرت، مجید، سالک، — غرض کس کس کی یاد اس وقت نہیں
 آ رہی ہے، اور آج ہم شوکت کا پر سادے رہے ہیں، اُس شوکت کا جو ساری عمر ہمارے سامنے نشاطِ فکر، تبسم اور قہقہوں کی دولت لٹاتا
 رہا۔ آج ہم اس کا قرض چکا بھی رہے ہیں تو آنسوؤں کے خراج سے! زندگی کا یہ نہر خند بھی کیسا قاتل ہے!

شوکت تھانوی (— آہ — مرحوم!) کے پسندیدگان کے ساتھ ادارہ ان کے غم میں شریک ہے اور اپنے دلی تعلق
 اظہار کرتا ہے (ادارہ)

”نوائے دوش“ بقیہ منہ

یوں کہینا ہے!

بہ کثرت ریا حین و گل ہلے رنگیں
بہ افراط شمشاد و سرو و صنوبر
درختوں پہ پھل اور پھلوں پر پرندے
زمین پر دھبے دیتی ہیں ٹہنیاں سر
ہوئے ہیں مگر چھپے سنتے سنتے
شب و روز و صبح و مساؤں گل کو
ہر اک قطعہ پھولوں کے تختے کے تختے
ہر اک حوض پانی کی چادر کی چادر
تعالی اللہ فواروں کی سر بلندی
کہ قطرے بنے انجم چرخ چنبر
فواکہ اگر کھائیے رزق طیب
شگوفے اگر سو نگینے مشک و عنبر
سنے ہوں گر اوصاف جنت کے قلم نے
اسی کا نمونہ تمہارے زمیں پر

نذیر احمد طنز و مزاح میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کی
یہ خصوصیت ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ یوں تو ہر نظم میں ایک اور
”شوخی“ شعر موجود ہے، لیکن مندرجہ ذیل مختصر نظم سے نذیر احمد کے
کلام کا یہ پہلو بڑی خوبصورتی سے واضح ہوتا ہے، یہ نظم سینٹ آگسٹین
کا لچ دہلی کے کسی جلسے میں پڑھی گئی تھی:

آؤ دیکھو شش کے لڑکوں نے جھولتے جھولتے بڑھائی پینگ
سب کو جلسے میں کھینچ بلوایا اس کو شیخی قرار دیا ڈینگ
یعنی پھڑوں میں کتنے بڑھے ہیں آن شامل ہوئے کٹا کر سینگ
یہ جو بیکپر ہے اپنے گھر جا کر اس کو چاٹا کرو لگا کر ہینگ
اس مختصر سے مضمون میں نذیر احمد کا ان کے ماحول
سے موازنہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس کی ضرورت
بھی نہیں، اس لئے کہ نذیر احمد کی شاعری موازنہ و مقابلہ کی متعل نہیں
ہو سکتی۔ یہ صیح ہے کہ وہ بڑے شاعر نہ تھے، لیکن یہ صیح نہیں کہ
ایک بڑے ادیب کے ذہنی رجحانات کو سمجھنے کے لئے اس کی شاعری
کو وہ اہمیت نہ دی جائے جس کی وہ مستحق ہے۔

”اک طرفہ تماشا تھی....“ بقیہ منہ

لطف کی ان سے التجا نہ کریں ہم نے ایسا بھی کیا، نہ کریں
دل بہ گد جاؤں سے ملتا ہے لب کو شہر مندہ دعا نہ کریں
حسرت نے غزل کے میدان میں وزیر، صبا، امانت اور
فلق کی ہمقدمی سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ ادھر معاشرہ میں
داغ اور امیر جیسے اساتذہ بھی موجود تھے جن کا کلام پیش نظر رہتا
تھا، مگر غزل میں ان کا سفر آگے بڑھتا گیا غزل میں ایک نئی راہ نکالی
اور مضامین تازہ کے ایسے نمونے پیش کئے کہ اردو غزل میں ان کا ایک
منفرد و ممتاز مقام پیدا ہو گیا جسے رنگ حسرت کہنا بالکل بجا ہے۔
ان کی غزل میں عشق، خلوص، معصومیت، درد مندگی اور سپردگی
خاص طور پر نمایاں ہے۔ فراق کا یہ کہنا کہ حسرت اپنے پیشروؤں کے
انداز بیانی و وجدان اور فنی شعری انتہا تکمیل ہے، کوئی مبالغہ نہیں
ان کی حبسیات کا یہ رخ بھی اک طرفہ تماشا ہی ہے کہ

جیل میں کافی طویل زمانہ گزارنے کے باوجود انہوں نے کلام پر
اس کا کوئی براہ راست اثر پیدا نہیں ہونے دیا۔ چند اشعار کو چھوڑ
کر ان کے کلام کے تیور اور انداز بیان ایسا ہے کہ اسے جس فننگ
کی دین نہیں کہا جاسکتا۔ غزل سے ان کی شیفنگی مشہور تھی اور
وہ اسی رنگ میں کہتے رہے۔ سب سے بڑی بات انہوں نے
یہ کہ غزل کو درباریت کے رنگ سے آزاد کیا اور واردات
دل کی شرح و بیانی کو ہی اپنا شیوہ سخن بنایا جو ان کے عشق اور
خلوص و نیاز کا ایک آئینہ مصفا معلوم ہوتا ہے۔

غرض حسرت کی زندگی کے کسی پہلو کو بھی دیکھیں ایک
انفرادیت اور انوکھا پن اس میں ضرور نظر آئے گا، خواہ وہ
سیاست کا خازن رہا ہو یا شعر کا گلستاں۔

عالم یک شہر جستجو: ————— بقیہ صفحہ ۱۳

دوخ سے دوغ (چھاپہ) بنا اسی سے انگریزی (DAUGHTER) ڈاٹر
ہے جس کی املا میں غ کی آواز (GH) موجود ہے مگر تلفظ سے ساقط
ہو چکی ہے۔ رخ کا تبادلہ رخ سے بھی ہوتا ہے دوخ سے دوغ بنا ہے
علامت تائید "ٹیک" لگا کر پہلے "دوخیڑک" بنا، اس کے بعد "دوخیڑک"
دوخیڑہ کی شکل اختیار کی مگر اس کے معنی میں ذرا تغیر آیا ہے، یعنی
دوخیڑہ صرف نوجوان لڑکی کے لئے مخصوص ہے۔

ہماری موسیقی

موتیہ: رفیق خاور

نئے موضوعات کا اضافہ
پاکستانی موسیقی کے موجودہ مسائل
ساز و آہنگ کی دنیا میں مسلمانوں کا عظیم حصہ
مسلمان نمک و لہجہ کے اعجازات موسیقی، تمدن و تاریخ انسانی میں نغمہ و آہنگ نے کیا کردار ادا کیا۔

چند موضوعات

مشاہیر موسیقی: امیر خسرو، سلطان حسین شرقي، میاں تان سین، شاہ عبداللطیف جھٹکی، تنہا خاں، بہت حال، فیروز خان
تاریخ موسیقی: موسیقی اور تمدن عالم موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ، پاکستانی موسیقی، ہماری موسیقی کے ساز
پاکستانی موسیقی: مشرقی پاکستان کے لوگ گیت، رنگ و روپ (وارث شاہ)
مسائل موسیقی: تجدید موسیقی، فوری نوازے کی موسیقی اور سرگم، ہماری موسیقی کے مسائل، سرفروسی۔

چند مہتمم از انجمن علم

سید عابد علی، عابد، جناب شاہد احمد دہلوی، جناب خادم
محمود الدین تاجو، احمد میاں اختر جوگیا، ڈاکٹر نبی بخش خان
بلوچ، فیروز نظامی، سید محمد آغا، سجاد سرور نیازی، احمد
چاگلا۔ سید محمد علی، عاصم حسین، امین الرحمن، رفیق غریبی
اور ماہنامہ آذادی۔

کتاب میں مختلف سازوں کی آرٹ پر بھیچے ہوئی آٹھ صفحے
کی انہیں تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب نفیس اردو ناسپ
میں نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت سرورق کے ساتھ
شائع کی گئی ہے۔ قیمت صرف پانچ روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۳۸۳ کراچی



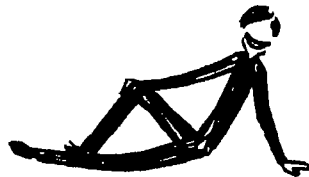
رحمت
یا رحمت؟

یہ صفائی کے استعمال پر منحصر ہے!

خون میں سرایت کئے ہوئے فاسد مادے برسات
میں پھوڑے پھنسی بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ ان موکی
فوارضات سے محفوظ رہنے کیلئے صفائی استعمال کیجئے۔
یہ خون کی صفائی اور تقویت کا بہترین ذریعہ ہے۔

صافی

برسات میں صحت و عافیت کیلئے



خون صاف
کرنے کی
قدرتی دوا



ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چٹاگانگ

تین عہد

- آپ کو ہر شب اپنے ضمیر سے یہ سوال کرنا چاہئے کہ دن بھر میں آپ نے پاکستان کیلئے کیا کیا۔ پھر اس جواب کا موازنہ کر کے یہ دیکھنا چاہئے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ آپ کی شان کے شایان بھی تھا یا نہیں۔
- پاکستان کے نظریاتی بنیاد کیلئے اپنے تمام قلبی ذہنی اور روحانی وسائل وقف کر دیجئے۔ تاکہ ہم اس موقع سے جو قدرت نے عطا کیا ہے۔ فائدہ اٹھانے میں پیچھے نہ رہیں۔
- پاکستان کے مالی بینکوں میں اپنی پس انداز کی ہوئی تمام رقمیں اور منافع جمع کیجئے تاکہ وہ عظیم ترقیاتی منصوبے جو اس وقت زیر تجویز ہیں آسانی سے پایہ تکمیل کو پہنچیں۔ اور آنے والی نسلیں زیادہ خوشحال، مسرور اور پرسکون زندگی محظا ر سکیں۔

یونٹ انقلاب کی دوسری سطر کے موقع پر

صدر پاکستان فیملڈ مارشل محمد ایوب خان کا قوم کے نام پیغام

ان مخلصانہ عہدوں میں جو منصب العین پیش کیا گیا ہے اسے رو بہ عمل لانے کیلئے نیشنل بینک آف پاکستان نے اپنی بہترین کوشش صرف کی ہے۔ اسے توقع ہے کہ سارے ملک میں ۲۹۷ دفاتر بچت کی جو سہولتیں فراہم کر رہے ہیں عوام ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

منظور شدہ، مادی کردہ

اور اقرا ری اصل سرمایہ

۴۰۰۰ روپے

اداشدہ سرمایہ

۱۰۸۰۰۰۰۰۰ روپے

محفوظ رقم

۳۰۰۰۰۰۰۰ روپے

رقوم امانت تا ختم جون ۱۹۶۳ء

۴۰۰۰۰۰۰۰ روپے

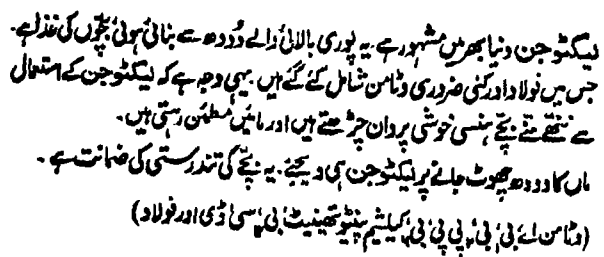


نیشنل بینک آف پاکستان

ہیڈ آفس :- بندر روڈ - کراچی



تندرست نیچے
مطمئن مسائیں



جَبَ ماں کا دودھ کا رگڑ نہ ہو تو لیکٹوجن پر بھر دے کیجئے

نام _____
 پتہ _____

'The Lactogen Mother Book'، صفحات کی یہ تصویر کتاب مفت حاصل کرنے کے لئے اس کو پُر کیجئے اور ڈاک حشرج کے لئے چھپس پیسے کے ٹکٹوں کے ہمراہ اس پتہ پر روانہ کیجئے۔

نیسلرز پروڈکٹس پوسٹ بکس ۲۹۹۲-۱۵ ویسٹ وارٹ روڈ- کراچی

LAC.I 63

یہ خوشنما اور آرام دہ لباس



بسنوں اور ہرنائی کے اُونی پارچہ جات سے بنے ہیں

ان کا ہریشہ اور ہر ہفت گرمائی پہنچاتے ہیں اور ہر ڈیزائن جدید فیشن کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے

مردوں، عورتوں اور بچوں کے اونی لباس
کے لئے عمدہ ڈیزائن اور دلکش رنگ انتخاب کیجئے۔

اور کوٹنگ، ویلور، بلیزر کلاتھ، کمبل

اب ہرنائی ورسیٹڈ اور سوئنگ بھی جدید ترین ڈیزائنوں میں دستیاب ہیں۔

مغربی پاکستان بھر میں مقررہ ڈیلروں سے خریدیے۔

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

۶	سیلاب اکبر آبادی (مرحوم)	روکش منزل (نظم)	یہ یاد قائد اعظم:
۷	یوسف عبداللہ	"طبع بلندے مشرب تابیہ" (مقالہ)	
۱۰	عبدالغنی شمس	منزل آشنا (نظم)	
۹	منظر صدیقی	حسن فیضان (نظم)	
۱۱	انور سعید گیلانی	حسن کلام آئینہ (صدر پاکستان: تازہ فرمودات پر ایک نظر)	مسائل امروز:
۱۳	الطاف پرواز	مسافران شب (دور حاضر) (نظم)	
۱۵	احسان اللہ دانش	افتخار تاب (صاحبزادہ سر عبدالقیوم، مرحوم) احسان اللہ دانش	اکابر ملت:
۱۸	احمد فراز	افسانہ، ڈرامہ، پلوتنا: اے روسینیوں کے شہر! (ڈرامہ) احمد فراز	
۲۹	اللہ بخش راجپوت	جنگل جنگل، پریت پریت (مشرقی پاکستان: پہاڑی علاقے میں ایک اور یادگار سفر)	
۲۶	لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید	جہاں میں تھا، (ایک تاثر)	
۳۳	وجاہت حسین سوئی پتی	ایسا گماں نہ تھا (انسان)	
۳۷	طاہر احمر	سونہ می	ثقافت:
۴۵	سیدنا ہد الرحیم	ستارہ مشرق (سید حافظ حسین: ایک تعارف)	فن:
۴۲	اقبال نبوی	کالی گرم (سابق صوبہ سرحد)	مقامات:
۴۰، ۴۱	حشم لکھنوی	جمیل نقوی • عبداللہ قادر • شیدائگی • حشم لکھنوی	غزلیں:
۴۸	مصباح الحق	تجام ادب (جم اور حقوق انسانی)	گرد و پیش:
۵۲	ر-خ	اپنا نہیں وہ شیوہ	فیچر:
۵۷	صغریٰ ربانی	قائد اعظم (رنگین نقش)	نئی مطبوعات:
			سرورق:

روکش منزل

(قائد اعظم باریک گاہ باری تعالیٰ میں)

سیلاب اکبر آبادی (محلوم)

باری تعالیٰ :

باری تعالیٰ :

ہم نے دنیا میں مٹانی جاہ و ملت دی تھی جو رفیع اہل شہرت تھی، شہرت دی تھی
اک نئی جوت مٹا کی اگر اچھوتا تھا، ایک بڑی قوت بغیر علم و حکمت دی تھی
مشرق و مغرب ترے افکار سے خوب تھے خود معلم بن کے تعلیم سیاست دی تھی
صرف پاکستان ہی بھگو نہیں بخشا گیا پاک نیت پاک طینت پاک سیرت دی تھی
”قائد اعظم“ تھے سارا جہاں کہنے لگا کاروان اہل ملت کی قیادت دی تھی
اب جو ہو کر فائز منزل یہاں آیا ہے تو
پیشکش کو کیا ہمارے سامنے لایا ہے تو؟

ملت مرحوم کا ہمتوں بہاؤں گے تھے تیرے ایثار مسلسل کھلا دیں گے تھے
خونِ ناسخ سے رنگے جن دشمنوں نے لپٹا کیا آل ان کا ہوا یہی بتا دیں گے تھے
بھگو تالیخِ مجاہدان تو بھلا سکتی نہیں اویں پاکستان کے فتنے بھی مالا تھے
اب چلیے دیکھ دیں گے نقوشِ پاترے ہم منارِ روشنی منزل بنا دیں گے تھے
قوتِ عزم و عمل بخشیں گے تیری قوم کو مٹا دے دل بقدرِ اتحاد دیں گے تھے
حال بھی روشن ہے پاکستان کا، مستقبل بھی
اس کو استحکام بھی قسمت ہے، استقلال بھی

قائد اعظم :

قائد اعظم :

ہر ہیئت بہ درگاہِ خدا لایا ہوں میں اُمتِ ختمِ رسل کا شکر بالایا ہوں میں
اپنے کا فوری کفن کے گوشہِ محد میں خون بھر کر ملتِ ظلم کا لایا ہوں میں
پیش کرنے کے لئے منجانبِ قوم ضعیف استغاثہ مشعلِ برخوں بہا لیا ہوں میں
دفرِ مستقبلِ ملت ہے شایانِ کرم دستِ خدا کو محض اہل و فالایا ہوں میں
دستِ لرزاں میں میرے نقشہ ہے پاکستان کا اور اس کے ساتھ ہی یہ التجایا ہوں میں
بسکہ ہے آغازِ تیرے ہاتھ اور انجام بھی
سلطنتِ دی ہے تو اب دے اس کو استحکام بھی

میں ہوں یا دستِ تنگ دامن تیری محبت میں اپنے چلنے کا اب بھگو ذرا بھی غم نہیں
اب میری پی قوم پسند نہ کو دیتا ہوں پیا ہے یہ وقتِ شادمانی موقعِ ماتم نہیں
کلِ نفوسِ خیر نے دلے کیوں ہیں بھڑوہ خوا میرا جانا خلافتِ فطرتِ عالم نہیں
زندگی تو دماغوں میں چلی چاہئے یہ قنوط و یاس شلیلین بنی آدم نہیں
اس کا مسلک اس کا نصب العین تو وجود تم میں گواہی تھا نا قائد اعظم نہیں
گر نہیں قائد نہ ہو، کوئین کا آقا تو ہے

نندہ دہاتی محمد ہے اعظم واعظِ قوم ہے
(دسمبر ۱۹۷۲ء)

طبع بلندے، مشربِ نلبے

(بیاد قائد اعظم)

یوسف عبد اللہ

ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کی تنظیم اس وقت کس قدر ناقص تھی اور مسلمانوں کو ذرا بھی علم نہ تھا کہ اس کا پروگرام کیا ہے، بلکہ سچ پوچھا جائے تو اس کا سرے سے کوئی پروگرام تھا ہی نہیں اور تھا بھی تو بالکل بملے نام اور اسے کوئی بھی کار نمایاں دکھانے کا شرف حاصل نہ تھا۔

غرض وہ سیاسی جماعت جس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ مسلمان ہند کی قیادت کا حق ادا کرے گی، اس کی کیفیت یہ تھی اور جب سربراہ کی یہ حالت ہو تو تقویر کیا جاسکتا ہے کہ خود مسلمانوں کا حال کیا ہوگا۔ جن کا شیرازہ بری طرح درہم برہم تھا۔ حوصلہ پست، حالت زریں، امید موہوم۔ یہ دل شکن حالات تھے جب قائد اعظم نے ان کی قیادت کا بار امانت اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

اس قیادت کے نتائج بھی جلد مرتب ہونے شروع ہو گئے۔ نواب اسماعیل خان ان کے معاون کار بستے۔ ان کی بہترین خوبی ان کا اعلیٰ اخلاقی کردار اور حسن نیت تھا۔ انہوں نے قائد اعظم کا ہاتھ بٹایا اور مسلم لیگ کی کاپیالٹ ہو گئی۔ یہاں تک کہ ۴۷ء میں اس کا ایک معین مقصد ایک واضح سمت متعین ہو گئی۔ مسلمانوں کے دل میں ایک دلولہ تازہ پیدا ہوا اور ان کی از سر نو تنظیم معرضِ عمل میں آئی۔ بیوردی مجلس کے الفاظ میں صورت حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ قائد اعظم مسلم لیگ کو جیسے اور جس طرف بھی چاہتے لے جاسکتے تھے۔ ایک موقع پر قائد اعظم نے فرمایا:

"میرے دس کروڑ ہم مذہب میرے اور صرف میرے کہنے پر دائیں بائیں، سامنے، پیچھے، غرض جہر بھی حکم دیا جائے، جانے کو تیار ہیں؟ اور یہ بالکل سچی بات اور تسلیم شدہ حقیقت تھی۔ اس زبردست عوامی عقیدت سے بابائے ملت نے بڑا تعمیری کام لیا۔ سب سے پہلے انہوں نے پوری ملت کی شیرازہ بندی

بابائے ملت، محمد علی جناح کی شخصیت میں چند باتیں خصوصیت سے نمایاں ہیں۔ ان کی زبردست ذہنی توانائی، ان کی وسیع النظری اور بلندی کردار۔ یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ تاریخ کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ صرف اپنے کارہائے نمایاں ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ خود کس قدر بزر عظمت تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بابائے ملت بڑی ہی اعلیٰ درجے کی قیادت کی خوبریں سے بہرہ ور تھے۔ اور ان کی تنظیمی صلاحیت تو بے پناہ تھی۔ چنانچہ جب ۲۳-۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت ناکام ثابت ہوئی اور مسلمانوں کا کوئی ایسا رہنما نہ رہا جسے حقیقی معنوں میں سربراہِ ملت کہا جاسکے تو برطانوی استعمار پسندوں کو ملے دے کر یہی بے نصیبت قوم نظر آئی جسے وہ اپنے غیظ و غضب کا تختہ مشق بنائے۔ یہ وہ دن تھے جب گاندھی جی نے مولانا محمد علی کو بری طرح کا وادیا تھا۔ اور وہ یوں کہ فروری ۳۲ء میں چوری چوراہا کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ گاندھی جی نے اسی کو بہانہ بنا کر تحریک کو واپس لے لیا، اور پھر لگے کانگریس کی قیادت کو مسلمانوں پر زبردستی مسلط کرنے۔

مسلمان، قدرتی طور پر اس تحریک کی ناکامی سے بہت ہی بد دل اور مایوس ہوئے۔ یہ بد دلی و مایوسی دوسری دہائی کے آخری دنوں اور تیسری کے شروع میں انتہا کو پہنچ گئی۔ اس لئے انہوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ وہ زندگی کی اصلیتوں سے روگرداں ہو کر ملکی مسائل و معاملات سے الگ تھلگ رہیں۔

وہ پُر خلوص مسلمان جنہوں نے مولانا محمد علی کا سیاسی انجام دیکھا تھا، کانگریس سے کنارہ کش ہونے لگے یہ بڑا نازک مرحلہ تھا بڑا آڑا وقت تھا، جب ۳۷ء میں قائد اعظم نے مسلم لیگ کی عنوان قیادت اپنے ہاتھوں میں لی۔

کی اور ان کو اس طرح راہ عمل پر لگا دیا کہ وہ "راہ مختصر" کے وسیلے سے اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۰۷ء کو یہ منزل طے ہو گئی اور کاروان ملت اس طرف روانہ ہوا اور صرف سات سال کی قلیل مدت میں منزل کو چالیا۔

واضح رہے کہ قائد اعظم کے ہاتھ میں کمال آواز رک کی طرح کوئی بے اندازہ قوت نہ تھی جس کا وہ جیسے چاہیں استعمال کر سکیں۔ ان کے ساتھ بہارک یا ہندن برگ کی طرح کوئی لشکر چڑا بھی نہ تھا۔ پھر بھی وہ اپنا نصب العین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، جسے لوگ ناممکن خیال کرتے تھے۔ بیشک انہوں نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ بلکہ ایک برجستہ بات تو یہی ہے کہ قائد اعظم نے تاریخ کو تخلیق کیا۔ بے شک وہ ایک بہت بڑے سیاست داں، صاحب تدبیر قائد اور بے اندازہ تنظیمی صلاحیت کے مالک سربراہ تھے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ قائد اعظم ایک بہت بڑے حقیقت پرست بھی تھے اور وہ اسی وجہ سے بڑے شعلہ دل کے ساتھ، منطق و استدلال سے کام لیتے ہوئے بالکل درست نتائج تک پہنچتے تھے اور حالات کا صحیح ادراک کر کے نہایت صحیح نکات اخذ کرتے تھے۔ یہی عظیم صلاحیت تھی جس نے انہیں خواب و خیال کی دنیا میں گم ہو جانے سے باز رکھا اور ہمیشہ زندگی کی کڑی اصلیتوں پر نظر رکھنے اور ان سے روبراہ ہونے کی تحریک دلائی۔

اس سے پہلے سید احمد شہید بریلوی تھے، جنہوں نے سابق پنجاب و صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی آزادی کے لئے بے باکی و شجری کے ساتھ جہاد کا علم بلند کیا تھا، اور ان میں اپنے نصب العین کی جدوجہد کے لئے بڑا عظیم جذبہ ابھرا تھا۔ لیکن ان کی تحریک نے قوم کے نوجوان افراد کو اپنی طرف اس قدر راغب نہ کیا تھا جیسا قائد اعظم کی دولہ انگیز قیادت نے کیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ قوم کا نوجوان و فعال اور باشعور طبقہ ہی کسی ایسی عظیم تحریک کا اصل روح و رواں اور پشت بنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد سر سید احمد خان کی تحریک نے قوم کو جدید راہ عمل دکھائی، ایک تمام تر جدید تحریک۔ انہوں نے حالات کے تقاضے کا صحیح ادراک کیا اور بھلائی لوگوں سے فوراً کوئی جنگ نہیں چھیڑی بلکہ حالات سے مفاہمت کو ہی تدبیر

منزل بنایا۔ مولانا محمد علی کی تحریک خلافتِ خلافتِ برطانیہ کے خلاف تھی اور حرکاتِ رندانہ کی آئینہ دار۔ مگر اس کی جڑیں بھی حقیقت کی نہیں ہیں۔ پیوست نہ تھیں۔ اس کا واحد مقصد ترکی میں خلافت کا استقرار تھا اور ان کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کی آزادی و لغائے خلافت کے طفیل ہندوستان بھی خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ حالانکہ حالات ایک اور ہی طرف اشارہ کر رہے تھے اور وہ یہ کہ عرب، جو کلیتہً مسلمان ہی تھے، خلافت کی قبا کو چاک چاک کر دینے پر تلے ہو گئے۔ جب قائد اعظم نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی تو ان تمام عظیم تحریکوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ انہوں نے سید احمد شہید رحمہ کی اسلامی ریاست کے تصور کو قبول کیا مگر سر سید رحمہ کی تلاشِ جدید کی روشنی میں اپنا نیا نقشہ عمل تیار کیا جس میں حامیانِ خلافت کے جذبہ "پان اسلام ازم" کو بھی اپنے نصب العین سے ہم آہنگ رکھا۔ اس طرح قائد اعظم نے مسلمانانِ ہند کے لئے جو طرح نظر قائم کیا اور جس طرح اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی وہ ان کی ثابت رائے کی دلیل محکم ہے اور ہم نے خود یک کھ لیا کہ دس سال کے اندر اندر ان کا نصب العین حاصل ہو گیا اور دنیا کے نقشے پر پاکستان جیسی عظیم اسلامی مملکت ابھرائی۔

قائد اعظم کا سرچشمہ فیضانِ اسلام تھا اور اسی نے پاکستان کی بنیاد مہیا کی۔ ان کا تصور ایک ایسی اسلامی مملکت تھی جس میں نظریہ اسلام ہی کو بالادستی حاصل تھی۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو وطن بنا ہے اسے حصارِ اسلام بنالیں۔ قائد اعظم پہلے شخص تھے جنہوں نے مسلمانانِ ہند کو ایک ملت قرار دیا اور انہیں ایک "فرقہ" کی کمر حثیت سے اٹھا کر ایک عظیم اور جداگانہ ثقافت کی حامل ملت کے طور پر تسلیم کرایا۔ میری مراد ان کے دو قومی نظریہ سے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دو قومی نظریہ کا تصور کسی نہ کسی عنوان پہلے بھی موجود تھا مگر بہم، جب نزل سامنے آئی تو یہ ابہام دور ہو گیا اور یہ قائد اعظم کی سب سے بڑی قائدانہ کامیابی تھی۔

ان کا ایک مشہور اعلان ہے: "ہم ایک قوم ہیں، جس کا ایک اپنا مخصوص تہذیبی مزاج ہے، ایک جداگانہ ثقافتی نقطہٴ نظر، زبان، ادب، فن، طریقہٴ تعبیر، نام، اصطلاحیں، اقدار و مناسبات

حسن فیضان (قائد اعظم کے بعد)

منظر حداثی

یہ فطرت کی عنایت ہو رہی ہے کہ پھر بیدار قسمت ہو رہی ہے
فروزان شمعِ وحدت ہو رہی ہے جہاں سے دو ظلمت ہو رہی ہے
نئی تنظیم ملت ہو رہی ہے روایت پھر حقیقت ہو رہی ہے
نئے سورج ابھرتے جا رہے ہیں اندھیری راتِ رخصت ہو رہی ہے
ہمیں اپنی تباہی کا نہیں غم زلزلے کو تو عبرت ہو رہی ہے
ہمارا ہی چمن لوٹا گیا تھا ہمیں سے اب شکایت ہو رہی ہے
وہی دُنیا جو دوزخ بن چکی تھی حریفِ بارِ جنت ہو رہی ہے
دُعا اور آمینت کیوں نہ بڑھتا کہ قدرِ آدمیت ہو رہی ہے
نکھرتی جا رہی ہے زندگانی ہر اک شے اہِ طلعت ہو رہی ہے
یہ فیضِ قائدِ اعظم تو دیکھو جہاں میں اپنی شہرت ہو رہی ہے
زلزلے میں ہمارے پھر ہیں چرچے خدا کی پھر عنایت ہو رہی ہے
ذکیوں تقدیر پر پھول اپنی نازاں شہ یک حال فطرت ہو رہی ہے

اندھیرے دور ہوتے جا رہے ہیں

نئی اک صبحِ عظمت ہو رہی ہے

فقہ، مناکحت، اخلاق، رسوم و رواج، تقویم، تاریخ، روایات
صلاحیتیں، ہماری امنگیں، کیا چیز ہے جو اپنا ایک طلوع و سفود جو
نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے بارے میں ہمارا ایک تباہی
خیر اور زاویہ نظر ہے۔

بے حد اولوالعزم اور اپنے ارادوں میں راسخ جیسے کہ وہ
تھے، اپنا انصبِ العین حاصل کر کے رہے۔ ان کے متعلق ایک واقعہ
بھی مشہور ہے کہ جب انہوں نے جھڑپٹی کے چہرہ سے (جس کا
مشاہرہ ۵۰۰ روپے مانا تھا) علی گڑی کا فیصلہ کیا تو ان سے اس کی وجہ
پوچھی گئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں تو ڈیڑھ ہزار روپے یومیہ کمانا
چاہتا ہوں۔

یہ بھی مانا کہ اس وقت انہیں ایک سر پھر انو جان تصور
کیا گیا ہوگا۔ بے حد بخود غلط اور دنیا کی اونچ نیچ سے بے خبر
مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک ایسا زمانہ ضرور آ گیا جب قائد اعظم نے
واقعی ڈیڑھ ہزار روپے یومیہ کیا، اس سے کہیں زیادہ کیا۔

عجب ہے کہ ایک انسان جس کی زندگی اتنی بوقلموں
توانا اور کارہائے نمایاں سے بھر پور ہو، اس کی اب تک کوئی
مستند و جامع سوانح حیات مرتب نہ ہوئی ہو۔ ایک ایسی واحد
سوانح عمری جس میں قائد اعظم کے آخری دنوں تک کے حالات
منعبط کر دیئے گئے ہوں۔ ہیکٹر تولانی، تھو کی تصنیف یوں تو
بجائے خود بڑی اچھی ہے (اور کچھ نہیں تو اپنے دلکش اسلوب
تحریر کے اعتبار سے ہی سہی) مگر قائد اعظم کے عقیدتمندوں
کے دل میں پھر بھی یہ تمنا باقی رہ جاتی ہے کہ وہ ان کے
بارے میں اور بہت کچھ معلوم کریں۔ اور پھر ایک اور اشد
ضرورت یہ بھی ہے کہ قائد اعظم کی سوانح عمری اپنے ملک کے
لوگوں کے لئے بہت کم قیمت پر فراہم ہو تاکہ ہر ایک کے پاس
اس کی کاپی پہنچ سکے۔ حق یہ ہے کہ اکثر لوگوں کی نظروں میں بابائے
مستراب بھی زیادہ سے زیادہ ایک ایسا ابرگہ رہا ہیں جس نے
برصغیر ہندو پاکستان کے مسلمانوں کو ایک جداگانہ ملت کی
نعمت ارزانی کی اور اس ۛ

منزل آشنا

عبد الغنی شمس

عظیم قائد!

سلام لے دس کروڑ ان بیٹے بیٹیوں کا
جنہیں عطا کی ہے تیرے عزم و یقین نے کچھ ایسی سرفرازی
کہ اب ہمارے کی بھی بلند قطرین ان کے نہیں ساتی

عظیم قائد!

سلام لے دس کروڑ ان بیٹے بیٹیوں کا
جو تیرے نقش قدم کو مشعل بنائے باغزدنازد تکلیں
منازل ارتقا کی پڑیچ شاہراہوں پہ گامزن ہیں

عظیم قائد!

سلام لے دس کروڑ ان بیٹے بیٹیوں کا
جو تیری اس کشورِ حسین پر نشا کر لے کو اپنی جانیں
قطارِ اندر قطار، خنجر بدست، آمادہ و عشا ہیں
نظر اٹھا کر ذرا تو دیکھ اُس اُبھرتے سورج کی ضوفشانی
کہ جس کی ہیبت سے، قلبِ ظلمت کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں۔
نہ جانے کتنے ہی ان میں ایسے جیسے ہوں گے، جو نام روشن کریں گے طاری کا شش بہت میں۔
نہ جانے کتنے ہی ان میں ہوں گی، غیور و جساں باز، مثلِ خولہ
کہ جن کی جرات کی داستانیں سنائیں گی مائیں بیٹیوں کو

میں سوچتا ہوں، جو تو نہ ہوتا، تو تیرے گردوں کے ماہِ داغِ نجم
بصورتِ ریگہائے صحرا، خراب و آوارہ و پریشان
خلا کی انجانی و سعتوں میں، نہ جانے کب تک کھٹکتے رہتے
کہاں کی منزل، نشانِ منزل کی بھی انہیں کچھ خبر نہ ہوتی
شبِ سیہ کی سحر نہ ہوتی

حسنِ کلامِ آئینہ

انور سعید گیلانی

کا تھا ضابطہ ہی ہے کہ ہم ایسی آوازوں پر کان نہ دھریں جو ”کجہ“ کی بجائے ”ترکستانی“ کی طرف بلارہی ہوں۔ ہمارے لئے سب سے پہلی اور بنیادی شرط تو ملک کی سلامتی ہے۔ حتیٰ کہ کوئی بدیہی ظلم ہمارے لئے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہمیں خود غرض لوگوں کو یہ موقع ہی نہیں دینا چاہیے کہ وہ اپنے فائدے کے لئے ہم عوام کو اپنا آلہ کار بناتے رہیں۔

صدر پاکستان کا یہ ارشاد سو فیصد صحیح ہے کہ صدارتی نظام قطعاً غیر جمہوری نہیں بلکہ اسلامی روایات سے بے حد قریب ہے۔ اس سے حکومت کو کئی سال تک اطمینان سے عوام کی سچی خدمت کی مہلت مل جاتی ہے اور کوئی دوزارتی افراتفری برپا نہیں ہوتی۔ نہ حکومت کا نظام درہم برہم ہوتا ہے۔ یہ بالکل بجاس ہے کوئی ہے جو اس رائے سے اتفاق نہ کرے گا؟ آخر محض چند لوگوں کی تفریح کی خاطر یہ کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے کہ آئے دن کوشش بدلنے کا تماشا دیکھا جائے۔ خدا ہمیں ۵۸-۵۱ کے دورے محفوظ ہی رکھے!

پارلیمانی نظام کے کیا کہنے۔ چند ہی دن بعد صدر پاکستان نے بڑی پتے کی بات کہی کہ دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ جو پارلیمنٹوں کی ماں ”کبلائی“ ہے، خود اس کی اولاد اب اس کو بوڑھا اور شعیبا ہوا سمجھنے لگی ہے۔ اس کا رنگ روپ بگڑ چکا ہے اور بے ایک نئی اور اولوالعزم قوم کی ضرورتیں پوری کرنے سے معذور ہو چکی ہے۔ جناب صدر نے بہت اچھا کیا کہ اس ضمن میں لاؤڈ سپیکر جیسے فاضل اور جہاں دیدہ سیاست کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ بطلانِ نوحی نظام حکومت ایک ایسی بوسیدہ مشین ہے جو چرچر کرکے ٹوٹنے ہی والی ہے اور موجودہ دور کے لئے ہرگز موزوں نہیں۔

اب کے پہلی تاریخ کچھ دن پہلے ہی یادو بار آئی! اس لئے کہ صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، نے حسب معمول یکم کو ملت سے خطاب فرمایا، مگر اس سے کچھ ہی روز پہلے ۲۷ اکتوبر کے یادگار دن کو بھی وہ ملت سے خطاب کرنا نہیں بھولے۔ ریڈیو کی لہروں ان کی ہر وعید، حیات افروز آواز لئے گھر گھر پہنچیں۔ عین اس وقت جب اس کی اشد ضرورت تھی۔ جبکہ وطن دشمن، ملک کے اندر بھی اور باہر بھی۔ پھر پاکستان کے خلاف مسلح ٹھارسے ہیں اور دن رات نت نئے منصوبے کرنے میں مشغول ہیں۔

صدر پاکستان کی آوازاں جیسے کا ملا صدائے ملت بنتی جا رہی ہو، اس کے پیش نظر میں اور میری طرح ہزاروں افراد، خانہ بہ خانہ کو بگڑے برابر گوش برآواز رہتے ہیں۔ اس لئے اب کے میں اپنے دوسرے پاکستانی بھائیوں کی طرح دونوں تقریروں کو سننے کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔

پہلے اکتوبر کا ذکر بہتر ہے۔ کیونکہ یہ انقلاب کی پانچویں سالگرہ کی بات ہے۔ جب ہم اور ہمارے ساتھ پاکستان نے ایک نئی زندگی پائی اور آزادی حقیقی معنوں میں آزادی بنی۔

بے شک جو لوگ اپنی تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتے انہیں تاریخ میں کوئی جگہ بھی نہیں ملتی۔ اس لئے ہمیں لازم ہے کہ ہم اپنی بے پرواہی اور غفلت سے پرانی غلطیوں کو نہ دہرائیں اور ان میں سب سے بڑی غلطی مغربی طرز کے پارلیمانی نظام کو بحال کرنا ہے جس نے ہمیں تباہی کے کنارے لاکھڑا کیا تھا۔ اور اب بھی اس سے یہی خطہ لاحق ہونا لازم ہے۔ مگر انقلاب بار بار تو نہیں برپا کئے جاسکتے اور نہ وہ ملک و قوم کی نجات کا آخری علاج بن سکتے ہیں کی جگہ عوام کی منشا کو نظامِ مملکت میں شریک کرنا چاہئے مگر دانش

اور جنوں و کشمیر کی سنگین صورت حال کے ساتھ یہ بھی ہمارے لئے مسلسل پریشانی کا باعث رہا ہے اور ہے۔

ان ایام میں جو کچھ درپہدہ تھا براہِ فکندہ نقاب سامنے آ گیا ہے۔ یہ کہ جس چیز کا قانوناً و اخلاقاً استحقاق نہیں وہ اس ترکیب سے ضم ہو جائے۔ اخلاقی قدر میں مسئلہ بین الاقوامی دھڑے، عالمی رائے عامہ اور دوست ملکوں کے مشورے سب اس لئے ہیں کہ انہیں گلدستہ طاق نسیاں بنایا جائے اور زبردستوں کے جذبات افواج کے پاؤں تلے کچل دیئے جائیں۔ ایسی جارحانہ کارروائیاں کس کے ہاتھ پر کلنگ کا ٹیکہ نہ ہوں گی، خواہ وہ کوئی ہو۔ اس سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ دوسری طرف ایسے اقدامات سے ہمارے اس عزمِ جمیم میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑے گا کہ ہم عوام کو ان کا حق دلایں تاکہ جو بھی فیصلہ ہو حق و انصاف کے مطابق ہو معلوم نہیں ہمارے 'یارانِ عزیز' ہمیں دنیا میں اپنا سب سے بڑا دشمن کیوں سمجھتے ہیں، حالانکہ ہم ہر تازہ کوئلہ من اور منصفانہ طور پر حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے ہیں اور اب بھی اس پر کاربند ہیں۔

قدرتی بات ہے کہ جب کسی کو دھڑلہ دھڑلہ عسکری امداد حاصل ہوتی جائے تو وہ من مانی کرنے پر کُل جاتا ہے اور بظاہر ہدف خواہ کچھ بھی ہو اگر اصل ہدف کوئی اور ہی ہوتا ہے۔ شاید وہ غلطی سے اسی کو حقیقی غنیمت سمجھ لیتا ہے۔ یقین حاتی ہے۔ یہ مسلح پوشی اس غنیمت کے ساتھ کبھی جنگ پر متوجہ نہیں ہوگی اور پھر وہ دن آجائے گا جب 'بھائی بھائی' کا راگ الاپا جائے گا۔ ایسے حالات میں جنگ مغلوبہ بی کی طرح ڈالی جاسکتی ہے اور وہ یوں کہ ہم اپنی صفوں ہی کو مستحکم کریں اور ہر جارحانہ اقدام کا ترکی بہ ترکی جواب دیں۔

سب سے بڑی ضرورت حقیقت پسندی ہے۔ ہمارے دانشوروں کو لازم ہے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کی باتیں سوچیں اور خواہ مخواہ فضول نظریوں، نعروں اور جڈبانی لہیلوں سے کام نہ لیں۔ ضرورت یہ بھی ہے کہ زمین پر قدم جمائے جائیں نہ کہ خلاؤں میں خیالی پرواز سے کام لیا جائے۔ طریقہ کار میں قوم کے حقیقی مسئلوں کا جائزہ لینا اور ان کے حل سوچنا ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے اخبار نویسوں نے اسی حقیقت پسند کا ثبوت دیا ہے جو ان کے موجودہ نسبت بہتر معیار میں منعکس ہے۔

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

جناب صدر نے پھر بھی ہے اور بڑی ہی خدا انگیزی کہی ہے کہ پارلیمانی حکومت کو بحال کرنے کا نعرہ درہل اپنی سیاست دانوں کا نعرہ ہے جو سیاست کی بازی ہار چکے ہیں اور پھر کسی جیلے بہانے وہی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں جو انہوں نے پہلے کھیلنا تھا تاکہ قوم کا بیڑا پھر تباہ ہو جائے۔ سچ پوچھا جائے تو ان لوگوں کے تھکنڈوں کا جواب انقلاب ہی تھا اور اس انقلاب کے کام کو اس وقت تک جاری رکھنا چاہئے جب تک وہ اصلاحات جو اس کے تحت رائج ہوئیں ملک میں پوری طرح نشوونما پا کر بار آور نہ ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ملک میں سیاسی و اقتصادی استحکام برقرار رہے۔ صدر پاکستان کی یہ آواز یقیناً بڑی توجہ اور سنجیدگی سے سنی جائے گی۔ ایسی سیاست بھی کیا جو کسی مسئلہ کا حل نہ پیش کر سکے اور عوام کے لئے کسی طرح بھی سودمند ثابت نہ ہو۔ آفرانِ سیاست دانوں نے پارلیمانی حکومت کی بھائی، بنیادی حقوق اور باغ حق رائے دہی کی رٹ لگانے کے سوا اور کیا بھی کیا ہے؟ ان سے قوم کے امراض کا کیا مداوا ہوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے ان سے تو انٹا اصلاحات اور عوامی رفاه و بہبودیں رکاوٹ ہی پیدا ہو سکتی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی تو ہے کہ خود غرض سیاست دان محض حکومت کی مخالفت پر اندھا کھلے بیٹھے ہیں اور حزب اختلاف کے کردار کا بہت سی غلط تصور رکھتے ہیں جنہیں بغضِ لہی اور اندھا دھند مخالفت کو چھوڑ کر اصل تعمیری کام کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، تاکہ حکومت کی تعمیری اور مفید سرگرمیوں کو ان کی بھی تائید حاصل ہو اور ان کے خلوص نیت کا لوگوں کو بھی علم ہو۔ صدر پاکستان کی اس رائے سے کون اتفاق نہ کرے گا کہ کیا ذاتی و سیاسی مقصد برآری کے لئے ملک میں انتشار اور بے چینی پھیلنا کوئی نیکی ہے، خصوصاً جبکہ باہر دشمن اپنے دندانِ آذوقہ کھینچ رہا ہے؟ سیاست دانوں کو ہرگز زیم نہیں دیتا اور نہ یہ محبت وطن ہی ہے کہ عوام کی سادگی اور ان کے مذہبی لگاؤ سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے کیا یہ کوئی دینی خدمت ہے کہ مذہب کی آڑ میں اپنا اٹو سیدھا کیا جائے؟

یہ تو ہونے لگا ہے اور بیگانے؟ اسی کے تھکنڈوں بھی کچھ کم نہیں۔ آسام اور تری پورہ کے بد نصیب مسلمانوں کا انخلا جاری ہے۔



معاشری خدمات کی حوصلہ افزائی
(جوبلی اسلامیہ کالج پشاور)



لیاقت میموریل : مجوزہ عمارت کا نقشہ (راولپنڈی)



اراکین بنیادی جمہوریت و عمائدین شہر سے خطاب (نواب شاہ)

اے آمدنت : قبائلی طلبہ کی طرف سے خیر ما



مشائخ کانفرنس کراچی : معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز



جنگی بلی

اسلامیہ کالج پشاور
اولین جدید درسگاہ،
سابق صوبہ سرحد -
(تاسیس: ۱۹۱۰ء)



روحانی تعلیم کا سرچشمہ

کالج سے متعلق شفاخانہ



ب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان
عوم (سیاسی اصلاحات اور ترویج
تعلیم کے محرک اعظم)

اسلامیہ کالج، جواب نرقی کر کے یونیورسٹی بن چکا ہے



مسافرانِ شب

دقائد اعظم اور نقیب کی روشنی میں

الطاف پرواز

صبح رنگیں سے بدل جائے کہ تو قادر ہے۔
رات اور دن بھی مری طرح ہیں تیری مخلوق
وقت بھی تیرا ہی شہکار دوام
اب خموشی کا بھی جادو لوٹے
یہ خموشی، یہ مری تنہائی
کسی چٹکا نہ رنگیں سے بدل جائے کہ میں
اپنے امانوں کا خون دیکھ نہیں سکتا
میرے آقا! کوئی آواز،
کسی دوست کی آواز سنوں
لطف فرما کہ یہ کانٹے نہ رہیں، پھولی جنوں

اللہ اکبر اللہ اکبر
تو راہ رو ہے نہ کٹنے نہ پائے
یہ رات دن تو میں تیرے سائے
حیرت ہے، ان سے تو عو قحکا؟
قدر پر قیری صبح منور
اللہ اکبر اللہ اکبر
بڑھتا چلا جائز ہر منزل
جے دم تیرا اگر وہاب وصال
مدنی ہے کیوں آنکھ ڈوتا ہیکٹا
سودنیاں میں روت الجھ کر
اللہ اکبر اللہ اکبر

آئی تنہائی کی رات
تو مالک، تو داتا سب کا
تو والی، تو آقا سب کا
تو منزل تو راہِ نجات
آئی تنہائی کی رات
آ، دل ڈرتا ہے
ہر بات پر، ہر آہٹ پر
گو یہاں کچھ بھی نہیں
بات، نہ آہٹ، نہ اجالا نہ دھواں
پھر بھی دل ڈرتا ہے یاں کوئی نہیں
ادور نہ کوئی آنے گا۔
کو یہ چھو، یہ ٹھکانہ غم کا
زیست کے سایہ الطاف سے ہے دور بہت،
اس قدم و رکہ امید کی رو
پر گھٹا کر بھی جو چاہے تو نہیں آسکتی
لیکن اسے رب مئی! خالق ہر انس و ملک!
تو رگ جال سے بھی رہتا ہے قریب
میں نہ گر دیکھ سکوں تو تو مجھے دیکھتا ہے
تو شمس ہے مرے دروہاں سے آقا!
تو جو چاہے تو یہ دیرا نہ پڑ بھول گیا
شوش زیست کا گہوارہ بنے
اور یہ رات کہ سببت کا ساں ہے گویا

یہ شب تیرہ وٹے بھول، یہ خاموش سماں
وقت تمنا تو نہیں ہے لیکن۔
وقت پیچھے کہ تھا جانا ہے
کوئی دیرا نہ درخت،
کوئی جھرنہ نہ پہاڑ
ایک چپ، سکے سے بہت دور
دکھوں سے بھر چور!
ایسی تنہائی کہ سایہ بھی جدا ہے مجھ سے!
(وقفہ)
آئی تنہائی کی رات
رات، بھیانک رات
موا دل ڈرتا ہے
چھوٹے طوفان، گھپ اندھیا را
لوٹی نیت۔ دور کت را
ہاتھ کو دے نہ سمجھائی بات
آئی تنہائی کی رات
پل پل بڑھتے غم کے سائے
کوئی نہیں جو دیر بندھاے
پیاریں دیکھی بات ہی مات
آئی تنہائی کی رات
ایک اکیلا نیر بہاؤں
آپ بھاپا دھندھاؤں
کوئی نہ مجھے میری بات

باغ اور دین ہیں دھوکا نظر کا
یہ تیرگی پیش خیمہ سحر کا
ہے عشق سلطان بھرا اور برکا
ہے عشق تیرا ہر آن رہبر
اللہ اکبر اللہ اکبر
خوشید نو ہے شرق سے ابھرا
پھولوں سے ہے دامن صحرا
تو وقت کو دے بڑھ کر سہارا
تو جبر الفتن کا ہے شناور
اللہ اکبر اللہ اکبر

پھول ہی پھول، اجالا ہی اجالا
وہ شب تیرہ دُپر پھول، وہ خاموش سماں
میری تقدیر نہ تھا!
کہا یہ سب وہم تھا
خود میری نظر کا دھوکا،
پر یہ آواز
الہی یہ صدا کس کی تھی؟
کیا میں تنہا بھی نہ تھا؟
تھا کوئی اور بھی اس دکھ بھرے دیر لے میں،
کون تھا؟ اب وہ کہاں ہے؟
اسے کس جا دیکھوں؟
اب تو شب بیت گئی
صبح تو ابھی گئی ہے کے اجالوں کا پیام
پھر وہ روپوش ہے کیوں؟
میں پکاروں نہ اسے؟ دو لہان
آواز دینے والے
آواز دے دو بار
تو کون ہے کہاں ہے
کس کچھ میں نہیں ہے
اک بے کمی ہے دل کو
پھر آواز دے جو اس ہے

کوئی نہیں سہارا
آواز دینے والے
آواز دے دو بار
جلد و جھگٹا گیا ہے
حیراں بنا گیا ہے
میں بے نوا سا فر
تورہ دکھا گیا ہے
آ، سامنے خدا را
آواز دینے والے
آواز دے دو بار

تجمہ سے ہوا اجالا
تو نے دیا سنبھالا
میں گھریب تھا غم میں
تو نے مجھے بٹکا لایا
تو صبح کا سستا را
آواز دینے والے
آواز دے دو بار

اور پھر میں نے پکارا اسے یوں جیسے کوئی
رکاوہ مصیبت کا اسیر
ہر آنے وقت پہ مایوس جہاں سے ہو مگر
دل کی ہر شیں کو آواز بنالیتا ہے
میری آواز، مرے دل کی غم آمیز پکار
صبح کے توریں تحلیل ہوئی، پھیل گئی
دو رنگ دشت و جبل کو سجائے
باز گشت آئی تو یوں جیسے وہ خود
نغمہ نشاں، رقص کن آن پہنچا
گھنٹیاں بجے گئیں،
سامعین دامن صحرا میں جو خماید تھے میدان ہونے
ایک آواز بدلتی، عشقِ فردا یہ کسا عجاز بنی

حسن، سامانِ نظر، دعوتِ نظارہ بنا
بے کمی مل گئی،
اس کی آواز
مرے دل کی صدا، ایک ہوتی
اور دوئی مل گئی، تنہائی کا غم دوہ ہوا

جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے
کرک کرک سے آن ملی ہے
کلی کلی سسکا کے کھلی ہے
جھک اٹھے نفا رے
جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے

اُجلی اُجلی پیارا کی راہیں
پھیل ہوئی جیون کی باہیں
امرت رس کے دھارے
جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے

ہانٹ لے غم سا رے اپنے
آسمان کے بندھن، سندھ سینے
گیت سلونے پیارے
جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے

منزل منزل ساتھ ملیں گے
غم سے سدھم دودھ پیئیں گے
اک دوجے کے سہارے
جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے

افتخار تاب

(صاحبزادہ سر عبد القیوم مرحوم)

احسان اللہ دانش

قارئین سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے لڑکپن میں سرسید مرحوم کا شہرہ ضرور سنا ہوگا اور ان حالات سے بھی آگاہی ہوگئی ہوگی جہاں عظیم ہستی کے ساتھ ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ سر صاحبزادہ عبد القیوم خان پٹھانوں کے مشہور لودھی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۵۲۶ء میں جب سلطان ابراہیم لودھی نے شہنشاہ بابر کے ہاتھوں پانی پت کے مقام پر شکست کھائی تو بعض لودھی شہزادے افغانستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بعد میں جب احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ہندوستان پر حملہ کیا تو انہی لودھی شہزادوں کے خاندان کا ایک فرد عبدالکریم غازیوں کے لشکر کے ساتھ جہاد کی غرض سے ادھر آیا۔ احمد شاہ نوپائی پت فتح کرنے کے بعد لوٹ گیا۔ مگر عبدالکریم نے یوسف زئی علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں نوپائی میں سکونت اختیار کر لی۔ عبدالکریم ایک صوفی منش بزرگ تھے اور زیادہ تر عبادت و ریاضت ہی میں مصروف رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ مقامی پٹھانوں میں ان کی قدرومنزلت بہت بڑھ گئی۔ لوگ ان کی روحانی عظمت کے باعث ”بابا“ کہہ کر پکارتے تھے ان کی اولاد کو جو مین لڑکوں پر مشتمل تھی اسی نسبت سے ”صاحبزادہ“ کہتے تھے۔ بڑے لڑکے صاحبزادہ غس اللہ مین کی اولاد میں سے ایک صاحبزادہ قطب عالم (پ ۱۸۰۰ء) تھے جنہوں نے اپنے زمانے کے ایک مشہور صوفی و مبلغ حضرت سید امیر مرے، جو نوپائی سے تھوڑی ہی دور ایک گاؤں کوٹھ کے رہنے والے تھے، بیعت کی تھی۔ بعد میں حضرت صاحب نے اپنی محبت و کلمہ بھی صاحبزادہ قطب عالم سے کر دیا تھا۔ اس طرح علاقے کے دو بطلان القدر خاندان متحد ہو گئے۔ صاحبزادہ قطب عالم کے لڑکے صاحبزادہ عبدالرؤف بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلے اور اپنے ماموں حضرت سید امیر مرے ارادت اختیار کی۔ ۱۸۵۸ء میں صاحبزادہ عبدالرؤف کی شادی حضرت سید امیر

انیسویں صدی کے وسط میں جب درانیوں کی قوت کمزور پڑی اور ان کی سلطنت کا جو دلی اور کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی، شیرازہ بکھر گیا تو اس کا سب سے زیادہ اثر ان لوگوں پر بالخصوص پٹا جو کہ سلیمان کے مشرقی جانب رہتے تھے۔ بعد کو جب انگریزوں اور روسیوں کے مابین افغان دہرا میں اٹھوڑ صحن بڑھانے کا مقابلہ شروع ہوا تو افغانی حالت اور بھی خستہ ہو گئی۔ بحیثیت منگھ اور اس کے جانشینوں نے سرحد کے بعض علاقوں کو جی بھر کر لوٹا، بلکہ ہری سنگھ تلوہ کی بربریت تو آج بھی پشتوئیں ایک کثیر الاستعمال ضرب المثل کی طرح موجود ہے۔ عرض سابق صوبہ سرحد ایک عجیب انتظامی افراتفری کا شکار تھا جس میں نہ کسی کی جان محفوظ تھی اور نہ مال۔ جا بجا لڑائیوں نے قحط کی صورت پیدا کر دی تھی۔ انگریزوں نے جب زمام اقتدار سکھوں سے اپنے ہاتھ میں لی تو حالات کچھ سنبھل گئے لیکن غیور پٹھانوں نے تسلط فرنگ کو کبھی پوری طرح قبول نہ کیا اور برابر آزادی حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ نتیجتاً حاکم اور محکوم کے درمیان ایک خلیج بھی پیدا ہو گئی جو روز بروز بڑھتی رہی۔ برادران وطن نے حسب معمول اس صورت حال سے خوب فائدہ اٹھایا اور ایمان حکومت میں داخل ہو کر مسلمانوں کی اس شجاع قوم کو اپنی ناپاک قلم کے تیروں اور انگریزوں کی سنگینیل کا نشانہ بناتے رہے۔ کچھ ہی صورت حال تھی جو سرسید کو اپنے زمانے میں دلی کے زوال کے بعد برپا ہونے لگی تھی۔ سابق صوبہ سرحد میں بالخصوص اس صورت حال کے مقابلہ کی ضرورت تھی اور ادھر بھی ایک سرسید کے لئے آنکھیں نہ لگا سکتیں تھیں۔ ایسی ہی شخصیت عبد القیوم خان (نواب سر صاحبزادہ) کی تھی غور و فکر اس عظیم شخصیت سے ہماری قوم آشنا ہو، بالخصوص وہ ہونہار و جوان کی بابت بہت ہی کم یا کچھ ہی نہیں جانتے۔

نواب سر صاحبزادہ عبد القیوم خان ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے

مختوف ہو گئی۔ ۱۹۸۸ء میں انہیں خیبر ایجنسی کا اسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے اور ۱۹۹۱ء تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہ کر سبکدوش ہو گئے۔ یہ تو داستان تھی اُن کی شخصی ترقی اور عزت و توقیر کی اب کچھ ذکر ان کی ملی و تعلیمی خدمات کا پیش کیا جاتا ہے :

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ اور صرف اغیار ملازمتوں پر فائز، نظم و ضبط پر قابض تھے۔ مسلمانوں بالخصوص پٹھانوں کو انگریزوں کا دشمن ثابت کر کے اپنی ترقی کے خواہشمند رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیاسی معاشرتی، تعلیمی، ہر میدان میں پیچھے رہے جا رہے تھے۔ صاحبزادہ صاحب کی دور رس نظریں ان تمام ناگفتہ بہ حالات کو دیکھ رہی تھیں۔ مگر انہوں نے ہتھیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی قوم کو اس گڑھے میں گرنے سے فوری بچائیں گے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ عرصے تک برابر سوچتے رہے۔ قومی لوہار کو دور کرنے کا واحد علاج تعلیم ہی تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ہمارے پٹھان بھائی بھی تعلیم کی طاقت حاصل کریں۔ اس ضمن میں ان کے سامنے سرسیدؒ کے تعلیمی مشن کی مثال موجود تھی۔ چنانچہ انہوں نے ”دارالعلوم اسلامیہ سرحد“ جسے آج کل اسلامیہ کالج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کی تشکیل کا ارادہ کیا۔ سر جارج روس کپل نے اس سلسلے میں نواب صاحب کی بہت بہت افزائی کی حقیقت یہ ہے کہ اگر اس وقت روس کپل جیسا ہندو شخص مدد کرنا تو اس ادارے کے قیام میں بہت دیر لگتی اور بڑی مشکلات پیش آتیں۔

دارالعلوم کا قیام فوری ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ سر جارج روس کپل اور سر صاحبزادہ دونوں ہی کسی کام سے کلکتہ جا رہے تھے۔ علی گڑھ راستہ میں پڑتا تھا۔ وہیں پٹھان طالب علموں سے بھی کچھ دیر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے سوچ و پے کی ایک تعلیمی سرجاء کی تذکرہ تاکہ ان کے لئے علی گڑھ میں ایک پٹھان ہوسٹل کی تاسیس کی جاسکے لیکن سر جارج نے انہیں بتایا کہ نواب صاحب ان کے اپنے ہی وطن میں ایک ایسے ادارے کے قیام کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کی کوششوں میں سب کو مدد کرنی چاہئے۔ طلباء اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے یہ رقم دارالعلوم فنڈ میں بطور خیریت دے دی

کی صاحبزادی سے ہوئی، جن کے بطن سے ان کی تین لڑکیاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ دو لڑکیاں تو بچپن ہی میں وفات پا گئیں مگر ایک لڑکی خیرالنسا اور ایک لڑکا زندہ رہا۔ یہی لڑکا بعد میں شہرت و ناموری کے آسمان پر مہر مالتاب بن کر چمکا اور خان بہادر نواب سر صاحبزادہ عبدالغفور (کے بی۔ آئی۔ ای۔ سی۔ آئی) کے نام سے روشناس خلق ہوا۔

صاحبزادہ موصوف ابھی نو سال ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ان کے والد شہید ہو گئے۔ اب یہ دونوں بہن بھائی یتیم ہو چکے تھے۔ حضرت سید امیر نواسوں کو کوٹھ لے کئے اور یہیں صاحبزادہ صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ثانوی درجے کی تعلیم کے لئے موصوف کو پشاور کے مشن ہائی سکول میں داخل کرادیا گیا۔ قیمی اور گھر سے دوری نے انہیں بڑی مشکلوں میں پھنسا دیا۔ مگر انہوں نے بڑے عقل سے تمام سختیاں جھیلیں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد صاحبزادہ صاحب کشنر کے دفتر میں مترجم کی اسامی پر متعین ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کشنر کے معتد خاص اور میرمنشی کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ۱۸۹۱ء میں سیالکوٹ میں بندوبست کی تربیت حاصل کرنے کے بعد نواب صاحب نائب تحصیلدار مقرر کرکے گئے اور کوہ سمانہ پر میر آل نئی مہم کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ اگلے سال تحصیلدار بنائے گئے۔ تیس سال کی عمر میں اسٹنٹ پولیٹیکل آفیسر کے عہدے تک پہنچے اور کرم ایجنسی میں پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہو کر روس کپل کے ساتھ متعین ہوئے۔ میجر روس کپل بہت سمجھدار اور علم دوست آدمی تھا۔ اس کی اور صاحبزادہ کی بہت دوستی تھی۔ اسلامیہ کالج پشاور کا قیام اسی زمانہ کے مراسم کا نتیجہ تھا۔

اسی زمانے میں برطانوی اور افغان حکومتوں کے درمیان سرحدی معاہدہ بھی ہوا تھا۔ حکومت نے سر صاحبزادہ کو ”اندو افغان باؤنڈری کمیشن“ کا رکن مقرر کیا جہاں انہوں نے بڑے تدبیر کا ثبوت دیا۔ جب ۱۸۹۲ء میں ہندوؤں اور انگریزوں میں اُن جن ہوئی تو صاحبزادہ صاحب کی ہی کوششوں سے ان کے درمیان باعزت سمجھوتہ ہوا۔ اگلے سال تیرہ کے آفریدی قبائل اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑی۔ انگریزی فوج نے تیراہ پر یلغار کی لیکن صاحبزادہ صاحب نے اس کو بھی روک دیا اور آفریدیوں کی آزاری سلب ہونے

ماحول دیکھ کر سر ڈینیئر برے دنگ رہ گئے۔ انہوں نے حکومت ہند سے سفارش کی کہ اس مفید کام کو ترقی دینے کے لئے نواب صاحب کو مرکزی قانون ساز کونسل کا رکن نامزد کیا جائے۔ مجلس قانون ساز میں نواب صاحب نے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۲ء تک کام کیا۔ اور اصلاحات کے لئے میدان ہموار کرتے رہے۔ مرکزی اسمبلی میں بھی کانگریس سرحد کو اصلاحات دینے کی مخالف رہی۔ قائد اعظم اور علامہ اقبال نے برابر سر صاحبزادہ کے موقف کا ساتھ دیا۔

اس زمانے میں پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور ہندوستانیوں کا حکومت برطانیہ کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ برصغیر میں مزید آئینی اصلاحات نافذ کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک گول میز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں صوبہ سرحد کی نمائندگی کے لئے نواب صاحب ہی کو منتخب کیا گیا۔ کانگریس کے لیڈروں میں بھی مسلمانوں کو خاص کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہے۔ لیکن نواب صاحب نے اپنی استقامت کروار اور سلاست گفتار دونوں سے کام لیا اور مخالفین کے منہ بند کر دیئے۔ چنانچہ حکومت کو مجبور ہو کر سرحدی اصلاحات کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ اس موقع پر سر عبدالقیوم نے نواب کو کہا تھا: ”مجھے علم نہیں کہ آپ نے مجھے اپنی اس پگڑی کی وجہ سے تقریر کرنے کی اجازت دی ہے۔ یا انصاف کے اس تقاضے کے تحت کہ جنوب کے رہنے والوں کی طرح شمال مغرب کے پسماندہ صوبوں کو بھی اپنے معروضات پیش کرنے کا حق ہے۔ بہر کیف، جناب والا! اس روشن دور میں فقط آپ ہی ہیں جو اچھوت پر چار کر رہے ہیں۔ مگر ہم پسماندہ صوبوں کے رہنے والوں کو زندگی کے عام حقوق بھی نہیں دیتے ہماری قوم سڑھے سے اصلاحات کے لئے جیج پکار کر رہی ہے لیکن کوئی نہیں سنتا۔“

آخر یہ کمتری کا دھتہ ہماری پیشانیوں پر کب تک رہے گا؟۔ آخر میں انہوں نے فرمایا: ”میں اپنی تقریر کو اپنی زبان پشتو کے ایک محاورے پر ختم کرتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ ایک پتو بھی اگر آپ کے جامہ میں گھس جائے تو آپ کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔“ برطانوی وزیر اعظم مشر ریمزے میکڈونلڈ پر نواب صاحب کی تقریر کا بڑا اثر ہوا، اور انہوں نے سر صاحبزادہ کو ایک نامکن انجمن مطالبہ تسلیم کر لینے پر دل سے مبارکباد بھی دی۔

۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو اس مجاہد ملت کی کوششیں بار آور باقی صنف ہے

یہ پہلا خطبہ تھا جو دارالعلوم فند کے لئے موصول ہوا اس لئے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور کی خشت اول ۲۱ مارچ ۱۹۱۲ء کو سر صاحبزادہ کی ایما پر حضرت فضل احمد صاحب (حاجی نیرنگ زئی) نے اپنے میلک ہاتھوں سے رکھی۔ پہلا طالب علم جس نے اس ادارے میں داخلہ لیا، حضرت سید امیر کافور سا اور نواب صاحب ہی کے خاندان کا ایک نامور فرد، صاحبزادہ محمد خورشید تھا۔ یہی وہ صاحبزادہ خورشید صاحب ہیں جو ۱۹۴۹ء میں سرحد کے اولین پاکستانی گورنر مقرر ہوئے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سر صاحبزادہ اپنے دوست سر چارچ روس کپٹل سے ملنے لندن گئے۔ واپسی میں سائبریا، چین، جاپان، ہنگ کانگ اور تھائی لینڈ بھی گئے۔ مگر جب واپس آئے تو وطن کی سیاسی فضا بدلی ہوئی تھی۔ ہندوستان میں خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کا زور تھا۔ نواب صاحب ہجرت کی اس تحریک کو مسلمانان ہند کے سیاسی مفاد کے لئے معززت رساں سمجھتے تھے اور اس کے اصولاً موافق نہ تھے۔ مگر جوش کے سامنے سوجھ بوجھ کی بات نہ چلی اور صاحبزادہ صاحب کو عملی سیاست سے کچھ عرصے کے لئے کنارہ کش ہونا پڑا۔

نواب صاحب اس دوران میں زیادہ تر اسلامیہ کالج کے کام میں منہمک رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کی سیاسی اور معاشرتی بہبود میں ان کے مد نظر رہی۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء کی صوبائی اصلاحات میں کانگریس اور حکومت برطانیہ دونوں ہی صوبہ سرحد کو حقوق دینے کے مخالف رہے جس سے سرحد کے باشعور طبقوں میں شدید رد عمل پیدا ہوا۔ نواب صاحب سرحد کے لئے حقوق حاصل کرنے میں سب سے پیش پیش تھے۔ مگر جب ۱۹۲۱ء میں وہ شمالی افریقہ کے راستے دوبارہ لندن گئے یہ سرگرمیاں تعویق میں پڑ گئیں۔ واپسی کے سفر میں وہ امریکہ اسپین، شام و بیت المقدس ہی نہیں گئے بلکہ مدینہ منورہ پہنچ کر دوبارہ نبوتی میں بھی جا غری دی۔

۲۳۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت نے سر ڈینیئر برے کی صدارت میں ایک کمیٹی صوبہ سرحد کے مسئلہ حقوق کا جائزہ لینے کے لئے مقرر کی۔ اس کمیٹی کے اراکین کو سر صاحبزادہ اسلامیہ کالج بھی لے گئے برصغیر کے اس دور افتادہ علاقہ میں اتنا شاندار ادارہ اور اس قدر صحت مند

اے روشنیوں کے شہر!

احمد فواز

بے ثمر رکھتی مراغلی حیات! بے ثمر رکھتی مراغلی حیات
آمنہ: قدر سے دور سے اس رسیدہ آواز
کیا ہوا؟ کیوں بلاوجہ پریشان ہوتے جاتے ہو؟
اک ذرا صبر کرو
آگ روشن کئے دیتی ہوں ابھی
تم کو زیبا نہیں ہر وقت جواں بیٹی کو
ایسے مطعون کرو
خالدہ بیٹیوں سے بڑھکھری پیاری بیٹی
کس قدر نیک ہے، معصوم ہے، سنجیدہ ہے
ہم کہ اب ٹوٹی گئی ہوئی دیواریں ہیں
اس کا معصوم سہا لہجہ بہت ہے ہم کو
جوشب دروزہ جوانی کے تقاضوں کو بچھا کر کے
ہم پہ قربان ہوئی جاتی ہے
بوڑھے ماں باپ کی خدمت پہ کربتہ ہے
بوڑھا، آمنہ کہتی کم فہم ہے تو
تیری کوتاہ نظر
صرف امر و نکر کی محرم ہے مگر
تجھ کو فردا کی خبر کچھ بھی نہیں
آہ میں کیسے کہوں، کیسے تجھے سمجھاؤں
خالدہ کس لئے ہر شام کئی پہروں تک
اپنے ماحول سے بیگانہ کسی دھیان میں گم
اس دیکھ میں کھڑی رہتی ہے۔
آمنہ: یوں اگر ہے بھی تو پھر
کون ظلم ہوا

دگر دیال سات بجالے اور پھر کسی آباد بازار کی
مختلف آوازیں فیلڈان ہوتی ہیں۔ ان آوازوں میں بعض
کاروں کے ہارن گھنٹیاں، قحط، اور بال روم کی
موسیقی ہے۔
بوڑھا: دکھلتے ہوئے، اپنے آپ سے
اف یہ جائزے کی خنک شام،
یہ ٹھنڈے جھونکے۔ جسم مخلوق ہوا جاتا ہے
جیسے شریاؤں میں قسم جلتے ہوئی گروٹس
یہ بڑھاپا، یہ خدیاں کا موسم
دو لوں بے رنگ، حرارت سے تھی۔ دونوں محرم تپش
جل چکا کب سے بڑھاپے کے جہنم میں گنہگار بدی کا ایندھن
اب تو انک پیکیں خاکستر ہوں
زندگی راگھ کا ڈھیر
اب کوئی آگ اسے حلت جاں تاب نہیں دے سکتی
اف یہ جائزے کی خنک شام
یہ ٹھنڈے جھونکے
دلچسپ بدل کر، خالدہ!
بند کر دے یہ دریچے کے کوڑے
کتفی بے رحم ہے بیٹی تو بھی،
میں چراغ سحری، اور تجھے
طلبِ بادشاہ
کیا اسی دن کے لئے تجھ کو جواں ہونا تھا!
(اپنے آپ سے)
کاش اس دختر بے فیض کے بدلے قدرت

چھین لے جائیں گی اک روز ترے اور مرے گھر کا یہ ننھا سا
یہ معصوم چراغ

آنکھ کا نور، بڑھاپے کا سکون۔ خالدہ

خالدہ کی آواز ادھر حاوی ہو کر ابھرتی ہے

خالدہ! اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر!

سورج ڈوب چلا تو کتنے دیپ جلے

شام کے سائے روشنیوں میں ڈوب چلے

یہ خوشبو کے بوجھل جھوکے

یہ کرنوں کی نہر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

یہ لوگوں کے منہ سے ادا ہونے کے ادب

لات ہوئی تو دم اٹھی چہروں کی دھوپ

میرے دل میں کیوں ہے اک

انجانے درد کی لہر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

تیرے ہنگاموں کی دنیا نور ہے نور

میرے دھیان میں تاریکی کو میں مجبور

میں کیا جانوں میں کیا سمجھوں

تو امرت یا زہر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

دغہ فید آؤٹ ہو جاتا ہے اور سوتلی

سے منظر بدلنے کا ٹاپا پیدا ہوتا ہے۔

ہاں میں ایک مھوڑا کے تصویروں کی

خائش غم جہم کی ملی جلی آوازوں کے

اثرات۔

آواز ملے: خوب تصویریں ہیں

میں کتنی ترتیب سے آویزاں ہیں۔

دن بھر اسکول پڑھا، ابھی تو کچھ سہل نہیں

تو کبھی ایک اذیت ہے، کوئی کھیل نہیں

اور وہ بیچارہ تھکن کی ماری

خاک کے وقت بھی اپنے دریکے میں کھڑی

خود کو پہلائے اگر شہر کے نظاروں سے

تو یہ معصوم سی تفریح بھی ہے جرم عظیم

کتنے خود غرض ہیں احسان فراموش ہیں ہم

کتنے بے درد دستم کو ش ہیں ہم

دوھیے اور اداس لہجے ہیں)

خالدہ!

کتنی بد بخت ہے تو

کتنی بے رنگ ہے معصوم جوانی تیری

تیری قسمت میں نہیں ہے شاید

کہ تری ماگ میں افنا کے ستارے چمکیں

کہ ترے ہاتھوں میں گلزار حنا کے ہمکیں

تیری تقدیر میں محنت کے بیاہاں ہیں فقط

اور ماں باپ کی بوڑھی لاشیں

کتنی بد بخت ہے تو!

دسکیاں لینے لگتی ہے۔ دوسرے خالدہ کے گنگناؤں کی آواز آتی ہے

بوڑھا: سن۔ سن یہ آواز کہ اس میں ہے نہاں

تیری بیٹی کا سسکتا فردا

غم فشاں فوجہ کسان!

خالدہ میری نظر میں بھی ہے معصوم مگر

مجھ کو اس ہنسنے ہوئے شہر سے خوف آتا ہے

اس کے ہنگاموں سے، رعنائیوں سے

جلد جاتی ہوئی راہوں سے، چمکتے ہوئے بازاروں سے

توبوں اور ہلکتی ہوئی خوشبوؤں سے

اس کے نغموں سے جیسے رنگوں سے

اس کی دیواروں سے نظاروں سے خوف آتا ہے....

تو نہیں جانتی

اس شہر کی یہ روشنیاں

۱۱ ہاں کسی فن کی نمائش بھی تو اک فن ہے

۱۲ خدا دیکھو تو

۱۱ اس طرح دیکھو یہ تصویر

۱۲ "غزل صحرانہ" فن کی مہارت ہے یہ۔ جس طرح قاف کی آواز

پری ہو کوئی۔

۱۱ اے مصوٰر ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں

۱۲ خوب تصویر بنائی مہرے پہلائے کو

۱۱ "صحیح نو"

۱۲ قابل داد ہے ان رنگوں کی آمیزش بھی

۱۱ کتنے موزوں ہیں یہ باریک خطوط

۱۲ نور و ظلمت کی کٹ کش کہ عجب منظر ہے

۱۱ جس طرح شب کی تباہ پاک ہوئی جاتی ہو

۱۲ آہستہ آہستہ گہرا ہوا دریا، توبہ!

۱۱ کتنی بھیری ہوئی ہر مودت نظر آتی ہے

۱۲ جیسے بر سنگ گراں ٹوٹ کے بہہ جائے گا

۱۱ جو کچھ تصویر ہے شہکار ہے، فن پارہ ہے۔

(یہ آوازیں رفتہ رفتہ دودھ ہوتی

جاتی ہیں اور دوسروں کی آوازیں

ابھرتی ہیں)

سلمیٰ : اے زاہد، تم بھی موبہ بنو

زاہد : کون؟ سلمیٰ : ... بونہی میں چلی آئی تھی

اس مصوٰر کے فن سے عقیدت ہے مجھ کو

سلمیٰ : بڑی خوبصورت تصاویر ہیں

زاہد : واقعی فن کے شاہکار ہیں

سلمیٰ : جس کو دیکھو وہی نقش ہائے مصوٰر میں گم بت بنا ہے

اور یہ خالہ اور یہاں۔

زاہد : کیوں، اسے دیکھ کر تم کو حیرت ہوئی ہے۔

سلمیٰ : بھاری کی تقدیر میں صرت اس کی ہے اور گھر ہے۔

زاہد : مگر آج تو وہ نمائش میں آئی ہوئی ہے

خدا جانے کیسے بھاری کا مفلوج باپ اور محذور مال

دو لوں اس کے سہارے پہ زائیدہ آیا

اور خالہ خود بھی اس عمر میں فلسفی بن چکی ہے

کہ جیسے کسی اور دنیا کی ہاںسی یہاں آگئی ہو

اسے آرٹ سے ہے لگاؤ

مگر زندگی کے کسی اور رخ سے محبت نہیں ہے

زاہد : بھاری اکیلے کھڑی ہے

چلو اس سے باتیں کر پ

سلمیٰ : زاہد، تم نہیں جانتیں ...

اس کی دنیا انہیں سرد تنہائیوں ہی سے آباد ہے

دیکھ لو ایک تصویر کے سامنے، کیسے مہموت ہے

زاہد : اور ہاں اس کے ہونٹوں کی جنبش کہ جیسے کوئی خود سے

محو سخن ہو۔

سلمیٰ : چلو اب چلیں لوگ جانے لگے ہیں۔

رجوم کی ملی آوازیں

آہستہ آہستہ فید آؤٹ ہو جاتی ہیں

خالہ : (اپنے آپ سے) : یہ تصویر کس شہر کی ہے؟ سہاں

کتنا مانوس ہے

جیسے میری نگاہیں اسے روز و شب دیکھتی ہوں

یہ اونچی عمارات یہ جگمگاتے در و بام۔ روشن دریا

یہ شغاف سرکیں، بھڑکتے ببادوں میں خوش باش انسان

حسین قص کا ہوں میں یہ قلعے، قلعے، قلعے،

زندگی۔ روشنی زندگی۔ روشنی

اور یہ ایک گوشے کے سائے میں ڈوبا مکان

نیم ڈاک دریا

یہ کیوں روشنی کے سمندر کی قربت میں بھی

اک کرن سے بھی محروم ہے۔ کیوں؟

نہیں، یہ چمکتا ہوا شہر ...

اور یہ اندھیروں میں ڈوبا مکان

جیسے میرا ہی شہر اند۔ میرا مکان ہو

مصوٰر :۔

مصوٰر : کیس کا مکان ہے؟

مصوٰر : یہ کس کا مکان ہے، یہ کس کا مکان ہے،

مجھے خود نہیں علم یہ روشنی سے چمکتا ہوا جگمگانا ہوا شہر کس کا
اور یہ اندھیرے میں ڈوبا مکان خود مرے واسطے اجنبی ہے۔

خالہ: (چٹک کر) کوئی؟

منصور: خاتون! میں ہی وہ مجرم مصوڑوں جس کی پریشان تصویر نے

آپ کے ذہن کو اتنا الجھا دیا ہے۔

سبھی لوگ میری بتائی ہوئی ان تصاویر کو دیکھ کر ہلچلے ہیں
مگر ان کی آنکھیں

فقط شوخ رنگوں، چمکتی لکیروں، فسوں کا قوسوں میں
کھوئی رہی ہیں

سبھی نے فقط جگمگاتے ہوئے شہر کا نور دیکھا

مگر بھول کر بھی کوئی اس اندھیرے مکاں تک نہ پہنچا

یہ سایوں کی دنیا، اندھیروں کا مسکن

مصوڑ کا ایک نقشِ لوحہ کتاں ہے

یہ ہاسم کاوش!

مری ناتمام آرزو اس مجرم فراواں میں بھی

اک بجکا و کرم کو ترستی رہی ہے

یہ توہین فنکار کی موت ہے

ہاں یہ توہین۔ فنکار کی موت ہے

مصوڑ گمراہ کی..... قیمت؟

منصور: فقط قدرِ ذاتی۔

خالہ: مراد عام ہے... اگر میں اسے لینا چاہوں

منصور: نہیں یہ ابھی نامکمل ہے

خالہ: وہ کس طرح؟

منصور: اس اندھیرے مکاں کا دریچہ

ابھی منتظر ہے کسی ایسے پیکر کا

جس کے رنگ دہے میں یہ جگمگانا ہوا شہر طوفاں اٹھائے

مگر اس کے قدموں میں ساحل کی زنجیرِ ظلمت پڑی ہو

یہ نور و ظلمت کی پیہم کش

مرے شاہ پارے کو تکمیل کا رنگ دے گی

مجھے اُس خیالی ہیوے کی، اُس پکیہ خواب کی جستجو ہے۔

نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی

نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی

(اپنے آپ سے کھوٹے ہوئے لہجے میں)

یہ خاتون تصویر میں کس قدر کھو گئی ہے

یہ بکھری ہوئی زلف۔ جیسے زمانے کا دکھ اس پر سایہ لگن ہو

یہ غمگین آنکھیں۔ کہ جیسے کسی خواب گول جھیل میں

دو کنول شام ہستی کے کھرے میں لپٹے ہوئے ہوں۔

یہ گنلا لب۔ جیسے بارغِ جوانی کی کلیاں بہاروں کے انجم

سے باخبر ہوں

یہ معنوم چہرہ۔ کہ جیسے کسی جگمگاتے ہوئے شہر پر دھند

چھٹا گئی ہو

مسلسل اداسی میں ڈوبی ہوئی فوجواں

خوشی میں بھی لوحہ گر ہے

یہ پیکر دہی ہے جسے میں نے

منعوم صبحوں میں، خاموش شاموں میں ویران راتوں میں

ڈھونڈا

مجھے مل گیا۔ میرے تاریک و تنہا مکاں کا کیس

(تقریباً اتے ہوئے) اجنبی نیک خاتون! میں آپ کی قدر دانی

کامشکور ہوں

میرے فن کا اتفاق ابھی یہ ہے کہ میں آپ کی نذر کردوں یہ تصویر

لیکن اگر آپ کچھ روز اس نامکمل ہیسلے کی تکمیل تک ایک

زحمت اٹھائیں

خالہ: وہ کیسے؟

منصور: مری آرزو ہے... کہ میں اس اندھیرے مکاں کے دیکھے میں

اس روشنی کی کرن کھینچ لاؤں

جو اس جگمگاتے ہوئے شہر کی تابناکی سے تابندہ تر ہو

اگر آپ کچھ روز تک شام کو چند لمحے

مرے سامنے آکر بیٹھیں

تو میں آپ کو اپنی تصویر کے اس دریچے کی زینت بنا دوں

یہ شہر کا جس دن مکمل ہو۔ بس آپ کا ہے۔

خالہ: مصوڑ۔ مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے

مگر میری موجودگی تیرے فن کے کسی کام آئے

تو میں... غواہ کچھ ہو۔ یہاں روز آتی رہوں گی...
اے شام ڈھلنے کو ہے... لوگ سب جا چکے
مجھ کو لازم ہے... اب میں بھی جاؤں
مصنوعہ: تو کل شام؟
خالہ: ہاں، میں ضرور آؤں گی
(موسیقی)

بوڑھا: آمنہ!
ہو چکی شام مگر نکلہ اسکول سے اب تک نہیں واپس آئی
وسوسے مجھ کو پریشان کئے دیتے ہیں
آمنہ: آج کچھ دیر سے آنے کے لئے اس نے کہا تھا مجھ سے
اس کے اسکول کے پاس
اک نمائش تھی۔ دہیا آج اسے جاتا تھا
ابھی آتی ہوگی
بوڑھا: ہوں، تو اب۔

اس کو بھی شہر کی رنگینیاں بہکائے لگیں
آخراں سے بھی یہ پرچھائیاں اب چھلنے لگیں
آہ اس شہر کی یہ روشنیاں!
کتھے معصوم چراغوں کو بجھا دیتی ہیں
کتھے تاریک کھالوں کو ٹٹا دیتی ہیں
آہ اس شہر کی یہ روشنیاں!

آمنہ: جاتے کیوں واسے بڑن کئے دیتے ہیں نہیں
خود سے، ماحول سے، مٹی سے، سمی دنیا سے!
واسے کتنے گناہوں کو جنم دیتے ہیں
آدمی اپنے تراشے ہوئے بت پوجتا ہے...
ہم کہ اب عمر کی اس منزل تاریک میں ہیں
جس میں اک شمع کی موہوم سی ضرور
ایک ہلکی سی کرن

خیرہ کہ دیتی ہے آنکھوں کو۔ وہاں
تابِ نظر گئی مشعلِ خورشید کے
اپنی محرومی کا احساس ہے، اس تنگ بنگاہی کا سبب،
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجاتے ہیں چراغ

بوڑھا: ٹھیک کہتی ہو مگر
یہ مرے واسے وہ تلخ حقائق ہیں جنہیں
میری بے نور نگاہیں ہی فقط دیکھتی ہیں
یہ نظر سوز نظارے یہ بھڑکتے منظر
یہ چمکا چوندیہ جلووں کا ہجوم

رنگ دا ہنگ کا طوفان۔ یہ سیل انوار
اک مائع ہے، نمائش ہے، دکھا واسے ہے
اک فسوں کا رنے ہر سمت بجا رکھا ہے
ہائے اس سادہ و معصوم نظر کی قسمت
جو فقط ظاہری جلووں سے ہو سکتا مگر
موت کے دام سے بیگانہ رہے
اپنے انجم سے بیگانہ رہے
خالہ کے قدموں کی چاپ سائی دیتی ہے

آمنہ: خالہ آگئی۔ بہتر ہے کہ خاموش رہیں
بوڑھا: میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا
میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا
(موسیقی)

(مصنوعہ کا کمرہ)

(تصویر بناتے ہیں گم۔ اور اپنی آواز سے خود بے خبری کا)

مصنوعہ: تیری تصویر کہ خوابورہ جہاں ہو جیسے
میرا دل میری تمنا، مری جہاں ہو جیسے
چشمِ نرگس کو میں کچھ اور بھی حیراں کر دوں
ذلفِ آوارہ کو کچھ اور پریشاں کر دوں
تھیل میں پر تو ہوتا رہاں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
جلوہ افروز ہو پردوں میں بھی افسوں شباب
جس طرح شیشہ مے سے نہ چھپے کس شراب
آپ سے آپ کھل جاتے ہیں ہونٹوں کے گلاب
آمدِ صبح بہاواں کا سماں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
کس قدر سادہ و سادہ ہے جوانی تیری

میرے ہر نقش میں پہلاں ہے کہانی تیری
فن کی معراج ہے تصویر بنائی تیری

ہر مصوٰر تیری جانب نگراں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
خالہ: کے قدموں کی چاپ۔

کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور
مصوٰر خاموش ہو جاتا ہے،

مصوٰر: یوں؟ تم خالہ، آؤ بیٹھو

خالہ: مت ورا، بڑے خوش نظر آ رہے ہو

کہ جیسے جہاں بھر کی دولت تمہیں مل گئی ہو

مصوٰر: بہت خوش ہوں میں، واقعی جس طرح ایک دریوزہ لڑ کر

کوئی بخش دے ہفت اقلیم کی بادشاہت

خالہ: ذرا ہم بھی جانیں کہ وہ یوں حاتم ہے اور کوئی بادشاہت

ہے جس کے سبب تم نو فرسرت سے نغمہ بہ لب لکھے۔

مصوٰر: سخاوت اگر ہو تو ایسی

کہ دس لاکھ کیم اپنی بخشش سے خود بے خبر ہوں

میرے سامنے میں وہ بخشنہ و بادشاہت

خالہ: (مسرت سے) مصوٰر!

مصوٰر: مری ناتمام آرزو آج پوری ہوئی ہے

یہ تصویر میری حتم کی معراج

دیکھو۔ اندھیرے مکاں کے دریچے میں

یہ روشنی کی کرن کہ قدر صوفیاں ہے

خالہ: تو کیا یہ اندھیروں میں ڈوبا مراہی مکاں تھا

جہاں آج تابانیاں موجزن ہیں؟

مصوٰر: نہیں تم تو خود روشنی ہو

ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں

یہ ظلمت میں ڈوبا مکاں

ایک فنکار کا غمگدہ، اک مصوٰر کا تصویر خانہ تھا جس پر

زمانے کی بے اعتنائی کے سائے پرا فشاں رہے ہیں

کسی نے تمہارے سوا یہ نہ دیکھا

کہ اس سبلی رنگ و طرح میں بھی آخر کوئی فوج گر ہے۔

تمہارا کرم تھا کہ تم حسب وعدہ
مرے فن کی تکمیل کو میرے ظلمت کندے میں کئی روز تک
روشنی کے آتی رہی ہو۔

خالہ: تو کیا اے مصوٰر، تمہارا مکاں بھی اندھیروں میں گم تھا؟

تو کیا ہر مکاں تیرہ و تار سایوں میں ڈوبا ہوا ہے؟

یہ سب روشنی پھر کہاں کھو گئی ہے؟

کہاں ہے وہ خورشید۔ وہ منبع نور؟

وہ روشنی کا سمندر

کہ جس کے لئے تیرہ و تار دنیا میں شام و سحر منتظر ہیں،

مصوٰر: تمہیں روشنی کی ضرورت نہیں ہے،

تمہیں روشنی کی ضرورت نہیں

میرا تار ایک گھراک کرن کہتے رہتے

اور یہ کرن... یہ کرن؟

مصوٰر: مل تمہاری ہے، و حسب وعدہ یہ تصویر حاضر ہے۔

اب اس مکاں میں اندھیرا نہیں

یہ بھی اس جگہ گاتے ہوئے شہر کا ایک حصہ ہے

یہ تو وہ تیرگی سیل انوار میں کھل گیا

روشنی تو ملی۔... روشنی تو ملی

خالہ: اچانک تمہاری نگاہوں میں کس سوچ کے دائرے تیرے

لگ گئے ہیں؟

یہ ایک سترت کی لہروں میں کن حسرتوں کے بھنور پڑ گئے؟

جس طرح تم سے پل بھر میں ہی چن گئی ہفت اقلیم کی بادشاہت

کہو... چپ ہو کیوں... کچھ تو بولو، مصوٰر

مصوٰر: نہیں، کچھ نہیں، سوچتا ہوں کہ جب چاند تارے بھی محتاج

ہیں روشنی کے

تو پھر میں اندھیروں کا باسی

کہ جس کے مقتدر میں تاریکیاں ہیں اندھیرے ہیں

کیوں آرزوئے ضیا میں۔ اجالوں سے شکوہ کنال ہوں

مجھے میری تاریکیاں چاہئیں صرف تاریکیاں۔ صرف تاریکیاں

مجھے جگہ گاتے ہوئے شہر کے کتا دھوکا دیا ہے

کہ میں اپنے فن کا گلا گھونٹ کر سیل انوار میں بہہ چلا تھا۔

(خالدہ کے تھوڑی سی چاب)

آمنہ: خالده آگئی

بوڑھا: کل سے اب خالده اسکول نہیں جاتے گی

خالده: کیا ہوا؟

بوڑھا: خالده! کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

سن یا! کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالده: ماں... مگر

بوڑھا: بس نہیں جاؤ گی تم۔

آمنہ: لیکن اتنا سوچو

خالده نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جیئیں گے آخر؟

تم بھی معذور ہو... میں بھی مجبور

دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں۔

بوڑھا: وائے محرومی تقدیر کہ جس کے باعث

آج میں اپنی جوان بیٹی پر

بار ہوں۔ بارگراں

پھر بھی میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا

خالده، باپ کی محتاجی و معذوری کے پردے میں مرا

اتنی تذلیل کرے

اس سے پہلے کہ یہ افلاس مرا

میری غیرت مری ناموس کا نیلام کرے

میں بچا دوں گا ہر اک شمع حیات

زندگی، موت سے بدتر ہے اگر غیرت و ناموس نہیں...

کچھ بھی ہو

نہج کو منظور ہے ہر ایک عذاب

مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب

(شدت سے کھانسی)

(موسیقی)

(شام کا منظر۔ گھر ڈیال سات بجائے کسی

آباد شہر کا بازار۔ باری، گھنٹی دلی، قہر میں

اور بال روم کی موسیقی کے اشارت)

خالده: (وائے آپ سے): آہ یہ شام کس درجہ اندوہ میں ہے

مگر آج بھی شہر کس سے یہ عالم

مصور کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے

اسے جگمگاتے ہوئے شہر سے کیا؟

تو... خاتون... کل شام میں آپ کے شہر کو چھوڑ جاؤں گا

کل شام، اسی وقت

خالده: تو کیا واقعی تم مرے شہر کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟

مصور نہ جاؤ... نہ جاؤ مصور،

مصور مجھے صرف فن سے محبت ہے۔

شہروں سے، لوگوں سے، بچیوں سے، شاموں سے نسبت

نہیں ہے،

مجھے آپ سے آپ کا عکس پیا رہا ہے

جو میں نے خونِ جگر سے سمایا ہے روشن کیا ہے

اس کے لئے میں یہاں چند دن رک گیا تھا

اور اب جب مکمل ہے یہ نقش۔ میں جا رہا ہوں

ابھی جاتے کتنے ہیوں مرے منتظر ہیں

ابھی جاتے کتنے ہیوں مرے منتظر ہیں

(موسیقی)

بوڑھا: آمنہ! جو چکی شام مگر خالده گھرا آئی نہیں

جاتے کیا بات ہے، کیوں آج پریشاں ہے طبیعت میری

آمنہ: ابھی آتی ہوگی

بوڑھا: ابھی آتی ہوگی

اب تو یہ روز کا معمول ہوا۔

خالده شام سے پہلے کبھی گھرا آتی نہیں

اور گھر آئے تو اپنے ہی خیالوں میں گمن رہتی ہے

نہ اسے باپ کا غم ہے نہ اسے ماں کا خیال

طورے طور ہوئے جاتے ہیں۔

آمنہ: جاتے یہ واہے کب ختم تمہارے ہوں گے

تم کو معلوم تو ہے

خالده ان دنوں اسکول میں منسرف بہت رہتی ہے

صبح سے شام تک

اک اذیت میں گرفتار ہے نازک بچی

بوڑھا: پاس ہے تم کچھ بھی کہو (تلخ ہنس) کل سے اب خالده اسکول

نہیں جاتے گی

آمنہ: (خیالی آواز): خالد، نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جیئیں گے؟
 تم بھی معذور ہو میں بھی مجبور
 دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں
 دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں
 خالہ: ہمیں میری دنیا بھی لاشوں کا گھر ہے

میرا کب تک یہ لاشیں اٹھائے اندھیروں میں بھٹکوں
 مری زندگی سر دلاشوں کے بارگراں سے سسکتے لگی ہے

مصور، مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں
 کہ تم بھی اسی جگہ کاتے ہوئے شہر کی اک کرن تھے
 تمہارا وجود ایک زرتاب ذرہ تھا جو

اپنے مرکز سے پھر باہر

تم بھی اس شہر کے ایک جکڑ تھے

جوان اندھیروں میں اک پل کا جہان تھا اور بس
 اک کرین، ایک جکڑ سے ظلمت کی دیوار کب گر سکی ہے
 یہ لاشیں

کہ جن کے لئے میں نے اپنی دھڑکتی جوانی کو مفلوج رکھا ہے
 اب وہ بھی مجھ کو فقط باعث تنگ گردانتی ہیں

تو کیا وہ مقدس فریضہ مراجع تھا جس کی خاطر

میرا اک لاش بنکر اندھیروں میں ڈوبی رہی ہوں

تو کیا یہ مری زندگی شہر کی طرٹ

تا ابد روشنی سے گریزاں رہے گی؟

مرے سامنے اک طرف یہ پھلکتا ہوا شہر ہے۔

روشنی کا سمندر ہے

جو سر دلاشوں سے بیگانہ مینہتی ہوئی زندگی کا چال ہے

اور اک سمت ساحل کی زنجیر ظلمت۔ مری آندھوں کی قاتلی

ادھر روشنی۔ زندگی

اور ادھر۔ موت۔ اور موت کی تیرگی

اگر یہ اجالے مری دسترس میں نہیں ہیں

تو پھر۔ موت کی مستقل تیرگی کو دکھوں اپنا سکنا بنا لوں؟

میں اس نور و ظلمت کو اب تو نوروں کی۔

فقط موت ہی میری اس کشمکش کا حوالہ ہے

باقی وہ ہے

کہ ہر سمت جیسے چراغاں ہوا ہو

وہی روز کے زرخیز۔ تپتے۔ تپتے جیسے جن طرف ہو

وہی جگہ تپتے درو باہم روشن دریکے

وہی رقص کا ہوں کے منظر

یہ انہوں کا سیلاب گیتوں کی کرنیں

بھڑکتے بادوں میں خوش باش رہ گیا خوش بخت پیکر

وہی زندگی روشنی۔ روشنی زندگی

اور میرا مکان۔ اے مصور، یہ تم میری نہیں ہے

ہمیں۔۔ میری دنیا میں اب تک اندھیرے بے ہیں

یہاں ظلمتیں اب بھی نوحہ کناں ہیں مصور

مضوی خیالی آواز: ہمیں تم تو خود روشنی ہو

ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں

مجھے جگہ کاتے ہوئے شہر نے کتنا و تنوکا دیا تھا

کہ میں اپنے فن کو سسکتا ہوا چھوڑ کر

سیل انوار میں بہہ چلا تھا

مصور کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے

میں یہ جگہ کاتا ہوا شہر کل چھوڑ جاؤں گا

کتنے ہیوے مرے منتظر ہیں

خالہ: مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو

گھر۔۔۔ ہاں۔۔۔ تمہیں اپنے فن سے غرض

اپنے بے جان رنگوں، ادھوری لکیریں۔

خاموش سیالوں سے ساکن ہیولوں سے الگ۔ ہے

تم نقش گر ہو، تمہارے لئے زندگی میں

دھڑکتے دیوں، گنگناتے لبوں، جھللاتے چراغوں، ہسکتی

شعاعوں میں

کچھ بھی نہیں ہے!

فقط کاغذی بت۔ خیال صنم سر دلاشیں

تمہاری نگاہوں کے مرکز۔ مگر بولتی زندگی سے گریزاں

پوڑھا (خیالی آواز):

خالہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

”جہاں میں تھا“

لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

کے الفاظ بھی دیئے۔ پہلوی تو مشہور ہے ہی جس کی یاد اعلیٰ حضرت محمد رضا شاہ پہلوی مرحوم نے تازہ کی تھی۔ خیر حصہ بقدر حق ہے۔ یہ دلوں پر کھڑا لازماً خوش خوراک ہوں گے۔ کشتی کا اکھاڑہ نہ سہی کھانے کا اکھاڑہ ہی ہے۔ یا آپ پہلوانوں کی رعایت سے ہفت خواں کہہ لیجئے۔ یہ ”میل سیستان“ رستم ہی تو تھا جس نے قوی ہیکل دہقان، اولاد کے کلان اکھڑ کر خونخوار اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے تھے! — اس لئے میرے جیسے غیر پہلوان پہلے ہی سے ڈر رہے تھے۔ بہر حال جب وقت آیا تو ہم اپنے مجسم و شہ زور، ہم نوال، ہم پیالہ، دوستوں کا نہایت بیچینی سے انتظار کرنے لگے۔

اس دعوت کا سہرا ہم سب کے مشترک دوست الحاج، میاں منظور حسین کے سر تھا۔ آپ انہیں جانتے ہی ہوں گے۔ ”گجرات بس برس“ گراچی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن“ جیسے اداروں کے صدر ان کے والد میاں کرم الہی بھی گجرات سے تشریف لائے ہوئے تھے، بڑے جہان نواز، اہل گجرات کی زندہ دلی کا نمونہ عزت بیگ نے اسی سرزمین پر پہنچ کر چل عمر تیار رہا۔ ”کرم“ کے مصداق اپنا سارا دھن دولت سب کچھ لٹا دیا تھا۔

موصوف کے رستم ہند امام بخش کے ساتھ بڑے گہرے دوستانہ مراسم ہیں! اس لئے جب وہ کراچی تشریف لائے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے یارِ سزا کو نہ صرف تازہ کرنے کی رحمت نہ دیتے، چلے چنگا کر شادی بھی، تقریب بہرِ ملاقات ہی ہی مگر معلوم نہیں کیا کچھ تو ہمیں بھی ان بولوں گروں کے

دعوتیں کھانے کا اتفاق، تو اکثر ہوا، نہ، پاکستان میں بھی اور پاکستان سے باہر بھی۔ کبھی وزیروں کے ساتھ، کبھی بڑے بڑے رؤسا کے ساتھ، مگر جو لطف پہلوانوں کے ساتھ کھانا کھانے میں ہے وہ کسی بڑی سے بڑی محفل طعام میں بھی کہاں؟ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایک ایسا موقع میسر آیا اور محفل بھی وہ جو پاکستان کے مایہ ناز پہلوان، رستم ہند امام بخش، اور ان کے فرزند ان رشید کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔ دعوت شیراز تو ظاہر ہے یہ ہو ہی نہیں سکتی تھی، پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ اس میں نہ کوئی تکلف تھا، نہ نمود۔ سادگی ظہور خاموشی، انہماک لحمس دعوت کے نمایاں خواص تھے۔ نہ کوئی ہنگامہ نہ اعلیٰ و ادنیٰ کی تخصیص، نہ لباس کا امتیاز بلکہ دعوتی رقعوں کا جھنجھٹ تک نہ تھا۔ نشست فرش اور بلا تکلف۔ عام لباس، سیدھا سا داکر سیٹنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے جیسے کوئی چاہے آرام سے بیٹھے جس طرے چاہے کھائے پیئے، بات چیت کرے۔ کوئی کیل کانٹوں سے لیں ہو کر نہیں آیا تھا! مطلب یہ ہے کہ دعوت کے لئے زمین پوری طرح ہموار کر دی گئی تھی، اور بس، تاکہ کھانا پورے ذوق و شوق سے کھایا جاسکے۔

ہونے کو تو ہم بھی اس محفل میں شریک تھے، لیکن کہاں وہ رستم و اسفندیار کے جانشین اور کہاں ہم۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ لفظ ”پہلوان“ غالباً ”پارتھین“ سے ماخوذ ہے جس کے بہادروں نے روما کے بڑے بڑے فاتحین، انڈونی وغیرہ کے دانت

بھی کھٹے کر دیئے تھے تب ہی سے انگریزی میں PARTHIAN SHOT (قادرانِ ذی، تبرِ مکی) بطور ضرب المثل مشہور ہو گیا ہے۔ اپنی ”پارتھینوں“ نے ”فارسی“ کو ”ہلو (شہر) اور ”پہلوان“

لے کھائے پیئے ہیں! (ادارہ)

نے تصویر سے تو یہ گمان نہیں ہوتا! (ادارہ)

لے لٹکا میں سب بادل گز کے ہونے ہیں بک یوں بھی سنا ہے کہ ہر چیز کے درکان تک رفت تک شد! شاید اس لئے آپ بھی اس میں دھرتے گئے ہوں! (ادارہ)

لمبا گلاس، سب کو دیا گیا۔ مجھے تولیوں لگا جیسے ناو نوش کی یہی انتہا ہو۔ یعنی مزید کھانے پینے کی نوبت شاید ہی آئے۔ شربت مہانوں کی فرمائش پر ہی تیار کیا گیا تھا اور ”نسخہ“ کے مطابق تھا۔ یوں ہم غیر پہلوان بھلا کیا جانیں کہ پہلوانوں کی غذا کیا ہے۔

کھانا تھا تو مختصر مگر چٹا گیا بڑے سلیقے سے۔ سبجان اللہ! خوشبوؤں کی کیا کیا لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مرغ پلاؤ، قورمہ، شیرینی پھل۔ قورمے میں گوشت کے ساتھ ابلے ہوئے اندے جس سے کھانا داؤا لٹنہ ہو گیا۔ ساتھ ہی بڑے بڑے پرانے۔ کھانا بڑا مرغن، کسی استاد کا پکایا ہوا جو کراچی میں ذرا کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ یہ کھانا تو واقعی لکھنؤ کے روایتی کبابداروں کی یاد دلاتا تھا۔ خالص گھی میں پکا ہوا اور اسی میں شرابور، بلکہ ترتراتا ہوا۔ مہک ایسی کہ خواہ مخواہ کھانے کو جی لپچا۔ میں بڑے اشتیاق سے، کنکھوں سے دیکھنے لگا کہ اب کھانے کا پہلوانی محاذ کیسے قائم ہوتا ہے اور کیا کیا استادانہ بات، کیسے کیسے داؤ پیچ دکھائے جاتے ہیں۔ بار بار تھکی روئی کا وہ لہتہ سانس آتا جو کبھی فکا ہی شاعر، خضر میمن نے کھینچا تھا۔ امام بخش تنہا معرکہ سر کرنے نہیں آئے تھے۔ ان کے ساتھ تقریباً بیس کا رازمودہ شاگردوں کا پرانسی تھا تاکہ جنگل میں مشکل کی طرح منزل میں دھج کا بھی کچھ سماں بندھ جائے۔

پہلوانوں کا یہ ٹولہ بڑی بے کلکئی کے ساتھ وارد ہوا۔ سیدھا سلا لباس دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ہمارے ملک کا بہترین لباس ہے تو یہی۔ کرتہ اور تہمد۔ ہمان جو تے اتار کر قالین پر آلتی پالتی مار کر بٹھ گئے۔ بھلا انہیں کالروں، کنکھائیوں کی ٹوک پلک کے جھنجھٹ سے کیا واسطہ۔ پتلون میں شکن پڑ گئی، اس کا انہیں غم کہاں۔ بیٹھے ہی سلسلے دسترخوان کچھ گئے۔ یعنی صف طعام برپا ہو گئی۔ کھانا بھی چن دیا گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ کہیں زیر لب بات چیت، کہیں تمغہ پر تمغہ۔ اور پھر تمغہ بھی پہلوانی۔ کہ صاعقہ کا گال ہو۔ ادھر دھیمی آواز میں ریکارڈ بھی بج رہے تھے۔

ساتھ شامل کر لیا گیا۔ فخر و قدامت میں ہم ان کے حریف کیا ہوں گے۔ چونکہ پہلے کبھی ایسی صحبت میں شریک ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بڑی بے تابی کے ساتھ وقت کا منتظر رہا۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں گھومتے رہے۔ یہ میرے لئے پہلا موقع ہو گا کہ میں پاکستان کے مایہ ناز اور عالمی شہرت رکھنے والے ان سپورتوں کو یکجا دیکھ سکوں گا۔ ان کے ساتھ کھانا بھی کھاؤں گا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جو کھانے کے ساتھ انصاف کریں گے، بلکہ یوں کہنے کو کھانے کی کشتیوں سے ”کشتی“ لڑیں گے، اس معرکہ کے دیکھنے کا بھی موقع ملے گا۔ یوں پہلوانوں کی خوش خوری کے متعلق میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ مگر کج اس کی تصدیق ہونے والی تھی۔

میرے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ میں نے فون پر اپنے میزبان سے درخواست کی کہ اس موقع پر ایک فوٹو گرافر کا بھی انتظام کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ ایسے نادر مواقع کم ہی ہوتے ہیں۔ یہ فوٹو بطور یادگار محفوظ ہو جائیں گے۔ اس سے قبل یہ خواہش کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ خیر، خدا خدا کر کے وہ وقت آ ہی پہنچا۔ اور ہم ”میدان عمل“ میں پہنچ ہی گئے۔ مگر ابھی محل جہان، یعنی پہلوان صاحبان تشریف نہیں لائے تھے۔ ان کو لانے کے لئے ایک لابی بھیجی گئی تھی اور یہی سواری ان کے لئے موزوں بھی تھی۔ ارٹھائی بجے کے قریب سب لوگ تشریف لے آئے۔ معزز مہانوں کا بڑے ندر شور سے استقبال کیا گیا۔ امام بخش کو مندرخ اور بہنوئی کے ہار بطور اعزاز پہنائے گئے، جس نے اور بھی ہمارا پیدا کر دی۔ پھر سب لوگوں کو ”میدان کارزار“ یعنی ”گجرات ہاؤس“ کے ایوان طعاً میں پہنچایا گیا جو بالائی منزل پر تھا۔ ہمارا بھی یہی گمان تھا کہ اسی جگہ محل معرکہ دہشتاگرہم گرم ہو گا۔ امام بخش کے ساتھ ان کے تین صاحبزادے بھی تھے۔ سب یکساں نامور۔ بھولو، اسلم، گوگا۔ اور دو کس پوتے بھی۔ ایک پوتا۔ جو سات برس کے قریب لگ رہا تھا، ماشاء اللہ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں ”کامنو“ تھا۔ اس کا ذیل ڈول اور پہلوانی دم ختم کی شروعات صاف اعلان کر رہی تھیں کہ یہ اس خاندان کی روایات کو خوب برقرار رکھے گا۔ ہونہار بردا کے چمکے چمکے پات۔ سب سے پہلے شربت کا دور چلا۔ پہلی مرتبہ پہلوانی شربت بھی پیا۔ کتنا فرحت بخش! اس کا ایک ایک بڑا، قد آور، تہ بھر

۱۰ علامہ حسین کشمیری نے مدت ہوئی لکھا تھا۔

کتیں جو چند گز دین تو قوم کی ہر زندگی

لہو جو ہے خدوس کا وہ قوم کی زکوۃ ہے (ادارہ)

سے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور خوب ڈنڈ پیلے ہیں۔ بالکل بستر توانا، اور عادی بھی صرف مرغن غذاؤں کے۔ سلسلے وہ اب بھی بڑا پیدا ایک گھنٹہ ورزش کرتے ہیں۔ یہی ان کی صحت و توانائی کا راز ہے ہم لوگوں کو خدا رک کیسے ہمیں ہر وجہ ورزش کی عادت ہی نہیں رہی بلکہ اس سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ "بیڈ ٹی" کے بغیر بات نہیں کرتے۔ ورزش تو پھر دور کی بات ہے۔ پیدل چلنا باعث عار سمجھتے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے، قیصر کا حق قیصر کو اور خدا کا حق خدا کو مطلب یہی کہ تن کا حق تن کو دیتے رہو اور من کا من کو۔ اگر ہم تن کا حق ادا نہ کریں گے تو وہ بغاوت کیوں نہ کرے؟

نوجوانوں کے لئے کراچی میں کھیل کے میدان کتنے ہیں، اور ہوں بھی تو وہ کھیلے کب ہیں؟ اگر ہمارے نوجوان کام کریں اور کھیلے کھیلے پوری طرح تنگ جائیں تو ان کی خدا رک بھی بڑے اور فضول شرارتیں بھی کم سو جائیں۔ نوجوانوں کی ورزش تو بس رقص تک محدود ہو گئی ہے۔ اور آپ جائیں رقص کے ساتھ اور کیا کچھ نہیں۔ ورزش ضبط اور تاب نہوان کا تحفظ سکھاتی ہے اور یہی ہم میں ناپید ہے۔ ہم لوگ جسمانی محنت سے بھی جی چراتے ہیں کہ اس سے تکلیف ہوتی ہے! جس طرف دیکھئے "صاحب ہلانا" کرسیوں پر بچے بیٹھے ہیں۔ دفتر سے نکلے تو موٹر، یا رکشا، ٹیکسی، بس پر سوار جسم میں طاقت آئے تو کیونکر؟ جبھی تو وہ ہیں اور طرح طرح کے امراض۔ ڈاکٹر بچا رہے بھی ان کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر گھبراتے ہیں اور ان کا علاج نہیں کر پاتے۔ معدے کا کارہ ہو چکے ہیں، صحتیں بگڑ گئیں۔

آپ بھی کہیں گے کہ یہ کیا رنگ میں بونگ ملا دی۔ کھانے اور گانے بجانے میں یہ کھراگ کیسا! وہ کھانے کی بات تو یقیناً ہی پڑ رہ گئی۔ خیر، کھانا ختم ہوا تو پھلوں پر حملہ ہوا۔ انہیں بھی بڑے ذوق شوق سے کھایا گیا۔ ایک پہلوان کو کہتے سنہ ۱۲۶ کل کیلے کھا گیا تھا۔ دوسرے نے مصرع طرح لگایا کہ "اب بھی اتنا کچھ کھانے پینے کے بعد بارہ درجن کیلے گھوٹ کر لاؤ تو نوش کر جاؤں!" میرے تو سن کر ہوش اڑ گئے۔ خدا ہمارے ان پہلوانوں کو سلامت لے آپ نے دوسری تفصیلات تو بیان ہی نہیں کیں۔ مگر اجناس کا انازہ

بھی اسی سے کیا جاسکتا ہے۔ (ادارہ)

باتی ۲۷ پر

جو دلوں کے ساتھ کام و دہاں کو بھی تیار کر رہے تھے۔ ماہرین خوراک کا نظریہ تو یہی ہے۔ پہلوان گانوں کے لئے ہم تن گوش۔ اتنے ذوق! اس کا تو ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ دھیان کھانے کی طرف، کان گھمانے کی طرف۔ خصوصاً اسلم اور بھو کو تو دھیرے دھیرے پاؤں کے ساتھ تال بھی دیتے جاتے تھے۔ امام بخش نے تو ایک دوسرے سم پر ہر بھی جھٹکا! پہلوان اور موسیقی۔ مجھے یہ تال میل بڑا عجیب لگا۔ مگر ایسا ہی عجوبہ یہ بھی ہے کہ اکثر ریاستوں میں جہاں پہلوانوں کی بڑی قدر ہو کر تھی، اچھی اچھی ڈیرہ دار نیاں بھی ان کے فن کا بحد قدر دان ہوتیں۔ بہر حال مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہلے پہلوان صرف پہلوان ہی نہیں۔ خشک اور بے ذوق۔ بلکہ بڑے خوش مذاق اور زندہ دل بھی ہیں۔

لباس جتنا مختصر اور صاف ستھرا اتنا ہی چال میں وقار اور خود اعتمادی جسم گھٹے ہوئے، کسرتی، جیسے فولاد۔ مگر کیا مجال جو چرس پر غور کی ذرا بھی جھلک ہو۔ سب بڑی خاموشی اور خوش تیزی کے ساتھ بیٹھے کھاتے رہے، آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتے جاتے۔ میں برابر کنکھروں سے ان کی شرعور کی کا منظر دیکھتا رہا۔ کھانے کا سلسلہ فقو سوا گھنٹے جاری رہا۔ سب نے حسب ذوق کھانے کے ساتھ خوب انصاف کیا۔ اور جتنے بقدر جتن کی صداقت پر پوری طرح مباد۔ اپنے پہلوان بھائیوں کو کھاتے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جیسے اس مظاہر میں ہم بھی شریک ہوں اور اپنے آپ پر ناز کر سکیں۔ زیادہ تر خوشی اس لئے ہوئی کہ آج بھی ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حقیقی معنوں میں "کھا مسکتے ہیں" ورنہ آج کل تو جہاں دیکھیں "ڈائٹنگ" یعنی خوراک کم کرنے اور جسم کو گھلاتے جانے کا چرچا ہو رہا ہے۔ اور شرق ہو یا مغرب، لوگ اسی پر فخر کرتے ہیں، بلکہ پھولے نہیں سماتے کہ ہم "ڈائٹنگ" پر کار بند ہیں۔ اِلَہَا مَا شَاءَ اللہ۔ میرا خیال ہے ماہرین طب کو چاہئے پہلوانوں کی خوراک کا سائنسی جائزہ لیں اور اس پر تحقیق کریں۔ وہ تو آئے دن یہی پٹی پڑھاتے رہتے ہیں کہ گھی کم کھاؤ ممکن، کم کر۔ یہ نہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ جو اتنا گھی بکھن، میوے ہمیں کر لیتے ہیں تو کیسے، بلکہ اتنا کچھ کس طرح لیتے ہیں؟

امام بخش کی عمر اس وقت ۸۵ سال ہے۔ وہ خدا کے فضل

جنگل جنگل، پرست پرست

اندراجش راجپوت

گولے بھی اڑتے ہیں جن سے بستیاں کی بستیاں اڑ کر سمندر میں جا پڑتی ہیں
جاگتا م کے پہاڑی علاقے کی سرسبزی، ہریادوں اور خوشبو
کا اندازہ دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی پانچ ہزار مربع میل کو محیط
گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا، خوفناک وحشی جانوروں کا مسکن۔ تنگ،
سکڑی واویلاں حد درجہ یک پھیل ہوئی۔ بے شمار ندیاں، تکیہ چٹانیں،
ہیب پہاڑ کہ انسان مارے رعب کے آنکھیں بھی کر لے۔

یہاں کی آبادی کا حال کیا پوچھتے ہیں۔ مجھے اتنا ہی معلوم
کہ یہاں ۲۹۳۱۱۳ نفوس جگہ جگہ بسے ہوئے ہیں۔ یہاں کے پہاڑی
لوگ شگولی نسلوں میں سے ہیں۔ زیادہ تر بودھ دھرم کے ماننے والے
ہیں جیسے موگھ اور چاگہ۔ ان میں سب سے زیادہ خیر متدن نمونگ
نوک ہیں۔ ان کی اپنی ہی ایک تہذیب ہے۔ بالکل ناتراشیدہ اور
ابتدائی حالت میں۔ دنیا کو ان کا حال سب سے کم معلوم ہے۔ چند
بستیاں ہیں، ہر ایک میں سو سو سا آدمی، مرد، زن و بچہ رہتے
ہیں۔ انہیں بن جوگی اور ٹیکو بھی کہتے ہیں۔ ان کے چہرے کو دیکھنے سے
ایک فرق معلوم ہوتا ہے۔ اقوام درود کے دیگر نمونوں کے مقابلہ پر
ان کے رخساروں کی ہڈیاں زیادہ ابھری ہوئی نہیں ہوتیں نہ آنکھیں
ہی اتنی اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ موڈنگ قبیلہ کے لوگ ۲۰ تا ۲۵ ہزار
ہوں گے

مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ راستہ پر خطر ہے، چنانچہ میں نے
سفر کا آغاز کیا ہی تھا کہ سرف ایک منزل تک پہنچنے میں مجھے کوئی تیس
ندیاں پار کرنی پڑیں حالانکہ فاصلہ صرف تین میل کا تھا! ستواں پہاڑ
کو عبور کرنا جنگلی واڈیوں میں سے ہر گز گزرنا میرے لئے کوئی نئی بات
نہی مگر اس سفر میں ایک عجیب طعن کی تھر تھری ضرور محسوس ہوئی۔

سب سے بڑا قصبہ بندرا بن ہے اور جنگلی علاقہ صرف
۱۶ میل دور تھا۔ اسے مقامی لوگوں میں دیوانی پاترہ کہا جاتا ہے۔

پچھلے اپریل میں میں نے پھر رخت سفر باندھا۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ ستیا جی میرے خون میں ملے ہوئے ہے یا پاؤں میں کچر ہے،
کہ میں ایک مریضہ تک کسی جگہ ہی نہیں رہ سکتا اور دنیا کا کوئی نہ کوئی خط
ضرور مجھے دعوتِ نظارہ دیتا ہے اور میں پھر آمادہ سفر ہو جاتا ہوں
یہ سوال کہ شہر اچھے یا بُرے؟ بہت پرانا ہے۔ انسان کے مدینت اختیار
کرنے کے وقت سے ہی یہ سوال بھی سامنے ہے اور حضرت و۔ دین
کی بحث ہی ان اڑلی بحثوں میں سے ہے جن کا کوئی آخری فیصلہ نہیں
ہو سکتا۔ شہر کے کوچہ و بازار اور بام و سقف، دیوان و منازل کا اپنا
ایک روپ اور بلا واسطہ جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور سر جنگل،
بیاباں ہیں، بارخ و بارغ ہیں صحرا اور مٹنے ہیں، جن کا اپنا ہی ایک حادث
ہے۔ جنس جنہیں تو خود دلچسپی ملک میں ایسی ہیں کہ کم لوگوں نے دیکھی ہیں
اور میں ایسے ہی مقامات کی روتے سے قریب ہونے اور ان کی ملکسی دوزخ
تصویریں حاصل کر لے کے لئے جایا کرتا ہوں۔ یہی لکن مجھے مشرقی پاک
کے بندرا بن کی طرف لے گئی۔

چانگام کے پہاڑی علاقوں کی سیرکٹی بار کر چکا ہوں مگر
وہاں تمدن حاضرہ سے بہت دور ہے ہوئے اب بھی ایسے قبائل ہیں
جن کو خود اس پاس کے لوگ بھی نہیں جانتے اور میں تو ہزاروں کوس
سے یہاں پہنچا تھا۔ سفر قتنا مشکل اور راہ کی صعوبتیں جس قدر زیادہ
ہوں اتنا ہی لطیف سیاحت بڑھتا ہے درنہ آدمی اس وادی میں
تو ہر کیوں رکھے شہر میں آیا ہوا کوئی نہ جنگل قائم دیکھ لے یا کسی سفر نامہ کا
مطالعہ کر لے۔ چنانچہ جب میں بندرا بن کے سفر اور ایک طلسمی جنگلی
قبیلہ تک پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ روانگی کا انتظام
فورا ہونا چاہیے ورنہ بارشیں شروع ہو جائیں گی اور وہ ایسی
قیامت کی بارشیں ہوتی ہیں کہ آسمان کا طبق پھٹ جاتا ہے اس لئے
سفر نامہ ممکن ہو گا۔ سنہ سے صرف بارشیں ہی نہیں ہوتیں زلزلے کے

بناتے ہیں۔ ہر گھر کا نقشہ ایک سا نظر آئے گا۔ یہ دل گروہے محن بھی کہہ لیجئے۔ ادھر ادھر کی جڑے اور رکھڑے جھلیاں لگی ہوئی۔ اس پنجرہ تک پہنچنے کے لئے عجیب طرح کا لیتے ہیں۔ زمان خانہ میں کوئی نہیں جاسکتا۔ ”صحن“ میں جہا عرشے کا سالطف آتا ہے، اٹھتا ہوا دارا دودھ دودھ کا نفا میں لے یہاں جو لٹا بھی دیکھا۔ بس ویسا ہی جیسا چھا ہوتا ہے۔ گھر کے کی جگہ میٹھے کدو کا خول برتا جاتا ہے، یہی ان اور انیس کبس بھی ہوتا ہے۔ بید کا بنا ہوا ایک عجیبہ نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ اس میں دھان بھرا جاتا ہے۔ بلا نامہ شین غلہ اس میں آجاتا ہوگا۔ اب ان کی زراعت کا حال بونے سے پہلے کسی زمین کو چھانٹ لیا، صاف کیا اور جھاڑ زمین پر جمع کر کے سوکھنے دیا۔ یہ کوڑا ساری گرمیوں غور ہے۔ اس کے بعد اسے آگ لگا کر زمین کو کاشت کے لئے ہے۔ اس اور سارے اناجوں پر کاروں کے بچوں کی ”کاک ٹیل“ پھیلاتے ہیں۔ دھان، روٹی، مکا، مرسولی، میٹھا کدو، خربوز اور تبا کو سب ایک جگہ بونے جلتے ہیں۔ ان کی سب کاشت چاول ہے اور آگ جلنے کے بعد چورا کھنی تھی وہ ثابت ہوتی ہے۔

ان لوگوں میں بھی تقسیم کار کا اصول جاری ہے۔ مرد عورتوں کے جدا جدا کام ہیں۔ مرد جھومنگ کرتے ہیں اور کرتے ہیں، ٹوکریاں بننا، چٹائیاں بنانا، روٹی اوشنا، گھرن بڑھنے کے کام۔ کھائے کا دودھ بھی مرد ہی بکھلتے ہیں۔ عورتیں پانی لاتی ہیں، دھوئی نالنگوٹ اور دریاں بنتی ہیں۔ منڈ بھی اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ جھاڑو بوا رو، بچوں کی دیکھ بچا پکانا وغیرہ تو خیر عورتوں کے کام ہی ہیں۔

میں نے ان کے علاقے میں چل پھر کر شادی بیاہ کی۔ معلوم کیں۔ شادی کے وقت لڑکی کی عمر لڑکے کی عمر سے ۱۰ جلد شادی ہو جاتی ہے کیونکہ ایسی لڑکی شوہر کی عمدہ گھریلو ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لئے زیادہ موزوں لڑکا لڑکی آپس میں ملتے جلتے رہتے ہیں جس سے شادی کر لڑکا اس کے گھر شام کو آتا اور کافی دیر تک گھر میں رہتا۔

یہاں کوئی سردار دیوانی نام کا تھا جس نے یہ پاڑہ بسایا تھا۔ جو اسکا رکھوالا تھا۔ اس رقبے میں کوئی دس گیارہ موزنگ بستیاں تھیں جہاں اس مقام تک پہنچا تو حسب معمول زبان نہ جاننے والی دشواری پیش آئی مگر انسانوں کے پاس خلوص کی زبان ایسی ہے جس کا سکھ ہر جگہ رواں ہے۔ اور وہ اولٹے مطالب میں بڑی مدد دیتی ہے۔ ویسے ایک مقامی ترجمان کا بندوبست بھی کر لیا تھا تاکہ جہاں گاڑی بالکل ہی اٹک جائے تو اس سے مدد لیں اور وہ رہنمائی کرتا رہے۔ میرا خیال تھا کہ سب سے پہلے یہاں کے سردار سے ملا جائے۔ پھر ان لوگوں کے گھر گھر متنی کو جا کر دیکھوں اور جتنی باتیں مجھے معلوم ہوں ان کی کہانی آپ کو سنائوں۔

ان کے پاڑہ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ عجیب زبان بولتے ہیں، ہر چیز عجیب، انوکھی اور جدا ہے۔ میں ان عجائبات کو ہی دیکھنے آیا تھا۔ گاؤں کے مکھیاسے ملاقات ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے کھیتی باڑی دیکھائی۔ یہاں زراعت کا وہ طریقہ رائج ہے جسے ”جھومنگ“ کہتے ہیں۔ اس کا حال آگے بیان کروں گا۔

موزنگ لوگ اپنی ضرورت کی سب چیزیں بستی ہی میں پیدا کر لیتے ہیں اور صرف دو ایک ہی چیزوں کا باہر سے انتظام کرتے ہیں جیسے مٹی کا تیل، نمک وغیرہ۔ مجھے گاؤں میں نہ کوئی درزی دکھایا دیا، نہ موچی، نہ ٹبرمنی، نہ لوہار، کہار، جولاہا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ یہ لوگ خود ہی اپنا کام کرتے ہیں۔ اب میں موزنگ گھر میں بھی پہنچا اس کا حال سناتا ہوں۔

گھر کافی کٹا رہا تھا۔ شادی شدہ جوڑے کے لئے رنجہ کی الگ جگہ بنی ہوئی تھی، یوں مشترکہ خاندان کا رواج یہاں بھی ہے۔ موزنگ کی دنیا بائس کی دنیا ہے جیسے عربوں کی دنیا کبجور کے گھر دھو متی ہے۔ موزنگوں کا گھر زمین سے دس بارہ فٹ بلند تلیوں پر بنتا ہے تاکہ جنگلی جانوروں وغیرہ کے گزند سے محفوظ رہے۔ اتنی اونچائی پر مکان بنانے کی وجہ موزنگ کچھ ادھی بتاتا ہے۔ اس کا قصہ بھی سن لیجئے۔ کتلسے ہزاروں سال گزرے ایک دفعہ کسی موزنگ کے گھر میں بچہ پیدا ہوا جنگل میں چوہنیاں، کیڑے مکوڑے اور وہ بھی ایسے جنگلوں میں بہت ہوتے ہیں، وہ اس ننھے سے بچے کو اپٹ گئے اور انہوں نے اس بچے کو کھا لیا۔ تب سے یہ لوگ اکبر کی کرسی کے مکان

قبول کر لی جاتی ہے۔ دلہن کے گھر صرف مرد جلتے ہیں۔ دلہن کوئی خاص جوڑا بھی شادی کے روز نہیں پہنتی بس ایک گھبراہٹا چادر ٹانگوں سے لپیٹ لیتی ہے۔ ہاں رخساروں اور پیشانی پر بندیاں اور نقش و نگار ضرور بنائے جاتے ہیں۔ لبوں اور دانوں کو سرخ گلابی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ منکوں کی مالا، چوڑیاں، بازو بند جھانجن اور کمر کا پٹکہ ضرور ہوتا ہے۔ پٹکے المونیم کا ہوتا ہے۔

یہ سب سامان گھر پہاڑی لوگ لاتے ہیں اور ان کے کاٹوں پاس جب ہاٹ لگتا ہے تو وہاں فروخت کرتے ہیں یا ان کے جھگل سامان وغیرہ سے تبادلہ کر لیتے ہیں۔

مورنگوں کے علاقے میں پہنچ کر مجھے یہ معلوم کرنے کی بھی جستجو ہوئی کہ ان کے مذہبی خیالات۔ معلوم کروں۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ کسی دیوی دیوتا کو نہیں ماننے، کچھ پرانی رسوم اور عقیدے کا ماننا ہے اور انہی کو اپنا دھرم کہتے ہیں۔

مورنگ موسیقی کے بڑے دلدادہ ہوتے ہیں۔ قص بھی کرتے ہیں۔ ذرا ان کے سارینہ کا حال سنئے۔ ایک دوڑ خاڑھ، جسے وہ خوب پیٹتے ہیں۔ عجیب عجیب شکلوں کے باجے، کوئی نفرخا، کوئی ۸ فٹ دیوار، قص کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ درجن بھر بن بیاہی لڑکیاں ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں اور اتنے ہی باجے والے ہوتے ہیں شادی شدہ لڑکیاں کسی موقع پر بھی قص میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ بیچ میں ایک آدمی بیٹھ جاتا ہے اور قص شروع ہوتا ہے۔ نال دینے کے لئے المونیم کے جھانچہ عجیب طرح کا آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ رقص کرنے والیاں پیروں سے اس کے ساتھ منگرتی ہیں۔ میک آپ کیلئے پھول، کوڑیاں اور جسم کو رنگنے کے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ محفل رقص و سرور صرف خاص خاص موقعوں پر منعقد ہوتا ہے جیسے جھوم کی فصل تیار ہونے کے وقت امیر آدمی کا گئے ضرور ذبح کرتا ہے۔

غرض مورنگوں کے شب و روز اس ہی طرح گزرتے ہیں ان لوگوں میں زندگی کی جو سچائی بہت ہے۔ یہ لوگ جمائی توانائی، جیلے پن اور جفاکشی میں بھی ممتاز ہیں مگر چاول زیادہ کھانے اور جو ہڑوں کا گند پانی پینے کی وجہ سے مرد عورت سب کی

کی موجودگی میں ہنسنا بولنا اور گیت گانا عام مشغلہ ہوتا ہے۔ لیجئے ان کے ایک گیت کے بول نہیں تو مطلب آپ بھی سن لیں:

”اے لڑکی، تیرا دوسے زینا کنول کے مانند ہے۔

بہ چنڈ کہ توجہ ہو رہی ہے مگر میں تجھے کنول میں

ڈھونڈ رہی ہوں گا اور تیری یاد میں اے پیارے

جاؤں گا، اے خیریں، اے شیریں!“

انچے حبیب کی یہ بات سن کر لڑکیوں جو اب دیتی ہے:

”اے دلنوا، تو کیسا بکا ہے، اے میری سرخ گتھی،

تیرا بدن چمکدار طلا مثل محل ہے، اے میرے جھگل

باسی، اے میرے دلنوا!“

ان کے مردوں میں بہترین صن یہ مانا جاتا ہے کہ جسم کٹھا ہوا ہو، رنگ گندمی ہو، سر کے بال لٹوں کی صورت میں بکھوے ہوئے نہ ہوں بلکہ چنے کی طرح گدی پر باندھ سکے ہوں۔ اس نے اپنے گالوں کو سرخ قرمزی رنگ لیا ہو، گالوں میں جو سوراخ ہیں ان میں رنگین پھول لٹے ہوئے ہوں۔ دانت ایسے کالے ہوں جیسے کوئلہ وہ ہانسی پر پریم گیت سنا گتا ہو شادی اس طرح ہوتی ہے کہ ایک دم وہ اپنے منگیت کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ لڑکے کی سسرال پہنچ کر جہیز کی رقم طے کی جاتی ہے۔

د تقریباً تین سو روپے پر شادی طے ہو جاتی ہے، ان تین سو روپے کا حساب بھی ذرا سن لیجئے۔ دس روپے دلہن کی اپنی قیمت، دس روپے دودھ پلائی کا حق مادہ عروس کو، باقی رقم دیگر مصارف کے لئے۔ چادریں، چٹائیاں، کلباری، گنڈاس، تیر، تلوار خریدنے کے لئے، الگ خرچ لڑکے والے کو دینا پڑتا ہے پہلے تو صرف کھنکٹے ہوئے روپوں میں ہی یہ حق ادا کیا جاتا تھا مگر اب سنا ہے نوٹ بھی چلنے لگے ہیں کیونکہ جھگلوں تک یہ کھنکٹے روپے اب کم پہنچتے ہیں۔

یہ نوٹ نصف قیمت پر بدلے جاتے ہیں! اگر اس رشتے پر کوئی اعتراض ہو تو لڑکیوں کی مجلس شورعی میں اعتراض سنا جاتا ہے اگر لڑکی کو پہلا پھسلا کر لڑکے لے گیا تھا تو ۷ روپے کا تاوان دینا پڑتا ہے، اگر بعد میں لڑکے کا فیصلہ یہ ہو کہ نہیں لڑکی نے لڑکے کو وہ غلایا تھا تو لڑکی والوں پر تیس روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ اگر لڑکے کا قصود دار مانا جائے تو اسے ایک سو روپے لڑکے کو ملنا ہوتا ہے۔ اسے وہی ذبح کرے گا اور ہر گھروں پہنچ کر اس کا گوشت بانٹ کر معافی مانگے گا۔ عام طور پر یہ معافی

تو ندیں نکلی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کی عمریں ۴۰-۸۰ برس تو معمولی بات ہے۔ کسی خاص بیماری میں بھی مبتلا نہیں ہوتے۔ جڑی بوٹیوں سے عضلات کر لیتے ہیں ورنہ مرض یا سوز کی ترقی دے کر دبا یا بیماری بھگنے کا ٹوڑکا کرتے ہیں۔ دوسرے قبائلیوں کے ہاں تو مندر یا استھان جیسی کوئی چیز مل جائے گی مگر مورنگوں میں نہ دیوی ہے نہ دیوتا۔ اسپتال جیسی کوئی چیز ان کے ہاں نہیں۔ ہاں رنگھتھی کے صدر مقام پرمول اسپتال ضرور موجود ہے کچھ ڈسپنسریاں بندوبان اور رام گڑھ کے ذیلی صدر مقامات پر بھی بنی ہوئی ہیں جو تھانوں کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ دبا وغیرہ کی اطلاع کرنے کے لئے محکاؤں کا نمائندہ نزدیکی تھا نہ پڑتا ہے اسے یہاں "کارباری" کہتے ہیں۔ جھگڑے وغیرہ کی اطلاع بھی یہی کارباری جاکر دیتا ہے۔ ویسے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ پنچایت ہی میں فیصلہ ہو جائے۔ کیونکہ مورنگ عام طور پر امن پسند ہوتے ہیں۔ وہ حکومت سے مدد اس وقت مانگتے ہیں جب فعلیں تباہ ہو جائیں یا دریاؤں میں طغیانی آنے کے باعث ان کے گھر بستی بہہ جائیں۔ حکومت انہیں "جھوم" اگانے کیلئے ۵۰ روپیہ فی کنبہ دیتی ہے۔ مورنگ کے پاس گھر گڑھستی کے سامان، تھوڑی بہت نقد پونجی اور چند پالتو جانوروں کے علاوہ کوئی خاص املاک نہیں ہوتی۔ وہ ترکاریاں اور تبا کو خود ہی بوتے اور گھر کے لوگ اسے استعمال کرنے میں مورنگوں میں بچے کی پیدائش پر کوئی خاص رسم ادا نہیں کی جاتی۔ زچگی کے دوران ماں نو دن تک گھر کے کمرے سے باہر نہیں نکلتی۔ مرنے پر مورنگوں میں چند رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ میت ایک ہال میں سات دن تک رکھی رہتی ہے اور اگر کنبہ داروں میں استطاعت ہو تو چند سٹوراؤں اور مرنے کا ٹکڑہ خزا داروں کو کھلاوے جلتے ہیں۔ سات دن گزرنے کے بعد میت کو نزدیکی ندی پر لے جا کر جلاتے ہیں۔ اس شمشان یا مردہ گھاٹ کو ان کی بولی میں "چینگ رنگ" کہتے ہیں۔ میت کی راکھ بانس کے ایک کس میں رکھ کر جلاتے کی جگہ پر دفن کر دی جاتی ہے اور دوسرا ایک سفید جھنڈا گاڑ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی دبا میں مرا ہو تو اس کی لاش دو دروازہ جمل

میں لے جا کر دفن کرتے ہیں ورنہ میت کو جلاتے ہی کا رواج ہے۔ رسوم کی طرح مورنگوں کے لباس میں بھی انوکھا پن ہے۔ عورتیں اور چھوٹی بچیاں اپنی کمریں ۹ انچ لمبی کپڑے کی تاکڑی یا ٹیپی سی باندھتی ہیں۔ اس فحشی کوہ دھنکی کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کپڑا کالا ہوتا ہے اور گھری پر بنایا جاتا ہے۔ مرد بھی ایک چھوٹی سی ننگوٹی ستر پوشی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ "کارباری چونکہ گاؤں سے باہر بھی جلتے ہیں اس لئے ان کو زیادہ اچھا لباس پہننا بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ مختلف ایک لنگی کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔ اوپر برمی وضع کی ایک بنش شرٹ جیسی چیز پہنتے ہیں اور سر پر سفید پگڑی بھی باندھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ لوگ برما کے علاقے ارکان سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان کی زندگیوں میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ایک روایت یہ بھی کہتی ہے کہ مورنگ لوگ ہندو گنگائی علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ بہر حال مشرقی پاکستان آج جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہے اس کی وجہ سے یہاں کے پہاڑی علاقوں کے باشندوں میں بھی ترقی کی لہر دوڑے گی اور وہ بھی ان ترقیاتی منصوبوں سے بہرہ ور ہوں گے جو پورے مشرقی پاکستان میں اب عام ہو رہے ہیں پہاڑی علاقے کے عین وسط میں ترقی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ کاشتکاری کا برقیائی منصوبہ اور کرنائی کا رخانہ کاغذ ساز بنے چکے اور موٹو قبائل کے لئے ترقی و معاش کی بہت سی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اسی طرح غلط بندوبان میں سائنس و ٹیم بنانے کی تجویز ہے۔ اس کے مکمل ہونے پر مورنگوں کے بھی دن پھر جائیں گے اور اب تک ان جنگل باسیوں کی طرف سے جو غفلت برتی گئی تھی وہ توجہ سے بدل جائے گی اور صدیوں پہلا ناجو دور دور ہو جائے گا۔ مشرقی پاکستان کے ان پہاڑی علاقوں میں جب نئی لہر محدود و بڑے گی تو قدرتی بات ہے کہ مورنگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس وقت ان مورنگوں کی زندگی اور تمدنی نظام میں کیا کیا تبدیلیاں آگئی ہیں اس کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہوگی۔ امید ہے اس کا آنکھوں دیکھا حال جلد مشیہ کر سکیں گے۔

”ایسا گماں نہ تھا“

(ایک نفسیاتی مطالعہ)

وجاہت حسین سونی پتی

کی داد دے بغیر نہ رہ سکتا۔ شاید یہ مروانہ بن تھا جس کے باعث وہ ایسے ایسے مشکل کام انجام دے نیا کرتی جن سے مرو بھی پہلو بچا نہیں۔ لباس! اسے یہ کیا؟ مذاق تو نہیں کر رہی ہیں؛ پتلون، کوٹ، مگر وہ ذرا بھی شس سے مس نہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ میں بھی اور گھر کے سب لوگ ان باتوں کے عادی ہو گئے۔ لطف یہ کہ وہ پوری طرح مرد بننے کے لئے سر پر دوپٹے کو مگر ٹی کی طرت بانہ لیتی۔ جیسے ہیر کسی ناہک میں راجھاں گئی ہو۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں! جو دیکھتا حیران ہوتا۔ شاید بچپن میں جنس کا امتیاز، جنسی شعور اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ ان کے ڈانڈے کچھ کچھ آپس میں ملے ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسی باتیں عجیب بھوتے ہوتے بھی عجیب نہیں ہوتیں۔ میں اس کی اس ٹیڑھی، دس پر کوئی مذاق کر بیٹھا تو وہ جھٹک دیا، ”اب دیجئے، میں اپنا نام نغمہ بڑا ہے“

اتنی جان نہ شروع ہی سے نغمہ کے لئے اپنی بہن کا روپا دھار لیا تھا۔ بھر حواس، ہمدرد۔ ایک پردان چڑھتے بھنے پودے کی ہر حالت سے دلچسپی رکھتے ہوئے، وہ ان باتوں پر لے سے نصیحت کرتیں، بڑے پیار سے سمجھاتیں۔ اما کی تو ایک سے دو بلکہ دو سے تین ہو جانے میں جیت تھی۔ اس لئے سب کبھی آبا جان کے سامنے اتنی ناصح مشفق کا کردار ادا کرتی تو وہ کھٹکھٹا کر منہ پڑتے اور کہتے کہ یہ ہم مردوں کی تعداد میں ایک اور اضافہ ہے۔ ہماری اکثریت تمہاری اقلیت۔ آبا جان کی یہی نغمہ کے اس جذبہ کی تسکین کا باعث بنتی جس کی رد میں وہ ہمے جا رہی تھی۔ سمند احساس کو تازہ نہ

ہم دونوں کھینچا، کھینچتے کبھی رکھی پڑتے۔ نغمہ یہاں بھی باز رہتی۔ اور تاؤ میں اگر مجھے ایسا دھنک ڈالتی کہ میں چیخا چیخا ڈانٹاں کے پاس شکایت لے کر جاتا۔ وہ اٹھی مجھے ملامت کرتی، ”نوٹ! امر دھو ہوئے یہ چیخ پکار، یہ واو میا! آگے چل کر کیا ہو گا؟“

نغمہ؟

ہاں ماں اور کون؟

میں کیسے باور کر لوں؟ وہ اور

یعنی چہ؟ ناممکن! اُسے تو

نفرت تھی، وحشت تھی، سب کچھ تھا مگر اسب وہ تنہا نہیں!

مجھے وہ دس سال یا وہیں۔ اپنی عمر کے ابتدائی سال بوس میں نے

اس کے ساتھ گزارے۔ وہ پانچ برس ہی کی تھی۔ جب اس کا باپ فوت ہو گیا، ایک کار کے حادثے میں اور اس حادثے سے ایک اور حادثہ بھی

پیدا ہو گیا جو عموماً ہوتا ہی ہے۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی اور سوتیلی باپ تو سوتیلے ہی ہوتے ہیں۔ تھا تو کافی پریشان تھا، ترقی یافتہ، مگر بے حد

تنگ نظر۔ نغمہ پردان چڑھے، تعلیم پائے، اسے اس سے کیا۔ وہ بڑی پیاری ہی تھی۔ بڑی ذہین، مگر وہ اس کی گفت میں تو نہ تھی، کوئی خون کا

رشتہ تو نہ تھا۔ نغمہ ہی نغمہ، اس کا رشتہ تو کچھ دوسرے ہمارے ہی ساتھ جا ملتا تھا۔ نغمہ کی ماں میری والدہ کی بہن لگتی تھیں اس لئے میرا

اس کا بھی ایسا دور۔ اور قریب کا رشتہ بھی ملے ہو گیا میری ماں اس لئے اسے اپنے یہاں لے آئی۔ اس وقت میں یہی سات آٹھ سال

کا تھا۔ اکلوتا بچہ۔ اور جب اس گھر میں ایک اور اکلوتی آگئی تو وہ قدرتی طور پر میری بھولی بن گئی۔ پہلے پہل تو میں یسٹن کر چو کہ پڑا کہ وہ اکلوتی نہیں۔

اکھوتے کی طرح بات کرتی ہے۔ بالکل میری طرح۔ جیسے وہ لڑائی ہوتے ہوئے بھی لڑائی نہیں کھلتا چاہتی۔ بالکل مردوں کا سلوک، خود بخود ہی

وہ بے دھڑک کہتی تھا دید بھیا! میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ میں اس کے منہ سے یہ سن کر مسکرا دیتا اور چھٹیلنے کے لئے کہتا میں تو جاوید بھیتا میں وہ اس پر ذرا بھی نہ گھبراتی اور میں اس کی قہقہے و جرات

ظاہر ہے اس میں ایک خاص اشارہ ہوتا جس سے اماں کے ارادوں کی جھلک صاف دکھائی دیتی اور جسے میں سمجھتے سمجھتے ہی سمجھ لیا بھی غمزدی کا ساتھ دیتے، واہ بیٹا! پٹ گئے نا۔ ایں کارا زواید و مرداں چنیں کنند! اس سے ڈرتے ہو۔ بالشت بھر کر طے سے، ماشاء اللہ! ابھی سے ٹینگ! دراصل وہ ان الفاظ سے مجھے شہ دیتے اور واقعی میرے دل میں حوصلہ و ہمت پیدا ہو بھی جاتی۔ مگر جہزی حریف سامنے آتا میری ساری اولوالعزمی اور جرات ہوا ہو جاتی اور میں یوں کانپ اٹھتا جیسے کوئی مجرم جاہر حاکم سے سنگین سزا پانے کے بعد۔

ہمارا گھر یوں احوال ہم دونوں کی زندگیوں کو الگ الگ ڈگر پر ڈالتا جا رہا تھا۔ حریف — خندی، شوخ، تند مزاج اور میں اس کے برعکس احساس کمتری کا شکار۔ دونوں طبعا ایک دوسرے سے مختلف۔ پھر بھی ہمیں ایک دوسرے سے جلدانی گوارا نہ تھی۔ جتنی شدت سے لڑتے اتنی ہی شدت سے پیار بھی کرتے تھے۔ ہماری نوعمری کا یہ زمانہ بھی کتنا معصوم تھا۔ جب کبھی مجھے سکول سے ویر ہو جاتی یا میں کسی دوست سے ملنے کے لئے چلا جاتا تو واپسی پر گھر آکر پتہ چلنا کہ نغمہ نے اور دمچا رکھی ہے۔ اتنی، اتنا سے لڑتی، نوکرائیوں کے پیچھے پڑتی کہ جاؤ ابھی ڈھونڈ کر لاؤ، میں یہ دیکھ کر جی ہی جی میں بہت خوش ہوتا۔ نغمہ ان موقعوں پر "نفقش فریادی" بھی تیار کرتی اور اپنی شوخی تحریر یا شوخی طبع کا ثبوت دیتی۔ وہ اپنے غم و غصہ کا نثر انہیں نقوش میں ظاہر کرتی یعنی کہیں کپڑے لٹے سیدھے پھینکے ہوئے، کہیں اوندرھی کر سی توڑے پوڑے ہوئے قم کہیں الٹ پلٹ کتابیں اور کہیں چینی کے پیالوں کے ٹکڑے۔ گھر میں اسے ٹوکتا تو کون توکتا، جو کسی اس کی لاابالی طبیعت میں آیا وہ کر گذرتی اور جو کچھ چاہتی بے دھڑک کر ڈالتی۔ میرے ماضی کے اور ایسے ہی نقوش سے بھرے پڑے ہیں کسی گہرے سمندر میں غرق اور حافظہ کے نہاں خانے میں محفوظ۔ کتنا حسین تھا یہ سنہری زمانہ اور کتنی دلاؤ نہیں اس کی معصوم یادیں۔

وقت گذرنا چلا جا رہا تھا۔ دختروں کے سائے ابھرتے رہے، پھیلتے رہے، سمٹتے رہے، گم ہوتے رہے۔ زندگی کے سینہ پر خوبصورت عمدتیں کھڑی ہو گئیں اور کہیں زمین کے دہن نے خستہ عمارتوں کو بھگ لیا۔ روشنی بارش کی طرح بستی رہی اور اندھیرے خاموشی سے رات کی کشتی میں بیٹھ کر کائنات کے دریاؤں میں تیرتے رہے۔ یہ کیفیتیں،

یہ صبح و شام کے ملاپ، یہ بہار و خزاں، آتی جاتی رُتیں۔ یہ تعمیر و تخریب کے مناظر، یہ ابھرتے ڈوبتے سائے ہماری زندگی میں طرح طرح کے اضافے کرتے چلے گئے۔ ہم جوانی کی حدود کو چھوئے گئے۔ ان حدود کی ابتدا ایک ایسی بارش سے ہوئی جسے اعتدال کی نرمی اور احتیاط کی قوت نے تعمیر کیا تھا۔ اب ہم بالکل اڑتے تھکڑے نہ تھے۔ اب ہم میں کوئی بے تکلفی بھی نہیں رہی تھی۔ کمرے الگ الگ۔ میں آئرس کا طالب علم، وہ علم نباتات کی طالبہ۔ اس کی وہ شوخیاں جو بچپن کا اقتدار ہی نشان تھیں، بالکل ختم ہو گئیں۔ اب اس کے چہرے پر غور و فکر کی روشنی نظر آتی تھی بے حد سنجیدہ ایسا نظر آتا تھا جیسے شوخیوں شرارتوں کا وہ سرمایہ جو قدرت نے نغمہ کو دیا تھا، وہ اسے پوری طرح اپنے بچپن میں صرف کر چکی تھی اور اسے اب سنجیدگی کے خزانے میں چلے گئے تھے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو بچے بچپن میں بے حد شرارتی ہوں، وہ شباب میں داخل ہوتے ہی نہایت سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ نغمہ بھی میری نظر میں اس حقیقت کی واضح مثال تھی۔ اس کا کمرہ اچھا خاصا معامل بن چکا تھا۔ وہ دن رات اپنے کام میں منہمک رہتی۔ طرح طرح کے تجربے کرنا۔ ان سے نتائج مرتب کرنا، اس کے علمی شور کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ میری طرف بہت کم توجہ دیتی اور تعجب یہ کہ ہم ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود کسی کئی دن ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھتے تعلیم کی راگداز پر چلے۔ ہم بہت دور نکل چکے تھے۔ میں ایم۔ اے میں داخلہ لے چکا تھا اور وہ اسی تناسب سے علمی دوڑیں تیز رفتاری کاٹ رہی تھی۔ اب اس کا عمل کمرے ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ اس نے گھر سے باہر ایک پھلواڑی بھی بنا رکھی تھی، جس میں وہ دن بھر پھولوں پتوں پھلوں اور سبزلیوں کو کاٹتی، تراشتی اور ان کا کیمیاوی یا خوردبینی تجزیہ کرتی رہتی۔ ہوتے ہوتے اسے اتنی مہارت ہو گئی کہ وہ آنکھیں بند کر کے کسی چیز کو محض ہونکھنے سے اس کا نام بتا سکتی تھی۔ میں اس کی قوت شامہ پر اکثر حیران رہ جاتا جیسے اس کے ذہن میں ایک ایسا صحیفہ کھل گیا تھا جس کے اوراق میں کل کائنات کی خوشبوئیں محفوظ تھیں۔ ایک دن ہم سب نے مل کر اسے سٹ پٹانے کے لئے پلاٹ بنایا۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ بانچہ میں کچھ نئے پودوں کا تجربہ کر رہی تھی جو باہر سے منگوائے گئے تھے۔ اس نے ان کی پرورش کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ یہ پودے زمین سے ڈیڑھ فٹ کے قریب ابھرائے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کا تجربہ کرتے وقت نغمہ اس زمانے کی طرف

نغمہ کو اس لفظ سے شدید نفرت تھی۔ جب کسی اسکا سوال اٹھتا وہ خبر نہیں کس نفسیاتی رد عمل کے تحت بیمار ہو جاتی۔ ایسا کئی بار ہوا۔ یہاں تک کہ اس بات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا پڑا۔ اس کے معنی تھے اس کی زندگی کو معرض خطر میں ڈال دینا۔ اور اسی کو نغمہ کی زندگی میری ستر سے زیادہ عزیز تھی۔

نغمہ خوشبوؤں کی دنیا میں بڑھتی چلی گئی۔ پودوں، پھولوں، پتوں، شاخوں، سبزیوں غرض ہر نباتاتی شے کا تجربہ اس کی زندگی کا مقصود بن گیا۔ میں نے ایم۔ لے کا امتحان بھی پاس کر لیا اور میری زندگی..... خیر اب اس کا تذکرہ ہی کیا۔ میں نے محسوس کیا اس کی سب سے زیادہ خوشی نغمہ کو ہوگی حالانکہ میرا خیال تھا وہ اس کا بہت گہرا اثر لے گی۔

زندگی بار آور ہوئی اور ایک غنچہ کھلا۔ نغمہ بہت خوش تھی۔ وہ اس نوشگفتہ غنچے سے کھیلتی رہتی۔ اس کی توجہ پھلوری کے غنچوں سے اس نے غنچے کی طرف منتقل ہو گئی۔ خبر نہیں اس کو واقعی غنچہ کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم کیا اور ہماری قوت شائہ کیا۔ مگر نغمہ تو ہر پھول کی خوشبو سونگھ لیتی تھی۔ شاید اس کے تحت الشعور کو اس سے بھی کوئی خوشبو آتی ہو۔ ایک نامعلوم پیام۔ وہ اسی غنچہ نوشگفتہ کو ہنلاتی، دھلاتی اور خوب پیار کرتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کیسے دیوانہ دار اس ہنستے کھیلنے غنچے کا منہ چومتی جاتی۔ میں نے غور کیا۔ بچے کے بال بھٹوں کے بالوں کی طرح ہنرے ہنرے، چمک دیتے ہوئے، تروتازہ تھے۔ جیسے ان کو چھونے سے کوئی سحر کی ہری بھری سوندھی سو ندھی سینٹی گھاس کو چھو رہا ہو۔ آنکھیں رس بھری کی طرح اور پہوٹے جیسے رس بھری ہی کا نرم نرم چھلکا۔ گال گلاب کی طرح لپکتے ہوئے اور چونٹ پھولوں کی نرم و نازک پتیوں۔ بھلا اس سے بہتر غنچہ اور کیا ہو سکتا تھا جس کا روز خوب مطالعہ کیا جاسکے۔

چنانچہ وہی پرانا سوال ایک بار پھر ابھرا۔ اب کے بزرگ نیچے ہٹ گئے اور غور یعنی ہوا آگے بڑھی۔ اس نے باتوں باتوں میں کہا بچے بھی تو پھول ہی ہوتے ہیں۔ کیسے کوئل، کیسے پیارے، کیسے اچھے لگتے ہیں یہ نغمہ نے کہا کیوں نہیں۔ کایاں بچہ بولنی زندگی کی بہار بھی ہے کہ گود ہری بھری ہوا اس میں ایسا ہی کوئی غنچہ۔ زمینیں ہنستا کھیلنا ہنستا نظر آئے۔ نغمہ کے چہرے پر سخی کی لہر دوڑ گئی اور دیکھنے والی (باقی صفحہ دہر)

نوٹ گئی ہے جہاں اس کا بچپن خود انہیں پودوں کی طرح معصوم اور دلی کی امداد کا محتاج تھا جب وہ پھلوری شے ہاں نکلتی تو اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک ہوتی۔ میں نے پودوں سے نظر ہٹا کر پھلوری میں لگے ہوئے، اچھے نیچے پودوں کو دیکھا اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ نغمہ نے میرے چہرے پر اس مسکراہٹ کو نہیں دیکھا۔ میں سسٹنٹ کھڑے ہوئے درختوں کے تصور میں کھویا ہوا تھا اور اس کا ذہن ابھی پودوں کی نرم نرم گونپوں سے باہر نہیں نکلا تھا۔

میں پلاٹ کا ذکر کر رہا تھا۔ ہم نے نغمہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اتفاق سے وہ دنوں ایک صاحب جنہیں ”سیاح چچا“ کہتے تھے اور جنہوں نے ہمالیہ کے ایک ایک پہاڑ کی سیر کی تھی، ایک بڑے ہی نایاب قسم کے پھول کا عطر تحفہ لائے تھے۔ ہم نے یہ تھوڑا سا عطر گل نیلوفر کے ایک منہ بند غنچے پر چھڑک دیا اور کہا بناؤ یہ کونسا پھول ہے؟ ہمارا خیال تھا وہ جھٹ کہہ دے گی یہ فلاں پھول ہے۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ اس نے تین چار مرتبہ غنچہ کو سونگھا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ ہر بار اس کے لبوں پر ایک ”پر معنی مسکراہٹ“ ابھرتی۔ آبا کہتے بس بس، تم اسے بوجھ چلیں۔ آخر نغمہ کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے کہا ”پھول ایک نہیں دو ہیں۔ ایک تو نیلوفر لگتا ہے اور دوسرا.....“ آبا جان جھٹ بولے ”ہو نہ ہو! وہ کہاں ایک ہی تو ہے۔ بس جی بس معلوم شد“ نغمہ کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔ وہ بولی ”ہے تو خیر وہ نیلوفر مگر ہے پہاڑی۔ اس میں کسی نایاب پھول کی باس بھی مل گئی ہے۔ ادھو! یہ کوئی عطر تو نہیں مل دیا آپ نے؟ دونوں خوشبوئیں ایک دوسرے کو دبا رہی ہیں۔ دیکھیں تو....“ ہم سب حیران رہ گئے اور آبا جان نے تو بہت ہی شاہاش دی۔

ایسے نغمہ ہمارے گھر کی مستقل رونق بن گئے تھے۔ زندگی کی کشتی اب شباب کے دریا میں پوری طرح اتر چکی تھی۔ شباب کی لہریں جذبات کے ساحل سے مستانہ وار تکرار رہی تھیں۔ نغمہ جوان ہو چکی تھی۔ انی کو اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ لیکن جوہنی اس کا تذکرہ کیا گیا، نغمہ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ اتنا شدید رد عمل! اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ وہ کئی دن بخار میں پھنکتی رہی۔ مجھے بے اختیار ”مذکی“ کا ہیرو یاد آ گیا۔ میرے ذہن میں نغمہ کا ایک تصور تھا اور وہ مجھے دھندلاہٹوں کی آغوش میں کھوتا ہوا محسوس ہوا۔

ہماری موسیقی

فن نغمہ کی تاریخ اور اس کے فن و فلسفہ پر سیر حاصل نظر

مرتبہ: رفیق خاں

- نئے موضوعات کا اضافہ
- پاکستانی موسیقی کے موجودہ مسائل
- ساز و آہنگ کی دنیا میں مسلمانوں کا عظیم حصہ
- مسلم فنکاروں کے اعجازات موسیقی، تمدن و تاریخ انسانی میں نغمہ و آہنگ نے کیا کردار ادا کیا۔

چند موضوعات

مشاہیر موسیقی: امیر خسرو، سلطان حسین شرقی، میاں تان سین۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی، بان رس خاں، مسیت خاں، نیروز خاں
تاریخ موسیقی: موبقی اور تمدن عالم، موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ، پاکستانی موسیقی، ہماری موسیقی کے ساز
پاکستانی موسیقی: مشرقی پاکستان کے لوگ گیت، مغربی پاکستان کے لوگ گیت، راک ڈیز (دار شاہ)
مسائل موسیقی: تجدد موسیقی، قومی ترانے کی موسیقی اور سرگم ہماری موسیقی کے مسائل، نمر لوسی

چند ممتاز ادیبان قلم

سیدنا بدلی عابد جناب شاہد احمد دہلوی۔ جناب خادم محمد الدین، قاضی۔
احمد میاں اختر جو ناگزری، ڈاکٹر نکیل خاں بلوچ، فیروز نظامی سید مجتبیٰ
سجاد و سرور نیازی، احمد جی چھاگلہ، سید امجد علی، عاصم حسین، امین الرحمن،
رفیق غزنوی اور مادام آذوری۔

کتاب میں مختلف سازوں کی آرٹ پیپر چھپی ہوئی آٹھ صفحے کی
نغیں تعداد بھی شامل ہیں۔

کتاب نغیں اردو ٹائپ میں نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت سرورق
کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت صرف پانچ روپے۔

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳۳ کراچی

سوندھی مٹی

طاہر احمر

اب اس دعوے کے لئے کسی دلیل کی بھی حاجت نہیں رہی ہے۔ ہر قوم اپنے ثقافتی آثار و علامت کی زندہ مثالوں سے ہی ممتاز ہوتی ہے اور اقوام عالم میں پہچانی جاتی ہے۔ یہ علامتیں رسم و رواج، زبان و ادب، قدیم کہانیوں، گیتوں، روایات میں ملتی ہیں یا قوم کی امنگوں اور دین و ملت کی گڑھی سوندھی مٹی سے تیار ہوتی ہیں۔ ان کی توانائی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ وہ نئے ماحول اور نئی رفتار کے ساتھ خود کو زندہ رکھ سکتی ہیں اور ان کا حسن ماند نہیں پڑتا نہ ان کی تاب بڑھ پڑتی ہے۔ ہمارا قومی کچھ اس روشنی میں یقیناً نیا نہیں، بہت پرانا ہے، بڑا مانوس اور گہرا۔ اس کی علامتیں گندھارا کی وادیوں سے لے کر سندھ کے ڈیٹا تک بکھری ہوئی ہیں اور آج کی مشینی زندگی بھی اس کی اصل توانائی، خشش اور روح کو نقصان نہیں پہنچا سکی ہے۔ یہی زندہ تہذیب کی علامت ہے۔ ہماری ثقافت، جس کے ڈانٹے گندھارا کے مجسموں، مومن جوڑو کے گلی کوچوں، یہاں کے ظروف اور ٹیکسلا کے عظیم معبدوں اور دانشکدوں سے ملے ہوئے ہیں اور ہر تار سے اس کا قدیم رشتہ ہے۔ اسے شالامار کے مرمریں دیوؤں سے بھی مناسبت ہے۔ اس نے قصبہ خواتی بازار کو صرف ایک بانڈی نہیں رہنے دیا ہے اور نہ ڈھاکہ کی طلسمی گلیاں صرف گلیاں ہی ہیں۔ ان میں جو زندگی، رنگارنگی اور ہمہ گیر کیفیت نظر آتی ہے وہ ایک طویل قومی داستان کا حصہ ہے۔ یہ تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی ان مختلف طاقتور محرکوں کا امتزاج ہے جو اس سرزمین میں پہلے ہی ہیں اور اپنا نقش چھوڑ گئی ہیں۔ ان مٹ نقش۔ یہ تہذیبی نقش فن کا رانہ بھی ہیں نسلی و سماجی بھی اور تعمیراتی بھی۔ ان کے قدیم اور مقدس وجود سے ہم کو اپنی سرزمین کی زندگی، اس کی قدامت، عظمت اور شہرہ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تہذیب دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں کی طرح انسانی عظمت و حسن کا ایک سرمدی نقش ہمارے دلوں پر چھوڑتی ہے، خواہ آپ محسوس کریں یا نہ کریں۔

شکر کا مقام ہے کہ اب کچھ عرصہ سے ملک کے دانشور اور ادیب بھی قلم کھلا قومی کچھ کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں اور انہوں نے بھی بالآخر اس کے اپنے علیحدہ وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔ آج ان فنکاروں کی طرح جن کی مخنی انگلیوں نے ہماری دھرتی کے حسن اور اس کی بالیدگی کی پرورش کی ہے، ہمارے اہل علم و اہل قلم بھی اب سر بلندی کے ساتھ اپنے قومی کچھ کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے قومی نشوونما اور خود داری کی ایک واضح علامت ہے۔ اس سے پہلے اکثر یہ سنا جاتا تھا کہ ہمارا کوئی واضح کچھ نہیں ہے۔ ہمیں ایک قومی کچھ کی ضرورت ہے۔ وغیرہ۔ اب کچھ اداروں نے، بالخصوص رائٹرز گلڈ، آئس کوئٹل آف پاکستان اور نڈل ایکڈمی کی کوششوں سے یہ صورت حال روشن تر ہوتی جا رہی ہے کہ ہماری زرخیز زندگی جو خیر سے چاٹھ گام کی پہاڑیوں اور بیو عرب سے قراقرم کی وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے، ایک زبردست تہذیب اور واضح کچھ کی امین ہے۔

یہ احساس اتنا ہی اٹکھا ہے جیسے بعض لوگ شہروں میں رہتے ہوئے اچانک سمجھ جائیں کہ وہ اکیلے نہیں رہتے۔ یہ حقیقت بڑی آہستہ سے طلوع ہوئی ہے۔ لیکن اس کی وضاحت بڑی ضروری اور مبارک ہے۔ کیا ہمارا قومی کچھ کوئی نئی علامت ہے؟ کیا یہ صرف چند سال کے اندر ہی ظہور میں آیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس احساس کی جڑیں مضبوط ہوئی ہیں اور اگر اب بھی کہیں احساس کمتری یا جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے تو وہ بھی یقیناً آہستہ آہستہ دور ہو جانیے گی۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری قومی ثقافت اتنی ہی قدیم ہے جتنا اباسین، جتنا چناب اور ان کی ٹھنڈی زرخیز زمین اور شرتی پاکستان کے جنگلوں میں رقص کرنے والی خوشبودار ہوا۔ ہمارا یہ قومی ورثہ ایک وسیع، متنوع اور گہمیر دنیہ ہے جس کے کنارے دلوں سے دلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور جس کی علامتیں اب واضح تر ہوتی جا رہی ہیں شاید

دوسرے الفاظ میں یہ کہوں گا کہ ہماری قومی تہذیب دراصل مختلف علاقائی عناصر اور عوامی روایات سے مل جل کر گندھی ہے۔ یہ اتنی ہی قدیم ہے جتنی بن جلی، کسان کا ہل بھولا ہے، کارگھ چلانے والی انگلیاں اور قالین بننے والے کے ہاتھ۔ یہ اتنی ہی عظیم ہے جتنی سفال رگڑی تھیلیاں ڈلیاں، اور ٹوکریاں بننے والی آنکھیں۔ یہ وہی قدیم تہذیب ہے جس کی تعمیر میں معمار کی محنت، کسان کا پسینہ، بڑھئی کی کاوش، ڈھاکر ہل جتنا والوں کی روایات، نقاشوں کی عرق ریزی اور سنگ تراشوں کا خون مگر ملا ہوا ہے۔ ہماری تہذیب کی اساس ایک زرعی معاشرت پر قائم ہے جس کو صدیوں تک دھرتی نے پروان چڑھایا ہے اور جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ توانا اور دلکش ہوتی چلی گئی ہے۔ آج مٹی کا برتن، اونٹ کی کھال کا لمپ، اوئی قالین، رنگین تنکوں کی ٹوکری اور تھکر کی مورتی سب ہماری تہذیب کی علامتیں بن گئی ہیں۔ ہم نے ان کو زندگی میں ایک نئے انداز سے شامل کیا ہے۔ آج ہمارے سجے ہوئے ڈرائنگ روم کی زینت بھی ہیں اور معمولی سے گھر کی آرائش بھی۔ ہمیں ان سے محبت ہے کیونکہ یہ سب چیزیں ہماری ہیں۔

اس گفتگو سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہماری تہذیب قدیم ہے اور اتنی قدیم جتنی کہ زندگی، لیکن ہماری تہذیب صرف اپنی قدامت کے بل بوتے پر ہماری بقا و حفاظت کی حق دار نہیں بن جاتی بلکہ اس میں افادیت بھی ہے اور وجدانی تہذیب کا سامان بھی۔ اس میں قومی تنکوں اور آندوؤں کا اظہار بھی ہوتا ہے، نیز آگے بڑھتی ہوئی ارتقاء پذیر زندگی کی بیباکی اور اخذ و جذب کی صلاحیت بھی۔ کیا ہماری تہذیب ان مظاہر کو پیش نہیں کرتی؟ میرا جواب تو اثبات میں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ہماری تہذیب صرف قدیم ہی نہیں ہے بلکہ اس نے ہر دور میں نئی باتوں کی توانائی اور حسن کو بھی اپنے اندر سمویا ہے۔ مغلوں اور تنکوں کی تہذیب نے اسے بہت کچھ دیا ہے۔ غور سے دیکھئے اس تمام سرسبز مٹی پر محکم حسن طبیعت بھی ہے اور عرب کا سوز و درد بھی۔ ایک اور خوبی یہ کہ اس نے ادب اور فن کے میدانوں میں بھی مقامی اثرات کو قبول کیا ہے اور بڑی بلاغت و چابکدستی کے ساتھ ارتقائی عمل کا ساتھ دیا ہے۔ اسی قومی مزاج نے ہم سے شالام بنوایا، بادشاہی مسجد بنوائی، قصہ خوانی بانا آباد کرایا۔ دیکھئے ہر بہت خاں کی مسجد، مسجد مست گنبد اور جہاںگیر کے

مقبرہ کی نازک مرمرین نقاشی کیا داستان سنا رہی ہے۔ کیا ڈھاکر کی ہل، گجرات کے نازک ظروف، شمشک کی عظیم عمارتیں اس دھرتی کے جادو ہیں۔ تہران اور پشما کے شاداب پانیوں سے زرخیز علاقائی گیتوں میں ابھرنے والا جذبہ اور اس کی مٹھاس کون بھول سکتا ہے۔ ہمارا قومی کلچر عوام کے دلوں میں اتنا ہی قدیم ہے جتنی زمین کی چھایا اور زراعت کا حسن ہم اس سے اپنا رشتہ کیسے قرطیں؟ کیا ماضی کی ہر شے ناکارہ ہی ہوتی ہے؟ ماضی سے ہی زندہ اور توانا کلچر کی روایت آگے بڑھتی ہے۔ ایسا کلچر جو ابھی تک انمٹ ہے، کیا وہ کبھی بھی نابود ہو سکے گا؟ حقیقت تو یہ بتا رہی ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ جینے کی کوشش میں کامیاب رہے۔ یہ کلچر بھٹیلا گیتوں، ٹوڑھی لگکا اور پدما کے ملاحوں، چناب و جہلم کے کسانوں، نذرل، وارث شاہ اور شاہ لطیف کی دھرتی کی پیداوار ہے اس لئے سدا بہا ہے۔ یہ دھان کے کھیتوں، پٹن کی فصلوں، چانگام کے چائے کے باغات میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے باسیوں کے گیتوں سے رنگارنگ بنا ہے۔ اسے کافیوں اور ٹپوں نے سوز و ساز دیا ہے۔ سندربن اور کھلنا کے ساحلوں کے طائرانہ رقص و نغمہ نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ اسے سرحد کی چٹانوں، سوات کی وادی اور راولی کی موجوں نے دلکش بنا دیا ہے، جوانی بخشی ہے۔ یہ سہ ڈھاکہ، جیسو ر اور کٹکس بازار میں ہی نہیں پہچانا جاتا اس کی نمود ملتان، پاک پٹن، لاہور، بہاولپور اور لٹڈی کوتل میں بھی اپنا روپ دکھاتی ہے۔ یہ اقبال، نذرل، وارث شاہ، فرید، لطیف اور خوشحال خاں کے فکر کی آغوش سے تباہی پاتا ہے۔

کیا ہمارا کلچر حال سے بے خبر یا بے نیاز ہے؟ کیا وہ مرگیا ہے؟ کیا وہ نئی علامتوں کو جذب کرنے سے قاصر ہے؟ مگر امتیاز سے دیکھئے تو وہ ہر طرح والا مال نظر آتا ہے۔ ان اہم سوالوں کے اقرار یا انکار پر ہمارے قدیم کلچر کے مستقبل کا فیصلہ ہے، مگر خوش قسمتی سے ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ ہمارا قومی کلچر تمام زندہ کلچروں کی طرح ماضی سے بے نیاز نہیں۔ نہ وہ مردہ ہے نہ وہ نئے دور کی نئی صحت مند علامتوں کے جذب سے بے خبر یا تہی مایہ۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا قومی کلچر بھی صنعتی دور کی زد میں ہے۔ مگر دنیا کے کون سے تہذیبی عناصر ہیں جو اس طرح مٹتی عہد کی زد میں نہیں۔ آج صدیوں پرانے عقائد، رسوم اور روایات پر نئی زندگی کی ضرب لگ رہی ہے۔ یقیناً نئی زندگی اور اس کے طلبا

زبانوں، داستانوں، ناگلوں سے ہم کیا کچھ کام نہیں کر سکتے، قومی تعمیر نو میں سب کو شمشوں کو مبلغ اور موثر بنانے کے لئے انہیں عوام تک پہنچانا، اسے عام پسند و عام فہم بھی بنانا ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری دھرتی ثقافتی اقدار کی نشوونما کے لئے بہت زرخیز ہے۔ بس اسے اپنے عمل اور جذبہ سے پروان چڑھانا ہے۔ اگر یہی اس طرح زراعت ہو جائے تو اس کی زرخیزی کا چار چاند لگ سکتے ہیں۔ اس دعوت فکر و عمل کے لئے ہمارے ذہین و دانشور طبقہ ہی پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور کام کرنے کے لئے اس دور میں پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی مروساں میسر ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس ہی ضمن میں کچھ سوچنا اور کام کرنا شروع کریں :

”اے روشنیوں کے شہر“ البقیہ ۲۵

میں تو رندوں کی یہ زنجیر ظلمت - شعاعوں بھرے شہر !
(دریچے سے جھانک دکھاؤ)

بوڑھا، خالہ، خالہ !

(رنگین موسیقی)

آہ اے شہر... چمکنے ہوئے شہر
کتنائے دم ہے سفاک ہے تیر
ترے بے خواب درجوں کے ابا لے - جلاو
تیرے شب تاب تنوؤں کی فضا - تیغ ستم
تیرے انہول کی کٹنگ - ساغر ستم
تیری صوبہ بار عمادات ہیں - نقش گاہیں
تیری رعایاں - آنکھوں کا فریب
یہ تراسن - متعجب ہے - نائش ہے فقط
ریگ رواں، موج سراپ !

ریویو کے لئے

دو کتابیں روانہ فرمائیں۔

(ادارہ)

قدیم ٹھہری ہوئی زندگی اداس کے مطالعات سے بے پروا یا لاتعلق نہیں ہو سکتی اس لئے نئے دور میں قدیم معاشرہ کا رنگ روپ بدلنے کی بات نہ چمکا دینے والی ہے نہ مایوس کن۔ روایات شکست و ریخت کی زو میں ضرور آئیں گی، مگر نیا چلا بدل کر پھر سامنے بھی آجائیں گی۔ عام مشاہدہ ہے کہ کوئی شے کا ملا نہیں بنتی، ہاں روپ ضرور بدلتی ہے۔ کسی علامت اور نشان کو ہم کیسے مٹا سکتے ہیں۔ وہ نقش اگر دم پریشانی کوئی دوسرا نقش اس کے چھوڑے ہوئے نشان پر ابھرتا ہے۔ مثلاً طاقوں نے بھی قدیم نقش کے ساتھ ایسا ہی کچھ کیا ہے۔ مگر کیا پرانی تہذیب کی نمود، تاریخی عمارت پرانی بستیوں کے گئی کوچے یکسر فنا ہو گئے؟ ریل، تار، برقی طاقت اور ریڈیو نے ہم سے کیا چین لیا؟ پلوں کی تعمیر، سڑکوں کا حال اور گاؤں گاؤں بجلی پہنچ جانے سے ہمیں فائدہ اور آرام پہنچا ہے یا نہیں؟ ان جدید آسائشوں نے ہمارے صنعت کاروں اور فنکاروں سے ہی ہاں نہ ڈالا ہے اور ان کی تہذیب کو متاثر کیا ہے۔ بعض چیزوں کی قلب باہیت ہو گئی ہے مگر کسی چیز کو نوکلیٹ فنا نہیں ہوئی ہے۔ نئی روایات اور نئی زندگی میں تبدیلیاں آجانا ناگزیر تھا مگر یہی حقیقت ہے کہ جدید صنعتی دور نے پیداوار اور سماجی رشتوں کو نئی طاقت بھی دی ہے اور نئی زندگی ابھر رہی ہے۔ لیکن کیا اس نئی برق واپ کی قوت میں اتنا ہوتا ہے کہ وہ آپ کے کلاسیک ادب کو بدل ڈالے، آپ کے گیتوں کا رس چیلن لے؟ کوئی سائنس، کوئی قوت آتش و آہن ردایا کی دھڑکن اور ان کا حسن نہیں چھین سکتی، نہ انہیں ہمیشہ کے لئے مٹا سکتی ہے۔ وہ کبھی کبھی دلوں کی پہنائیوں میں چھپ ضرور جاتی ہیں مگر ایک وقت میں پھر دلوں سے ہی ان کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور اپنی سرزمین کو لالہ زار بنا دیتے ہیں۔ اس کی بڑی گہری نفسیاتی وجہ ہے۔ مثلاً آپ اپنے بچوں کا نقشہ بھی بدل سکتے ہیں۔ اس میں کنوئیں کی جگہ نل لگا سکتے ہیں۔ بیل گاڑیوں کی جگہ موٹر سائیکل دوڑ سکتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہو بھی رہا ہے مگر کیا دلوں سے ہمیں اپنی تہذیبی روایات کے چھن جانے کا خدشہ لاحق ہوا ہے؟ ہمارے گیت، ہمارے قصے، ہماری داستانیں، ماوی تہذیبوں کے دائرہ سے خارج بھی نہیں ہوتیں اور اپنا جادو پھر بھی جگاتی ہیں۔

اس ہم کو چاہئے کہ برق و باد اور آہن و آتش کے جابر عناصر سے اپنی قومی تہذیب کے دفاع کا کام لیں۔ ان سے نئی توانائی، طاقت اور اشاعت علم و فن کا کام لیں۔ پرانی کتابوں، ادب پاروں، تصویروں،

غزل

جمیل نقوی

عبد اللہ خاوند

ہو اے شوق کو اپنی روش پہ چلنے دو

جنوں کو راہ گزاروں کا رخ بدلنے دو

کسی کے وعدہ فردا کا انتظار رہی

اسی حسین سہارے پہ غم کو ٹلنے دو

نگاہ شوق سے پھوٹے گی صبح نو کی کرن

افق پہ تیر گئی شام غم مچلنے دو

کبھی تو آئے گا گم گشتہ کا روانِ سحر

روشِ روش پہ دلوں کے چراغ جلنے دو

جہاں میں اہل سیاست بہا ر لائے سکے

سب کو کشانِ محبت کا دور چلنے دو

افق کی اوٹ میں سوا آفتاب ہیں خاوند

کچھ اور حوصلہ تیرگی نکھلنے دو

محبت میں سزا و ناسزا کی یاد کیوں آئے

شامِ عشق کو گل کی، صبا کی یاد کیوں آئے

منو داگہی تو مین ہے دینِ محبت میں

لبِ اظہار کو دستِ دھلکی یاد کیوں آئے

خرد بھی ہے شریکِ خندہ گلہائے بذامی

تبسم ہائے تمکینِ آنما کی یاد کیوں آئے

حریمِ ناز میں حسنِ نظر کی آزمائش ہے

تو پھر ایسے میں اُن دیکھے خدا کی یاد کیوں آئے

نظرِ گم ہے طلسمِ لذتِ محشرِ خرامی میں

جبینِ بندگی کو نقشِ پاکی یاد کیوں آئے

چمن میں سرو بھی آزاد ہے سبزہ بھی بیگانہ

جنوں کو آشنا، نا آشنا کی یاد کیوں آئے

نشاطِ ضبطِ غم جب عشق کا مقسم ہو ٹھہر

جمیل اس دشمنِ ہر و وفا کی یاد کیوں آئے

غزل

شیدا گجراتی

انٹھی تو ہے اور میری وہ نگاہ مہرباں اکثر
مگر حائل ہوئی ہیں راہ میں محرومیاں کیا کیا
ازل سے نا ابد اک منزل بے نام کی دھج میں
ہیں سرگرداں سر دشتِ تمنا کا رواں کیا کیا
جواب جلوہ صدر رنگ ہے داغِ جگر اپنا
چکنے کو تو چمکے مہر و ماہ و کہکشاں کیا کیا
ہم اپنی عظمتِ گفتار سے بیگانہ تھے اب تک
کھلے اس انجمن میں جو ہر طبع رواں کیا کیا
بہر صورت ہم اپنی وضع پر قائم تو ہیں شیدا
بدلتا ہی رہا یاروں کا اندازِ بیاں کیا کیا

سنائی وقت نے یارِ غم کی داستاں کیا کیا
ہوئے ہیں دیدہ کوئین سے آنسو رواں کیا کیا
لئے ہیں زندگی نے اہل دل کے امتحاں کیا کیا
ہوئے ہیں ہم حریفِ انقلابِ آسمان کیا کیا
یہ کس نے بربطِ دل پر سرودِ آرزو چھیڑا
اٹھے ہیں روئے فطرت سے حجابِ میاں کیا کیا
سراغِ منزلِ قلب و نظر ملتا گیا جوں جوں
فروں ہوتی گئی رعنائی فکر و بیاں کیا کیا

بمقامِ جانِ تمنا بہ ذرا دیکھ کر کن دہوں سے مجھ کو بے مری گزشتہ تمام حیات
آپنی زیست کے غمناک و غم انگیز و صند لکوں میں سمانے کے لئے کتنی ہے بے چینی مری شامِ حیات
اے مرے دوست مرے ہدم و ہزار مرے عہدِ گزشتہ کی بہادری کی المناک حکایات نہ چھوڑ
جوفہِ تلخِ شوقِ رنگ ہی پھر بھی مرے دل کے لئے کتنی سم آلود ہے یہ دورِ و تہ جب اے حیات
دیکھ کر پائے عملِ جادو تاریک کے ذرات سے اس طرح نکلتی ہے بہر کام امیدوں کی گلی
حلقہِ ظلمتِ شب توڑ کے جس طرح نکل آتا ہو غورِ شیدا فضا پاش جہاں تابِ سیرِ بامِ حیات
تیز چل تیز کہ اے راہِ و ملکِ عدم سبیلِ حادثے نے تعبیروں میں نہیں کوئی ٹھہرنے کا مقام
وقت کے دوش پہ ان ٹوٹے ہوئے سقفِ دور و بام کے آٹا قدیم ہیں بے عبرت گزشتہ تمام حیات
کچ جو ماہِ رخ و ماہِ کوش و ماہِ جبین سونے میں بہتی ہے بہت دور بہت دور تیرے خاکِ مزار
یہ وہی غنچہِ نو خیز ہیں گل جن کے تہ سے گلستاں کی بہاروں کو لڑکنا تھا پہچانِ حیات
حوصلے دل میں اگر ہوں تو مرے فدویِ فراقِ طلب کے لئے یہ ادبِ تریا بھی کوئی حسیز نہیں
غمِ ملامِ جہاں سے لے فرصت تو دکھا دوں میں زمانے کو پہچاتا ہے کہاں تک یہ راہِ گمِ حیات
اے حشم ہے چہنستانِ جہاں میں کہیں کوئی کہیں بیل کہیں تہلی کہیں جگنو کہیں بد بخت چکور
یعنی اس عالمِ منائی کے ہر اک گوشہ رنگیں میں براکِ سمت ہے پھیلا ہوا اک سلسلہِ دامِ حیات

غزل

حشم لکھنوی

کافی گرم

اقبال بنوی

کافی گرم کا علاقہ سطح سمندر سے ۵۲۹ فٹ بلند ہے۔ ٹانگ سے ۸۳ میل دور اور یہاں کے مشہور صحت افزا مقام دانا سے ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وزنگ کا نام تو مشہور چھاؤنی ہونے کی وجہ سے دور دور مشہور ہے، یہ بھی بڑا نفیس علاقہ ہے اور کافی گرم اس سے بس کوئی ۲۰ میل دور ہی تو ہے۔ دانا اور وزنگ کے درمیان ۵۵ میل لمبی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی چلی جاتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ اچھی حالت میں نہیں ہے مگر حکومت اسے اب درست کر رہی ہے اور امید ہے کہ جلد حکومت کی مساعی اور عوام کے تعاون سے یہ سڑک نچھٹ اور غر ہو جائے گی اور سفر مزے سے کئے گا۔ آزادی سے پہلے اس سڑک پر صرف ٹرکیں چلا کرتی تھیں مگر اب سات آٹھ میل تک بسیں بھی چلنے لگی ہیں اور جوں جوں فلاحی کام بڑھتے جائیں گے اس علاقے کی ترقی بھی ہوتی جائیگی۔ اور بسیں بھی دور دور تک چانے لگیں گی۔ اگر آپ دانا سے بائیس پر سوار ہو کر چلیں تو راستہ میں کوئی ۱۰ میل کے فاصلے پر آپ کو ایک بڑا مضبوط قلعہ نظر آئے گا۔ اسے تیارہ کا قلعہ کہتے ہیں۔ اس میں پہاڑی علاقے، حفاظتی دستہ، تعینات ہے جو خلعے دار کہلاتے ہیں۔ یہاں سے کوئی سات آٹھس دو چالیس تو بڑا سبز و شاداب علاقہ آجاتا ہے، بڑا دلنزیب پہاڑی منظر ہے۔ سڑک کے کنارے اور پہاڑوں پر چتر کے سدا بہار درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ یہ جھوم جھوم کر آنے والے پہاڑوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اخروٹ، خربانی، چلوڑہ کے شاندار درختوں کی کثرت ایک الگ پربہار و جاں فرزا نظارہ ہے۔ کافی گرم کا قصبہ اب ذرا سے فاصلے پر رہ گیا ہے، لیجئے وہ قصبہ کے مکانات کا طنسی نظارہ سنئے آگیا۔ دو دو سے ایسا لگ رہا ہے جیسے ”الف لیلہ“ کا کوئی معجزہ ہو!

کافی کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں بھی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ پہلا امر یہاں کی حضرات زیادہ تر آباد ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ گرم ”گرام“ (گاؤں) کا بولا ہوا تلفظ ہے جیسے بلگرام، مگرام وغیرہ مقامات میں

آپ کا فرمانا صحیح ہے کہ آپ نے یہ بولی اس سے قبل کبھی نہ سنی تھی مگر ہمارے ملک میں، خاص کر مغربی پاکستان میں، آپ ایسے بہت سے مقامات پر پہنچیں گے جہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئے گی اور بولی بھی پہلے کبھی نہ سنی ہوگی، مگر حقیقت میں وہ ہمارے ہی وطنی بھائی ہیں اور یہ جگہیں بھی ہماری ہی سرزمین کا حصہ ہیں۔ اپنی دھرتی کے مختلف علاقوں کا تعارف ہم پہنچا نا ہمارا قومی و ملی فریضہ ہی نہیں یوں بھی ایک بڑا دلچسپ ثقافتی مشغلہ ہے۔ آپ جگہ جگہ جائیں تو بہت سی باتیں سنیں گی بلکہ لباس، بول چال اور رہن سہن بھی کچھ جدا معلوم ہوگا مگر یہ بھی ان میں بہت سی مشترک قدریں آپ کو ملیں گی اور انہیں معلوم کر کے ہم میں یکجہالت کا اور بھی قومی احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ اتنے دور دراز سفر کے بعد یہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ ہمارے علاقے اور اس کے باشندوں سے تعارف کی لگن ہی ہے جو آپ کو کھینچ کر یہاں لائی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، آپ نے یہ بولی پہلے نہ سنی ہوگی، پشتون کہ تو خراب چلنے ہی میں مگر یہ برکی لوگوں کی بولی ہے۔ برکی حضرات اور ان کی بولی کا مزید تعارف میں ابھی کرتا ہوں۔ آپ نے راستہ میں جگہ جگہ ”برکی کرانہ سٹور“ برکی جنرل مرچنٹس وغیرہ کے بورڈنگ ہوئے دیکھے ہیں، تو اس سے یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہاں برکی حضرات کثرت سے آباد ہیں۔ اب تو برکی حضرات کا تعارف برکی مشاہیر کی وجہ سے ویسے بھی ہر جگہ ہو چکا ہے، یوں مختصر میں بتا چلوں کہ یہ لوگ یہاں کے خاص باشندے ہیں اور بڑی پرانی تاریخ و ثقافتی اہمیت کے مالک ہیں۔ ان لوگوں کی اپنی زبان ہے جس جگہ آپ پہنچے ہیں اسے کوہستان شور کا سلسلہ کہا جاتا ہے۔ یہیں وہ جگہ واقع ہے جسے دیکھنے کی کشش آپ کو لاتی ہے یعنی کافی گرم۔ یہ بھی ہمارے کوہستانی شمال کا ایک بڑا پڑھنا اور صحت افزا مقام ہے مگر ابھی اس کے نام کا چرچا کم ہوا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہم لوگ ارضی بہشت کے اس گوشے سے بھی اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

علاوہ ہند کو بھی خوب بولتے ہیں۔ جب ان کے علاقے میں زبردست برف پڑتی ہوتی ہے تو یہ لوگ پناہ لینے کے لئے ٹانگ کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ وہاں ہند کو کار و راج بھی ہے اس لئے ہند کو بھی خوب بولنے لگتے ہیں۔ ضرورت کے وقت پشتو ہی زیادہ بولتے ہیں۔ مگر ان کی اپنی بولی، آرمڑ، کئی زبانوں کا آمیزہ ہے۔ جو بھی بیرونی لفظ یا دخیل الفاظ ملیں گے وہ زیادہ تر مرکبی ہوئی شکل میں ملیں گے۔ اس زبان کا کوئی بڑا ادبی ذخیرہ میرے علم میں نہیں مگر یہاں کے ادب دوست حضرات کے پاس اس زبان کے جو چند کسلے مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ کافی دلچسپ ہیں۔ ایک صاحب اس زبان میں غزلیں بھی خوب کہتے ہیں۔ پشتو بولنے والی درستی کے کتب خانہ میں اس زبان کی ایک کتاب بھی ایک رسالہ موجود ہے۔

کافی گرم میں کچھ زیادہ آبادی تو نہیں ہے، یہی کوئی چھ سات ہزار کے قریب ہے۔ مکانات کی روشنی ہی نظر آئے گی جیسی کھلا باغ میں ہے۔ درجہ بدرجہ بلند یوں پر بنے ہوئے مکانات ہیں۔ کہیں کہیں مورچے بھی بنے ہوئے نظر آئیں گے۔ جگہ بھی بنے ہوئے ہیں تو بہت اچھی پناہ گاہیں بھی بن چکی ہیں۔ ان جگہوں سے عام طور پر باب کی دلکش آواز سنائی دیتی ہے۔ ضروریات زندگی سب ہی مل جاتی ہیں، زیادہ تر لوگ تجارت پیشہ ہیں۔ یوں تو کاشتکاری اور مویشی بانی بھی کرتے ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں جوار، آلو اور کھیرا بہت عمدہ ہوتا ہے۔

ہاں، ایک اور ضروری بات بھی بتاؤں، یہاں بھی دورہ آدم خلی کی طرح بڑا اچھا سلمہ بننا ہے بلکہ یہاں کے لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری اسلمہ سازی استادانہ ہے، اور درہ والوں نے ہم ہی سے سیکھی ہے۔ آرمڑ بہت تنومند، دھیمہ اور قد آور ہیں۔ مردوں کا لباس قمیص، شلوار، واسکٹ اور ٹیڈی ہے۔ کبھی کبھی سواتی ٹوپی بھی پہنتے ہیں جو اب دور دور مشہور ہو چکی ہے۔ چٹانوں کا زبرد بندوق ہے۔ یہاں کے لوگ انہیں بڑے چاؤ سے رکھتے اور صبح شام لے کر نکلتے ہیں۔ عورتوں کا لباس وہی شلوار قمیص یا سرخ پھولدار چینٹ کاٹھا گرا ہے، کالا دوشیہ بھی اوڑھتی ہیں جس پر ٹھیکہ ٹکا ہوتا ہے۔ ان کپڑوں پر ریشم کے تاروں اور رنگین دھاگوں سے بہت عمدہ کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ زور کار و راج یہاں کم ہے۔ یہاں کی عورتیں بڑی قوی، بڑی صحت مند اور مختار ہوتی ہیں۔ کھنڈھڑ حائیاں چڑھنا، کھیتوں میں مردوں کا ہاتھ بٹانا، بڑی سے پانی بھر کر نانا اور گھر کے سارے دھندلے اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔

مگر گرم، کا لفظ بھی شامل ہے۔ یہاں پہاڑی علاقوں میں اسے کانٹری گرم (پتھروں کا قریہ) کہتے تھے وہ کثرت استعمال سے کافی گرم بن گیا۔ ایک دفعہ کسی پرچے لکھے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اصل میں یہاں معدنیات کی کثرت ہے۔ اس لئے یہ کلن گرم کہلاتا تھا، اب عوامی بولی میں اس کا عنوان کافی گرم ہو گیا ہے۔ پشتو میں "کانٹری" کے معنی بیشک پتھر یا چٹان ہی کے ہیں۔ اس پاس لوہا ملتا ہے اور ناموجود ہونے کے بھی آثار ہیں کیونکہ برسات میں اکثر ندیوں کے پانی میں سونے کے ننھے ننھے ذرات کا بہنا عام مشاہدہ ہے۔ ہر نوع یہ قصبہ بڑا پرانا آباد ہے۔ یہاں تک کہتے ہیں کہ راجہ اشوک و کنشک کے زمانہ میں بھی موجود تھا، چنانچہ یہاں ان راجاؤں کے زمانے کے کتے بھی برآمد ہوئے ہیں۔ مسلمان یہاں ساتویں صدی سے ہی آباد ہیں۔ اکثر آرمڑوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد دینی تھے اور محمود غزنوی کے زمانہ میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ محمود نے اپنی زوج میں پانچ سو کھیتی جنگجو بھی بھرتی کئے تھے۔ فخر سومات کے بعد یہ کھیتی سپاہ محمود کی اجازت کے کراسی جگہ مستقلاً آباد ہو گئی امدان کی نسل کے حضرات آرمڑیاہ کی کہلاتے ہیں۔ یہ حضرات پشتو بھی بولتے ہیں اور اپنی مخصوص برکی بولی بھی۔

مغلوں کے عہد میں یہ لوگ بڑے خوشحال تھے، آبادی بھی اتنی کثیر تھی امدان کے پاس زمینیں بھی بہت تھیں مگر جب معاشی حالات کا تقاضا ہوا تو وہ لوگ یہاں سے نکل کر دوسرے مقامات پر بھی جا بسے۔ چنانچہ آجکل یہ حضرات ملتان، پشاور، ورنہ، ٹانک، کابل میں بھی بسے ہوئے ہیں اور غیر منقسم ہند میں جالندھر تک جا کر آباد ہو گئے تھے۔ آزادی کے بعد بہت سے گھرنے پھر پاکستان میں آکر رہائش گئے ہیں۔ خود پشاور میں آرمڑیاں اور آرمڑیالا ان کی مشہور بستیاں ہیں۔ اور آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ یہاں بھی ایک جگہ جالندھر کے نام سے مشہور چلی آتی ہے۔ یہ کافی پرانی جگہ ہے اور کافی گرم سے ذرا ہی فاصلہ پر چھوٹا سا کڈل ہے جو جھڑا ہر جا کر بس گئے انہوں نے بہت ترقی کی اور اس علاقہ کی شہرت کا باعث بنے۔

اب آپ پوچھتے ہیں کہ ان کی زبان کا حال کیا ہے، تو عرض ہے کہ ان لوگوں کی اپنی بولی آرمڑ کہلاتی ہے مگر مسعود پنجاہوں کی طرح پشتو بھی اسی روانی و فصاحت کے ساتھ بولتے ہیں۔ یہ لوگ بھی افغانہ میں شمار ہوتے ہیں امدان کی مادری زبان آرمڑ ہی ہوتی ہے، پشتو کے

اور اسکی وجہ سے ان کی صحت قابل رشک ہوتی ہے۔

دوسرے قابل کی طرح آرٹھر (یا برکی) حضرت بھی بڑے دیندار ہوتے ہیں اور پاکستان کے انتہائی وفادار و توانا باشندے ہیں۔ جہاں تک میں ان کو جتنا غلو ہے وہ آپ نے ابھی دیکھ ہی لیا۔ آرٹھر نوجوانوں کو موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ ہے اور الغوزہ تو بڑا اچھا بجاتے ہیں۔ شادی بیا کی رسومات زیادہ تر وہی ہیں جو سابق صوبہ سرحد کے دیگر علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر مرد پہاڑی رقص پیش کرتے اور بڑے سریلے سازوں کے ساتھ پشتو لوگ گیت گاتے ہیں۔ موسم سرما کے دوران لوگ زیادہ تر جھروں میں وقت گزارتے ہیں۔ ساگ دکھتی رہتی ہے اور لوگ ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ کوئی خوش فکر نوجوان الغوزے پر ایک ایسی دھن بجانے لگتا ہے جس سے شہر میں سحر ہو جاتا ہے۔ آگ میں لکڑیاں جھپتی رہتی ہیں، بوڑھے عمر رفتہ کے قصوریں گلوں اور نوجوان ان دیکھے خواب میں محو ہوتے ہیں، غرض عجیب سماں ہوتا ہے۔ آرٹروں کی زبان میں حلاوت بہت ہے اور جذبہ و خیال میں رفعت و صداقت بھی۔ یہاں کے چند مقبول گانے کسی وقت سنو اڑیں گا، اس وقت مجھے بونہی ایک گیت یاد آگیا۔ بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ کہنے والا کہتا ہے۔

”میں آجاؤں گا، مگر تم نکلو گے، تمہاری ٹوٹی ہوئی

دلہاؤں پر میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں گا“

ایک اور شعر کا مفہوم ہے،

”میرے حبیب اب تم ندی پہ آنا چھوڑ دو، میری ماں

نے میرا گھڑا توڑ دیا ہے“

یا پھر کسی گیت کا یہ ٹکڑا:

”میرے روشن چہرہ، یہ چکوری آنکھیں، یہ شکلیں بالی

ہاں ان کا مالک وہی ہے جو جنگ میں کبھی ٹھینہ دکھا۔

فرض اگر ایک بار روانہ ہو تو اس کو لوٹا یا جاسکتا ہے

مگر دیدار محبوب کا لمحہ گندہ جانے تو وہ نہیں ٹوٹتا“

آپ نے مری بھی دیکھی ہے اور رسومات بھی سنے ہیں۔ اب آپ ہی

بتائیے کہ اس مقام کی قدرتی خوبصورتی ان جگہوں سے کچھ کم تو نہیں ہے؟

دیکھئے سامنے چتر کے جنگلات ہیں۔ صاف شفاف نیچے پانی کی مترقیم عیاں

گزر رہی ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں، جب سورج کی کرنیں ان پر پڑتی ہیں تو

پانی کیسا گلستا ہے، جیسے پارہ بہہ رہا ہو۔ چاندنی رات میں ان طلسمی

ندیوں کا نظارہ تو غضب کا جوت ہے۔ چتر، خرمائی، اخروٹ، بادشاہ

چنار اور چلفوزہ تو یہاں کثرت سے ہے، مگر کہیں کہیں زیتون بھی ملتا ہے۔

مگر ابھی لوگ اس مفید درخت کی پرورش کرنے اور اس سے فائدہ

اٹھانے سے واقف نہیں ہوئے ہیں مکانی گرم کے شمال میں پری غل کا

بلند و بالا پہاڑ ہے جو جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہ پہاڑ ۱۵۷۹۱ فٹ اونچا

ہے اور چٹان بہت گھنا جس میں وحشی کبروں کے علاوہ خوفناک درندے

بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر آپ اس کی کسی چوٹی پر چڑھ کر دھار دھار نظارہ

کریں تو رات کو بتوں، ٹانگ، اور میراں شاہ کی روشنیاں جھلکاتی

نظر آئیں گی۔ کافی گرم کے جنگلوں میں خرگوش عام ہے اور گھبراہٹ میں

چکر رکھا رکھی کیا جاسکتا ہے۔ چکر یہاں بہت کثرت سے ہے اور خوبصورت

شہابی آنکھوں کو یہاں کے لوگ چکر کی آنکھوں سے تشبیہ بھی دیتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا یہاں معدنیات کثیر ہیں۔ خام لوہا

بھی نکلتا ہے جس سے مقامی اسلو سا نہایت اچھے ہتھیار بناتے ہیں۔ موسم

سردیوں میں بڑا سخت ہوتا ہے مگر گرمیوں میں نہایت خوشگوار دسمبر اور

جنوری میں برف باری ہوتی ہے اور اس قدر زیادتی کے ساتھ کہ دیکھتے

ہی دیکھتے شجر و جھر سفید قابو میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اپریل سے ستمبر تک

ان پہاڑوں کا حسن رونق پر ہوتا ہے اور قدرنگاہ تک خوبصورت بریادوں

ہی بریادوں نظر آتا ہے۔ بھیتوں میں گلی کی شاداب فصلیں ابلہاتی نظر آتی

ہیں اور جنگلی پھولوں کی بھیجی بھیجی خوشبو مشام جاں کو تازہ کرتی ہے۔

پہاڑی لڑکیاں ندی کنارے بیٹھ کر دھیمی دھیمی آواز میں گلگلتی

ہیں اور ان کی بھٹریں ہری ہری دھب چرتی پھرتی ہیں۔ نمایاں سارے سال

بہتی رہتی ہیں۔ کہیں کہیں پہاڑوں میں سرنگیں بنائی گئی ہیں اور ان کے

ذریعے بھی پانی لانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس طرح زندگی میں نشیب و فراز

نہوں تو وہ بے کیف ہو جاتی ہے اسی طرح کافی گرم بھی ہے۔ پہاڑی راستے

خطرناک ہیں مگر یہاں کے لوگ ایسے بے خطر چلتے ہیں جیسے لاجورد کی بالی

پہلے جا رہے ہوں۔

کافی گرم میں ایک ہائی اسکو اور مرکاری ڈپنسری بھی ہے۔

دق کے مریضوں کے علاج کے لئے یہاں ایک صحت گاہ بھی بنانا چاہتی ہے۔

یہاں کے قابل دید مقامات میں پیر روشن کا شہر بھی ہے جو ازمرغسل کے

ایک بزرگ تھے۔ دوسری مشہور زیارت گاہ میاں شکاران صاحب کی

کھی جاتی ہے۔ اب ذکر آگیا ہے تو ان کا واقعہ بھی سن لیجئے جو لطف سے

بانی ہے۔

ستارہ مشرق

(حفاظت حسین: ایک تعارف)

سید زاہد الرحیم

اور ان کی طوفانی موجوں، طلوع اور غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں اور ایسے ہی دوسرے مناظر سے بے پناہ محبت ہے۔ چنانچہ اس لئے اپنے احساسات کا اظہار غنیمت عنوان سے کیا ہے۔ مثلاً پندرہویں گنگا میں غروب آفتاب: "مچھروں کی روانگی"۔ غضبناک نہ دیا "یہ تینوں تصاویر کی رنگوں سے تیار کی گئی ہیں۔ پہلی تصویر میں سورج کے جلال و جمال کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ پچھم سے افق سے اس کی رنگین کرنیں پھوٹ پھوٹ کر پورے کونکے کی پچھل لہروں کو جوانی کے مدھمکیت ساز ہیں اور اس نسبت پر رقص کرتی ہوئی موبیہ۔ مانجھیوں کے قریب سے ہو کر گزرتی ہیں جن سے مانجھیوں کی انگلیوں کی کشتیاں تن میں ہچکولے کھانے لگتی ہیں۔ وہ بھنبائی کے گیت گانے اس کا اظہار کرتے ہیں جن میں کوئی کویا کا رنگ بھی ہے اور مشہور شا عجم الدین کے خیالات کا پرتو بھی۔ حفاظت حسین کی دوسری تصویر پچھروں کی روانگی میں معاشرتی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس میں دو نوجوان مچھروں کے جوش و خروش کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو پو پھٹتے ہی زندگی کی جدوجہد شروع کر دیتے ہیں اور کشتیوں میں بیٹھ کر دریائی تہ سے مچھلیاں تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مچھلیوں کی دستیابی پر ان کی زندگی کا انحصار ہے۔ دن بھر کی تھکن سے جب ان کی کمر ٹھٹھنے لگتی ہے تو کبھی وہ دریائی کھربائیوں کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی چاروں طرف پھیلے ہوئے آسمان کی سمت۔ لیکن جب دریا میں دلچسپ طوفان اٹھتا تو مانجھیوں کی زندگی بھی ہچکولے کھانے لگتی ہے اور ان کی چھٹی چھٹی ہانسی کی کمرور کشتیاں سیلاب کی تیز ہوجاتی ہیں۔ حفاظت حسین نے اسی ڈراما نے منظر کی جھلک اپنی تیسری تصویر "غضبناک دریا" میں دکھائی ہے۔ الغرض حفاظت حسین اپنی تصویروں میں مشرقی پاکستان کی زندگی کو وہاں کی مخصوص فضا میں حقیقت سے ہمکنار کر کے پیش کرتا ہے۔

یوں تو پاکستان میں کتنے ہی فنکار پیدا ہوئے جو اپنے فن کے ذریعہ زندگی کے ہر شعبہ پر روشنی ڈال چکے ہیں تاہم جہاں سید حفاظت حسین کی تصویروں میں نظر آتی ہے وہ کسی اور کے یہاں شکل ہی سے ملے گی۔ "زندگی کی کشمکش" اور طوفان کے بعد دعوت جیسی تصاویر اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا تین ثبوت ہیں۔ ان تصاویر میں تخیل اور مشاہدہ کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس کے فن میں نفاست کے ساتھ نزاکت بھی ملتی ہے اور یہ دونوں خصوصیات اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ فن کی رفتوں تک پہنچنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہنگال کا یہ تیس سالہ نوجوان ۱۵ اگست ۱۹۴۳ء میں مکمل کیا پیدا ہوا اور وہی اکتساب فن کیا۔ اس کا ذوق و شوق اساتذہ کے زیر سایہ برابر پروان چڑھتا رہا۔ زندگی کی تنگ دو میاں سزاؤں کا کاٹا ابھرے جنوں نے فکری پائیل تک پہنچایا اور حقیقت کے آئینہ میں زندگی کے نشیب و فراز کے منت سنے روپ دکھائے۔ حفاظت حسین بھی نئی نئی خوابیں رعنائیوں کو بیدار کرتا ہوا ۱۹۴۴ء میں ڈھاکہ پہنچا۔ آزادی کی سحر طلوع ہوتے ہی اس کی زندگی بھی روشن ہو گئی اور وہ مشہور فنکارانہ درنگ کا گورنمنٹ ہسپتال ٹیوٹ آف آرٹس میں زمین العابدین کے زیر نگرانی اپنے خواہوں کو صفو قرطاس پر منتقل کرنے لگا۔ ماہی سال کے پہلے ریاض سے اس کی زندگی میں ایک مچھل سی گئی اور وہ ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر حال کی روشن فضا میں پرواز کرنے لگا۔ آج ہی جوں سالی حفاظت حسین فن کی اس بلندی پر ہے جہاں فی الدینا قمر حسن اور کبریا جیسے فنکاروں کے سلسلے آکر ملتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے دوسرے مصوروں کی طرح حفاظت حسین کو کچھ فطرت سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ فطرت کی ہر طرح کی نگینوں کو اپنے مو قلم سے صفحہ قرطاس پر زندہ جاوید بنا دینے کا بڑا محک رکھتا ہے۔ فطری مناظر کے علاوہ اس کو مچھروں کی زندگی بڑے خاصا تہ دیاؤں

میں آبی رنگ استعمال کئے گئے ہیں۔ طوفان کی پلاکت آفرینیوں کا جو مہینہ تک
خطر اس تصویر میں پیش کیا گیا ہے اسے دیکھ کر دو ٹوٹے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔
حفاظت حسین کے فن کی ایک نمائش ڈھاکہ میں منعقد ہوئی
اور دوسری پاکستان امریکن کالج سینٹر کراچی میں۔ مؤرخانہ ذکر نمائش میں
مغربی پاکستان سے متعلق تصاویر بھی تھیں۔ اس طرح وہ صرف مشرقی
پاکستان ہی کا نہیں بلکہ مغربی پاکستان کا بھی نمائندہ مصوٰف ہے اور
اس کے مو قلم سے وہی زندگی کنواں اس پہاڑی ہے جسے ہم چلتی پھرتی
دیکھتے ہیں۔

حفاظت حسین کی ایک بڑی خصوصیت روایت سے انحراف
ہے۔ مسلمان مصوٰفوں میں غالباً حفاظت حسین ہی پہلا فنکار ہیں جس نے
مذہبی موضوع کو مرکز توجہ بنایا اور چند ایسی تصویریں تخلیق کیں جو اس کے
ماہر فن ہونے کی تین دلیل ہیں۔ اس کی ایک تصویر خدائے حضرت مولیٰ کی
گفتگو، جرات کے علاوہ روایت سے بغاوت کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔
اس تصویر میں روغن استعمال کیا گیا ہے، حضرت عیسیٰ کی والدہ ماجدہ
بھی اس کے فنی شعور کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ اس میں پنیل اور دو شانی
استعمال کی گئی ہے۔

یہ مصوٰف حسین تخیل، وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کا نادر
شاہکار ہے۔ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ مصوٰف نے نہایت چابکدستی سے
ان روایات کو از سر نو تازہ کیا جو ہمارے آئے دن کے واقعات سے
ہٹ کر صحائف آسمانی میں قلمبند کی گئی ہیں۔ مصوٰف کا خیال ہے جیسا کہ
اس تصویر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بحر تخیل میں غوطہ زن رہ کر
انواع و اقسام کے نعل و کعبہ تصویر کی صورت میں پیش کرتا رہے گا مگر
دنیا اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اٹھائے دینے وہ خود کو اس سے
سکون قلب حاصل کرتا ہی رہے گا۔ حفاظت حسین حقیقت کی
روشنی میں مذہب کا روشن چہرہ دیکھنا چاہتا ہے اور یہ واضح
کرنا چاہتا ہے کہ آج کی "تیسرے ترک" کا مزہ کی دنیا میں قدیم رشتہ
ست اور بہت سست ہے۔ "جہاں امت محمد سکون کی غنیمت دیتی
ہے" اسی سلسلہ کی ایک اور رکڑی ہے۔ یہ روشنی رنگوں کی آمیزش
تیار کی گئی ہے اور اس کا منظر بہت پروردہ ہے۔ فضا میں ہر طرف
خاموشی ہے، پتیاں زمین پر بکھری پڑی ہیں۔ درخت کی شاخیں
بالکل خشک اور تیروں کا ایک سلسلہ امتنا ہی حد تک چلا گیا ہے۔

حفاظت حسین کو قدرتی مناظر سے بڑی محبت ہے۔ اس کی
تصاویر "شان مشرق" اور "جب فطرت مسکراتی ہے" فطرت سے وابہانہ
شینگی کا مظہر ہیں۔ "شان مشرق" میں روشنی رنگ استعمال کئے گئے ہیں
اور دوسرے تصویر میں آبی رنگ گہرے دوسری تصویر بنانا زیادہ مشکل
ہے۔ یہ دونوں تصویریں حفاظت حسین کی ژرف نگاہی کا زندہ جاوید
ثبوت ہیں۔ ہارٹس میں چند لمحے تو اس کا شاہکار ہے۔ برسات میں مشرقی
پاکستان ایسا نظر آتا ہے جیسے کائنات کی تمام رعنائیاں ایک ہی جگہ
سمٹ آئی ہوں۔ حدنگاہ تک ہریالی ہی ہریالی، رنگ برنگے پھول ہی
پھول۔ ہرے بھرے دھانوں کے کھیت، زردی مائل سرسوں کی
رعنائی، گہرائے رنگ رنگ سے بھرے ہوئے ٹرٹ ٹرٹ پتھر، آسمان سے
باتیں کرتے ہوئے نال اور تاریل قطار اندر قطار، در در دور تک
پھیلی ہوئی بھیلیں، پانی میں حسین کنول کے عکس، تالابوں میں نہانے کا
سماں۔ اور پھر ان سب کا مجموعی تاثر۔

اگر فردوس ہر دے زمین است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

حفاظت حسین نے ان تمام رعنائیوں کو اپنی ایک ہی تصویر

"ہارٹس کے چند لمحے" میں سمیٹ لیا ہے۔ اس تصویر سے مصوٰف کی
ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں رنگوں کی آمیزش بھی فنی
اعتبار سے بے عیب ہے۔

آبی اور روشنی رنگوں کے علاوہ حفاظت حسین کو پنیل اور
چار کول کے استعمال پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اس کی
تصاویر غسل کے بعد، آئینہ کے سامنے، سنگھار، گپ شبہ
کمال فکر و فن کا مظہر ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ حفاظت حسین نے گاؤں کی معصوم دوشیزاؤں اور ان کے
رہن سہن کا بڑی گہری نظروں سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کی ایک تصویر
"عناصر کی بے توجہی کا خدواں ہی زندگی پر ایک تازیانہ سے کم نہیں۔
اس تصویر کا تعلق مشرقی پاکستان کے قیامت خیز طوفان سے ہے۔
اس بلائے نے دنیا کو چاکلہ بنایا اور دوسرے ساحلی
علاقوں میں زندگی کی ریت تک نہ چھوڑی۔ اس نے ہر جاندار کا ایک
ایک قطرہ ہونچ کر موت کی گرسنہ آنتوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔
دم توڑتے ہوئے بے بس انسان گدھوں کا شکار بن رہے تھے۔ اس

اندازہ لگا تاخود اس کے بس کی بات بھی نہیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہے اور جیسے جیسے اس کی تصویریں سامنے آتی رہتی ہیں اس پر پائے زنی کی جاتی ہے۔ اس کے ریاض، کاوش اور فنی تحقیق و جستجو کا پہلا سلسلہ چندے اور رمل تودہ دن دو نہیں جب وہ صف اول کے ماہرین فن میں شمار ہونے لگے گا۔

یہ تصویر حفاظت حسین کے شدید احساسِ کلبے ساختہ رد عمل معلوم ہوتی ہے۔

اب تک حفاظت حسین کے فن پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرفِ آخر نہیں کیونکہ وہ ہر لحظہ ترقی پذیر ہے۔ اس کا مشاہدہ فنی چیزوں کو اپنے فن کی گرفت میں لینے کے لئے سمجھنا ہے شاید اپنے تجلی کی رفعتوں کا

”جہاں میں تھا“ بقیہ صفحہ ۲۵

کشمیری چائے پہلو انوں کو بڑی مرغوب ہے۔ اہل ہمارے پہلو ان زیادہ تر کشمیری ہی ہیں۔ کیونکہ یہ کھانے کو ہضم کرتی ہے مگر یہ لوگ تو اپنی جسمانی قوت سے ہی کھانا ہضم کرنے کے قابل ہیں۔ مشروبات اور چائے وغیرہ کی لاگ سے نہیں۔ کون ہے جو ان باتوں سے سبق لے۔ سب یہی کہیں گے، نئے زمانے میں آپ ہم کو بہانی باتیں سنارہے ہیں! یہاں تو دن رات چائے یا ایسی ہی اور چیزوں کا دور ہے اور اس +

رکھے۔ جن کی بدولت خوش خوری کا یہ مظاہرہ دیکھنا نصیب ہوا۔ یہ مایہ ناز طبقہ ہماری قومی محنت کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ اگر ہم اس کے نقش قدم پر چل کر اس کی محنت و توانائی کو واقعی ساری قوم میں عام کر سکیں تو بڑا کام ہو گا۔

آخر میں جب میزبان نے ”چائے پیمانی“ پر تان توڑی تو سب پہلو انوں نے ایک زبان ہو کر معذرت چاہی، بلکہ صاف انکار کر دیا۔ چائے آج کل ہر کھانے کا متمم سمجھی جاتی ہے، بلکہ لوازمہ۔ گو یہ سنا تھا انگلیں

”کافی گرم“ بقیہ صفحہ ۲۶

بہر کیف کافی گرم ایک قابلِ دید جگہ ہے اور سیاح کے لئے چوکی یہاں بہت کچھ سنانے ہے۔ دیکھئے اب سورج ڈوب رہا ہے اور اس کی قرمز کا کرنی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر پڑتی ہیں۔ ایسا دکھائی دے رہا ہے طلسمی شہزادیاں شہر سے تاج پہن کر جمع ہو رہی ہیں۔ ہوا کے سارے پرندیں مدھر راگ گا رہی ہیں، ادھر دیکھئے ایک نوجوان الغونہ بلیوں کو لٹکائے زیتون کے پیر سے ٹیک لئے بیٹھا ہے اور وہ اب اپنا دل پسند نغمہ چھیرے گا اور یہ وادی موسیقی کے رس سے بھر جائے گی۔ اب شام کا دُھند لگا رہا ہے، رنگین قبا پرندے بھی اپنے اپنے اشیانوں کی طرف جا رہے ہیں، پیر اور پہاڑ ایسے نظر آ رہے ہیں جیسے ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے اور وہ دم بخود کھڑے ہیں۔ کہتے ہیں اس مقام میں دنگ و کی اس راجدھانی سے رخصت ہوں +

خالی نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ شکار کے بہت شائق تھے اور اسی وجہ سے ان کا یہ نام پڑا۔ ایک دفعہ وہ شکار پر گئے تو اتفاق سے کوئی شکار ہاتھ نہ آیا اور وہ تہی دست لوٹے، ان کے فرزند بھی ہمراہ تھے، اور انہوں نے ایک جھگی بکرا شکار کر لیا تھا۔ اس واقعہ پر صاحبِ جزا دے بار بار کہتے رہے کہ: آپ تو کچھ بھی نہیں لائے۔ باہا کو اس پر جلال آگیا اور ایک نعرہ مستانہ بلند کیا جس سے ساری وادی گونج اٹھی اور لوگوں کا کہنا ہے کہ وادی میں جس قدر بکرے تھے ان کے سر تن سے کٹ کر گر گئے اور اقلہ کی محنت پر یقین کرنا نہ کرنا تو خیر اور بات ہے مگر میں خود ان کے مزار پر گیا ہوں اور وہاں یہ ضرور دیکھا ہے کہ مقبرہ کی دیواروں کے ساتھ جگہ جگہ جھگی بکروں کے ان گنت سر سبز سمیت، پڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوی سر ہیں۔ سنا ہے بعض سرچھی حالت میں تھے اور اگر زیرِ پسے ساتھ بطور یادگار لے گئے۔ اقلہ بہتر جانتا ہے کہ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔

جام اور ہے، جم اور (حقوق انسانی)

طلب حقوق ہمیشہ اور ہر زمانہ میں رہی مگر اس سلسلے میں جب بھی تشدد نا انسانی سے کام لیا گیا یہ حقوق حاصل نہیں ہوئے۔ اس لئے صلح جو کی ہمیشہ ہی کوشش رہی کہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق طبعی ساری دنیا کے قابل ذکر چھوٹے بڑے ممالک مل جل کر ان حقوق کو اپنے یہاں عام کریں تاکہ لاکھوں انسان بددلی، بیزاری اور محرومی کا شکار نہ بن سکیں۔ لوگوں کو جیسے جیسے حقوق ملیں گے ان کی زندگی میں بہتر اور زیادہ خوش گوار بنیں گی۔ انہیں اپنے فرائض ادا کرنے اور مدد طلب پوری کرنے کا احساس بھی زیادہ ہوگا۔ وہ اپنے ملک کی حکومتوں اور اجتماعی نظاموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون بھی کریں گے۔ اسی طریقہ سے معاشری و سیاسی مقاصد کا کچھ سدباب اور عالمگیر انسان کا حصول ممکن ہے۔

نیک نیتی کے ساتھ مقصد بھی جلیلی ہو تو اس پر تہم قویوں کا کامل اتفاق نہ ہو نا حیرت انگیز امر ہے کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کے سارے ملک انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق آسانی سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ کیوں؟ اس سوال کے کئی پہلو ہیں جن پر تفصیلی بحث یہاں ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں صرف اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں صرف ایسا بڑا عالمی ادارہ، اقوام متحدہ ہے جس کے مشور میں اہل دنیا سے حقوق انسانی کے تحفظ و حمایت کا نکتہ شامل ہے اور وہ ہر سال دنیا کے ضمیر کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق ملنے چاہئیں اور اس نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انفرادی و اجتماعی طور پر افراد و اقوام کو کیا کچھ کرنا ہے۔

اقوام متحدہ ہر سال تمام ممالک کے تعاون سے جن میں پاکستان بھی شامل ہے، ایک عالمی یوم حقوق انسانی مناتا ہے اس دن تمام باشندے انسانی طبقوں کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ حقوق خدا کی ترقی نام، مسرت اور اطمینان کے لئے ہیں کیا کرنا چاہئے۔ جہاں یہ مقاصد حاصل

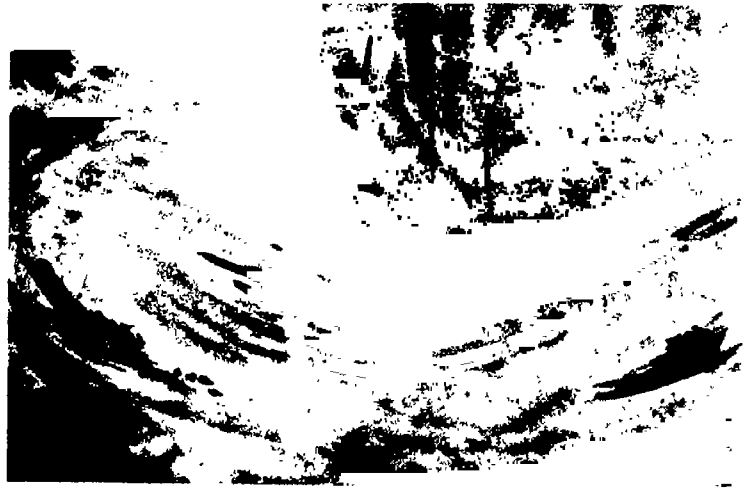
آجکل جسے دیکھئے طرح طرح کے مطالبے کرنے اور حقوق مانگنے پر تکا ہوا ہے۔ اس حقوق طلبی میں مصلحت بینی، عقل سلیم کے تقاضے، انہی حیات کا پاس، شعور و شائستگی کا احساس کچھ بھی قابل اعتنا نہیں یہی وجہ ہے کہ اہل بسین حقوق آئین و انسانیت دونوں کے حدود سے گزر جاتے ہیں جس سے معاشرہ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ فرد کو ضرورت اس امر کی ہے کہ ہند و شائستہ انسان سب سے پہلے حقوق و فرائض کے مسئلہ سے آگاہ ہی حاصل کرے۔ یوں تو حقوق طلبی کسی انسانی معاشرہ کے زندہ و فعال ہونے کی سب سے بڑی علامت ہے مگر حقوق میں وقت طلب کرنے جاسکتے ہیں جب کسی منظم و ہند معاشرہ کے افراد خود بھی کچھ پابندیاں، فرائض اور ذمہ داریاں اپنے اوپر عائد کر لیں۔ حقوق فرائض کے اس توازن کی بدولت نہ صرف معاشرہ کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں بلکہ مختلف انسانی گروہوں کے باہمی تنازعات بھی پُر اس طریقہ پر طے کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر فرائض ادا کرنے یا کچھ نہ دینا قبول کرنے کے لئے یا تو تیار ہی نہیں یا انہیں صرف زبانی طور پر قبول کر لیتے ہیں اور ان پر عمل نہیں کرتے۔ انفرادی نہیں اقوام کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ اسی لئے انسانوں کو اپنے انفرادی و اجتماعی حقوق کے حصول میں دشواریاں پیش آتی ہیں یا وہ ان حقوق سے بالکل ہی محسوسم رہتے ہیں۔

حقوق و فرائض کے سلسلے میں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اجتماعی حقوق کے مطالبہ کے لئے ہم پہلے صرف چند بنیادی اصولوں پر متفق ہوں اور ان ہی کے حصول کے لئے کوشش کریں ورنہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انفرادی خواہشات کی طرح اجتماعی مطالبوں کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ہم بعض نکات ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی ہر شخص تائید کرے لیکن جب سوال یہ ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے لئے یہ حقوق کون اور کس طرح حاصل کرے۔ دنیا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ



مہینہ سہر !

طوفان کی آغوش میں



بانی کی تہہ میں چشم کرداب سو گئی ہے !

طوفان بھی سکون بھی

دو انتہاؤں کی سر زمین

مشرقی پاکستان

اسؔھی کے ایک مصور کی نظر میں

سید حنا فاطمہ حسین

(۱۹۳۳ء)



جام اور ہے، حجم اور“

(حقوق انسانی)

طلب حقوق ہمیشہ اور ہر زمانہ میں رہی مگر اس سلسلے میں جیسا بھی فتنہ دو نا انصافی سے کام لیا گیا یہ حقوق حاصل نہیں ہوئے۔ اس لئے مصلح برہمنوں کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق ملیں اور ساری دنیا کے قابل ذکر چھوٹے بڑے ممالک مل جل کر ان حقوق کو اپنے یہاں عام کریں تاکہ لاکھوں انسان بددلی، بیزاری اور محرومی کا شکار نہ بن سکیں۔ لوگوں کو جیسے جیسے حقوق ملیں گے ان کی زندگی بھی بہتر اور زیادہ خوشگوار بنیں گی۔ انہیں اپنے فرائض ادا کرنے اور ذمہ داریاں پوری کرنے کا احساس بھی زیادہ ہوگا۔ وہ اپنے ملک کی حکومتوں اور اجتماعی نظاموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون بھی کریں گے۔ اسی طریقہ سے معاشری و سیاسی مقاصد کا کچھ سدباب اور عالمگیر فلاح کا حصول ممکن ہے۔

نیک نیتی کے ساتھ مقصد بھی جلیل ہو تو اس پر تمام قوموں کا کامل اتفاق نہ ہونا حیرت انگیز امر ہے کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کے سارے ملک انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق آسانی سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ کیوں؟ اس سوال کے کئی پہلو ہیں جن پر تفصیلی بحث یہاں ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں صرف اسی قدر کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں صرف ایسا بڑا عالمی ادارہ، اقوام متحدہ ہے جس کے منشور میں انسانی سے حقوق انسانی کے تحفظ و حمایت کا نکتہ شامل ہے اور وہ ہر سال دنیا کے ضمیر کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق ملنے چاہیے اور اس نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انفرادی و اجتماعی طور پر افراد و اقوام کو کیا کچھ کرنا ہے۔

اقوام متحدہ ہر سال تمام کن ملک کے تعلق سے جن میں پاکستان بھی شامل ہے، ایک عالمی یوم حقوق انسانی مناتا ہے اس دن تمام باشندہ انسانی طبقوں کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ حقوق خدا کی ترقی و تمام مسرت اور اطمینان کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ جہاں یہ مقاصد حاصل

آجکل جیسے دیکھتے طرح طرح کے مطالبے کرنے اور حقوق مانگنے پر توجہ ہے۔ اس حقوق طلبی میں مصلحت بینی، عقل سلیم کے تقاضے، انہی حیات کا پاس، شعور و شائستگی کا احساس کچھ بھی قابل اعتنا نہیں یہی درجہ ہے کھالیں حقوق، انمن و انسانیت و فطرت کے حدود سے گزر جاتے ہیں جس سے نہ معاشرہ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ فرد کو ضرورت اس امر کی ہے کہ مذہب و شائستہ انسانی سب سے پہلے حقوق و فرائض کے مسئلہ سے آگاہی حاصل کرے۔ یوں تو حقوق طلبی کسی انسانی معاشرہ کے زندہ و فعال ہونے کی سب سے بڑی علامت ہے مگر حقوق انسانی کا طلب کئے جاسکتے ہیں جب کسی منظم و مذہب معاشرہ کے افراد خود بھی کچھ پابندیاں، فرائض اور ذمہ داریاں اپنے اوپر عائد کر لیں۔ حقوق فرائض کے اس توازن کی بدولت نہ صرف معاشرہ کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں بلکہ مختلف انسانی گروہوں کے باہمی تنازعات بھی پراسن طریقہ پر حل کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم فرائض ادا کرنے یا کچھ نہ دیا قبول کرنے کے لئے یا تو تیار ہی نہیں یا انہیں صرف زبانی طور پر قبول کر لیتے ہیں اور ان پر عمل نہیں کرتے۔ افراد ہی نہیں اقوام کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ اسی لئے انسانوں کو اپنے انفرادی و اجتماعی حقوق کے حصول میں دشواریاں پیش آتی ہیں یا وہ ان حقوق سے بالکل ہی محروم رہتے ہیں۔

حقوق و فرائض کے سلسلے میں ہمیں یہ بات بھی یاد کرنی چاہئے کہ اجتماعی حقوق کے مطالبہ کے لئے ہم پہلے صرف چند بنیادی اصولوں پر متفق ہوں اور ان ہی کے حصول کے لئے کوشش کریں ورنہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انفرادی خواہشات کی طرح اجتماعی مطالبوں کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ تاہم بعض نکات ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی ہر شخص تائید کرے تاکہ جب سوال یہ ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے لئے یہ حقوق کن اور کس طرح حاصل کرے۔ دنیا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ



میدان سپر !

طوفان کی آغوش میں



پانی کی تہہ میں چشم کرداب سوکئی ہے !

طوفان بھی سکون بھی

دو انتہاؤں کی سر زمین

مشرقی پاکستان

اسٹہی کے ایک مصور کی نظر میں

میدان حفاظت حسین

(۱۹۳۳ء۔۰۰۰۶)



کھانے سے پہلے؟ کھانے کے بعد؟



دبیز قمیص
بھولو

باریک قمیص
اسلم

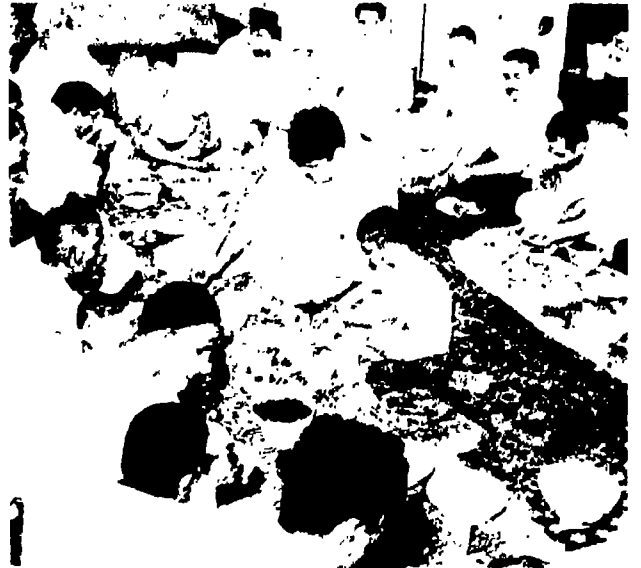
کالی قمیص
کوٹا

بھولو لقمہ بقدر جند !

صف اول : لوکا، رستم غند امام بخش، میان کرم الہی (میزبان
بھولو - اسلم -
بجھلی صف میں : لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید
(میزبان کے عقب میں)

وصافہ ہیں یہ لوگ

پاکستان کے مابہ ناز بلند بالا پھلوان
جنہوں نے ہر معرکہ میں کامیاب رہ کر
پاکستان کا نام دولا کیا ہے
اور جن کے ساتھ کھانا کھانا باعث
فخر و مسرت ہے ایک یادگار واقعہ



کلو و الشربوا ! اے کشمیری بھائی عورتے !

حقوق اور آزادیوں کا حصول و تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ اپنے آئین و قانون کا معقول طریقہ پر احترام کرے۔

حقوق انسانی کے متعلق اقوام متحدہ کے اس اعلان کو اگر دنیا کا "منشور اعظم" کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کیونکہ اس میں صرف سیاسی و شخصی حقوق ہی نہیں بلکہ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق بھی شامل ہیں کیونکہ افراد کے تین آزادیوں کے بغیر سیاسی و انفرادی آزادی کے کوئی معنی ہی نہیں پچھلے پندرہ سال میں ان حقوق کی حفاظت اور ترویج کے لئے بہت کچھ کام کیا گیا ہے اور اس ضمن میں اقوام متحدہ کی مساعی کی سب سے بڑی کامیابی تو یہی ہے کہ انسانوں کے ذہن و ضمیر اس سے متاثر ہوئے ہیں اور دنیا کے ہر ملک کے مرد و زن اب اس منشور کی روح کو سمجھتے جا رہے ہیں۔

کنہ معاشرہ انسانی کی بنیاد ہے۔ اس لئے خاندان کے مسائل و تعلقات اور حقوق و فرائض کو ہی ہمیں سب سے پہلے دیکھنا چاہئے۔ اقوام متحدہ نے یہ اصول بھی تسلیم کیا کہ اس کی حفاظت بہت ہی ضروری معاشری نکتہ ہے۔ اس حفاظت کا فرض معاشرہ اور حکومت دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ شادی، اس کے دوران اور طلاق سب حالتوں میں جملہ متعلقہ افراد کو مساوی حقوق حاصل ہونے چاہئیں نیز یہ کہ میاں بیوی کی ذمہ داریاں بھی یکساں ہونی چاہئیں تاکہ کام، زندگی، قومیت اور انسانی معاشرہ میں ان کے بے شمار تعلقات و روابط کے پیش نظر ان مساوی حقوق و فرائض کا تحفظ ہو سکے۔

دنیا میں انسانوں کے دکھوں کی کہانی یوں تو بڑی طویل ہے مگر بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے تدارک و تحفظ کے لئے ضمیر انسانی بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ حریتِ نفس، آزادیِ فرد اور قوامِ انسانی کو طے طرح کے حملوں سے بچانا انسانی معاشرہ کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے اور خدمت بھی۔ مثلاً ابھی تک دنیا کے بعض حصوں میں غلامی کا مسئلہ بہ طور موجود ہے، عورتوں اور جوانوں اور بچوں سے ناجائز فائدے اٹھانے کی لعنت الگ ہے۔ مردوروں کے سیاسی و اقتصادی حقوق چرچ کرنے کی جوس بھی موجود ہے اس سے قطع نظر نسلی، تعلیمی اور دیگر بنیادوں پر امتیازی سلوک رفاہ کن کسی طرح جائز نہیں سمجھا جاسکتا۔ اقوام متحدہ نے ان تمام مفاسد کی روک تھام کے لئے بہت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ہر ملک ان معاشری و سیاسی ضرورتوں کو ختم کرنے

نہیں چھوٹے ہیں یا جزوً حاصل ہوئے ہیں وہاں ہماری کاوش و مساعی کا کیا انداز ہونا چاہئے۔

اقوام متحدہ نے شروع ہی میں حقوق انسانی کو اپنے منشور کا ایک جزو بنالیا تھا اور اس ادارہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۴۴ء کو اسے ایک قرارداد کی شکل میں منظور بھی کر لیا تھا۔ عالمی تاریخ میں انسان کے لئے سب سے بڑا جینے ہی حقوق انسانی کا مسئلہ رہا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ جنرل اسمبلی نے یہ قرارداد منظور کر لی مگر چند ہی ملک اس بات پر آمادہ ہوئے کہ قرارداد میں شامل انسانی حقوق دینے کے سلسلے میں کوئی آئینی پابندی قبول کریں۔ اس میں سب سے بڑی برکادٹ سیاسی و اقتصادی حقوق کا معاملہ تھا جس کی وجہ سے کچھ ممالک پس و پیش کر رہے تھے۔ ہر ملک کے مسائل و مشکلات کی نوعیت جدا گانہ تھی۔ ان دشواریوں کو دیکھ کر نے کہ لئے جنرل اسمبلی نے حقوق انسانی کے دو حصے کر دیئے۔ ایک حصہ کا تعلق شہری و سیاسی حقوق سے تھا اور دوسرے میں اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق شامل تھے۔ پھر یہ طے کیا گیا کہ انہیں کس طرح بروئے کار لایا جائے۔ جنرل اسمبلی میں ان حقوق کو تسلیم کرنے کے لئے بین الاقوامی معاہدہ کی طرح ڈالی گئی تاکہ سب ملک ان مقاصد کے حصول کے لئے اپنے ہاں کام کریں۔ مگر جنرل اسمبلی میں جب اس سلسلے میں تقریریں ہوئیں تو یہ معلوم ہوا کہ مختلف ممالک کو انہیں تسلیم کرنے یا ان پر عمل پیرا ہونے میں کیوں تامل ہے۔ انہیں عملی جامہ پہنانے میں کیا دقیقیں لاحق ہیں۔

حقوق انسانی سے متعلق چار اہم نکات تھے، خوف سے آزادی، احتیاج سے نجات، عبادت اور مذہب پر خیال کی آزادی۔ جب اقوام متحدہ نے ان باتوں اور دیگر متعلقہ اجزاء کو اپنے منشور میں شامل کیا تو سب سے پہلے اس بنیادی اصول کو تسلیم کیا گیا کہ "ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ وقار و حقوق کے باب میں سب یکساں ہیں۔ وہ منشور و ضمیر کے اوصاف سے بھی مصنف ہیں۔ اس لئے انہیں ایک دوسرے سے براہِ راست جذبہ کے ساتھ سلوک کرنا چاہئے"۔ اقوام متحدہ نے یہ بھی اعلان کیا کہ ان کے حقوق کا اطلاق نسل، مذہب، جنس یا مذہب کے اختلاف کے باوجود ہر فرد پر ہو گا خواہ وہ کسی آزاد یا خود مختار علاقہ میں یا کسی ایسے حصہ میں رہتے ہوں جیسے حق خود اختیاری حاصل نہیں۔ ساتھ ہی یہ نہایت اہم شرط بھی لگا دی گئی کہ ان

کے درپے ہے۔ گو جس قدر کامیابی حاصل ہونی چاہئے تھی اتنی نہیں ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا سے غلامی کا کلیتہً خاتمہ نہیں ہوا۔ استیلا و انفرادی آزادی سے محرومی کا مسئلہ بھی معقول طریقہ پر حل نہیں ہو سکا ہے۔ مگر ایسا سب جگہ نہیں ہے، حالات سدھرتے جا رہے ہیں اور ضمیر انسان بیدار ہو کر مطالبہ کر رہا ہے کہ ان دامنوں کو انسانیت کی پیشانی سے دور کیا جائے۔ اب جہاں کہیں بھی یہ برائیاں زور پکڑتی ہیں، ساری دنیا میں پھل مچ جاتی ہے اور ہر جگہ نہایت شدید احتجاج و رد عمل ہوتا ہے۔ اتنا کام بھی انسانی حقوق کے لئے بڑا کام ہے اور اس سے امید بندھتی ہے کہ آخر کار انسانیت ان برائیوں کو یکسر ختم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمارے ملک میں حقوق انسانی کا مسئلہ کس منزل پر ہے؟ اور اس کا ہماری قومی زندگی میں کیا مقام ہے؟ ایک اسلامی مملکت ہونے کی حیثیت سے حقوق انسانی کی طرفداری اور حمایت ہمارا انسانی فرض ہے۔ انسانوں کو یہ حقوق دینے کے لئے اسلام نے ہی سب سے پہلے آواز اٹھائی اور عملاً ان حقوق کو معاشرہ میں تسلیم رائج کیا۔ جنصورِ صلح کے آخری خطبہ کے الفاظ و معانی پر غور کیجئے۔ ان کو اگر حقوق انسانی کا اولین منشور اعظم کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔ ہمارا فلسفہ دین و حیات ان حقوق کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے لوگوں کو تفویض بھی کرتا ہے۔ معاشری مفاسد پیدا ہو جانے کے باعث اگر ان پر کہیں کہیں پوری طرح عمل نہ ہو رہا ہو تو وہ دوسری بات ہے مگر جہاں تک ان حقوق کو بطور عقیدہ تسلیم کرنے کا تعلق ہے ایک اسلامی مملکت ہونے کی حیثیت سے ہمارا موقف بالکل واضح ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں ذات پات کے بندھن نہیں ہیں جو انسانوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے والی سب سے بڑی لعنت ہے۔ ہمارے ہاں معاشری انصاف، عورتوں مردوں کے مساوی حقوق، تعلیم، ورثہ، محذورِ رحم، خیرات و زکوٰۃ کے ادارے صدیوں سے موجود ہیں۔ ہم حقوق انسانی کے احترام کی روح سے بخوبی آشنا ہیں اور ان کا دائرہ عمل بھی بہت وسیع ہے، کیونکہ اسلام نے ہماری نسبت کے جو اصول عطا فرمائے ہیں ان میں ہر جگہ ان حقوق و فرائض پر زور دیا گیا ہے۔ ان اسباب کی بنا پر ہماری حکومت، عوام و اہل الرائے بلکہ حقوق انسانی کی وکالت و حفاظت کا دل سے خیر مقدم کرتا ہے۔

صحت، ترقی اور تعلیم و مساوات کے لئے ہمارے ہاں بڑا کام ہو رہا ہے اور ایک نوزائیدہ مملکت ہونے کے باوجود اس معاملہ میں پہلی کامیابی کی رفتار تیز ہے۔ مثلاً تعلیم کا معیار ۵۵ یا ۳۴ فیصد سے بڑھ کر فیصد تک پہنچ چکا ہے۔ ہمارے ترقیاتی منصوبوں نے اس پر خاص توجہ دی ہے۔ اور درود انقلاب میں ایک تعلیمی کمیشن کا تعین بھی اسی نیت سے کیا گیا تھا اور اس کی سفارشات پر پوری تندی سے عمل ہو رہا ہے۔ صحت عامہ کا بیار بڑھانے اور بیماریوں کے سد باب کے لئے بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ نئے اسپتالوں اور مراکز صحت کا قیام، گاؤں گاؤں خیراتی شفا خانوں، گشتی طبی امداد و دیگر طبی سہولتوں کا فروغ اس سہولت کا خاص کارنامہ ہے۔ ملیریا کے انسداد کی ماسی جاری ہیں جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے باشندوں کو اس موذی بیماری سے کلیتہً نہیں تو بڑی حد تک نجات مل چکی ہے۔ ملک کے کچھ حصوں میں وق اور جذام جیسے منحوس امراض کے استیصال اور علاج کے لئے کافی بڑی رقم بھی اگئی ہیں اور عوام کو اس سے جو فائدہ پہنچ رہا ہے وہ انکسب دلیل کا محتاج نہیں۔ یہ سب کام انسانی حقوق کی پذیرائی کے لئے ہی ہو رہے ہیں اور عوام و خواص کا باہمی تعاون جیسے جیسے بڑھتا جائے گا ہم اس ضمن میں کامیابی کے مزید مراحل بھی طے کرتے جائیں گے۔ اصل میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ہر معاملہ میں حکومت کی طرف نہ دیکھیں بلکہ خود بھی منظم ہو کچھ کام کریں۔ حکومت تو مدد و تعاون کی سہی ہے لیکن معاشرہ کے اہل عمل لوگوں کا بھی یہ فرض ہے کہ جگہ جگہ سماجی کارکنوں کی مدد کریں۔ یہ فرض سماجی کارکنوں کا ہے کہ وہ مقامی حالات کا جائزہ لے کر وسائل کا اندازہ کر کے کام شروع کریں اور ہر جگہ محکمہ میں، گاؤں میں، بستی میں تعلیم، صحت، امن و امان اور معاشری بہبود کے دوسرے کاموں کی داغ بیل ڈالیں۔ اس طرح جو فرائض اداروں، سرکاری امداد اور توجہ سے انجام پارہے ہیں، اس میں ہاتھ بٹائیں۔ صرف اسی طریقہ سے ہم اسلام کے دئے ہوئے سبق پر عملاً کار بند ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں سماجی حقوق دینے پر کوئی نظریاتی قدغن نہیں ہے۔ لہذا انسانی حقوق کو کام کرنے میں ہمارے معاشرہ کو خاص طور پر زیادہ عمل کرنا چاہئے کیونکہ ہمارے ہاں جیسے سازگار حالات ہیں وہ کم جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ اقوامِ متحدہ کے منشور کی حمایت میں ہمارا ملک بھی کسی سے پیچ نہ رہے کیونکہ یہ ہماری ملکی بہبود اور ہمارے عوام تک ان حقوق کے فوائد

خدمت کی بڑی ضرورت ہے اور اس خدمت ہی میں انسان کو کتنی
ہونے کو حیثیت ہے ہماری عظمت ہے +

★

دور دور تک پہنچانے کا سوال ہے، اس لئے ہم اپنے معاشرہ میں ان
صوبہ کو پامال نہ ہونے دیں اور جہاں ان کے حصول و تحفظ میں دقتیں
مائل ہوں ان کو مل جل کر دور کریں کیونکہ تعمیر انسانیت کے لئے اس

” افریقہ “

بقیہ صفحہ ۱۷

کرائے میں کامیاب ہو گئی۔ صاحبزادہ صاحب نے وزارت سے استعفی
دے دیا۔ اور دل شکستہ ہو کر گھر بیٹھ رہے۔ مگر اسلامیہ کالج کی وہ لب
بھی خدمت کرتے رہے۔ اور خدمت وقت ہی کے دوران ۴ دسمبر ۱۹۶۳ء
کو ان کا انتقال ہوا۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان آج ہمارے درمیان نہیں لیکن
ان کی یاد اب بھی اسلامیہ کالج پشاور کی صورت میں تازہ و تابد ہے۔
جس نے حال ہی میں اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کئے ہیں۔
ان کے تعلیمی مشن اور ملت کے وسیع تر مفاد کے لئے ان کی مساعی بارگاہ
ہو رہی ہیں۔ اب کئی مقامات پر کالج کھل رہے ہیں مثلاً صوابی ہی
میں ایک کالج قائم کیا گیا ہے۔ ان کا یونیورسٹی بنانے کا خواب بھی
اب پورا ہو چکا ہے۔ اور امید ہے کہ ملک و ملت کے اس نامور
فرزند سرحد کی خدمات جلیلہ ہمیشہ یاد رہیں گی اور موجودہ نسل ان
کی مساعی کو اور آئے بڑھائے گی۔ جو ان کا مسلح نظر تھا +

ہوئیں اور صوبہ سرحد کو ایک ایفینٹ گورنر کی تحویل میں دے دیا گیا۔
۲۸ اپریل کو ہی صاحبزادہ عبدالقیوم خان وزیر برائے محکمات
منتقل مقرر کئے گئے اور سرحد میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ وزارت
منظلی کے پہلے پانچ سال میں نواب صاحب ہی نے پشاور میں ایک ریڈیو
اسٹیشن بھی قائم کیا۔ ملاکنڈ کی برقی قوت کا منصوبہ شروع کرایا۔
اور قانون انتقال اراضی بھی منظور کرایا۔ اس کی رو سے مسلمانوں کی
فیہ نقد جائداد غیر مسلموں کے ہاتھ میں جانے سے محفوظ ہو گئی۔ اسلامیہ
کالج پشاور کی رفتار ترقی بھی تیز ہو چکی تھی۔ کیونکہ تعلیم کا محکمہ خود
ان کے پاس تھا۔

انہوں نے زندگی میں اپنی کوئی سیاسی جماعت قائم نہیں کی۔
وہ سیاست میں غیر جانبداری کے قائل رہے۔ اس کے بعد کانگریس
کی ریشہ و اینوں کا عہد آیا اور اس علاقے میں طرح طرح کے سیاسی
گٹھ کھلے۔ کانگریس پارٹی ان کے خلاف عوام اعتماد کی تحریک منظور

مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مسلمانوں نے بنگلہ شعر و ادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ یہ ان کا ایک مختصر، مگر سیر حاصل
انتخاب ہے جو عہد قدیم سے معاصر شعر و ادب تک پیش کیا گیا ہے۔

یہ ترجمے حسن احمد لکھ اور جناب یونس احمد نے

برائے راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں۔

صفحات ۲۵۰ - کتاب جلد ۱ - ۱۰۰ پیسہ -

پارچہ کی لفٹیں جلد - طائفی لوح سے مزین -

قیمت صرف چار روپے ۵۰ پیسہ -

یہی کتاب سادہ جلد میں چار روپے -

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

چناب سے پدما تک (عوامی کہانیاں)

ہمارا ملک اس لحاظ سے کافی ممتاز و منفرد ہے کہ اس کا دامن طرح طرح کی اچھوتی، دلچسپ، عوامی کہانیوں کے گہلے رنگ لنگ سے لبریز ہے۔ مغربی پاکستان کی دنیاوی آذریوں کا ایک بوتلموں مرتب ہے تو مشرقی پاکستان کی بھی ایک انہی ہی دنیاوی انہی ہی فصل ہے، نفس پری بھری، سحرور کن۔ مگر فرزند ان کوہ و دامن اور ریگ و صحرا ہوں یا نرم کوئل و دب میں جھلکتی چھلکتی کہناتی ندیوں اور اٹھتی گھٹاؤں کے دس دسے ہوں، ان سب کے ذہنوں، تجربوں اور احساس نے جن جن کہانیوں کو دنیا طو پر جنم دیا ہے وہ ایک ہی چیز کی غماز اور عکاس ہیں۔ عوام کے اپنے دل کی دھڑکنیں، ان کی حیات کی جھلکیاں اور سادہ و رنگین جذبات و احساسات کی بے لوث تصویریں۔ ہر کہانی پر تحلیل کی کار فرمائی ہے، یا بیان واقعہ کی تفسیر جمیل۔ مشرقی پاکستان ہوا مغربی پاکستان، ان کی رو میں ایک ہی ہیں۔ اس لئے ان عوامی کہانیوں کا مطالعہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب کرانے اور باہمی تعارف و یکجہت کا احساس بیدار کرنے میں مدد دیتا ہے

چند جھلکیاں

تعارف، درفتی خادرا: ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ جس میں عوامی کہانیوں کے مخصوص تیوروں پر مرتبے ایک بھر پور روشنی ڈالی ہے۔
ایک کے اس پار: موٹی خاں گل کٹی، آدم خاں درخانہ، محبوبہ جلات، یوسف کرٹھدار، شہی تور وٹی، زرساگ، بہرام گل اندام۔
پنج ند، ہیر رانجا، ہیر سیال، مرزا صاحبان، سوہنی جنوال، یوسف زلیخا، میندھل موہل۔ سسی داوڑی جہان، سسی پنوں، مرستی موہل راتو، عمراروی، سراروٹی، لیلا چنیر، لوری جام تاجی۔
دادئی بولان، لیلا موہر کشمیر، گلزار شہر حاج مشرقی پاکستان: ہوا، گوتائی بی بی، دیوانی مدینہ، کاجل ریکھا، آئینہ بی بی، کنول کنڈ۔
اس مجموعہ کا ایک اہم و دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر کہانی کے ساتھ اس کی ایک مختصر منظوم جھلک بھی پیش کی گئی ہے۔
قیمت صرف دو روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳۳ کراچی



کارٹون: ریحان

اپنا نہیں وہ شیوہ...

مصباح الحق

کے متعلق سدا سے فیصلہ یہ ہے کہ ؟
 بہشت آنجا کہ آزارے نیا شد
 کسے را نہا کسے کارے نیا شد

اور یہاں کسے را با کسے 'کارے' پر زور نہیں بلکہ صرف "کارے" پر زور ہے کیونکہ مشہور ہے بلکہ یہاں تک سنا ہے کہ بہشت میں رهنے والے حاشا و کلا کوئی کام نہیں کریں گے۔ بیٹھے بیٹھے سب کام خود بخود ہو جائیں گے۔ سبحان الله ! لیٹے ہی لیٹے خوشہ انگور آپ ہی آپ منہ میں ! اور جنت کے تمام رسیلے رسیلے سیوے اور نعمتوں پر نعمتیں کام و ہاں کی خاطر تواضع کے لئے آمادہ ۔ نہ ہاتھ ہلاؤ نہ پیر، بلکہ منہ بھی چلانے کی ضرورت نہیں، کیا بات ہے ! کتنا نکما شخص تھا، کیا کہتے ہیں اے ؟

—کارلائل - سخت گاؤدی - خوجی سے بھی کہیں بڑے چڑھ کر - رات دن "کام کام کام" کی رٹ - جیسے کام اس کی اماں جان نے گھٹی میں ڈال رکھا تھا - آخر تھا کہاں کا ؟ یورپ کا - جس کا باوا آدم ہی نرالا ہے - جو الھتا ہے اونڈھی کھوپڑی لئے - الٹی گنکا بہانے پر تلا ہوا - اور یہ کارلائل بھی تو اسی تھیلی کا چٹہ بٹہ تھا - کوئی شاعر ہوتا تو بٹہ کے ساتھ وہ قافیہ سلافا کہ عمر بھر یاد رکھتا - وہ نہ سہی اس کے جانشین ابد الابد تک یاد رکھتے - کہاں مغرب کہاں مشرق - ٹھیک ہے مغرب والے کام کریں - مشرق والے عیش سنائیں - اور ہم دیسوں کے دیس، دیار پاک، کے رهنے والے - بھئی الله میان ہمارا حاجت روا - ہمیں کام کرنے کی ایسی ہلکت ہی کیا پڑی ہے ؟ اپنی

کہ آرام سے بیٹھیں - واہ صاحب واہ ! آپ بھی خوب سمجھے - سخن فہمشی عالم بالا معلوم شد - مصباح صاحب ! والله ہم تو آپ کو بہت سنانے بیانے سمجھتے تھے - مگر آپ تو، معاف کیجئے، بڑے "وہ" نکلیے - ورنہ فوراً کہتے : اپنا ہے یہی شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں - اور بیٹھے ہی رہیں، بیٹھے ہی رہیں - نہ ہلیں نہ جلیں - زمیں جنید نہ جنید گل محمد - کام کرنا، ہاتھ پاؤں ہلانا بھلا کہاں کی دانائی ہے - وہ جو تھے نا لسان العصر، آہا ہا ہا ! سبحان الله ! کیا کہہ گئے ہیں - قربان جائیے : موت سے ڈرنا بشر کا اک خیال خام ہے

اصل فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے
 ذرا غور کیجئے - کیا آج تک کسی نے کام کی خواہش ظاہر کی ہے ؟ جسے دیکھو آرام ہی آرام چاہتا ہے - کام ؟ واہ صاحب ہوش کے ناخن لیجئے - یہ کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ کام کیجئے - وہ حکیم نہیں ہوگا کوئی اور ہوگا جس نے کوئی ایسی بات کہی ہو - "غالب" کو بھی تو بعض لوگوں نے "حکیم فرزانہ" کہا ہے - اور اس حکیم فرزانہ نے ساری عمر میں ایک ہی کام کی بات کہی : عشق نے غالب نکما کر دیا - ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے ہائے ہائے ہائے ! کیا لفظ گھڑے گھڑنے والوں نے - سو جان سے قربان جائیے - حق یہ ہے کہ کام نہ اینجانب کے نگڑ دادا کے نگڑ دادا کے نگڑ دادا نے کیا اور نہ اس سے بھی آگے خانوادہ سلسلے کی آخری کڑی باوا آدم نے کیا - کیونکہ وہ ٹھہرے بہشت کے باسی - اور بہشت

میں آئے گی۔ فی الحال اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ جیسے پریزگار لوگ صبح سویرے نماز با جماعت ادا کرتے ہیں، اسی طرح ہم کام چور اکٹھے ہو کر سوئے آسمان دیکھتے رہتے ہیں۔

اب چاہے اس کے جو بھی معنی لے لیجئے۔ یہ کہ:

تھیں بنات النعش گردوں شب کو نظروں پر عیاں

دن کو ان کے جی میں کیا آئی کہ پنہاں ہو گئیں؟

یا پھر یہ کہ اللہ جل شان، کی شان کریمی کے طفیل آسمان سے سن و ملوٹا اتر آئے۔ اور، اور کچھ نہیں تو Penguin بننے ہی کی مشق کی جائے۔ رات بھر سوئے کا مزا، اور دن بھر پینے کا۔ لگے دم پر دم! مطلب یہ کہ ایک بڑا سا سماوار، ویسا ہی جیسا ہمارے دوست، ابراہیم جلیس کے گھر سے کوئی منچلا چور چرا کر لے گیا تھا اور انہیں اس کا بڑا دلدوز مرئیہ لکھنا پڑا۔ اس سماوار میں من بھر نہیں تو آدھا من پانی تو ضرور آیا ہوگا۔ اسے اہالا اور پھر اس میں سلہٹ کی ہری پتی کو گھلا یا۔ یا اصفہانی کو جوشایا۔ بن گیا سنہرا پانی۔ پھر کیا۔ یہ کہ

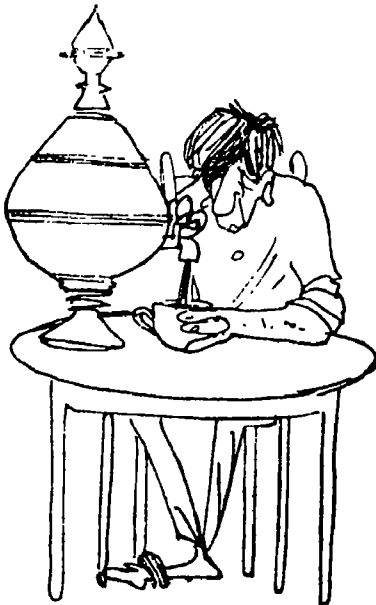
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ ہے تو ساری دنیا آگے۔ ساقی نہ ہو تو کیا۔ ٹونٹی کے نیچے رکھی پیالی اور اسے دم بھر میں خالی کر کے وہی قصہ

بلا سے بیٹھ رہے گر فقیر ہو۔ ہمارا بس چلے تو کام کا لفظ ہی لغت سے نکال دیں۔ 'کام بہت ہے'، 'کام بہت ہے'۔ وہ ہمارے "حکیم فرزانہ" بولے خاک کام ہے۔ ہم لوگ تو جنم جنم کے شاعر ہیں۔ اور شاعر تو ویسے ہی کام کے دہنی ہیں جیسے آج کل کی ہیگمات۔ زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا! اگر کوئی ہیگمات سنتی ہوں تو بخش دیں، غصہ تھوک ڈالیں!

کسی نے کہا نہا دن کام کے لئے، رات آرام کے لئے۔ مگر ہماری بات اور ہے۔ نہ دن کام کے لئے نہ رات بلکہ دونوں آرام ہی آرام کے لئے! مانا ہم عاشق نہیں۔ مگر عاشقوں سے کم کیا ہیں۔ رات بھر زیر بام آسمان، صحن میں بڑی شان سے لیٹے ہوئے، پاؤں کسی پشتینی نواب کی طرح ہمارے "گن گن تارے"، گنگنا بھی رہے ہیں اور تارے بھی گنتے جارہے ہیں کہ دل کے بجائے وقت کو خون کرنے کی کوئی تو صورت ہو۔ اور دن؟ اس میں ہم کسی سے کب بیچھے رہنے والے ہیں۔ آپ ہی کہئے کوئی ڈیڑھ دو انچ موٹا لعاف تان کر سو جائیے تو سورج کی کبا مجال جو کبھی طلوع ہو۔ مارے شرم کے طلوع ہوتے ہی ڈوب جائے گا۔ اور بھٹی، جاگ بھی اٹھیں گے تو کیا تیر مار لیں گے۔ علی الصباح کہ مردم بہ کاروبار روند۔ اور ہلا کشان محبت بہ کوئے یار روند کی بات تو بعد



جب تک بس چل سکے.....!



سوئے آسمان دیکھا کئے.....!

یوں لگا جیسے وہ ہنڈا گورا گورا چاند ہو اور اس سے ایک اجلی اجلی کرن برابر لڑھکتی چلی آرہی ہو۔ حضرت انشاء اللہ خان آتشا ”تصور عرش پر ہے اور سرے پائے ساقی پر“ کیا کہہ گئے ہیں۔ کہاں ہمارے ابن آتشا جو چاند نگر ہی میں کھو کر رہ گئے۔

بیس تفاوت رہ از کجاست تا بکجا !

ہم دل ہی دل میں جانتے تھے کہ بھنس گئے یعنی ان بیگم صاحبہ نے ہمیں بیگار میں دھر لیا۔ مگر مرتے کیا نہ کرتے۔ ان کی نوج کا ڈر سواں روح ! مگر وہ کہہ کر اس جان رومان کو کنکھیوں سے دیکھتے جاتے اور میرا جی کی طرح کہتے چلو سراہ میرا سین کے ساتھ اتنا ہی راز و نیاز غنیمت — یعنی کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں۔

”جچا“ غالب نے یوں ہی تو نہیں کہا تھا کہ :

عشرت صحبت تو باں ہی مناسب سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عمر طبعی نہ سہی

سبحان اللہ ! ”میرا سین“ کے سر پر وہ پیچاک کا پیچاک کہ اون کے ہنڈے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اون کے ہنڈے کے مقابلہ میں اون کا ہنڈا ! مطلب یہ کہ جتنی دیر شاپنگ جاری رہی بڑا مرا رہا۔ لوگ یہی سمجھتے ہوں گے کہ یہ ان کے تابع بیان ہیں۔ تابعدار اس لئے نہیں کہا کہ حضرت جوش ملیح آبادی اس پر معترض ہیں کہ تابع خود ہی تابع ہے، تابعدار کیا ہوا۔ ”دار“ بالکل تابع مہمل۔ خیریت گذری۔ اس دوران



ادھیر — بُن

اپنی تو جہاں آنکھ پڑی پھر وہیں دیکھو

آئینے کو لپکا ہے پریشان نظری کا

میاں مجنوں تم بھی لیلیٰ پر فریقہ ہو۔ وفا نباہنا اسی کو کہتے ہیں۔ سمجھے ؟

ہاں صاحب، اب مجنوں کا ذکر آگیا تو ہمارے شاعروں کی طرح دشت کا ذکر کہوں نہ آئے؟ وقت کشی کے لئے دشت نورددی سے بہتر تدبیر اور کیا ہوسکتی ہے؟ اور دشت بھی ”بوہری بازار“ کا، جہاں لیلیٰ سے لے کر ٹیلدی تک ہر جلوہ مفت نظر۔ صبح ہوئی، چائے پی کر گرم ہوئے اور چل پڑے سفر شوق پر۔ آنکھیں سری جلوہ ان کا۔ اور کبھی ان میں سے کوئی مہربان ہو جائے تو کیا کہنے !

میں جا نون اس زمین پر آسمان سے ماہتاب آیا۔ چنانچہ ایک دن اس دشت نورددی کا صلہ مل گیا۔

ہم تھے کہ گھومتے خاں پھرتے خاں کا پورا پورا روپ۔ آنکھ جھپکی تو مجنوں کو لیلیٰ کے سوا اور کیا دکھائی دے سکتا تھا؟ — وہی مگر ذرا بزرگ۔ ترن بھرت چلتی ہوئی سلاٹیاں اور اون کا ہنڈا وزنی دو سیر۔ اشارہ ہوا یہ اٹھالو۔ مدت سے سن رکھا تھا کہ :

رشتہ اندر گلو افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

سو اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ یا ہم نے خود ہی خود کو اس تجربہ کے لئے یار مہربان کے حضور پیش کر دیا۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ — کچے دھاگے سے بندھی آئیں گی سرکار مری۔ اون کا دھاگہ کچا ہوتا ہے یا پکا، یہ تو نہیں کہہ سکتے مگر ہم اس سے بندھ ضرور گئے۔ ہمارا کیا ہم تو بغیر دھاگے کے بھی بندھے چلے آتے ہیں۔ کچھ یہ بھی ڈر کہ بے چون و چرا ساتھ نہ ہولئے تو بیگم صاحبہ کہیں تاؤ میں آکر سلاٹیاں ہی نہ آنکھوں میں بھونک دیں۔ ان کا کیا جائے گا۔ اندھے کانے ہوں گے تو ہم۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری ! اس لئے ”بس میڈم“ کہہ کر ہنڈا اٹھا لیا اور بڑے طمطراق سے ساتھ ساتھ چلتے لگے۔ جیسے ہم ان ہی کے ساتھ ہوں۔ اور چلتے گئے، چلتے ہی گئے۔ جیسے کسی فرنگی شاعر کا وہ ہیرو جو اپنی محبوبہ کے ساتھ برابر گھوڑا سواری کئے جاتا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کی بھی تو یہی ”ہابی“ ٹھہری۔ دکان دکان پر شاپنگ، چاہے خریدیں کچھ بھی نہیں۔ یہ رہی لیلیٰ کی دشت نورددی۔ کوئی کسی سے کم نہیں۔ ہاں تو صاحب لیلیٰ کے حسن سیاہ کی آب و تاب سے

کوئی بہت ہی ہمارے جیسا با ذوق ہے جس نے کہا ہے کہ :

دیکھ ہاتھ ہیں جو ٹانگے پر حسی
گھر پہ پہنچانا ہمارا کام ہے

واہ! واہ کیا کام ہے ! کام سا کام ! یہ بھی ایک مشغلہ
دلچسپ ہے بیکاروں کا - اور یقین جانتے، یہ محض غب
نہیں، ٹانگا تو کیا وہ تو آٹو رکشاؤں کے پیچھے بھی رہیں
لگانے سے کبھی نہ چوکیں اور جوں توں کر کے کام شوق
حاصل کر کے ہی رہیں -

کیا عورتیں کیا مرد، وقت کا کیا پانچا کرنے میں سب
ایک جیسے - لو صاحب، گھر والیاں تو کچھ کرنے سے
رہیں - وہ تو گریباں چاک کرنا جانتی ہیں، سینا کیا
جائیں - اس لئے مرمت ہو یا رفوگری، یا پھر مارے کا
سارا کوٹ پتلون سینا، سب آپ ہی کرنا پڑتا ہے -
یعنی مردوں کو - اور سچ ہو چھٹے تو ویسے بھی عورتیں
کب سیتی پڑتی ہیں - یہ دھندا بھی تو مرد ہی کرتے
ہیں - اور ہم بیگمات کے ہتھکنڈوں سے ایسے لاچار
ہو گئے ہیں کہ سربازار بیٹھ کر مرمت، پیوند، سب کچھ
آپ ہی کرتے ہیں - خود بخیہ و خود بخیہ گر و خود....



لاچار ہم ہوئے!

ارے صاحب ٹھیرنے تو.... سٹنے تو....؟خدا کے
لئے صرف ایک بات اور.... چیں بول گئے نا؟ ہاھاھا....
سارے رے رے گے گا گا ما ما دھا دھا دھانی....
ہپ ہپ ہرا !!

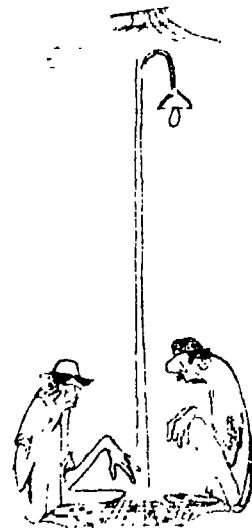
ہیں کہیں اپنی بیگم صاحبہ ہی نہیں مل گئیں - ورنہ جان
نے لالے بڑ جاتے - یقین جانتے رات کو جب ہم کسی کی
د میں ”کن کن تارے“ کا ورد کرتے ہیں تو خواب
میں بھی رہ رہ کر کسی کافر ادا کے سپنے ہی دیکھتے
ہیں - ہائے ہائے !

کیا چاند سی صورتیں بنائیں

قربان اے نیلی چھتری والے !

شعر! اے کاش! عبدالعزیز خالد ہمارا سارا دیوان
لے لیں اور اپنا یہ شعر دیدیں - بہر حال، یہ سفر خوب
مٹا - اور جب تک یہ مشغلہ شوق جاری رہا، بڑا لطف
آ - ادھر ادھیڑ آدھر بن - اور ہم برابر ادھیڑ بن ہی
ہیں رہے - بے کارم و با کارم کے مصداق -

ہمیں تو وقت کی گردن مارنے سے غرض ہے، چاہے
یسے بھی ہو - خدا کارپوریشن کا بھلا کرے - ہر سڑک
کیا تیز روشنی دینے والے سو سو، دو دو سو کینڈل ہاور
نے قمقمے لگا رکھے ہیں جن کے سائے میں بیٹھ کر بار لوگ
ت رات بھر پچسی کھیلنے رہیں - ہم بھی بڑے بڑے
پاسدانون اور ریاست والوں سے کیا کم ہیں - وہ بھی تو
ہے ہی ہیں - یہ گوٹ مار، وہ گوٹ مار، یہ چال چل،
چال چل کا کھیل ہی کھیلنے رہتے ہیں - کبھی چین،
بھی پاکستان، کبھی یہ، کبھی وہ - کسی پر بھی
’دندان آرز تیز‘ غرض یہ کہ قمقمہ ان کا، کھیل ہمارا !



تقرآن کا کھیل ہمارا

نئی مطبوعات

اصل حیات: مصنف: ضامن نقوی
ناشر: ادارہ معارف ادب

۱۲۰- ڈی۔ ڈی۔ کوٹلی گراچی

قیمت: ایک روپیہ

ضخامت: ۷۷ صفحات

یہ کتاب حتمی مختصر ہے، موضوع و مضمون کے اعتبار سے اتنی ہی بسیط بھی ہے۔ مقصد تخلیق جس کا حیات انسانی سے بڑا گہرا و قریبی تعلق ہے، صرف مذاہب ہی نہیں فلسفہ اور سائنس کے مطالعات میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر بعض کا یہ نقطہ نظر تسلیم کر لیا جائے کہ زندگی کا کوئی مقصد تخلیق نہیں اور وہ صرف عناصر میں ظہور ترتیب کا نام ہے اور موت ان کے پریشاں ہو جانے سے عبادت تو بھرتی دہی آل کار اور حیات مابعد کا تصور ہی خاک میں مل جاتا ہے۔ خود حیات مابعد کے تصور کو بھی اب اس دور میں رد کر دینا کچھ ایسا آسان نہیں رہا ہے اور ہم لاجاً لہ آگے چلیں گے دم لے کر کے عقیدہ بھی نہیں عقلاً بھی قابل ہوتے جا رہے ہیں۔

”اصل حیات“ میں یہ دلائل یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حیات انسانی ایک دائمی سوچ اور تقاضے جس کے بے شمار نظام، سلسلے اور مظاہر ہیں اور یہ کہ حیات مابعد بھی دراصل ایک نظام و سلسلہ حیات ہی ہے، نہ کہ کسی غیر مرتب دیوان بے شیرازہ کا جزو۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اباب تشکیک کو کافی مایہ فکر ہوتا ہے۔ جو لوگ اب بھی ریب و شک کے شکام میں اور ان کے ذہنوں پر کڑی کا سا جال اتنا ہوا ہے وہ پھر ایک بار تلاش حق کی جستجو کریں تو فکر و نظر کے لئے بہت کچھ سامان اس چھوٹی سی کتاب میں مل سکتا ہے۔

یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب یہ اس کا دوسرا

ایڈیشن ہمارے سامنے آیا ہے (۱-۲)

★

ابو کی کہانی:

ایک عرصہ بعد پھر ایک کھپ کی کھپ -
قیام پاکستان کے ساتھ دیگر علاقائی زبانوں (انجمن کے افسانے پنجابی) کی طرح پنجابی میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے جس میں نظم و نثر کو یکساں دخل ہے کلاسیکی دور تو شاعری ہی کا دور تھا۔ جدید دور میں شاعری نے بھی نیا رنگ اختیار کیا جس کا نمونہ شرف، سر شہاب الدین (مجموع) عبد المجید تھوٹی، اور احمد راہی کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اب ان میں اور سلسلے بھی شامل ہو گئے ہیں جن میں غزل کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس باب میں بعض استاد اب بھی پیش پیش ہیں۔ ان میں سیر فیض گجراتی کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے اپنے مقبول عام مجموعے ”ڈونچیک، پائیڈے“ (لمبی مسافرتیں) میں غزل کا حق بہت خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ اور اس صنف میں وہ تمام تیور پیدا کر دئے ہیں جو اس سے مخصوص ہیں۔ ان کے زیر اثر دیگر شعرا نے بھی اس صنف کو اپنا لیا ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد پنجابی شاعری اس صنف میں بھی مالا مال ہو جائے گی۔

ایک اور استاد جناب عبد الکریم شرمہیں۔ ان کی نظموں، غزلوں اور گیتوں کا مجموعہ ”نگراں“ کے نام سے موسوم ہے۔ ”نگراں“ اصل میں وہ کونپلیں ہوتی ہیں جو درخت کو کاٹ دینے کے بعد زخود پھوٹ آتی ہیں اور ان میں جلد تر و تازگی پائی جاتی ہے۔ اسی لئے پہلی و شیشم کی طرح سہی قد تیاروں کو بھی ”نگراں“ کہا جاتا ہے۔ ”نگراں“ جی مینا ظاہر ہے کہ اس ہلکتے ہوئے نام کے ساتھ نظموں، غزلوں، گیتوں کی کیسا کیفیت ہوگی۔

یاد نامہ ایک استاد کی تصنیف ہے جسے پنجابی ادبی بورڈ لاہور

نے حال ہی میں شائع کیا ہے اور یہ بھی کتابوں کے ایک جدید عمدہ سلسلے کی تمہید ہے۔

ولکناس (پنجین) تنویر بخاری کی پنجابی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

گو مجموعہ مختصر ہے مگر اس نو عمر شاعر نے تھوڑے ہی عرصہ میں پنجابی نظم

وہ خاصی حیرت افزا ہے۔ اس کی کہانی، داجل کے افسانے پنجابی افسانوں کا نہایت عمدہ اور دلچسپ مجموعہ ہے۔ مرتبین پنجابی ادب کے چوٹی کے ادیب ہیں۔ محمد آصف خان، خالد لاہوری اور شہباز ملک۔ لکھنے والوں میں بزمگیر کے کم و بیش پچیس بلند پایہ افسانہ نگار اس مجموعہ میں نظر آتے ہیں۔ ان میں خود مرتبین کے علاوہ صوفی غلام مصطفیٰ اقبتم، راجندر سنگھ بیدی، افضل احسن، نواز، غلام علی چودھری، کرتار سنگھ دگل، امریتا پریت، رشیدہ سلیم، شفقت تنویر مرزا، صنیف چودھری وغیرہا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسانوں کا معیار خاصا بلند ہے اور یہ امر بھی تعجب انگیز ہے کہ کھوڑے ہی عرصہ میں اس نئی صنف نے بھی اس قدر اعلیٰ مدارج ترقی طے کرائے۔ ان گونا گوں امور سے اس زبان میں آئندہ ترقی کے بڑے وسیع امکانات نظر آتے ہیں۔ (ر۔خ)

میں غزل کی صنف میں جو اضافہ کیا ہے اس کا ذکر نہ کرنا ٹالنے کی ہوگی۔ تنویر بخاری گو پہ قفل مجھ کوئی اور استاد عبد الکریم شمسے، تاثر نہیں، پھر بھی انہوں نے اپنے پیش رو اساتذہ کے رنگ کو بڑی حد تک اپنایا بھی ہے اور نبھا یا بھی۔ اس نوجوان شاعر سے بہت سی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

بہر کیف، پنجابی نظموں سے زیادہ دلچسپی کا باعث اس کی نثری کتابیں ہیں جن کی طرف اہل قلم حال ہی میں زور شور کے ساتھ متوجہ ہوئے ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ کھوڑے ہی عرصہ میں تقریباً صنف میں انہوں نے کئی نثر لیس طے کر لی ہیں۔ چنانچہ "کا ذکر قبل ازیں ان صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ عبد المجید بھٹی کا ناول "ٹھنڈا" (ٹھوک ادبی انعام بھی حاصل کر چکا ہے۔ اس کا طرہ امتیاز ناول کی نہایت چٹیل زبان ہے۔

پنجابی افسانے نے چند ہی سالوں میں جو گزیر پاتری کی ہے

ایسا گمان نہ تھا، ————— بقیہ صفحہ ۳۵

چاؤ سے، ایک کی طرف جاتی ہیں دوسرے کی طرف بھی.... مگر اب اس سوال کا محل ہی کیا تھا؟ مجھے اپنے بچے سے بے حد پیار ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرا ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کی خوشبو نے ایک زندگی کی کایا پلٹ دی۔ وہ اسے تصور کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں لے آئی ہے، ایک باغ و بہار دنیا۔

نظروں نے اسے بھانپ لیا۔ کوئی مذہل؟ وہ اب پرانی بات بڑھتی تھی، شاید۔

اور آخر — وہ بات جس کا کسی کو گمان نہ تھا! نہ اب جاننا ہی، نہ بچے۔ میں حیران تھا۔ اور میرے دل میں سوال اٹھا: کیا قدرتی اور انسانی پھول دونوں ایک ہی ہیں؟ دونوں کا رنگ روپ، بو باس، کیف اور ان کے ساتھ بیا بھی وہی؟ — ہاں نہیں جو اس تپاک سے،

حسن کلام آئینہ، ————— بقیہ صفحہ ۱۲

لگے ہوئے تھے۔ صدر کی روز افزوں عوامی مقبولیت، ان کی صدا آرگنٹ اور صاحب الرائے ہونے کی بڑی علامت۔

یقین ہے کہ اب کے پھر میری طرح دوسرے بھی اپنے ساتھ گونا گوں تاثرات لے کر گئے ہوں گے۔ اور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ہمارے محترم سربراہ نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک کہا ہے اور ان باتوں پر عمل کیا جائے تو ہم اپنے قومی مقاصد میں جلد از جلد فائز المرام ہو سکتے ہیں۔

اگر سیاست دان اور عوام بھی انہی کی پیروی کریں تو کیا اچھا ہو۔ مذہاتہ بالآخر ہم سب کا یہی ہے نا، کہ پاکستان کو مضبوط و مستحکم اور ترقی پذیر بنایا جائے۔ پس اس سلسلے میں جو بھی حقیقت پسندانہ قدم اٹھایا جائے مستحسن ہوگا۔

پہلے کی طرح اب بھی جس توجہ اور پیش از پیش اپنا شک سے صدر پاکستان کے ان دلنہی خطابات کو سنا گیا اس کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ کوچہ و بازار میں کتنے لوگوں کے ٹھٹھٹ ٹھٹ

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کر سکے۔ اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس کر سکے۔

نوائے پاک میں ملک کے نامور شعراء کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں گیت اور ترانے درج ہیں۔

کتاب مہلہ ہے اور خوبصورت
گردپوش سے آراستہ، گیت آپ
بہت نفیس اور دیدہ زیب،
قیمت صرف ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :- ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو "ماہ نو" اور "مطبوعات پاکستان" کراچی کی کتابیں و رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں تو وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے منگوا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جاسکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔

پتہ :-

ادارہ مطبوعات پاکستان

معرفت پاکستان ہائی کمیشن - شیر شاہ میس - نئی دہلی (ہندوستان)

منجانب :- ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

ہماری دونی مطبوعا

(زیر طبع)

انتخاب "ماہ نو"

"ماہ نو" کے سلسلہ انتخابات کی تیسری ترتیب جو پچھلے پانچ سالوں کے بہترین مضامین، نظم و نثر کی چیدہ اور نمائندہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ ملک کے بہترین اہل قلم کے مضامین نظم و نثر جو ہمارے ملی ادب، تاریخ و فن، اور ثقافت و انتقاد کے موضوعات پر سیر حاصل پیشکش ہیں اور دائمی قدر و قیمت کے حامل۔

کتاب مصور اور کافی ضخیم ہوگی اپنی کاپی کے لئے فرمائش جلد درج کرا لیجئے

★

(زیر طبع)

سنہرا دیس

(دفا راشدری)
مدھر دریاؤں، گنگنا تے ما بھیلوں، سنہرے پٹ سن، اور روپہی دھان کی سرزمین کا ایسا مرقع جو ہمیں اس دیس سے اور قریب کر دے گا۔ جو ہمیں اس کی عظیم تاریخ، اس کے شاندار ادب، فنون اور زندگی کی جھلکیوں سے پہلی بار بطریق احسن روشناس کرائے گا۔

اپنے موضوعات کے تنوع اور اسی دھرتی کے رہنے والے کے قلم سے پڑھنے والے اثرات، مستند حقائق اور معلومات پر مشتمل ایسی وسیع پیشکش جو عرصہ تک مشرقی پاکستان پر ایک نفیس دستاویزی حوالہ سمجھی جائے گی۔

— ضخیم — مصور — مجلد
فرمائش جلد درج رجسٹر کرائیں۔

اداری مطبوعا پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی



زمانہ کسی کا انتظار نہیں کرتا!

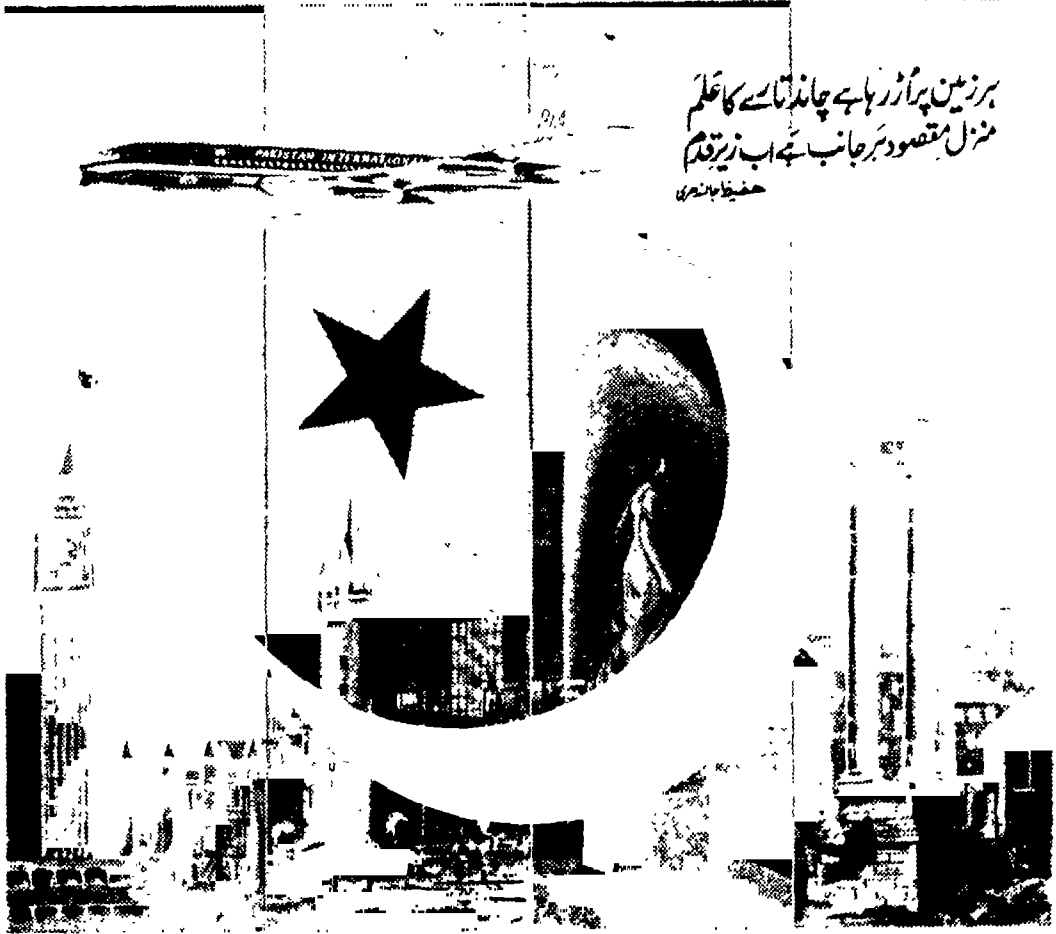
وقت گزرنے پر اوپر زوں کی طرح تیل بھی خراب ہو جاتا ہے اور انہیں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ یہی تبدیلی کتنے وقفے سے کی جاتی ہے! ریسرچ کوئی ہے اس کا مدار مخصوص حالات اور کارکردگی پر ہے۔ اس لئے بیج جو اب چون چورنگ سے مل سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ برما شیل نے اپنے خریداروں کی آسانی کے لئے جدید قسم کی پورے گاؤں قائم کر رکھی ہے۔ مگر خریدارہا جان پازنی کے ساتھ اپنے تیل کی چاہا کر اسکیں۔ اور تیل کو پوری ملک استعمال کر کے کفایت کر سکیں۔

یہ پورے گاؤں کی خدمت برما شیل کی جلد فہم کا ایک پہلو ہے۔ آپ جو برما شیل کی پٹرول سٹیشن استعمال کرتے ہیں برما شیل آپ کی ہر خدمت کیلئے حاضر ہے۔ وہ تمام تیل کی مشینا جو اسکی پٹرول کے لئے فراہم ہوتی ہیں سب بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

خدمت اپنا افتخار : برما شیل پر اعتبار

برما شیل آئل اسٹونگا ریشرفٹری بیٹنگ کمپنی آئن پاکستان لیسٹڈ (انڈسٹری میں قائم شدہ) کمپنی کے مسبرائی کی ذمہ داری محسوس



ہر زمین پر اُڑ رہا ہے چاند تارے کا علم
منزل مقصود ہر جانب ہے اب زیر قدم
حفیظ مہتمم

ہمارا چاند تار ترقی اور علمینان کا نشان ہے۔
اس تصویر میں ہمارا چاند تار دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے نشان بردار میناروں پر روشنی برسا رہا ہے۔
ریاست جو یا سیاست۔ امارت جو یا تجارت صنعت ہو یا حرفت اب ماری دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔
پاکستان کے مشرق مغرب اور باہر کی دنیا پر عزت اور علمینان کی اُڑان سے جڑے طیارے ہماری اپنی خوش نصیبی کا عملی اعان ہیں۔

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز - ہا کمال لوگ لاجواب پرواز

چین سے دو خط



دل روز تمام علاج جلدی امراض

ہر قسم کے پھوٹے سنسی یا پوری پھوٹے
منفلائی پھوٹے یا سورجیگندہ یا توڑا دھنیل غاراش
گچ نیست زیر کچالی گچی۔ دھولی۔ ماسوہ چندی رستہ ہلار
درو۔ ملن۔ سوچن چوٹ۔ سنے اور پالنے زخم اور زہریلے بالوں
کے کاٹے اور ڈسے کا بیضر اور تیر بہدف علاج ہے۔

چیرہ چار اور مرہم ٹپی سے نجات دلاتی ہے

حیثیت فی شیشی

دور پیہ۔ ایک پیر۔

آئین گنجی ہزل
چنگ کنگ چین
گزشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی ارسال کردہ
دل روز کی شیشی ملی۔ شکریہ! مجھے دس سال کے بعد سے
پیشینہ جی۔ ہر قسم کی دھبے، دھریا اور دھبے استعمال
کیں مگر کچھ بھی آفت نہ ہوا۔ دل روز کو صرف
چھ دن لگانے کے بعد دستہ ام شکایت باقی رہی۔
کاش! مجھے پہلے ایسے تیر بہدف علاج کا علم ہوتا۔۔۔۔۔

ص۔ د۔ غ
میر

آئین گنجی ہزل
چنگ کنگ چین
..... مجھے کچھ دوسرے گرن پرکھنے کی سہولت ہے
دل سے ہیں۔ ان کی وجہ سے غبارش بہت ہوتی ہے
نشانات تو رنگ دم سے ملتے جلتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آفت نہیں ہوا۔ استعمال میں آپ
کی دہائی دل روز کا شہتہ بیکہ خیال ہوا کہ ایسے ہی
استعمال کر کے کون کون سے گزشتہ ام شکایت کیا آپ
مہربانی فرما کر ایک شیشی دل روز منسلک بلا پیسہ
پیشہ دل روز کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔

ص۔ د۔ غ
میر

سندھ سے استعمال میں ہے

حکیم طاہر الدین اینڈ سنز دروازہ لاہور روڈ لاہور۔ خوب

شہود و افروش طلب کریں

ماہ نو، میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

- ۱۔ دو ماہ نو، میں شائع شدہ مضامین کا معقول معاوضہ دیا جائے گا جس کے بعد وہ ادارہ کی ملکیت ہوں گے اور وہ حسب منشا ہر طور سے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔
- ۲۔ مضامین بھیجنے وقت مضمون نگار حضرات دو ماہ نو، کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
- ۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
- ۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
- ۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
- ۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
- ۷۔ مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔
- ۸۔ ہتھ بہت صاف اور مکمل درج کیجئے۔
- ۹۔ اپنے مضامین نظم و نثر کی نقول اپنے پاس بھی رکھئے۔ غیر طلبیدہ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کیجئے۔

(ادارہ)

مسلم بنگالی ادب

(بنگلہ سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔

سرورق دیدہ زیب اور رنگین - ضخامت . . . صفحات

قیمت چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

”ماہ نو“

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

۱۔ غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔

۲۔ مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔

۳۔ ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضمون کو نالابل اشاعت چھوڑ کیا جائے۔

۴۔ ادارہ ڈاک میں کسی مسودہ کے کم ہوجانے کا ذمہ دار نہیں۔ (ادارہ)